01/10/12

مستنصر حسین تارڑ
کیوبک سے کیلگری کے پہاڑو ں میں

مانٹریال پر حاوی ہوتے ، ایک پہاڑی پر سربلند ماؤنٹ رائل کے کلیسا کے اندر صوفی یا سینٹ آندرے کا دل ایک شیشے کے مرتبان میں محفوظ ہے۔ لوگ اس کے سامنے جھک کر مرادیں مانگتے ہیں ، سینٹ آندرے کا"معجزہ" ہے کہ اپاہج لوگ آتے ہیں اور چلنے لگتے ہیں اور اس کے ثبوت وہاں آویزاں ہیں، سینکڑوں بیساکھیوں کی صورت میں جو اپاہج پن سے نجات حاصل کرنے کے بعد لوگ وہاں چھوڑ گئے۔میں کینیڈا کے بیشتر بڑے شہر دیکھ چکا تھا لیکن ابھی تک مجھے کیوبک جانے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔
جب ذوالفقار اور شیث نے مجھے شہر دکھانے کا منصوبہ بنایا تو میں نے انکار کردیا کہ میں ایک اور بڑا شہر دیکھنے کے لئے خواہ مخواہ اتنی طویل مسافت نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن شیث نے مجھے یقین دلایا کہ ماموں کیوبک دیکھ کر آپ باقی کینیڈا بھول جائیں گے بلکہ آپ وہاں سے واپس آنے سے انکاری ہوجائیں گے کہ شہر تو اسے کہتے ہیں چنانچہ رخت سفر باندھ لیا اور واقعی کیوبک میں داخل ہوئے تو وہ ایک ستھرا نکھرا ہوا ، دیدہ زیب گڑیا گھر نظر آیا جس میں یقینا پریاں وغیرہ حال مقیم ہوں گی، جیسے ایک زمانے میں ایک بدتمیزسی فراخ دہن خاتون ٹیلی ویژن پر مختلف فلموں کے زور دار منظر دکھایا کرتی تھی اور ہر منظر کے اختتام پر اپنے آپے اور سراپے سے باہر ہو کر کہتی تھی"کیا سین ہے"تو میں بھی کیوبک دیکھ کر پکار اٹھا کہ۔ ۔ ۔ کیا شہر ہے ، قدرت کی سنجیدہ دل کشی لئے ہوئے گلیاں اور بازار فرانسیسی طرز کی عمارتیں ، بلند قصبے کے پہلومیں موجزن دریا اور سمندر اور سیاحوں کے سمندر موجزن اور مسرت میں مست اور ہاں جب آپ کینیڈا اور امریکہ میں قدامت کہتے ہیں تو یہ قدیم زمانہ دو سو برس سے زیادہ کی سکت نہیں رکھتا۔ ۔ ۔ کوئی بھی عمارت صرف سو برس کی ہوجائے تو اسے "تاریخی" قرار دے دیا جاتا ہے ، چنانچہ ایک کھنڈر دکھایا گیا جسے محفوظ کرلیا گیا ہے کہ یہاں پورے ڈیڑھ سو برس پیشتر ایک درزی رہائش پذیر تھا۔
میں ان لوگوں کو اگر یہ لاہور آئیں ، ویسے تو ان کا دماغ خراب ہے کہ آئیں لیکن فرض کیجئے کہ آہی جائیں تو میں انہیں اندرون شہر ایسے گھر دکھا سکتا ہوں جہاں پانچ چھ سو برس سے ایک ہی خاندان کے لوگ رہتے ہیں ، ایک پارک میں اس کرسی کی ایک نقل نمائش پر ہے جس پر کینیڈا کی پہلی پارلیمنٹ کے سپیکر بیٹھے تھے ۔ ۔ ۔ لوگ نہایت ذوق و شوق سے اس پر براجمان ہو کر تصویریں کھنچواتے تھے لیکن میں نے اجتناب کیا کہ اگر میں اس کرسی پر بیٹھ جاتا تو پھر اٹھنے والا نہیں تھا کرسی مل جائے تو پھر کاہے کو چھوڑنا جب تک کہ عدالت عالیہ چھڑا نہ دے۔ ۔ ۔ کیوبک ایک شہر نہ تھا ایک جشن تھا ایک سیاحوں سے امڈتا میلہ تھا جسے چھوڑنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ ۔ ۔ جیسے دنیا چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا پر چھوڑنی پڑتی ہے تو ہم نے بھی کیوبک کو ایک بھاری دل سے چھوڑ دیا۔ ۔ ۔ مانٹریال میں قیام تمام ہوا۔ ۔ ۔ شائستہ حسب معمول اس سوپر نروس پھرتی تھی کہ بھائی جان آپ ابھی تو آئے ہو اور ابھی جارہے ہو۔ میں نے اسے دعائیں دی کہ ہمشیرہ انشاء جی اب کو چ کرو اس شہر میں دل کو لگانا کیا تو اب اپنے دل کو مانٹریال سے تقریباً پونے تین گھنٹے کی فضائی مسافت پر کینیڈا کے آخری سرے پر واقع شہر کیلگری سے لگاتے ہیں۔ ۔ ۔ وہاں ایڈمنٹن اور کچھ نواحی قصبوں کے پاکستانی میرے منتظر تھے۔
ائیر پورٹ پر اشفاق حسین اور نرجس سے ملاقات ہوگئی، اشفاق یہاں کسی میٹنگ کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے اور شاید ایک مشاعرہ بھی بھگتا رہے تھے۔شہر کیلگری مجھے ہمیشہ ایک اداس اور اپنے آپ میں گم اور پوشیدہ سا شہر لگا۔ ۔ ۔ میں نے اپنے ناول"خس و خاشاک زمانے" کے آخری حصے میں اپنے مرکزی کرداروں کو اس شہر میں آباد کیا ہے۔ ۔ ۔ دراصل کیلگری وہ دروازہ ہے جس میں آپ داخل ہوتے ہیں تو کینیڈا کی راکی چٹانوں ، جھیلوں، جنگلوں ، بلندیوں اور برف اور ریچھوں کا ایک حیرت کدہ کھل جاتا ہے ، میں نے اس حیرت کدے میں تقریباً دو ہفتے مسلسل سفر میں گزارے ۔ ۔ ۔ اگر اس مسافت کی تفصیل میں جائے تو یقین کیجئے ایک اور ضخیم سفری داستان وجود میں آجائے گی اس لئے اسے مختصر کرتا ہوں۔ ۔ ۔ یوں جانیے

کہ کوئی طے شدہ منزل نہ تھی آج کی شب کہاں آئے گی ، کہاں قیام ہوگا ، کچھ خبر نہ تھی۔
بس یہ خبر تھی کہ آس پاس بلند پہاڑ اور جنگل ہیں اور ہر دو قدم کے بعد کسی جھیل کا پانی پاؤں میں آپہنچتا ہے اور اس کے سوا جنگل کے جانور ہیں جو بے خطر ہمارے قریب آتے ہیں سونگھتے ہیں پچھلی بار میں وادی یونان سے گذر کر الاسکا گیا تھا اور اس سفر کے دوران جہاں جنگلی بھینسے، ہرن، سرخ لومڑیاں اور سیاہ ریچھ دیکھے تھے وہاں بدقسمتی سے مجھے ایک بھی بھورا بلند قامت ریچھ دیکھنے کو نہ ملا تھا اور یہ آرزو اس سفر کے دوران پوری ہوگئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے جنگلوں میں جتنے بھی بھورے ریچھ قیام پذیر تھے وہ سب کے سب مجھے دیکھنے کے لئے چلے آئے ہیں۔ وہ نہیں بلکہ میں ان کے لئے ایک عجوبہ تھا کہ یہ جو تہتر برس کا شخص تارڑ نام کا ہے یہ گھر میں بیٹھ کر دیگر بوڑھوں کی مانند اللہ کرتے موت کا منتظر کیوں نہیں ہوتا،پھر سے ان جنگلوں اور کوہساروں میں دیوانوں کی طرح مارا مارا کیوں پھرتا ہے۔ ۔ ۔ ذرا اسے دیکھیں تو سہی یہ کیسا ہے اور کیوں دیوانگی دربدری اور سیاحت کے جنون میں ابھی تک مبتلا ہے ۔
میں نے اس پہاڑی سفر کے دوران بہت سے بھورے ریچھوں سے ذاتی طور پر اگرچہ قدرے فاصلے سے ملاقات کی۔اس کوہستانی سفر کے دوران مجھے ایک مصرعہ یاد آتا رہا کہ ۔ ۔ ۔ میں نے چن لیا ہے ایک پہاڑی راستہ۔ ۔ ۔ اور یہ راستہ مجھے کلونا، بینف، نیلسن، جیسپر اور واٹرئن ایسے پہاڑی قصبوں نیلگوں جھیلوں، کوہ ایڈتھ کی برفانی بلندیوں ، بہت پوشیدہ آبشاروں ، جھرنوں اور چشموں تک لئے جاتا تھا۔ ایک روز جب ہم ایک طویل پہاڑی سفر کے بعد ایک ایسی جھیل کے کنارے پہنچے جو شاید ابھی ابھی ایک خواب میں ملفوف تھی اور ابھی جب میں نے اسے دیکھا تو اس کا پانی میرے بدن کو بھگونے لگا تو میرے ایک ہم سفر نے کہا ”تارڑصاحب“ اس جھیل پر جھکا جو سیاہ جنگل ہے اس میں سے ایک راستہ بلندی پر واقع ایک ایسے آبشار تک جاتا ہے جس کی پھوار بوڑھوں کو بھی نوخیز کرتی ہے ، لیکن آنے جانے میں چھ کلومیٹر کی مسافت ہے ۔ ۔ ۔ آپ طے نہیں کرسکیں گے۔ ۔ ۔ میں نے ہانپتے ہوئے گرتے پڑتے وہ مسافت طے کرلی اور اس پوشیدہ آبشار کے پانیوں کی پھوار نے مجھے واقعی نوخیز کردیا۔
پورے دو ہفتے اس کوہستانی جنوں خیزی میں گذرے اور تب میں نے عینی کے گھر جانے کے لئے فلوریڈا کے شہر، ڈزنی لینڈ کے شہر آرلینڈو کے لئے ہوائی سفر اختیار کیا۔ ۔ ۔ راستے میں ٹیکساس کا شہر ڈیلس بھی آیا جہاں جیک کینیڈی کو آسلوالڈ نے ہلاک کیا تھا۔آرلینڈو کے ۔ ۔ ۔ شاید دنیا کے سب سے خوش نظر ائیر پورٹ پر میرا اور کون منتظر ہوسکتا تھا۔ میری اکلوتی بیٹی عینی، بلال اور میرا اکلوتا بھانجا نوفل جس نے مجھے ایک بار ”نانا“ کہا تھا۔ ۔ ۔ اگرچہ مجھے نانا کہلانے سے سخت چڑ تھی کہ درمیان میں نانا فرنویس نانا پاٹے کر وغیرہ آتے تھے لیکن جب اس نے مجھے نانا کہاتھا تو میں نے منت کی تھی کہ نوفل ، ایک مرتبہ پھر مجھے نانا کہو۔ ۔ ۔ تو میں آرلینڈ و فلوریڈا میں تھا

08/10/12

مستنصر حسین تارڑ
“آ رلینڈو“ اور مائی بیوٹی فل جار جیا ”

اگر ایک شہریوں لمبی جھیلوں اورجنگلوں اور ان میں قلانچیں بھرتے ہرنوں سے مزین ہو اور پھر اس شہر میں آپ کی اکلوتی بیٹی بھی قیام پذیر ہو تو وہ شہرآپ کے دل میں جانہ کرے تو اور کیا کرے۔ ۔ ۔ ہمہ وقت اس کی مہک سے ایک ہو مہکتے نہ رہیں تو اور کیا کریں۔ آرلینڈو میرے لئے ایک ایسا شہر ہے۔اگرچہ اس کی وجہ شہرت مشہور عالم ڈزنی لینڈ کے حیرت کدے اوراس کی جھیلوں میں پائے جانے والے مگرمچھ بھی ہیں لیکن میرے لئے وہ عینی، بلال اور شاندار ترین نواسے نوفل کی موجودگی سے عبارت ہے۔۔ عینی ایک

سرکاری ہسپتال میں سابق امریکی فوجیوں، عمررسیدہ بوڑھوں اوربچوں کے دکھ درد کا مداوا کرتی ہے اوربلال انجینئرنگ اور وکالت کے پیشے میں مگن ہے۔ نوفل میاں کے بارے میں مشہور کردیاگیا ہے کہ وہ اپنے نانا جان پرگیا ہے کیونکہ وہ نہ صرف پڑھائی میں ممتاز ہے جو کہ ناناجان تو ہرگز نہیں تھے بلکہ کتابوں کو دیمک کی مانند چاٹتا ہے جو کہ ناناجان کی بیماری بھی رہی ہے۔ موصوف ابھی آٹھ برس کے ہیں اورایک لائبریری کے مالک ہیں۔ کتابوں کے مشہور سٹور"بارنزاینڈ نوبلز" میں گھس جائے تونہایت بے چارگی اور پیار سے کہے گا نانا آپ پلیز مجھے یہ چار پانچ کتابیں تحفے کے طورپر پیش کردیں۔
ناناجان اس درخواست کا رخ نانی جان کی جانب موڑ دیتے ہیں کہ ڈالروں کی پوٹلی انہی کے پاس ہے۔
آرلینڈو میں پاکستانی کثرت سے نہیں ہیں۔ جمعہ کے روزبلال مجھے نماز کیلئے مقامی مسجد میں لے گیا اور جی اس لئے بھی خوش ہوا کہ اس مسجد سے ملحقہ والی بال کورٹ اورسکوائش کورٹ کے علاوہ ایک ریسٹورنٹ اورکیفے ٹیریا بھی ہے۔ ظاہر ہے امریکہ میں جمعہ کے روز آدھی چھٹی نہیں ہوتی اور جتنے لوگ آتے ہیں وہ اپنے کام اور تنخواہ کا حرج کرکے آتے ہیں۔ مجھے خوشی ہوئی کہ نوفل بھی نماز کی ادائیگی میںباقاعدہ ہے، ہفتے میں دو روزاسکی فلسطینی"ٹیچر" اسے قرآن پاک اور اسلامی تاریخ پڑھانے کیلئے آتی ہے۔ اس دوران میں بھی ان کے آس پاس منڈلاتا رہتاتھا کہ فلسطینی خاتون کے عربی لہجے میں ایک عجیب سافسوں تھاجو آپ کے احساسات کی رگونمیں اتر کر آپ کو سرشار کر دیتا تھا، بہت جی چاہ رہاتھا کہ نوفل کے ہمراہ سپارہ کھول کر بیٹھ جاؤں اور قرآن کے حرف اسی طور ادا کروں جیسے کہ وہ حجاب پوش فلسطینی خاتون کرتی تھی۔
میں نے ایک لیکچر کے دوران کہاتھا کہ اگراسلام کی نشاۃ ثانیہ کا ظہورہونا ہے تو نہ سعودی عرب میں اور نہ ہی پاکستان میں ہونا ہے۔ اس کے گل بوٹے یورپ اورامریکہ میں پھوٹنے ہیں کہ وہاں آباد پاکستانی مقامی اور فرقہ وارانہ تعصبات سے پاک صاف اور صرف اسلام کے روشن اصولوں پر یقین رکھتے ہیں۔ مثلاً آرلینڈو میں ایک مسلم تنظیم ہے جو نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ ایک مسجد میں بہت باقاعدگی سے امریکہ کے غریب اورحالات کے مارے ہوئے لوگوں کیلئے جنہیں یہاں "بے گھر اور بھوکے" کہا جاتاہے ان کے لئے کھانے کا بندوبست کرتے ہیں اور وہاں ایسے امریکیوں کی قطاریں لگی ہوتی ہیں یہ نوجوان قطعی طور پر کھانا پیش کرتے ہوئے یہ نہیں کہتے کہ یہ ایک مسلم تنظیم کی جانب سے پیش کیا جارہا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہمارا مذہب تمام انسانوں کی تعظیم کرنا اورخدمت کرنا سکھاتا ہے اوراس میں عقیدے کی کچھ تخصیص نہیں۔
بہت سے ایسے امریکی حیرت زدہ ہوکر پوچھتے ہیں کہ آپ مسلمان ہوکر ہمیں کھانا مہیاکررہے ہیں یعنی آپ اسامہ بن لادن کے فلسفے پر یقین نہیں رکھتے۔
جیسے لاہور کے کچھ ہسپتالوں کے باہر خدمت خلق کے لئے نامعلوم لوگوں نے بیماروں کے رشتے داروں کے لئے قیام گاہیں بنارکھی ہیں اس طور امریکہ میں "میکڈانلڈ" برگر چین کی جانب سے ہسپتالوں سے ملحقہ نہایت آرام دہ رہائش گاہیں تعمیر کررکھی ہیں جہاں مریضوں کے لواحقین مفت قیام کرسکتے ہیں۔ البتہ خوراک کاانتظام انہینخود کرنا ہوتاہے اوربہت سے لوگ اسکی بھی استطاعت نہیں رکھتے۔ چنانچہ کچھ رفاعی ادارے کسی حد تک یہ ذمہ داری قبول کرلیتے ہیں۔ اگرچہ عینی نے مجھے سختی سے منع کیاتھا کہ آپ نے کہیں بھی زبانی طور پر یا تحریری طورپر ذکر نہیں کرنا لیکن میں یہ تذکرہ ایک بیٹی کا نہیں ایک پاکستانی کا کررہا ہوں۔ عینی نہایت باقاعدگی سے مریضوں کے رشتے داروں کے لئے خوراک کا اہتمام کرتی رہتی ہے اور وہ ذاتی طورپر ہسپتال کی کمرتوڑ ڈیوٹی کے بعد اپنے کچن میں درجنوں ناشتے تیارکرکے ان امریکی مجبورلوگوں تک پہنچاتی ہے۔ بہت سے لوگ اس سے پوچھتے ہیں کہ تم ایسا کیونکرتی ہوتو وہ کہتی ہے کہ اس لئے کہ میں ایک پاکستانی ہوں اور مسلمان ہوں۔ ایک اور تنظیم یہودی اور مسلمان ڈاکٹروں کی ہے جو مشترکہ طورپر بغیر کسی معاوضے کے امریکیوں کا علاج کرتی ہے صرف یہ ثابت کرنے کے لئے کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان منافرت نہیں ہے۔
اس دوران ہم ایک شب کیلئے "سوانا" کے تاریخی اور سوتے جاگتے شہر میں بھی گئے۔ میں نے اس شہر یا قصبے کے بارے میں ایک ناول پڑھاتھا اس لئے مجھے اشتیاق تھا۔ لیکن گرمی کی شدت ایسی تھی کہ ہم

تو پگھل گئے۔ یہاںپر وہ محاورہ بھی کارآمد نہیں ہوسکتا کہ گرمی اتنی تھی کہ چیل بھی انڈہ چھوڑتی تھی کہ یہاں چیلیں نہیں ہوتیں۔ یہ شہر اگرچہ باغوں، سرسبز گوشوں کا ایک خاموش شہر ہے جسکے ساحل کیساتھ ساتھ ایک دیدہ زیب بازار ہے لیکن دھوپ کی شدت ایسی تھی کہ ہم بوکھلائے ہوئے گھومتے رہے اوربالکل ذہنی طورپر گھوم گئے، ہمیںیہ بھی خبر ملی کہ ٹام ہینکس کی بے مثال فلم"فارسٹ گمپ" کی شوٹنگ یہاں ہوئی تھی اور یہاں اس پارک میں وہ تاریخی بنچ ہواکرتا تھا جس پر بیٹھ کر ٹام ہینکس بس کاانتظار کرتاتھا اگرچہ اس تاریخی بنچ کو اب عجائب گھر میں محفوظ کرلیاگیا ہے، میں ٹام ہینکس کی اداکاری کامداح توتھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ وہ بنچ دیکھنے کیلئے دس بیس ڈالر خرچ کرکے اس عجائب گھر میں چلاجاتا، ایک پارک کے اندر ایک ریڈانڈین سردار کی جگہ تھی جس نے اپنا قبیلہ ترک کرکے گوروں کی حمایت کی تھی اور میمونہ نے کہا تھا کہ یہ یقینا ریڈانڈین لوگوں کا میرجعفرہوگا، اگر ٹیپو سلطان ہوتا تواسے یہ اعزاز نہ ملتا۔

آرلینڈو واپسی پرہم کچھ دیر جارجیا کے شہر جیکسن ول میں ٹھہرے اور مجھے وہاں بے مثل نابینا گائک رے چارنر یادآگیا۔ میں اس کی درد بھری آواز کا مداح ہوں اور اسے سنتا رہتاہوں اسے جارجیا کے سفید فاموں نے جارجیا سے نکال دیا کہ وہ نسلی امتیاز کے خلاف تھا اگرچہ اپنے وطن جارجیا کی توصیف میں عمر بھر نغمہ سرا رہا اورپھر ایک ایسادن آیا کہ جارجیا کی پارلیمنٹ نے اجتماعی طورپر اس نابینا گائک سے معافی مانگی اور اس کے ایک گیت" مائی بیوٹی فل جارجیا" کو ریاست جارجیا کا قومی نغمہ قراردیا۔ ۔ ۔ یہ تو طے پاچکا ہے کہ چین وعرب ہمارانہیں لیکن کیا ہم ایک گیت "مائی بیوٹی فل پاکستان" نہیں گاسکتے؟

4/11/12

رائس اینڈ۔۔۔ سوہو۔۔۔ مصری چاول، نماز

مستنصر حسین تارڑ

میرے نیو یارک کے ایک دوست شاہد چغتائی نے اس شہر کی ایک بے مثال تعریف کی تھی۔۔۔ اس کا کہنا تھا کہ تارڑ صاحب آپ نیو یارک کے کسی پُر رونق ایونیو کے فٹ پاتھ پر کھڑے ہو جائیے اور اپنے تصور کے مطابق ایک من پسند عورت خلیق کیجیے کہ اس میں ہیر کا حسن چھلکتا ہو۔ آنکھیں حافظ کے شعروں سے مستعار لی گئی ہوں، وہ موہن سنگھ کی پنجابی مٹیار کا الڑ پن لیے ہوئے ہو۔ وہ ایک ترک غنچہ دہن ہو، غالب کے وہ لب ہوں کہ جن کی شیر ینی ایسی کہ گالیاں کھا کے بھی بندہ بے مزہ نہ ہو۔ اس کی بناوٹ پرانی صوفیہ لورین کی اور بدن مارلن منرو ایسا ہو تو۔۔۔ آپ کو پانچ منٹ سے زیادہ انتظار نہیں کرنا ہو گا۔۔۔ آپ کے تصور سے تخلیق کردہ وہ عورت آپ کے سامنے سے گزر جائے گی۔ آپ دنگ رہ جائیں گے کہ کیا اس شہر میں تصور کے خواب سے آراستہ ایک حقیقت بھی وجود رکھتی ہے جو ابھی ابھی آپ کے قریب سے گزر گئی ہے۔

نیو یارک میں یہ ورائٹی مرہون منت ہے اُن کم از کم پونے دو سو مختلف گوری، کالی، نیلی، پیلی، بھوری اور گندمی قومیتوں کی جو اس شہر میں آباد ہیں۔۔۔ اور ان کے اختلاط اور باہمی قربت سے وہ تصوراتی عورت یا تصوراتی مرد جنم لیتے رہتے ہیں جو دنیا کے کسی اور شہر میں ممکن نہیں۔۔۔ اور یہ رنگا رنگی صرف انسانوں میں ہی نہیں، اس کی عمارتوں، موسموں اور کھانوں میں بھی پائی جاتی ہے، آپ دنیا کا کوئی بھی کھانا تصور میں لائیں وہ کسی نہ کسی ریستوران میں میسر آ جائے گا۔ سری پائے سے لے کر مینڈک کی ٹانگوں اور اونٹ کے کبابوں تک۔۔۔ شہر کے فٹ پاتھوں کے کنارے سینکڑوں عارضی کھوکھے ایستادہ ہیں جہاں سے آپ بہت مناسب قیمت پر ناشتہ اور ڈنر وغیرہ حاصل کر سکتے ہیں۔ یوں بھی میرے اندازے کے مطابق نیو یارک یورپ کی نسبت سستا ترین شہر ہے خاص طور پر خوراک کے معاملے میں۔۔۔ میں ہر صبح سلجوق کے فلیٹ سے نکل کر کبھی سنٹرل پارک اور کبھی ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ تک سیر کے لیے نکل جاتا اور واپسی پر کسی ریستوران یا سیلف سروس کیفے میں ناشتہ کرتا جس کی قیمت کم ہی چار ڈالر سے زیادہ

ہوتی۔ اتنی رقم میں اب آپ کو لاہور میں بھی مناسب ناشتہ نہیں مل سکتا اور۔۔۔ اس ناشتے میں اتنی زیادہ خوراک ہوتی کہ دو بندے آسانی سے سیر ہو سکتے ہیں۔ ان عارضی کھوکھا ریستورانوں میں ہوٹل ہلٹن کے سامنے واقع ایک مصری مولانا کا کھوکھا تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔ شام سات بجے سے لے کر گئی رات تک خوراک حاصل کرنے والوں کی طویل قطاریں آپ کو حیرت زدہ کرتی ہیں، ان قطاروں میں نہ صرف سابق صدر کلنٹن بلکہ بالی وڈ کے کچھ اداکار بھی دیکھے گئے۔۔۔ صرف 6 ڈالر میں ایک نہایت لذیذ پلاؤ کا ڈھیر، چکن یا لیمب کا خستہ گوشت، سلاد، مختلف ساس، ایک پکوڑا اور مرچیں۔۔۔کھوکھے پر ”حلال گائز“ درج ہے اور یہاں بھی یہ خوراک دو لوگوں کے لیے کافی ہو سکتی ہے۔ نہ صرف مقامی مسلمانوں بلکہ امریکیوں اور سیاحوں کی یہ پسندیدہ طعام گاہ ہے۔۔۔ ہر آدھ گھنٹے کے بعد جانے کہاں سے ایک ویگن آتی ہے جو پلاؤ سے لبریز ہوتی ہے اور وہاں کام کرنے والے عرب بھائی اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ بدتمیز ہو جاتے ہیں اور پھر بھی عاشقان پلاؤ میں کچھ کمی نہیں آتی اور ہاں یہ مصری بردار باریش ہیں اور ان کے اس عارضی ریستوران سے ہمہ وقت قرآن پاک کی قرأت بلند ہوتی رہتی ہے یعنی اس امریکہ کے دل میں جسے ہم شب و روز لعن طعن کرتے رہتے ہیں، اس کی تباہی کی دعائیں مانگتے رہتے ہیں وہاں بھرے نیویارک میں قرآن پاک کی قرأت پر کبھی کوئی اعتراض نہیں کرتا بلکہ قریبی فٹ پاتھ پر نماز بھی ادا کی جاتی ہے۔۔۔ اور پاس سے گزرنے والے ان کے احترام میں ذرا پرے ہو کر گزرتے ہیں۔ کسی کی جرأت نہیں کہ وہ معترض ہو سکے۔ امریکہ کا عراق اور افغانستان میں گھناؤنا پن بے شک قابل نفرت ہے، اس کا گھمنڈ اپنی جگہ لیکن امریکہ کے اندر شاید دنیا بھر میں سب سے زیادہ مذہبی آزادی ہے۔۔۔ نیو یارک کا محمد بُوٹا ڈھولچی رمضان کے دنوں میں مسلمان علاقوں میں سحری کے وقت ڈھول بجانے لگتا ہے اور وہاں مقیم دیگر مذاہب کے لوگ صبح سویرے زبردستی جگا دیئے جانے پر مقامی حکام سے احتجاج کرتے ہیں تو بُوٹا سے گزارش کی جاتی ہے کہ پلیز ایک تو ڈھول ذرا آہستہ بجائیے اور ذرا چند لمحوں کے لیے بجائیے کہ یہ آپ کا مذہبی فریضہ ہے ہم آپ کو امریکی آئین کے مطابق روک نہیں سکتے۔۔۔ آپ آگاہ ہوں گے کہ ہمارے بہت سے لیڈران کرام اور صحافی جو دن رات گو امریکہ گو الاپتے ہیں وہ نہایت باقاعدگی سے اپنے بچوں سے ملنے امریکہ جاتے ہیں، انہوں نے اپنے بچوں کو سعودی عرب یا مصر وغیرہ میں نہیں امریکہ میں سیٹل کیا ہے۔۔۔ بس تھوڑے لکھے کو بہت جانیں۔۔۔ میری بیٹی عینی کی ایک ویت نامی کولیگ ہے اور وہ ایک بدھ راہبہ ہے، اس نے سر منڈا رکھا ہے اور ڈیوٹی سے واپسی پر بُدھ مندر میں عبادت کرتی رہتی ہے۔ میں اس سے پیشتر تذکرہ کر چکا ہوں کہ فلاڈیلفیا کے قریب ایک سر سبز پہاڑی پر شمالی امریکہ میں دفن واحد مسلمان صوفی بابا محی الدین کا مزار ہے جہاں میلہ لگا رہتا ہے، اس پہاڑی کے دامن میں پھیلے ہوئے علاقے میں بنیاد پرست عیسائیوں کے قصبے ہیں جو آمش کہلاتے ہیں اور تمام جدید ایجادات سے پرہیز کرتے ہوئے آج بھی گھوڑوں کے ساتھ کاشتکاری کرتے ہیں۔ کاروں کی بجائے بگھیوں میں سفر کرتے ہیں، پورے بدن کو ڈھانپ لینے والے سیاہ لباس پہنتے ہیں اور نورانی طرز کی طویل ڈاڑھیاں رکھتے ہیں۔ شراب اور موسیقی سے پرہیز کرتے ہیں۔۔۔ یعنی ایک مسلمان صوفی کے مزار کے سائے میں ایک بنیاد پرست عیسائی کمیونٹی۔۔۔ دونوں اپنے اپنے عقیدے پر قائم۔۔۔ آج تک کبھی کچھ اختلاف نہیں ہوا۔ بابا محی الدین کے آستانے سے پانچ وقت اذان کی صدا اس وادی میں گونجتی ہے۔

یہ جو یورپی تہذیب ہے اس نے دنیا بھر میں اگر غلبہ پایا تو یہ نہیں کہ وہ دانش میں افضل تھے۔ یہ اس کی تنظیم اور انتظامی سوچ کی اہلیت تھی۔۔۔ کسی نے لارڈ کلائیو سے پوچھا تھا کہ آپ نے کیسے نواب سراج الدولہ کو شکست دی جبکہ اس کی فوج آپ سے کئی گنا بڑی تھی، اس کے پاس ہاتھی تھے اور سینکڑوں توپیں تھیں تو اس نے کہا تھا کہ میرے پاس تنظیم تھی اور اس کے پاس افراتفری۔ وہ اپنے خیمے میں پوشیدہ جنگ کے احکام جاری کرتا تھا اور میں خود میدان جنگ میں تھا۔ میرا ہر سپاہی تربیت یافتہ اور میرے ابرو کے اشارے کو سمجھنے والا تھا۔۔۔ میرے پاس صرف تنظیم تھی۔ اور آج بھی یہی صورت حال ہے۔۔۔ وہ ہم پر محض تنظیم کی صلاحیت کی وجہ سے غالب رہتے ہیں۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال۔۔۔ آپ مسکرائیے گا نہیں میں سنجیدہ ہوں امریکہ کے فاسٹ فوڈ آؤٹ لیٹ ہیں، میکڈونلڈ، کے ایف سی، ڈنکن ڈونٹس اور۔۔۔

وغیرہ۔۔ یہ ادارے کتنی بدمزہ اور فضول خوراکیں مہیا کرتے ہیں لیکن دنیا میں کہیں بھی چلے جائیے، چین میں ، روس یا منگو لیا میں اُن کی خوراک کا معیار ایک ہو گا اور ان کے غسل خانے شفاف ترین ہوں گے۔
پاکستان کے موٹروے پر بھی۔۔ بلکہ جب مجھے ماسکو سٹیٹ یونیورسٹی نے مجھے لیکچرز کے لیے مدعو کیا تو ٹالسٹائی کی ریاست کی جانب سفر کرتے ہوئے جب میں نے میزبانوں سے درخواست کی کہ براہ کرم کہیں ٹھہرئیے مجھے اپنے آبی بوجھ سے نجات حاصل کرنا ہے تو انہوں نے کہا تارڑ صاحب تھوڑا سا صبر کر لیجیے اگلے قصبے میں ایک میکڈونلڈ ہے اور وہاں کے واش روم نہایت اعلیٰ ہوتے ہیں۔
تو یہ صرف تنظیم اور معیار کی برقراری ہے جو انہیں غلبہ عطا کرتی ہے۔
اس کی ایک مثال ”رائس ٹو رچز“ کا آؤٹ لیٹ ہے۔۔ جو ان کی قوت اختراع سے بین الاقوامی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور وہاں کیا ہے؟ وہی لاہوری کھیر لوہاری دروازے کے باہر فروخت ہونے والی محض کھیر۔۔ لیکن درجنوں مختلف ذائقوں کی کھیر۔

4/11/12

بگلا بھگت اور بے حجاب مچھلیاں

مستنصر حسین تارڑ

یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم فلوریڈا کے اور امریکہ کے جنوب کے آخری جزیرے کی ویسٹ میں ہوتے اور اس سمندر میں، جس میں ٹینسی ولیمز، ہیمنگوے، جیک کینیڈی، ہیری ٹرومین، بل کلنٹن وغیرہ ڈبکیاں لگاتے تھے اس سمندر میں ہم اشنان نہ کرتے۔۔ اس سے پیشتر ہم مراتھون کے کچھ ساحلوں پر بے حد بدمزہ ہوئے تھے کہ ان کے پانیوں میں سمندری کائی اتنی بہتات میں تھی کہ وہ بدن سے چمٹ جاتی اور ہم نہا کر باہر نکلتے تو ایک نیم سیاہ جنگلی پودا لگتے۔ کی ویسٹ کا سمندر صاف ستھرا اور نکھرا ہوا تھا اور ہم، یعنی بلال، نوفل اور میں نہایت اشتیاق سے اس میں داخل ہوئے۔ پانی تو بے حد شفاف اور نیلگوں کروٹوں والے تھے لیکن اس کی تہہ میں ریت کی بجائے کنکر تھے۔۔ چونکہ دیگر خواتین و حضرات تو پانی کی سطح پر تیرتے تھے لیکن میں اس میں چلتا تھا تو ان کنکروں نے بے حد اذیت دی۔۔ مجھ سے جب کبھی کسی نے پوچھا کہ آپ سوئمنگ کر سکتے ہیں تو میں نے ہمیشہ عرض کیا کہ اگر مجھے گہرے پانیوں میں دھکیل دیا جائے اور کنارا صرف دو ہاتھ کے فاصلے پر ہو تو میں غوطے کھاتا، ہاتھ پاؤں مارتا ڈوبنے سے بچ سکتا ہوں، میرا کمالِ تیراکی بس یہیں تمام ہو جاتا ہے۔۔ اور یہ مشاقی بھی اس عمر میں جبکہ پورا بدن ماشکی کی مشک کی مانند پھول چکا ہے مفقود ہو گئی ہے چنانچہ میں سوئمنگ نہیں کرتا، پانی میں ایک موٹے بگلے کی مانند کھڑا رہتا ہوں اگرچہ آس پاس مچھلیاں تو وافر ہوتی ہیں اور بے حجاب ہوتی ہیں لیکن انہیں دبوچنے کے دن گزر گئے۔۔ پانی میں اترے ہوئے ابھی چند لمحے گزرے تھے کہ ہم سے کچھ دور آسمان پر ایک تیز روشنی سی لہرائی اور پھر ایک دھماکا ہوا اس کے ساتھ ہی بادل گرجنے لگے۔۔ ابھی دھوپ تھی اور ابھی سمندر ایک سائے تلے آ کر نیم سیاہ ہونے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ بیشتر تیراک پانیوں میں سے نکل کر ساحلوں کا رُخ اختیارکر رہے ہیں اور سمندر میں لوگ کم ہوتے جاتے ہیں۔ بلال نے میرے نزدیک آ کر کہا ”انکل۔۔لگتا ہے کہ کوئی چھوٹا موٹا سمندری طوفان آ رہا ہے۔۔ یہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں۔۔ علاوہ ازیں سمندر پر بجلی گرنے کا امکان بھی ہوتا ہے تو نکل چلیں“۔۔ میری قومی حمیت اور غیرت نے گوارہ نہ کیا کہ میں ایک امریکی سمندری طوفان سے ڈر کر راہ فرار اختیار کروں چنانچہ میں نے اپنی توند پر ایک دھپ لگا کر کہا، برخوردار ہم تو طوفانوں کے پالے ہوئے ہیں اور ہم نے تو بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑا دیئے تھے، ہم ان معمولی طوفانوں سے ڈرنے والے نہیں ہیں“۔۔ اس دوران میں نے دیکھا کہ سمندر تقریباً خالی ہو چکا ہے اور سوائے ہمارے اور دوچار دیگر ناعاقبت اندیش تیراکوں کے اور سب کے سب ساحل پر جا چکے ہیں۔ کچھ لمحوں کے بعد افق پر پھر بجلی کے کوندے لپکے اور ایک ایسا دھماکا ہوا کہ میری دونوں ٹانگیں لرز کر جل ترنگ بجانے لگیں۔۔ اس پہلے دھما کے کو تو میں برداشت کر گیا لیکن فوراً بعد جب ایک اور ملفوف سا دھما کہ بادلوں میں سے ظاہر ہو کر سمندر پر گرا تو میں نے قومی حمیت اور غیرت وغیرہ سے بصد ادب معذرت کر

کے راہ فرار اختیار کی۔
مراتھون سے چار روز کے قیام کے بعد جب ہم میامی کے راستے آرلینڈو کے سفر پر نکلے تو صرف ایک قلق تھا کہ ہم اپنے ریسارٹ کے برابر میں واقع "کچھووں کے ہسپتال" کو نہ دیکھ سکے۔۔ اس ہسپتال میں نہ صرف بیمار اور بوڑھے کچھووں کا علاج کیا جاتا ہے، بلکہ لاوارث کچھووں کی دیکھ بھال بھی ہوتی ہے اور جب وہ پوری طرح صحت یاب ہو جاتے ہیں تو انہیں سمندر میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ کچھوے جنہیں پنجابی میں کچھوکومے کہا جاتا ہے ان کے ساتھ میرے تعلقات بچپن کے کچھ دنوں میں خوشگوار رہے لیکن جب گکھڑ منڈی کے جوہڑ میں سے مچھلیاں پکڑتے ہوئے یہ کچھوے میری کنڈیاں ہڑپ کرنے لگے تو میری ان کے ساتھ مخاصمت کا آغاز ہو گیا۔۔ اس کے باوجود میری ڈرامہ سیریل "ہزاروں راستے" میں عرفان کھوسٹ ہمیشہ ایک "کاشوکوما" اپنی جیب میں رکھتا تھا اور اپنی محبوبہ پیرین کوہر کو بھی جب پیار سے مخاطب کرتا تھا تو "کاشوکومی" کہتا تھا۔
حسب وعدہ واپسی پر بلال نے مجھے میامی کی ساؤتھ بیچ پر نہلایا اور پھر ہم نے ایک ساحلی ریستوران میں ناشتہ کر کے گھر کا راستہ اختیار کیا۔ ہم سب فلوریڈا کی تیز دھوپ اور اس کے سمندروں میں دن رات تیرتے قدرے نیم سیاہ ہو چکے تھے۔۔ کچھ روز بعد رمضان کا آغاز ہو گیا۔۔ عینی کے گھر میں ایک مقدس ماحول اتر آیا۔ یہاں تک کہ اس نے میری فرمائش پر عجیب قسم کے پراٹھے سحری کے لئے بنانے شروع کر دیئے اور ایسے پراٹھے صرف ایک ڈاکٹر لڑکی ہی بنا سکتی تھی کہ ان میں ذائقہ کم اور غذائیت زیادہ تھی۔ اس کے باوجود میں صرف ایک ایک روزہ رکھ کر ریٹائر ہو گیالیکن افطار پارٹیوں میں نہایت خشوع و خضوع سے شریک ہوتا رہا۔۔ بقیہ تمام خاندان نے باقاعدگی سے روزے رکھے۔۔ اور پھر وہ دن آ گیا کہ ہمیں ایک مرتبہ پھر اپنی بیٹی اور نواسے سے بچھڑنا تھا۔ نوفل کے اندر محبت کا ایک جزیرہ ہے جسے وہ ظاہر نہیں کرتا لیکن ہماری روانگی سے کئی روز پیشتر وہ چپ ہو گیا۔ اس کی عینک بار بار ناک سے پھسلتی تھی اور وہ کہتا تھا "نانا۔۔ آپ نے کیوں پاکستان جانا ہے۔۔ میں یہاں ہوں۔۔ امی ابو بھی یہاں ہیں تو پاکستان کیوں جانا ہے"۔۔ اور میں کہتا "بیٹے ہم آپ کے پاس پورے ڈیڑھ ماہ رہے ہیں۔۔ اب دو ہفتوں کے لئے نیویارک میں سلجوق ماموں کے پاس جائیں گے اور پھر پاکستان میں سمیر ماموں ہیں، یاشر اور طلحہ ہیں" لیکن نوفل کی تسلی نہ ہوتی اور وہ کہتا "میرا جی چاہتا ہے کہ میں یاشر ہوتا اور آپ میرے پاس سوتے"۔
ہم دونوں نیویارک کے ایک ائیرپورٹ پر اترے تو سلجوق کو پہچان نہ سکے کہ اس نے خوراک پر قابو پا کر صرف سلاد اور ابلی ہوئی سبزیوں پر گزارہ کر کے اپنے آپ کو اتنا چھریرا اور سمارٹ کر لیا تھاکہ دور سے وہی بچہ لگتا تھا جو چھٹی کے وقت کیتھڈرل سکول میں سے نکل کر باہیں پھیلائے میری جانب لپکتا چلا آتا تھا۔ اس چھریرے پن کا اسے شدید مالی نقصان ہوا تھا کہ اس کی پوری وارڈ روب بیکار ہو گئی تھی اور اس نئے کپڑے خریدنے پڑے تھے۔ اس کے ہمراہ اس کا بچپن کا دوست، ایک عرصے سے نیویارک میں مقیم، اب ایک کروڑ پتی ہو چکا دوست۔۔ علی۔۔ تھا، اور اگلے ہفتے کینیڈا میں اس کی پھر سے شادی ہونے والی تھی۔
مین ہٹین کے فرسٹ ایونیو میں،54 نمبر سٹریٹ میں سینٹ جیمز ٹاور کی پانچویں منزل پر واقع سلجوق کے فلیٹ میں اس کی بیگم رابعہ اور ہماری اولین پوتی مشال اور چھوٹا ابراہیم ہمارے منتظر تھے۔ ہماری آمد کی خوشی میں ان دونوں نے خوب چیخیں ماریں، فلیٹ کی ہر شے کو اتھل پتھل کر دیا اور پھر ہم سے لپٹ کر ہمیں چومنے لگے۔۔ صرف یہ کہ وہ اظہار محبت امریکی انگریزی میں کرتے تھے اور ہم اس کے جواب میں صرف غوں غاں کرتے تھے۔۔ بس یہی ہماری عمر بھر کی کمائی تھی، ہمارے بچوں کے بچے۔
ابو۔۔ اس عجیب سے مصور ممتاز حسین کے بہت سے فون آ چکے ہیں۔ کل کوئین میوزیم میں بلّھے شاہ " کے حوالے سے ایک تقریب ہے اور آپ کو صدارت کرنی ہے، یاد ہے؟" اور اگلے روز بلّھے شاہ نیویارک میں تھا۔
گل سمجھ وچ آ گئی تے رولا کیہہ
اے رام رحیم تے مولا کیہہ۔۔

18/1/13

مستنصر حسین تارڑ

کچھ مزید محبوب جو پہچانے نہیں جاتے

میں نے اپنے گزشتہ کالم میں اپنے عہد کے ان" محبوبوں،، کا تذکرہ خصوصی طورپر کیا تھا جنہوں نے کسی نہ کسی ٹیلی ویژن ڈرامے میں میرے مقابل ہیروئن کا کردار ادا کیا تھا، اور ان سے میری رسم و راہ تھی لیکن اس عہد میں لوگوں کے اور بھی محبوب تھے جن میں خاص طور پر فلمی ہیروئنیں شامل تھیں، اور لوگ کس طرح ان سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے اس کا بیان ممکن نہیں، ان میں سے بیشتر محبوب تو راہی ملک عدم ہو چکے اور جو دوچار ابھی زندہ ہیں ان کی طرف دیکھا نہیں جاتا...

لاہور میں ایک درزی تھے اور اپنے فن میں نہایت ماہر تھے ، موصوف فلم سٹار ثریا پر بری طرح عاشق تھے۔ ان کے درزی خانے اور گھر کی دیواروں پر ثریا کی اخباروں رسالوں سے کاٹی ہوئی تصویریں چسپاں تھیں اور گراموفون پر ثریا کے گائے ہوئے گیت بجتے رہتے تھے... وہ سارا سال ثریا کے لئے مختلف عروسی جوڑے اور لباس تیار کرتے رہتے اور پھر سہرہ باندھ کر اپنے چند دوستوں کی برات بنا کر وہ جوڑے سوٹ کیس میں سجا کر ثریا کو بیاہنے کی خاطر بمبئی روانہ ہو جاتے...

وہاں سے ایک بینڈ کا بندوبست کرتے اور دولہا بنے ثریا کے گھر جا پہنچتے...ملازم دریافت کرتے کہ یہاں آپ کس سلسلے میں آئے ہیں تو سہرے کی اوٹ میں شرماتے ہوئے کہتے...ثریا سے شادی کرنے آیا ہوں... ظاہر ہے ان کی مناسب گو شمالی کی جاتی، قدرے زدوکوب کیا جاتا اور وہ اور ان کے دوست ٹھنڈے ٹھنڈے لاہور واپس آجاتے، واپسی پر وہ پھر سے ثریا کے لئے عروسی جوڑے بنانے میں جت جاتے، اور اگلے برس پھر سے بارات لے کر بمبئی جا پہنچتے... اسے کہتے ہیں بے غرض اور پاک محبت...ثریا ان دنوں ہالی ووڈ کے اداکار گریگوری پیک سے یکطرفہ الفت کی پینگیں بڑھا رہی تھیں

وہ بھلا لاہور کے ایک نامراد عاشق کو کہاں لفٹ کرواتی میرے اپنے ایک قریبی عزیز چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے کہ یکدم شاید کانن بالا پر عاشق ہوگئے، عظیم گلوکار محمد رفیع جو ایک خالص اندرون شہر کے لاہوریئے تھے ان کے کلاس فیلو تھے اور ظاہر ہے ابھی نامور نہ ہوئے تھے وہ بھی اس کانن بالا کی محبت میں گرفتار تھے چنانچہ دونوں نے سائیکلیں ایک آنہ فی گھنٹہ کے حساب پر کرائے پر لیں اور ان کے پیڈل مارتے ہوئے بمبئی روانہ ہوگئے... امرتسر کے قریب اس قریبی عزیز کے والد صاحب کے دوست نے انہیں پہچان لیا اور کان پکڑ کر واپس لاہور لے آئے۔

میرے ایک عزیز دوست ہیں کرنل دلنواز دل...کلاسیکی انداز کے عمدہ شاعر اور ہائکو شاعری میں کمال رکھنے والے، موصوف نے ایام جوانی میں آڈرے ہیپ برن کو" رومن ہالیڈے،، میں دیکھا اور مرمٹے۔ بقیہ عمر اس کے نام کی مالدجپتے رہے، پیرس کے پس منظر میں لکھا گیا میرا ناول" پیار کا پہلا سر،، ان کو بھا گیا اور کہنے لگے میں اس ناول پر فلم بناؤں گا...خبر دار جو اس ناول کے حقوق کسی اور کو دیئے...اور یہ ہے ایڈوانس رقم، کرنل صاحب نے جیب سے بٹوہ نکال کر دس دس کے دو نوٹ میری طرف بڑھا دیئے، کہنے لگے" اگر یہ کم ہیں تو میں دس روپے اور دے سکتا ہوں، اور وہ بے حد سنجیدہ تھے اور اس سنجیدگی کی ایک علامت یہ تھی کہ ان کی بائیں مونچھ پھڑک رہی تھی، میں نے جان چھڑانے کی غرض سے کہاکہ کرنل صاحب آپ دوست ہیں بھلا دوستوں میں ایڈوانس وغیرہ کی کیا ضرورت ہے" پیار کا پہلا سُر،، آپ کا ہوا لیکن یہ فرمایئے کہ اس کی کاسٹ کیا ہوگی مثلاً سنان کے رول میں کون اداکار ہو گا" انہوں نے اب بائیں کی بجائے دائیں مونچھ پھرکائی اور کہنے لگے،، میں ہوں گا اور کون ہوگا، اور ان زمانوں میں واقعی وہ کچھ کچھ کلارک گیبل لگتے تھے۔

چلئے ہیرو کا تو فیصلہ ہوگیا لیکن پاسکل کے رول میں آپ کسے کاسٹ کریں گے،، اس پر کرنل صاحب نے " آبروچڑھا کر کہا، آڈرے ہیپ برن، میں نے عرض کیا کہ کرنل صاحب آڈرے ہیپ برن تو فی زمانہ ہالی ووڈ کی سب سے مہنگی اداکارہ ہے تو وہ کیسے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس فلم میں کام کرنے کی خاطر لاہور آجائے گی تو انہوں نے مجھ پر ایک تحقیر کی نظر ڈالتے ہوئے کہا جب اسے معلوم ہوگا کہ فلم میں ہیرو کا کردار میں ادا کر رہا ہوں تو دوڑتے ہوئے آئے گی...اس معاہدے کو تقریباً چالیس برس ہونے کو ہیں...

پچھلے دنوں کسی ٹیلی ویژن چینل نے مجھ سے رابطہ کیا کہ وہ " پیار کا پہلا سُر،، پر مبنی ایک سیریل بنانا چاہتے ہیں، یہ بیل منڈھے تو نہ چڑھی لیکن میں نے یونہی کرنل صاحب سے تذکرہ کرلیا اور وہ سیخ پا ہوگئے،، تم نے مجھ سے وعدہ کر رکھا ہے کہ اس ناول کے ڈرامائی یا فلمی حقوق میرے پاس ہیں...خبر دار جو اس معاہدے کی خلاف ورزی کی، میں نے مسکراتے ہوئے کہاکہ ٹھیک ہے فلم آپ ہی بنائیں گے اگر چہ پچھلے چالیس برس سے نہیں بنا سکے تو یہ فرمایئے کہ اب ان زمانوں میں آپ کی کاسٹ کیا ہوگی!،، یاد

...رہے کہ کرنل صاحب کو ریٹائر ہوئے بھی ایک عرصہ بیت گیا
اگرچہ اب بھی ہینڈسم ہیں لیکن چلتے ہوئے ذرا لرزتے ہیں، سڑک پار کرنی ہو تو اپنے پوتے کو ساتھ لے کر آتے ہیں کیونکہ سڑک کے پار کا منظر قدرے دھندلا دکھائی دیتا ہے، ہاتھوں میں بھی لرزش کے آثار ہیں لیکن آنکھوں میں تو دم ہے... مجھ پر ایک طنز بھری نگاہ ڈال کر کہنے لگے، کاسٹ تو کب کی طے ہو چکی...یعنی میں اور آڈرے ہیپ برنہ... میں نے مناسب نہ جانا کہ ان سے عرض کروں کہ ایک کچی عمر کے نوجوان سنان کے رول میں آپ کیسے ہونگے لیکن ایک اطلاع دی" کرنل صاحب... آڈرے ہیپ برن کو کاسٹ کرنا تو قدرے ...مشکل ہوگا کہ وہ کب کی بوڑھی ہو کر مرچکی ہے
کرنل صاحب ذرا اداس ہو کر کہنے لگے " نہیں یار آڈرے ہیپ برن کیسے مر سکتی ہے... جھوٹ کہتے ہو... ایک اور جان جاں قسم کے دوست ہیں فرخ رضوی... ان کی موجودگی میں اگر کہا جائے کہ شاہ جی یہ ایشوریہ رائے، کاجل، تبو اور کرینہ کپور بھی تو خوبصورت ہیں تو وہ طیش میں آجاتے ہیں، چوہدری صاحب یہ سب تو مدھو بالا کے پاؤں کی خاک بھی نہیں... مدھو بالا کے علاوہ کسی کو حسین کہنا تو کفر ہے" محل،، یا" ترانہ،، کی مدھو بالا کا حسن تو الو ہی تھا... آسمانی تھا، چہ نسبت...اگر چہ اس نے ایک مسخرے کشور کمار سے شادی کرلی پھر بھی چہ نسبت... میں یہاں ایک اور عزیز دوست منیر شیخ کا حوالہ دوں گا، ...کشمیری ہونے کے حوالے سے خوراکوں کے شوقین
مختلف نوعیتوں کے کم از کم چھ آپریشن کروا چکے ہیں اور جب کبھی اپنی پلیٹ میں پائے انڈیلتے جاتے ہیں اور کھاتے ہی جاتے ہیں تو ہم بصد ادب ان سے اجتناب کی درخواست کرتے ہیں تو کہتے ہیں" چوہدری صاحب ...مجھے مت روکئے...زیادہ سے زیادہ ساتواں آپریشن کروالونگا
وہ فلم سٹار نمی کے پرستار اب تک ہیں ان کے خوابوں میں" داغ،، اور" آن،، کی نمی اب تک رقص کرتی ہے، ایک میگزین میں نمی کی تازہ ترین تصویر شائع ہوئی، تصویر کیا تھی گوشت کا ایک پہاڑ تھا جس میں صرف اس کی چپٹی ناک پہچانی جاتی تھی شیخ صاحب نے اس تصویر کو دیکھا تو بے یقینی سے کہنے لگے نہیں چوہدری صاحب یہ تصویر" میرا لال دوپٹہ ململ کا،، والی نمی کی نہیں، ان ہندوؤں کی سازش ہے کہ نمی اللہ کے فضل سے ایک مسلمان ہے،
ہمارے عہد کے محبوب پہچانے نہیں جاتے "

3/2/13

« مستنصر حسین تارڑ » کالم

مٹی کا قرض ادا کرنے والے پاکستانی ڈاکٹر

اگلے روز بھی ڈیٹرائٹ کی ویرانی اور بے آباد سی وسعت میں کچھ فرق نہ آیا...ہائت ہوٹل کی لابی میں چلے جایئے تو محسوس ہوتا ہے کہ آپ شاید بیروت یا قاہرہ کے کسی ہوٹل میں ہیں...ہر جانب عرب خواتین نظرآتی ہیں اور چونکہ اکثر فربہ ہوتی ہیں اسلئے زیادہ نظر آتی ہیں، اکثر حجاب پہنے ہوئے اور یہ تکلف صرف چہرے کا ہوتا ہے اس سے نیچے سراسر امریکی تناسب نمایاں ہوتے ہیں...اس دوران جب میں اپنے کمرے میں بیٹھا پچھلے دو گھنٹے سے شیشے کی کھڑکی کے ساتھ ایک کرسی لگائے اور ناک لگائے نیچے پارکنگ لاٹ کو دیکھے جا رہا تھا کہ کرنے کو اور کچھ نہ تھا تو منور جاوید اوکاڑوی کا فون آگیا...سر آپ مصروف تو نہیں ہیں؟...برخوردار یہاں میرے لئے مصروف ہونے کو ہے کیا تو بالکل مصروف نہیں ہوں...سر آپ کر کیا رہے ہیں؟ اس پر میں نے حقیقت بیان کر دی...میں پچھلے دو گھنٹے سے ہائت ہوٹل کی پارکنگ لاٹ میں پارک ہوتی کاروں کی گنتی کر رہا ہوں...ابھی ابھی ایک سو چالیسویں کار داخل ہورہی ہے...نہایت دلچسپ مشغلہ ہے...منور نے میری حالت کار پر ترس کھایا اور عارف کے ہمراہ فوراً پہنچ گیا...ہم ایک ایسے چینی ریستوران مینلنچ کے لئے گئے جو انکے بقول مکمل طورپر حلال تھا...وہاں پہنچ کر انہوں نے بوفے کی میز پر سجی خوراک کی ہر ڈش کی جانب اشارے کرکے بتایا...کہ سر...یہ اور یہ ٹھیک ہے اور یہ...پتہ نہیں کیا ہے...اور اسے نہ کھایئے گا...جب میں نے اپنی پلیٹ اٹھا کر میز کا رخ کیا تو حرام ہے یاد رہا ہو کہ کونسا حلال ہے...بہر طور جھینگے اور مچھلی وغیرہ تو حلال ہی ہوتے ہونگے، یہاں سے فارغ ہو کر وہ مجھے شاید ڈیٹرائٹ کی مٹھائیوں کی سب سے مشہور اور پسندیدہ دکان پر لے گئے اور یہاں یہ سب مٹھائیاں اس لئے بھی حلال

تھیں کہ عرب تھیں، وہاں پنیر اور سویوں سے بنی ہوئی اور شہد میں نچڑی ہوئی جو گرم مٹھائی تناول فرمائی وہ یقینا جنت سے درآمد کی گئی تھی...میں نے فیصلہ کیا کہ فلوریڈا کے لئے روانہ ہونے سے پیشتر عینی کے نئے گھر کی خوشی میں یہی مٹھائی لے کر جاؤنگا...اور وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ڈیٹرائٹ کی اس عرب مٹھائی کی دکان کا چرچا پورے امریکہ میں ہے...

خوردونوش کے بعد منور اور عارف مجھے اس دریا کے کنارے لے گئے جس کے پار کینیڈا دکھائی دے رہا تھا اور وہ پل جس پر سے آپ کار کے ذریعے یا پیدل بھی دوسرے کنارے پر کینیڈا میں داخل ہو سکتے تھے...اس پار بہت سے ایسے لوگ رہتے تھے جو مجھ سے محبت کرتے تھے...مجھ میں ایک اداسی نے گھر کیا...دریا پاررانجھن کا ڈیرہ ہے کون ہے جو میرے ساتھ چلے...کوئی بھی نہیں، چونکہ آج کی شام وہ شام تھی جسکے لئے میں نے امریکہ کا قصد کیا تھا اس لئے میں نے میزبان نوجوانوں سے درخواست کی کہ وہ مجھے واپس ہوٹل چھوڑ آئیں تاکہ سٹیج پر جو کچھ کہنا ہے اس کے لئے کچھ تیاری کرلوں...ایک خاکہ تیار کرلوں جو اتنا سنجیدہ نہ ہو کہ ڈاکٹر حضرات بیمار پڑ جائیں۔

میں اقرار کرتا ہوں کہ مجھے یہاں آنے سے پیشتر ہرگز اندازہ نہ تھا کہ ہیومن ڈویلپمنٹ فاؤنڈیشن اتنے وسیع پیمانے پر پاکستان بھر میں متحرک ہے...پچھلے چودہ برس سے تقریباً پونے دو سو سکول مردان سے لے کر ٹنڈومحمد خان تک چلا رہی ہے، ایک ہزار سے زائد اساتذہ اور استانیاں ٹرینڈ کر چکی ہے، تقریباً تیئس ہزار خاندان کے لئے طبی سہولتیں مہیا کر چکی ہے...سات سو سے زیادہ ایسے ادارے قائم کر چکی ہے جو خدمت خلق پر کمر بستہ ہیں ... دس ہزار سے زیادہ نوجوانوں کو تکنیکی تعلیم اور ملازمتیں مہیا کرچکی ہے، اور یہ سب کچھ صرف اس لئے ممکن ہوا کہ امریکہ میں مقیم پاکستانی ڈاکٹروں کی اس تنظیم نے اپنی اس دھرتی کے دکھوں کو کم کرنے کی کوشش کی ہے جس کی کوکھ میں سے انہوں نے جنم لیا...اپنی مٹی کا قرض اتارنے کی کوشش کی ہے، اپنی حق حلال کی روزی کا کچھ حصہ مادر وطن کے لئے وقف کر دیا ہے...میں صدق دل سے سمجھتا ہوناور میں نے اس شام اپنی تقریر کے دوران بھی عرض کیا کہ جب تک دنیا میں ایسے پاکستانی موجود ہیں جو اپنی سرزمین کو سنوارنا چاہتے ہیں، اپنے وقت اور اپنی کمائی کی قربانی دے کر، کسی بھی غرض سے لالچ سے ماورا...تب تک پاکستان کی سالمیت کوکوئی گزند نہیں پہنچ سکتی...

شاید پڑھنے والوں کو یہ توصیف مبالغہ آمیز محسوس ہو کہ ہم جو کرپشن اور خود غرضی میں غرق ہو چکے ہیں ہمیں یقین ہی نہیں آتا کہ دنیا میں ایسے بے غرض اور اپنی سرزمین سے ٹوٹ کر محبت کرنے والے پاکستانی ہیں اور بہت ہیں، یہ تقریب میری توقع سے بڑھ کر شاندار اور پرہجوم تھی... کم از کم چھ سات سو لوگ تو ہونگے اور سب کے سب آسودہ خوشحال...اور اپنے وطن کی چاہت میں ڈوبے ہوئے اگرچہ وہ اس چاہت کو کچھ دیر کیلئے مکمل طورپر بھول گئے جب ڈنر کے لوازمات میزوں پر سجنے لگے...آفٹر آل ان میں سے بیشتر نے تقریباً اسی ڈالر فی کس کے حساب سے اس شام کے دعوت نامے خریدے تھے...سٹیج پر بھی ڈاکٹر عالمگیر کرتا دھرتا تھے اور ڈاکٹر ہونے کے باوجود خاصی دانش ورانہ گفتگو کرتے تھے...سب سے پہلے جسے کلیدی مقرر کہا جاتا ہے یعنی کی نوٹ سپیکر...سابق ڈیمو کریٹ سینیٹر ڈیوڈ بونئر تشریف لائے اور یہ پرواہ نہ کی کہ حاضرین کھانے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں اور انہوں نے ایک پرجوش تقریر پاکستان کے حق میں کی کہ وہ ایک پاکستان سے ہمدردی رکھنے والے سیاست دان سمجھے جاتے ہیں، ان کے بعد جاوید جبار صاحب آئے...انہوں نے اپنی تصنیف شدہ انگریزی کتاب کے حوالے سے شاید سیر حاصل یا شاید مدلل گفتگو کی اور چونکہ کوئی دھیان نہ دے رہا تھا تو انہوں نے کہاکہ خواتین و حضرات دراصل آج کی شام میرا مقابلہ نہ تو سیاست دانوں سے ہو رہا ہے اور نہ ہی دانشوروں سے بلکہ روسٹ مرغوں، پلاؤ، کوفتوں اور گرم نانوں سے ہو رہا ہے اس لئے میں اپنی ہار مانتا ہوں...جاوید جبار صاحب کا تو یہ حال تھا کہ جیسے پنجابی گلوکار اور شاعر منظور جھلے نے کہا تھا کہ

واجاں ماریاں بلایا کئی وارے
کسے نے میری گل نہ سنی

...یعنی میں نے بہت آوازیں دیں بہت بار بلایا لیکن کسی نے میری بات نہ سنی
چونکہ میں ایک چالاک شخص تھا اس لئے میں سٹیج پر تب گیا جب وہ چھ سات سو حاضرین مکمل طورپر خوراک سے پر ہو چکے تھے اور اب ذرا لطف اٹھانا چاہتے تھے تو انہوں نے یعنی حاضرین نے مہربانی کی اور میری بات سن لی میں نے زندگی میں پہلی بار اس تنظیم کے لئے اپنی جھولی پھیلا دی، درخواست کی کہ میں اتنے طویل فاصلے طے کرکے یہاں تک آیا ہوں میری لاج رکھ لیجئے، اپنی نیک کمائی میں سے کچھ عنایت کر دیجئے۔
بہتوں کا بھلاہوگا اور آپکا بھی بھلا ہوگا
اس شب بہت سے لوگ طے کرکے آئے تھے کہ وہ بہر طور اس کارخیر میں حصہ لیں گے... میری یا کسی بھی جانے پہچانے شخص کی موجودگی انکے لئے کچھ اہمیت نہ رکھتی تھی، ان میں سے کچھ ایسے تھے کہ ان کی جانب سے دس ہزار ڈالر کا چیک مجھے موصول ہوتا تھا اس درخواست کیساتھ میرا نام نہ لیا جائے...مجھے گمنام رہنے دیا جائے، شاید کچھ چیک ایسے بھی تھے جن پر ایک کونے میں لکھا تھا” تارڑ صاحب...صرف آپ کے لئے،،اس شب تقریباً پونے دو لاکھ ڈالر اکٹھے ہوگئے

4/2/13

« مستنصر حسین تارڑ » کالم
شاعروں کو یادر کھنا اور نثر نگاروں کو فراموش کردینا

پچھلے دنوں ایک انگریزی اخبار کے ادبی رپورٹر نے مجھے فون کیا اور کہنے لگا تارڑ صاحب آپ ایک نثر نگار ہیں تو مجھے یہ بتایئے کہ ہمارے ہاں بڑے نثر نگاروں کی یاد میں انکی برسی یا پیدائش کے موقع پر کیوں تقریبات منعقد نہیں ہوتیں، سیمیناروں کا انعقاد نہیں ہوتا جبکہ شاعروں کے حوالے سے آئے دن تقریبات کا اہتمام ہوتا رہتا ہے...مثلاً کچھ عرصہ پہلے سعادت حسن منٹو کی برسی تھی اور کسی نے بھی ان کو یاد نہ کیا تو اس کی کیا وجہ ہے... میں نے صرف اتنا کہا کہ ہمارا معاشرہ سہل پسند ہے، شعر کے حوالے سے لمحے بھر کے ہیجان پرجان دیتا ہے...شاعری تفریح کا باعث بھی بنتی ہے اور نثر، یعنی ناول اور افسانہ وغیرہ نہ تو تفریح مہیا کرتے ہیں اور نہ ہی ان میں جذبات کا عارضی ابال ہوتا ہے... آپ منٹو کو روتے ہیں، کیا یہاں کبھی کسی نے کرنل محمد خان کو یاد کیا، شفیق الرحمن کی یاد میں کبھی کوئی تقریب منعقد ہوئی، شوکت صدیقی اور ابن انشاء کا خیال آیا، محمد خالد اختر یا احمد ندیم قاسمی کے بارے میں کوئی سیمینار ہوا؟ دراصل یہ جو یوم پیدائش اور مرنے کے دن ہیں یہ صرف شاعروں کی یاد میں منائے جاتے ہیں اور وہ بھی صرف سکہ رائج الوقت شاعروں کی یاد میں... نقاد حضرات بھی غالب، اقبال اور عہد موجود میں فیض کے طلسم سے باہر نہیں آتے کیونکہ آپ بے شک ایک مدرسی اور میکانکی نوعیت کے نقاد ہوں آپ اپنے آپ کو ماہر غالبیات ماہر اقبالیات اور ماہر فیض کہلانا چاہتے ہیں، بھلا مجید امجد، میراجی، منیر نیازی، احمد فراز، محسن احسان، احسان دانش، ظہیر کاشمیری وغیرہ کا ماہر کہلانے میں کیا اعزاز ہے... غالب، اقبال اور اب فیض نہ صرف عوام الناس بلکہ نقاد حضرات کے نرغے میں ہیں کہ انکے بارے میں تنقیدی مضامین لکھنے میں آسانی بہت ہے... غالب کے بارے میں لکھنے سے آپ کو ایک بے مثل دانشور سمجھ لیا جاتا ہے... اقبال کے بارے میں کچھ بھی تحریر کرنے سے ایک تو آپ محب الوطن ثابت ہو جاتے ہیں اور پھر یہ ایک منفعت بخش کاروبار بھی ہے کہ متعدد قومی ادبی انعام آپ کی سعی لاحاصل کے منتظر ہوتے ہیں... باقی رہ گئے فیض ...صاحب تو وہ ان دنوں فیشن میں ہیں... خاص طور پر ہمارے ماڈسکوڈ طبقے ہیں
کسی بھی محفل موسیقی میں ان کی کوئی غزل گائی جا رہی ہو تو متمول اور سرمایہ دار طبقے کی خواتین نہایت عوامی انداز میں فرش پر براجمان پان چباتی، اپنی لپ سٹک درست کرتی یوں جھوم رہی ہوتی ہیں جیسے خدانخواستہ وہ ہر شعر کو سمجھ رہی ہیں اور ایک جذب کے عالم میں ہیں...مجھے یہاں لطیفہ یاد آرہا ہے کہ بازار حسن میں ایک ادھیڑ عمر بیکار ہو چکی طوائف گلشن نام کی تھی تو اس نے اپنے کوٹھے

کے باہر ایک تختی آویزاں کر دی کہ" چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے" تو اس کاکاروبار چل نکلا... اس طور بھانت بھانت کے ادیب اور شاعر بلکہ کچھ نہ ادیب نہ شاعر دھڑا دھڑ فیض صاحب کے ساتھ اپنے دیرینہ تعلقات کے قصے قلمبند کررہے ہیں بلکہ انکے ہر شعر کی شان نزول بیان کر رہے ہیں اور معتبر ہوئے جاتے ہیں... مجھے داد دیجئے کہ میں نے ابھی تک فیض صاحب کے بارے میں کوئی کتاب نہیں لکھی حالانکہ میں تو فیض صاحب کو شعر لکھوایا کرتا تھا...

جی ہاں بہ قائمی ہوش وحواس عرض کر رہا ہوں اور تفصیل اس اجمال کی میں کہیں نہ کہیں بیان کر چکا ہوں یعنی ایک سکول ہوائے کے طورپر جب" پاکستان ٹائمز" کے دفتر کے سامنے ایک بھری دوپہر میں یکدم فیض صاحب کے آگے ایک کشکول کی مانند اپنی آٹوگراف بک پھیلا دی تو انہوں نے اس پر... ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے...لکھ کر دستخط کر دیئے... اب چونکہ مجھے قطعی طورپر علم نہ تھا اور اب بھی نہیں کہ یہ لوح و قلم وغیرہ کیا ہوتے ہیں اور ان کی مناسب پرورش کیسے کی جاتی ہے تو میں نے گزارش کی کہ فیض صاحب کوئی اور شعر لکھ دیجئے... انہوں نے نہایت تحمل سے ایک اور شعر لکھ دیا اور وہ بھی میرے پلے نہ پڑا تو میں نے کہا... سر وہ لکھ دیں رات یوں دل میں تیری کھوئی ہوئی یاد آئی... تو فیض صاحب کہنے لگے، وہ تو مجھے یاد نہیں تو میں نے شاید اسی روز یا اگلے دن کہا، یہ مجھے یاد ہے...

آپ لکھئے میں لکھواتا ہوں، چنانچہ میں انہیں شعر لکھواتا گیا اور فیض لکھتے گئے...علاوہ ازیں محض دو چار دوستوں کے ہمراہ فیض صاحب کے ساتھ کچھ رت جگے بھی ہوئے اور انہوں نے اپنا کلام اپنی خواہش کے مطابق سنایا... تو پلیز مجھے داد دیجئے کہ میں نے ابھی تک انکے بارے میں کوئی کتاب لکھ کر اپنے آپ کو معتبر نہیں منوایا... بہت سے ہم عصر ادیبوں بلکہ شاعروں کا خیال ہے کہ میں شاعروں سے بغض رکھتا ہوں اور انکا خیال درست ہے...میں مجمع باز، شاعروں کے، محفلوں کے، مزاحیہ شاعروں سے قدرے بغض رکھتا ہوں... اگرچہ میری نثر میں وہ اثر انگیزی کبھی نہ ہوتی اگر میں غالب، بلھے شاہ، شاہ حسین اور مجید امجد سے استفادہ نہ کرتا... بے شک وہ ایک سفرنامہ ہو یا ناول ان میں کہیں نہ کہیں ان شاعروں کے شعروں کی نثری تفسیر ملے گی، یہاں تک کہ " منہ دل کعبے شریف، اور" غارحرا میں ایک رات" کے بیشتر ابواب انہی شاعروں کے مصرعوں سے مستعار لئے گئے ہیں، ایک مشہور اور مقبول شاعر نے ایک بار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا کہ یار مجھے حیرت ہے کہ تم گفتگو کے دوران عمدہ شعروں کے کیسے کیسے حوالے دیتے ہو یعنی تم عمدہ شعری ذوق رکھتے ہو... تو میں نے بھی نہایت اعلیٰ شاعری کی ہے تو تم مجھے کیوں نہیں پڑھتے تو میں نے کہا، اگر تم اعلیٰ شاعری کرتے تو میں کب کا تمہیں پڑھ چکا ہوتا!

مجھے معلوم نہیں کیوں اور کس نے اور کس سلسلے میں تقریباً دس برس پیشتر مجھے پنجاب ٹورازم ڈیپارٹمنٹ کا اعزازی، ڈائریکٹر مقرر کردیا، دیگر سرکاری افسروں کے علاوہ اختر ممونکار شیرین والجی اور یہ بندہ حقیر غیر سرکاری ڈائریکٹر قرار دیئے گئے...تب میں نے ایک میٹنگ میں لاہور میں سیاحت کے فروغ کے لئے تجویز پیش کی تھی کہ جیسے لنڈن میں چارلز ڈکنز اور سینٹ پیٹرزبرگ میں دوستووسکی کے حوالے سے ٹور ہوتے ہیں اسی طور اگر لاہور میں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، امرتا پریتم، امرتا شیرگل، کہنیالال کپور، بلونت سنگھ، پطرس بخاری، خشونت سنگھ، ابن انشاء وغیرہ کے حوالے سے ایسے ٹورز ترتیب دیئے جائیں جن میں سیاحوں کو ان عظیم نثر نگاروں کی زندگی کا ایک دن یوں زندہ کیا جائے کہ انکی رہائش کہاں تھی۔

وہ گھر سے نکل کر کونسے ادبی رسالوں کے دفتروں میں جاتے تھے، کس ریستوران یاٹی ہاؤس میں بیٹھتے تھے، ان کے کون کون سے آثار باقی ہیں اور پھرانہیں ان کی زندگی اور تخلیقات پر مبنی ایک ڈاکومنٹری دکھائی جائے، اس تجویز پر عمل نہ ہونا تھا سو نہ ہوا... اگر ہم آئے دن شاعروں کو غالب ، اقبال اور فی الحال فیض کو ہی یاد رکھتے ہیں اور شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر، سعادت حسن منٹو، شوکت صدیقی، ابن انشاء، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، پطرس بخاری اور احمد ندیم قاسمی، اے حمید اور اشفاق احمد کو بھول گئے ہیں تو ہم کیسے بدنصیب اور کورذوق لوگ ہیں۔

« مستنصر حسین تارڑ » کالم

میری ٹیلی ویژنی حماقتیں

میرے جیسے فرسودہ اور بیکار ہوچکے ٹیلی ویژن کے اداکار بیتے دنوں کی یاد میں ہمیشہ آہیں بھرتے رہتے ہیں، اپنے ماضی کے کارناموں کو کوئی سنے یا نہ سنے بیان کرتے رہتے ہیں کہ جناب فلاں ڈرامے میں میں نے جب شہنشاہ بابر کا کردار اداکیا تو یقین مانئے بابر کی روح کابل میں واقع اپنے مزار سے نکل کر میرے آس پاس منڈلانے لگی کہ واہ... میں کیا بابر تھا...بابر تو تم ہو...وغیرہ...لیکن میرا معاملہ کچھ الگ ہے کہ مجھے ہمیشہ اپنے ٹیلی ویژن ڈراموں کی حماقتیں یاد آتی ہیں کہ میں کیا ہی بیہودہ قسم کا اداکار ہوا کرتا تھا...شکر ہے ان دنوں ابھی بش پر جوتے پھینکنے کا رواج نہیں تھا ورنہ ناظرین مجھ غریب کے ساتھ بھی یہی سلوک روا رکھتے لیکن خوش قسمتی سے ان حماقتوں کا کوئی ریکارڈ نہیں، چنانچہ ہماری جان بچ گئی...

ایک ڈرامہ تھا اور ان دنوں لاہور ٹیلی ویژن سٹیشن لاہور ریڈیو سٹیشن کے پچھواڑے میں واقع ایک دو کمروں پر مشتمل ہوتا تھا...تو وہاں محمد نثار حسین اس ڈرامے کے ہدایت کار تھے...

منظر کچھ یوں تھا کہ میں ایک عیاش طبع امیر شخص کے روپ میں نہایت بے رخی سے ایک سگار پیتا دھویں کے بادل منہ سے برآمد کرتا ہوں اور ایک خاتون سنگھار میز کے سامنے براجمان اپنی نوک پلک درست کرتی بالوں میں کنگھی کر رہی ہیں اور ایک طویل مکالمے میں مجھے کوس رہی ہے کہ تم میری مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہو...مجھ سے محبت نہیں کرتے شادی نہیں کرتے، تحفے دے کر ٹرخا دیتے ہو یاد رکھو عورت جب بدلہ لینے پر اتر آئے تو... اس دوران کیمرہ مسلسل میرے چہرے پر ذوم ان کر رہا ہے، قریب آرہا ہے اور میں اس طویل مکالمے کے اختتام پر صرف اتنا کہتا ہوں میرا شوفر تمہیں گھر چھوڑ آئے گا ریکارڈنگ شروع ہوئی، اس خاتون اداکارہ نے اپنے طویل مکالمے نہایت مہارت سے ادا کئے، اب میرا چہرہ اور سگار سکرین پر بگ بگ کلوز میں تھا چنانچہ میں سگار کا ایک اور کش لگا کر نہایت مکاری سے کہتا ہونمیرا شوہر تمہیں گھر چھوڑ آئے گامحمد نثار حسین مجھ سے نہایت خفا ہوتا ہے اور مسکرا بھی رہا ہے تارڑ تم نے واضح طور پر کہنا ہے کہ ...میرا شوفر تمہیں گھر چھوڑ آئے گا شوہر نہیں میں مناسب معذرت کرتا ہوں، منظر دوبارہ شروع ہوتا ہے اور میں دل ہی دل میں گردان کررہا ہوں... میرا شوفر تمہیں گھر چھوڑ آئے گا...میرا شوفر... اور جب بالآخر اس طویل مکالمے کے بعد میری باری آتی ہے تو میں کہتا ہوں...میرا...شوہر تمہیں گھر چھوڑ آئے گا...نثار اپنے بال نوچتا ہوا غصے میں آجاتا ہے...جب یہ منظر تیسری بار شروع ہوا تو میں نے کہا، میرا شو...شو...فر...تمہیں گھر چھوڑ آئے گا۔

قصہ مختصر کوئی ساتویں ٹیک میں جا کر میں کہہ سکا کہ میرا شوفر...اور اس کا لہجہ بھی شوہر ہی لگتا تھا... ایک اور ڈرامے میں حسب معمول میں ایک امیر اور عیاش شخص کا کردار ادا کر رہا ہوں...مرحوم ادیب میرے سیکرٹری ہیں...ڈرامہ سورج کو ذرا دیکھ انور سجاد کا تحریر کردہ... میں نے اپنے وسیع گھر میں ایک کاک ٹیل پارٹی کا اہتمام کر رکھا ہے...جی ہاں ان دنوں شراب نوشی کے منظر جائز تھے...ایک خوبصورت لڑکی اور ان دنوں مدیحہ گوہر واقعی خوبصورت تھی پارٹی میں داخل ہوتی ہے اور میں اپنا جام میز سے اٹھا کر ایک گھونٹ بھرتا ہوں اور اپنے سیکرٹری سے پوچھتا ہوں کہ...یہ لڑکی کون ہے؟...کیمرے حرکت میں آتے ہیں، ریکارڈنگ کا آغاز ہوتا ہے، مدیحہ داخل ہوتی ہے اور میں جام اٹھا کر گھونٹ بھرتا ہوں اور اپنے سیکرٹری سے پوچھتا ہوں، یہ لکڑی کون ہے؟

یہاں بھی ہدایت کار نثار ہے...دوسری بار یہ لڑکڑی کون ہے؟ کہہ جاتا ہوں اورتیسری بار یہ تو کہہ جاتا ہوں کہ یہ لڑکی کون ہے لیکن اس سے پیشتر بے دھیانی میں جام کی بجائے ایک چائے دانی اٹھا لیتا ہوں... تو یہاں بھی خاصے بے عزت ہوئے...صفدر میر کا سیریز آخر شب اور ڈرامہ جلال الدین خلجی ہم گھنی سفید داڑھی لگائے، سر پر تاج شاہی سنبھالتے لباس فاخرانہ میں ملبوس تخت پر جلوہ افروز ہیں۔ دائیں بائیں بزرگان دین اور مؤدب درباری سرجھکائے کھڑے ہیں، ایک باغی شہزادے کو پیش کیا جاتا ہے اور ہم اسے مخاطب کر کے

بلامبالغہ دو صفحوں پر محیط ڈائیلاگ شاہانہ کروفر سے ادا کرتے ہیں جن میں بار بار بنگال اور دکن کی مہمات اور ان کی تکنیکی تفصیل آتی ہے لیکن ہم اس کٹھن مرحلے سے گزر جاتے ہیں اور صرف اشارہ کرتے ہیں کہ اس شہزادے کو حراست میں لے لیا جائے، شاہی جلاد کا کردار ایک ناتواں سے اداکار ملک صاحب ادا کر رہے ہیں اور وہ آگے بڑھ کر سپاہیوں کو حکم دیتے ہوئے صرف اتنا کہتے ہیں کہ پکڑ لو...لیکن میری طویل تقریر کے بعد وہ گڑبڑا جاتے ہیں اور کہتے ہیں پکڑ پکڑ لو ...میں سرتھام کر رہ جاتاہوں کہ میں نے پچھلی پوری شب ان مکالموں کو رٹنے میں گزار دی تھی، سیٹ پر موجود اداکار اور سٹاف کے لوگ ملک صاحب کی اس حماقت پر ہنسنے لگتے ہیں، لیکن نثار غصے میں ہے، منظر دوبارہ شروع ہوتا ہے، میں پھر سے مناسب جاہ وجلال سے گرجتے ہوئے وہ طویل مکالمے بخوبی ادا کرکے اشارہ کرتا ہوں تو ملک صاحب آگے بڑھ کر کہتے ہیں پکڑ لو لو...

تیسری بار وہ آگے بڑھ کر نہایت رعب سے کہتے ہیں پھڑ لو...نثار کا بلڈ پریشر عروج پر ہے... چوتھی بار میں پھر سے اپنے مکالمے ادا کر رہا ہوں اور اختتام کے قریب ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ مرے بائیں جانب عاصم بخاری نہایت متشرع داڑھی میں پیٹ پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں اور ان کا پیٹ ہولے ہولے ہل رہا ہے اس لئے کہ وہ ملک صاحب کے متوقع پکڑ لو کی توقع میں اندر ہی اندر ہنس رہے ہیں اور اس ہنسی کو روکنے کی خاطر اپنے آپ پر جبر تو کرتے ہیں بلکہ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کوشش میں انہوں نے اپنے آپ کو کاٹ لیا خون آلود کرلیا لیکن پیٹ ہلتا رہا... اب مجھے بھی ہنسی کا دورہ پڑنے والا تھا لیکن میں نے اپنے آپ کو بمشکل روکے رکھا اور مکالمے بولتا رہا...لیکن جب عاصم بخاری کے ہلتے ہوئے پیٹ سے توجہ ہٹانے کے لئے دائیں جانب دیکھا تو میرے درباری اداکار شاہنواز اور ظفر مسعود اگر چہ ہاتھ باندھے سرجھکائے مؤدب کھڑے ہیں لیکن...وہ بغیر آواز کے کھی کھی کر رہے ہیں جس پر ان کا کچھ اختیار نہیں اور یہ وہ لمحہ تھا جب میں اپنے طویل ڈائیلاگ کے آخرمیں کہہ رہا تھا کہ دکن اور بنگال کی مہمات میں ہم نے فتح حاصل کی اور دشمنوں کو زیر کر کے کہا...ہی ہی...کھی کھی...میری بھی ہنسی نکل گئی اور میں قہقہے لگانے لگا... نثار نے صرف مجھ پر عتاب نازل کیا کیونکہ کیمرہ صرف مجھ پر تھا اور وہ نہیں جانتا تھا کہ میرے آس پاس ہنسی کی کیسی کھلبلی مچی ہے اور موٹے پیٹ کیسے ہل رہے ہیں۔

اور میں وہ سانحہ تو بیان کر چکا ہوں جب میں سراج الدولہ ایک زندان میں محبوس زنجیروں سے جکڑا ہوا ہوں اور میرے پیٹ میں تلوار گھونپ کر مجھے قتل کردیا جاتا ہے اور میری بیوی میری لاش سے لپٹ کر اتنا روتی ہے کہ میں مسکرانے لگتا ہوں، اور نثار ایک مرتبہ طیش میں آکر منظر کٹ کرتا ہے اور کہتا ہے، یار تم کبھی بھی ایک بڑے اداکار نہیں بن سکتے...تم قتل ہو چکے ہو اور تمہاری لاش مسکرا رہی ہے اور میں معذرت کرتا ہوں کہ نثار میری بیوی کو کہو کہ وہ یوں مجھ سے لپٹ کر بھوں بھوں کر کے روئے نہیں...ذرا فاصلے پر کھڑی ہو کر بے شک آنسوؤں کے دریا بہا دے...علاوہ ازیں کچھ اور حماقتیں بھی ہیں جن کا بیان آئندہ

7/2/13

مستنصر حسین تارڑ » کالم »
مبالغے کی بادشاہت

ہم مبالغے کے بادشاہ ہیں، یعنی کہ اسے ادبی انداز میں کہا جا سکتا ہے کہ ہم مبالغے میں ید طولےٰ رکھتے ہیں... ہم زیب داستان کے لئے کچھ نہیں بڑھاتے بلکہ اتنا کچھ بڑھاتے ہیں کہ داستان غائب ہو جاتی ہے اور مبالغے کے پلندے باقی رہ جاتے ہیں، ہم جب تک کسی سیاستدان، ادیب مصور، شاعر یا کھلاڑی کو کوئی خطاب نہ دے لیں ہماری تسلی نہیں ہوتی... ہماری تاریخ میں صرف ایک شخص تھا جو اس خطاب کا حقدار تھا جو اسے عوام نے عطا کیا اور وہ ہے محمد علی جناح قائداعظم۔ ان کے بعد جتنے بھی آئے اور اہم لوگ آئے لیکن وہ اتنے عظیم نہ تھے جتنا کہ خطاب عطا کرکے انہیں بنانے کی کوشش کی گئی... ہم یہاں علامہ اقبال سے بھی آغاز کر سکتے ہیں...

میرے دادا صاحب جنہیں قائداعظم سے والہانہ محبت کے علاوہ اقبال کی شاعری سے بھی عشق تھا ہمیشہ انہیں ڈاکٹر اقبال کے نام سے پکارتے۔ پھر انہیں شاعر مشرق اور حکیم الامت کے خطاب سے نوازا

گیا اور اسے صریحاً بے ادبی قرار دیا گیا اگر انہیں محض علامہ اقبال یا ڈاکٹر محمد اقبال کے نام سے یاد کیا گیا۔ میں ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ ہمارا جغرافیہ بے حد کمزور ہے...ہم جانتے ہی نہیں کہ مشرق میں پاکستان کے سوا اور کون کون سے ممالک شامل ہیں، چین، جاپان، ہندوستان، انڈونیشیا، فلپائن وغیرہ کے علاوہ ایشیا یا مشرق تو استنبول سے شروع ہو جاتا ہے بے شک وہ مشرق وسطیٰ ہی کیوں نہ ہو، وہ ہے تو مشرق...چنانچہ ہم ایران، عراق، ترکی اور شام وغیرہ کو بھی بھول جاتے ہیں، بلکہ اس میں ماضی کے آدھے سوویت یونین کو بھی شامل کر لیجئے...

ہم یہ خیال نہیں کرتے کہ ان ملکوں میں بھی تو بڑے اور عظیم شاعر ہو گزرے ہیں۔ اب ہم مشرق کی مکمل نمائندگی کرتے ہیں اور عبدالرحمن چغتائی کو بھی مصور مشرق قرار دے دیتے ہیں...قائداعظم کے بعد قائد ملت چلے آتے ہیں، فخر ایشیا کا ظہور ہوتا ہے، مشرق کی بیٹی کا خطاب دیا جاتا ہے... اور ذرا ماضی میں جھانکیں تو گاما پہلوان جو یقینا برصغیر کے سب سے بڑے پہلوان تھے انہیں رستم زماں کا خطاب دے دیا جاتا ہے، صرف اس لئے کہ انہوں نے انگلینڈ میں کسی غیر معروف پہلوان زبسکو کو چت کیا تھا...اس زبسکو پہلوان کا تذکرہ سوائے ہماری تاریخ کے کسی اور تاریخ میں نہیں ملتا...

یہاں تک کہ انگلستان کی پہلوانی تاریخ میں بھی نہیں ملتا... ایک فرانسیسی سیاح جو اتفاق سے ڈاکٹر بھی تھا پرانے زمانوں میں ہندوستان آیا اور اس دوران کسی معمولی سے نواب صاحب سے ملاقات ہوئی جو ان دنوں شاید زکام میں مبتلا تھے فرانسیسی سیاح نے انہیں کوئی مکسچر گھول گھال کر پلا دیا تو ان کی چھینکوں کو افاقہ ہوگیا۔ نواب صاحب نے دربار کیا اور اس فرانسیسی ڈاکٹر کو نہ صرف ایک زریں خلعت عطا کی بلکہ انہیں تحریری طور پر لقمان ثانی۔ معالج کائنات۔ ارسطوئے اعظم وغیرہ کے خطابات بھی عطا کئے...

اس فرانسیسی سیاح نے اپنے سفر نامے میں تحریر کیا کہ یہ لوگ مبالغے کے بادشاہ ہیں۔ بھلا ایک معمولی زکام کے علاج کے نتیجے میں مجھے لقمان ثانی کس سلسلے میں کہا گیا تھا... لیکن وہ بھولا سیاح نہیں جانتا تھا کہ ہم مبالغے کے بغیر نہ زندہ رہ سکتے ہیں اور نہ ہی کسی کی عزت کرسکتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا جب میں پاکستان ٹیلی ویژن پر موسیقی کے ایک پروگرام کی میزبانی کیا کرتا تھا، اس عہد کے سبھی نامور گویئے اس پروگرام میں مہمان ہوتے ... چنانچہ کلاسیکی موسیقی کے ایک بہت نامور اور میرے پسندیدہ ایک خان صاحب بھی تشریف لائے ...ٹیلی ویژن پر ایک میزبان کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے مہمان...وہ جیسا کیسا بھی ہو، اس کی توصیف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دے چنانچہ میں نے بھی ملا دیئے اور اس دوران میں نے کچھ اس نوعیت کی بات کی کہ...ماشاء اللہ خان صاحب لاکھوں میں ایک ہیں اور جیسے سورج کی کرنیں ہر جاندار کو زندگی بخشتی ہیں ایسے ہی خان صاحب کی گائیکی بھی مردہ روحوں میں زندگی پھونک دیتی ہے اور یہ بے جا نہ ہوگا اگر ہم انہیں ”آفتاب موسیقی،، کے نام سے یاد کریں۔

بات آئی گئی ہوگئی اور تقریباً دس برس گزر گئے...

موسیقی کے ایک اور پروگرام میں اب قدرے ناتواں اور بوڑھے ہو چکے خان صاحب تشریف لائے انہیں اس دوران بجا طور پر ملک کے اعلیٰ ترین اعزازات مل چکے تھے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے گلو گیر ہو کر کہا تارڑ صاحب... کیا آپ جانتے ہیں کہ سب سے زیادہ فخر مجھے ” آفتاب موسیقی،، ہونے پر ہے...آپ ہی نے مجھے اس خطاب سے نوازا تھا۔

یعنی صرف ہماری تسلی تب تک نہیں ہوتی جب تک ہم کسی اہم ہستی کو خطاب سے نہ نوازیں بلکہ اس ہستی کی بھی تسلی نہیں ہوتی۔ کسی ایک سپورٹس رائٹر نے ہمارے شاندار بیٹس مین ظہیر عباس کو ” ایشین بریڈمین،، قرار دیا۔ اور ہم سب ہیں کہ ابھی تک اس خطاب کی ڈفلی بجاتے چلے آرہے ہیں شایداس سپورٹس رائٹر کو بھی بھول چکا ہو کہ اس نے کیا لکھا تھا...لیکن ہم نہیں بھولے...اور ہمیں اس سے کیا غرض کہ کرکٹ کی دنیا میں ظہیر عباس سے کہیں بڑھ کر بلے باز موجود ہیں سنیل گواسکر اور سچن ٹنڈولکر موجود ہیں اور یاد رہے کہ دے گریٹ ڈان...بریڈ مین اپنی سالگرہ مناتا ہے، اگر چہ آسٹریلیا کا وزیر اعظم اس کی دعوت کا منتظر ہے لیکن بریڈمین اسے مدعو نہیں کرتا...ٹنڈولکر کو اپنی سالگرہ پر خصوصی طورپر مدعو کرتا ہے کہ دنیا بھر میں صرف یہ بیٹس مین ہے جو میری عظمت کی قربت میں ہے اور اس کے باوجود ظہیر عباس... بریڈ مین ہے۔

یہ مبالغہ ہماری کرکٹ ٹیم تک پہنچتا ہے، جس نے ایک بار اتفاق سے ورلڈ کپ جیت لیا...اور ہم سب ابھی تک ڈفلیاں بجا رہے ہیں۔ اگرچہ اس سکینڈل سے پہلے بھی ہماری کرکٹ ٹیم دنیا کی ناکارہ ترین ٹیم تھی۔ پوری دنیا کی سطح پر بنگلہ دیش کے ایک دو کھلاڑی تو شمار میں آجاتے تھے لیکن پاکستانی کھلاڑیوں کا کہیں بھی کچھ شمار نہ تھا کہیں اتفاق سے سولہ سترہ برس بعد وہ آسٹریلیا میں یا کہیں اوول میں وہ ایک میچ جیت لیتے ہیں تو ہم پھر سے مبالغے کے بادشاہ ہو جاتے ہیں... آج پاکستانی عقاب انگلینڈ پر جھپٹ پڑیں گے... پاکستان انگلینڈ کے پرخچے اڑانے کے لئے تیار” قسم کی ہیڈ لائنز اخباروں کی زینت بننے لگتی ہیں،، اور جب یہ پاکستانی عقاب کوے بن جاتے ہیں، سکینڈلز کی زد میں آجاتے ہیں تو پھر ہم انہیں جوتوں کے ہار پہنانے لگ جاتے ہیں۔

اس نوعیت کی مبالغہ آمیزی ان دنوں ٹینس کے کھلاڑی اعصام الحق کے حوالے سے جنم لے رہی ہے جو مجھے شک ہے کہ اس نوجوان کیلئے مضر ثابت ہو سکتی ہے...ائیر پورٹ پر بھنگڑے، ماڈل ٹاؤن پارک میں

جشن، گورنر ہاؤس میں دعوتیں اور انعامات کی بھرمار... ماڈل ٹاؤن میں بینر آویزاں ہیں جن پر اسے ورلڈ چیمپئن کا خطاب دیا گیا ہے...حالانکہ اگر وہ فائنل جیت جاتا تب بھی یو ایس اوپن کا چیمپئن ہوتا... ورلڈ چیمپئن نہ ہوتا، میں نے نہایت اشتیاق سے اس کا پورا میچ ٹیلی ویژن پر دیکھا تھا اور آپ تصور نہیں کر سکتے کہ ایک پاکستانی کھلاڑی کو یو ایس اوپن ایسے ٹورنامنٹ کے فائنل میں کھیلتے ہوئے دیکھ کر مجھے کتنا فخر ہوا تھا اور اس کا کھیل نہایت اعلیٰ تھا...
وہاں کے عوام کا وہ پسندیدہ ہوا... میں نے بچپن میں اس کے نانا جان افتخار صاحب کو باغ جناح میں ٹینس کھیلتے دیکھاتھا اور ان کی سروس بھی ایسی ہوتی تھی کہ مخالف کھلاڑی ششدر رہ جاتا تھا اور حیران ہوتا تھا کہ آخر بال کدھر گیا ہے یو ایس اوپن کے فائنل میں اعصام کی سروس بھی اس کے نانا جیسی تھی... اس نوجوان نے ابھی ٹینس کے میدان میں بہت سی منزلیں طے کرنی ہیں، براہ کرم بے جا توصیف سے، مبالغے سے اس کا دماغ مت خراب کیجئے...اسے اپنا کھیل کھیلنے دیں۔

« مستنصر حسین تارڑ » کالم

اینگلو انڈین،ہندو اور پارسی پاکستانی کہاں گئے؟

تارڑ صاحب آپ تو ایک روکھے پھیکے بے رنگ اور متعصب لاہور میں رہتے ہیں، ہمارے زمانے کے لاہور میں کیسی کیسی رونقیں ہواکرتی تھیں اور سب سے پررونق اور زندگی کی مسرت سے ابلتی ہوئی اینگلو انڈین کمیونٹی ہوا کرتی تھی... آپ جانتے ہونگے کہ انگریز کے زمانے میں ریلوے کا تقریبا سارا عملہ خاص طورپر انجن ڈرائیور اینگلو انڈین ہوا کرتے تھے، ہم سر شام گڑھی شاہو کے علاقے کی جانب نکل جاتے تھے اور وہاں موسیقی ہر گھر میں سے ابلتی ہوئی گلی تک آتی تھی، بہت گوری اور بہت کالی لمبی اینگلو انڈین لڑکیاں سائیکل چلا رہی ہیں، بیڈمنٹن کھیل رہی ہیں، ان کا ایک اپنا مخصوص کلچر تھا... ہفتے کی شب کو برٹ انسٹی ٹیوٹ اور گرفن میں رقص ہوا کرتا تھا، اینگلو لوگ بہترین موسیقار ہوا کرتے تھے اور تارڑ صاحب یہ لوگ نہایت پرخلوص اور محبت کرنیوالے ہوا کرتے تھے، منافقت اور ریا کاری ان میں نام کو نہ تھی، پھر ان کیلئے یہ سرزمین تنگ ہونے لگی اور وہ آہستہ آہستہ نقل مکانی کرنے لگے، قائداعظم کے تصور کا جو پاکستان تھا جس میں تمام شہری بلاتفریق مذہب یکساں حقوق رکھتے تھے وہ ایک دھند میں کھو گیا اور اب گڑھی شاہو صرف تلی ہوئی مچھلی اور مٹھائیوں کیلئے مشہور ہے، میں سوچتا ہوں کہ ان دنوں اگر کوئی اینگلو انڈین لڑکی سکرٹ پہنے سائیکل چلاتی ہوئی آنکلے تو لوگ اسے سنگسار کردیں۔
شیخ صاحب... یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ بھی کبھی کسی سائیکل چلاتی اینگلو انڈین لڑکی کی زلف ” گرہ گیر کے اسیر ہوئے تھے.. شیخ صاحب مسکرانے لگے...، ان کے بال کٹے ہوئے تھے لیکن... بھولی ہوئی داستانوں کو دہرانے سے فائدہ... کبھی آپ نے سوچا ہے کہ ہمارے اینگلو انڈین اور پارسی حضرات کہاں گئے... لاہور انکے وجود سے خالی ہو کر کیوں بے روح اور بے رنگ ہوگیا... شیخ صاحب آپ تو غیر مسلموں کے غم میں ہلکان ہوتے ہیں، یہاں تو میرے جیسے مسلمانوں کے عقائد کو بھی پرکھا جارہا ہے کہ کیا یہ شخص ہمارے معیار کامسلمان ہے یا نہیں، شیخ صاحب اگر عمر رفتہ کو آواز دے رہے تھے تو مجھے بھی اپنے زمانے کا لاہور اور خاص طورپر مال روڈ پر واقع لکشمی مینشن یادآنے لگا تھا۔
ہمارے فلیٹ کے برابر میں ایک عیسائی خاندان مقیم تھا، وہ یوم آزادی کے موقع پر اپنے فلیٹ کی چھت پر پاکستانی پرچم لہرانا نہ بھولتے، ان کی ایک بیٹی لوما میری چھوٹی ہمشیرہ شائستہ کی سہیلی تھی، یہ لوما نہایت سوکھی سڑی اور کالی سی ہوا کرتی تھی، عیدین کے موقع پر ہم انہیں سویاں اور کھیروغیرہ بھیجتے اور کرسمس پر انکی جانب سے کشمش والا میٹھا کیک آیا کرتا جسے میری امی جان تو نہ چکھتیں لیکن ہم بچہ لوگ اسے نہایت رغبت سے نوش کرتے، ہمارے فلیٹ کے عین سامنے ایک پارسی خاندان رہتا تھا، چونکہ پارسی صرف پارسیوں میں ہی مسلسل شادیاں کرتے چلے آئے تھے اسلئے ان کی نسل ناتواں ہو رہی تھی...انکی تین لڑکیاں تھیں جو لنگڑا کر چلتی تھیں، بیڈن روڈ پرانکے بھائی کی ایک بیکری تھی جہاں کی ڈبل روٹی کی خوشبو آج بھی میں سونگھ سکتا ہوں، نوروز کے تہوار پر یہ پارسی اپنی سیڑھیوں پر نہایت دیدہ زیب گل بوٹے بناتے اور ہماری جانب پارسی پکوان بھجواتے اور امی جان یہ پکوان نہایت شوق سے کھاتیں، ذرا ادھر ہے ماسٹر خاندان رہتا تھا اور ایک موٹا سا ہے ماسٹر نوجوان ایسا تھا کہ وہ ہم پنجابیوں

سے بڑھ کر پنجابی اور لاہوری تھا، اسکی بہن رتی کے حسن کے چرچے ہر بام ودر سے چھلکتے تھے۔
نہ صرف عیسائی اور پارسی بلکہ لکشمی مینشن میں ایک ہندو خاندان بھی مقیم تھا اور ان کا ایک لڑکا ہمیشہ کہا کرتاتھا کہ... یار... میں مسلمان ہوجاؤں گا لیکن لاہور کو کبھی نہیں چھوڑوں گا...لیکن یہ سب بالآخر مجبور ہو کر لاہور کو چھوڑ گئے...اور میں سمجھتا ہوں کہ انکے حق میں بہت اچھا ہوا کہ وہ چلے گئے، اس ملک میں کیا رہنا جہاں ایک عیسائی بچی اگر" نعت،، کے بجے کرتے ہوئے غلطی کرجائے تو اسے زدوکوب کیاجاتا ہے اور وہ خوش نصیب ٹھہرتی ہے کہ اس پر ہتک کامقدمہ دائر نہیں ہوتا اور اسکی ماں کو شہر بدر کر دیا جاتا ہے... اچھا ہوا کہ یہ اینگلو انڈین، پارسی اور کچھ ہندو لوگ یہ شہر چھوڑ گئے۔
بے شک ان پارسیوں میں میری ایک شناسا، بیسپی سدھاوا بھی شامل ہے جس نے " کروایٹرز،، اور،، آئس کینڈی مین،، ایسے شہرہ آفاق ناول لکھے اور وہ امریکہ میں مقیم ہوتے ہوئے بھی کہتی ہے کہ میں... شہر لاہور کی ہوں اور سراسر لاہورن ہوں مجھے اگر تخلیق پر ابھارا تو شہر لاہور نے... جس کے ساتھ میں عشق کرتی ہوں۔ کیسی نادان عورت ہے کہ ایک ایسے شہر کے ساتھ عشق میں مبتلا ہے جس نے نہ صرف اسے بلکہ اینگلو انڈین کمیونٹی اور ہندوؤں کو دھتکار دیا، لیکن ہم کیا کریں کہ ہم مسلمان ہوتے ہوئے بھی دھتکارے جا رہے ہیں۔
« مستنصر حسین تارڑ » کالم
حنوط شدہ لوگ

میری اپنی بیٹی ڈاکٹر عینی جب پہلی بار امریکہ سے پاکستان واپس آئی تو ہم سب کھانے کے لئے ایک ریستوران میں گئے... وہاں جتنی بھی نوجوان لڑکیاں تھیں، کچھ اپنے خاندانوں کے ہمراہ اور کچھ اکیلی اپنی دوستوں کے ساتھ ان میں سے بیشتر نیلی جینوں میں ملبوس تھیں...عینی پر تو سکتہ طاری ہوگیا، ابو یہ پاکستان کو کیا ہوگیا ہے، میں تو فلوریڈا میں بھی شلوار قمیض پہنتی ہوں اور یہ لڑکیاں کھلے عام جینوں میں گھومتی ہیں، کیا ہوگیا ہے، میں نے اسے سمجھایا کہ بیٹے یہ بدلتے ہوئے زمانے ہیں، اگر ساری دنیا میں تغیر ہے تو بھلا پاکستان کیسے تبدیل نہ ہوتا۔ انگلستان میں ایک صاحب تھے حنیف خان ذرا دبلے پتلے تھے لیکن فلسفیانہ ذہن کے مالک تھے، کھوئے کھوئے سے رہتے تھے، اکثر ایک دردناک آہ بھر کر کہتے، تارڑ بھائی! پچھلے بیس برس سے اس انگلینڈ کی قید میں ہوں، بند کمرے میں سوتا ہوں اور وہ بھی کیا دن تھے جب اپنے گاؤں میں گھر کی چھت پر چاندنی راتوں میں مقامی جولاہوں کے بُنے ہوئے سفید کھیسوں کو اوڑھ کر سوتے تھے اور ان میں اسے کپاس کی خوشبو آتی تھی، حنیف خان بیس برس بعد اپنے گاؤں لوٹے...
عزیزوں نے بہتیرا سمجھایا کہ آپ نیچے کمرے میں سو جائیے، گرمی بہت ہے اور کمرہ ائرکنڈیشنڈ ہے پر نہ مانے، چھت پر جا سوئے، بلکہ سوئے کہاں رات بھر مچھروں نے سونے نہ دیا، صبح تک شاید انہیں ملیریا ہو چکا تھا، انگلستان واپس آئے تو پھر کبھی اپنے گاؤں کی چاندنی راتوں کو یاد نہ کیا۔
نیو یارک کی ایک ادبی محفل میں جب مجھے کچھ کہنے کیلئے کہا گیا تو میں نے یہ بھی کہا کہ بے شک آپ لوگ ایک آسائش شدہ متمول حیات گزار رہے ہیں لیکن آپ نامکمل ہیں، جب تک آپ کی ہر سویر میں جو پہلا سانس ہوتا ہے اس میں وطن کی مٹی کی خوشبو نہ ہو... اپنے دیس کے گل بوٹوں کی مہک نہ ہو... آپ نہ تو تخلیق کر سکتے ہیں اور نہ ہی مکمل ہو سکتے ہیں، یہ مہک اور خوشبو آپ کو حنوط ہو جانے سے بچاتی ہے تو بہت سے لوگ ناراض ہو گئے۔ عین ممکن ہے کہ میں خود حنوط ہو چکا ہوں، لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ جو بھی لاکھ کلفتوں اور کھٹنائیوں کے باوجود اپنے وطن کو ترک نہیں کرتے وہ حنوط ہو جائے... وطن کی مٹی اسے حنوط نہیں ہونے دیتی۔

20/3/13

« مستنصر حسین تارڑ » کالم

کشور ناہید کے جلے ہوئے پائے

چنانچہ سکیورٹی کے اہلکار...وزیر اعظم ہاؤس میں داخل ہونے والے ملک بھرکے ادیبوں اور دانشوروں کے ساتھ طالبان ایسا سلوک کر رہے تھے اور درست کررہے تھے کہ ادیب بھی تو ایک نوعیت کے دہشت گرد ہوا کرتے ہیں، اپنی تحریروں سے بے ایمان اور کرپٹ اہل اقتدار کے ایوانوں کو متزلزل کرتے رہتے ہیں...چند روز پیشتر اکیڈمی آف لیٹرز کے چیئرمین عبدالحمید صاحب جو میرے بیٹے سلجوق کے ساتھ جدہ کے سفارت خانے میں کمرشل اتاشی کے طورپر تعینات تھے مجھ سے ملاقات کرنے کیلئے میرے گھر تشریف لائے تو میں نے سب سے پہلے وزیر اعظم ہاؤس میں ادیبوں کے ساتھ جو بدسلوکی ہوئی اس پر احتجاج کیا، ان کا کہنا تھا کہ جب افتتاحی اجلاس نیشنل لائبریری کی بجائے وزیر اعظم ہاؤس میں منتقل کیا گیا تو انہوں نے متعلقہ اہلکاروں کو خبردار کیا کہ ایک تو سکیورٹی کے حوالے سے ملک بھر سے آئے ہوئے ادیبوں کا احترام کیا جائے، علاوہ ازیں وزیر اعظم ہاؤس کے ہال میں اتنی گنجائش نہیں کہ ساڑھے پانچ سو کے قریب ادیب اس میں سماسکیں، اس پر وہاں کے عملے نے کہا کہ حضور ہمارا تجربہ ہے کہ جب یہاں پانچ سو لوگ مدعو ہوتے ہیں تو بمشکل سوڈیڑھ سو پہنچ پاتے ہیں یہاں تک کہ ہمیں نشستیں پر کرنے کیلئے ...اپنے سٹاف کو بٹھانا پڑتا ہے

یاد رہے جیسے آئی جی پولیس کا ڈرائیور یا چپڑاسی اپنی ذات میں آئی جی سے بھی کہیں بڑھ کر افسر ہوتا ہے تو یہی معاملہ وزیراعظم ہاؤس کے اہلکاروں کا ہوتا ہے، اگلے روز ہال کی چھان بین گیارہ بجے مکمل ہوئی کہ سٹاف دیر سے پہنچا تھا...یوں چیئرمین صاحب ایک بے بس اوربے اختیار شخص کے طورپر بھاگ دوڑ کرتے رہے ان کا کہنا تھا کہ وہ انہے آپ کو اس" سانحے" سے بری الذمہ قرار نہیں دیتے اگرچہ حقائق یہی تھے اور یوں وہ...بقول انکے" عبث بدنام ہوئے....انہوں نے اس ملاقات کے دوران ان منصوبوں کا تذکرہ بھی کیا جن پر عمل پیرا ہونے کی خواہش انکے دل میں تھی اور ان میں سرفہرست ملکی ادب کے ترجموں کا ایک منصوبہ تھا...انگریزی، عربی، فرانسیسی اور چینی میں اگرہمارے ادب کے شاہکاروں کو منتقل کیا جائے تو پوری دنیا کے لوگ آگاہ ہوسکیں گے کہ ہمارے ہاں بھی بین الاقوامی سطح کی تحریریں تخلیق کی جارہی ہیں...ویسے روایت ہے کہ جب کبھی اس نوعیت کے منصوبے بنتے ہیں تو اکیڈمی کے چیئرمین سب سے پہلے اپنی" تحقیقات" کے تراجم کروا کے سرخرو ہوجاتے ہیں، عبدالحمید سے ہمیں کم از کم یہ خدشہ نہیں کہ وہ خوش قسمتی سے ادیب نہیں ہیں۔

افتتاحی تقریب کیلئے دعوتی کارڈ میں ادیبوں کا جو پینل وزیر اعظم کے ہمراہ سٹیج پر رونق افروز ہونے کے لئے منتخب کیاگیا تھا اس میں بانو قدسیہ، انتظار حسین، مشتاق احمدیوسفی اور مجھ حقیر بندہ پر تقصیر کو بھی شامل کیاگیا تھا...لیکن ہم رہے وضو کرتے کہ بانو قدسیہ کے علاوہ ہماری کرسیوں پر وزرائے کرام اور سیکرٹری حضرات رونق افروز ہوگئے، یوسفی صاحب تو تشریف نہ لاسکے لیکن میرے ہمراہ انتظار حسین بھی رہے وضو کرتے، البتہ ہمیں اگلی نشستوں پر قدرے سرفراز کردیاگیا...جبکہ ہم سے کہیں معتبر ادیب حضرات ہال میں نشستوں کی تلاش میں خجل خوار ہوتے رہے...اس دوران فہمیدہ ریاض آئیں اور وہ بھی کسی نشست کی متلاشی تھیں، میرے برابر کی نشست پر انتظار حسین کا نام چسپاں تھا تو انہوں نے کہا" لو کیا انتظار حسین مجھ سے بڑا ادیب ہے" اور ان کے نام کے سٹیکر اتار کر وہاں براجمان ہوگئیں...انتظار صاحب جانے کہاں جابراجمان ہوئے مجھے اس کی خبر نہیں، لیکن فہمیدہ ہمیشہ کی مانندایک خوشگوار رفاقت تھی...بلکہ وہ بڑبڑاتی رہی کہ اس کانفرنس کی تھیم" ادب اور جمہوریت" ہے تو یہ سٹیج پر بیٹھنے والے لوگ تو آمروں کے ہم نوا تھے۔

جمہوریت کے پرخچے اڑانے والے تھے تو یہ سٹیج پر کیوں بیٹھے ہیں...فہمیدہ ریاض کو کوئی چپ نہیں کروا سکتا تو وہ بولے چلی گئیں، البتہ جب وہ چپ ہوئی تو اس نے مجھ سے پوچھا کہ عبداللہ حسین کیسے ہیں

تو میں نے اسے بتایا کہ اپنی دراز قامتی کی پاداش میں قدرے جھک گئے ہیں، گنٹھیا کے مریض ہیں، بڑھاپے کے دیگر عوارض بھی انہیں بے بس کرتے ہیں، لیکن ہر ملاقات پرقہقہے لگاتے زندگی کو بے مقصد ٹھہراتے ہیں...وزیراعظم راجہ صاحب کی تقریر ایک پرتکلف تجربہ تھا کہ انہوں نے قطعی طورپر ادیبوں اور دانشوروں کو اپنے دانش ورانہ مشوروں سے نہ نوازا...عاجزی اور سادگی اختیار کی، بانو آپا کے سامنے نہایت احترام اور عجز سے جھکے اور اپنی تقریر میں میرے علاوہ دیگر ادیبوں کی موجودگی کا شکریہ ادا کیا، وہ تب قطعی طور پر کسی راجہ رینٹل کے ملزم دکھائی نہ دیئے...یہ بڑے نصیب کی بات ہے۔افتتاحی تقریب کے اختتام پروزیراعظم ہاؤس سے باہر نکلتے ہوئے ضبط شدہ موبائل فونوں کے حصول کیلئے ایک جنگ جاری تھی۔
اسیر خان بانو آپا کا بیٹا، ایک ایسا امرت دھارا تھا جسکے پاس ہر بیماری کا علاج تھا...وہ جانے کیسے میرا موبائل اس دھینگا مشتی میں سے نکال لایا...میں بے وجہ بے حد تھک چکا تھا اور پھر وہاں پاکستان کے مختلف خطوں سے آئے ہوئے ایسے لوگ تھے جو اپنی تحریروں کے حوالے سے مجھ سے باتیں کرنا چاہتے تھے، آٹو گراف حاصل کرنا چاہتے تھے اور تصویریں اتروانا چاہتے تھے، مجھ سے محبت کرنے والے تھے لیکن محبت کی زیادتی بھی تو تھکا دیتی ہے...مجھ میں اتنی سکت نہ رہی تھی کہ پچھلے پہر کا سیشن بھی اٹینڈ کرتا...بانو آپا کے ہمراہ میں بھی واپس ہوٹل چلاگیا۔لاہور میں ہی اسلام آباد روانگی سے پیشتر مجھے کشور ناہید کا فون آگیا کہ مستنصر افتتاحی تقریب کی شام تم نے کہیں نہیں جانا، میرے ہاں آنا ہے۔
میں پائے بنا رہی ہوں، انہیں کھانا ہے، خبردار کہیں نہیں جانا...اس دوران قیصر چیمہ اور وحید احمد کے فون آئے کہ حضور یہ شام ہمارے ساتھ بسر کیجئے اور پھر مظہراسلام جو کہ نہایت ہی قریبی اور میرے راز جاننے والا دوست ہے اس کا بھی فون آیا اور جب میں نے معذرت کی کہ میں کشورناہید کے پائے کھانے جارہا ہوں تو کہنے لگا” تارڑ...یہ کیا غضب کر رہے ہو...کشورکے پائے کھانے جارہے ہو...وہ تو حلال نہیں ہوں گے“ میں نے ہنس کر کہا” مظہر...اس کے نہیں غالباً بکرے کے پائے ہوں گے بکواس نہیں کرو“اسلام آباد میں ہر ادیب کی ایک اپنی سلطنت ہوتی ہے اور انکے درمیان رقابت کے سلسلے چلتے رہتے ہیں ویسے مجھے اطلاع کی گئی کہ کشور کے پائے جل گئے ہیں، وہ ان کا دیگچہ چولہے پر چڑھا کر نیند کی گولی نگل کر سوگئی تھی اور وہ جل گئے اور اب وہ مزید پائے حاصل کرنے کی خاطر اپنے قصاب کی دکان پر جاچکی ہے۔
« مستنصر حسین تارڑ » کالم
کیا وہ عورت پاسکل سے زیادہ خوبصورت تھی

گزشتہ کالم میں قصہ یہ بیان ہو رہا تھا کہ کشور ناہید کے پائے جل گئے... وہ ان کا دیگچہ چولہے پر چڑھا کر نیند کی ایک گولی نگل کر سو گئی اور وہ جل گئے اور اب وہ مزید پائے حاصل کرنے کی خاطر قصاب کی دکان پر جا چکی تھی...ویسے خدا لگتی کہوں گاکہ کشور ناہید اگر شاعرہ نہ ہوتی تو ایک بے مثال شیف ہوتی اور ان دنوں کسی نہ کسی چینل پر پکوان تیار کرتی، ترکیب کے دوران اپنے شعر سناتی، دنیا جہان کو کوستی یقینا لاکھوں میں کھیل رہی ہوتی جب کہ محض شاعری کی آمدنی سے وہ زیادہ سے زیادہ درجن بھر پائے خرید سکتی ہے...مجھے کوئی چالیس برس پیشتر کی وہ شام بھی یاد ہے جب وہ اپنے کرشن نگر والے گھر کے صحن میں گھٹنوں کے درمیان ایک دیگچہ حلیم کا توازن کئے اسے ایک مگدر سے گھوٹ رہی تھی اور پسینے سے شرابور تھی، یہ کشوری حلیم صوفی غلام مصطفی تبسم کو بہت مرغوب تھی...بہر طور میں اس شب کشور کے ہاں نہ پہنچ سکا کہ انتظار حسین اور مسعود اشعر مجھے داغ مفارقت دے کر چلے گئے اور میرے پاس سواری کا کوئی انتظام نہ تھا، یہ الگ داستان کہ واپسی پر فاطمہ حسن بے چاری مرتے مرتے بچی تھی اور زاہدہ حنا اس کی ڈھارس بندھاتی تھی کہ کشور کے پائے کھانے سے اسی نوعیت کے حادثات جنم لے سکتے ہیں۔
نیشنل لائبریری کے ہال میں ادیبوں کی کانفرنس کا آخری اجلاس جاری تھا...سٹیج پر فہمیدہ ریاض، نبیلہ کیانی، کشور ناہید، ہندوستان کے احمد صاحب کے علاوہ ایک افغان ادیبہ بھی براجمان تھیں جنہوں نے نہایت عمدہ تقریر کی...چین کے ژونگ صاحب نے بھی بہت عمدہ اردو میں اجلاس کو خطاب کیا، انہوں نے چین

پاکستان دوستی کو فوکس کیا، جس طور پاکستان نے چین کو بقیہ دنیا کے قریب کرنے کا فریضہ انجام دیا...اپنے آپ کو ایک دروازہ کیا جس کے راستے چین کی رسائی دیگر ملکوں تک ہوئی اس ماضی کیلئے شکریہ ادا کیا...انہوں نے ایک بہت غور طلب بات کی، ان کا کہنا تھا کہ چین اب اس پوزیشن میں ہے کہ اپنے دیرینہ دوست پاکستان کی زندگی کے ہر شعبے کیلئے بے حد کارآمد ہوسکے اور ہماری جانب سے مسلسل کاوش جاری رہتی ہے لیکن ہم نہیں سمجھ سکے کہ پاکستان کیوں احتیاط پسند ہوگیا ہے، ہم سے فائدہ نہیں اٹھاتا...میرے دوست سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس شیخ ریاض کا بیٹا رضا رومی، بیورو کریٹ، دانشور اور ان دنوں روم کے علاوہ ہر جگہ پایا جانے والا رضا اس افتتاحی اجلاس کا میزبان تھا۔

ہال کے باہر نیشنل لائبریری کے لاؤنج میں مجھے اس صوفے کی تلاش تھی جس پر میں نے ” میرا داغستان“ کے مصنف اور شاعر رسول حمزہ توف کو بٹھاکر میں انکے قدموں میں بیٹھ گیا تھا اور وہ فیض صاحب کو یاد کرتے ہوئے رونے لگے تھے اور مجھ سے اپنی نظم” اے عورت“ کا اردو ترجمہ کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا، وہ صوفہ اب وہاں نہ تھا اور رسول حمزہ توف بھی اب یہاں اس دنیا میں نہ رہے تھے، لاؤنج میں باہر دھوپ میں کیسے کیسے پیارے اور قدیم چہروں سے ملاقاتیں ہوئیں، احمد سلیم، جھکا ہوا سفید بالوں والا پنجابی شاعر اور شاید پاکستان کا واحد شخص جو تاریخ اور ادب کو محفوظ کرتا ہے...جگر کے سرطان میں مبتلا...ان زمانوں کو یاد کرتا جب وہ میری دکان پر آیا کرتا تھا اور ہم بہت باتیں کیا کرتے تھے...راشد حسین رانا، کمال کا پنجابی شاعر جس کی خوفناک اور گھنی مونچھوں میں سے اس کے مجھے دیکھ کر ظاہر ہونے والے دانتوں پر اسلام آباد کی دھوپ عکس ہوتی تھی۔

اسد محمد خان بے بدل افسانہ نگار اور دل پر اثر کرنے والا شاعر...انور شعور جسے جب بھی دیکھا بقول منیر نیازی، عالم خمار میں دیکھا اور یہاں تو عالم ہوش میں دیکھا...صابر ظفر جس نے لاہور سے کوچ کیا تو کراچی نے اس کے نصیب جگا دیئے، اتنے عرصے کے بعد اسے دیکھ رہا تھا اور خوش ہو رہا تھا کہ وہ بھی میری دکان پر آیا کرتا تھا اور پھر دلی کے ڈاکٹر خالد اشرف جنہوں نے اپنے آپ کو اردو ناول کی تنقید اور ترجمانی کیلئے وقف کررکھا ہے، انہوں نے جب اپنی کتاب میں یہ بیان دیا کہ...اب جبکہ قرۃ العین حیدر کے ہاں تخلیقی امکانات معدوم ہو رہے ہیں تو سرحد پار ایک ناول” بہاؤ“ نے... ازاں بعد ڈاکٹر خالد اشرف نے جو درج کیا وہ میں یہاں تحریر کرنے سے قاصر ہوں...کہ خودستائی ایک معیوب عمل ہے۔وہ لوگ جو جانے پہچانے اور شناسا تھے انکے علاوہ سینکڑوں لوگوں نے جو اجنبی تھے۔

انہوں نے مجھے اپنی الفت اور محبت سے نڈھال کردیا وہ سب مجھ سے باتیں کرنا چاہتے تھے، اپنی تخلیقات کا تذکرہ کرنا چاہتے تھے اور میرے ہمراہ تصویریں بنوانا چاہتے تھے، یہاں تک کہ میں مسکراتے مسکراتے، ان کی الفت کے جواب دیتے اتنا نڈھال ہوا کہ ایک کرسی پر ڈھیر ہوگیا ایک بڑے اخبار کے فوٹو گرافر نے کہا کہ سر...آپ اس کانفرنس کے سب سے زیادہ تصویر شدہ شخص ہیں تو میں نے کہاکہ برخوردار یہ محض میری عمر کا زوال ہے کہ یہ لوگ میرے آس پاس ہیں، میرے ساتھ تصویریں اترواتے ہیں کہ انہیں خدشہ ہے کہ کیا جانئے کل ہو کہ نہ ہو...اگلی کانفرنس پر یہ ہو یا نہ ہو...ادیبوں کے ایسے اجتماع کا ایک بلکہ سب سے بڑا مثبت پہلو یہ ہوتا ہے کہ آپ ایسے لوگوں سے ملتے ہیں جن کی ادبی صلاحیتوں سے آپ ...ناواقف ہوتے ہیں اور انہوں نے ادب اور تخلیق میں بڑے کام کئے ہوتے ہیں اور پھر بھی وہ گمنام رہتے ہیں مثلاً سندھ کے ساری عمر سمندروں میں بسر کرنے والے الطاف شیخ تھے جنہوں نے اپنی سمندر نوردی کے حوالے سے پہلے تو سندھی زبان میں متعدد سفر نامے تحریر کئے اور یہ کیسی غلط فہمی ہے کہ مجھے متعدد بار سندھی دوستوں نے بتایا تھا کہ الطاف شیخ سندھ کے تارڑ ہیناور اس میں بہت مبالغہ ہے کہ وہ مجھ سے بہتر لکھنے والے ہیں” سمندر کے دن، ایران کے دن، کراچی سے کوپن ہیگن اور ملائشیا کے دن“ ایسے کمال کے سفر نامے تو انہی کی سمندر گردی کے معجزوں سے تخلیق کئے جا سکتے تھے...یہاں سرفراز بیگ سے بھی ملاقات ہوگئی۔

اطالیہ میں مقیم اس فارغ البال نوجوان نے مجھے اپنا ایک ناول” پس آئینہ“ روانہ کیا تھا اور یہ ایک انوکھا اورحیرت انگیز ناول تھا اور میں نے اس کی انفرادیت کا چرچا بہت کیا...اس کی خواہش تھی کہ میں اسلام

آباد میں ایک اور دن ٹھہر جاؤں اور اس ناول کی افتتاحی تقریب میں شرکت کروں لیکن... مجھے لاہور بلاتا تھا اوریہاں مجھے مردان کے کسی کالج میں ایک لیکچرر محمد اویس قرنی سے ملاقات کا اتفاق ہوا...اس نے مجھے اپنی تخلیقی کتاب" کرشن چندر کی ذہنی تشکیل" عنایت کی اور یہ درجنوں دیگر عنایت شدہ کتابوں کے ہمراہ میرے سامان میں لاہور چلی آئی اور جب فراغت کے کچھ لمحوں میں اس کتاب کو سرسری طورپر دیکھا تو ششدر رہ گیا...ایک حیرت بھرے سناٹے میں چلا گیا کہ کرشن چندر کے بارے میں اتنا بڑا تحقیقی اور تجزیاتی کام، مردان کے ایک کالج میں اویس قرنی نام کا ایک گمنام شخص سرانجام دیتا ہے۔

میں اتنا متاثر ہوا کہ میں نے اسی شب اویس قرنی کو فون کرکے نہ صرف اسے مبارکباد دی بلکہ اپنی عقیدت کا اظہار بھی کیا۔اس کانفرنس میں بہت سے " وقوعے" بھی رونما ہوئے اور ان میں سرفہرست یہ وقوعہ تھا کہ میرے گرد بہت سے الفت بھرے مہرے میرا گھیراؤ کئے ہوئے تھے اور ایک دراز قامت اور اس سے انکار ممکن نہیں کہ نہایت خوش شباہت، بڑی بڑی آنکھوں والی، ملاحت کی رنگت والی خاتون میرے قریب آتی ہیں۔

شاید صنوبر کے نام سے تعارف کرواتی ہیں کوئٹہ سے تشریف لائی ہیں اور پھر کہتی ہے کہ تارڑ صاحب میں ایک مدت سے آپ سے ایک سوال کرنا چاہتی تھی، آپ یہ بتایئے کہ آپ کی" پیار کا پہلا شہر" کی پاسکل زیادہ خوبصورت تھی یا میں زیادہ خوبصورت ہوں" اور انہوں نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ سوال کیا اور میں قطعی طور پر ایسے بیباک سوال کیلئے تیار نہ تھا، تب میں نے ایک مصالحت آمیز راستہ اختیارکیا، خاتون اگر میں یہ اقرار کروں کہ آپ زیادہ خوبصورت ہیں تو پاسکل...اگر وہ ابھی تک زندہ ہے...تو اس کا دل دکھے گا اور اگر میں آپ سے کہوں کہ پاسکل آپ سے حسن میں بڑھ کر ہے تو آپ کا دل دکھ جائے گا اور میں کسی کا بھی دل دکھانے پر یقین نہیں رکھتا۔کیا یہ اسلام آباد میں منعقد کردہ اکیڈمی آف لیٹرز کی ادیبوں کی کانفرنس کا ایک خوبصورت انجام نہیں ہے

‘گرم آنکھیں اور ادبی میلے کی تھکاوٹ’(10/3/13)

مستنصر حسین تارڑ

کراچی لٹریری فیسٹیول کے دوران میں اور عبداللہ حسین لفٹ سے باہر آنے لگے تو ایک معنک اور گوری گوری خاتون عبداللہ سے کہنے لگی "میرا خیال ہے میں آپ کو کہیں مل چکی ہوں" عبداللہ نے فوراً کہا کہ۔۔ نہیں میرا خیال یہ ہے کہ ہماری کبھی ملاقات نہیں ہوئی"۔۔ کمرے میں پہنچے تو عبداللہ کو پچھتاوے نے آ لیا۔ بار بار کہتے، یار غلطی ہو گئی اُس سے پوچھنا چاہیے تھا کہُ اس کے خیال میں ہم کہاں مل چکے ہیں۔۔ گرم آنکھوں والی خاتون تھی۔۔ میں نے ان کی بے چینی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔۔ خان صاحب۔۔ اس عمر میں بھی آپ کی آنکھوں میں تو دم ہے۔۔ البتہ یہ گرم آنکھیں کیا ہوتی ہیں۔۔ اس پر کچھ دیر اپنی ڈاڑھی سنوارتے ہوئے بولے۔۔ جناب عالی ہمارے گاؤں کا ایک ان پڑھ کمہار تھا جو ایک لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو گیا تو میں نے پوچھا کہ تمہیں عشق کیسے ہوا تو کہنے لگا۔۔ وہ ایک کچی گلی میں چلی آ رہی تھی، اُس نے میری طرف دیکھا تو گرم آنکھوں سے دیکھا، بس فوراً عشق ہو گیا۔۔ تو وہی گرم آنکھیں۔۔ مجھے یہ ترکیب نہایت انوکھی لگی تو میں نے پوچھا خان صاحب اگر آپ کسی تحریر میں یہ گرم آنکھیں استعمال نہیں کر رہے تو میں اسے کسی تحریر میں بیان کر لوں۔۔ دراصل میں اور عبداللہ حسین اس نوعیت کے تخلیقی تبادلے کرتے رہتے ہیں۔ میرے افسانے "بابا بگلوس" کا بنیادی خیال عبداللہ کی گفتگو کے دوران مجھ پر آشکار ہوا تھا اور اُن کے انگریزی ناول "دے افغان گرل" میں میرے کسی قصے کہانی کا بھی عمل دخل ہے چنانچہ عین ممکن ہے کہ میرے کسی آئندہ کردار کی آنکھیں گرم ہوں۔ ویسے میں عبداللہ کا معترف ہوں کہ عمر کے جھکاؤ کے باوجود اور چال میں لغزش کے باوجود لغزشوں کے تمنائی رہتے ہیں۔

فیسٹیول میں قدیمی مہربانوں اور دوستوں میں ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ حُمیر اشتیاق اگرچہ اب اُن کی ڈاڑھی

مناسب حد سے تجاوز کر چکی تھی، انہوں نے میری متعدد کتابوں کے بارے میں ”ڈان“ میں توصیفی اور تنقیدی بھی ریویو لکھے بلکہ ”خس و خاشاک زمانے“ پر لکھا جانے والا ریویو اس ناول کے حوالے سے تحریر کیے جانے والے تین ایم فِل کے تھیسس میں سب سے نمایاں تھا۔ انہوں نے اس ناول کا چرچا بھی کچھ بے دریغ کیا۔ عبداللہ کیہر آج سے شاید بیس برس پیشتر مجھ سے ملاقات کے لیے آئے تھے۔۔۔ سفرنامہ نگار اور کمال کے کمپیوٹر کاریگر شخص۔۔۔ میرے پہلے سفرنامے ”نکلے تری تلاش میں“ کے نام سے ایک ویب سائٹ آپریٹ کرتے ہیں اور گوگل کے نقشوں کے ذریعے میری مسافتوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ بلکہ انہی دنوں انہوں نے اپنی سائٹ پر میرے بارے میں حسینہ معین، عبداللہ حسین، آئی اے رحمن، مجاہد بریلوی، قصیر زیدی وغیرہ کے تاثرات شامل کیے۔

فیسٹیول کے یہ تین دن یاد گار بھی اور تھکن سے چور بھی تھے۔ ٹیلی ویژن اور ریڈیو انٹرویوز، آٹو گراف، تصویریں، باتیں، کتابوں پر دستخط ۔۔۔ اور یہاں کچھ حجاب والیاں خواتین تھیں اور کچھ قدرے بے حجاب بھی تھیں۔ ان میں سے ایک نہایت پیاری شکل کی میری بیٹی عینی کی عمر جتنی لڑکی نے میرے کان میں دوبارہ سر گوشی کی۔ تارڑ صاحب میں صدق دل سے آپ کو ایک ابراہیم ادھم مانتی ہوں۔ ایک اور خاتون مجھ پر اتنی تحقیق کر چکی تھیں کہ وہ میری زندگی کے اُن گوشوں کو بھی جانتی تھیں جنہیں میں بھی نہیں جانتا تھا۔ میرے بارے میں ایک مختصر ڈاکو منٹری بنا رہی تھیں، سمندر کنارے میں نے اُن کے خوش آثار مہرے اور کیمرے سے باتیں کیں۔۔۔ کسی اخبار کے ایک صحافی مجھ تک پہنچے تو میں نے اُن سے پوچھا کہ آپ نے مجھے کیسے اس ہجوم میں تلاش کر لیا۔۔ تو کہنے لگے، میں نے استقبالیہ سے آپ کے بارے میں استفسار کیا تو کامران صاحب نے کہا کہ جدھر لوگ گھنے ہوں گے بہت ہوں گے اُن کے درمیان تارڑ صاحب ہو سکتے ہیں۔ مجھے گمان بھی نہ تھا کہ اہل کراچی مجھے اپنی محبت سے مار ڈالیں گے۔ میں بہت تھک جاتا تو اپنے کمرے میں چلا آتا اور فوراً ہی چہرے کو چند چھینٹوں سے تازہ کر کے واپس فیسٹیول کے ہجوم میں اتر آتا۔۔۔ ویسے ان تین دنوں کے دوران میرے آس پاس بہت خوبصورت سہارے تھے اور ان میں ”مستنصر حسین تارڑ ریڈرز ورلڈ“ کے مجھ پر نچھاور ہونے والے لوگ تھے۔ برٹش کونسل کی باجرہ تھیں جنہوں نے نہایت دل سوزی سے میرے ایک ناول کے کچھ حصوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ عمارہ خان بھی ہمہ وقت موجود ۔اور پھر تہمینہ صابر۔۔۔ ایسی محبت بھری شخصیت کہ کیا بیان کروں ۔لیکن یہ جمیل عباسی اور عظمیٰ عباسی تھیں جن کی محبت اور جاں نثاری نے مجھے موہ لیا۔ جمیل حیدر آباد سے میرے کسی گاؤں سے سفر اختیار کر کے سات گھنٹے کی ڈرائیو کرتے ہر سویر پہنچ جاتے۔

اس دوران عبداللہ حسین کی بتیسی تڑخ گئی اور پھر دو ٹکڑے ہو گئی لیکن یہ الگ داستان ہے۔۔۔ البتہ یہ ورلڈ ریکارڈ ہو سکتا ہے کہ کسی لٹریری فیسٹیول میں کسی عظیم ناول نگار کی بتیسی تڑخ جائے اور پھر دو ٹکڑے ہو جائے۔ آرٹس کونسل کے احمد شاہ اگر مدد گار ثابت نہ ہوتے تو عبداللہ حسین پوپلے پھرتے۔ کراچی آنے سے پیشتر لاہور میں ہی محمد حنیف نے مجھے فون کیا تھا کہ تارڑ صاحب آپ نے کم از کم ایک شام میرے گھر کے لیے سنبھال رکھنی ہے۔ اُس ایک شام انتظامی امور میں گڑ بڑ ہو گئی بلکہ بعد میں حنیف کی شاید اس سے بڑھ کر تخلیقی بیوی نے ،سٹیج کی اداکارہ، ہدایت کار بیوی نے شکایت کی کہ تارڑ صاحب ہمارے گھر میں اکثر اوقات کچھ نہیں پکتا لیکن جس شام آپ کی آمد متوقع تھی میں نے کچھ وقت کچن میں بسر کیا اور آپ نہ آئے تو چند انتظامی امور کی گڑ بڑ کی وجہ سے وہ شام میرے کمرے میں ہی برپا ہو گئی۔ عبداللہ حسین، محمد حنیف کے علاوہ اطہر بیگ بھی اس رت جگے میں شریک تھے۔ ساقیا آج مجھے نیند نہیں آئے گی۔۔۔ سنا ہے تیری محفل میں رت جگا ہے۔

کراچی لٹریری فیسٹیول میں متعدد پروگرام بیک وقت ظہور پذیر ہوتے تھے۔ چنانچہ کسی ایک معینہ وقت میں آپ مخمصے میں پڑ جاتے تھے کہ کدھر جاؤں، کہاں جاؤں۔۔۔ میں ذاتی طور پر قائداعظم کے بعد صرف دو پاکستانیوں کی دل سے تحریم کرتا ہوں۔ ڈاکٹر عبدالسلام اور عبدالستار ایدھی۔۔۔ ایدھی صاحب میرے لیے عہد حاضر کے ایک ولی ہیں جن پر میرا ایمان ہے۔ تو اُس روز ”اردو ناول۔۔۔ کل۔ آج اور کل“ کے مذاکرے میں انتظار حسین، حسن منظر، اطہر بیگ کے علاوہ میں بھی شامل تھا اور برابر کے ہال میں ایدھی صاحب

تشریف فرما تھے۔ میں نے منتظمین سے گزارش کی کہ مجھے معاف کیا جائے میں ایدھی صاحب کے درشن کرنا چاہتا ہوں لیکن شنوائی نہ ہوئی۔

اردو ناول کے بارے میں اس سیشن کے اختتام پر ایک صاحب کھڑے ہو گئے اور ماڈریٹر سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "میں ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں" تو اُنہیں کہا گیا کہ سیشن کا وقت ختم ہو چکا آپ سوال نہیں پوچھ سکتے تو انہوں نے نہایت ادب سے کہا کہ ۔۔۔ آپ اس سیشن کے دوران کشور ناہید، رضیہ فصیح احمد یا راحت سعید سے باتیں کرتی رہیں جبکہ ہم ہیں جو سٹیج پر براجمان لوگوں کی کتابیں خریدتے ہیں اور پڑھتے ہیں اور یہ جو انتظار اور تارڑ ہیں یہ صرف ہم جیسے پڑھنے والوں کی وجہ سے بڑے ادیب ہیں۔۔۔ میں بدتمیزی کروں گا اور سوال ضرور پوچھوں گا۔۔۔ پورا ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔ بعد ازاں اس شخص کے ہمراہ درجنوں پڑھنے والے سمندر کنارے میرے رفیق ہوئے۔

کراچی لٹریری فیسٹیول نے پاکستان کے نسلی اور مذہبی تعصب سے مسخ شدہ چہرے کو ایک روشن اور تخلیقی شناخت ہے جو ہماری اصل شناخت دی ہے جو ہماری اصل شناخت ہے اور میں امینہ سید اور آصف فرخی کو اس شناخت کی دریافت پر مبارکباد دیتا ہوں۔

13/3/13

یہ دھواں کہاں سے اٹھتا ہے

مستنصر حسین تارڑ

ویسے تو پوری دنیا میں ایسے "پروفیشنل" لوگ ہیں جنہیں اپنے عزیزوں کی موت پر گریہ وزاری کرنے کے لیے کرائے پر حاصل کیا جاتا ہے۔ اگرچہ ان میں نہایت مؤقر عالم دین بھی شامل ہوتے ہیں لیکن ان کے تذکرے سے گریز کرتے ہوئے میں راجستھان کی "رُودالی" عورتوں کا حوالہ دوں گا جو نسل در نسل سینہ کوبی، ماتم اور رونے پیٹنے کے فن میں کمال حاصل کر چکی ہوتی ہیں۔ ہمارے پنجاب کے دیہات میں بھی ایک زمانے میں ایسی خواتین ہوا کرتی تھیں اور اُن کی بہت قدر کی جاتی تھی کہ وہ کسی بھی مرگ پر۔۔۔ چاہے انہیں مر چکے شخص کا نام بھی معلوم نہ ہو۔۔۔ ایک لمحے کے نوٹس پر یوں دھاڑیں مار مار کر رونے لگتی تھیں، بین کرتی، بال کھولے، نامعلوم انتقال شدہ شخص کے لیے آہ و زاری کرتی تھیں کہ انسان تو کیا چرند پرند بھی آبدیدہ ہو جاتے تھے۔

صد افسوس کہ یہ ماتمی روایت ختم ہو چکی۔ اب ہم بین کرنے کے لیے "رُودالی" عورتوں کو کرائے پر حاصل نہیں کر سکتے۔۔۔ اور مجھے ان دنوں ان کی کمی اور نایابی شدید طور پر دکھ دے رہی ہے۔ مجھ پر وہ زمانے آ چکے ہیں جب میں خود سینہ کوبی کرتے ، ماتم کرتے، آہ و زاری کرتے کرتے تنگ آ چکا ہوں۔۔۔ میری آواز بھرا چکی ہے اور میرے سینے پر اتنے داغ ہیں کہ مزید ایک داغ کی گنجائش نہین تو ان زمانوں میں، میں چاہتا ہوں کہ میں تو عاجز آ چکا ہوں ماتم کرتے، احتجاج کرتے اور آنسو بہاتے، تو کوئی اور آئے بے شک کرائے پر آئے اور میرے لیے دھاڑیں مار مار کر روئے، چرند اور پرند کو بھی آبدیدہ کر دے۔

مجھے روتے ہوئے ایک مدت ہو چکی ہے اور مجھ میں سکت نہیں ہے کہ میں بہت پرانے زمانے کے تذکرے چھیڑ دوں۔۔۔ صرف گزرے ہوئے چند برسوں کا قصہ بیان کرتا ہوں۔۔۔ یہ قصہ شانتی نگر کے نذر آتش کرنے، انسانوں کو زندہ جلا دینے سے شروع ہوتا ہے۔۔۔ پھر ماڈل ٹاؤن میں ایک احمدی عبادت گاہ میں درجنوں پاکستانیوں کی ہلاکت سے شروع ہوتا ہے۔ گوجرہ میں ایک ہجوم کے غضب سے جلائے ہوئے گھروں سے شروع ہوتا ہے۔ کوئٹہ میں معصوم اور چپٹی ناکوں والے دل کش شکل کے ہزاروں کے قتل عام سے شروع ہوتا ہے۔ کراچی کے عباس ٹاؤن کے کھنڈروں میں دفن بچوں اور عورتوں سے شروع ہوتا ہے۔ جس پر کوئی مذہبی جماعت نہ احتجاج کرتی ہے، نہ لونگ مارچ کرتی ہے۔ ان کے لیے ہزارہ قبیلے کی ہلاک شدہ درجنوں بچیوں

کی معصومیت کا کچھ مقام نہیں ۔ میری بیٹی ڈاکٹر عینی مجھے فلوریڈا سے فون کرتی ہے اور وہ رو رہی ہے کہ ابو انہوں نے لاہور میں کنگ ایڈوڈز کالج کے پروفیسر اور اُن کے بیٹے کو ہلاک کر ڈالا۔۔ وہ کتنے نفیس اور خوش لباس ٹیچر تھے میں بتا نہیں سکتی۔۔ امریکہ میں اُن کے جتنے بھی طالب علم رہے ہیں وہ ایک دوسرے کو فون کر رہے ہیں کہ اُن کا کیا قصور تھا۔ ابو یہ۔۔ میرا ملک کیسا ملک ہو گیا ہے۔ آپ کچھ تو کریں۔۔ میرے بہت سے ڈاکٹر کولیگ جو پاکستان واپس آنے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہے تھے وہ اپنے پروفیسر اور اُن کے بچے کو ہلاک کیے جانے کے بعد سوچ میں پڑ گئے ہیں۔

شانتی نگر، گوجرہ اور پھر۔۔ بادامی باغ۔۔ سبحان اللہ تقریباً سات ہزار افراد نہایت شغل اور ایمان کی شمعوں سے بھڑکتے۔ تقریباً ڈیڑھ سو عیسائی گھروں کو آگ لگا دیتے ہیں اور اُن میں ایک مقدس کلیسا بھی آتش کی نذر ہو رہا ہے اور اس میں یقیناًبائبل کے نسخے بھی ہوں گے جن کے اوراق جل گئے۔۔ اخباری رپورٹ کے مطابق یہ تنازعہ تب شروع ہوا جب ایک حجام مسلمان اور ساون عیسائی جو کہ نہایت گھرے دوست تھے شراب کی فروخت کے تنازعے پر اُلجھ پڑے اور دونوں اس لمحے شراب میں غرقاب تھے۔ حجام صاحب سیدھے تھانے گئے اور ساون پر الزام لگایا کہ وہ تو مرتکب ہو رہے ۔ چنانچہ ۔۔ اس عیسائی بستی کو نذر آتش کرنا عین ایمان ٹھہرا۔ بدبخت ساون اب پولیس کی حراست میں ہے اور کیفر کردار کو پہنچے گا جب کہ حجام مزے سے لوگوں کی حجامت بنا رہا ہے ۔

ٹیلی ویژن سکرین پر سینہ کوبی کرتی عورتیں، روتے ہوئے بچے اور آبدیدہ نوجوان ہیں جن کے گھروں کو جلا دیا گیا۔ اُن کا اسباب لوٹ لیا گیا۔ البتہ ایک کرم ہوا کہ پولیس نے اس عیسائی بستی کے سب کے سب مرتکب مکینوں کو خبردار کر دیا کہ اپنے گھروں سے نکل جاؤ، اپنی جان بچا لو کہ ”اہل ایمان“ تمہیں بھسم کرنے کے لیے کل چلے آ ئیں گے اور ہم تمہیں نہیں بچائیں گے۔ پولیس کا فرض ہے مدد آپ کی۔ منیر نیازی نے کہا تھا کہ

اس شہر سنگ دل کو جلا دینا چاہیے

اور پھر اس کی خاک کو بھی اڑا دینا چاہیے

چنانچہ شہر تو سنگدل نہ تھا، بے مثال تھا لیکن اس میں بسنے والے ”اہل ایمان“ نے اسے جلا دیا۔ میرے ایک انجینئر دوست بلوچ صاحب کہنے لگے ”تارڑ صاحب۔۔ میں نے ایک سلگتے ہوئے کھنڈر کے پس منظر میں ٹیلی ویژن پر ایک عیسائی عورت کو بین کرتے دیکھا اور وہ کہہ رہی تھی۔۔ میں نے ان لوگوں کے گھروں میں صفائیاں کر کے۔۔ ان کی گندگی دھو کر اپنی بیٹی کے جہیز کے لیے دو تولے سونا بنایا تھا۔۔ ان کی غلاظت صاف کر کے اور یہ ظالم وہ بھی لوٹ کر لے گئے ۔ بلوچ صاحب کی آنکھوں سے یکدم آنسوؤں کی ایک آبشار گرنے لگی۔۔ میرے دوست ڈاکٹر انیس احمد کی دانشور اور شاعرہ بیٹی ڈاکٹر تزئین نے اگلی صبح ایک خاکروب کو ماڈل ٹاؤن کے فٹ پاتھ پر نہایت دلچسپی سے جھاڑو دیتے دیکھا تو کہنے لگی ”ابو۔۔ یہ لوگ اب بھی ہماری غلاظت اور کوڑا کرکٹ کو صاف کر رہے ہیں۔۔ ”تو، ڈاکٹر انیس نے کہا“ بیٹی یہ لوگ اور کیا کریں، کہاں جائیں، یہی ان کا وطن ہے۔۔ ”یہ مجبور ہیں، کیا کریں“ میرا خیال ہے ان کو ان کی ایمانداری اور رزق حلا پر یقین رکھنے کی سزا مل رہی ہے۔ ہمارے دیہات میں فصل کی کٹائی اور ہوائی کے موقع پر ہمیشہ عیسائی مزدوروں کو ترجیح دی جاتی تھی کہ وہ ایماندار ہوتے ہیں اور بدن توڑ مشقت کرتے ہیں۔ ادھر شہروں میں بھی عام طور گھریلو ملازموں کے لیے عیسائی خاندانوں سے رجوع کیا جاتا ہے۔۔ کہ ان کی اکثریت ایماندار ہوتی ہے۔ مجھے یاد ہے ہمارے صفائی کے لیے ایک اماں آیا جایا کرتی تھیں، جب بہت بوڑھی ہو گئیں اور فرش پر گھسٹ گھسٹ کر ٹاکی پھیرتی تھیں تو ایک روز میمونہ نے کہا ”اماں۔۔ تم نے ہماری بہت خدمت کی ہے۔ تم اب بڑھاپے کے ہاتھوں لاچار اور معذور ہو رہی ہو تو میری درخواست ہے کہ تم آرام سے گھر بیٹھو۔۔ تمہاری ماہانہ تنخواہ انشاء اللہ تمہارے گھر پہنچ جایا کرے گی“ تو اماں نے شکر گزار ہو کر قدرے درشتگی سے کہا ”بی بی۔۔ مجھے آپ کی خیرات کی ضرورت نہیں۔۔ جب تک مجھ میں جان ہے، کام کروں گی اور رزق حلال کماؤں گی“۔

خیبر پختونخوا میں کچھ عرصہ پیشتر ایک قدیم اور تاریخی کلیسا جلا دیا گیا تو ذرا تصور کیجیے کہ اُن کے دل

یہ کیا گزری ہو گی جن کی جبینیں وہاں سجدہ ریز ہوتی تھیں اور اُس پیغمبر کی پیروی کرتی تھیں جس کا دیگر پیغمبروں کی نسبت قرآن پاک میں زیادہ تذکرہ ہے... صرف موازنے کے لیے تصور کیجیے کہ جب بابری مسجد ڈھائی گئی تو ہمارے دلوں پر کیا گزری تھی۔ تو حضور اب تو مجھ میں سکت نہیں رہی آہ و زاری کرنے کی، گریہ کرنے کی، میں کسی ”رودالی“ کی خدمات حاصل کرنا چاہتا ہوں کہ وہ میرے لیے روئے اور بین کرے... بادامی باغ کے ڈیڑھ سو عیسائی گھروں کے سلگنے سے جو دھواں اٹھتا ہے وہ میر تقی میر کے لفظوں میں دیکھو تو دل سے اٹھتا کہ جاں سے اٹھتا ہے... یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

20/3/13

“فرخ سہیل گوئندی اور فریدالدین عطار’

مستنصر حسین تارڑ

یہ ان دنوں کا قصہ ہے جب میں انگلستان سے واپسی پر چیمبر لین روڈ پر واقع اپنے والد صاحب کی دکان ”کسان اینڈ کمپنی“ میں ان کی معاونت کرتا تھا... معاونت تو خیر میں نے کیا کرنی تھی، جونہی میرے ابا جی دوپہر کے وقت کاروبار میرے سپرد کر کے گھر لوٹ جاتے تو وہاں بھانت بھانت کے ادب سے وابستہ حضرات کا تانتا بندھ جاتا... میرزا ادیب نہایت باقاعدگی سے آتے، کبھی کبھار اشفاق احمد بھی آ نکلتے کہ وہ ان دنوں اندرون شہر نہ صرف ایک کبابیے کی شاگردی اختیار کر کے کباب تیار کرنے کے فن میں کمال حاصل کر رہے تھے بلکہ ایک ترکھان سے لکڑی کا کام بھی سیکھ رہے تھے... وہ میرے ابا جی کے دوست تھے اور ان سے زراعتی مشورے لیتے رہتے... کم از کم دو بار جسٹس رستم کیانی بھی تشریف لائے۔ فخر زمان اکثر آیا کرتا... بعدازاں امجد اسلام امجد اور عطاء الحق قاسمی کا آنا جانا شروع ہوا جنہوں نے میرے اولین سفرنامے ”نکلے تری تلاش میں“ سے متاثر ہو کر مجھے کھوج نکالا۔ یوسف کامران، اختر کاظمی، اقبال ساجد، مرزا اطہر بیگ، ذوالفقار تابش، ملکہ پکھراج، منظو رجھلّا (وے میں چوری چوری تیرے نال لا لیّاں اکّھاں وے)... جمیلہ ہاشمی کے خاوند سردار صاحب، صابر ظفر، رحمان مذنب... مختصراً یہ کہ شاید پاک ٹی ہاؤس کے سوا اس دکان پر ادیبوں کا بہت آنا جانا رہا... اور ہاں میں راشد حسن رانا، حفیظ تائب، شریف کنجاہی، مقبول جہانگیر کو بھول رہا ہوں... ویسے اختر شیرانی بھی ابا جی کے دوست تھے اور ایک آدھ بار حفیظ جالندھری نے بھی قدم رنجہ فرمایا... لیکن تب میں انگلستان میں تھا... تو انہی دنوں ایک روز تلمیذ حقانی جو کہ میرے محسن تھے جنہوں نے میرے پہلے سفرنامے کی اشاعت میں مدد کی۔ ایک نوجوان کو اپنے ہمراہ لے کر آئے کہ یہ بھی آپ کا شیدائی ہے... گھومنے پھرنے کا شوقین ہے، ترکی سے خصوصی اُلفت رکھتا ہے... والد صاحب شاہ عالمی میں عطریات کا کاروبار کرتے ہیں لیکن اسے بائیں بازو کی سیاست، سیاحت اور ادب سے شغف ہے۔ یہ نوجوان ازحد مضطرب اور متحرک تھا... بعدازاں وہ اکثر میری دکان پر آ بیٹھتا اور ترقی پسند نظریات کی فلسفیانہ تشریح کر کر کے میرا دماغ چاٹ جاتا... یہی نوجوان چند روز پیشتر میرے گھر آیا اور اب وہ ادھیڑ عمری میں قدم رکھ رہا تھا اگرچہ باتیں کرنے میں وہ اب بھی وہی پُرطیش اور پُرجوش نوجوان تھا... یہ فرخ سہیل گوئندی تھا۔ ایک پبلشنگ ہاؤس کا مالک اور ایک غیرملکی خاتون کا شوہر نامدار جو دانشوری میں اس سے بھی دو ہاتھ آگے تھی۔ ان تیس چالیس برسوں میں ہمارا رابطہ منقطع نہ ہوا تھا۔ وہ کبھی دلّی میں ضیاء الحق کی آمریت کے خلاف احتجاج کر رہا ہوتا اور کبھی لبنان یا ترکی میں سرگرم عمل ہوتا... یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک زمانے کا سیاسی احتجاجی اب ایک مستحکم سیاسی اور نظریاتی فلسفی ہو چکا تھا... اگرچہ اب بھی باتیں بہت کرتا تھا... پاکستان میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو تُرکی کی ثقافت اور سیاست پر گوئندی سے زیادہ عبور رکھتا ہو۔ ترکی کے بہت سے بڑے سیاستدانوں سے اس کے ذاتی تعلقات ہیں۔

تو یہی گوئندی چند روز پیشتر میرے گھر آیا اور اس نے خصوصی طو رپر یشار کمال کے اہم ناول کا اردو ترجمہ ”بُوئے گُل“ مجھے پیش کیا اور کہنے لگا ”تارڑ صاحب آپ کو شاید یاد نہ ہو لیکن جب میں تلمیذ حقانی کے

ہمراہ آپ کی دکان پر آیا کرتا تھا تو یہ آپ تھے جنہوں نے یشار کمال کے اس ناول کے بارے میں مجھے بتایا تھا اور میں اس سے پیشتر اس عظیم ترک ناول نگار سے واقف نہ تھا"۔

میں یشار کمال کا تفصیلی تذکرہ کرنے سے گریز کرتا ہوں۔۔ میں اس کے ناولوں کا اتنا گرویدہ تھا کہ جب سلجوق نیشنل کالج آف آرٹس کے ایک طالب علم کے طور پر ترکی گیا تو میں نے اپنا سفرنامہ "خانہ بدوش" اس کے حوالے کیا کہ بیٹا یشار کمال استنبول میں مقیم ہے۔۔ کسی طور میرا یہ سفرنامہ اگرچہ وہ اسے پڑھ نہ سکے گا اسے پہنچا دینا اور کہنا کہ یہ اس کے ایک مرید کا نذرانہ ہے۔ سلجوق پاکستان واپس آیا تو کہنے لگا "ابا جی آپ تو مجھے مروانے لگے تھے، استنبول کے پریس کلب میں جب میں نے یشار کمال کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں رہتا ہے تو ایک ترک صحافی میرا بازو تھام کر مجھے کلب سے باہر لے گیا اور کہنے لگا، اے نوجوان پاکستانی کیا تم نہیں جانتے کہ ترکی کے سب سے بڑے ناول نگار یشار کمال کا ترکی میں نام لینا ایک جرم ہے۔۔ تم گرفتار ہو سکتے تھے۔ یشار کمال ایک کُرد ہے اور متعدد بار اس کا نام نوبل پرائز کے لئے منتخب ہوا لیکن ترک حکومت نے احتجاج کیا اور وہ اس انعام سے محروم رہا، اس لئے کہ وہ ایک کُرد ہے۔ اور نہ صرف ترک۔۔ بلکہ ایرانی، شامی اور عراقی ان کُردوں سے شدید نفرت کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ صلاح الدین ایوبی سے بھی کہ۔۔ وہ بھی ایک کُرد تھا۔ دمشق میں اس کے مزار پر تب میں تھا جو فاتحہ پڑھ رہا تھا، میرے سوا ویرانی تھی۔

اور یشار کمال کے ساتھ۔۔ اس کے عظیم ناولوں کے اعتراف میں میری الفت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ جیسے میں نے اپنی اکلوتی بیٹی کا نام قرۃ العین طاہرہ اور قرۃ العین حیدر کی مناسبت سے رکھا تو اپنے پہلے پوتے کو یشار کا نام دیا۔۔ چنانچہ گوئندی نے میرا ایک خواب پورا کر دیا۔۔ مکتبہ فرینکلن نے "ونڈز فرام دے پینسز" کے نام سے یشار کمال کا انگریزی میں ترجمہ آج سے تقریباً چالیس برس پیشتر شائع کیا تھا، گوئندی نے آج اسے اپنے اشاعتی ادارے کی جانب سے "بُوئے گُل" کے نام سے اردو میں منتقل کر دیا تھا۔

ہم چونکہ مجموعی طور پرایک کوتاہ نظر قوم ہیں اس لئے ذلت اور رسوائی میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ یعنی ہم مغرب بشمول روس، امریکہ اور جنوبی امریکہ کے بڑے ادب سے تو شناسائی رکھتے ہیں لیکن۔۔ ہمیں اپنے آس پاس کی کچھ خبر نہیں۔۔ عرب دنیا میں، افریقہ میں، ہندوستان میں کیا لکھا جا رہا ہے ہمیں کچھ خبر نہیں اور جن ملکوں کے ساتھ ہم اپنے اسلامی روابط کا تذکرہ کرتے نہیں تھکتے، ایران اور ترکی، حرام ہے ہمیں وہاں تخلیق کئے جانے والے ادب کے بارے میں کچھ آگاہی ہو۔۔ ترکی کے ادب کے بارے میں تھوڑا بہت ناظم حکمت کا تذکرہ ہوتا ہے اور وہ بھی صرف اس لئے کہ فیض صاحب اور نرودا اُن کے مداح تھے۔۔ یا پھر فیشن ایبل دانشور ان دنوں ارہان پاموک کی جانب صرف اس لئے مائل ہوئے کہ انہیں ادب کا نوبل انعام عطا کیا گیا۔۔ وہ نہیں جانتے کہ ایک ارہان کمال بھی تھا اور یہ گوئندی ہے جس نے اس کے ناول اردو میں شائع کر کے ہم نابیناؤں کو اس سے متعارف کروایا۔۔ بلکہ عہد حاضر میں ترکی کے جو بڑے ناول نگار ہیں ان کی تخلیقات کے ترجمے بھی پاکستان میں پہلی بار شائع کئے۔۔ ان میں اویابیدر کا کُرد۔ ترک تنازع پر لکھا گیا ناول "گرفتار لفظوں کی رہائی" اور مایہ ناز ترک ادیبہ عدالت آ عولو کا ناول "انجام بہاراں" بھی شامل ہیں۔ ان دو ناولوں کا ترجمہ کمال کے حسن وخوبی سے ہُما انور نے کیا ہے۔ انہیں پڑھتے ہوئے آپ ایک ایسے جہان میں سفر کر جاتے ہیں جو مغربی اور جنوبی امریکی ناولوں کے جہان سے سراسر ایک الگ دنیا ہے۔۔ ترک احساس کے لہجے بالکل جداگانہ ہیں اور آپ کو یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم پاکستانی آخر ایسے بڑے ناول کیوں نہ لکھ سکے؟ شایداس لئے کہ ہم زبان اور محاورے میں اپنی تہذیب سے جدا ہو کر ایک اجنبی تہذیب کی نقالی میں مشغول رہے۔۔ نقل کبھی بھی بمطابق اصل نہیں ہو سکتی۔۔ میں اکثر یشار کمال کا یہ قول درج کرتا ہوں کہ جب تک ایک ادیب اپنی دھرتی کے بارے میں آگہی نہیں رکھتا۔۔ اس کی فصلوں، موسموں، شجروں، ندی نالوں اور روایتوں کے ساتھ نہیں جُڑتا۔۔ یہاں تک کہ کسی گھنے جنگل کے اندر جو ایک تالاب ہے اس کے پانیوں میں پرورش پانے والے کیڑے مکوڑوں کو نہیں جانتا تو۔۔ وہ کبھی ایک بڑا ناول نگار نہیں ہو سکتا۔۔ اور جب تک وہ اپنے مذہبی تعصب سے بالاتر ہو کر ایک ہمہ گیر انسانیت کی سطح پر آ کر نہیں

لکھتا۔۔ وہ ایک بڑا تخلیق کار نہیں ہو سکتا۔۔ میں ذاتی طور پر گوئندی کا احسان مند ہوں کہ اس نے عہد جدید کے بڑے ناول نگاروں کو اردو میں مجھ تک پہنچایا۔ اس سے پیشتر میں جدید ترک ادب سے نابینا تھا اور اُس نے مجھے بینا کیا۔ بے شک ایک ناشر کی حیثیت سے یہ ایک گھاٹے کا سودا ہے، پر گوئندی ایسے سودائی کہاں سودوزیاں کے جھمیلوں میں پڑتے ہیں۔۔ اگرچہ میں موازنہ نہیں کر رہا لیکن ایک فرید الدین عطار تھا جس نے عطر فروشی ترک کر کے تصوف کی راہ اختیار کی اور گوئندی بھی تو ایک عطار ہوا کرتا تھا جس نے یہ پیشہ ترک کر کے سیاست، ادب اور اشاعت کا پیشہ اختیار کیا

21/3/13

"میاں فرزند علی۔۔ کوہ نورد جو فنا کی وادی میں اتر گیا"

مستنصر حسین تارڑ

پاکستانی شمال سے میرے عشق کی کہانی بہت پرانی ہے۔۔ آج سے تقریباً چھپن برس پیشتر میں گورنمنٹ کالج لاہور کی بلکہ پاکستان میں کسی بھی کالج کی پہلی کوہ پیما مہم میں شریک ہوا اور ہم نے وادی کاغان میں واقع رتّی گلی چوٹی سر کی۔۔واپسی پر سب ممبران کے لئے کوہ پیمائی کا کلَر پرنسپل صاحب نے اعلان کیا۔۔ میرے عزیز دوست اشرف امان جو کے۔ٹو فتح کرنے والے پہلے پاکستانی ہیں اور نذیر صابر جو ایورسٹ پر قدم رکھنے والے پہلے پاکستانی ہیں ہمیشہ محبت سے لیکن نیم سنجیدگی سے کہا کرتے تھے کہ تارڑ صاحب آپ کوہ پیمائی میں ہم سے سینئر ہیں اس لئے ہم آپ کا احترام کرتے ہیں۔ یورپ میں بھی وہاں جیسے کیسے بھی پہاڑ تھے، انگلستان اور سوئٹزرلینڈ میں، میں ان میں بھٹکتا پھرا۔۔
پاکستان واپسی پر لکھنے لکھانے کے جنون میں بلند پہاڑوں کو بھول گیا اور پھر جب میں جوانی کے بخار کی حدّت کم ہونے پر ادھیڑ عمری میں قدم رکھتا تھا تو میں اپنے ساتویں یا شاید آٹھویں جماعت میں پڑھتے بیٹے سلجوق کے ہمراہ ہنزہ کے سفر کے لئے آمادہ ہوا اور واپسی پر پاکستانی شمال کے بارے میں اپنی تادم تحریر درجن بھر کتابوں میں سے پہلی کتاب "ہنزہ داستان" تحریر کی۔۔ بعدازاں بلتستان ایسے خوبصورت حیرتوں کے خطے میں بھی دربدر ہونے کا تفاق ہوا۔۔ 1991ء میں کسی ایک شب کچھ دیر پہلے نیند سے خیال آیا کہ یہ جو عارضی ثُرت کی چکاچوند ہے اس سے فرار ہو کر کسی ایسی بلند تنہائی میں اترا جائے جہاں کوئی پہچان نہ ہو، میری ذات ہو اور قادر مطلق کی موجودگی ہو اور اس کی موجودگی اگرچہ شہ رگ سے بھی نزدیک ہے لیکن وہاں اس کی موجودگی کے مظہر کا جلال و جمال ہو۔۔ پاکستان میں سب سے بلند ۔۔ ایورسٹ کے بعد سب سے بلند تنہائی سر بہ فلک کے۔ٹو کے برفانی اہرام کی تھی۔ بس وہاں جانا ہے۔۔ اس مہم کی تشکیل ہوتی چلی گئی۔۔ نیشنل فیڈ اور مینو فروزن فوڈ لئے عامر آ گئے۔۔ ڈاکٹر شامل ہو گئے۔۔ شاہد عزیز میرے ایک پڑھنے والے اپنے ہمراہ ایک معنک اور منحنی سے حضرت کو لے کر آئے کہ یہ میرے قریبی دوست میاں فرزند علی ہیں، میری طرح قانون کی پریکٹس کرتے ہیں، پہاڑوں کے شیدائی ہیں تو یہ بھی آپ کے ہمراہ کے۔ٹو جانا چاہتے ہیں۔ میں نے نہایت احترام سے کہا کہ میاں صاحب۔۔ آپ کی صحت کچھ مخدوش سی ہے ۔۔ کے۔ٹوکے دامن میں جو گلیشئر ہیں وہاں ایسی تند برفانی ہوائیں سنسناتی ہیں کہ بھاری پتھر اُڑے جاتے ہیں تو آپ کا وجود تو ان ہواؤں کے پہلے جھونکے سے ہی محو پرواز ہو جائے گا۔۔ یہ میاں صاحب اپنی عینک کے پیچھے مسکراتے رہے اور پھر کہنے لگے "تارر صاحب۔۔ ہم نے ناں اپنے بچپن میں گھوری کی سواڑی کی ہے۔۔ آپ نے کبھی گھوری کی سواڑی کی ہے؟" میں نے ذرا ناراض ہو کر کہا، میاں جی گھوڑی کی سواری کا کوہ پیمائی سے کیا تعلق؟ تو کہنے لگے۔۔ جناب عالی پہار بھی گھوری کی طرح ہوتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اُن کو سر کرنے کے لئے جو آ رہا ہے وہ گُھر سوار ہے۔۔"
عجیب سی منطق تھی اور میں نے بادل نخواستہ انہیں اپنی ٹیم میں شامل کر لیا۔۔ اب تک یہ تو عیاں ہو

چکا ہو گا کہ میاں صاحب پکے لاہوریے تھے کہ اُن کی ”ر“ آسانی سے ”ڑ“ ہو جاتی تھی اور ”ڑ“ بدل جاتی تھی ”ر“ میں یعنی پکے لاہوڑیئے! آج تقریباً اکیس برس بعد میں سوچتا ہوں کہ اگر میں میاں صاحب کو اپنی کے۔ٹو کہانی میں نہ شامل کرتا تو کتنے گھاٹے میں رہتا۔۔ ایک بے مثال، مخلص اور شاندار شخص سے محروم رہ جاتا۔۔ اگر آپ میرے سفرنامے ”کے۔ٹو کہانی“ کا مطالعہ کریں تو میاں فرزند علی اس کے ہیرو کے طور پر ابھرتے ہیں۔ بعدازاں وہ میری بیشتر کوہ نوردی کی مہموں میں شامل رہے جن میں ”یاک سرائے“ قابل ذکر ہے۔۔۔موصوف اپنی عینک سنبھالتے اپنے نہایت ضعیف جوگرز میں، ہر برفانی پُل صراط، پہاڑی ندیوں کے تندبہاؤ، گلیشئرز اور خوفناک چٹانوں سے چمٹے ہوئے ہر راستے پر سے ایک تتلی کی مانند اڑتے گزر جاتے اور بقیہ ٹیم لرزہ براندام پیچھے رہ جاتی۔۔ ہم منزل پر پہنچتے تو میاں صاحب ہم سے پہلے پہنچ کر رات کے کھانے کا بندوبست کر رہے ہوتے کہ وہ ایک کمال کے باورچی تھے۔۔ نانگا پربت کے دامن میں فیئری میڈو میں انہوں نے جو حلوہ تیار کیا اس کا ذائقہ ایسا تھا کہ ہمیں ہیرامنڈی کا پلنگ توڑ حلوہ یاد آ گیا، لیکن بدقسمتی سے نانگا پربت کے برفوں تلے کوئی ایسا پلنگ نہ تھا ورنہ وہ بھی ٹوٹ جاتا۔
ہم ہمیشہ بقرعید سے پیشتر اپنے ذاتی قصائی سے گوشت کا کچھ ذخیرہ حاصل کر لیتے تھے کہ قربانی کا گوشت قدرے عجیب سا ہوتا ہے لیکن میری بیگم منتظر رہتی کہ میاں صاحب جو گوشت لائیں گے بس وہ اس لائق ہو گا کہ اسے عید کے روز بھونا جا سکے کہ میاں صاحب اپنی لاہوری روایت کے مطابق خوراک کا اور گوشت کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ زندگی نے انہیں اکثر دکھ میں رکھا لیکن وہ ہمیشہ مسکراتے رہے، سکھی ہونے کی اداکاری کرتے رہے۔۔ بیگم نے قبرستان کو پسند کر لیاتو وہ تنہا رہ گئے۔۔ اولاد کے حوالے سے بھی انہیں کچھ امتحان درپیش ہوئے۔ کچھ عرصہ پہلے میرے ہاں تشریف لائے اور اس روز وہ بہت خوش تھے، کہنے لگے، تارڑ صاحب میری بیٹی کی شادی ہے بس یہ آخری بوجھ ہے اور پھر میں آزاد ہو جاؤں گا۔۔ ظاہر ہے میں نے بہرصورت ان کی نہیں اپنی بیٹی کی شادی میں شرکت کرنی تھی۔۔ میاں صاحب ایک تھری پیس سوٹ میں ملبوس نہایت بانکے لگ رہے تھے۔ ان کا بیٹا شادی کے انتظامات میں بھاگا پھرتا تھا۔۔ مجھ سے کہنے لگے ”میری بیٹی کے ساتھ تصویر تو اتروا لیجئے“ اور بیٹی دلہن کے روپ میں اپنے باپ کے تیکھے نین نقش میں کیسے دل میں اترتی چلی جاتی تھی۔۔ یہ ایسا بوجھ تو نہ تھا جسے اتارا جائے لیکن کیا کریں کہ اسے رخصت کرنے کے سوا اور کوئی چارا بھی تو نہیں۔
ایک شب۔۔ تقریباً آٹھ بجے میرے موبائل پر ”میاں فرزند علی“ کا نام روشن ہوا، میں نے اسے چھو کر آن کیا اور کہا ”ہاں جی میاں صاحب۔۔ ایورسٹ پر چلنا ہے“ تو اُدھر سے ایک آواز ابھری ”تارڑ صاحب۔۔ میں اُن کا بھائی بول رہا ہوں، میاں صاحب کا انتقال ہو گیا۔۔ رات دس بجے میانی صاحب کے قبرستان میں ان کی تدفین ہے“۔
میری ایک ویب سائٹ پر جب ان کی موت کی خبر درج ہوئی اور اس کے ہمراہ میری اور ان کی بلند پہاڑوں کے پس منظر میں ایک تصویر تھی تو پورے پاکستان سے میرے سفرنامے پڑھنے والوں کے تعزیتی پیغام بے شمار آئے۔۔ کہ آپ کا سب سے پسندیدہ کوہ نورد ساتھی ہمارا بھی پسندیدہ تھا۔
میاں صاحب موت کے تاریک گلیشئر کی دراڑ میں چلے گئے۔
کے۔ٹو کہانی“ اپنے انجام کو پہنچ گئی۔”
میں فنا کی وادیوں میں میاں صاحب کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں۔ اگر وہ نہیں ملتے تو میں کیسے آئندہ ان کے بغیر برفیلی بلندیوں کے سفر اختیار کر سکتا ہوں؟
مستنصر حسین تارڑ
کالم

امینہ سید اور آصف فرخی کا معجزہ
کراچی لٹریری فیسٹول کی پہلی شب بیچ لگژری ہوٹل کے ڈنشا آواری نے دنیا بھر سے آئے ہوئے ادیبوں اور فنون لطیفہ سے وابستہ لوگوں کے اعزاز میں ڈنر کا اہتمام کیا تھا اور ان کی رہائش گاہ کی چوکھٹ پر دونہایت دیدہ زیب لحیم شحیم کتے استراحت فرماتے تھے، لگتا تھاکہ انہیں مہمانوں کے دعوتی کارڈ چیک

کرنے کیلئے وہاں بٹھایا گیا ہے...بیشتر لوگ ان سے کترا کر نکلتے تھے لیکن میں نے آگے بڑھ کر انہیں ایک دوستانہ" ہیلو" کہا کہ میں اپنا کارڈ کمرے میں بھول آیا تھا اورانہوں نے جواب میں وف وف کرکے مجھ سے الفت کا اظہار کیا اور اندر جانے کی اجازت مرحمت فرمادی...ڈنشا آواری کی یہ رہائش گاہ ہوٹل سے متصل تھی جس کا لان سمندر پر کھلتا تھا...کھانے اور خاص طورپر پینے کا وافر انتظام تھا...انگریزی میں ادب سے متعلق لوگوں کو لٹراٹی کا نام دیاگیا اور متمول اورمشہور لوگوں کو دمکتے لوگ یعنی گلٹراٹی کہا جاتا ہے تو یہاں بے چارے لٹراٹی حیران پھرتے تھے اور گلٹراٹی چمکتے دمکتے راج کرتے تھے، میں سرجھکائے کشور ناہید کے پہلو میں جا بیٹھا جنکے پہلو میں زاہدہ حنا اور حسینہ معین بھی بیٹھی تھیں، ایک نہایت عمر رسیدہ اور معنک خاتون قدرے مسرور کیفیت میں میرے قریب آکر کہنے لگیں، تارڑ صاحب ... آپ حسب معمول حسیناؤں میں گھرے بیٹھے ہیں تو میں نے کہاکہ اے مہربان خاتون آپ اپنی عینک کا نمبر دوبارہ چیک کروا لیجئے کہ آپ کو یہ بہر طورمجھ سے کم سن خواتین حسینائیں نظر آرہی ہیں...البتہ حسینہ معین تو ہیں ہی حسینہ اور میں نے انہیں ڈرامے کی حسینہ عالم کا خطاب دے رکھاہے....یہاں تک کہ کشور بھی مجھ سے دوچارماہ چھوٹی ہے... تو میں اسے کبھی کبھار چھوٹی کہہ کر پکارلیتا ہوں۔

یہاں پہلی بارآکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی امینہ سید سے ملاقات ہوئی...جو بنیادی طورپر کراچی لٹریری فیسٹول کی ماں ہیں...اگرچہ اس کمال کے بچے کی پیدائش میں آصف فرخی کی معاونت بھی شامل ہے، اگلے تین روز میں جب مجھ پر مختلف چینلز کے کیمروں کے منہ کھلتے تھے تو میں نے ہمیشہ کہا کہ یہ فیسٹول پاکستان کیلئے ایک معجزے سے کم نہیں، اسکے انتظامات اور کارکردگی قابل رشک ہے اور میں نے جو ایک دو بین الاقوامی ادبی فیسٹول اٹینڈ کئے ہیں یہ ان سے کہیں برتر اور بلند درجے پر فائز ہے...یہ ہمارے پاکستان کا اصل چہرہ، اصل شناخت ہے...امینہ سید اور آصف نے میری شمولیت پر خوشی کا اظہار کیا اور آصف نے کہا" تارڑ صاحب کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے..آپ کراچی تشریف لے آئے، تو میں نے عرض کیا کہ آصف کفر تو ایک عرصے سے ٹوٹنا چاہتا تھا پر اسے توڑنے کا اس سے پیشتر کوئی سندیسہ ہی نہ ملا... نہ مجھے نہ عبداللہ حسین کو" اس دوران میرے پسندیدہ ترین ناول نگار" ایکیس آف ایکسپلوڈنگ مینگوز" کے مصنف محمد حنیف سے ملاقات ہوگئی، ان کے ہمراہ ندیم اسلم تھے جن کا ناول" میپ فار دے لاسٹ لَورز" مجھے بے حد پسند آیا تھا... حنیف نے بتایا کہ اگلی شب اسکے ہاں ندیم اسلم بھی موجود ہونگے...حنیف نے لاہور میں مجھ سے رابطہ کرکے مجھے اپنے گھر ایک شام کیلئے مدعو کیا تھا...ندیم ایک محیر العقول شخصیت ہے جس کا تفصیلی تذکرہ میں کسی اور وقت پر اٹھائے رکھتا ہوں، مجھے اس کا ناول" اے ویسٹڈ وجل" پسند نہیں آیا تھا ، تو میں نے کہا ندیم آپ نے ایک نہایت شاندار ناول لکھا ہے اور ایک نہایت ہی برا ناول لکھا ہے، اگلی شام ندیم دعوت میں موجود نہ تھا...حنیف کا کہنا تھا کہ وہ مجھ سے خوفزدہ ہوگیا تھا اسی دعوت کے خمار میں عذرا عباس اور انور سیف رائے سے ملاقات ہوئی اور وہ بھی گزر چکے وقتوں کے سراب میں گم تھے، دیگر مہمان بوجوہ گم شدہ تھے۔

میں نے ہوٹل کے ڈیسک منیجر کامران صاحب سے درخواست کرکے عبداللہ حسین کے لئے اپنے کمرے سے متصل کمرے میں رہائش کا بندوبست کیا تھا تاکہ میں خان صاحب کا دھیان رکھ سکوں، عبداللہ حسین دراصل محمد خان ہیں"اداس نسلیں" کے ناشر نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اپنا کوئی قلمی نام رکھ لیں کیونکہ ان دنوں ہر جانب کرنل محمد خان کی" بجنگ آمد" کے طبل بج رہے تھے چنانچہ انہوں نے اپنے ایک بنگالی رفیق کار کانام اختیار کرلیا...ڈنشا آواری کے ڈنر کے بعد میرے کمرے میں ایک اور محفل کا آغاز ہوگیا جس میں عبداللہ حسین اور محمد حنیف شامل تھے، کچھ دیر بعد مرزا اطہر بیگ بھی شامل ہوگئے...محمد حنیف کا کہنا تھا کہ سر آپ نے ندیم اسلم کو ڈانٹ دیا حالانکہ وہ آپ کے ناول " راکھ" کے بے حد مداح ہے تو میں نے کہا کہ حنیف شاید میں نے کچھ زیادتی کرڈالی لیکن...خوگر حمد سے تھوڑا سا گلا بھی سن لے والی بات تھی، واقعی اس کا دوسرا ناول کم از کم میرے معیار پر پورا نہیں اترتا، حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں ...کوئی

کراچی لٹریری فیسٹول کی تقریب آغاز نہایت متاثر کن تھی...روسی، برطانوی ، اطالوی اور جرمن سفیروں اور

اہلکاروں نے خطاب کیا، بنیادی تقریر گلزار نے کرنی تھی اور ان کا پیغام امینہ سید کو آیا تھا کہ...مجھ سے ناراض نہ ہونا...ندیم اسلم نے اپنے ناول کا ایک اقتباس پڑھا اور حاضرین نے وہاں وہاں داد دی جہاں جہاںنہیں خاموش رہنا تھا کہ زبان انگریزی ہو تو کوئی کیسے چپ رہے، اگر رہے تو جاہل کہلائے...انتظار حسین کے بارے میں ندیم اسلم کا کہنا تھاکہ وہ اس کائنات کے سب سے بڑے ادیب ہیں، یقینا وہ سکول میں جغرافیے میں فیل ہوتے رہے تھے۔

فیسٹول کے آغاز میں جو پروگرام ترتیب دیئے گئے تھے ان میں میرے ساتھ ایک محفل تھی جسے میرے اولین سفرنامے کے حوالے سے" نکلے تری تلاش میں" کا نام دیاگیا تھا، نوجوان اور باصلاحیت کہانی کارعرفان جاوید نے میرے بارے میں تحریر شدہ ایک طویل مضمون" کاہن" کے کچھ اقتباس پیش کئے جنہیں حاضرین نے بے حد سراہا...البتہ محفل کے آغاز میں محمد حنیف نے بھی ایک تعارفی تقریر کی...جو کچھ انہوں نے کہا وہ میں درج اسلئے نہیں کرتا کہ میرے حاسدین کی تعداد میں مزید اضافہ ہو جائے گا... وہاں ...اس محفل میں نہایت نک چڑھے لوگ بھی موجود تھے اور میں ان کا شکر گزار ہوں

حمیرااشتیاق، کشورناہید، رضیہ فصیح احمد، امجد اسلام امجد، بیگم محمد حنیف، راحت سعید اور وہ سینکڑوں لوگ جن کی موجودگی نے ہال کومختصر کر دیا یہاں تک کہ ہال کے باہر برآمدے میں بھی میرے پڑھنے والے میرے محسن کھڑے تھے...میں جانتا ہوں کہ میری اوقات کیا ہے، مجھ میں ایک محدود سی صلاحیت ہے اسلئے میں شکر کرتا ہوں کہ رب نے لوگوں کے دلوں میں مجھے بھر دیا...ہال سے باہر آکر جب میں نے متعدد ٹی وی چینلز کے کیمروں کا سامناکیا تو کیا کسی نے دیکھا کہ میری آنکھوں میں تشکر کی ایک نمی تھی

22/3/13

عالم میں انتخاب۔۔۔ ایم ایم عالم مر گیا

مستنصر حسین تارڑ

وہ عالم میں انتخاب تھا، خود عالم تھا۔۔۔ ایم ایم عالم تھا۔ متحدہ پاکستان کا آخری ہیرو بھی مر گیا۔۔۔

میں اُس کی موت کی تفصیل جاننے کے لیے ریموٹ کا بٹن دباتا چلا جاتا ہوں اس یقین کے ساتھ کہ ٹیلی ویژن چینلز سوگوار ہوں گے، اس کی حیات اور کارناموں پر مبنی پروگرام چل رہے ہوں گے لیکن وہاں تقریباً ہر چینل پر وہی شاطر لُومڑ منحوس شکلوں والے سیاستدانوں اور سیاسی میزبانوں کے چہرے ہیں جو ایک دوسرے کے خلاف زہر اگل رہے ہیں اور اُن کی باچھوں سے جھاگ بہہ رہی ہے۔۔۔ اور وہ آئندہ الیکشن میں سویپ کرنے کے احمقانہ خواب دیکھ رہے ہیں۔۔۔ اُن کے جبڑوں میں اس دھرتی سے نوچا گیا گوشت ہے جس کی وہ جُگالی کر رہے ہیں۔ آخری ہیرو ایم ایم عالم کی موت کا کہیں تذکرہ نہیں۔۔۔ یقیناًبعد میں چند خصوصی پروگرام دکھا دیے جائیں گے اور ایم ایم عالم سے نجات حاصل کر لی جائے گی کہ جس عہد میں طالبان، ملا عمر، اسامہ بن لادن اور جوزف کالونی جلا دینے والے یا ہزارہ کا ہلاکو قتل عام کرنے والے ہیروز قرار پاتے ہیں وہاں ایم ایم عالم ایک شرمندگی تھا تو اس سے نجات حاصل کر لو۔۔۔ اگر ستمبر 1965ء کی جنگ کا تجزیہ کیا جائے تو وہاں ایسے سرفروش اور پاکستان کی سرزمین کو اپنے خون سے سینچنے والے ہیروز جنم لیتے ہیں جن کا ثانی اب کہاں ملے گا کہ بعد ازاں ہم افغانستان کے جہاد کے لیے تو سر بہ کف رہے لیکن مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈال دیے۔ میں نے اپنے ایک ناول میں لکھا تھا کہ یہ کیسے لوگ ہیں جو اپنے آپ کو فاتح افغانستان اور فاتح جلال آباد کہلاتے ہیں لیکن اپنے وطن کے ڈھاکہ اور چٹاگانگ میں سرنگوں ہو جاتے ہیں۔

سرفراز رفیقی، میجر عزیز بھٹی، میجر شفقت بلوچ، جنرل عبدالعلی ملک، سیسل چوہدری، برگیڈیئر شامی اور درجنوں شجاع اور نڈر لوگ جنگ ستمبر کے ہیرو تھے لیکن ان سب میں سے اگر کوئی اقبال کے شاہین کے بلند مرتبے پر فائز ہوا تو وہ ایم ایم عالم تھا۔۔۔ جس نے دشمن کے متعدد جہاز چند لمحوں میں تباہ کر کے ایک عالمی ریکارڈ قائم کیا کہ وہ خود بھی تو ایک عالم تھا۔

یہ 1975ء کے موسم گرما کا قصہ ہے جب میں ترکی کے راستے شام میں داخل ہوا۔۔۔ شامی سرحد کے

کسٹم افسر نے میرا پاسپورٹ الگ کر دیا اور کہنے لگا، تم نہیں جا سکتے۔ اُس نے سرحد پار کر نے والے دیگر سیاحوں کو فارغ کر دیا اور اپنے کھوکھے سے باہر آ کر کہنے لگا "تم اس لیے نہیں جا سکتے کہ تم پاکستانی ہو۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں تمہیں ذاتی طور پر خوش آمدید نہ کہوں اور کافی کا ایک کپ پلانے کے بغیر رخصت کر دوں۔۔ بُھو تو اِز اے گڈ مین"

یہ فقرہ "بُھوتو اِز اے گڈ مین" میں نے شام میں اور خصوصی طور پر دمشق میں ہر جانب سنا۔۔ اور سادہ سی توجیہہ یہ تھی کہ جب عربوں اور اسرائیل کے درمیان جنگ رمضان کا آغاز ہوا، مصریوں نے سویز عبور کر کے اسرائیلیوں کے تمام مورچے تباہ کر کے صحرائے سینا میں پیش قدمی شروع کر دی تو ذوالفقار علی بھٹو نے شام کو پیشکش کی کہ پاکستان آپ کے ساتھ ہے۔ پاکستانی فوج اور فضائیہ آپ کی فوج اور فضائیہ ہے۔ شام نے یہ پیشکش قبول کرتے ہوئے دمشق کے زمینی دفاع کے لیے پاکستانی تو پخانے اور فضائی دفاع کے لیے ایئر فورس کی مدد مانگی۔ اُن کا کہنا تھا کہ ہم شام کی حدود میں رہ کر اسرائیل پر گولا باری کرنا چاہتے ہیں اور جب شامی پائلٹ اسرائیل پر حملے کرنے کے لیے پرواز کر جائیں تو کیا پاکستانی پائلٹ دمشق کے آسمانوں پر اڑان کرتے اسے اسرائیلی طیاروں سے بچا سکتے ہیں اور پھر اس فلک نے دیکھا کہ ایسا ہی ہوا۔۔ اور دمشق کے آسمانوں پر دنیا کے اس قدیم ترین شہر کو اسرائیلیوں سے بچانے کے لیے کون پرواز کرتا تھا۔۔ جی ہاں وہی ہمارا شہباز کرے پرواز۔۔ ایم ایم عالم۔۔

دمشق میں میرا دوست۔۔ تلمیذ حقانی کے توسط سے قریب آنے والا اور رضی شیخ کا کولیگ مظہر قیوم پاکستانی سفارت خانے میں فرسٹ سیکرٹری تھا۔۔یعنی 1975ء میں۔۔ مجھے نہ صرف بی بی زینب کے "زینوبیہ" لے گیا بلکہ اُس نے شامی وزارت دفاع سے گولان ہائٹس یعنی جولان کی پہاڑیوں تک جانے کا اجازت نامہ بھی حاصل کر لیا۔۔ اور گولان کے دوسری جانب اسرائیل تھا۔ اس اجازت نامے پر میرا نام "السیدی مستنصر حسین ترار" درج تھا جس کی بنیاد پر میں نے وطن واپسی پر اپنے آپ کو ایک ایسا سید ڈیکلیئر کر دیا جس کی گواہی ایک عرب قوم نے دی تھی۔ یہ الگ بات کہ انہوں نے جواہر لال نہرو کو بھی السیدی کے لقب سے نوازا تھا۔ گولان پہاڑیوں کی جانب سفر کرتے بائیں جانب ایک وسیع مالٹوں کا باغ نظر آیا اور مظہر نے بتایا کہ پاکستانی توپ خانہ اس باغ میں پوشیدہ اسرائیل پر گولے برساتا تھا۔

دمشق میں قدم قدم پر ایک پاکستانی کی حیثیت سے میری بلائیں لی جاتی تھیں اور "بُھوتو از اے گڈ مین"۔۔ بُھوتو واقعی اُن زمانوں میں ایک گڈ مین تھا اگر اُس کے بعد کوئی بیڈ مین آ گیا تو اس میں اُس کا کچھ قصور نہیں۔۔ اور میں ایک تاریخی حقیقت بیان کرنا چاہتا ہوں کہ بے شک بھٹو کو آج تک بخشا نہیں گیا لیکن یہ وہی تھا جس کی دعوت پر کُل عالم اسلام، شاہ فیصل سمیت متحد ہو گیا تھا اور اس نے عربوں اور خاص طور پر فلسطینیوں کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا جب کہ مرد مومن نے اُردن میں فلسطینیوں کے سیاہ ستمبر کے دنوں میں شاہ حسین کی تابعداری میں اُن کے قتل عام میں شرکت کر کے اُردن کا ایک بڑا فوجی اعزاز حاصل کیا تھا جو وہ ہمیشہ اپنی وردی پر سجاتا تھا۔۔ ایک روز میں پاکستانی سفارت خانے میں مظہر قیوم کے ہاں دوپہر کی چائے کے لیے گیا تو اس کے دفتر میں ایک سادہ سا، ایک غیر متاثر شخصیت کا حامل شخص بیٹھا تھا، اگرچہ وہ شناسا لگتا تھا لیکن میں تعین نہ کر سکا کہ میں نے اگر اُسے کبھی دیکھا تھا تو کہاں دیکھا تھا یا شاید یہ ایک واہمہ تھا۔ وہ ایک مختلف لہجے میں اردو بولتا تھا اگرچہ اس کی انگریزی کا اظہار نہایت رواں اور شُستہ تھا۔ ان دنوں پاکستان ٹیلی ویژن پر میں ایک اداکار کے طور پر خاصا نمایاں اور جانا پہچانا تھا۔ اس شخص نے نہایت محبت سے میرے ڈرامے "نواب سراج الدولہ" کے بارے میں بے پناہ پسندیدگی کا اظہار کیا جس میں میں نے اُس بدقسمت نواب کا کردار ادا کیا تھا۔ یاد رہے کہ نواب سراج الدولہ کا تعلق اُس بنگال سے تھا جسے ہم نے غدار قرار دے کر اپنے آپ سے کاٹ دیا۔ میں نے اس شخص کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پوچھا کہ آپ کہاں رہتے ہیں تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا، کبھی دمشق میں اور کبھی کراچی میں۔

اس کے رخصت ہونے پر میں نے مظہر سے پوچھا "یہ کون صاحب تھے؟"مظہر قیوم حیران ہو کر بولا "تم نے نہیں پہچانا؟ ۔۔ یہ ایم ایم عالم تھے"اب میری حیرت کی انتہا نہ تھی "یہاں کیا کر رہے ہیں؟

دمشق کے آسمانوں کی حفاظت کرتے رہے ہیں، ان دنوں شامی ایئر فورس کے پائلٹوں کو تربیت دے رہے ”ہیں۔۔ لیکن یہ راز خفیہ ہے۔ تم نے لکھنا نہیں“ (جاری ہے)

31/3/13

بابا بلیک شیپ میلر

مستنصر حسین تارڑ

پچھلے بیس برس سے ہر سویر ماڈل ٹاؤن پارک میرے لیے ان زمانوں کی کرپشن، بے ایمانی اور دہشت گردی سے وقتی فرار کی ایک پناہ گاہ رہا ہے۔ وہاں نہ صرف بھانت بھانت کے پرندے چہکتے ہیں بلک عجیب و غریب خصلتوں اور عادتوں کے انسان بھی سیر کرتے پائے جاتے ہیں۔ مثلاً وہاں سیر کے بعد جو اجتماع ہوتا ہے اور جسے ایک زمانے میں ”تکیہ تارڑ“ کا نام دیا گیا تھا اگرچہ ان دنوں وہی تکیہ تارڑ کو ہوا دینے لگا ہے وہاں نہ صرف نہایت متمول صنعتکار، ریٹائرڈ بینکر، انجینئر، مذہب سے شغف رکھنے والے اور مذہب سے باغی براجمان ہوتے ہیں بلکہ ادب اور شاعری سے والہانہ محبت کرنے والے اور ٹاٹ کے سوداگر بھی رونق افروز ہوتے ہیں۔۔ یہ سب لوگ بنیادی طور پر پر خلوص اور محبت کرنے والے ہیں۔۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی ضرورت مند شخص مجھے تلاش کرتا وہاں آ جاتا ہے۔ اور میں اپنی جھولی پھیلا کر اپنے دوستوں سے مالی تعاون کی درخواست کرتا ہوں تو وہ کبھی مجھے مایوس نہیں کرتے۔ یہ دریا دلی اُن کی عظمت کی دلیل ہے۔ آزاد کشمیر میں جب ایک تباہ کن زلزلے نے بستیاں اور وادیاں ملیا میٹ کر دیں تو ان لوگوں نے میری درخواست پر چھ لاکھ سے زیادہ رقم جمع کر کے آفت زدگان کی مدد کی۔ ایسے طالب علم آ جاتے ہیں اور اُن کے ہمراہ اُن کی مائیں آجاتی ہیں جن کے چہروں پر غربت اور تنگدستی کی بے چارگی کی پرچھائیاں ہوتی ہیں اور یہ فراخ دل لوگ اُس طالب علم کی پورے برس کی فیس ادا کر دیتے ہیں۔ پچھلے دنوں اسی اجتماع میں صبح سویرے ایک نوجوان آیا۔ اُس نے ایم بی اے کر رکھا تھا اور اُسے نوکری کی تلاش تھا۔ اب مجھ میں یہ خامی ہے کہ اہل اقتدار اور اہل ثروت سے میرے کچھ رابطے نہیں ہیں کہ میں سفارش کر سکتا تو میں نے اُس نوجوان سے معذرت کر لی۔ اس پر وہ نوجوان کہنے لگا ”تارڑ صاحب آپ تو اُس زمانے میں ہمارے چاچا جی ہوا کرتے تھے جب ہم کارٹون دیکھے بغیر سکول نہیں جاتے تھے۔ آپ اتنی مدت سے میڈیا سے وابستہ ہیں تو آپ ان تمام لوگوں کو تو جانتے ہوں گے جو ان دنوں سیاسی مباحثوں کی میزبانی کرتے ہیں تو سر ان میں سے کوئی ایک اگر میری سفارش کر دے تو کسی سیاستدان یا بیورو کریٹ کی کیا مجال کہ وہ انکار کرے۔ انکار کرے تو اگلے شو میں وہ اس ملک کا سب سے زیادہ کرپٹ اور بے ایمان شخص قرار دیا جائے گا۔۔ چلئے ٹیلی ویژن کا کوئی میزبان نہ سہی کوئی ایسا کالم نگار جو ملک و قوم کے غم میں غلطاں ہر سیاست دان کو گالیاں نکالتا اُسے بے غیرت اور مردود کہتا ہے خود ہوا جاتا ہو۔۔ بے شک اُس اینکر پرسن یا کالم نگار کے گھر ماہانہ وظیفے باقاعدگی سے پہنچتے ہوں اور گھر کے باہر کسی پراپرٹی ٹائی کون کی عطا کردہ ایک تازہ ترین پجارو استراحت فرماتی ہو تو سر جی آپ ان میں سے کسی ایک سے سفارش کر دیجیے۔ مجھے نوکری مل جائے گی“۔ میں اس نوجوان کے بیان پر وہ کیا کہتے ہیں کہ انگشت بدنداں رہ گیا کہ بائیں یہ لوگ۔۔ جن کے بارے میں پارلیمنٹ میں سوال اُٹھتے ہیں اتنے طاقتور ہو چکے ہیں کہ وہ کسی بھی برُج کو اُلٹا سکتے ہی۔۔ اور اس لمحے مجھے افسوس ہوا، کف افسوس ملا کہ میرا شمار ان مؤقر اور معتبر میزبانوں اور کالم نگاروں میں نہیں ہوتا جو کبھی زرداری کو اپنے زریں مشوروں سے نوازتے ہیں، کبھی نواز شریف کے سامنے اپنی حکمت کے موتی بکھیرتے اُسے بھی نوازتے ہیں اور کبھی عمران خان کے زوال کی گھنٹیاں بجاتے اُس غریب کو خبردار کرتے ہیں۔ یہ کیسے انمول اور نابغۂ روزگار لوگ ہیں۔ میں اُن پر رشک کرتا ہوں بلکہ اُن سے شدید حسد کرتا ہوں کہ مجھ میں مستقبل میں جھانک کر سیاست دانوں کو خبردار کرنے کی کچھ صلاحیت نہیں ہے۔ میں یقیناًایک گھامڑ کالم نگار ہوں اور اپنی قسمت کو کوستا ہوں کہ آخر میں کیوں کسی ایک کھونٹے سے نہیں بندھا ہوا۔ کسی سیاسی جماعت، کسی مذہبی تنگ دلی، کسی ایک نظریے کے کھونٹے سے کیوں نہیں بندھا ہوا۔۔ ایک ”شورہ بیگم“ کیوں نہیں، ہر سیاستدان اور بیورو کریٹ کو اپنے

مشوروں سے نوازتی ہوئی بیگم۔ ماڈل ٹاؤن پارک میں صبح کی سیر کرنے والوں میں سے ایک حضرت بدنام قیوم طارق۔۔۔ ریٹائرڈ بینکر۔۔۔ اسلامی تاریخ کے حافظ، حیرت انگیز حافظے کے مالک، کبھی امیر معاویہؓ کے خطبے لفظ بہ لفظ دہراتے ہیں اور کبھی بی بی زینبؓکے یزید کے دربار میں خطبے کا ہر حرف سناتے ہیں ایک روز کہنے لگے ”تارڑ صاحب۔۔۔ معاف کیجیے گا لیکن آپ لوگ، یہ سیاسی شوز کے میزبان اور اخباروں کے کالم نگار۔۔۔ ان میں سے بیشترپھر معاف کیجیے گا۔۔۔ بلیک میلر ہیں“۔
ظاہر ہے مجھے اُن کے اس نامعقول بیان پر طیش آ گیا۔ میں نے شدید احتجاج کیا کہ آپ نہایت عاقبت نااندیش ہیں۔ بے شک ہم میں کچھ کالی بھیڑیں ہیں لیکن ہم میں سے بیشتر سفید بھیڑیں ہیں۔ تو انہوں نے کہا ،چلیے مثال دے کر واضح کیجیے۔۔۔ تو میں نے کچھ میزبانوں اور کالم نویسوں کا حوالہ دے کر اپنے آپ کو سر خرو کر دیا لیکن میرے ذہن میں یہ سوال اٹک گیا ”کیا۔۔۔ واقعی ہم لوگ یعنی میڈیا سے وابستہ کچھ میزبان اور اخباری کالم نویس کالی بھیڑیں ہیں؟۔۔۔ بکاؤ مال ہیں، بلیک میلر ہیں۔۔۔ ویسے صحافت میں شروع سے کسی حد تک ”بلیک میلنگ“ کا رجحان چند ایک اخباروں میں پنپتا رہا ہے۔۔۔ لیکن اس میں اکثرنظریاتی اختلاف بنیاد ہوتا تھا۔۔۔ ازاں بعد ایسے اخبار نویس بھی میدان صحافت میں اترے جنہوں نے ہر جانب دہشت گردی شروع کر کے بڑی سلطنتیں تعمیر کر لیں۔ میں حوالے دینے سے اجتناب کرتا ہوں۔ مجھے مرتب کا نام یاد نہیں لیکن ایک مجموعہ شائع ہوا تھا ”کالم نویسوں کی قلابازیاں“۔ مرتب نے صرف اتنا کہا تھا کہ چند معتبر اور مؤقر کالم نگاروں کے وہ کالم جو انہوں نے نواز شریف کے دور حکومت میں لکھے اور پھر اُن کا تختہ الٹنے کے بعد کمانڈو جنرل مشرف کی آمد پر تحریر کیے، اُس کتاب میں نقل کر دیے۔۔۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ ایک مؤقر کالم نگار نواز شریف کو تقریباً ولی اللہ کے درجے پر فائز کرتا ہے اور چند ہفتے بعد مشرف کی آمد پر اسے تقریباً پھانسی دینے کا مطالبہ کرتا ہے۔ ہم آسانی سے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے سکتے ہیں کہ میڈیا میزبان اور کالم نگار بھی تو اسی تنزل پذیر معاشے کے فرد ہیں۔۔۔ تو اُن کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔
میں ذاتی طورپر ادب اور صحافت کو ایک مقدس فریضہ سمجھتا ہوں، عہد حاضر میں بھی متعدد بلکہ بیشتر میڈیا میزبان اور کالم نگار اپنے صحافتی اصولوں کی پاسداری کرتے ہیں، قیمت لگنے کے باوجود فروخت نہیں ہوتے لیکن دن بہ دن اُن کی تعداد گھٹتی چلی جاتی ہے۔ کالی بھیڑوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔۔۔ چند گندی مچھلیاں شفاف تالاب کو گدلا کر رہی ہیں۔۔۔ میں اگرچہ ایک سیاسی اور شورہ بیگم کالم نگار نہیں ہوں لیکن اس کے باوجود میں روزانہ آئینے میں اپنے آپ کو نہایت غور سے دیکھتا ہوں۔ میں ہمیشہ کوئی سفید بھیڑ تو نہیں رہا، کہہ لیجیے کہ سرمئ سی بھیڑ رہا ہوں تو غور سے اپنے آپ کو دیکھتا ہوں کہ کہیں میری سرمئ رنگت سیاہی مائل تو نہیں ہو رہی۔ میں بابا بلیک شیپ تو نہیں ہو رہا۔۔۔ ویسے آپس کی بات ہے کہ میرے ایمان کو پرکھا ہی نہیں گیا۔۔۔ اگر میرے پورچ میں بھی ایک نئی نویلی پجارو پارک کر دی جاتی۔۔۔ مجھے سیاسی پارٹیوں کی جانب سے ”لفافے“ ملنے شروع ہو جاتے اور میرے ایک فون پر ایک غریب اگرچہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان کو نوکری مل جاتی تو عین ممکن ہے کہ میں بھی بے ایمان ہو جاتا۔ میں فی الفور سرم�ئسے ایک سیاہ بھیڑ میں بخوشی بدل جاتا۔۔۔ کیونکہ رسمِ دنیا بھی ہے، دستور بھی ہے۔

3/4/13

لاہور کی بیٹی جو کوّے کھاتی ہے

مستنصر حسین تارڑ

یہ ان گئے زمانوں کے قصے ہیں جب اقبال ٹاؤن میں واقع کشور ناہید اور یوسف کامران کا گھر مرجع خلائق وغیرہ ہوا کرتا تھا اور اس خلقت میں بھانت بھانت کے لوگ شامل تھے۔ اچھے برے ادیب اور شاعر ناکام مصور ادھیڑ عمر ڈانسر نادر کالم نگار کہ ان دنوں کالم نگار باضمیر ہوتے تھے۔ یورپ، ہندوستان اور لاہور کے باہر سے

آنے والے شاعر اور ادیب۔۔ خاص طو رپر مضافاتی ادیب جو کشور کے یوسیع حلقۂ احباب سے متعارف ہو کر دنوں میں نامور ہو جاتے تھے تو ان زمانوں میں کشور کی پارٹیوں میں ایک نازک ملوک سی کانچ کی گڑیا ایسی پارسی لڑکی آیا کرتی تھی جو ہر وقت بے وجہ مسکراتی رہتی تھی۔۔ اُسے بچُپن میں پولیو لاحق ہوا اور اس نے کمال استقامت سے نہ صرف اس اپاہج کر دینے والے عارضے کا مقابلہ کیا، کسی حد تک صحت مند تو ہو گئی لیکن اُس کا بدن قدرے لاغر رہا۔۔ وہ لکھتی لکھاتی تو نہ تھی لیکن اسے تخلیقی لوگوں کی رفاقت پسند تھی۔۔ وہ پاکستان کے ایک بہت متمول اور نامور پارسی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اس کے باوجود اس کے چہرے پر بے چارگی برستی تھی۔ ہم جو اس زمانے میں شہرت کی ابتدائی چکاچوند سے متکبر ہو رہے تھے اسے زیادہ لفٹ نہ کراتے تھے۔ اور ایک روز اس نے مجھے ایک صدمے سے دوچار کر دیا۔۔ جھجکتے ہوئے بلکہ کسی حد تک شرمندہ ہوتے ہوئے اس نے اپنے بینڈ بیگ میں سے ایک کتاب نکال کر مجھے پیش کر دی ”تارڑ صاحب میں نے یہ ناول لکھا ہے جو تقریباً میری آپ بیتی ہے اور اس میں پارسی لوگوں کے رسم و رواج کا تفصیلی تذکرہ ملتا ہے۔۔ پلیز آپ اسے پڑھ کر مجھے بتائیے گا کہ یہ کیسا ہے۔۔ مجھے آپ لوگوں کی مانند لکھنا تو نہیں آتا لیکن میں نے کوشش کی ہے“۔

اس پارسی لڑکی یا خاتون کا نام بیپسی سدھوا تھا اور نہایت ہی بُرے کاغذ پر چھپے ہوئے ناول کا نام تھا ”کرو ایٹرز“ یعنی ”کوّے کھانے والے“۔۔ اس شب میری نئی نویلی بیگم بار بار مجھے سرزنش کرتی تھی کہ ٹیبل لیمپ آف کر دو میں سونا چاہتی ہوں اور میں کہتا تھا صرف پانچ منٹ اور۔۔ میں بجھا دوں گا۔۔ کہ بیپسی کے ناول نے مجھے اپنے حسن بیاں اور انوکھے ماحول میں جکڑ کر اپنا قیدی بنا لیا تھا ۔۔ چنانچہ ٹیبل لیمپ رات گئے تک روشن رہا۔۔ ایک روز کشور نے اپنی خشونت آمیز سُرمہ بھری آنکھوں سے گھورتے ہوئے کہا ”کیا تم بیپسی کے ناول کا اردو ترجمہ کرنے میں دلچسپی رکھتے ہو۔۔ یہ اس کی خواہش ہے“۔

میں نے فوری طور پر انکار کر دیا۔۔ میں اپنے اولین سفرناموں کی مقبولیت اور شہرت کے گھمنڈ میں زمین سے بلند ہو کر کہیں آسمانوں میں پرواز کرتا تھا تو میں کیسے ایک نووارد اور نومولود ناول نگار خاتون کے ناول کا ترجمہ کر کے حقیر ہو سکتا تھا۔۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔۔ اور آج 2013ء میں، میں کیسے اپنے آپ کو کوستا ہوں، پچھتاتا ہوں۔۔ اگر میں تب ”کرو ایٹرز“ کا ترجمہ اردو میں کر جاتا تو آج میں بھی بین الاقوامی شہرت کی ان چکاچوند روشنیوں میں نامور ہوتا جن میں بیپسی سدھوا کا نازک سراپا ایک بڑی ناول نگار کے طو رپر نمایاں ہو رہا ہے۔۔ جبکہ ایک اردو ناول نگار کے طور پر میں گمنامی کے ایک گڑھے میں پڑا ہوں۔

اکثر باتونی لوگ۔۔ مسلسل باتیں کرنے والے جنہیں پنجابی میں گالڑ کہتے ہیں۔۔ ان کے بارے میں میری امی کا ایک قول تھا۔ میں بھی بچُپن میں ایک گالڑ تھااور وہ تنگ آ کر کہتیں۔۔ کیا تم نے کوّے کھا رکھے ہیں جو اتنی باتیں کرتے ہو چُپ ہو جاؤ۔۔ اور میں چُپ نہ ہوتا۔ پچھلے دنوں میں ان زمانوں میں اپنے پسندیدہ چینی ناول نگار مویان کی ابتدائی حیات کے بارے میں ایک مضمون پڑھ رہا تھا۔۔ میں اُس کے ناولوں ”سُرخ جوار“ اور ”تھوم کا گیت“ پڑھنے کے بعد شدید احساس کمتری کا شکار ہو چکا تھا کہ آخر میں ایک ایسا ناول لکھنے کی تخلیقی صلاحیت کیوں نہیں رکھتا۔۔ مویان جب ایک بچہ تھا تو وہ باتیں بہت کرتا تھاد یعنی وہ ایک چینی گالڑ تھا۔ چُپ نہ ہوتا تھا تو اس کی ماں ہاتھ جوڑ کر کہتی تھی کہ چُپ ہو جاؤ۔۔ چُپ ہو جاؤ۔۔ اور چینی زبان میں کہتی تھی کہ ”مویان۔ مویان“ چُپ ہو جاؤ۔ اس بچے نے جب اپنے ادبی کیریئر کا آغاز کیا تو اپنا قلمی نام ’مویان۔۔ چُپ ہو جاؤ‘ رکھ لیا۔۔ ویسے حیرت انگیز حقیقت یہ ہے کہ بیسپی سدھوا نہ تب اور نہ اب چالیس برس بعد بولتی ہی نہیں، صرف بے وجہ مسکراتی ہے اور وہ اپنے آپ کو کوّے کھانے والوں میں شمار کرتی ہے۔

وہ ان دنوں اپنے محبوب لاہورسے دور امریکہ میں مقیم ہے لیکن اس کے ہر ناول میں لاہور شہر پس منظر میں رنگ بھرتا ہے کہ اس کے دل میں ایک لاہورن مقیم ہے۔ وہ لاہور کو کبھی نہیں بھولتی۔۔ بین الاقوامی ادبی میلوں میں جب اس سے دریافت کیا جاتا ہے کہ اس کی تخلیق کا منبع کس سرچشمے سے پھوٹتا ہے تو وہ ہمیشہ کہتی ہے کہ یہ لاہور ہے۔۔ میں لاہورن نہ ہوتی تو ایک ناول نگار نہ ہوتی۔۔ بیپسی کے ایک ناول کو ہندوستان کی ایک بڑی ہدایتکار نے فلم میں ڈھالا ہے جس میں مرکزی کردار عامر خان نے ادا کیا ہے اور ظاہر

ہے اس کا پس منظر لاہور ہے۔
بپسی سدھوا کے ناول ”کرو ایٹرز“ کے عمر میمن کے اردو ترجمے او راس کی کہانیوں کے مجموعے ”ویئر لینگوئج آف لَو“ جسے ”ریڈنگز“ والے خاموش طبع ڈاکٹر نے بین الاقوامی معیارپر شائع کیا ہے۔۔ ان دونوں مطبوعات کے حوالے سے ایک مقامی ہوٹل میں ایک تقریب منعقد ہوئی۔ صدارت جسٹس جاوید اقبال کی تھی اور باتیں کرنے والوں میں، یعنی جو گالڑ تھے ان میں میرے علاوہ شائستہ سراج الدین، خالد احمد، انتظار حسین اور بانوقدسیہ تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ نوجوان خاتون جو آج سے چالیس برس پیشتر بے وجہ مسکراتی تھیں آج بھی مسکرا رہی تھیں لیکن ان میں ناتوانی اتنی تھی کہ انہیں سٹیج پر آنے کے لئے سہارا درکار تھا ۔۔ بانو آپا کی حالت بھی کچھ اچھی نہ تھی۔۔ کیسے کیسے لوگ زمانے کے ہاتھوں بے بس ہو جاتے ہیں۔ یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ۔
ویسے تو ہم اکثر کسی کو مشرق کی بیٹی یا پاکستان کی بیٹی قرار دیتے ہی رہتے ہیں لیکن میرے خیال و خواب میں اگر لاہور کی کوئی بیٹی ہو سکتی ہے تو وہ بپسی سدھوا ہے کہ وہ لاہور میں جیتی ہے اور لاہور میں ہی مرنے کی آرزو کرتی ہے۔۔ میری ہیروئن نہ کوئی سیاستدان ہے اور نہ ہی جہاد پر کمربستہ کوئی خاتون۔۔ صرف بپسی سدھوا ہے، بے شک وہ کفار میں شامل ہے ، ایک آتش پرست ہے لیکن اس کی آتش لاہور کے الاؤ میں سے روشن ہوتی ہے

8/4/13

مصطفی چوہدری: تارڑ تم کیسے یار ہو

مستنصر حسین تارڑ

بے شک ان زمانوں میں آپ کا سیل فون وہ خزانہ ہے جس میں نہ صرف دنیا جہاں کے موسموں کی خبریں ہیں، کائنات کے سب راز عیاں ہیں، پیغام ہر نوعیت کے، شرعی اور زیادہ تر غیر شرعی چلے آتے ہیں اور آپ کے دوستوں کے فون نمبر اور پتے محفوظ ہیں لیکن اس سہولت کے باوجود ہم جیسے شکی مزاج بابا جات اپنی ٹیلی فون ڈائری پر ہی انحصار کرتے ہیں۔۔ میرے پاس بھی ایک ایسی ہی ڈائری ہے جس میں میرے دوستوں اور کچھ دشمنوں کے فون نمبر درج ہیں۔ بس یہی دو چار برس پیشتر یکدم مجھے مجبوراً کچھ ٹیلی فون نمبرز کو سرخ مارکر سے حذف کرنا پڑا کہ وہ مر گئے تھے۔ حیرت صرف یہ ہے کہ دشمنوں میں سے تو کوئی نہ مرا، دوست بے وجہ دھڑا دھڑ فوت ہو گئے۔۔ میں نے تنگ آ کر رخصت ہو چکے دوستوں کے ٹیلی فون نمبروں کو سرخ مارکر سے حذف کرنا چھوڑ دیا کہ وہ کم از کم میرے لیے ابھی تک زندہ تھے۔
لیکن ایک نمبر ایسا تھا جو میرے لیے تو زندہ تھا لیکن وہ کب کا مر چکا تھا۔
میں نے آج شب ملتان کے شاکر حسین شاکر کو فون کیا۔ اس کی بے مثال تحقیقی کتاب، ضمیر ہاشمی کی مصوری سے آراستہ ”ملتان، عکس و تحریر“ کی پسندیدگی پر کہ یہ ایک جسے کہتے ہیں کہ محبت کی مشقت ہے۔ محبت ملتان کی اور مشقت شاکر کی۔ میں نے اس دوران اپنے دیرینہ دوست اور کرم فرما رضی الدین رضی سے بھی رابطہ کیا جس نے اس تحقیقی کارنامے کا کیا ہی تخلیقی دیباچہ تحریر کیا ہے۔ میں نے شاکر سے پہلے اپنے گمشدہ مرید عباس برمانی کا پوچھا اور پھر مجھے یکدم مصطفی چوہدری کا خیال آ گیا۔۔ شاکر ان دنوں مصطفی چوہدری کہاں ہے۔۔ تقریباً دو ہفتے پیشتر کم از کم تین برس بعد میری ملاقات فخر زمان سے ہوئی اور میں نے اس سے بھی دریافت کیا تھا کہ مصطفی چوہدری کہاں ہے۔ کس حال میں ہے۔ میرے پاس جو اس کا فون نمبر ہے وہ جواب نہیں دیتا۔۔ کیا تمہارے پاس اس دیرینہ اور مشترکہ یار کا نمبر ہے؟۔۔ فخر نے وعدہ کیا کہ وہ مجھے مصطفی کا فون نمبررروا نہ کر پائے گا اگرچہ اس کے ساتھ بھی اس کا رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔ مجھے شک ہوا کہ شاکر نے فون بند کر دیا ہے کہ ادھر ایک مرگ خاموشی تھی اور پھر وہ بولا ”تارڑ صاحب۔۔ آپ کو خبر نہیں ہوئی؟“

اور مجھے خبر ہو گئی کہ جو بھی خبر تھی اچھی نہ تھی ”مصطفی چوہدری کے انتقال کو تو دو برس ہونے کو ہیں۔۔ آپ کو اطلاع نہیں ہوئی۔۔۔ میں جنازے میں شریک ہوا تھا اور بھابھی سے تعزیت کی تھی۔ اُن کا دل رُک گیا تھا۔

میرا دل بھی رُک گیا۔ مصطفی چوہدری میرا دیرینہ دوست، فخر زماں کے ہمراہ سینکڑوں شبوں کا قہقہے لگاتا، دل میں گھر کر لینے والا۔ دو برس ہو چکے دفن ہو چکا ہے اور مجھے خبر نہ ہوئی۔۔۔ نہ کسی اخبار میں اور نہ کسی ٹیلی ویژن نیٹ ورک پر اس کی موت کا اعلان ہوا جہاں چیچو کی ملیاں میں اگر ایک سیاسی لومڑ بھی فوت ہو جاتا ہے تو اس کی یاد میں تعزیتی پروگراموں کی بھرمار ہو جاتی ہے اور وہ کوئی عام سا، معمولی شخص تو نہ تھا۔۔ ایک ایسا سیاسی سائنس دان تھا جس کے بین الاقوامی تجزیے دنیا بھر کے جرائد میں شائع ہوتے تھے اور ٹیلی ویژن چینلز اسے اپنے پروگراموں میں مدعو کرنے کے لیے منت سماجت کرتے تھے۔ وہ اگر بہاء والدین ذکریا یونیورسٹی کا وائس چانسلر منتخب ہوا تو ہر کسی نے اس انتخاب کی داد دی، اسے سراہا کہ وہی اس عالی مرتبت عہدے کے لیے موزوں ترین شخص تھا۔

ہم دونوں جب کنوار پن میں تھے تو تقریباً ہر شب ایک دوسرے کی رفاقت میں گزارتے تھے۔ میری شادی کی بلیک اینڈ وائٹ تصویروں میں وہ خاور زمان اور فخر زمان کے ہمراہ مسکراتا ہوا نظر آتا ہے۔۔۔ اور ان تصویروں کو قید ہوئے چالیس برس سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ جب کبھی اپنی بیگم کے ہمراہ میرے گھر آتا تو ہمیشہ میری بیگم سے اظہار افسوس کرتا کہ بھابھی تو میری راجپوت بہن ہے۔۔۔ تیرے ماں باپ نے کیسی بیوقوفی کی تجھے اس جاٹ سے بیاہ دیا۔ چنانچہ مصطفی چوہدری اس بیان کی وجہ سے میری بیگم کا پسندیدہ شخص ہمیشہ رہا۔

مصطفی چوہدری کے ساتھ جو رفاقتیں، محبتیں اور حماقتیں تھیں ان کے بیان کے لیے ایک ضخیم کتاب درکار ہے۔ ڈی جی خان میں پڑھاتا، گورنمنٹ کالج میں پولیٹیکل سائنس میں اپنی نابغۂ روزگر لیاقت کو طالب علموں میں سموتا وہ بالآخر اپنے آبائی وطن خانیوال کے قریب ہوا اور بہاؤ الدین ذکریا یونیورسٹی کے وائس چانسلر شپ کے عہدے پر فائز ہوا۔ اس دوران ہم دونوں کے درمیان ایک دراڑ نے جنم لیا جس کا کوئی منطقی جواز نہ تھا۔ ظاہر ہے میں اتراتا پھرتا تھا کہ میرا یک عزیز از جان قدیمی دوست ایک بلند مرتبے پر فائز ہوا ہے تو وہ میرے لیے بھی باعث افتخار ہے۔۔۔ اور ہاں یادوں کے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں اور مجھے یاد آتا ہے کہ مصطفی مجھے ملتان کے ڈاکٹر افتخار راجہ کے گھر لے کر جاتا ہے جو ایک فضائی حادثے میں ہلاک ہوئے اور جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا کے چند بہترین آپریشن کرنے والوں میں سے تھے۔ سرجن ایسے تھے کہ موت کے منہ میں اترتے ہوئے مریضوں کو اپنی سچائی سے زندہ کر دیتے تھے۔ فخر زمان کی اہلیہ شائستہ حبیب، کیسی انوکھی شاعرہ جب کینسر کا شکار ہوئیں تو میں نے ڈاکٹر افتخار راجہ سے منت کی کہ اگرچہ آپ انکار کر چکے ہیں کہ آپ کی بین الاقوامی مصروفیات آپ کو سانس نہیں لینے دیتیں لیکن شائستہ میری بھابی ہے اس کے آپریشن کے لیے کچھ وقت نکال لیتے۔ شائستہ اگر کچھ مدت جیتی رہی تو یہ افتخار راجہ کا کرشمہ تھا۔ ان کی اہلیہ نے ایک بہت منفرد سفرنامہ تحریر کیا اور مجھے اعزاز بخشا کہ میں اس کا دیباچہ تحریر کروں لیکن یہ سب باتیں تو بہت پرانیاں ہیں:

ایسا کبھی نہ ہوا کہ میں اور میری بیگم ملتان گئے تو مصطفی چوہدری کے ہاں نہ قیام کیا۔ میرے بٹوے میں اس کی اندرونی جیب میں سو روپے کا ایک نوٹ آج بھی محفوظ ہے۔ یہ نوٹ مجھے مصطفی چوہدری کی ایک درویش پھوپھی جان نے عنایت کیا تھا اور کہا تھا ”بیٹے اس نوٹ کو سنبھال کر رکھنا۔۔۔ یہ تمہارے رزق میں اضافے کا باعث بنے گا“ اور یہ حقیقت ہے کہ شاید مصطفی کی پھوپھی جان کے اس نوٹ کی برکت سے میرے رزق میں اضافہ ہوتا رہا۔

وہ مصطفی چوہدری ایک اکھڑ راجپوت، گفتگو کے دوران بے مہار گالیاں دیتا تھا اور ہم بہت بیزار ہوتے تھے۔۔۔ ایک بار شادمان کے فلیٹ میں ہم نے اس کے والد صاحب سے شکایت کی کہ چاچا جی آپ مصطفی کو سمجھائیں یہ گالیاں بہت دیتا ہے تو چاچا جی نے نہایت تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں اس۔۔۔ کو بہت سمجھاتا ہوں لیکن یہ ناں۔۔۔

سمجھتا ہی نئیں... وہ بھی تو ایک رانگڑ راجپوت تھے۔
شاکر نے جب مجھے یہ بڑی خبر دی کہ مصطفی چوہدری کو فوت ہوئے دو برس ہونے کو ہیں تو میں اس صدمے میں غرق تھا جب مجھے محسوس ہوا کہ مصطفی مجھے گالیاں دے رہا ہے... اوئے مستنصر تم کیسے یار ہو... ماں... نہیں ... کیسے یار ہو... نہ تم میرے جنازے پر آئے، نہ مجھے قبر میں اتارا... تمہیں خبر ہی نہ ہوئی کہ مجھے دفن ہوئے دو برس گزر چکے ہیں۔ کیسے... ماں... کیسے یار ہو؟

13/4/13

"انگریزی ناول نگار، کیا پانی کے بلبلے ہیں؟"
مستنصر حسین تارڑ

روزنامہ نئی بات

بات لاہور لٹریری فیسٹیول سے نکلی ہے تو بہت دور تک پہنچی ہے یعنی برصغیر کے ان ناول نگاروں کا تذکرہ چھڑ گیا ہے جو اس سرزمین سے جدا ہو کر ایک مدت سے مغرب کو گھر بنائے بیٹھے ہیں اور ان کے ادبی اظہار کا ذریعہ انگریزی زبان ہے... سلمان رشدی کمبخت کی تو بات ہو چکی جو ایک عرصے سے ملکہ برطانیہ کے ہاتھوں ایک نائٹ قرار دیئے جانے کے بعد سَر سلمان ہو چکا ہے۔ اگرچہ وی ایس نائے پال ٹرینیڈاڈ ویسٹ انڈیز کا باشندہ ہوا کرتا تھا لیکن ہندوستانی نژاد ہے جو ان دنوں سَر کا خطاب حاصل کرنے کے بعد ہماری پاکستانی لیڈی نادرہ کے ہمراہ ایک شاندار رہائش گاہ میں زندگی کے مزے لوٹ رہا ہے۔ مزے لوٹنا محض محاورے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے ورنہ اسّی برس کی عمر میں تو بندہ پتنگ نہیں لوٹ سکتا، مزے کہاں لوٹے گا... بہرطور میں تو اس کا ناول "میگوئل سٹریٹ" پڑھ کر نہایت مایوس ہوا تھا۔ اس کی تحریر نہایت بے رَس یعنی پھوکی اور بے لطف ہے۔ اس کے باوجود وہ مغرب کا نہایت پسندیدہ ادیب صرف اس لئے ہے کہ وہ اپنے مشرقی ہونے پر اتنا شرمندہ ہے کہ ہر تحریر میں مشرق کو رگیدتا رہتا ہے اور اپنے آپ کو برطانوی شہری کہلانے میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ ظاہر ہے اسلام کے بارے میں اس کے نظریات خاصے زہرآلود ہیں... ویسے ہمیں مجبوراً اس کا احترام کرنا پڑتا ہے کہ اس کی بیگم پاکستانی ہیں، مسلمان ہوا کرتی تھیں، ان دنوں جانے کیا ہوا کرتی ہیں، یہاں تک کہ ان کی پہلے خاوند سے جو پاکستانی بیٹی ہے وہ بھی اپنے نام کے ساتھ اقبال کی بجائے نائے پال لکھتی ہیں۔ بہرطور نائے پال میں کہیں نہ کہیں کوئی ادبی جوہر تو ہو گا جس کی وجہ سے وہ ایک ممتاز ادیب مانا گیا... مجھے آج تک اس جوہر کی اگر پہچان نہیں ہو سکی تو یہ میرا گھامڑ پن ہے... انگلستان کے ایک اور دیسی ادیب حنیف قریشی کا بہت چرچا ہے۔ وہ اپنی طرز کے ایک ایسے ناول نگار اور ڈرامہ نگار ہیں جو برطانوی معاشرت اور اقدار کو ایک مخصوص انداز سے نہایت تخلیقی قوت سے بیان کرتے ہیں۔ ان کے ناول "بُدھاآف سبربیا" اور "مائی فیورٹ لانڈریٹ" پڑھنے کے قابل ہیں۔ اسی طور وکرم سیٹھ جو پچھلے برس کراچی لٹریری فیسٹیول میں شریک تھے "اے سوٹ ایبل بوائے" ایسا ضخیم اور بور ناول لکھنے کے بعد شہرت کی بلندیوں پر جا پہنچے، یہاں تک کہ ان کے اس ناول کو ایک "جدید بائبل" قرار دیا گیا... یعنی مقدس بائبل پر یہ دن بھی آنے تھے۔ اس کا موازنہ آپ "علی پور کا ایلی" وغیرہ سے کرسکتے ہیں۔ البتہ وکرم سیٹھ کے ناول "آف ایکل میوزک" نے مجھ پر گہرا اثر کیا اور میں اس کی ناول نگاری کا قائل ہو گیا... سیالکوٹ کے رہنے والے ایک عرصے سے امریکہ میں مقیم ذوالفقار غوث ایک سلجھے ہوئے شخص ہیں اگرچہ ان کی تحریر قدرے پیچیدہ اور الجھی ہوتی ہے۔ ان کے ناول اور دیگر تحریریں ان کے وسیع مطالعے کی عکاسی کرتی ہیں۔ ایک عرصہ میں اس الجھن میں مبتلا رہا کہ یہ جو ذوالفقار گھوش ہیں تو بیک وقت مسلمان اور ہندو کیوں ہیں۔ پھر کھلا کہ انگریزی میں غوث، گھوش پڑھا جا سکتا ہے۔ یہ میری جہالت کا ایک اور ناقابل تردید ثبوت ہے۔

چلئے یہ سب تو سینئرز اور کھانگڑ انگریزی میں لکھنے والے برصغیر سے متعلق ادیبوں کا مختصر سا بیان ہے تو اب ہم عہد حاضر کے ان ناول نگاروں کا تذکرہ کرتے ہیں جنہوں نے ان دنوں دُھوم مچا رکھی ہے۔۔۔ بلکہ دُھول اُڑا رکھی ہے۔ ان میں میرے پسندیدہ ”اے کیس آف ایکسپلوڈنگ مینگوز“ والے اوکاڑہ کے رہنے والے محمد حنیف ہیں۔ جی ہاں اس میں آموں کی اُس پیٹی کا بیان ہے جو مردِ حق مردِ مومن کے طیارے میں ”پَٹ“ گئی اور پوری قوم ان آمو ں کی شکرگزار ہوئی۔ مرزا غالب کے آموں کے بعد اگر کوئی آم کام کے نکلے تو وہ سی ون تھرٹی طیارے میں جانے کس کے رکھے ہوئے بس یہی آم تھے جنہوں نے کام تمام کیا۔ اس ناول کے آخری صفحے اتنے طاقتور اور تخلیقی ہیں کہ انسان مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے۔۔۔ اس کا دوسرا ناول ”آور لیڈی آف ایلس بھٹی“ بھی کردار نگاری کے حوالے سے بہت منفرد ہے۔۔۔ اس نے حال ہی میں گمشدہ بلوچوں کے حوالے سے ایک رپورٹ مرتب کی ہے جس کا بہت چرچا ہے۔۔۔ لاہور کے محسن حامد نے جب ”ماتھ سموک“ نام کا ناول لکھا تو ان کی توصیف میں بھی بہت واویلا ہوا۔۔۔ یہ ایک بہت معمولی ناول تھا، اگر اردو میں لکھا جاتا تو کچھ پذیرائی نہ ہوتی بلکہ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے میں کچھ زیادہ ہی ظالم ہو گیا تھا اور میں نے کہا تھا کہ بے شک میری انگریزی اگرچہ میں نے بھی چھ برس انگریزوں کے گندے برتن دھوئے ہیں، نہایت واجبی ہے۔ اس کے باوجود میں صرف ایک شب میں اس سے بہتر ناول لکھ سکتا ہوں۔ اس ناول کی واحد وجۂ شہرت ادب میں نوبل انعام یافتہ امریکی ناول نگار ٹونی ایلن سن کا تحریر کردہ فلیپ ہے۔ ایلی سن، محسن حامد کے اساتذہ میں شامل تھیں۔ لیکن جب محسن کا دوسرا ناول ”دے ریلکٹنٹ فنڈا مینٹلسٹ“ شائع ہوا تو میں اس کا گرویدہ ہو گیا۔۔۔ یہ ناول نہ تو مغرب کو خوش کرنے کے لئے لکھا گیا تھا اور نہ ہی سطحی تھا، ایک اپنے پاکستان سے جڑے ہوئے اس سے محبت کرنے والے شخص کا ناول تھا۔۔۔ اس ناول پر مبنی ایک بین الاقوامی فلم ان دنوں دنیا بھر میں دکھائی جانے والی ہے۔

گوجرانوالہ کے ندیم اسلم حال مقیم انگلستان نے مجھے اپنے ناول ”اے میپ فار دے لوسٹ لورز“ سے اپنا شیدائی کر لیا۔ اس ناول میں جو انوکھی ترکیبیں اور استعارے تھے وہ سب کے سب دل پر اثر کرتے تھے۔ اگرچہ اس کے اگلے ناول ”دے ویسٹڈ وجل“ نے مجھے بے حد مایوس کیا کہ اس میں سب کے سب شیطان پاکستانی اور افغان تھے اور سارے فرشتے غیرملکی اور امریکی تھے۔ یہاں تک کہ ہیرو سی آئی اے کے ایجنٹ تھے۔ میں تذکرہ کر چکا ہوں کہ جب محمد حنیف نے ایک ضیافت کے دوران ندیم اسلم سے میرا یا اس کا تعارف کروایا تو میں نے اپنے گھامڑ پن میں کہا کہ ندیم تم نے ایک بہت اچھا ناول لکھا اور پھر ایک بہت بُرا ناول لکھا۔ ظاہر ہے اسے میرا کامنٹ اچھا نہ لگا کہ وہ صرف توصیف کا عادی تھا۔

پاکستانی انگریزی ناول نگاروں میں بیپسی سدھوا کا کوئی موازنہ نہیں کہ ایک لاہورن ہونے کے ناتے سے اس نے کوئی مفاہمت نہ کی۔ اپنے لاہور اور پاکستان سے جڑی رہی۔۔۔ آج جبکہ اس کی شہرت کُل عالم میں پھیل چکی ہے، اس کے ناولوں پر فلمیں بن رہی ہیں جن میں عامر خان اداکاری کر رہا ہے وہ کہتی ہے کہ میری تخلیق کے سب جھرنے میرے لاہور سے پھوٹتے ہیں۔ وہ لاہور کی بیٹی ہونے پر فخر کرتی ہے اگرچہ وہ ایک پارسی ہے جنہیں ہم کفار میں شامل کرتے ہیں۔

میں یہاں عظمیٰ اسلم خان کا تذکرہ کرنے سے جھجھکتا ہوں جس کے متعدد انگریزی ناول ”ٹریسپ سنگ“،”ڈجیومیٹری آف گاڈ“ وغیرہ قبول عام کی سند پا چکے ہیں۔ اس لئے جھجھکتا ہوں کہ وہ میری نزدیکی عزیزہ ہے۔۔۔ میری فی الحال اکلوتی بیگم میمونہ کی بھتیجی ہے ۔ اور ہاں، میں اس فہرست میں امیتابھ گھوش کو شامل نہیں کر رہا جس کے تمام ناول میں نے پڑھ رکھے ہیں اور وہ بلاشبہ برصغیر کے انگریزی ناول نگاروں میں میرے نزدیک سب سے بلند مرتبے پر فائز ہے۔

ایک پاگل ہو چکی خاتون نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ انکل یہ سب کے سب برصغیر سے تعلق رکھنے والے انگریزی ناول نگار پانی کے بلبلے ہیں۔ ایک عارضی موجودیت ہیں۔ یہ اردو میں لکھنے والے ناول نگاروں کے سامنے کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔۔۔ میں اس کی رائے سے کسی حد تک اختلاف رکھتا ہوں۔ لیکن ہم انتظار کر سکتے ہیں، یہ دیکھنے کے لئے کہ کون سے بلبلے عارضی ہیں اور کن میں زمانوں کو سہہ جانے کی صلاحیت ہے۔

2/5/13

شوقن مظہر الاسلام کے میلے کی
مصتنصر حسین تارڑ۔

ڈیلی نئی بات

ایک تھے لوک گلوکار ، نام تھا اُن کا طفیل نیازی، رنگ روپ ایسا پایا تھا کہ لوگ دریافت کرتے حضرت نیازی صاحبان تو گورے چٹے پٹھان ہوا کرتے ہیں تو آپ مقامِ نیازیت پر کیسے براجمان ہو گئے تو وہ کسی بزرگ کے مُرید ہونے کے حوالے سے اپنے آپ کو مرشد کا ایک پرتو قرار دیتے تھے۔۔۔ ہمیشہ اپنے آپ کو ”پھوک سنگر“ کہتے تھے پر کیا سریلا گلا پایا تھا کہ اُن کے آگے بڑے بڑے کلاسیکل گوئیے بھی پانی وغیرہ بھرتے تھے۔ ایک مرتبہ کہنے لگے ہم لوگ جب ہندوستان جاتے ہیں تو ہمیں بھگوان کہا جاتا ہے۔ واہگے کے راستے پاکستان میں قدم رکھتے ہی ہم میراثی ہو جاتے ہیں۔

کچھ یہی حال احوال ہم ادیبوں کا ہے۔۔۔ ہم نیشنل بُک کونسل کے مظہر الاسلام کی دعوت پر نیشنل بک ڈے کے میلے میں شرکت کرنے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں تو شہزادے ہو جاتے ہیں۔ ہم رائلٹی ہو جاتے ہیں۔۔۔ مظہر اور اُس کے نائب ہمارے خدام ہو جاتے ہیں۔ ہمارے آگے پیچھے پھرتے ہیں کہ کوئی اور حکم آقا۔۔۔ کسی وزیر بے تدبیر یا وزیراعظم کی بجائے ادیبوں کو ڈائس پر کھڑا کر کے اُنہیں گارڈ آف آنر پیش کرتے ہیں۔۔۔ ممتاز ادیبوں کے اعزاز میں شاندار نشستیں اہتمام ہوتی ہیں جہاں اُن کی شان میں قصیدے پڑھے جاتے ہیں اور اُن سے اُن کی تحریروں کے اقتباس سن کر بے پناہ تحسین کی جاتی ہے اور مروّت کا یہ عالم ہے کہ نہایت ناتواں یعنی تخلیقی طور پر ناتواں ادیبوں کی بھی اتنی پذیرائی ہوتی ہے کہ اُن کے سروں میں سے ایک سرخ کلغی پُھوٹ نکلتی ہے اور وہ ایک اصیل مرغ کی مانند سینہ پھلائے پھرتے ہیں۔ چنانچہ ادیب حضرات پورے تین روز تک رائلٹی کے مزے لوٹتے ہیں۔ نظام سکے ہو جاتے ہیں اور پھر میلے کے اختتام پر اپنے قصبوں اور شہروں کو لوٹتے ہیں تو پھر سے میراثی ہو جاتے ہیں۔ کمی کمین ہو جاتے ہیں۔ تین دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات ہے۔۔۔ ادیب حضرت مظہر الاسلام کی آؤ بھگت کی وجہ سے مکمل طور پر ”چوڑ“ ہو جاتے ہیں اور واپسی پر پھر سے اپنی اوقات میں آ جاتے ہیں۔

پچھلے برس جب ہم اسلام آباد ایئر پورٹ سے باہر آ کر شاہراہ پر رواں ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہر شاخ پر اُلّو بیٹھا ہے۔۔۔ معاف کیجیے گا شاہراہ کے کناروں پر جو کھمبے ہیں اُن پر کوئی نہ کوئی ادیب بیٹھا ہے بلکہ لٹکا ہوا ہے۔ ہم لوگوں کی جہازی تصاویر کھمبوں پر آویزاں تھیں جنہیں دیکھ کر ہم سب اکڑ کر اصیل مرغ ہو گئے اور دل ہی دل میں اذانیں دینے لگے۔۔۔ محترم انتظار حسین ادب کے علاوہ شماریات میں بھی مہارت رکھتے ہیں کہنے لگے ”کھمبوں سے لٹکنے والے ادیبوں میں سے زیادہ تصویریں تارڑ کی ہیں“ تو میں نے کہا ”حضور آپ جانتے ہیں کہ جس شخص کی تصویریں کثرت سے آویزاں ہوتی ہیں بالآخر اُسی کا انجام برا ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے بھٹو کا انجام۔۔“ لیکن اس برس جب ہم ۔۔۔ نیشنل بک کونسل کے دوسرے سالانہ نیشنل بک ڈے میں شرکت کے لیے اسلام آباد ایئر پورٹ سے باہر آ کر شاہراہ پر گامزن ہوئے۔ یعنی انتظار حسین، سعود اشعر اور یہ حقیر پر تقصیر اس لیے بھی کہ بیگم ہمراہ تھی تو نہایت مایوس ہوئے۔ ہماری بجائے اسلام آباد کے الیکشن میں حصہ لینے والے اُمید واروں کی بوتّق اور اکثر مونچھ بردار شکلیں کھمبوں پر آویزاں تھیں اور بیشتر کھمبوں پر کمانڈو صاحب۔۔۔ جنرل پرویز مشرف لٹک رہے تھے۔ مجھے معاً خیال آیا کہ کہیں یہ پرویز مشرف کو بالآخر لٹکانے کی ڈریس ریہرسل تو نہیں۔ اگر اس جنرل کو لٹکانا ہے تو دو چار درجن اور بھی ہیں جنہیں لٹک جانا چاہیے۔۔۔ وہ فوج کا سوتیلا بچہ تو نہیں اس کے اور بہن بھائی بھی تو ہیں۔ ٹہنی پر کسی شجر کی یہ واحد بلبل تو نہ تھا جو اداس بیٹھا تھا۔ انگریزی زبان کی ایک کہاوت ہے کہ ایک کتے کو برا نام دو اور پھانسی پر چڑھا دو۔۔۔ اس کی برائی میں جو دیگر بے شمار حضرات بشمول سیاست دان اور بیورو کریٹ شامل تھے تو براہ کرم اُن کے بھی لٹکانے کا مناسب بندوبست ہونا چاہیے۔

مظہر الاسلام باؤلاہوا پھرتا تھا۔ انتظار حسین، اسد محمد خان، فتح محمد ملک، زاہدہ حنا، عطاء قاسمی،

محمود شام، امجد اسلام امجد، قوی خان، توصیف تبسم، پروفیسر تانگ منگ شنگ، ڈاکٹر وحید احمد، محمد یونس سیٹھی، رضا ربانی، انور جہانگیر، عقیل روبی، ناصر علی سید۔۔۔ جاوید جبار کے سامنے ایک خادم کی مانند کورنش بجا لاتا اُن کی تعظیم کرتا تھا۔ اگرچہ میں اس کی سفید مونچھوں اور خوش لباسی سے حسد کرتا راکھ ہوتا تھا۔ بے شک یہ جو زندگی کے میلے ہیں یہ کم نہ ہوں گے افسوس ہم نہ ہوں گے اور جگ والا میلہ یارو تھوڑی دیر دا۔۔۔ ہسدیاں رات لنگھی پتہ نئیں سویر دا۔۔۔ لیکن یہ جو نیشنل بک ڈے کا میلہ تھا ان سب میلوں پر حاوی تھا۔۔۔ افسوس ہم نہ ہوں گے۔۔۔ کراچی کے ”انوکھے لاڈلے“ خبطی ہو چکے، لوگوں کو کیلے پیش کرتے ہوئے انوکھے کہانی کار اسد محمد خاں، انتظار حسین اپنی ”بستی“ میں بستے۔ عقیل روبی والٹیئر اور یونان میں گم، عطاء الحق قاسمی ”مجموعہ“ میں اُردو محلہ کے گل کھلاتے ہوئے۔۔۔ محمود شام کی شاعری جس نے میری نک چڑھی بیگم میمونہ کو بھی داد دینے پر مجبور کر دیا۔ عاصم بٹ کی ”کافکا کہانیاں“ قوی خان کی لازوال پرفارمنس منٹو کے حوالے سے اور اپنے چینی اردو دان پروفیسر تانگ منگ شنگ کا منٹو کے بارے میں انوکھا مضمون، امجد اسلام امجد کی ”شام سرائے“ کی پذیرائی۔۔۔ سعود اشعر کا ”اپنا گھر“۔۔۔ زاہدہ حنا کی ”تتلیاں ڈھونڈنے والی“ اور وہ اپنا افسانہ پڑھتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہیں جو اُن کی تخلیقی سچائی کی دلیل ہے۔۔۔ اور پھر وحید احمد لاجواب شاعر اور انوکھے ناول نگار کا ”مندری والا“ کیا ہی حیران کرنے والا ناول۔۔۔ پھر جاوید جبار آئے ”پاکستان انوکھی تشکیل، انوکھی تقدیر؟“ ایسی چونکا دینے والی کتاب کے ساتھ۔۔۔ دو برس پیشتر امریکہ کے شہر ڈیٹرائٹ میں ہم دونوں شمالی امریکہ کی ڈاکٹروں کی تنظیم کے سالانہ جلسے میں مہمان خصوصی تھے۔ تب جاوید جبار صاحب نے اپنی کتاب کا اولین تعاوف کروایا تھا۔ وہاں باریش جمیل فرخ بھی موجود تھا۔ منشا یاد کا ڈاکٹر بیٹا ”میں اپنے افسانوں میں تمہیں پھر ملوں گا“، اور مجھے محسوس ہوا کہ منشا پھر سے مجھ سے مل رہا ہے۔
کیسے تخلیقی برق سے روشن ہوتے وہ تین روز تھے۔۔۔ ہر سو ایسے چہرے تھے جو ادب اور شاعری کی بجلیاں گراتے تھے۔ اور پھر ہم سب اس میلے سے لوٹے تو اندھیارے میں چلے گئے ۔ ہم ابھی شہزادے تھے اور ابھی معمولی کمی کمین ادیب ہو گئے۔

پیر دھو کے جھانجھراں پاندی تے شوقن میلے دی
واپسی پر ہر شوقن نے جھانجھریں اتار دیں کہ ان کے جھنک سننے والا کوئی نہ تھا

1988ء کے الیکشن سِٹی کی یادیں

مستنصر حسین تارڑ۔

ڈیلی نئی بات

چونکہ الیکشن کے زمانے ہیں اور رسم دنیا بھی ہے اور دستور بھی ہے کہ الیکشن کے بارے میں ہی دیگر کالم نگاروں کی مانند میں بھی حکمت کے کچھ موتی بکھیروں۔۔۔ اور اتنے بکھیروں کہ وہ فرش پر لڑھک جائیں اور آپ ان پر پھسل پھسل جاویں۔۔۔ میں ان دنوں پی ٹی وی کی صبح کی نشریات کی میزبانی کیا کرتا تھا اور تقریباً سرشام سو جایا کرتا تھا کہ صبح ساڑھے چار بیدار ہو کر، تیار ہو کر، سیر کرتے، راستے میں اکثر سؤر حضرات سے دور سے ملاقات کر کے مجھے پورے سات بجے کیمرے کے سامنے براجمان ہو کر ”السلام علیکم پاکستان اور سارے پاکستان“ کہہ کر دو گھنٹے کے اس پہلے براہ راست پروگرام کا آغاز کرنا ہوتا تھا۔۔۔ تو ایک شب تقریباً دس بجے فون کی گھنٹی نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ دوسری جانب میرے ڈائریکٹر اور دوست خواجہ نثار حسین تھے ”تارڑ صاحب آپ سوئے ہوئے ہیں“ میں نے بیزار ہو کر کہا ”خواجہ جی میں ہرگز نہیں سویا ہوا۔۔۔ گلی ڈنڈا کھیل رہا ہوں، فرمایئے“ اس پر نثار نے نہایت سنجیدگی سے کہا ”آپ نے خبریں نہیں سنیں۔۔۔ نو بجے والی۔۔۔“ تو میں نے مزید بیزار ہو کر کہا کہ خواجہ ایک تو میرے کمرے میں ٹیلی ویژن

نہیں ہے اور اگر ہوتا تو بھی معاف کیجئے گا آپ پی ٹی وی کے ڈائریکٹر ہیں لیکن کیا کوئی صحیح الدماغ شخص پی ٹی وی کا سرکاری خبرنامہ سنتا ہے "خواجہ تو مزید گھمبیر ہو گئے" جنرل ضیاء الحق بہاولپور میں طیارے کے حادثے میں ہلاک ہو گئے ہیں۔۔ کل صبح آپ نے ان کی ہلاکت کی خبر اناؤنس کرنی ہے تو آپ تیاری کر لیجئے۔۔ آپ کے ہمراہ قاری عبیدالرحمن ہوں گے جو تلاوت کریں گے، نعتیں پڑھی جائیں گی اور "سوگوار ماحول ہو گا۔۔ آپ سکرپٹ تیار کر لیجئے۔۔

چونکہ خواجہ نثار حسین ایک دوست بھی تھے چنانچہ میں نے ان سے کہا "خواجہ آپ کی سرکاری مجبوریاں ہیں میری نہیں۔۔ میں اپنی طرف سے سوگواری اور افسوس کے جذبا ت کا اظہار کرنے سے قاصر ہوں۔۔ اس کے لئے آپ لودھی صاحب کو بلا لیجئے۔۔ البتہ آپ جو کچھ مجھے لکھ کر دیں گے وہ میں پڑھ دوں گا، اپنی طرف سے کچھ نہیں کہوں گا"۔

وہ پہلی صبح کی نشریات جب ضیاء الحق عالم بالا سے مزید بلند ہو کر عالم ارواح میں چلے گئے اس کی تفصیل پھر کبھی سہی۔۔ لیکن ان کی رخصتی کے بعد جب الیکشن کا اعلان ہوا تو اس تین روزہ ڈے اینڈ نائٹ مسلسل الیکشن نشریات کے لئے طارق عزیز اور خوش بخت شجاعت کا چناؤ کیا گیا۔۔ اِدھر مہتاب راشدی کے ہمراہ مجھے یہ ڈیوٹی سونپی گئی۔۔ بعدازاں طارق عزیز ایم این اے منتخب ہوئے۔ خوش بخت ایم کیو ایم کے حوالے سے بخت بھری ہو گئیں اور مہتاب سندھ کی منسٹری آف کلچر کی سیکرٹری ہو گئیں اور انہیں ہونا بھی چاہئے تھا۔۔ صرف میں تھا جو گھامڑ کا گھامڑ رہا اور صرف ادب کا تکیہ کرتا رہا۔

میں نے نشریات کی ابتدا میں پی ٹی وی کے وسیع سیٹ کو ایک الیکشن سٹی کے طو رپر متعارف کروایا کہ اس شہر میں کوچے ہیں صحافیوں کے، گلیاں ہیں تجزیہ نگاروں کی اور روشنیاں ہیں جمہوریت کی، آمریت کے سب چراغ ایک حادثے میں جل کر راکھ ہو چکے ہیں۔

مہتاب راشدی ان زمانوں کے لوگ جانتے ہیں کہ "دوپٹہ فیم" تھیں۔ انہوں نے اپنے کسی شو میں سرکار کے حکم کی روگردانی کی تھی، سر پر دوپٹہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ جتنی دلکش تھیں اس سے کہیں بڑھ کر ذہین اور بے تحاشا پڑھی لکھی تھیں۔ وہ ایک ادبی فقرے کی رمز پہنچانتی تھیں اور مزاح سے لطف اندوز ہوتی تھیں چنانچہ ہم دونوں کی معصوم چُہلیں عوام الناس نے پسند کیں۔۔ البتہ یہ چھیڑ چھاڑ کچھ پُرتقدس اور نورانی حضرات کو گراں گزری۔۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ مشہور مشرف لال مسجد کے خطیب نے جمعہ کا خطبہ میرے اور مہتاب کے مکالموں اور زندہ دلی کے خلاف دیا۔۔ اور ہم دونوں کو تقریباً دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا۔۔ ابھی ضیاء عہد کی تاریکی کا ہینگ اوور باقی تھا اور شیوخ نوحہ کناں تھے کہ ان کا مرد مومن آسمانوں کو پرواز کر گیا تھا اور وہ ابھی ذرہ بھر روگردانی برداشت نہ کر سکتے تھے۔

اس پہلی مراتھون الیکشن ٹرانسمشن کے دوران بہت سی حماقتیں سرزد ہوئیں، کچھ دلچسپ سانحات اور پُرلطف حادثے ہوئے اور ان میں سے ایک "سیب سانحہ" تھا جس کا تذکرہ آج بھی ہوتا تھا۔ مسلسل ٹرانسمشن کے باعث ہمیں باقاعدہ کھانے پینے کا موقع کم ہی ملتا تھا۔ چنانچہ ایک بریک کے دوران میں لپک کر باہر گیا اور ایک کلو سیب خرید لایا اور انہیں اپنے آگے رکھے ڈیسک کے دراز میں پوشیدہ کرلیا۔ ہم آن ایئر گئے تو مہتاب راشدی کیمرے سے مخاطب ہو کر الیکشن کے نتائج کے بارے میں تجزیہ کاری میں مشغول تھیں جب میں نے ایک خفیہ سیب برآمد کیا اور نہایت رغبت سے کہ بھوک بہت لگی تھی، کچر کچر کھانا شروع کر دیا۔۔ مہتاب کے کانوں میں جب یہ کچر کچر اتری تو اس کی توجہ بھٹک گئی۔۔ اپنا لیکچر منقطع کر کے کہنے لگی "تارڑ صاحب۔۔ ہمیں بھی ایک سیب عنایت کیجئے" تو میں بے دید ہو گیا اور کہا "سیب اپنا اپنا"۔ اس دوران کنٹرول روم سے ایگزیکٹو پروڈیوسر ظہیر بھٹی کی آواز نہایت غصے میں میرے کانوں میں اتری "تارڑ یہ کیا کر رہے ہو۔۔ آن ایئر سیب کھا رہے ہو ۔۔ انتہا ہے بدتمیزی کی۔۔ بند کرو سیب کھانا" میں نے ان کا پیغام سنا اور کیمرے سے مخاطب ہو کر کہا "خواتین و حضرات ہم لوگ دن رات قوم کی خدمت کے لئے کمربستہ ہیں اور اس دوران ٹیلی ویژن والے ہمیں کھانے کے لئے بھی کچھ نہیں دیتے۔۔ تو ہم کیا کریں، اپنے سیب بھی کھانے نہیں دیتے" اور میں نے وہ سیب ڈیسک پر رکھ دیا۔۔ پورے پانچ منٹ کے بعد ظہیر بھٹی پھر مجھ سے مخاطب تھا "تارڑ پلیز پھر سے سیب کھانا شروع کر دو۔۔ مجھے اتنے احتجاجی فون آ رہے ہیں کہ

فون لائن بلاک ہو گئی ہے"۔ اس ٹرانسمشن کے دوران ایک اور معصوم سا بلنڈر ہوا۔۔ ایم کیو ایم اس الیکشن میں شاید عوام دوست یا عوام پرست مجھے اچھی طرح یاد نہیں کے نام سے اپنے امیدوار کھڑے کر رہی تھی اور طارق عزیز نے جوش خطابت میں انہیں ایک "گروہ" کہہ دیا۔۔ چنانچہ فوری طور پر الطاف بھائی کی وارننگ آ گئی۔ معذرت کرنے کے لیے میرا انتخاب کیا گیا کہ طارق ان دنوں کراچی میں مقیم تھے اور نذرآتش ہونے سے بجا طور پر خوفزدہ تھے۔
آج پچیس برس بعد پھر سے الیکشن کا انعقاد ہو رہا ہے۔۔ یُدھ پڑ چکا ہے۔۔ ایک مہا بھارت کا آغاز ہو چکا ہے دیکھتے ہیں کون فتح سے ہمکنار ہوتا ہے۔
ایک کسان نے اپنے بیل کو سرزنش کرتے ہوئے کہا تھا "جا تجھے چور لے جائیں" تو بیل نے اپنی اداس آنکھیں جھپکاتے ہوئے جواب میں کہا تھا "اس سے مجھے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔۔ میں نے تو چارا ہی کھانا ہے۔۔ کوئی بھی کھلا دے"۔
تو وہ کون سخی بابا ہو گا جو ہمیں چارا کھلائے گ

6/5/13

الیکشن بی بی پریشان پھرتی ہے

مستنصر حسین تارڑ۔

ڈیلی نئی بات

یوں تو پورا پاکستانی شمال میرا محبوب ہے۔۔ جب تک سکت رہی میں اس برفانی محبوب کے وصال کی خواہش میں ہر برس گھر سے نکل کر اک عالم دیوانگی میں شمال کی لیلیٰ کو پکارتا پھرا۔۔ صرف پاکستان کے شمال کے حوالے سے میرے کم از کم ایک درجن سفرنامے دراصل میرے اس عشق خاص کی داستانیں ہیں۔۔ اور اس محبوب نے بھی مجھ سے خوب وفا کی۔ میری وحشت اور دیوانگی کا بھرم رکھا۔ کبھی کسی جھیل کو میرا نام دیا اور کبھی کسی کوہستانی منزل کو "تارڑ سٹاپ" قرار دیا۔۔ اس شمال میں چترال کی وادئ کالاش بھی میری منظور نظر رہی ۔۔ جسے عرف عام میں کافرستان کے نام سے بھی پکارا گیا۔۔ یاد رہے کہ یہ یک طرفہ فیصلہ ہے کہ اس وادی کے مکین کافر ہیں، ہو سکتا ہے وہ ہمیں اُن کی وادی کے باہر جو دنیا ہے اسے کافرستان کہتے ہیں۔۔ میں نے اپنی ڈرامہ نگاری کے زمانوں میں ایک پرائیویٹ چینل کے لیے "کالاش" نام کا سیریل بھی تحریر کیا تھا جس کی شوٹنگ ظاہر ہے اسی وادی میں کی گئی تھی۔ میں نے کچھ عرصہ اس شوٹنگ کے دوران پروڈیوسربختیار احمد کی اشک شوئی کے لیے مجبوریت میں بسر کیا۔
جہاں اس سیریل کے ایک اداکار قاضی واجد نے ایک شب انگوروں کی بیلوں سے آراستہ ہوٹل کے چمن میں مجھے رسا چغتائی کا یہ شعر سنایا تھا:
تھی حیا مانع فقط بندِ قبا کھلنے تلک
پھر تو وہ جان حیا ایسا کھلا، ایسا کھلا
کالاش" سیریل آن ایئر گیا تو کافرستان کی ایک کافر حسینہ جس کا نام غالباً الیکشن بی بی تھا پشاور " ہائی کورٹ میں اس پر پابندی لگانے کی درخواست دائر کر دی کہ بقول اس کافرہ کے اس میں کفار کے رسوم و رواج کی عکاسی میں توہین کا پہلو نکلتا تھا۔۔ یہ درخواست ہائی کورٹ نے فوری طور پر خارج کر دی۔۔ بلکہ اسے مناسب طور پر توصیف کا حقدار ٹھہرایا گیا۔
آپ بجا طور پر استفسار کر سکتے ہیں کہ آخر اس سر زمین پاک میں مجھے کافرستان کی یاد کیوں آ رہی ہے تو میں نہایت احتیاط کرتے کفار پر لعنت بھیجتا عرض کرتا ہوں کہ مجھے کافرستان کی نہیں بلکہ کافر حسینہ الیکشن بی بی کی یاد آ رہی ہے۔ یاد رہے کہ ان وادیوں کے باشندے ہماری طرح پوّتر اور مقدس نام نہیں رکھتے بلکہ اپنے بچوں کو اپنی سر زمین کے پھولوں، جھاڑیوں، جھیلوں اور پودوں کے علاوہ اہم واقعات کے حوالے سے پکارتے ہیں۔ یعنی برفانی ندی۔۔ سبزگھاس۔۔ سبز پتھر وغیرہ۔۔ وہاں آپ کو بھٹو، نواز شریف یا پرویز مشرف ایسے نام بھی ملیں گے۔ اسی طور جن دنوں الیکشن منعقد ہوتے ہیں تو ہر دوسرا بچہ الیکشن

خان یا الیکشن بی بی کہلاتا ہے۔
تو ان دنوں الیکشن ہوا ہی چاہتے ہیں یا کیا خبر ہوا نہیں چاہتے اس لیے مجھے الیکشن بی بی یاد آ رہی ہے۔۔۔ پورے پاکستان میں الیکشن کی بی بی دھومیں مچا رہی ہے۔۔۔ کہیں صرف بی بی کی شہادت کے تذکرے ہیں، مرحومہ کو کیش کروایا جا رہا ہے اور کہیں الیکشن خان دندناتے پھر رہے ہیں۔ ان کے درمیان میں شریفوں کے دور چل رہے ہیں۔ بھائی لوگوں کی فریادیں ہیں کہ لوگو ہم لٹ گئے۔۔۔ بے شک ہم ہمیشہ اقتدار کے ایوانوں میں براجمان رہے ہیں۔ ہم پرویز مشرف کو گھر بلا کر اپنے وعدے سے منحرف ہوئے ہیں لیکن ہم تو لٹ گئے۔ اُدھر نیشنل عوامی پارٹی کی سرخ ٹوپیاں ہیں اور اُن کے ہم وطن طالبان اُن کے بقیہ لباس کو بھی خون سے سرخ کر رہے ہیں۔ اس دھما چوکڑی میں مذہبی جماعتیں (یاد رہے کہ ان کے علاوہ دیگر تمام سیاسی پارٹیاں لا مذہب ہیں)۔۔۔ مشتعل ہو رہی ہیں کہ آخر ہم کیوں اسلام کے نام پر ووٹ مانگ کر لوگوں کو بیوقوف نہیں بنا سکتے، ہم الیکشن کمیشن کی اس پابندی کو جوتے کی نوک پر رکھتے ہیں۔
میرے ایک واقف کار جب کسی بھی سیاسی پارٹی کی حمایت نہ حاصل کر سکے۔۔۔ یہاں تک کہ ق لیگ۔۔۔ اور پگاڑا لیگ نے بھی انہیں مسترد کر دیا تو انہوں نے ایم کیو ایم میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ ادھر سے بھی ٹکٹ نہ ملا تو فوراً تحریک انصاف میں شامل ہو گئے اور ان دنوں نیا پاکستان۔۔۔ نیا پاکستان کے نعرے لگا رہے ہیں۔
مجھے یہاں بے تحاشا والد صاحب کے دوست اپنے آبائی چچا یاد آ رہے ہیں۔ یہ ان دنوں کا قصہ ہے جب مصطفی کھر صاحب کے ایک دست راست میاں اسلم نے آدھی رات کے وقت میرے فلیٹ کے دروازے پر دستک دی تھی کہ تارڑ تمہارا آبائی گاؤں گجرات میں ہے اور وہاں ہمارا کوئی امیدوار نہیں ہے تو کیا تم پیپلزپارٹی کے ٹکٹ پر وہاں سے الیکشن لڑنا پسند کرو گے۔ والد صاحب سے مشورہ کیا تو وہ کہنے لگے، بیٹا ہم مڈل کلاس لوگ ہیں، یہ چونچلے امیروں کے ہیں۔ ہمیں تو رزق حلال کھانے سے ہی فرصت نصیب نہیں ہوتی تو الیکشن لڑنا ہمارے بس میں نہیں ہے چنانچہ میں نے انکار کر دیا۔ اُدھر آبائی چاچا جی جب کبھی ہمارے ہاں آتے تو میں ان زمانوں کے ہر نوجوان کے مانند بھٹو کی توصیف کرتا تو وہ کہتے ”دفع کرو اس شرابی اور بدمعاش کو۔۔۔ پتّر ہم تو اس ملک میں اسلام نافذ کرنا چاہتے ہیں اور وہ تو ایک کافر ہے۔ چاچا جی نے سر توڑ کوشش کی کہ انہیں جماعت اسلامی کا ٹکٹ مل جائے لیکن ناکام ہوئے پھر خبر ملی کہ انہوں نے پیپلزپارٹی میں شمولیت اختیار کر لی ہے۔ اگلی مرتبہ جب وہ ہمارے ہاں آئے تو میں نے نہایت بدتمیزی کا مظاہرہ کیا ”چاچا جی آپ تو کہتے تھے کہ بھٹو ایک شرابی ہے، کافر ہے تو آپ نے کیوں اس کی پارٹی میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا“ تو چاچا جی نے اپنی خضاب زدہ ریش پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ”پُتر میں نے ان سے ملاقات کی ہے، بھٹو صاحب تو ایک درویش ہیں، کامل مرشد ہیں، سبحان اللہ۔۔۔“ چاچا جی پیپلزپارٹی کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے اور دین اور دنیا میں منفعت کے حوالے سے سرخرو ہوئے۔
اکیلے الیکشن بی بی ان دنوں پریشان پھرتی ہے۔
اس کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔
میرے گلے لگ کر تادیر روتی رہتی ہے۔
میں اس کے آنسو پونچھتا ہوں تو وہ کہتی ہے ”پھر وہی آ جائیں گے۔۔۔ پھر وہی آ جائیں گے

12/5/13

جب اس نے گیسو بکھرائے بادل آیا جھوم کے

مستنصر حسین تارڑ۔

ڈیلی نئی بات

لاہور کے ہال روڈ میکلوڈ روڈ چوک اور مسجد مائی لاڈو کے درمیان ایک وسیع میدان ہوا کرتا تھا جسے پٹیالہ گراؤنڈ کہا جاتا ہے۔ ایک زمانے میں شاید ستر برس قبل یہاں لاہور کی "نمائش" لگا کرتی تھی۔ میرے ابا جی مجھے یہ نمائش دکھانے کے لیے لے جاتے۔۔ مرکزی کشش سرکس ہوا کرتا تھا۔ کچھ برس پیشتر جب مجھے ماسکو سٹیٹ یونیورسٹی میں لیکچر دینے کے لیے سرکاری طور پر مدعو کیا تو میں نے وہاں روسی سرکس دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا اور یقین کیجیے وہ بین الاقوامی روسی سرکس پٹیالہ گراؤنڈ کے میرے بچپن کے سرکس کے سامنے نہایت حقیر اور معمولی تھا۔۔ اس نمائش کا آخری آئٹم جس کے لیے اہل لاہور منہ کھولے کھڑے رہتے تھے "جلتا ہوا آدمی" تھا۔۔ ایک شخص تقریباً دو سو فٹ بلند زینے پر کھڑا ہو کر اپنے آپ کو تیل میں بھگو کر دیا سلائی سے آگ لگاتا اور تادیر اس بلندی پر کھڑا دھڑ دھڑ جلتا رہتا اور پھر وہاں سے کود کر آگ میں بھڑکتا زینے کے دامنے میں ایک مختصر سے تالاب میں آگرتا۔۔ اہل لاہور خوب نعرے لگاتے اور تالیاں پیٹتے۔۔ اسی پٹیالہ گراؤنڈ کے درمیان میں ایک سڑک تعمیر کر کے اسے آباد کیا گیا تو میرے والد صاحب نے بھی مبلغ بیس ہزار روپے میں تقریباً اڑھائی کنال کا ایک کمرشل پلاٹ خرید لیا۔ مجھے یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ ان زمانوں میں بیس ہزار آج کے شاید چار پانچ کروڑ کے برابر تھے۔ یہ پلاٹ خریدنے کے دو چار ماہ بعد میرے ماموں جان نے جو کہ والد صاحب کے کاروباری رفیق تھے کہا "بھائی جی کمال ہو گیا۔۔ آج ایک پراپرٹی ڈیلر آئے تھے اور انہوں نے ہمارے پلاٹ کی بولی بائیس ہزار روپے لگا دی ہے۔ پورے دو ہزار کا منافع ہو رہا ہے تو اسے فروخت کر دیتے ہیں"۔۔ والد صاحب کہنے لگے "بھائی جی۔۔ اللہ کے فضل سے ہمارا کاروبار عروج پر ہے ہمیں پیسوں کی ضرورت نہیں، کیوں فروخت کریں، بچوں کے کام آئے گا"۔
"اس پر ماموں جان مسکرا کر بولے "آپ کو پتہ ہے یہ آخر کس نے لگائی ہے؟
والد صاحب نے پوچھا "کس نے ؟" تو ماموں جان نے نہایت فخر سے کہا "شمشاد بیگم نے۔۔" والد صاحب فوراً پگھل گئے۔ میرے یہ دونوں بزرگ برصغیر کے کروڑوں صاحب ذوق لوگوں کی مانند شمشاد بیگم کی کھنکتی، شفاف جیسے ایک برفانی ندی ہو، مدھر جیسے کوئلیا کوکتی ہو آواز کے مداح تھے۔ بھائی جی "میرے والد صاحب تو خوش ہو گئے" مجھے یقین تو نہیں آتا لیکن اگر شمشاد بیگم ہماری جائداد خریدنا چاہتی ہے تو بے شک خسارے پر بیچ دیں"۔
بہت سے پرانے قصے مجھے بھولتے جا رہے ہیں، جیسے میں بھول چکا تھا کہ الیکشن ٹرانسمیشن کے حوالے سے لال مسجد اسلام آباد کے جمعے کے خطبے میں مجھے اور مہتاب راشدی کو مطعون کیا گیا تھا، اسی طور میں یہ فراموش کر چکا تھا کہ کبھی شمشاد بیگم نے پٹیالہ گراؤنڈ کا ایک پلاٹ میرے والد صاحب سے خریدا تھا۔ اُن کی موت کی خبر سنی تو مجھے یہ قصہ پارینہ بھی یاد آ گیا۔۔ ایک عجیب و قوعہ ہوا۔ یہ نہیں کہ ہر سو ایک سوگوار سناٹا چھا گیا بلکہ ہر سو مترنم گیت چھنکنے لگے، جو سوگوار ہوئے ان پر اس کی آواز پائلوں کی جھنکار پھوار کی مانند چھن چھن برسنے لگی۔۔ نہ بول پی پی مورے رنگنا پنچھی جارے جا۔۔ تیری محفل میں قسمت آزما کے ہم بھی دیکھیں گے۔۔ سیاں دل میں آنارے آ کے پھر نہ جانا رے۔ چھم چھما چھم۔ چھوڑ بابل کا گھر موہے پی کے نگر۔ اڑن کھٹولے پہ اڑ جاؤں۔ کبھی آر کبھی پار لاگا بوجھو مرا کیا نام رے۔۔ شمشاد بیگم نے برصغیر کا پہلا پاپ سانگ گایا "آنا میری جان سنڈے کے سنڈے" جسے سی۔ رام چندر نے ترتیب دیا اور پھر اُن کا دو گانا جو آج بھی دھومیں مچاتا ہے۔ اسے سو طرح سے گایا جاتا ہے اور ایسی ویڈیو زتیار ہوتی ہیں کہ انسان کا ایمان ان دو چار گرہ کپڑے میں ملبوس غریب خواتین کے مسلسل تھرکنے سے تھرکنے لگتا ہے۔ ڈانواں ڈول ہو کر ایک ڈول کی صورت کسی کنویں میں اتر جاتا ہے۔۔ اور وہ گانا ہے "میرے پیا گئے رنگون، وہاں سے کیا ہے ٹیلی فون، تمہاری یاد ستاتی ہے" چونکہ وہ بھی محمد رفیع کی مانند ٹھیٹھ پنجابی تھیں، رفیع لاہور کے تھے اور وہ امرتسر میں پیدا ہوئیں تو اُن کی آوازمیں نکھار تب پیدا ہوتا تھا جب وہ پنجابی میں گاتی تھیں۔۔ میرے صبح کی سیر کے دوست مجید بھٹی کا کہنا ہے کہ ان کا اولین گانا جو سپر ہٹ ہوا تھا "کنکاں دیاں فصلاں پکیاں نیں" تھا۔ جب کہ میری بیگم کا کہنا ہے کہ "بتی بال کے بنیرے تے رکھنی آں" اس کا بہترین لوک گیت ہے۔ اب اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ شمشاد بیگم کب میرے دل میں اتر کر مجھ پر احسان کرتی ہیں تو میں عرض کروں گا کہ ان کی گائی ہوئی دو نعتیں ایسی ہیں جن

سے بہتر اگر کوئی سہرا لکھ سکتا ہے تو سامنے آئے۔ پہلی نعت۔۔ ”میں سو جاؤں یا مصطفیٰؐ کہتے کہتے“ اور دوسری ”آیا ہے بلا وا مجھے دربار نبی سے۔۔ گلزار نبی سے“۔۔ کچھ عرصہ پیشتر ہمارے عہد کی سب سے سوز آفریں گلوکارہ نیرہ نور نے شمشاد کی اس نعت کو اسی دھن میں گایا ہے کہ شمشاد اپنی جگہ لیکن نیرہ نور بھی اپنی ہی جگہ۔۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ ٹیلی ویژن سکرین پر یکدم نیرہ نور نمودار ہو اور وہ ”آیا ہے بلاوا مجھے دربار نبیؐ سے“ گا رہی ہو تو میں نے خواہش نہ کی ہو کہ کاش یہ نعت ختم نہ ہو، چلتی رہے اور کبھی ایسا بھی نہیں ہوا کہ میرا گلا نہ رندھ گیا ہو، اور مجھ سے بولا نہ جائے۔

جب لتا منگیشکر اور آشا بھونسلے کا ورود ہوا تو موسیقار ان سے فرمائش کرتے تھے کہ وہ شمشاد کے انداز میں گائیں۔ اور جب شمشاد گاری تھیں تو اُن کے پس منظر میں جو کورس بوائز ہوا کرتے تھے جو اُن کے بول دہراتے ۔۔ سر ملاتے تھے ان میں مدن موہن جیسا عظیم موسیقار اور کشور کمار ایسا پر سوز گلوکار بھی تھا اور شمشاد نے کہا تھا کہ یہ چھورا کشور بہت بڑا گائک بنے گا۔

یہ استاد غلام حیدر تھے جنہوں نے نہ صرف نور جہاں کو بلکہ شمشاد بیگم کو متعارف کروایا۔ لیکن شمشاد کا ایک اور جہان تھا یعنی اس کی آواز نے بڑے بڑے مہمان موسیقاروں کا تعارف کروایا جن میں نوشاد بھی شامل ہیں جو اعتراف کرتے ہیں کہ یہ شمشاد تھی جس کی آواز کے بغیر میں گمنام رہتا۔۔ او پی نیر ایک اور ٹھیٹھ پنجابی، جب لتا منگیشکر دعوے کرتی ہے کہ موسیقار کی کچھ حیثیت نہیں۔ یہ میری آواز ہے جو اس کو ممتاز کرتی ہے تو نیر نے قسم کھالی کہ وہ آئندہ کسی بھی فلم کے لیے لتا سے گانا نہیں گنوائیں گے۔۔ تو انہوں نے صرف گیتا دت اور شمشاد پر انحصار کیا اور لازوال نغمے تخلیق کیے۔۔ نیر نے کہا ”شمشاد کی آواز میں مندر میں بجتی گھنٹیوں کی کھنک ہے۔

ویسے ”جب اس نے گیسو بکھرائے بادل آیا جھوم کے“ کون فراموش کر سکتا ہے۔

شمشاد نے چورانوے سال کی عمر پائی، عرج دیکھا لیکن کبھی زوال نہ دیکھا۔

بھلا اس آواز کو زوال آ سکتا ہے جس نے ”میں سو جاؤں یا مصطفیٰؐ کہتے کہتے“ اور ”آیا ہے بلاوا مجھے دربار نبیؐ سے“ ایسی دل نشیں نعتیں پڑھی ہوں جب اگلے جہان میں یہی نعتیں پڑھتے ہوئے وہ داخل تو کیا کوئی جنت کا راستہ روک سکتا ہے۔

16/5/13

جہاندیدہ بوڑھا مینڈک اور چنچل مینڈکیاں

مستنصر حسین تارڑ۔

ڈیلی نئی بات

16-05-2013

پچھلے دنوں ایک ٹی وی چینل کے شو ”آپس کی بات“ میں مجھے ایک خصوصی مہمان کے طو رپر مدعو کیا گیا جس کی میزبان خاتون حسب معمول نہایت نٹ کھٹ، چنچل اور شرارتی سی تھیں، اگرچہ بوٹا سا قد تھا لیکن خاصی پٹاخہ تھیں، اگرسروقامت ہوتیں تو یقیناًپٹاخہ نہ ہوتیں، بینڈ گرنیڈ وغیرہ ہوتیں اور خلاف توقع بونگیاں نہ مارتی تھیں، زرخیز ذہن رکھتی تھیں اور انہوں نے میری درخواست پر عمل کیا اور شو کے دوران مجھ سے کوئی پنگا نہ لیا۔۔ دراصل جب کبھی مجھے کسی شو میں مدعو کیا جاتا ہے تو میری کچھ شرائط ہوتی ہیں۔۔ ایک یہ کہ آپ دوچار بار پھر فون کیجئے تاکہ مجھے یقین ہو جائے کہ آپ کو واقعی میری موجودگی کی خواہش ہے۔ دوسرا یہ کہ ریکارڈنگ کا وقت میں طے کروں گا۔ تیسری شرط یہ ہوتی ہے کہ میرے سوا اور کوئی مہمان نہ ہو گا۔۔ البتہ اگر کوئی خاص موضوع زیربحث ہے تو الگ بات ہے اور آخری شرط یہ ہوتی ہے کہ میزبان خاتون ریکارڈنگ کے دوران مجھ سے پنگا نہ لے ورنہ میں نتائج کا ذمہ دار نہ ہو گا۔۔ میں ایک جہاندیدہ

اور عیار بزرگ مینڈک ہوں اگر کوئی مینڈکی جسے زکام لگا ہو مجھ سے چھیڑخانی کرے گی تو پچھتائے گی۔۔ جیسے پچھلے برس ایک نادرن مینڈکی مجھ سے پنگا نہ لینے کے وعدے وعید کر کے شو کے دوران حسب عادت چنچل ہو گئی۔۔ نخرے کرنے لگی، اپنے جھمکے جھلانے لگی۔۔ پہلے تو اس نے دانش کے بیش قیمت موتی بکھیرے، ناظرین کو بتایا کہ ادب کیا ہوتا ہے اور ارسطو نے کیا کہا تھا اور پھر میرا تعارف کروا کے مجھ پر فقروں کے تیر برسانے لگی۔۔ میں نے ازحد تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے فقروں کی داد دی اور اس کے بھڑکیلے لباس کی توصیف کی۔۔ اس پر موصوفہ نے اِک ادا سے کہا، ہائے ہائے تارڑ صاحب آپ لڑکیوں سے فلرٹ کرنے سے باز نہیں آتے۔ سنا ہے آپ کو ہر قدم پر کوئی نہ کوئی حسینہ مل جایا کرتی تھی۔۔ اور میں شرمندگی کی اداکاری کرتے مسکراتا رہا۔۔ بالآخر کہنے لگیں۔۔ میں نے سنا ہے کہ آپ نے سولہ برس کی عمر میں پہلا عشق کیا تھا۔۔ اب جانے انہوں نے میری ذاتی زندگی کے بارے میں یہ نادر ”حقائق“ کہاں سے حاصل کئے تھے تو میں بدستور خجل مسکراتا رہا۔ اس پر انہوں نے کیمرے سے مخاطب ہو کر کہا ”ہائے !ہائے صرف سولہ برس کی عمر میں انہوں نے عشق شروع کر دیا تھا۔۔ کیوں تارڑ صاحب کیا یہ سچ ہے

بالکل سچ ہے لیکن بی بی آپ کے بارے میں تو اطلاع ہے کہ آپ۔۔ آپ نے ایک انٹرویو کے دوران اقرار کیا تھا ” کہ میں تو ایک چھوٹی سی بچی تھی جب میری شادی ہو گئی اور دولہا میری پسند تھے تو اگر آپ ایک چھوٹی سی بچی ہونے کے باوجود عشق کر سکتی ہیں اور تین چار بچوں کی ماں ہو سکتی ہیں تو میں تو پھر سولہ برس کا تھا“ مجھے محسوس ہوا کہ مجھے یہ نہیں کہنا چاہئے تھا کہ ان کا چہرہ فق ہو گیا اور انہوں نے فوراً موضوع بدل دیا۔۔ چونکہ شو براہ راست نشر ہو رہا تھا اس لئے ایڈیٹنگ کی گنجائش نہ تھی۔۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ بے شک ایک بیل عمر رسیدہ ہے لیکن اسے اپنا سرخ دوپٹہ دکھا کر اشتعال میں آنے پر مجبور تو نہ کریں۔

مختلف مارننگ شوز کے میزبانوں میں سے میں نے اداکار شان کو سب سے زیادہ متین، مدبر اور دانش مند پایا۔۔ اس نے اپنے عظیم باپ ریاض شاہد کے گہرے تدبر کو ورثے میں پایا ہے۔۔ ”سُسرال“ اور ”زرقا“ ایسی فلموں کے خالق کا بیٹا جانتا ہے کہ اس کے سامنے جو مہمان بیٹھا ہے اس کی ادبی یا سماجی حیثیت کیا ہے۔۔گمان بھی نہیں ہوتا کہ یہ وہی شان ہے جو پنجابی فلموں میں دھاڑتا پھرتا ہے مونچھوں کو تاؤ دیتا، کلاشنکوف کو سر کے اوپر معلق کر کے اس فربہ ہیروئن کے زیروبم سے لاپروا جو اس کے اردگرد اپنے زیرو بم پھڑکاتی پھرتی ہے۔۔جو برصغیر کے تمام فلمی ہیروز سے کیسا بڑھ کر خوش شکل اور پُرکشش ہے۔۔ شاہ رخ خان اس کے سامنے کم از کم شکل کے حوالے سے چپڑ قناتیہ لگتا ہے۔۔ گمان بھی نہیں ہوتا کہ یہ وہی شان ہے۔۔ وہ اتنی تکریم اور عاجزی سے سوال کرتا ہے۔

میں ان دنوں ایک شو ”شادی آن لائن“ کی میزبانی کیا کرتا تھا جب اسی چینل پر ایک ٹاک شو شروع ہوا ایک نہیں اکٹھی تین نامعلوم سی خواتین اس کی میزبان تھیں اور اپنی نامعلومیت میں خاصی ڈھل چکی تھیں لیکن ان کے نخرے نہ ڈھلے تھے۔ ان کے شو میں خاصے معروف لوگ آتے جن کے ساتھ وہ انتہائی بدتمیزی سے پیش آتیں اور ان کی شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ان پر اخلاق سے گرے ہوئے حملے کرتیں۔۔ مجھے مدعو کیا گیا تو میں نے انکار کر دیا لیکن اس شو کا پروڈیوسر میری تحریریوں کا شیدائی تھا کہنے لگا۔۔ تارڑ صاحب آپ میرے لئے آ جائیے، مجھے فخر ہو گا کہ جس شخص کو ٹی وی سکرین پر دیکھتا میں جوان ہو اور پھر اُس کی تحریروں کا مداح ہوا وہ میرے ذاتی شو میں آیا۔۔ یوں بھی یہ آپ کے چینل کا شو ہے۔۔ ہمارا حق بنتا ہے چنانچہ میں انکار نہ کر سکا۔۔ اس شو کی وڈیو ریکارڈنگ یو ٹیوب پر محفوظ ہے آپ ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ میری انٹری سے پیشتر ان تینوں نے جی بھر کے میرے بارے میں بونگیاں ماریں اور جب میں اپنی نشست پر بیٹھ گیا تو ایک لمبے چہرے والی خاتون، جیسے ایک بوسیدہ پیراہن دھونے کے بعد دھوپ میں خشک ہوتے لٹک جاتا ہے ایسے چہرے والی بوڑھی خاتون نے نخریلے انداز میں کہا ”دیکھئے کتنی خوبصورت شام ہے۔۔ آپ اس شام میں ہماری رفاقت میں کیسا محسوس کرتے ہیں؟“ تو میں نے نہایت سنجیدگی سے کہا ”خاتون، یہ میری زندگی کی پہلی شام ہے جو میں اتنی ادھیڑ عمر خواتین کے ساتھ گزار رہا ہوں“ ۔

اسی نوعیت کے ایک ٹیلی ویژن شو میں مجھے بے حد عزیز، باکمال اداکار اور میزبان معین اختر نے بھی مجھ سے کچھ چھیڑ چھاڑ کی تھی اور مجھے آج تک افسوس ہے کہ میں نے کیوں اشتعال میں آ کر اسے شرمندہ کیا تھا۔ معین اختر نے اپنی موت سے کچھ روز پیشتر مجھے ایک طویل فون کیا تھا۔۔۔ وہ میرے بارے میں فکرمند تھا، میری موت کے بارے میں فکرمند تھا اور پھر مجھ سے پہلے مر گیا۔ معین جیسا نابغۂ روزگار شخص اگر مجھ سے پنگا لیتا ہے تو جائز ٹھہرتا ہے مینڈکیوں کو یہ حق ہرگز حاصل نہیں کہ بوڑھے مینڈک کے ساتھ چھیڑ خوانی کریں۔

میرے زمانے۔۔۔ خدا حافظ

مستنصر حسین تارڑ۔

ڈیلی نئی بات

19-05-2013

ان دنوں مجھ سے باتیں کرنے والے سوال پوچھنے والے ”آپ کے زمانے“ کا استعمال کچھ زیادہ ہی کر رہے ہیں۔ مثلاً تارڑ صاحب آپ کے زمانے میں آئس کریم ہوا کرتی تھی، برگر تو بالکل نہیں ہوں گے، ٹیلی فوج ایجاد ہو چکا تھا۔۔۔ ظاہر ہے ٹیلی ویژن تو ایجاد ہو گیا ہو گا ورنہ آپ کیسے ٹیلی ویژن پر آتے۔۔۔ آپ کے زمانے کا ہوں، قبل از مسیح پیدا ہوا تھا اور پھر خیال آتا ہے کہ اگر میں اللہ کے فضل سے پون صدی کا ہونے والا ہوں۔ مجھے ہندوستان کی تقسیم یاد ہے۔۔۔ انگلستان گیا تھا تو اُن زمانوں میں ابھی جیٹ ایجاد نہیں ہوئے تھے، پنکھوں والے جہاز پر سوار ہو کر گیا تھا۔۔۔ ستمبر 1965ء اور 1971ء کی جنگوں کا چشم دید گواہ ہوں۔ پاکستان کو پہلے بنتے پھر بگڑتے دیکھا۔۔۔ تو لوگ درست ہی کہتے ہیں کہ میرا زمانہ کوئی اور تھا۔۔۔ میں نے پاکستان کا وہ اولین دور دیکھا ہے جب پوری دنیا اس نئی مملکت کو پورے ایشیا میں ایک جدید اور روشن خیال معاشرے کی پیغامبر قرار دے رہی تھی۔۔۔ اُن کا خیال تھا کہ ہندوستان قدیم رسوم اور مذہبی تعصبات میں جکڑا ہوا ہے اور اس میں تبدیلی کی گنجائش نہیں جبکہ پاکستان جناح جیسے پڑھے لکھے، جدید سوچ کے حامل اور بین الاقوامی حقیقتوں کا سامنا کرنے والے لیڈر کی قیادت میں دنیا کے نقشے پر ایک روشن مثال ہو گا۔۔۔ جس نے اس ملک کے قیام کے بعد یہ کہا تھا کہ آج آپ سب آزاد ہیں اپنے اپنے مذہب اور عقیدے کے مطابق مسجدوں، مندروں، کلیساؤں میں جانے کے لیے اور آپ سب یکساں طور پر پاکستانی ہیں۔۔۔ دنیا کا ہر ملک پاکستان کے ساتھ تعاون کرنا چاہتا تھا، اس ابھرتی ہوئی مثالی ریاست کے ساتھ تعاون کرنا چاہتا تھا۔۔۔ یہ وہی دور تھا جب جنوبی کوریا ہمارے پانچ سالہ منصوبے کو جوں کا توں اپنے ملک میں نافذ کرتا ہے۔۔۔ زراعت اور صنعت میں ہم تب چین کو بھی پیچھے چھوڑ رہے تھے اور چین ہم سے مشورے مانگتا تھا۔۔۔ دنیا بھر میں ہم پاکستان کے لیے جائیدادیں خرید رہے تھے۔۔۔ پیرس کے شانزے لیزے پر پی آئی اے کا شاندار دفتر تھا، ایک ہوٹل تھا اور اب بھی شاید ہے جو پاکستان کی ملکیت میں تھے۔۔۔ نیو یارک کے مہنگے ترین علاقے مین ہاٹن میں وہاں کا سب سے شاندار ہوٹل روز ویلٹ پاکستان کا تھا اور اب بھی ہے اگرچہ اسے فروخت کرنے کی کوشش بہت ہوئی۔۔۔ امریکہ بھر میں پاکستان کی جائیدادیں بکھری پڑی تھیں۔۔۔ چند برس پیشتر جب ہالینڈ میں مقیم پاکستانیوں اور سفیر پاکستان جناب اعزاز چوہدری نے مجھے اور میری بیگم کو خصوصی طور پر مدعو کیا تو چوہدری صاحب اور اُن کی بیگم ناجیہ نے ہمیں تقریباً زبردستی اپنی محل نما رہائش گاہ میں ٹھہرایا۔۔۔ اور یہ پیلس بھی حکومت پاکستان کی ذاتی ملکیت ہے۔۔۔ تفصیل اس اجمال کی کچھ یوں ہے کہ جب رعنا لیاقت علی خان کو ہالینڈ میں پاکستانی سفیر مقرر کیا گیا تو انہوں نے یہ شاہانہ رہائش گاہ کرائے پر حاصل کی۔۔۔ رعنا اور ہالینڈ کی ملکہ جو لیانایوں جانیئے کہ گوڑھی سہیلیاں ہو گئیں۔ وہ میز آج بھی اس رہائش گاہ میں موجود ہے جو اُن کی پسندیدہ تھی، وہ اکثر شاموں میں اس میز پر برج کی بازی لگاتیں۔۔۔ اس دوران کہا جاتا ہے کہ ملکہ جو لیانا نے رعنا لیاقت علی خان سے کہا کہ آپ کی حکومت یہ رہائش گاہ خرید کیوں نہیں لیتی بجائے اس کے کہ ہر ماہ اتنا کرایہ ادا کیا جائے تو رعنا نے کہا کہ ملکہ جی۔۔۔ پاکستان ایک

غریب ملک ہے، ہم ایسی شاہانہ رہائش گاہ خریدنا افورڈ نہیں کر سکتے۔۔ اس پر کوئین جولیانا نے کہا کہ یہ رہائش گاہ ہالینڈ کے شاہی خاندان سے بھی متعلق ہے تو میں ملکہ کے طور پر سفارش کر سکتی ہوں کہ پاکستان ایسا نیا اور جدید ملک جو کچھ بھی افورڈ کر سکتا ہے اسے قبول کر لیا جائے۔۔ کیونکہ میری خواہش ہے کہ میں آپ کے پاکستان کی ترقی میں معاون ثابت ہوں۔ پی آئی اے دنیا کی وہ پہلی ایئر لائن تھی جس نے اپنی فضائی میزبانوں کے لباس کے لیے پیرس کے پیئر کارڈن سے رجوع کیا۔۔ اور یاد رہے اُن دنوں ابھی موٹی، بے ڈھب اور ادھیڑ عمر ایئر ہوسٹوں کا رواج نہ ہوا تھا جنہیں سیاسی جماعتیں زبردستی بھرتی کروا دیتی ہیں۔۔ اور جب اس نہایت جدید اور انوکھے لباس میں ملبوس پی آئی اے کی ایئر ہوسٹس دنیا کے کسی بھی ایئر پورٹ پر قدم رکھتی تھی تو لوگ ٹھہرکے دیکھتے تھے۔۔ پی آئی اے نے آج کی دنیا کی بڑی ہوائی کمپنیوں کو ابتدائی ٹریننگ دی اور آج۔۔ پی آئی اے جس کے آدھے جہاز ناکارہ ہو کر زمین پر زنگ آلود ہو رہے ہیں۔۔ پروازیں کینسل ہوتی ہیں، کبھی پرواز نہیں کرتیں۔۔ دنیا کے کتنے ایئر پورٹ ایسے ہیں جہاں پی آئی اے کے طیاروں کو تکنیکی طور پر اس قابل نہیں سمجھا جاتا کہ وہ وہاں لینڈ کر سکیں۔ پی آئی اے صرف اجارہ داری، مجبوری اور ممالک غیر میں آباد پاکستانیوں کی حب الوطنی کو بلیک میل کرتی چل رہی ہے۔۔ پاکستان ویسٹرن ریلوے۔۔ ٹرین سٹیشن پر کھڑی ہے اور ایک صاحب ڈرم لے کر بازار سے ڈیزل خریدنے جا رہے ہیں اور پھر واپڈا اور بجلی کا بحران۔۔ سبحان اللہ۔۔ یہ شرمناک تنزل کیوں ہوا۔۔ اسے میں کیسے مختصر طورپر بیان کروں۔۔ بس یہ ہے کہ ہم نے اپنی دھرتی کی قدرنہ کی۔۔ ہم سب نے مل کر۔۔ کیا سیاست دان، کیا فوجی حکمران اور کیا تاجران اور کیا بیورو کریٹ اور عدل کرنے والے سب نے گِدھوں کی مانند اس کی بوٹیاں نوچ کھائیں اور ڈکار لیتے ہوئے ہمیشہ الحمد للہ کہا۔۔ہم نے اس سر زمین کو کبھی ماں نہ سمجھا کہ چین و عرب ہمارا تھا پاکستان ہمارا نہ تھا۔۔ اگر ماں سمجھتے تو کبھی اس کا ماس کھا کر تکبیر کے نعرے نہ لگاتے۔۔ ہم نے دوسروں کی جنگیں لڑیں، جہاد کیے لیکن اپنے مشرقی پاکستان کا دفاع نہ کیا۔۔ ہمیشہ ہم نے دوسروں کے لیے ہتھیار اٹھائے اور اپنے لیے ہتھیار ڈال دیئے۔۔ عقیدے کے تعصب نے اس عظیم الشان سلطنت خدا داد کی جڑیں کھوکھلی کر دیں۔۔جہاں نہ کوئی کرکٹ ٹیم آ سکتی ہے اور نہ ہی کوئی صحیح الدماغ سیاح۔۔ میں آپ سے معذرت کرتا ہوں کہ میں ایک نوحہ گر ہو گیا ہوں۔۔ اک شام غریباں کا آنسو بہانے والا ہو گیا ہوں۔۔ ہاں۔۔ میرے زمانے واقعی کچھ اور تھے۔۔ تب ”خدا حافظ“ ہوا کرتا تھا اور اب ”اللہ حافظ“ ہو گیا ہے۔۔ بے شک قرآن پاک کا سب سے اہم اردو ترجمہ مولانا فتح محمد جالندھری کا تسلیم کیا گیا ہے اور وہ بھی اس کا آغاز ”شروع کرتا ہوں خدا کے نام سے“ کرتے ہیں لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں۔ مولانا کی عقل پر ماتم ہی کر سکتے ہیں کہ وہ آگاہ ہی نہیں تھے کہ خدا تو سب قوموں کے ہوتے ہیں اور اللہ صرف ہمارا ہے۔۔ ہاں میرے زمانے واقعی جہالت کے زمانے تھے جب مال روڈ پر واقعی لکشمی نیشن کے فلیٹوں میں مسلمان، پارسی، عیسائی اور ہندو سب کے سب پاکستانی تھے۔

یہ الم ناک داستان تو بہت طویل ہے، چلئے میں اپنے زمانے کے لاہور کے کچھ قصے سناتا ہوں۔۔ جب لاہور۔۔واقعی لاہور تھا۔ اس پر کسی مذہبی، لسانی منافرت کا سایہ نہ تھا۔ ہاں۔۔ وہ میرے زمانے تھے۔ (جاری ہے)

میرے زمانے کا لاہور

مستنصر حسین تارڑ۔

ڈیلی نئی بات

22-052013

تو میں اپنے زمانوں کے لاہور کے قصے چھیڑتا ہوں۔۔ جب لاہور۔۔ واقعی لاہور تھا، کھلے دل اور روشن چہرے والا لاہور۔۔ جہاں عیسائی، پارسی، ہندو اور مسلمان اِک دوجے کے ہمسائے تھے، اپنے اپنے مذہبی تہواروں میں سب کو شامل کرتے تھے اور وہ بخوشی شامل ہوتے تھے۔۔ لاہور کی میری اولین اور موہوم یاد بسنت کا

ایک دن ہے جب لاہور کا آسمان پتنگوں، گڈیوں اور گڈوں کی دل آویز رنگینیوں سے تھرتھراتا تھا، ہم ان دنوں چیمبر لین روڈ پر رہتے تھے اور میں اپنے بلند تین منزلہ مکان کی چھت پر کھڑا منہ کھولے آسمان کو تکتا خواہش کرتا تھا کہ کاش ان میں کوئی گڈی کٹ کر سیدھی میری جھولی میں آ گرے۔۔ کرشنا گلی اور گورو ارجن نگر کے مکانوں کی چھتوں پر ہندو لڑکیاں پیلے پھولوں کی مانند کھلتی تھیں، جیسے سرسوں کے پھولوں پر سے ہوا کے ایک جھونکے کا گذر ہو تو وہ نزاکت سے لچکتے ہیں ایسے وہ زرد پیراہنوں والی لڑکیاں تھیں۔۔ لاہور کی بسنت کو تو جانے کس کی نظر کھا گئی، میں نے جتنی بھی زمین دیکھی ہے اس کے چہرے پر کبھی لاہور کی بسنت ایسا تہوار نہیں دیکھا وہ لوگ جنہوں نے کبھی ایک آسمان میں چھید کرتی پتنگ کی تنی ہوئی ڈور کو اپنی انگلیوں میں سرکتے محسوس نہیں کیا وہ بھی کیا جئے۔۔اور وہ لوگ جن کے ہاتھوں میں ایک کٹی ہوئی گڈی کی آوارہ ڈور نہیں آئی وہ کیا جانیں کہ زندگی کی دھڑکن کیا ہوتی ہے۔۔ بسنت شاید تب ہلاک ہوئی جب اسے کمرشل کر دیا گیا۔۔ لاہور کی چھتوں پر مجرے ہونے لگے، موسیقی کی دھماچوکڑی مچ گئی اورملٹی نیشنل کمپنیوں نے اس تہوار کو ایک کاروبار بنا لیا۔۔ ہم جیسے مڈل کلاسئے اپنی دوچار پتنگیں تھامے، ڈور کا ایک پنا ہاتھوں میں لئے اس تہوار سے باہر کر دیئے گئے۔ جتنے بھی پلنگ باز سجناں تھے وہ غریب غربا تھے، وہ بے چارے حسرت سے اس بسنت کو دیکھتے تھے جسے سرمایہ دارانہ نظام نے اغوا کر لیا تھا۔۔ اس کے ہاتھ میں دھاتی ڈور کا ورود ہو گیا جو گلے کاٹنے لگی اور میں نے ان دنوں لکھا تھا کہ اگر اس تہوار کے منانے سے ایک بچہ بھی گلے میں ڈور پھرنے سے ہلاک ہوتا ہے تو میں اس پر لعنت بھیجتا ہوں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دھاتی ڈور بنانے والوں اور استعمال کرنے والوں کو گرفتار کر کے ان پر قتل عمد کا مقدمہ چلا کر انہیں سزا کیوں نہیں دی جاتی۔۔ اگر کوئی باؤلر اپنے گیند میں بارود بھر کر بلے باز کو ہلاک کر دیتا ہے تو کیا آپ کرکٹ پر پابندی لگا دیں گے۔۔ مائیک ٹائسن باکسنگ کے مقابلے میں اپنے حریف کا کان چبا جاتا ہے تو ٹائسن پر پابندی لگ جاتی ہے، باکسنگ کو بین نہیں کیا جاتا۔۔ اور پھر ہمارے علمائے کرام اس معرکے میں کود پڑے اور یاد رہے کہ ہمارے یہ کرم فرما ہر نوعیت کی مسرت اور سرخوشی کو حرام جانتے ہیں۔۔ کہا گیا کہ یہ ہندو تہوار ہے۔۔ ڈاکٹر ذاکر نائیک جن کا میں بہت معترف ہوں اپنے ایک لیکچر کے دوران کہا تھا کہ ۔۔میں ایک ہندو ہوں۔۔ اس لئے کہ میں ہندوستان کا رہنے والا ہوں۔۔ لیکن میرا مذہب اسلام ہے۔۔ تو یہ تہوار ہندوستان کا ہے۔۔ برصغیر کا ہے مرزا غالب کو ان کے کسی ہندو مداح نے برفی کی ایک ٹوکری روانہ کی اور جب غالب اسے نہایت رغبت سے کھا رہے تھے تو ایک صاحب نے اعتراض کیا کہ مرزا ۔۔یہ برفی توایک ہندو نے بھیجی ہے تو وہ کہنے لگے ”میاں برفی ہندو یا مسلمان نہیں ہوتی۔۔ بس برفی ہوتی ہے۔۔ تو بسنت بھی۔۔ بس بسنت ہوتی ہے میری خواہش ہے کہ بسنت مخالف علمائے کرام کو کسی کوٹھے پر مدعو کر کے (کوٹھے سے مراد وہ والا کوٹھاہرگز نہیں ہے) ان کے ہاتھوں میں ایک تنی ہوئی پتنگ کی ڈور دے دی جائے اور پھر پوچھا جائے کہ حضرت اب کہئے کہ بسنت ہندو ہے یا مسلمان۔۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں۔۔ اگر حرام قرار دینا ہے تو ایک قطرہ بسنت کا چکھ کر قرار دیجئے۔

بسنت کے بعد میرے کچے ذہن پر 1947ء نقش ہوا لیکن اس سے پیشتر کچھ اور قدیم تصویریں ہیں جو مدھم پڑتی جاتی ہیں۔۔ میں رنگ محل مشن ہائی سکول میں پڑھا کرتا تھا۔۔ عام طور پر میں چیمبر لین روڈ سے موچی دروازے کے راستے سکول جایا کرتا تھا۔۔اس راستے کی موسیقی آج بھی میرے کانوں میں گونجتی ہے کہ وہاں ورق کوبوں کی درجنوں دکانیں تھیں اور صبح سویرے ان کے اندرون سے سونے اور چاندی کے ورق کوٹنے کی نہایت سریلے ردھم میں دھم دھم کی گونج مسلسل سنائی دیتی تھی۔۔ ورق کوبوں کی یہ موسیقی، اگر مجھ میں ذرہ بھر بھی رومانیت ہوتی مجھے ایک ملامتی صوفی ہونے پر مجبور کر دیتی کہ اس میں ایک ایسا طلسم تھا جو بدن کے اندر سرایت کر کے وہ ازلی اور ابدی سوال کرتا تھا جن کے جواب کسی کے پاس نہ تھے۔شنید ہے کہ شاہ حسین بھی اسی ورق کوبی کی دُھن پر وجد میں آتے تھے اور فریدالدین عطارؒ پر بھی یہی لَے اثرانداز ہوئی اور وہ عطر فروشی ترک کر کے مجذوب ہو گئے۔

کبھی کبھار میں سکول پہنچنے کے لئے موچی دروازے کی بجائے نسبتاً طویل راستہ اختیار کر کے شاہ

عالمی کے بازار میں داخل ہو جاتا۔۔۔ یہ ایک نہایت تنگ اور گھنا بازار ہوا کرتا تھا یہاں تک کہ ایک دکان کا دھوپ سے بچاؤ کا سائبان سامنے کی دکان کے ماتھے پر جاگھستا تھا۔ یہاں بھی سب کا سب کاروبار ہندوؤں کا تھا اور بیشتر دکانیں سنیاروں یا سونا فروخت کرنے والوں کی تھی۔۔۔ میں دیکھتا کہ ان نیم تاریک دکانوں میں سونے کی لشک ہے اور موٹی موٹی متمول ہندو عورتیں زیور گہنے خرید رہی ہیں، بھاؤ تاؤ کر رہی ہیں۔ ایک نوجوان طالبہ جو میرے ناولوں کے حوالے سے ایم فِل کا تھیسس لکھ رہی تھی اس کی تحقیق کے مطابق میرے ناولوں میں نہایت تسلسل سے پرندوں، دریاؤں، موت اور لاہور کا تذکرہ ملتا ہے اور میں اس سے اتفاق کرتا ہوں۔۔۔ میرے ناول ”راکھ“ میں 1947ء کا لاہور ہے شاہ عالمی کے دن رات جلتے مکانوں اور حویلیوں کی راکھ ہے۔۔۔ ”خس و خاشاک زمانہ“ میں 1930ء کا قدیم لاہور ہے اور میرے تازہ ترین ناول ”اے غزالِ شب“ میں بھی ان زمانوں کے لاہور کے گلی کوچے ہیں بلکہ ناول کے علاوہ میرے ٹیلی ویژن سیریل ”سورج کے ساتھ ساتھ“ میں بھی پُرانا لاہور ایک زندہ کردار کے طور پر نمایاں تھا۔بلکہ مجھے یاد آ گیا کہ ایک محقق جو ”ادب میں لاہور‘ کے حوالے سے ریسرچ کر رہے ہیں ان کی تحقیق کے مطابق کسی بھی ادیب کی نسبت میرے ناولوں میں لاہور زیادہ پایا جاتا ہے۔۔۔ ادھر کشور ناہید نے“خس و خاشاک زمانہ“ کے بارے میں کومنٹ کیا تھا کہ جیسے شمس الرحمن فاروقی نے اپنے ناول ”کئی چاند سر آسماں“ میں لکھنؤ کی تہذیب کو زندہ کیا ہے اس طور تارڑ نے پنجاب اور لاہور کی قدیم روایات اور تہذیب کو محفوظ کر لیا ہے۔ میں اپنی کسی تحریر میں تذکرہ کر چکا ہوں کہ جب قرۃ العین حیدر لاہور آئیں اور ایک کیک تھامے ہوئے مجھے ملنے کے لئے میرے گھر آئیں تو میرے لئے یہ ایک خوش بختی کا سنہری لمحہ تھا۔۔۔ میں انہیں لاہور شہر کی قدیم گلیوں او رکوچوں میں لے گیا۔۔۔ وہ ہر گلی ہر کوچے میں جھانکتیں اور کہتیں ”تارڑ یہ تو ہو بہو لکھنؤ ہے“ تو میں نے ان سے کہا تھا کہ عینی آپا ایک فرق ہے۔۔۔ لکھنؤ کب کا زوال پذیر ہو چکا۔۔۔ مر چکا۔۔۔ لیکن لاہور ابھی زندہ ہے، تو (انہوں نے سر جھٹک کر کہا تھا ”ہاں۔۔۔ تم ٹھیک کہتے ہو“ یہ ہے لاہور۔ (جاری ہے

لاہور میں ہرنوں کی ڈاریں قلانچیں بھرتی تھیں

مستنصر حسین تارڑ۔

ڈیلی نئی بات

26-05-2013

جیسے کار جہاں دراز ہے ایسے قصہ لاہور بھی بہت دراز ہے۔
میرے ابا جی 1930ء کے لگ بھگ رزق روزگار کی تلاش میں اپنے آبائی گاؤں سے لاہور منتقل ہوئے۔ وہ اکثر ہمیں بتایا کرتے کہ ایک مرتبہ وہ کاروبار کے سلسلے میں لاہور سے کراچی بذریعہ ریل گاڑی جا رہے تھے۔۔۔ لاہور ریلوے سٹیشن کے بعد ایک ویرانے میں لاہور کینٹ کا مختصر سا سٹیشن تھا، جونہی ریل گاڑی کینٹ سٹیشن سے نکلی تو ہرنوں کی ایک ڈار قلانچیں بھرتی ہوئی گاڑی کے ساتھ ساتھ ہو لی۔۔۔ یہ علاقہ گورو مانگٹ کا تھا جس کے آس پاس ان دنوں گلبرگ پھیلا ہوا ہے۔ ہرنوں کی یہ ڈار اپنے تئیں اس عجیب سے سانپ نما لہراتے ہوئے لوہے کے جانور کے برابر میں اس سے آگے نکلنے کی کوشش میں دوڑتی رہی اور پھر یکدم برابر کے ایک جنگل میں روپوش ہو گئی۔ میں اکثر تصور کرتا ہوں کہ ان دنوں میں گلبرگ کے جس علاقے میں مقیم ہوں وہاں کبھی غزالوں کا بسیرا تھا۔۔۔ فخر الدین تم تو واقف ہو کہ دیوانے پہ گزری اور۔۔۔ اے غزالِ شب، تری پیاس کیسے بجھاؤں میں۔
ء کی قربت میں جب ہم چیمبر لین روڈ کے ایک خوش نما گیلریوں والے مکان سے مال روڈ پر واقع ان 1950 زمان کے ”پوش“ علاقے لکشمی مینشن میں منتقل ہوئے تو میری والدہ نے رو رو کر آنکھیں سُجا لیں کہ کہاں آ گئے ہم چمن سے نکل کے۔۔۔ پوری ہال روڈ مکمل طو رپر ایک ویران گزرگاہ تھی، کوئی ایک دکان بھی نہ تھی۔ البتہ لکشمی مینشن میں ہال روڈ پر کھلتا ایک مے خانہ تھا جس کے اندر جانے کا تو کبھی اتفاق نہ

ہوا کہ ہم ابھی ایک خاکی نیکر میں ملبوس لڑکے تھے لیکن ہم کبھی کبھار اندر جھانک لیتے۔۔۔ بیشتر مے خوار عیسائی یا پارسی ہوتے لیکن اپنے مومنین کی بھی کچھ کمی نہ ہوتی۔۔۔ اور میں نے کبھی اس شراب خانے سے نکلتے ہوئے کسی شخص کو ڈولتے اور جھومتے ہوئے نہ دیکھا جیسا کہ ہماری اکثر فلموں میں دکھایا جاتا ہے۔ میری امی جب کبھی چیمبر لین روڈ کے اس گھر میں مقیم میرے ماموں جان سے ملنے جاتیں تو شام ہونے سے پہلے لوٹ آتیں کہ تب مسجد مائی لاڈو کے بعد ویرانی ہی ویرانی تھی اور کوئی بھی تانگے والا شام کے بعد ہال روڈ کی جانب جانے سے گریز کرتا۔۔ اور وہ جو مال روڈ تھی مختصر سی جس کے دونوں جانب پھولوں کی کیاریاں ااور گھاس کے قطعے تھے وہاں پچھلے پہر کارپوریشن کی جانب سے چھڑکاؤ کیا جاتا۔ شاید اسی لیے اسے ٹھنڈی سڑک بھی کہا جاتا تھا۔ پورے دن میں شاید درجن بھر کاریں گزرتیں۔ تانگے اور ریڑھے بھی کم کم ہوتے اور گرمیوں کی دوپہروں میں مال روڈ اتنی ویران ہوتی کہ ہم بچہ لوگ وہاں بیچ سڑک کے بلکہ ریگل چوک میں کیڑی کاڑا وغیرہ کھیلتے۔ البتہ چودہ اگست کے دن یہ لاہور شہر کی سب سے پر رونق اور پر مسرت شاہراہ ہو جاتی۔ یوم آزادی کے موقع پر ایک نہایت پر جلال شان شوکت والی ملٹری پریڈ ہوتی۔۔۔ دور پار کے دوست اور رشتے دار ہمارے مہمان ہوتے کیونکہ ہمارے فلیٹ کی چھت پر سے ریگل چوک میں سے مارچ پاسٹ کرتی فوج، بکتر بند گاڑیاں اور ٹینک ایک شاندار نظارہ ہوا کرتے اور مال روڈ کے تمام کوٹھوں اور چھتوں پر ناظرین کا ایک ہجوم ہوتا اور ہم "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگا لگا کر اپنے گلے بٹھا لیتے۔ ہر مکان پر پاکستانی پرچم لہرا رہا ہوتا۔ خصوصی طور پر جب گڑ گڑاتے ہوئے ٹینک گزرتے تو زلزلہ سا آ جاتا اور ہم مزید پر جوش ہو کر نعرے لگانے لگتے۔۔۔ اور یاد رہے کہ ان نعرے لگانے والوں میں عیسائی اور پارسی ہم وطن بھی ہوتے۔ انہیں ابھی تک معلوم نہ تھا کہ وہ کبھی جلائے جائیں گے یا باہر کے ملکوں میں منتقل ہونے پر مجبور ہو جائیں گے۔

ریگل چوک کے پار "سٹینڈرڈ ریسٹورنٹ" تھا جس کی چھت پر ایک فربہ خاتون اینجلا نام کی رقص کیا کرتی تھی۔۔۔ اور ہم اپنے والدین سے چوری چھپے چھت پر جا کر مفت میں اس کا ناچ دیکھا کرتے تھے۔ ریگل سنیما کی گلی میں ایک انگریز خاتون نے ایک ڈانسنگ سکول کھول رکھا تھا۔۔۔ جہاں ان دنوں مسجد شہداء ہے وہاں تانگوں کا اڈا ہوا کرتا تھا اور آپ وہاں سے مزنگ اور اچھرہ کے دور افتادہ قصبوں تک جا سکتے تھے لیکن صرف دن کے وقت۔۔۔ بلکہ مجھے یاد آیا کہ ایک روز ابا جی نے میری والدہ سے کہا کہ۔۔۔ نواب بیگم لاہور سے کچھ دور گلبرگ نام کی ایک رہائشی کالونی کا منصوبہ بن رہا ہے اور اس کے ایک ڈائریکٹر نے پیشکش کی ہے کہ وہاں ایک شاہراہ کے کنارے پندرہ کنال کے پلاٹ الاٹ کیے جا رہے ہیں اور کل قیمت بیس ہزار سے بھی کم ہے تو چوہدری صاحب اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کو ایک پلاٹ الاٹ کردوں شرط صرف یہ ہے کہ آپ دو برس کے اندر اندر اس پر گھر تعمیر کر لیں۔ میری والدہ نے پوچھا کہ یہ جگہ کہاں ہے تو ابا جی نے کہا کہ لاہور کے پار کوئی علاقہ ہے تو والدہ نے انہیں خوب جلی کٹی سنائیں اور وہ اکثر انہیں سناتی ہی رہتی تھیں کہ ہم تو چیمبر لین روڈ چھوڑ کر اس ویرانے میں آن بسے ہیں اور اب یہاں سے نہر کے پار لے جانا چاہتے ہو۔۔۔ اس سے بہتر نہیں کہ اپنے گاؤں لوٹ چلیں۔۔۔ جب ہم نے گلبرگ میں بالآخر گھر بنایا تو والدہ صاحبہ اکثر تذکرہ کرتی تھیں کہ میں نے تمہارے ابا جی کی بات نہ مانی ورنہ آج گلبرگ کے مین بلیووارڈ پر ہماری کوٹھی ہوتی۔

قدیم لاہور کی سب سے ہنگامہ خیز یاد اُن دنوں کی ہے جب فارسٹر کے ناول پر مبنی فلم "بھوانی جنکشن" کی شوٹنگ اس کے گلی کوچوں میں ہوتی اور میں اس کا تفصیلی تذکرہ اپنے ناول "راکھ" میں کر چکا ہوں۔۔۔ جب ایوا گارڈنر مال روڈ کے فٹ پاتھ پر چہل قدمی کیا کرتی تھی اور اس کے بدن کی خوشبو لاہور کی ہواؤں میں دھو میں مچاتی تھی اور سٹیورٹ گرینجر ہماری گلیوں میں گھوما کرتا تھا اور وہاں لکشمی مینشن میں سعادت حسن منٹو تو تھے ہی، میرے بچپن کے "دوست"۔۔۔ جن کے ہاتھ میری اولین کوٹھا عشق کی محبوبہ کا میرے نام جو خط تھا آ گیا تھا اور انہوں نے مجھے انصاری ہوٹل میں ایک پیسٹری کھلا کر مجھے "بلیک میل" کرنے کی کوشش کی تھی۔

میں سارک ادیبوں کی دلی میں منعقد ہونے والی کانفرنس میں شرکت کر رہا تھا جب انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں میری ملاقات پران نِول سے ہو گئی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ یہاں ایک لاہوری کلب ہے جس میں صرف

لاہوری باہے شرکت کر سکتے ہیں، بدقسمتی سے میں اس کلب کے اجلاس میں شریک نہ ہو سکا کہ مجھے اگلے روز لاہور واپس آنا تھا۔ پران نِول نے قدیم لاہور پر ایک کتاب بھی تحریر کی اور اب اپنے بیٹے کو بھی ساتھ لا کر نسبت روڈ پر گھومتے ہیں کہ بیٹا یہ ہے ہمارا شہر۔۔ بے شمار لوگوں نے لاہور کی توصیف میں بہت کچھ لکھا، اے حمید۔۔ سراج نظامی، یونس ادیب، شورش کاشمیری اور ان دنوں مجید شیخ۔۔ یہاں تک کہ ”پیراڈائز لاسٹ“ میں بھی آگرہ کے علاوہ لاہور کے تذکرے ہیں۔
لاہور کا بیان ممکن ہی نہیں۔۔ ڈکنز کا لنڈن۔۔ ذولا اور ہیوگو کا پیرس، جیمز جوائس کا ڈبلن، البرتو موراویا کا روم اور دوستو سکی کا سینٹ پیٹرز اپنی جگہ لیکن یقین جانیے کہ یہ صرف لاہور ہے، جو لاہور ہے

30/5/13

مستنصر حسین تارڑ
آتش پرستی میں مسلمان حاجی
Thu May 30, 1:03 pm
یہی کوئی دوچارہفتے پیشتر میں نے لاہور کی پارسی ناول نگار بیسپی سدھوا کے اعزازمیں منعقد کی جانے والی ایک تقریب کاتذکرہ کیاتھا جہاں انتظار حسین، بانو قدسیہ اورجسٹس جاوید اقبال کے علاہ مجھے بھی بیسپی کی ناول نگاری کے بارے میں اظہارکاموقع ملا بیسپی کو میں ان زمانوں سے جانتا ہوں جب وہ کشور ناہید کی محفلوں میں شریک ہوا کرتی تھی، ایک شرمیلی سی لجائی ہوئی نازک سی خاتون تھی، بچپن میں پولیو کاشکار ہو کراس کے اثرات سے نبردآزما ہورہی تھی اور ایک کونے میں بیٹھی ان زمانوں کے نامور ادیبوں کو حسرت سے دیکھا کرتی تھی، پھر اس نے چپکے سے ایک ناول” کروایٹرز“ نام کالکھا جو پاکستان کے بعد امریکہ میں شائع ہوا تو اس لاہورن کڑی کی دھومیں مچ گئیں اورآج وہ نامور ادیب بیسپی کو حسرت سے دیکھتے ہیں، اس محفل میں بیسپی نے اپنی نئی کہانیوں کا مجموعہ دستخط کرکے عنایت کیا....
یہ کالم بیسپی کے اس مجموعے کے کمال تحریر کے بارے میں ہرگز نہیں ہے... بلکہ اسکی ایک کہانی جس کا اردو میں عنوان” مشکل کشا“ مناسب ٹھہرتا ہے اسکی اختتامی سطروں کے حوالے سے ہے کہ انہوں نے مجھے سوچ کی ایک نئی راہ پر بھٹکنے کیلئے مجبور کر دیا، کہانی کچھ یوں ہے کہ ایک پارسی گھرانے میں جمعہ کے روزفرش پردری بچھا کر آگ روشن کی جاتی ہے، پیغمبرزرتشت کی تصویر آویزاں کی جاتی ہے اور رحمت کے فرشتوں بہرام یزد اور مشکل آسان کی خوشنودی کیلئے، اگر بتیاں جلا کر، آگ میں لوبان اورصندل جلا کر گھر کی بڑی اماں بچوں کو ایک کہانی سناتی ہیں... اس کہانی کے دوران وہ بار بار آگ میں صندل ڈال کر ان دو مہربان فرشتوں کی مدد چاہتی ہیں...مختصراً کہانی کچھ یوں ہے کہ ایک زمانے میں پیرخورکن ایک لکڑہارا ہوا کرتاتھا...بہت بے یارومددگار اوربھوکا لکڑہارا جس کی مدد کو یہ دونوں رحمت کے فرشتے مشکل آسان وغیرہ آتے ہیں اور وہ دنوں میں مالا مال ہوجاتا ہے...صرف یہ کہ وہ ان فرشتوں کی خواہش کے مطابق ہر جمعہ کے روز لوگوں میں شکر اور چنے کے دانے تقسیم کرتا ہے...پھر پیر خورکن مکہ حج کرنے کیلئے چلا جاتا ہے اور بالآخر ان فرشتوں کے کرم سے وہ بادشاہ بن جاتا ہے...
کہانی سننے والے بچوں کو پہلی بار احساس ہوتا ہے کہ پیر خورکن اگر حج پر جاتا ہے تو وہ مسلمان ہے...تو ایک مسلمان ایک پارسی مذہبی کہانی کا حصہ کیسے بن سکتا ہے، قابل فہم طورپر سینکڑوں برس بیت جانے کے باوجود انکی آبائی یادداشت میں عربوں کا ایران پر حملہ محفوظ ہے جسکے نتیجے میں انہیں اپناآبائی وطن چھوڑنا پڑا اور انہوں نے ہندوستان کے صوبے گجرات میں پناہ لی...چنانچہ بچے اپنی بڑی اماں سے پوچھتے ہیں کہ آخر ہماری مذہبی رسوم میں یہ مسلمان حاجی لکڑ ہارا کہاں سے آگیا تو وہ کہتی ہیں، یہ کہانی ہماری دادی اماں اور نانی اماں سناتی چلی آئی ہیں اور یہی سچ ہے...میں پیرخورکن پر بے شک وہ ایک مسلمان تھا مکمل ایمان رکھتی ہوں، اسی کہانی کی وجہ سے رحمت کے دونوں فرشتے ہم پر عنایت کرتے رہے ہیں اور پھر بڑی اماں کے رخسار دمکنے لگتے ہیں اس کے مرجھائے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر جاتی ہے اور وہ کہتی ہیں کہ بچو...دیکھو جب آپ دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ برابری کی سطح پر پہلو بہ پہلو زندگی گزارتے ہیں تو یہی کچھ ہوتا ہے...ایک مذہب کے بزرگ سرحد پار کرکے دوسرے مذہب میں داخل ہوجاتے ہیں اور دوسرے مذہب کے صوفی عقیدے کو پھلانگ کر تمہاری جانب آنکلتے ہیں۔

بیسپی کی" مشکل کشا" کہانی نے مجھے سوچ کی ایک نئی راہ پر بھٹکنے کیلئے مجبور کردیا...اگر آپ کے آس پاس صرف آپکے عقیدے سے وابستہ لوگ رہتے ہیں تو کیا آپ تنگ نظری کا شکار نہیں ہو جاتے کہ آپکو کچھ تجربہ نہیں کہ دوسرے عقیدے کے لوگ بھی پارسا اور نیک ہو سکتے ہیں، اچھے انسان ہو سکتے ہیں اور پھریہ تنگ نظری اتنی مہلک ہو جاتی ہے کہ اپنے ہم عقیدہ لوگوں کے گلوں میں پھندے کس دیتی ہے، بنیادی طورپر آپ ایک عظیم جہالت کا شکار ہو جاتے ہیں، کیا واقعی اگر آپ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے پہلو بہ پہلو زندگی بسرکرتے ہیں تو یہ بزرگ حضرات بے دریغ سرحدیں پھلانگ کر ادھر ادھر مذہب سے لاپرواہ مٹر گشت کرتے رہتے ہیں۔ویسے اس معاملے میں میری معلومات بہت ناقص اور مختصر ہیں لیکن تاریخی طورپر مجھے تو یوں لگتا ہے کہ بیشتربزرگ اور صوفی حضرات جو سرحدیں پار کرتے ہیں، مسلمان تھے...تقسیم سے پیشتر داتا صاحب کے مزار پر حاضری دینے والوں میں ہندوؤں اور سکھوں کی بہتات تھی، ان دنوں بھی جب ہندو یاتری اور سکھ زائرین پاکستان آتے ہیں تو داتا دربار میں حاضر ہو کر متھا ٹیکتے ہیں۔

مجھے یاد ہے میرے ابا جی پنجاب حکومت سے وابستہ ایک سکھ بیورو کریٹ کا قصہ سنایا کرتے تھے کہ وہ اولاد سے محروم تھا... اپنے مذہب کے سب پیروں فقیروں کے پاؤں پڑا اور پھر بھی محروم رہا تو اسکے ایک سکھ ماتحت نے کہا" سردار جی...کچھ حرج نہیں اگر آپ داتا صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی درخواست پیش کریں، کیا پتہ وہاں قبول ہو جائے تو سکھ بیورو کریٹ داتا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا پگڑی اتار کر ان کے مزار کی پائنتی میں ڈال دی اور التجا کی کہ اے داتا میری جھولی بھر دے...اگرتو مجھ پر اولاد کا کرم کر دے گاتو میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک زندگی رہی میں روزانہ ننگے پاؤں لاہور کے لوگوں کو ٹھنڈا پانی پلایا کروں گا... رب نے اس پر کرم کیا اولاد عطا کردی...ابا جی بتایا کرتے تھے کہ وہ سکھ پنجاب سیکرٹریٹ سے باہر نکلتا...سوٹ بوٹ میں ملبوس...پورے چار بجے....وہاں اس کا ذاتی ملازم ایک ریڑھی پر برف سے ٹھنڈے کئے گئے پانی کے مٹکے رکھے منتظر ہوتا... سردار صاحب جوتے اتار کر ملازم کے حوالے کرتے اور اس ریڑھی کو دھکیلتے ہوئے وہاں سے لاہور سٹیشن تک جاتے۔

راستے میں عاجزی سے ہر راہ گیر کو ٹھنڈا پانی پلاتے...ان کے ننگے پاؤں میں چھالے پڑ جاتے....سٹیشن پر ان کا ذاتی ڈرائیور کارکے ساتھ موجود ہوتا اور وہ سوٹ پہن کر اس میں سوار ہو کر گھر چلے جاتے، یہ سلسلہ تقسیم تک جاری رہا...گویا علی ہجویری بھی ایک ایسے ہی بزرگ تھے جو سرحدیں پھلانگ جایا کرتے تھے، بابا فرید شکر گنج کے بیشتر عقیدت مند ہندو تھے اور شاہ حسین نے تو ایک ہندو لڑکے مادھو کے عشق میں اپنے آ پکو مادھو لال حسین قرار دیا...بابا فرید کا کل کلام" گرنتھ صاحب" میں محفوظ ہے اور ایک آسمانی صحیفے کے طورپر تلاوت کیا جاتا ہے...یہاں تک کہ سکھوں کے سب سے مقدس مقام دربار صاحب امرتسر کی بنیاد حضرت میاں میر نے رکھی۔ہم جب نظام الدین اولیا کے مزار میں داخل ہوئے تو یہ میں نہ تھا بلکہ میرا ہندو دوست ونود دعا تھا جو سرپررومال باندھے دھڑام سے سجدہ ریز ہوگیا، یہ کیسے بزرگ تھے جو مذہب کی تفریق پر یقین نہ رکھتے تھے صرف انسانیت پر ایمان کھتے تھے۔

یہاں سے" سائیں بابا... کا قصہ شروع ہوتا ہے...ایک متشرع مسلمان بزرگ جنہیں ہندو اپنے رام سے بڑھ کر پوجتے ہیں

3/6/13

مستنصر حسین تارڑ

سائیں بابا مندر اور بسم اللہ خان

Wed Jun 05, 1:15 pm

میں تذکرہ کر رہا تھا ان بزرگوں کا جو مذہب کی سرحدیں پھلانگ کر کسی اور مذہب کے پیروکاروں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہوتا ہے جب ایک ہی معاشرے میں مختلف مذاہب کو ماننے والے ایک دوسرے کی قربت میں زندگی بسر کرتے ہوں ، تو یہاں سے " سائیں بابا" کا قصہ شروع ہوتا ہے، جب سارک ادیبوں کی کانفرنس کے سلسلے میں مجھے دلی جانا ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بہت سے رکشاؤں اور ٹیکسیوں میں کئی دکانوں میں ایک سفید ریش بابا جی کی تصویر آویزاں ہے جو اپنے آپ کو ایک چادر سے ڈھانپے ہوئے ہیں، میں جب استفسار کرتا کہ حضور یہ صاحب کون ہیں تو ادھر سے جواب آتا۔

سائیں بابا.. میں پوچھتا کہ سائیں بابا کون ہیں تو لوگ میری جہالت پر مسکرا دیتے .. تب میں نے ونود دعا سے رجوع کیا کہ وہ نہ صرف نظام الدین اولیاء کامرید تھا بلکہ ہر سال فتح پور سیکری میں حضرت سلیم چشتی کے مزار پر..جہاں اکبر اعظم اولاد کی تمنا میں ننگے پاؤں حاضری دیا کرتا تھا..ونود دعا انکے مزار پر خصوصی قوالی کا بندوبست کرتا تھا تو اس نے میرے سوال کے جواب میں کہا..سائیں بابا ایک متشرع مسلمان تھے...انگریز فوج میں سپاہی تھے یا باورچی...اور ان میں کچھ ایسا وصف تھا کہ لوگ انکی جانب کھینچے چلے آتے..فوج سے فارغ ہوئے تو مریدین نے پیچھا کیا..آواز سریلی تھی اور گاتے بہت اچھا تھے، پکاتے بھی بہت اچھا تھے، اپنے ہاتھوں سے پلاؤ تیار کرکے لوگوں کو پیش کرتے۔
صرف ایک کھدر کی چادر میں بدن ڈھانپتے جسے وہ " کفنی" کہتے تھے یعنی کفن پوش تھے..ننگے پاؤں رہتے تھے اورباقاعدگی سے نماز ادا کرتے روزے رکھتے لیکن اپنے پاس آنے والے لوگوں کی بلاتخصیص مذہب خدمت کرتے اور محبت سے پیش آتے، اونچ نیچ کے قائل نہ تھے چنانچہ انکے ماننے والوں میں برہمن بھی تھے اور شودر بھی...پھر سائیں بابا ہجوم سے دور ہونے کی خاطر اپنے آبائی وطن مہاراشٹر میں لوٹ گئے..تنہائی انہیں وہاں بھی نصیب نہ ہوئی کہ انکے چاہنے والوں کی تعداد لاکھوں میں تھی اور اکثریت ہندوؤں کی تھی، انکی موت کے بعد انکی قبر پر ایک نہایت عالی شان مندر تعمیر کیاگیا جہاں انکا مجسمہ بھی نصب ہے اور ہر برس انکے عرس کے موقع پر لاکھوں لوگ پورے ہندوستان سے وہاں جمع ہوتے ہیں اور ان کی پرستش کرتے ہیںونود دعا نے کہا کہ میری بیگم جو مدراس کی ہیں وہ بھی ان کی پیروکار ہیں تو میں نے بیگم ونود سے پوچھا" بھابھی..آپ کیلئے یہ سائیں بابا کیا ہیں!" تو وہ نہایت عقیدت سے کہنے لگیں۔
وہ میرا سب کچھ ہیں..مجھے زندگی میں جو کچھ ملا وہ سائیں بابا کی کرامت سے ملا..تارڑ بھائی مہاراشٹر میں اکثر رہائش گاہوں کے ماتھے پر لکھا ہوتا ہے" سائیں بابا کی دین" میں نے اس مسلمان بزرگ کی کرامات سے تنگ آکر ونود سے کہا" ونود...مجھے ہندوؤں کی سمجھ نہیں آتی، ہر کسی کو پوجنے لگتے ہیں...اب یہ بابا جی مسلمان تھے تو پورے ملک میں ان کے مندر تعمیر کرواتے پھرتے ہو، تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ ونود، جو کہ ہندوستان بھر میں اپنے پروڈکشن ہاؤس میں تیار کردہ سیاسی شوز کے میزبان کے طورپر جانا جاتا ہے..بلکہ قطب مینار کے سائے میں جب میری جانب چند کالی کلوٹی راجھستانی کنیائیں چیخیں مارتی چلی آئیں اور میں فخر سے پھولا بھی اور سمایا بھی کہ واہ تارڑ صاحب آپ کی شہرت تو چاردانگ عالم میں ہے اور تب وہ کالیاں اور کلوٹیاں لڑکیاں مجھے نظر انداز کرکے ونود دعاکے گرد ہوگئیں کہ وہ اس کی گرویدہ تھیں اور میں نے اس ہندو بچے کو وقتی طورپر سخت ناپسند کیا...تو ونود دعا نے کہا" تارڑ جی...ہمیں اس سے غرض نہیں کہ سائیں بابا مسلمان تھے...وہ ایک بڑے پہنچے ہوئے بھگوان کے نزدیک ایک اور بھگوان ...تھے
اگر کوئی انسان اچھا ہے تو ہم اسے دیوتامان لیتے ہیں، کیا آپ کو معلوم ہے کہ اسی دلی میں سائیں بابا مندر اور رام مندر قریب قریب ہیں اور سائیں بابا مندر میں ہجوم رام مندر کی نسبت زیادہ ہوتا ہے"میں اشفاق حسین کے ہمراہ اسکی رہائش گاہ سے ٹورنٹو شہر کی جانب جا رہا تھا جب میں نے دائیں جانب ایک عظیم الشان مشرقی خدوخال کی دیدہ زیب عمارت دیکھی...بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سائیں بابا مندر ہے جسکی تعمیر میں صرف گھڑے ہوئے پتھر استعمال ہوئے ہیں، انہیں کسی سیمنٹ یا لوہے سے جوڑا نہیں گیا بلکہ اس طورپر تراشا گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے میں نصب ہوتے چلے جاتے ہیں...سائیں بابا کے مندر تعمیر کرنے والے ان کے پیروکاروں کی سینکڑوں افراد پر مشتمل ایک ٹیم ہے جس میں ماہر تعمیرات، انجینئر اور ڈیزائنروغیرہ شامل ہیں اور صرف وہی دنیا بھرمیں سائیں بابا کے معبد تعمیر کرتے ہیں...بلکہ جب کینیڈا کی حکومت کی جانب سے اعتراض اٹھایا گیا کہ سیمنٹ اورلوہے کے بغیر صرف پتھر جوڑ کر اٹھائی گئی یہ عمارت مسمار ہو سکتی ہے تو ان ماہرین نے ایک تحقیقی کمیٹی کے سامنے تکنیکی جواز سے ثابت کیا کہ یہ عام عمارتوں سے کہیں بڑھ کر مستحکم ہے۔
یعنی ان سائیں بابا نے تمام مذاہب کی سرحدیں پار کرکے ثابت کیا کہ انسانیت کی کوئی سرحد نہیں... انڈونیشیا کے ایک جزیرے میں جب ایک ہلاکت خیز آتش فشاں پھٹنے کا خطرہ لاحق ہوا تو مقامی آبادی جو کہ ہندو تھی انہوں نے ایک جلوس کی صورت، آتش فشاں کو خوش کرنیکی خاطر اس سے رحم کی درخواست کرنے کیلئے اور انہوں نے اپنے دیوتاؤں کے بت کاندھے پر اٹھا رکھے تھے..آتش فشاں کے دامن کارخ کیا تو انکے ہمراہ مسلمان بھی تھے جنکی قیادت ایک مقامی مولانا کر رہے تھے اور وہ بھی آتش فشانکے چرنوں میں بھینٹ کرنے کیلئے کچھ چڑھاوے لے جا رہے تھے قرآن پاک کی تلاوت کر رہے تھے، جب ان سے دریافت کیا گیا کہ حضرت آپ اس ملحدانہ رسم میں کیوں ملوث ہیں تو انہوں نے کہا کہ یہ اس جزیرے کی قدیم روایت ہے ہم آتش فشاں کو خدا تو نہیں مان رہے۔
صرف درخواست کرنے جا رہے ہیں کہ اللہ کے واسطے ہماری بستیوں کو ویران نہ کرنا..اس میں کچھ حرج

نہیں۔ خواجہ فرید کی خدمت میں انکا ایک مرید، ایک ہندوکمہار حاضر ہوا اور اسکے ہمراہ اس کی نوخیز قیامت آثار کمہارن بیٹی بھی تھی..خواجہ صاحب تو اسے بس ٹک دیکھا گیا..کچھ نہ بولے..انکی رخصتی کے بعد کسی مرید نے بصد ادب پوچھا کہ یا حضرت آپکی خاموشی کا سبب کیا تھا تو خواجہ کہنے لگے" میرے سامنے رب کا روپ تھا، میں اسے دیکھتا رہا..گنگ ہو گیا.." شہنائی کے دیوتا استاد بسم اللہ خان، شدید مذہبی انسان، فجر کی نماز پڑھنے کے بعد بنارس کے دیوی سرسوتی کے مندر میں حاضر ہو کر شہنائی بجاتے تاکہ اسکی خوشنودی حاصل ہو سکے، ہم لوگ جو ایک مذہبی معاشرے میں زندگی کرتے ہیں ہمارے لئے تو شاید یہ شرک ہو، کفر کا ارتکاب ہو لیکن اس مذہبی یگانگت اور ہم رنگی پر ہمارا کچھ اختیار نہیں کہ دنیا صرف ہماری خواہش کے تابع نہیں ہو سکتی۔ہم ان بزرگوں اور صوفیوں کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتے جو مذہب کی سرحدوں کے آرپار جاتے ہیں

سردار سمیع، ایک مہا آتما

مستنصر حسین تارڑ

12-06-2013

میں تقریباً بیس روز کے بعد چین کے صوبے سنکیانگ سے لوٹا تو لاہور کی گرمی نے وہ روپ دکھلایا کہ مجھے گمان ہوا کہ میں دنیا کے دوسرے بڑے صحرا تکلامکان میں پھر سے داخل ہو گیا ہوں۔ ڈائننگ ٹیبل پر ہندوستانی مٹھائی کے دو تین ڈبے پڑے تھے تو میں نے سمیر سے پوچھا، بیٹا یہ کس کے لئے ہیں تو وہ کہنے لگا "ابو ایک دو دوستوں نے فرمائش کی تھی ان کے لئے منگوائے ہیں"۔ اس پر میں نے کہا کہ مجھے ان میں سے ایک ڈبہ درکار ہے۔۔۔ کس کے لئے؟ اس نے پوچھا۔۔۔ تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا "سردار سمیع کے لئے۔۔۔ انہیں بھی یہ مٹھائی بے حد مرغوب ہے" مجھے یونہی واہمہ سا ہوا کہ شاید سمیر نے کچھ عجیب سا تاثر دیا ہے، جانے کیوں۔۔۔ بہرطور میں ان سردار سمیع کا تعارف کروائے دیتا ہوں۔۔۔ وہ پچھلے بارہ پندرہ برس سے ماڈل ٹاؤن پارک میں میری صبح کی سیر کے نہایت باقاعدہ ساتھی ہیں۔۔۔ اکثر وہ پارکنگ لاٹ میں میری آمد کے منتظر رہتے۔۔۔ انہیں دیر ہو جاتی تو میں انتظار کر لیتا اور پھر ہم اکٹھے سیر کرتے۔۔۔ وہ اتنے دھیمے مزاج کے، صلح کن اور مسلسل مسکرانے والے شخص ہیں کہ اکثر مجھے اُلجھن ہونے لگتی کہ آخر اس بندے کو کسی بھی بات پر غصہ کیوں نہیں آتا۔۔۔ یہ نہ حالات کی شکایت کرتا ہے اور نہ ہی سیاسی مسائل سے سروکار رکھتا ہے۔۔۔ اگر بات نہ کرو تو چار پانچ کلومیٹر خاموشی سے ساتھ ساتھ چلتا جاتا ہے اگرچہ مسکراتا جاتا ہے۔ سردار صاحب موٹے یا بدوضع نہیں البتہ تن و توش تندرست رکھتے ہیں تو میں انہیں کبھی کبھی "چھوٹا لارڈ بُدھ" یا "مہاتما جی" کے نام سے پکارتا ہوں اور وہ ایک مسکراتے ہوئے مہاتما بُدھ ہو جاتے ہیں۔۔۔ البتہ مسکراہٹ تب قدرے سمٹتی ہے جب کوئی اور دوست کوئی ایسا لطیفہ سناتا ہے جس میں کسی حد تک کوئی غیراخلاقی اشارہ ہوتا ہے۔ لیکن نہ تو وہ سرزنش کرتے ہیں اور نہ ہی کسی ناگواری کا اظہار۔۔۔ مسکراہٹ بے شک سمٹی ہوئی برقرار رہتی ہے وہ اللہ کے فضل سے بے حد متمول ہیں۔ سرحد کے قریب کئی مربع زمین کے مالک ہیں جو ان کے امریکہ پلٹ بیٹے سنبھالتے ہیں۔۔۔ وسیع کاروبار ہے اور ان کے ساتھی کاروباری ان کی ایمانداری کو قسم کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔۔۔ ندیم شیخ کا کہنا ہے کہ جب شہر بھر کے پٹرول ڈیلر سپلائی میں خلل آ جانے کی وجہ سے روزانہ لاکھوں روپے بنا رہے ہوتے ہیں، سردار صاحب کے پٹرول پمپ پر وہی نارمل قیمت کا بورڈ آویزاں ہوتا ہے۔۔۔ اس لئے کچھ لوگ انہیں بیوقوف سمجھتے ہیں۔۔۔ اگر کسی روز وہ مصروفیت کی وجہ سے پارک میں نہیں آتے تو میں ادھورا سا محسوس کرتا ہوں اور ان کا فون آ جاتا ہے کہ تارڑ صاحب۔۔۔ امریکہ سے بیٹی آ گئی تھی تو میں حاضر نہ ہو سکا۔
ہر برس وہ پارک کے دوستوں کے لئے اپنی زمین کے رقبے پر ایک پُرتکلف دعوت کا اہتمام کرتے ہیں اور وہاں یار لوگ اپنے درجنوں یار لوگوں کو بھی بلا لیتے ہیں اور سردار صاحب ایک مسکراتے ہوئے بُدھ کی مانند شانت رہتے ہر مہمان کے آگے بچھے جاتے ہیں۔ ان کی اہلیہ کے پاس حلیم تیار کرنے کا کوئی ایسا خاندانی نسخہ ہے کہ وہ حلیم کھانے سے انسان نہ صرف ذائقے سے آسودہ ہوتا ہے بلکہ حلیم الطبع بھی ہو جاتا

ہے۔۔ اور جب کبھی ان کے ہاں یہ پکوان تیار ہو گا تو ہمیشہ ایک چھوٹی سی دیگ میرے ہاں بھی بھجوا دی جائے گی۔ ان کی جانب سے اس نوعیت کی عنایات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔۔ کبھی موسمی سبزیوں کے انبارآ رہے ہیں اور کبھی تازہ دودھ سے لبریز برتن۔۔ انہیں علم تھا کہ میں گریپ فروٹ یا چکوترے کے جوس کا شیدائی تھا چنانچہ موسم سرما وارد ہوتا ہے تو ان کی جانب سے چکوترے وارد ہونے لگتے ہیں۔۔ چین روانگی سے پیشتر انہوں نے میرے پسندیدہ ستّو اور دیسی شکر کا تحفہ حسب سابق بھجوایا تو میں نے احتجاج کیا کہ سردار صاحب میں تو چین جا رہا ہوں تو کہنے لگے ”میری خواہش تھی کہ آپ اس طویل سفر پر جانے سے پہلے اپنے پسندیدہ ستّو، شکر کے شربت کے ساتھ پی کر جائیں اور یارقند جا کر مجھے یاد کریں۔۔ انہی دنوں میں نے نوٹ کیا کہ ان کی گردن پر کچھ ابھار سے ہیں جیسے گلٹیاں ہوتی ہیں۔ میں نے تشویش کا اظہار کیا تو کہنے لگے ”ان کی کچھ تکلیف تو ہے نہیں۔۔ ٹھیک ہو جائیں گی۔۔ جب بیٹوں نے اصرار کیا تو انہوں نے چیک اپ کروا لیا۔۔ کسی ایسے کینسر کی تشخیص ہوئی جو قابل علاج تھا۔۔ اپنی بیماری کے بارے میں بتاتے ہوئے ان کی چہرے پر وہی الوہی مسکراہٹ تھی لیکن میرا دل بیٹھ گیا۔ علاج شروع ہو گیا اور وہ حیرت انگیز طو رپر رو بہ صحت ہونے لگے۔۔ پارک میں آنے لگے۔۔ سیر کرنے لگے۔ ”ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ صرف دو آخری کیموتھراپی کے ٹیکے لگیں گے اور پھر میں پہلے کی مانند اچھا بھلا ہو جاؤں گا۔۔ تارڑ صاحب فکر نہ کریں۔۔“

اور سچی بات ہے میں بالکل بے فکر ہو کر چین چلا گیا۔ واپس ہوا اور جب میں نے سردار صاحب کے لئے ہندوستانی مٹھائی کے ایک ڈبے کی فرمائش کی تو سمیر کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور پھر کچھ دیر بعد کہنے لگا ”ابو۔۔ پچھلے ہفتے سردار صاحب۔۔“

اس شب نیند میں بھی میری آنکھیں بھیگتی رہیں اور میرا تکیہ گیلا ہوتا رہا۔

پارک کے کچھ ساتھیوں سمیت جب میں ان کے بیٹوں سے تعزیت کرنے گیا تو تینوں میں سے ایک بیٹے نے کہا ”ان کی سانسیں اکھڑتی تھیں۔بہت دنوں سے انہوں نے کچھ کھایا نہ تھا۔۔ میری والدہ نے حلیم تیار کی تو وہ انہوں نے شوق سے نگلی اور کہنے لگے ۔۔ دیکھو یہ حلیم تم نے تارڑ صاحب کے ہاں ضرور بھجوانی ہے۔۔ تو انکل یہ قرض ہے، ابو نے کہا تھا تو حلیم آپ کے ہاں انشاء اللہ ان کی خواہش کے مطابق پہنچ جائے گی“۔

مجھے یہاں نورجہاں کا ایک پرانا گانا یاد آتا چلا جاتا ہے۔۔ ’آندھیاں غم کی یوں چلیں، باغ اجڑ کر رہ گیا۔۔“

سردار سمیع کے جانے سے میرے لئے تو ماڈل ٹاؤن پارک کا باغ اجڑ کر رہ گیا ہے۔

پارک میں خزاں رسیدہ پتے سمیٹنے والے ایک مزدور پیشہ شخص نے کہا ”سردار صاحب ایسا شخص کیسے مر سکتا ہے“۔

جیسے بہادر شاہ ظفر کا دل اُس اجڑے دیار میں نہیں لگتا تھا۔۔ ایسے اب میرا دل بھی اُس اجڑے ہوئے پارک میں نہیں لگتا۔

ڈاکٹر انیس احمد نے سردار سمیع کی یاد میں جب یہ نظم لکھی تو گویا میرے جذبات کی بھی ترجمانی کر دی۔

شرافتوں کا دیوتا“۔”
خبر تھی آج یہ کہیں
محبتوں کا وہ امیں
نقیبِ صلح و آشتی
جو بانٹتا تھا روشنی
وہ نرم گو، وہ نیک خو
شرافتوں کا دیوتا
جانے کیوں وہ روٹھ کر
آج صبح چلا گیا

۔۔۔مگر نہیں ابھی نہیں
وہ کہیں گیا نہیں
یہ برگ و گل یہ رنگ بو
یہ بہار ہے جو چار سو
سبھی میں جی رہا ہے وہ
گواہی دے رہے ہیں سب
کہ وہ بھی ہے یہیں کہیں
وہ تو اس زمین پر
تابہ خاکِ کاشغر اور تاشکر گاؤں
مستنصر حسین تارڑ
3-7-13

ہم اس شعلہ بار چٹانوں میں پوشیدہ چینی ترکستان کے سب سے قدیم۔۔۔ تقریباً چودہ سو برس سے آباد چین کے مکہ سے واپس اُرمچی آئے۔ گئی رات پہنچے تو ہمارے لباسوں میں اس غار کی مہک تھی جس کے اند رہمارے رسول اللہؐ کے چھ رفیق دفن تھے۔۔۔ ایک گڈریا چین کا پہلا مسلمان دفن تھا اور کی قبر کے برابر میں ایک پتھر تھا جس کی شکل ایک کتے سے مشابہ تھی۔ مجھے اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا تھا کہ کیا وہ واقعی اصحاب کہف کی غار ہے یا محض ایک روایت ہے جسے چین بھر کے مسلمان اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ اصحاب کہف کا قصہ مختلف شکلوں میں تمام آسمانی کتابوں میں آیا ہے۔ اس غار کے حوالے اُردن، شام یہاں تک کہ اطالیہ میں بھی ملتے ہیں۔ دراصل تاریخی اور جغرافیائی عوامل عقیدے کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔۔۔ کم از کم مجھے ٹویو گاؤں کی ایک چٹان میں جو غار ہے اُس میں کافی حد تک حقیقت کا پر تو نظر آتا ہے۔ ہم اُرمچی سے ساؤتھ چائنا ایئر لائن کی پرواز پر تابخاکِ کاشغر کی جانب اڑان کیے جاتے تھے اور ہمارے دل میں وہ چراغ روشن ہوتے تھے جو اس غار کے اندر جلتے تھے اور خواتین قرآن کی تلاوت میں مگن سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ ہم ایئر پورٹ سے باہر آئے تو اُرمچی کی نسبت کاشغر قدرے دیہاتی سا دکھائی دیا اور پھر وہ خاک بھی تھی جو اڑتی پھرتی تھی لیکن اس میں نیل کے ساحل کی کچھ نم آلود خوشبو نہ تھی کہ یہ محض شاعروں کے خواب ہوتے ہیں، ہم جیسوں کی نابینا خواہشیں ہوتی ہیں، حرم کی پاسبانی صرف جابر شہنشاہوں کا حق ہوتا ہے اگرچہ وہ اپنے آپ کو خادمین کہتے ہیں۔۔۔ چینی فوج کا ایک بے حد طویل کا نوائے نہایت خاموشی سے ہماری ویگن کے برابر میں سے گزرنے لگا۔ یہاں بھی موجودگی تھی۔ کسی زمانے کا "سنکیانگ کاشغر ہوٹل" ایک تاریخی حیثیت کا حامل جس کی عمارتوں کے گرد شاداب چمن اور پھلدار درخت سایہ دار ہوتے ہیں اور اُن میں پرندے چہکتے ہیں، وہاں حکومت چین کے اہلکاروں اور اعلیٰ افسران کے لیے ایک ایسا پر شکوہ اور شاہانہ جدید ہوٹل تعمیر کیا گیا ہے کہ جب میں اور میمونہ صدر دروازے سے اندر داخل ہوئے تو ہم گنگ رہ گئے۔ اس کا وسیع استقبالیہ ہال ایسا بادشاہی تھا جیسے ہم فرانس کے وارسیلز محلات میں داخل ہو گئے ہیں۔ بلند و بالا منقش سنہری چھتوں سے درجنوں بیش قیمت فانوس جگمگاتے تھے۔ سنگ مرمر کے فرش پر پارک پھیلتے تھے اور صدر دروازے سے استقبالیہ ڈیسک تک اتنا فاصلہ تھا کہ ہمارے سانس پھول گئے۔ ظاہر ہے ہمارے کمرے مخصوص کر دیے گئے تھے اور یہ کمرے بھی دنیا کی ہر آسائش سے آراستہ تھے۔۔۔ اور ان میں باہر اڑتی کاشغر کی خاک کا ایک ذرہ بھی داخل نہیں ہو سکتا تھا کہ ذرہ اپنی تاریخ اور قدیم ثقافت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ سرکار دربار سے پرے پرے رہتا ہے۔ ہمارے شاندار کمرے میں ہمارے لیے ایک قباحت تھی کہ غسل خانے کی دیوار شیشے کی تھی، اگرچہ ایک پردہ کھنچا ہوا تھا لیکن کم از کم اس عمر میں، میں اور میمونہ ایک دوسرے کو قدرتی لباس میں اشنان کرتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ میں نے کمرے کی کھڑکی دھکیل کر وا کی تو سامنے جدید کاشغر کی عالی شان عمارتیں۔ گھنی ٹریفک اور روشنیاں تھیں اور پس منظر میں خشک پہاڑ تھے۔ پرانے کاشغر کا ایک قبرستان اور

اس کے برابر میں ایک قدیم محلہ نظر آ رہا تھا۔ ایک مکان کا صحن انگوروں کی بیلوں سے آراستہ تھا اور اس کی چھت پر ایک شخص کبوتروں کو دانہ ڈال رہا تھا۔ نیم پختہ مگر خوش نظر مکان کے صحن میں تین موٹے موٹے بچے کُود رہے تھے۔ چین میں کبھی بھی یک مشت تین بچے دکھائی نہیں دیتے۔ سرکاری طور پر ”ایک بچہ“ پالیسی ہے جس کی انجانے میں خلاف ورزی ہو جائے تو والدین کو جرمانے کے علاوہ سزا بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن چین کے کل رقبے کے تقریباً اٹھارہ فیصد اس مسلمان خطے میں ہر مومن کھلے عام بے دریغ اپنی من مرضی سے بچے پیدا کرتا ہے اور سرکارمعترض نہیں ہوتی بلکہ ہان چینی لوگ دبے لفظوں میں احتجاج کرتے ہیں کہ آخر ہم نے کیا قصور کیا ہے کہ دوسرا بچہ نمودار ہو جائے تو ہم سزا وار اور یہ جو ایغور، کرغیز ، تاجک ہوئی وغیرہ ہیں یہ اپنے سکوٹروں پر تین تین کم از کم بچے لادے پھرتے ہیں تو ان کا چالان تک نہیں ہوتا۔ میمونہ کا نکتہ نظر بالکل جدا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ چینی ایک بچہ پیدا کر کے اس کی بہترین نشو و نما کرتے ہیں۔ اس کو اعلیٰ تعلیم دلا کر سائنس دان یا انجینئر بناتے ہیں جب کہ ایغور مسلمان ان چینیوں کے لیے مزدور اور کلرک پیدا کر رہے ہیں اس لیے چینی حکومت معترض نہیں ہوتی کہ انہیں مزدور درکار ہیں۔ کاشغر ایک شب کاپڑاؤ تھا۔ اگلی صبح ہم پاکستان کے درۂ خنجراب کی جانب سفر کرتے تھے۔ میں نے سن رکھا تھا کہ جو لوگ گلگت سے خنجراب آتے ہیں، چین میں داخل ہوتے ہیں تو پہلی شب تاشکر گاؤں میں بسر کر کے اگلی سویر کاشغر کے لیے کوچ کر جاتے ہیں۔ کاشغر سے نکل کر ہم بہت دیر تک اس نخلستان کی ہر یاول میں سفر کرتے رہے اور پھر سرخ چٹانوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا اور ہم بلند ہونے لگے۔ افق پر برفوں کی سفیدی رونما ہوتی گئی۔ ہماری نئی پراڈو جھیل قراقل کے کناروں پر رک گئی۔ میں باہر آیا۔ صرف ایک نصف بازو کی ٹی شرٹ میں۔۔۔ اور باہر کوہ پامیر کے سلسلہ کوہ کی برفوں میں سے جنم لیتی برفیلی ہوائیں میری منتظر تھیں۔ جھیل قراقل کے نیلے پانیوں پر برفوں سے ڈھکی مسٹاگ چوٹی کے سفید عکس نقش تھے۔ یاد رہے کہ یہ وہی چوٹی ہے جو کے ٹو کے بیس کیمپ کی جانب سفر کرتے آج سے بیس برس پیشتر مجھے نظر آئی تھی۔ یعنی اس برف پوش بزرگ پہاڑ کے دوسری جانب میرا پاکستان تھا۔ سردی میرے رگ و پے کو منجمد کرتی چلی گئی اور میں بری طرح ٹھٹھرنے لگا۔ کاشغر سے تقریباً چھ گھنٹے کی مسافت کی بدن توڑ تھکن کے بعد ہم بالآخر تاشکر گاؤں کے کوہستانی قصبے میں داخل ہوئے۔۔۔ اور حسب معمول کچھ سرکاری اہلکار ہمارے منتظر تھے جن میں ایک خوش شباہت نوجوان الہام نام کا تھا اور میں نہیں جانتا کہ وہ ہم دونوں کی آمد سے کیوں اتنا پر مسرت تھا۔۔۔ ہمارے آگے پیچھے بھاگتا پھرتا تھا۔ ”ہوٹل سٹون کاسل“ ایک آرامدہ مقام تھا لیکن وہاں یخ بستگی بہت تھی۔ بستر پر بچھی چادر سردی سے منجمد ہو رہی تھی اور مجھ میں تو جھیل قراقل کا انجماد بھی ابھی تک مجھے کپکپاتا تھا۔۔۔ میں نے دریافت کیا کہ کیا اس ہوٹل میں سنٹرل ہٹینگ کا بندوبست نہیں ہے تو جواب ملا کہ سر۔۔۔ یہاں مئی کے آغاز میں گرمیاں شروع ہو جاتی ہیں اور ہیٹنگ سسٹم آف کر دیا جاتا ہے۔ میمونہ میری ڈھارس بندھاتی رہی کہ ہم جتنے بھی گرم کپڑے اور جیکٹیں وغیرہ لائے ہیں انہیں پہن کر کسی نہ کسی طرح شب بسر کر لیں گے۔ کمرے کے ایک کونے میں زرد رنگ کے بے طرح پھولے ہوئے دو تکیے تھے۔ ان کا مصرف جانے کیا تھا۔ شاید مقامی حضرات اسی نوعیت کے پھولے ہوئے تکیوں پر تکیہ کرتے ہوں۔ ابھی ہماری سانس بے ربط تھی جب الہام نازل ہو گیا ”چلئے محترم تارڑ صاحب۔۔۔ ہم آپ کو آپ کے ملک کی سرحدپر خنجراب ٹاپ تک لے جائیں گے۔۔۔ آئیے“۔ میرے بدن میں تھکاوٹ اور سردی اتنی تھی کہ میں کہیں بھی نہیں جانا چاہتا تھا لیکن میں طے شدہ شیڈول سے انحراف کیسے کر سکتا تھا۔۔۔ کوہ پامیر کی چراگاہوں کے درمیان میں۔۔۔ تین کاریں بلند ہوتی تھیں۔ پاکستان کی جانب چلی جاتی تھیں۔

امیری چراگاہیں اور درّہ خنجراب

مستنصر حسین تارڑ

7-7-13

میں چینی تُرکستان کے شہر تاشکر گاؤں میں پہنچتے ہی اس کی برفیلی ہواؤں میں ٹھٹھرتے شام کے پانچ

بجے درہ خنجراب کی جانب چلا جا رہا تھا۔ ہماری پراڈو کے آگے رہنمائی کرتی دو سرکاری سیاہ کاریں تھیں۔
سب سے اگلی کار میں الہام اور آپس کے محکمے کے اہلکار سوار تھے۔۔۔ اور پچھلی کار میں ایک چینی
ڈاکٹر صاحب ایک نائب کے ہمراہ ایک میڈیکل یونٹ کے طور پر چلے جاتے تھے، اُنہیں خدشہ تھا کہ ہم دونوں
بابا لوگ شاید خنجراب کی بلندی کو سہار نہ سکیں تو ہمیں فوری طور پر طبی امداد مہیا کی جا سکے۔
ہمارے کمرے میں جو پھولے ہوئے تکیے تھے دراصل تکیے نہ تھے آکسیجن بیگ تھے جنہیں بہ وقت ضرورت
ہمیں سنگھایا جا سکتا تھا اور ہماری فی الحال چین میں قیمتی جانوں کو بچایا جا سکتا تھا۔۔۔ تاشکر گاؤں
سے نکلتے ہی منظر وسیع ہوتا چلا گیا۔۔۔ دائیں بائیں وسیع و عریض گھاس کے میدان تھے جن کے کناروں پر
کیا ہی خوش نظر کوہ پامیر کی برفانی چوٹیاں دکھائی دے رہی تھیں اور گھاس کے ان سر سبز میدانوں میں
یاک سینکڑوں کی تعداد میں سر جھکائے گھاس چرتے تھے۔۔۔ میں نے کم ہی کسی یاک یا پھر یا کنی کو
سر اٹھاتے دیکھا ہے۔ وہ ہمیشہ سر جھکائے روئیدگی پر منہ مارتے تھے۔ میرے حیوانی تجربے کے مطابق دو
جانور کھانے پینے کے بے حد شوقین ہیں۔ ایک پانڈا جو مسلسل بانس کی کونپلیں نگلتا رہتا ہے اور دوسرا
یاک جو گھاس میں تھوتھنی ڈال کر سر اٹھاتا ہی نہیں۔۔۔ اور ہاں ایک اور جانور بھی ہمہ وقت خوراک کو منہ
مارتا رہتاہے ار وہ ہے لاہوری۔۔۔ یہ وسیع چراگاہیں اور ان کے سفید پوش پہرے دار پامیر ہمارے دلوں میں اترتے
تھے، ہم کیسے بدنصیب ہوتے اگر تھکاوٹ کی وجہ سے درہ خنجراب کا سفر ترک کر دیتے۔ پراڈو کا چینی
ڈرائیور جو ایک اور چیانگ تھا البتہ چیانگ کائی شیک نہ تھا میرے دل کا حال جانتا تھا، جہاں میرا جی چاہتا وہ
رک جاتا اور میں باہر نکل کر سردی سے ٹھٹھرتا چند سانس بھر کر پامیری ہوا کی ایک پائل کی مانند چھن
چھن کرتی سرد لذت کو اپنے پھیپھڑوں میں اتارتا اور ایک دو تصویریں اتار کر واپس پراڈو میں آ بیٹھتا۔۔۔ اس نے
جان لیا کہ یہ جو دائیں جانب چراگاہ میں ایک تاجک ٹیرٹ ایستادہ ہے جس کے آس پاس بھیڑیں اور یاک چرتے
ہیں اور چند تاجک خانہ بدوش خواتین اپنے روایتی شوخ پیراہنوں میں اُن کے پیچھے بھاگتی پھرتی ہیں تو میں
دل و جان سے وہاں رکنا چاہتا تھا۔ وہ خوش رنگ خواتین جن کے پیراہن پامیر کی برفوں کے عکس سے مزید
شوخ ہوتے تھے۔۔۔ اپنی بھیڑ بکریوں کو گھیر کر اُن کا دودھ دوہ رہی تھیں۔ میمونہ کا یہی تو فائدہ تھا کہ اُس
نے آگے بڑھ کر ’السلام علیکم“ کا طلسم اُن پر پھونکا اور وہ اس کی سہیلیاں ہو گئیں۔۔۔ بلکہ اُس کی خدمت
میں ایک بھیڑ بھی پیش کی کہ آؤ اس کے پھولے ہوئے تھنوں میں سے دودھ کی دھاریں نکالو۔۔۔ اُن سب کی
بڑی اماں نے ہمیں اپنے سادہ سے ٹیرٹ کے اندر آنے کی دعوت دی اور چائے کی کیتلی چولہے پر چڑھا دی۔
جب ہم ٹیرٹ کے دروازے میں سے اندر جا رہے تھے تو باہر بیٹھا ایک ریچھ نما گڈریا کتاکچھ معترض نہ ہوا۔۔۔ وہ
جان گیا تھا ہم اجنبی پامیر کی برفوں کے سائے میں اُس کے مالکوں کے مہمان ہیں۔۔۔ ہمارا بس چلتا تو ہم
اُس شب تاجک خانہ بدوشوں کے اُس ”ٹیرٹ“ میں ٹھہر جاتے۔ اُن کی نان نما روٹی بھیڑوں کے دودھ کے
ساتھ کھاتے اور ٹیرٹ کی رضائیوں میں رو پوش ہو کر سو جاتے۔۔۔ اگر ہمارا بس چلتا۔۔۔ چراگاہوں میں بھیڑوں اور
یاکوں کے علاوہ دوکوہانوں والے باختری نسل کے اونٹ بھی آوارہ ہوتے تھے۔ یہ باختری اونٹ بالوں کے حوالے
سے کسی حد تک دلیپ کمار سے ہوتے ہوتے ہیں۔۔۔ پامیری موسم سرما کا سامنا کرنے کے لیے انہیں بالوں
سے ڈھانک دیا گیا تھا۔ ہمارے ہاں کے جو اونٹ ہوتے ہیں، وہ ان کے مقابلے میں کچھ برہنہ سے لگتے ہیں۔۔۔
علاوہ ازیں ہمارے اونٹ بے وجہ غل مچاتے ڈکراتے رہتے ہیں جب کہ باختری اونٹ بے حد حلیم الطبع اور
درویش سے ہوتے ہیں۔ ان کی سب کلیں سیدھی ہوتی ہیں اور یہ کینہ پرور نہیں ہوتے۔ اگر مجھے اگلے جنم
میں ایک اونٹ ہونا ہوتا تو میں ہرگز عربی اونٹ نہ ہوتا۔۔۔ ایک باختری دو کو ہانوں والا اونٹ ہونا پسند کرتا۔
سفر پھر شروع ہوا تو دائیں جانب ایک چراگاہ میں نیلی جین اور سیاہ بلاوز میں ملبوس ایک لڑکی اپنے
مویشیوں کو ہانکتے اپنے ٹیرٹ کی جانب لے جا رہی تھی۔
مجھے یقین تھا کہ خنجراب تک کا سفر ایک پر پیچ، خطرناک، بل کھاتا سفر ہو گا لیکن یہاں تو ایک شاہراہ
تھی جو پہاڑوں کے اندر تک چلی جاتی تھی۔ پھر معمولی سی بلندی میں ہم نے کچھ موڑ کاٹے۔۔۔ اور
سامنے درہ خنجراب کی سرحد پر ایک شاندار چینی دروازہ برفوں میں بلند ہو رہا تھا۔ اور اس کے پار پاکستان
تھا۔ میں باہر آیا تو بلندی نے اثر دکھایا، میں ذرا سا لڑکھڑایا۔۔۔ آج سے بیس بائیس برس پیشتر میں اپنے

خاندان کے ہمراہ ہنزہ سے سفر کرتا یہاں تک آیا تھا۔ وہ سادہ سنگ میل جس پر خنجراب 16001فٹ۔۔۔ فاصلہ زیرو کلو میٹرتحریر تھا، وہاں نہ تھا جس کے گرد کھڑے ہو کر ہم نے ایک ایسی تصویر اتروائی تھی جسے دیکھ کر ایک جرمن ادیب نے کہا تھا کہ اس تصویر میں خوشی بہت ہے۔ میں اس مقام کا تعین کرنے لگا جہاں برفوں میں کھڑے ہو کر سکول کی طالبہ عینی نے پیپسی کولا کا ایک ٹین ہاتھ میں لے کر تصویر کھینچوائی تھی۔۔۔ اور وہ مقام جہاں میرے مرحوم دوست صابر قاضی کی کار کھڑی تھی۔ میمونہ ایک دو تصویریں اتروا کر پراڈو میں چلی گئی تھی کہ یہاں تادیر سانس نہیں لیا جا سکتا تھا۔ میں پاکستان کی سر زمین پر ہوں تو یہاں سے کیسے واپس چلا جاؤں۔۔۔ اپنی دھرتی کے لمس نے مجھے باغی کر دیا تھا۔ میں نے ہمہ وقت اپنے آس پاس منڈلاتی مترجم سے مخاطب ہو کر کہا "جوائے۔۔۔ میں پاکستان میں ہوں۔۔۔ میں چین واپس نہیں جا رہا۔ میرے بیگ میں ہمارے پاسپورٹ ہیں، خنجراب سے براستہ سوست۔ ہنزہ کریم آباد، گلگت سے نیٹکو کی بس پر سیدھے راولپنڈی جہاں ہر جانب۔۔۔ لاہور لاہور ہے کی سواریاں ہوں گی اور پھر میرا گھر ہو گا"۔ جوائے بے حد نروس ہو گئی۔۔۔ "تارڑ۔۔۔ آپ ایسا نہیں کر سکتے۔۔۔ میں آپ کے لیے ذمہ دار ہوں۔۔۔ آپ چاہتے ہیں کہ میں نوکری سے نکالی جاؤں۔۔۔" اُس نے باقاعدہ مجھے دھکیل کر پراڈو میں بٹھا دیا۔ ہم دس بجے کے قریب واپس تاشکر گاؤں اپنے ہوٹل میں پہنچے تو ابھی تک روشنی تھی۔ چینی ڈاکٹر جس نے حکومت کے کہنے پر خنجراب تک سفر کیا تھا بے حد مایوس تھا کہ بابا لوگ کو کچھ نہیں ہوا اس لیے ہم نے اس کا دل رکھنے کی خاطر اپنے بلڈ پریشر چیک کروا لیے اور اُن میں کچھ بے ضابطگی تو تھی پر ایسی نہ تھی کہ ہم رحلت فرما جاتے۔

رات کے کھانے کے میزبان تاشکر گاؤں کے خوش شکل اور کھلنڈرے سے گورنر تھے جو اردو میں شدھ بدھ رکھتے تھے۔ انہوں نے مجھے ایک دستار فضیلت عطا کی۔ ایک قراقلی تاجک ٹوپی پہنائی اور میں نے اُن کے کندھوں پر سندھ کی اجرک کے قدیم رنگ سجا دیے۔

اگلے روز۔۔۔ پتھروں کا قدیم قلعہ ، ایک قبرستان، ایک آتش کدہ، ایک وسیع چراگاہ، ایک قدیم مسجد اور یاد رہے کہ بدھ راہب فاہیان جو قبل از اسلام بدھ تحریروں کی تلاش میں ہندوستان تک آیا اس نے اپنے سفر نامے میں جہاں وادیٔ تانگیل، پشاور، بنوں اور بھیرہ کا تذکرہ کیا ہے وہاں تاشکر گاؤں بھی اس کی ایک منزل تھا۔

تاشکر گاؤں کے برف نظر اور دیدہ زیب شہر سے ہم واپس ہوئے۔۔۔ تابہ خاک کاشغر۔

یار قند کی امان النسا خان اور ایران کی قرۃ العین طاہرہ

مستنصر حسین تارڑ

14-07-2013

ہم کیسے نصیب والے تھے کہ یارقند کے جادوئی قدامت والے شہر کی ایک شام میں تھے۔ اور ایک ایسے قدیم محلے میں تھے جہاں ہندوستان سے آنے والے سوداگر قیام کرتے تھے۔ شاہراہ ریشم کا ایک اہم پڑاؤ۔۔۔ اور ایک مسلمان ثقافت کی نمائندگی کرتا ہوا قدیم قہوہ خانہ۔۔۔ تخت پوش پر سجے گرم نان۔ قہوہ اور سلگتے ہوئے سیخ کباب۔۔۔ یعنی تکے۔۔۔ شاہ مقام موسیقی الاپتے چوکور ٹوپیوں اور چوغوں میں ملبوس ترکستانی ساز چھیڑتے، دف بجاتے موسیقار اور ان کے درمیان براجمان الہام ایک ستار بجاتا شاعری پڑھتا وجد میں آتا تھا۔ موسیقاروں کا یہ طائفہ روایتی موسیقی کے ایک جشن میں جو بیجنگ میں برپا ہوا پورے چین میں سب سے اعلیٰ اور سریلا قرار دیا گیا۔ ان میں سے ایک بوڑھا چگی ڈاڑھی والا بے دانت گلوکار ایسا تھا جس کی آواز اپنے پٹھانے خان سے بے حد مماثلت رکھتی تھی۔ مجھے جب اپنے تاثرات بیان کرنے کی دعوت دی گئی تو میں نے اپنے ہاں کے صوفی گلو کاروں کا تذکرہ کرتے ہوئے خصوصی طور پر عابدہ پروین اور پٹھانے خان کی آوازوں کی کیفیت بیان کیا۔ اس شب کھانے کی میز پر مجھ پر کھلا کہ الہامِ نہ صرف ایک موسیقار اور گلوکار ہے بلکہ وہ موسیقی اور ثقافت کے حوالے سے ایک فلسفی ہے۔ شاہ مقام موسیقی اور شاعری کا سرچشمہ میرے تصور کے مطابق مولانا روم ہی تھے۔ خاموش طبع محمد اور ہماری آؤ بھگت میں مگن چینی

نوجوان چی نہایت دل جمعی سے میری باتیں سنتے رہے۔ یہاں چی نے مجھے مسلمانوں اور چینیوں کے درمیان روابط کا ایک حیرت انگیز قصہ سنایا۔ اس کا کہنا تھا کہ بچپن میں اس کے بیشتر دوست مسلمان تھے۔ ان میں سے ایک جو اس کا جگری دوست تھا اس کے ہاں ایک جشن منعقد ہوا اور یہ وہ موقع تھا جب مسلمانوں کی روایت کے مطابق اسے مسلمان کیا گیا یعنی اس کے ختنے کیے گئے۔ چی نے اصرار کیا کہ وہ اپنے دوست کی مانند مسلمانوں کی اس روایت پر عمل کرے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔۔ یعنی میرے سامنے کھانے کی میز پر بیٹھا معصوم چی ختنہ شدہ تھا۔ آدھا مسلمان تھا تقریباً۔۔ چیک کرنے کی کچھ حاجت نہ تھی۔ یار قند اور اس سے ملحقہ علاقوں کی سب سے بڑی بیروئن امان النساء خان ہے۔ ایک بے مثل حسن کی مالک، شاعرہ موسیقار اور فلسفی، جس نے قدیم شاہ مقام شاعری کو ایک دیوان میں جمع کیا۔ اس کے مزار کے اندر دیواروں پر اس کے شعر درج تھے اور میں نے محسوس کیا کہ وہ کسی حد تک ایران کی قرۃ العین طاہرہ تھی اگرچہ اس کی مانند گلا گھونٹ کر ایک اندھے کنویں میں نہیں پھینکی گئی تھی لیکن جذبے کی وہی شدت۔ عشق کی وہی آتش اور شاعری ایک ایسا آتش فشاں جو پڑھنے والے کو جلا کر راکھ کر دیتا ہے اور یہاں میں طاہرہ کی اس غزل کا حوالہ تفصیل سے نہیں دوں گا جس نے علامہ اقبال کو بھی متاثر کیا اور جو ہر اس شخص کو جس کے سینے میں ایک دل ہے۔ بہر طور ازبر ہے یعنی ۔۔گر بتو رفتدم نظر چہر بہ چہرہ رو بروـ۔ شرح دہم غم تو را نکتہ بہ نکتہ، مو بہ مو
در دل خویش طاہرہ گشت و ندید جزتورا۔ صفحہ بہ صفحہ، لا بہ لا، پردہ بہ پردہ تو بہ تو۔ طاہرہ کہتی ہیں ”نور تو ہے۔ خیمہ تو ہے۔ چاند تو ہے۔ افق تو ہے۔ میرے دستر خوان پر مہمان تو ہی ہے۔ میں تو بندوانہ کی ایک بیل ہوں۔“
شیر تو ہے۔ شکر تو ہی ہے۔ تو ہی شاخ ہے تو ہی ثمر ہے۔ تو ہی آفتاب ہے، تو ہی چاند ہے، میں تو بس ایک ذرہ ہوں،دھول ہوں۔
تو ہی کعبہ ہے، تو ہی صنم ہے، تو ہی دیر ہے تو ہی حرم ہے، محبوب بس تو ہے، میں تو ایک نور عاشق ” ہوں“۔
مجھے یقین ہے کہ طاہرہ کے یہ شعر آپ کو ”میرا عشق وی توں، میرا ایمان وی توں“ کی جانب کھینچتے ہوں گے۔ امان النساء خان کی شاعری میں بھی یہی شدت عشق ہے۔ اس کے مقبرے کے برابر میں یارقند کے شامیوں کے مزار تھے۔ اور ان سے متصل انگور کی بیلوں کی چھاؤں میں یارقند کی قدیم جامع مسجد تھی اور وہ ایک نادر اور شاندار عمارت تھی جس کی قدامت ایک چراغ کی مانند روشن ہو کر ہمارے دل کے اندرتک سرایت کرتی تھی۔ میں نے بمشکل اپنے جوگرز اتارے اور بھارت گزاروں میں شامل ہو گیا۔ وہ کن اکھیوں سے مجھے دیکھتے کہ یہ نیلی جین اور ٹی شرٹ میں ملبوس گندمی رنگت کا اجنبی کہاں سے آ گیا ہے۔ ہمارے برابر میں کھڑا جھکتا ہے اورسجدے میں چلا جاتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے پوچھتے تو میں انہیں بتاتا کہ میں دور کے دیسوں سے آیا ہوں۔ تمہارے قبیلے کاہوں، تم سے بچھڑا ہوا تھا۔ مجھے قبول کر لو۔۔ میں شاہ حسین اور بلھے شاہ کے دیس سے آیا ہوں۔ تخت لاہور سے آیا ہوں۔ میں نہیں جانتا میں کون ہوں۔۔ کی جاناں میں کون او بلھیا ۔۔ کی جاناں میں کون۔
الہام نے نہایت عاجزی سے درخواست کی کہ کیا ہم اس کے گھر جا سکتے ہیں اس کا ذاتی عجائب گھر دیکھ سکتے ہیں۔ یار قند کے پرانے علاقے میں الہام کا گھر تھا۔ ایک خصوصی ایغور گھر۔۔ شہتوت اور خوبانی کے شجر پھلوں سے بوجھل ہوتے ہوئے صحن میں اس کے ذاتی عجائب گھر میں عجائبات دھول میں اٹی ہوئی تھیں۔ قدیم ساز، برتن آرائش کی اشیاء، تصویریں۔ پرانے ظروف اور ایک قرآن پاک، سینکڑوں برس پیشتر کسی ماہر خطاط کے ہاتھوں سے لکھا ہوا ایک دل میں اتر جانے والا بے مثل نقش۔۔ میمونہ نے اپنے سر کو دوپٹے سے ڈھانکا اور قدیم قرآن کے اوراق کو لرزتی انگلیوں سے انتہائی احترام سے پلٹا اور جھک کر پڑھنے لگی۔ الہام نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا اور کہنے لگا ”آپ کی بیگم کا شکریہ۔۔ ان کا عربی لہجہ کتنا خوبصورت ہے۔ کیا یہ حافظہ ہیں؟ اور یہ سوال چینی ترکستان کے اس سفر کے دوران جب کبھی میمونہ قرآن پاک پڑھنے لگتی اکثر پوچھا گیا اور میں یہی کہتا کہ۔۔ نہیں اس کے بڑے بھائی جو پی آئی اے میں ڈپٹی

منیجنگ ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز رہے۔ اسلم خان، وہ حافظ تھے۔۔۔ البتہ میمونہ اگر قرآن پاک کھولتی ہے تو کسی بھی آیت کو پڑھتے ہوئے رواں ہو جاتی ہے۔
اس قرآن پاک کو نمی سے بچائیے کہ آپ کی چھت ٹپکتی ہے۔ یہ بہت نایاب نسخہ ہے، میمونہ نے اس ” خوبصورت نسخے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے الہام سے درخواست کی۔
الہام سر جھکائے کھڑا رہا، میمونہ کا شکریہ ادا کیا اگرچہ وہ انگریزی سے ناواقف تھا لیکن اس کے چہرے سے عیاں ہوتا تھا کہ وہ ایک نایاب کیفیت سے دو چار ہوا ہے۔
الہام کے صحن میں ٹپ ٹپ رس بھرے شہتوت گرتے تھے، ذرا سی ہوا کے چلنے سے ٹپ ٹپ گرتے تھے۔۔۔ اور ان میں یارقند کی شیرینی گھلی ہوئی تھی۔
گھر کے اندر ایک زنان خانہ تھا اور میمونہ کو دعوت دی گئی کہ وہ اندر جا کر الہام کی اہلیہ اور ڈاکٹر بیٹی سے ملاقات کرلے۔ مردوں کا داخلہ ممنوع تھا۔
میں نے مترجم جوائے کے توسط سے الہام سے پوچھا کہ کیا یار قند میں اب بھی کوئی عظیم ماضی کے مزار موجود ہیں۔ کوئی کارواں سرائے، کوئی بازار، ایک کچا گھروندا۔ کوئی مقبرہ، کوئی مسجد۔۔۔ ایسا مقام جہاں شاہراہ ریشم پر سفر کرنے والے کارواں قیام کرتے تھے۔ کیا سب کچھ زمانے نے ملیا میٹ کر دیا ہے یا کچھ آثار کہیں باقی ہیں؟
الہام نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر کہنے لگا”ایک پونے سات سو برس قدیم مسجد ہے جو یارقند کے سنہری دور کی پاسبانی کرتی ہے۔ اس کی حالت خستہ ہے۔ ایک عرصے سے بند پڑی ہے۔ صدر دروازے پرپڑا قفل زنگ آلود ہو رہا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ وہ قفل کھل جائے۔۔۔ اس مسجد کے امام میرے واقف ہیں۔ شاید وہ قفل کھولنے پر رضا مند ہو جائیں۔۔۔ شاید۔۔۔ آپ میری معلومات کے مطابق پہلے پاکستانی ہوں گے جو اس مسجد کی زیارت کریں گے

“پونے سات سو برس قدیم یارقند کی مسجد کے کھنڈروں میں”

مستنصر حسین تارڑ
18-07-2013
آج سے تقریباًڈیڑھ سو برس پیشتر ایک برطانوی ڈاکٹر جارج اینڈرسن نے لاہور سے یارقند کا سفر جو تین ماہ کی پُرمشقت اور دشوار مسافتوں پر مشتمل تھا، اختیار کیا۔۔۔ ڈاکٹر اینڈرسن کے سفرنامے کا آغاز کچھ یوں ہوتا ہے ”میں ان دنوں لاہور میں تعینات تھا جب غیرمتوقع طور پر جالندھر ڈویژن کے کمشنر جناب فورسائتھ کی جانب سے ایک پیغام ملا کہ وہ ایک خیرسگالی مشن پر یارقند روانہ ہو رہے ہیں جہاں وہ یارقند کے حکمران اتالیق غازی سے ملاقات کریں گے اور انہوں نے لارڈ میو سے درخواست کی تھی کہ وہ مجھے ایک ڈاکٹر کے طور پران کے ہمراہ بھیجنے پر رضامند ہو جائیں، یہ اپریل 1870ء کے دن تھے“۔
یارقند سے واپسی پر ان ڈاکٹر اینڈرسن نے ”لاہور سے یارقند تک“ کے عنوان سے ایک سفرنامہ تحریر کیا۔۔۔ میں نے یارقند کا سفر اختیار کرنے سے پیشتر اس سفرنامے کو دوبارہ نہایت دل جمعی سے پڑھا لیکن یہ میری معلومات میں کچھ زیادہ اضافہ نہ کر سکا کہ ڈاکٹر موصوف مقامی ثقافت اور تاریخ سے زیادہ ان علاقوں کے پرندوں، جانوروں اور گل بوٹوں میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے ایک مقامی ماہر کی مدد سے مختلف پرندوں کو حنوط کیا اور اپنے ہمراہ ہندوستان لے آئے۔۔۔ مجھے ان کی ایک شکایت بے حد دلچسپ لگی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ مقامی ماہر جب کبھی کوئی پرندہ پکڑ کر لاتا تو اسے حلال کر کے کھا جاتا اور پھر باقی ماندہ پرندے کو حنوط کر دیتا کہ وہ ایک مسلمان تھا۔ گوشت ہمیشہ سے مسلمانوں کی کمزوری رہی ہے۔ اپنے لاہور کے کڑاہی گوشت، پشاور کے نمک گوشت سے آغاز کیجئے۔ عرب حضرات کے سالم بکرے روسٹ شدہ ملاحظہ کیجئے۔ بیجنگ میں گوشت کے سب بیوپاری مسلمان ہیں۔ کاشغر میں ہر جانب روسٹ مرغ، تکے اور سری پائے نظر آتے ہیں۔۔۔ میمونہ ایک قنوطی طبیعت کی خاتون ہے او راس کا کہنا ہے کہ

مسلمان اتنا گوشت کھاتے ہیں کہ ان کے دماغ میں سوچنے سمجھنے کی گنجائش کم رہ جاتی ہے۔
بہرطور ہم یارقند میں تھے۔۔ ایک پرانے محلے میں پوشیدہ ایک بلند محراب تلے ایک خستہ دروازہ مقفل تھا جس کے اندر پونے سات سو برس قدیم ایک مسجد کے آثار تھے۔۔ دس برس پیشتر تک اس مسجد کے پینتالیس گنبدوں میں پانچ وقت اذان کی آواز گونجتی اہل یارقند کو فلاح کی جانب بلاتی او رپکارتی تھی۔ اس کی عمارت اتنی مخدوش ہو گئی کہ اسے بند کر کے دروازے پر قفل لگا دیا گیا۔ ایک خستہ اور شکستہ سیڑھی محراب کے برابر میں سے اٹھتی مسجدکی چھت تک جاتی تھی۔۔ میرے چینی میزبانوں اور محمد نے بھی مجھے منع کیا کہ اس پر چڑھنا خطرناک ہے لیکن میں ایک عجیب ہیجان کی گرفت میں تھا، مجھے اس قدیم مسجد کے اندر جھانکنا تھا۔۔ میں اپنے بھدے اور بے ڈول بدن کو سنبھالتا اوپر چلا گیا۔ دائیں بائیں پینتالیس خوش نظر گنبد چھت میں سے نمایاں ہوتے تھے اور پس منظر میں یارقند کے دروبام تھے۔ مسجد کا صحن شکستگی کی دھول میں اٹا تھا۔۔ دو پرانے درخت اپنی شاخیں پھیلائے صحن پر سایہ کرتے تھے۔۔ پونے سات سو برس تک اس صحن کے فرش پر سجدے نقش ہوتے رہے اور اب یہ صحن ویران پڑا تھا۔۔ کسی نے میرا نام پکارا۔۔ یہ الہام تھا۔۔ وہ مسجد کے آخری امام کو ڈھونڈ لایا تھا اور ان کے ہاتھ میں ایک زنگ آلود چابی لرزتی تھی۔ انہوں نے قفل کھولا اور ہم سب مسجد کے اندر داخل ہو گئے۔۔ میں اس پونے سات سو برس پرانی یارقند مسجد کی تاریخ اور تفصیل انشاء اللہ بہ شرط زندگی اپنے سفرنامے ”لاہور سے یارقند“ میں درج کروں گا کہ اس مختصر تحریر میں تفصیل کی گنجائش نہیں۔ وہاں سوکھے ہوئے پتے دھول آلود فرش پر سرسراتے تھے۔۔ محراب بھی مٹی میں روپوش تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ چینی حکومت نے اس مسجد کو بحال کرنے کے لئے دس لاکھ یُوآن کی منظوری دی ہے۔۔ میں نے امام صاحب سے پوچھا کہ کیا وہ رقم پہنچ گئی ہے تو انہوں نے کہا کہ ابھی منظور ہوئی ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ ان خطوں کی قدیم ترین مسجد پھر سے اپنی عظمت اور دلکشی کے ساتھ یارقند کے افق پر نمایاں ہو گی۔۔ چینی ترکستان یا سنکیانگ کے اس طویل سفر کے دوران مجھ پر جو دوچار لمحے مسرت اور روحانی ہیجان کے آئے ان میں سے ایک اس قدیم مسجد کے کھنڈر میں چند سانسیں لینا تھا۔
اگلے روز ہم کو چین قصبے کی جانب سفر کرتے تھے۔
کوچین شاہ مقام موسیقی اور دہقانوں کی مصوری کے علاوہ ”اخروٹوں اور جیڈ پتھر کا شہر کہلاتا ہے۔۔ ہمارے لئے مقامی آرٹ گیلری کے باہر ایک محفل موسیقی ترتیب دی گئی۔۔ اور سب کے سب موسیقار اور گلوکار دہقان اور کاشت کار تھے۔۔ موسیقی جب اپنے عروج پر پہنچی تو کچھ لوگ عوام میں سے اٹھے اور والہانہ طور پر رقص کرنے لگے۔۔ ان میں دو مسلمان مائی بوڑھیاں بھی تھیں جن میں سے ایک جب کبھی مسکراتی اس کے سونے کے دانت دھوپ سے لشکتے۔ رقص کرنے والوں میں ایک سیاہ ریش بلند قامت حضرت، فل بوٹ پہنے، ایک لمبے چوغے میں ملبوس سر پر سیاہ قراقلی لمبی ٹوپی اوڑھے وجد میں آ چکے تھے۔ ان کے بدن میں موسیقی تھرکتی تھی۔۔ ان کے پاؤں ایک مخمور پرندے کی مانند فرش پر مدہوش ہوتے تھے۔ اس پرفارمنس کے بعد ہم نے آرٹ گیلری میں آویزاں مقامی دہقانوں کی بنائی ہوئی تصاویر دیکھیں۔۔ یہ دہقان زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے لیکن ان کے اندر رنگ کی پہچان تھی اور وہ اپنی روزمرہ زندگی کو تصویروں میں ڈھالنے پر قادر تھے۔ ان میں سے ایک تصویر جس میں ایک مسلمان دہقان اپنے روایتی لباس میں ملبوس باختری دو کوہانوں والے اونٹوں کی مہار تھامے صحرا میں چلا جاتا ہے، میں نے اپنے متوقع سفرنامے کے سرورق کے لئے انتخاب کرلی۔۔ وہ بلند قامت سیاہ ریش رقاص اس تصویر کا خالق تھا۔۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ اس کی تصویروں کی نمائش پاکستان میں بھی ہو او راس کا کہنا تھا کہ وہ نہ صرف اپنی تصویر یں دکھائے گا بلکہ اپنے رقص کے کمالات بھی پیش کرے گا۔
کوچین قصبے سے کچھ فاصلے پر ایک نہروں کا ہیڈورکس تھا جو ان علاقوں کو سیراب کرتا تھا۔ ”یہ کون سا دریا ہے جس کے آگے بند باندھ کر آپ نے ان نہروں کو روا کیا ہے؟“ میں نے کوچین کے میزبانوں سے دریافت کیا۔
دریائے یارقند“ جواب آیا۔”

میں ایک مرتبہ پھر سناٹے میں آ گیا کہ دریائے یارقند کا تذکرہ تمام قدیم ترکستانی تاریخوں میں درج ہے۔ یوں جان لیجئے کہ یہ دریا ان خطوں کا شیر دریا سندھ ہے جس کے کناروں پر عظیم تہذیبوں نے جنم لیا۔۔ ”کیا یہاں کوئی قدیم آثار ہیں؟“ میں نے حسب عادت سوال کیا۔ دریائے یارقند کے ایک بلند کنارے پر تین شہید شہزادیوں کا مزار ہے جو مقامی روایت کے مطابق ایران سے جنگ کے دوران قرآن پاک کی تلاوت کرتی ہوئی ہلاک کر دی گئی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب انہیں ایک مشترکہ قبر میں دفن کیا گیا تو دریائے یارقند نے اپنا رُخ بدل لیا تاکہ ان کا مزار محفوظ رہے۔

مزار کی بلندی سے نیچے بہت نیچے ایک شخص دریائے یارقند میں کھڑا کچھ تلاش کرتا تھا۔ پانیوں میں سے کچھ تلاش کرتا تھا۔ میں نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ چین کا مقدس پتھر جیڈ تلاش کرتا ہے کہ پورے چین میں یہ شہر خُتن ہے جہاں کا جیڈ سب سے اعلیٰ ہے اور پھر دریائے یارقند کے پانیوں میں سے یہ مقدس پتھر دستیاب ہوتا ہے۔ تین شہید شہزادیوں کے مزار پر مختلف رنگوں کے پرچم لہراتے تھے اور دریائے یارقند ان کے احترام میں اپنا رُخ بدلتا تھا۔

اندھے شخص کا باغ“ اور ”پہاڑوں کی گونج

7/8/13

مستنصر حسین تارڑ

بے شک ان دنوں ممنون حسین کی ممنونیت کے چرچے ہیں، ملالہ کوغدار ٹھہرایا جا رہا ہے لیکن کچھ حرج نہیں کہ ایسے موسموں میں ہم کچھ تازہ ترین نالوں کا تذکرہ کر لیں یونہی منہ کا نہیں ذہن کا ذائقہ بدلنے کے لئے۔۔ پچھلے دنوں بھی حسب معمول فراغت تھی تو ان دنوں خوش قسمتی سے مجھے تین نہایت اثرانگیز ناول پڑھنے کا موقع ملا یعنی ندیم اسلام کا ”اندھے شخص کا باغ“ خالد حسینی کا ”پہاڑوں کی گونج“ اور آلف شفق کا ”محبت کے چالیس اصول“۔

ندیم اسلم بنیادی طور پر گوجرانوالہ کے رہنے والے ہیں اور ان کے والد ایک نظریاتی کمیونسٹ تھے۔۔ پھر وہ بھی زیرعتاب آئے اور ندیم کے خاندان کو پاکستان چھوڑنا پڑا۔ ندیم بہت کم عمری میں ہی انگلستان چلا گیا۔۔ ظاہر ہے وہ انگریزی میں لکھتا ہے۔ میں نے اس کا ناول ”گمشدہ محبت کرنے والوں کے لئے نقشے“ پڑھا تو اس کا گرویدہ ہو گیا۔انگریزی پر اسے عبور تھا اور اس کے استعارے اور اشارے بالکل نئے اور انوکھے تھے۔۔ بے شک وہ ذہنی طو رپر مغربی ہو چکا ہے لیکن اس کی روح میں مشرقیت کی ایک خوبصورت دلہن ہے اور جب اس کے لکھے گئے حرف اس دھن پر رقص کرتے ہیں تو لطف آ جاتا ہے۔۔ ازاں بعد اس کا ناول جو افغانستان کے پس منظر میں تھا ”ضائع شدہ نگرانی“ یعنی ”ویسٹڈ وجل“۔ ناول کے حسن کلام اور منظر کشی میں کچھ شک نہ تھا لیکن یہ کیا کہ تقریباً تمام افغان کردار طالبان اور ان کے حواری سب کے سب ولن تھے جبکہ جتنے بھی سفیدفام ہیں وہ ہیرو ہیں۔ بہتر انسان ہیں یہاں تک کہ سی آئی اے کا ایک ایجنٹ بھی عام افغانوں سے بہتر کردار کا مالک ہے۔ میں اس ادبی بددیانتی پر سخت بدمزہ ہوا، درست کہ ندیم اسلم نے یہ ناول ہمارے لئے نہیں مغرب والوں کے لئے لکھا ہے اور وہ بھی کم پڑھے لکھے اور متعصب مغرب والوں کے لئے لیکن ایک ناول نگار کو انصاف پسند تو ہونا چاہئے۔۔ اس نے یقیناًاپنے ادبی ایجنٹ کی خواہش کے مطابق یہ ناول لکھا تھا۔۔ ہم پاکستان میں اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ اگر کچھ نامور ہیں تو ناشر کی جرأت نہیں کہ وہ آپ کے لکھے گئے ناول کا ایک حرف بھی تبدیل کرے چہ جائکہ مشورہ دے بلکہ حکم کرے کہ اس میں سے فلاں کردار حذف کر دیا فلاں صورت حال کو بدل دو۔۔ کراچی لٹریری فیسٹیول کے ایک ڈنر کے دوران ندیم اسلم سے ملاقات ہو گئی اور ناول نگار محمد حنیف نے اس کا تعارف کروایا تو میں نے کہا ندیم اسلم تم

نے ایک ناول بہت شاندار لکھا اور یہ تازہ ناول بہت ہی بُرا لکھا یقیناًیہ ایک ضائع شدہ ادب تھا۔ مجھے یقین ہے اسے بہت برا لگا ہو ا لیکن میں اپنی رائے دینے پر مجبور تھا۔۔ اگلی شب میرے کمرے میں ایک محفل کا اہتمام تھا جہاں محمد حنیف، عبداللہ حسین اور عرفان جاوید موجود تھے لیکن ندیم نہ آیا۔۔ حنیف کا خیال تھا کہ وہ مجھ سے خوفزدہ ہو گیا ہے۔ اس فیسٹیول میں اس نے اپنے نئے ناول ”اندھے شخص کا باغ“ کا تذکرہ کیا کہ وہ کیسے کئی روز تک آنکھوں پر پٹی باندھ کر مختلف کام کرتا رہا تاکہ ایک اندھے شخص کے شب وروز کی تفصیل محسوس کر سکے۔

میں نے ”اندھے شخص کا باغ“ شروع کیا تو اس کی نثر اور ادبی شانداری نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس ناول کا پس منظر پاکستان کے علاوہ افغانستان اور وزیرستان ہے۔ اس کے کچھ حصے ایسے تھے جنہیں میں نے بار بار پڑھا کہ کمال ہے جذبات کو یوں بھی بیان کیا جاتا ہے۔ خاص طو رپر محبت اور موت کی کیفیت میں اس نے کیسے کیسے کلاسیک فقرے لکھے ہیں۔ اگرچہ اس ناول میں بھی ہر جانب ایک مذہبی جنون تھا۔۔ جیسے پاکستان میں نارمل لوگوں کا وجود ہی نہیں ہے جنہیں عرف عام میں روشن خیال اور سیکولر کہہ کر بھڑاس نکالی جاتی ہے۔ شروع میں میرا خیال تھا کہ ندیم اسلم آہستہ آہستہ انصاف پسند ہو رہا ہے۔ وہ کہیں کہیں افغانستان پر امریکی حملے کو ناپسندیدگی سے بھی دیکھتا ہے اور یہ ناول اپنے انجام تک بڑھتا ہوا لگتا تھا کہ اس کا بہترین ناول ہو گا۔۔ لیکن یکدم اس کے آخر میں وہ ایک مار دھاڑ سے بھرپور امریکی فلم میں بدل جاتا ہے جب ایک ”بے چارے“ امریکی کمانڈو کو بچانے کے لئے یکدم سپیشل دستے یلغار کر دیتے ہیں اور پاکستانی کردار مسجد کا لاؤڈ سپیکر کھول کر زخمی امریکی سے کہتا ہے کہ تم اس پر اعلان کرو کہ تم کہاں ہو تاکہ وہ تمہاری مدد کو پہنچ سکیں۔ ہیلی کاپٹر آتے ہیں، امریکی کمانڈو اپنے تمام ہتھیار چلاتے گاؤں پر فائرنگ کر رہے ہیں، زخمیوں کی چیخ و پکار ہے اور جیسا کہ فلموں میں اکثر ہوتا ہے وہ اپنے ساتھی کو اٹھا کر بخیروعافیت ہیلی کاپٹر میں سوار کر کے لے جاتے ہیں۔ ہر جانب آگ لگی ہے ۔۔ بالآخر امریکی ہی ہیرو ثابت ہوتے ہیں۔ انہوں نے افغانستان کے عوام کو جس طور ہلاک کیا اس کا کچھ تذکرہ نہیں۔۔ تو اے ندیم اسلم اتنا شاندار ناول لکھتے ہوئے تم یکدم پھر سے اتنے امریکی کیوں ہو گئے، تم نے اپنے ناول کو ضائع کر دیا۔۔ کیا میں تمہارے آئندہ ناول کا انتظار کروں! تم میں اتنا بڑا ٹیلنٹ ہے کہ میں تم سے مایوس نہیں ہونا چاہیں، اگر تم ایک معمولی لکھنے والے ہوتے تو بے شک ”گیلری“ کے لئے لکھ کر داد حاصل کر لیتے لیکن تم غیرمعمولی ہو۔ صرف یہ یاد رکھو کہ تم نے صرف مغرب کی متعصب سوچ کی نمائندگی نہیں کرنی، انسانیت کو مغرب اور مشرق کے خانوں میں نہیں بانٹنا، بلکہ ہماری آرزوؤں، دکھوں اور اذیتوں کو بھی زبان دینی ہے کہ تمہاری دہن میں گوجرانوالہ کی زبان ہے جس کا تم پر حق ہے۔

خالد حسینی ایک افغان نے ”کائٹ رنرز“ نام کا ناول لکھ کر بے حد شہرت کمائی اور اس کا ترجمہ ہم ”پتنگیں لوٹنے والے“ بھی کر سکتے ہیں۔ بعدازاں اس پر مبنی ایک فلم بھی بنائی گئی۔ خالد نے اس ناول میں سوویت یونین کے افغانستان پر حملے کی داستان بیان کی ہے اور ظاہر ہے روسیوں کو خوب رگیدا ہے۔۔ ان کے مظالم بیان کئے ہیں۔ دوسرے ناول ”ہزاروں شاندار سورج“ میں اس نے طالبان کے دور حکومت کو خوب کوسا ہے۔۔ اور ہر طالبان کو وحشی او راخلاقیات سے عاری شخص کے طو رپر پیش کیا ہے۔ اس ناول میں بھی ایک یکطرفہ تصویر ہے۔ خالد کا دوسرا ناول پڑھنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اس کے ساتھ ای میل پر رابطہ کر کے اپنی ایک خواہش کا اظہار کروں کہ ایک افغان کے طور پر تم نے اپنی سرزمین ر تباہی پھیلانے والے روسیوں اور طالبان کو تم نے ”بیڈ گائیز“ کے طور پر پیش کیا ہے اور اتنا برا بھی نہیں کیا تو اب افغانستان اپنی بدقسمت تاریخ کے تیسرے دور سے گزر رہا ہے۔۔ امریکیوں نے حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا ہے، جو کچھ روسیوں اور طالبان سے بچا تھا اسے بھی اجاڑ دیا ہے اور ان گنت افغانوں کو نہ صرف ہلاک کیا ہے بلکہ ایک تصویر میں وہ طالبان۔۔ یعنی اپنے ملک کے لئے جان دینے والوں کی لاشوں پر بے شرمی سے پیشاب کر رہے ہیں تو خالد مجھے امید ہے کہ تم اس دور کی عکاسی بھی کرو گے۔ لیکن میں اس کی مجبوری جانتا تھا، وہ امریکہ میں آباد ہو چکا ہے اور وہاں کے تعلیمی اداروں میں لیکچر دیتا ہے تو وہ کیسے افغانستان میں امریکیوں کے مظالم کی تصویر کشی کر سکتا ہے۔۔ اگر میں بھی اس کی جگہ ہوتا تو یہی

مصلحت اختیار کر لیتا۔۔ چنانچہ انہی دنوں جب اس کا تازہ ناول "پہاڑوں کی گونج" شائع ہوا اور میں نے پہلی فرصت میں اس کا مطالعہ کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ خالد حسینی میں ایک تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ اگرچہ اس نے امریکی حملے کو موضوع نہیں بنایا لیکن اس ناول میں افغانستان اس کے کردار اور لینڈ سکیپ کی حیرت انگیز تصویریں ہیں۔۔ سیاسی ردوبدل سے اجتناب کرتے ہوئے اس نے افغانستان کی اصل روح کی ترجمانی کی ہے۔۔ ندیم اسلم کی مانند خالد حسینی کو بھی نثر لکھنے میں ایک کمال حاصل ہے۔۔ وہ انسانی جذبات کا ایک ایسا ماہی گیر ہے جس کی ڈور سے بندھا کانٹا تمہارے دل میں اتر جاتا ہے۔ اس کا بیانیہ جادو کر دیتا ہے۔۔ اسے پڑھتے ہوئے مجھے مولوی غلام رسول عالم پوری کا "قصہ یوسف زلیخا" یاد آ (گیا۔ (جاری ہے

01/09/13

چودہویں کی رات راکاپوشی بیس کیمپ میں

مستنصر حسین تارڑ

فوٹوگرافر حضرات خاص طور پر اسے دیکھ کر ہیجان میں آ گئے۔ ندیم خاور گیسو دراز ایک عالم وجد میں تھا، مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "ہائے ہائے تارڑ صاحب آپ کو پتہ ہے کہ کل شب ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟
کیا ہونے والا ہے؟"۔۔ "ہم پاگل ہو جائیں گے سَر۔۔ کل ہم راکاپوشی کے بیس کیمپ میں ہوں گے اور کل " چودھویں کی رات ہو گی اور پورا چاند ہو گا۔۔ ہم تو پاگل ہو جائیں گے سَر اور آپ۔۔ آپ تو پہلے سے ہی کچھ کچھ ہیں، مزید ہو جائیں گے"۔اگلی سویر جب ہپاکن کیمپنگ کی گھاس پر ہمارے خیمے بندھے پڑتے تھے، ہم بھی تیار تھے اور گدھے بھی، جب میں نے اسرار سے پوچھا۔۔ آج مجھے فریب نہ دینا ، سچ سچ بتاؤ یہاں سے راکاپوشی کا بیس کیمپ تگافیری کتنا دور ہے اور راستہ کیسا ہے۔ اسرار نے شرارت سے اپنی پی کیپ اتاری اور سر کو کھجایا اور وہاں کھجانے کے لیے کچھ خاص نہ تھا کہ وہ تقریباً فارغ البال ہو چکا تھا "تارڑ صاحب۔۔وہ دیکھیے سامنے جو سرسبز پہاڑی نظر آ رہی ہے اور راکاپوشی کا کچھ حصہ جھلک رہا ہے بس وہاں تک جانا ہے۔ یہ ذرا آغاز میں تھوڑی سی چڑھائی ہے پھر تو جنگل میں منگل ہے، سیٹیاں بجاتے چلے جاؤ۔۔" اب یہ جو تھوڑی سی چڑھائی تھی کہ ایک قدم اٹھا کر آگے دھرتے تھے تو دو قدم کھسکتے ہوئے پیچھے چلے جاتے تھے۔ میرا بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ میں اب اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکتا تھا۔ بہرطور میں نے کامران سیالکوٹی سے کمک طلب کی اور اس کے سہارے پر چار قدم پرہر رکتے۔ ٹھہرتے ، پانی پیتے میں اس آفت کو عبور کر گیا یہ نہیں کہ اس کے بعد راستہ ہموار ہو گیا تھا۔ بہر حال مسلسل چڑھائی نہ تھی اور آس پاس کے موسم سہانے تھے ، قدیم اور قد آور شجر تھے۔ جنگلی بیلیں اور پستہ قامت سرو کے بوٹے تھے۔۔ اور کہیں انوکھے پھول بھی ظاہر ہو کر ہماری آنکھوں کو رنگین کر دیتے۔ ہمارے بائیں جانب ہپاکن کیمپنگ سے پرے ایک عظیم چٹانی دیوار تھی جس میں سے آہستہ آہستہ راکاپوشی کا ہیبت ناک گلیشیئر ظاہر ہو رہا تھا۔۔ ندیم خاور نے اپنے گیسو جھٹکے اور نہایت حسرت سے کہنے لگا "تارڑ صاحب۔۔ گلیشیئر کے دوسری جانب جو بلند کنارے ہیں میں نے وہاں ایک موسم سرما کے دوران پورے چھ روز قیام کیا تھا۔ میرے پاس کھانے کے لیے صرف سوکھے چنے تھے، وہاں ایک برفانی نہر یا قل کا چوکیدار تھا ، میں اس کے جھونپڑے میں رات گزار لیتا تھا۔ صرف اس لیے کہ مجھے راکاپوشی کے ایک مختلف زاویے سے تصویریں اتارنی تھیں اور موسم سرما میں اتارنی تھیں ۔ یہ ندیم خاور اور کامران جیسے لوگ جس طور اپنے فن کی پیاس بجھانے کی خاطر پہاڑوں اور صحراؤں میں دھکے کھاتے پھرتے ہیں اور ان کے جذبے اور فن کی کوئی قیمت نہیں پڑتی۔۔ یہ گمنام رہتے ہیں۔۔ اور یہ چاہتے کیا ہیں؟ صرف اپنے خوبصورت پاکستان کے مناظر کو کل دنیا کے سامنے نمائش کر کے ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ دیکھو ہم کتنے خوبصورت ہیں۔ اس راستے میں بھی وہی خاموش کنج نظر آتے چشموں میں پوشیدہ کسی محبوب کے منتظر۔۔ ہم بلند ہوتے جا رہے تھے اور

ہمیں وہ پہاڑی کنارا نظر آ رہا تھا جس کے پار را کا پوشی اور ویران چوٹی کے انبار تھے، دنیا کے بڑے گلیشیئر سانس لیتے تھے اور جب ہم اوپر پہنچے تو اسرار حسب معمول جنگلی پھولوں کا ایک دستہ تھامے میرے استقبال کے لیے موجود مسکراتا تھا۔۔۔ ”مبارک ہو آپ راکا پوشی کے بیس کیمپ پہنچ گئے ہیں لیکن آگے نہ جائیے گا۔ ابھی ہم ایک تجربہ کریں گے “ اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا” اب آپ اپنی آنکھیں بند کر لیجیے اور چند قدم میرا ہاتھ پکڑ کر چلیے اور جب میں کہوں گا تب آپ نے آنکھیں کھولنی ہیں۔۔۔ ٹھیک ہے“ میں آنکھیں بند کر کے اسرار کے سہارے آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگا۔۔۔ دل ہی دل میں ڈرتا کہ پتہ نہیں یہ نگری مہربان مجھے کہاں لے جا رہا ہے۔۔۔ آگے ایک عمیق گہرائی ہے جس کے کنارے پر میں آنکھیں بند کیے چلتا ہوں تو کہیں لڑھک ہی نہ جاؤں۔ تب اسرار کی آواز آئی ”تارڑ صاحب آنکھیں کھول دیجیے“ میں نے آنکھیں کھول دیں اور جو منظر میں نے دیکھا اُسے دیکھ کر میں نے بے اختیار ہو کر وحشیوں کی مانند گلا پھاڑ کر ہاؤ ہُو کی چیخیں ماریں اور ان کی گونج راکاپوشی کی برفوں تک چلی گئی۔ جہاں میں کھڑا تھا چٹان کا وہ کنارا عمودی زاویے سے گہرائی میں گرتا تھا۔ میرے قدموں میں ایک عظیم گلیشئر پھنکارتا تھا اور جہاں تک نظر جاتی تھی وہاں تک برف کا یہ شہر سانس لیتا تھا اور گلیشئر کے قدموں میں سے دائیں جانب دیران کی چوٹی کی برفیں بلند ہوتی جاتی تھیں اور اُس کے برابر میں راکاپوشی کا برفانی محل کسی سنڈریلا کے خوابناک محل کی مانند ظاہر ہو رہا تھا۔ دنیا میں شاید ہی کہیں اتنا وسیع اور پر جلال برفانی منظر ہو گا اور میں نے محسوس کیا کہ جیسے ہم اس کی معصوم اور پاکیزہ تنہائی میں مخل ہوتے ہیں۔ ہم تو آلودہ اور گدلے ہیں، ہماری آلودگی اس عظیم برفانی پاکیزگی پر ایک بدنما دھبہ ہو گی۔ ”کیوں تارڑ صاحب۔۔۔ سفر کی تکان اتری، لطف آیا“ ڈاکٹر احسن سربلاتا مسکرا رہا تھا ”ہاں ڈاکٹر تمہارا شکریہ، اگر تم مجھ سے دھوکا دہی کی یہ واردات نہ کرتے، مجھے نہ ورغلاتے تو میں کیسے اس شاندار الوہی منظر پر پہنچتا۔۔۔ شکریہ!“۔۔۔اور اس گلیشئر گہرائی کے برابر میں ایک چٹان اٹھتی تھی جس کے ساتھ ایک مختصر پگڈنڈی مشکل سے چمٹی ہوئی تھی بلکہ چٹان سے اٹکی ہوئی تھی اور یہ راکا پوشی کے سر سبز بیس کیمپ میں اتر رہی تھی اور جب ہم اس پر ڈولتے ہی چلے تو اس کوہ نوروی کے دوران پہلی مرتبہ ایک ایسا راستہ سامنے آیا جہاں ذرا سی لغزش سے آپ نیچے گہرائی میں موت کی وادی میں گر سکتے تھے۔ تو یہاں بھی چلتے ہوئے لطف آ گیا کہ کوہ نوردی کی شراب میں موت کے خدشے دامنگیرنہ ہوں تو وہ آپ کو مخمور نہیں کرتی، پانی ہو جاتی ہے۔ اس راستے پر ہم پھونک پھونک کر قدم نہیں رکھ سکتے تھے کہ وہ اتنا مختصر اور کچا تھا کہ پھونک مارنے سے غائب ہو سکتا تھا۔۔۔ راکاپوشی کا یہ بیس کیمپ تگافیری کہلاتا ہے۔ ہم اس میں اترے تو آغاز میں دو چٹانیں تھیں جن میں ایک پر اس سنہرے بالوں والے نوجوان کوہ پیما کی تصویر اور کتبہ تھا جو کچھ برس پیشتر راکاپوشی کی چوٹی کے راستے میں ہلاک ہو گیا، دوسری چٹان ایک جیلانی کوہ پیما کی ”قبر“ تھی۔ وہ بھی راکاپوشی پر چڑھتے ہوئے ایک حادثے کا شکار ہو گیا اور اس کی راکھ اس چٹان کی کوکھ میں دفن تھی۔۔۔ اسرار نے جنگلی پھولوں کا جو دستہ مجھے پیش کیا تھا وہ میں نے جاپانی کوہ نورد کی ”قبر“ پر رکھ دیا۔ تگا فیری کے وسیع میدان کے بائیں جانب ایک چٹانی دیوار تھی جو منظر کو پوشیدہ کرتی تھی۔ البتہ دائیں جانب راکاپوشی کا بیشتر حصہ اپنے جمال سے ہر آنکھ کو مسحور اور ہر دل کو ممنون کرتا تھا۔ عمر رسیدہ جاپانیوں کی ایک ٹیم کے درجن بھر خیمے تگا فیری کو آباد کیے ہوئے تھے اور اُن سے پرے ایک برفانی ندی کے پہلو میں ہمارے خیمے نصب کیے جا چکے تھے۔۔۔ اور ہاں تگافیری کی آبادی میں گدھوں کی اکثریت تھی جو ادھر اُدھر خرمستیاں کرتے پھرتے تھے۔۔۔ ان گدھوں پر کوہ نوردوں کا سامان لاد کر لایا گیا تھا۔ جونہی میرا جیسا کوئی کوہ نورد راکاپوشی کی برفوں کی جانب تکتے ہوئے ذرا رومانوی خوابوں میں چلا جاتا تو عین اس وقت کوئی گدھا جذباتی ہو کر راگ کھوتے کا پتر الاپنے لگتا اور پھر فوراً پورے بیس کیمپ میں چرتے گدھے اس کے ہم نوا ہو جاتے۔۔۔ اور کوہ نورد خواب و خیال کی رومانوی دھند میں سے بے حد ذلیل ہو کر فوراً باہر آ جاتا۔۔۔ یہاں تک کہ اس شب چودہویں کے چاند کو راکا پوشی کے پہلو میں سے ابھرتے ہوئے دیکھ کر سب سے پہلے گدھوں نے ڈاہ ڈھیں کا شور مچا دیا۔ وہ بوڑھے جاپانی کوہ نورد چپ چاپ گمشدہ روحوں کی مانند ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ چائے اور فرنچ فرائز سے تازہ دم ہو کر چاروں پاگل حضرات یعنی

فوٹو گرافر اپنا سامان تصویر کشی سنبھالے نعرے لگاتے ہوئے راکاپوشی کے برابر میں جو بلند پہاڑ تھے اُن کے جنگلوں میں غائب ہو گئے۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد کوئی کسی چوٹی پر جا پہنچا تھا اور کوئی کسی خطرناک چٹان پر براجمان تھا۔ وہ یہاں سے دکھائی تو نہ دیتے تھے بس ہم اندازہ لگا سکتے تھے وہ جو ایک نقطہ سا ہے وہ ندیم خاور گیسو دراز ہو گا۔ میں اور وقار ملک میدان میں پھیلے ندیوں کے جال پھلانگتے پار کرتے وہاں تک گئے جہاں سے راکاپوشی کی برفوں کا آغاز ہوتا ہے، وہ اپنی ڈاکومنٹری کے لیے میری گفتگو ریکارڈ کرتا رہا۔ اس شب ایک مرتبہ پھر اسرار نے اپنی کھانا بنانے کی صلاحیت سے حیران کر دیا
دیگر خوراکوں کے علاوہ بکرے کی روسٹ پسلیاں بھی مینو میں شامل تھیں۔ اور پھر وہی ہوا جو چودھویں کا چاند طلوع ہونے پر ہوتا ہے اور وہ بھی دنیا کی خوبصورت ترین چوٹیوں میں شمار ہونے والی راکاپوشی کے بیس کیمپ میں۔ بس غدر مچ گیا۔۔ چاند کے تمنائی سودائی ہو گئے۔ ہر شے سونے میں ڈھل گئی۔ برفانی ندیوں میں پانی نہیں سیال چاند بہتا تھا۔ دوسرے ہوئے تو ہم بھی تھوڑے سے پاگل ہو گئے کہ ایسی پورے چاند کی رات راکاپوشی کے دامن میں کسے نصیب ہوتی ہے۔ ایسے میں جو نہ پاگل ہو وہ دراصل پاگل ہوتا ہے ۔ (جاری ہے)

11/9/13

ہُنزہ کے عقابوں کے نشیمن میں۔۔ ایگلز نیسٹ

مستنصر حسین تارڑ

دیران ریسٹ ہاؤس سیاحوں کا خاصا پسندیدہ مقام تھا۔۔ اکثر لوگ بال بچوں سمیت ہُنزہ یا گلگت جاتے ہوئے دوپہر کے کھانے کے لئے ادھر آ نکلتے اور خوب رونق ہو جاتی۔ ایک روز پوری آٹھ خواتین اور وہ برگر نسل کی نہ تھیں، گھریلو اور سادہ قسم کی تھیں، وارد ہو گئیں، اور ان کے ہمراہ ان کے خاندان کا کوئی مرد نہ تھا، پورے شمال میں دندناتی پھرتی تھیں۔۔ میں ان کی ہمت اور پہاڑوں سے عشق کا معترف ہو گیا۔۔ ایک ڈاکٹر صاحب خاصے باریش تشریف تھے ، اپنے بال بچوں سمیت تشریف لائے اور فروکش ہو گئے۔۔ وہ ہر دوچار ماہ بعد ادھر آتے ہیں، مناپن میں میڈیکل کیمپ قائم کرتے ہیں، نہ صرف بیماروں کا علاج کرتے ہیں بلکہ اپنے پلّے سے ان کو دوائیاں بھی مفت پیش کرتے ہیں، ایسے بے غرض لوگ ہی پاکستان کی پہچان ہیں۔۔ ایک اور خاتون اپنے متعدد بچوں کے ہمراہ یہاں مقیم تھیں، سارا دن کچھ نہ کچھ اپنے بچوں کو کھلاتی رہتیں، کھلاتے ہوئے خود بھی کھاتی چلی جاتیں۔۔ کسی سے کہنے لگیں، یہ بندہ کہتا ہے کہ میں راکاپوشی کے بیس کیمپ گیا تھا۔۔ دوستوں کے سہارے اٹھتا بیٹھتا ہے، سارا دن ہائے ہائے کرتا پھرتا ہے، ایک سیڑھی پر چڑھ نہیں سکتا راکاپوشی پر کہاں چڑھ گیا۔۔ اللہ معاف کرے یہ ادیب لوگ بھی کیسی کیسی چھوڑتے ہیں۔
اسرار نے مجھے ایک زبردست حیرت سے دوچار کیا۔۔ ریسٹ ہاؤس کے ڈائننگ روم میں باقاعدہ ایک تقریب منعقد کی گئی جس میں مجھے ایک اونی ٹوپی اور نہایت دبیز کاڑھا ہوا قدیم شمالی چوغہ پیش کیا گیا۔۔ مجھے جب چوغہ پہنایا گیا تو جذبۂ تشکر سے میری آنکھوں میں نمی آ گئی۔ یہ چوغہ وادئ یاسین کے آخری گورنر اورنگر کے راجہ محبوب علی خان (1898-1938ء) کی ملکیت تھا جو ننھیال کی جانب سے اسرار کے عزیز تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ۔۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ شمال کے حوالے سے آپ کی جو خدمات ہیں اور آپ نگر تشریف لائے تو میں کیسے آپ کی پذیرائی کروں۔ یہ چوغہ ہمارے خاندان میں چلا آتا تھا، ہمارے لئے بیش قیمت اور بزرگوں کی یادگار تھا تو یہ میں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔۔ اس نے مجھے اپنے ہاتھوں سے چوغہ پہنایا اور اس عنایت پر میرے ساتھیوں نے خوب خوب تالیاں بجائیں۔ مجھے امید ہے کہ میرے بعد یہ چوغہ میرے پوتوں کے بھی کام آئے گا۔۔ فی الحال میں اس نادر تحفے کو موسم سرما کے لئے سنبھالتا ہوں تاکہ اسے پہن کر محسوس کروں کہ میں ایک مرتبہ پھر راکاپوشی نگر پہنچ گیا ہوں۔ یہ تو ممکن نہ تھا کہ ہم نگر سے منہ موڑ کر واپس لاہور چلے جاتے، ہُنزہ میں کچھ قیام نہ کرتے۔۔ پچھلے پہر ہم

نے اسرار اور لیاقت کی مہربانیوں اور میزبانیوں کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا، میں نے وعدہ کیا کہ واپسی پر نگر کے بارے میں بہ شرط زندگی تحریری طور پر کچھ نہ کچھ پیش کروں گا اور پھر بہ چشم نم دیران ریسٹ ہاؤس سے جدا ہو گئے۔۔ ناپن گاؤں میں سے گزرتے شاہراہ قراقرم پر آئے اور پُل پار کر کے دوسری جانب چلے گئے۔
ہُنزہ بدل چکا تھا۔۔ میرے ذہن میں آج سے ربع صدی پیشتر کا ہُنزہ تھا، کچے راستے، پتھریلے مکان، خواتین مقامی لباسوں میں ٹوپیاں پہنے۔۔ جس گھر میں جی آئے جھانک لو، اہل خانہ آپ کو خوش آمدید کہیں گے، آپ کی خدمت میں خشک خوبانیاں اور بادام پیش کریں گے، صحن میں پھلدار درخت اور گلیشئر پانی کی ایک مختصر ندی۔ ہُنزہ کے پانیوں میں ریت ہوا کرتی تھی، لیکن اب گاؤں قصبے اور قصبے شہروں میں بدل چکے ہیں۔۔ ناصر آباد اور علی آباد کے شاپنگ سنٹر، وسیع بازار اور وہ سب کچھ جو پاکستان کے کسی بھی بڑے شہر میں میسر ہے، بلکہ علی آباد کا کچھ حصہ تو لاہور کی لبرٹی مارکیٹ لگتا تھا۔ ہُنزہ کے مرکزی بازار میں کچھ قدیم شناساؤں سے ملاقات ہوئی اور پھر ہم نے ڈاکٹر احسن کی فرمائش پر ایک ریستوران میں خوبانی کا جوس پیا۔۔ یہ وہی پوشیدہ سا ریستوران تھا جو وادی پر کھلتا تھا اور جہاں ”سنولیک“ سے واپسی پر ایک شام آسٹریلوی لڑکی جو سٹیفی گراف کی ہم شکل تھی میرے ہمراہ تھی اور وہ مجھے ہُنزہ میں ٹھہر جانے کو کہہ رہی تھی۔۔ وہ کیا ہی سحر انگیز شب تھی۔۔ ہم چڑھائی چڑھتے اور میں تب بھی تھک جاتا تھا اور اب زیادہ تھکتا تھا، قدیم قلعہ کے سائے میں ایک سکول کے میدان میں پہنچے جہاں بچوں کے ایک بینڈ نے سلامی دے کر مجھے ہُنزہ میں خوش آمدید کہا۔۔ یہ طے ہو چکا تھا کہ ہم آج کی شب ہُنزہ کے مشہور ہوٹل ”ایگلز نیسٹ“ یعنی ”عقاب کے گھونسلے“ میں بسر کریں گے، اس سلسلے میں اس کے مالک علی مدد سے بھی رابطہ ہو چکا تھا جو ہُنزہ کے ہوٹلوں کی ایسوسی ایشن کا چیئرمین بھی ہے۔
مجھے اندازہ نہ تھا کہ یہ اتنی بلندی پر واقع ہے اور ہونا بھی چاہئے تھا کہ عقاب تو بلندیوں پر ہی گھونسلے بناتے ہیں۔ ہماری ویگن ہُنزہ کے قدیم اور بلند دیہات میں سے بل کھاتی اوپر چڑھتی چلی گئی اور اس کے ساتھ ہمارا سانس بھی رُکتا اور چڑھتا چلا گیا۔۔ ہوٹل کے ریسپشن کے برابر میں ایک ٹیلہ تھا جسے دیکھ کر فوٹوگرافر حضرات کی تو باچھیں کھل گئیں۔۔ ”تارڑ صاحب آ جائیے، سورج غروب ہونے کو ہے اور اس ٹیلے کی چوٹی سے راکاپوشی کے علاوہ درجنوں دنیا کی خوبصورت ترین برفانی چوٹیوں کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔۔ دور دور سے سیاح اس غروب کے منظر کے لئے یہاں تک آتے ہیں“۔ شفیق الرحمن لکھتے ہیں کہ روم میں ایک مقام پر کوچ رکی اور گائیڈ نے اعلان کیا کہ حضرات ذرا بلندی پر واقع کلیسا میں مائیکل انجلو کا تراشا ہوا مشہور زمانہ حضرت موسےٰ کا مجسمہ ہے آئیے چلتے ہیں تو ایک بوڑھے سیاح نے ان درجنوں سیڑھیوں کو ایک نظر دیکھا جو کلیسا تک اٹھتی تھیں اور کہنے لگا”میرا خیال ہے حضرت موسےٰ کے بغیر بھی میرا گزارہ ہو سکتا ہے“ چنانچہ میں نے ٹیلے کی بلندی دیکھی اور پھر اپنے اکڑے ہوئے بدن کو دیکھا اور کہا ”میرا خیال ہے برفانی چوٹیوں پر غروب آفتاب کا منظر دیکھے بغیر بھی میرا گزارہ ہو سکتا ہے“ اور وہ چاروں فوٹوگرافر بندروں کی طرح کودتے ہوئے ٹیلے پر چڑھ گئے۔۔ ”ایگلز نیسٹ“ کا منیجر اور مالک علی مدد، خوش شکل اور خوشگوار کسی پرانی انڈین فلم کا ہیرو لگتا تھا۔۔ اس نے میری آمد پر ایک تقریر کی اور مجھے خوش آمدید کہا۔۔ ”ایگلز نیسٹ“ اتنی بلندی پر تھا کہ یہاں سے ہُنزہ کا قدیم قلعہ ایک کھلونا سا دکھائی دیتا تھا اور کریم آباد قدموں میں پھیلا ہوا تھا۔۔ کمرے میں داخل ہوا تو اس کی آرائش اور سہولتیں کسی فائیوسٹار ہوٹل سے کم نہ تھیں اور بالکونی سے وادی کا نظارہ تو حیرت انگیز تھا۔۔ اور پھر شام ہو گئی۔۔ ایک ایسی شام جو مدتوں یاد رہتی ہے۔۔ برفانی سہانی جادوئی شام۔۔ ہم نیچے ریسپشن ہال میں گئے تو اس کے برابر وسیع ڈائننگ روم کی ثقافتی سجاوٹ اور آرائش نے ہمیں بے حد متاثر کیا۔ دیواروں پر قدیم قالین، تصاویر، پرانے ظروف او رغالیچے۔۔ میں نے ایسی باذوق آرائش کم ہی دیکھی تھی بلکہ دیران ریسٹ ہاؤس میں کسی حد تک دیکھی تھی۔۔ علی مدد کے بھائی جو بے حد خوش لباس تھے وہ بھی بہت مہربان تھے۔ انہوں نے خصوصی طور پر مجھے اپنے عمررسیدہ والدین سے ملایا، صاف ستھرے اور شفقت سے دمکتے چہرے۔۔ والدہ کی آنکھوں میں اپنے بیٹوں کی کامرانی اور کامیابی کا فخر جھلکتا تھا۔۔ ”ایگلز نیسٹ“ انسانی عزم،

حوصلے اور بدن توڑ مشقت کی داستان ہے۔۔ کہا جاتا ہے کہ ہُنزہ کا کوئی گائیڈ جاپانی سیاحوں کو اس ٹیلے تک لایا کرتا تھا تاکہ وہ ایک عظیم برفانی سلسلے پر غروب اور طلوع کے حیرت ناک مناظر دیکھ سکیں، قریب ہی ایک غریب کسان کا جھونپڑا تھا اور تھوڑی سی زمین تھی۔ وہ ان جاپانی سیاحوں کے لئے گھر سے چائے بنوا کر لاتا تو ایک جاپانی نے اسے مشورہ دیا کہ وہ یہاں ایک دو سادہ سے کمرے تعمیر کر لے تو وہاں سیاح شب بسر کر کے اگلی صبح طلوع آفتاب سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں اور اس نے کچھ مالی معاونت بھی کی۔۔ وہ دو کمرے جو اس شاندار ہوٹل کا آغاز ثابت ہوئے اب بھی موجود ہیں۔ پورے خاندان نے اس ہوٹل کی تعمیر کے لئے مزدوروں کی مانند مشقت کی، چٹانیں توڑیں، پتھر ڈھوئے، دن رات محنت کی اور آج اس کا نتیجہ ”ایگلز نیسٹ“ کی صورت پوری دنیا میں مشہور ہے۔ اور یہ نام اس لئے رکھا گیا کہ ایک روز اس بلندی پر ایک عقاب پرواز کر رہا تھا جسے دیکھ کر یہ نام وجود میں آیا۔
ایگلز نیسٹ“ میں قیام ،مدد علی کی میزبانی میرے لئے ایک یادگار تجربہ تھے۔”
شہباز کرے پرواز تے جانے حال دِلاں دے

15/9/13

شاہراہ قراقرم پر قتل کے سائے
مستنصر حسین تارڑ

اگلی صبح ”ایگلزنیسٹ“ میں پھر سے ہاہاکار مچ گئی۔۔ چلو چلو۔۔ ٹیلے کی چوٹی پر چلو، سورج طلوع ہونے کو ہے۔۔ اور فوٹو گرافر حضرات اپنے تھیلے اور فوٹو گرافی کا سامانِ حرب سنبھالتے بن مانسوں کی مانند ٹیلے پر چڑھ کر غائب ہو گئے۔ ناشتے کے بعد ہم رخصت ہونے لگے تو علی مدد نے ڈائننگ روم میں آویزاں کروشیا کڑھائی کی بی بی مریم اور ننھے عیسیٰ کی تصویر مجھے تحفے میں پیش کر دی۔ میں نے پچھلی شب ڈنر کے دوران اس تصویر کو سراہا تھا۔ اگر نانگا پربت پر اُن معصوم غیر ملکیوں کو ہلاک نہ کیا جاتا تو شاید ہم ہنزہ میں ایک دو دن مزید ٹھہر جاتے لیکن اب ہمارا دل نہ لگتا تھا۔ ڈاکٹر احسن جو شمال میں شیطان سے بھی زیادہ مشہور ہیں ، انہوں نے راولپنڈی تک کے لیے ایک آرامدہ ویگن کا بندوبست کیا اور ہم نکل کھڑے ہوئے۔ گلگت میں ہمیں ایک ہوٹل کے بارے میں اطلاع ملی کہ وہاں کا کھانا نہایت شاندا رہے۔ دوسری منزل پر واقع ہم ایک ایسے گندے سے کمرے میں پہنچے جہاں چند فضول سی کرسیاں پڑی تھیں اور ایک دو ملازم حضرات جو شاید پچھلی عید پر بھی نہیں نہائے تھے لیکن اب ہم میں اتنی ہمت نہ تھی کہ کسی بہتر جگہ کا رخ کرتے لیکن جب کھانا آیا تو وہ واقعی نہایت اعلیٰ ذائقے کا تھا اور وہ گندے ملازم ہمیں صاف ستھرے نظر آنے لگے۔ گلگت سے روانگی سے پیشتر ویگن ڈرائیور نیٹکو کے اڈے پر اپنی روانگی کی اطلاع کرنے گیا۔ وہاں ایک بورڈ پر لکھا تھا ”گلگت سے کاشغر۔۔ براہ راست“ دل خوش ہو گیا کہ ابھی کچھ روز پیشتر میں کاشغر میں تھا۔ ویگن رکی تو مسافر حضرات نے موقع غنیمت جانا اور تتر بتر ہو گئے۔ میں بھی تتر ہوا یا بتر یہ نہیں معلوم لیکن کچھ نہ کچھ ہو گیا۔ اس دوران فہد ایک فاتح عالم کی مانند فرحاں اور شاداں مسکراتا ہوا آیا اور کہنے لگا ”لو جی میں خوبانی کا تازہ جوس ایک گلاس صرف بیس روپے میں پی کر آیا ہوں“۔۔ ”تو پھر کیا ہوا؟“ کسی نے پوچھا: ”آپ کو یاد نہیں ہنزہ کے اُس ریستوران میں جہاں ڈاکٹر احسن ہمیں خاص طور پر لے گئے تھے خوبانی کا یہی جوس پونے دو سو روپے فی گلاس چارج کیا گیا تھا۔ میں بیس روپے میں پی کر آیا ہوں“۔۔ جمیل نے کہا، ”فہد بھائی کیا وہ واقعی خوبانیاں تھیں جن کا جوس تم نے پیا“ تو وہ فخر سے کہنے لگا ”کیا میں خوبانیاں نہیں پہچانتا۔۔ خوبانیاں تھیں، صرف بیس روپے میں“ میں نے اُسے بتایا کہ ”قیمت لوکیشن کی ہوتی ہے۔ بسوں کے اڈے پر خوبانی کا جوس پینا اور وادی ہنزہ کے کسی خوش منظر ریستوران

میں بیٹھ کر پینا کوئی اور بات ہوتی ہے" لیکن فہد اپنی سر خوشی سے دستبردار نہ ہوا۔۔ اور میں نے اس کی معصومیت پر رشک کیا کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے کتنی ڈھیر ساری خوشی کشید کر سکتا تھا۔۔ صرف بیس روپے میں!

یہاں ہمیں ایک تشویشناک اطلاع ملی کہ شاہراہ قراقرم پر ٹریفک بند کر دی گئی ہے کیونکہ نانگا پربت قتل کے مجرموں کی تلاش میں پولیس اور فوج ایکشن کر رہی ہے۔ ہم نے سوچا کہ سفر اختیار کرتے ہیں اگر کہیں روک دیئے گئے تو رات وہیں بسر کر لیں گے۔ اس دوران ہم نے شنگریلا ہوٹل چلاس میں بکنگ کروائی تھی اور یہ بکنگ ہمارے بہت کام آئی۔۔ گلگت سے نکلتے ہمیں شام ہو گئی۔۔ اور نکلتے ہی ایک روڈ بلاک پر دھر لئے گئے۔ رات کے وقت آپ سفر نہیں کر سکتے۔۔ خطرہ ہے۔۔ یہاں وقار ملک جو ان علاقوں میں آتا جاتا رہتا ہے ترپ کا کارڈ ثابت ہوا۔ اس نے پولیس والوں کوایکسپریس چینل کا شناختی کارڈ دکھایا اور کہا کہ اسے بہر طور لاہور پہنچ کر سانحۂ نانگا پربت کو تفصیل سے رپورٹ کرنا ہے اور ہم آج شب چلاس میں ٹھہر جائیں گے آگے نہیں جائیں گے۔۔ اجازت مل گئی۔ ہمارے پیچھے کراچی کے تین نوجوان سیاح ایک سیاہ کار میں چلے آتے تھے، ہم نے اُن کی بھی سفارش کر دی۔ شاہراہ قراقرم رات کی تاریکی میں بہت ہولناک اور سنسان دکھائی دے رہی تھی۔ تقریباً تیس چالیس کلو میٹر کی مسافت کے بعد پھر سے ایک چیک پوسٹ پر روک لیے گئے۔ یہاں معاملات ذرا زیادہ گھمبیر ہو گئے۔ پولیس کا کہنا تھا کہ اُنہیں ابھی ابھی ایس ایس پی صاحب کا حکم ملا ہے کہ کسی بھی مسافر بس، ویگن یا کار کو آگے نہ جانے دیا جائے۔ صبح چھ بجے کے بعد اجازت دی جائے۔ وقار ملک نے طویل مذاکرات کیے۔ ایس ایس پی سے فون پر رابطے کی کوشش کی لیکن سب بے سود۔۔ میں نے وقار سے کہا کہ میں بات کر کے دیکھتا ہوں تو وہ کہنے لگا سر آپ نے تو اپنی شکل نہیں دکھانی، ان میں سے کس نے آپ کو پہچان لیا تو پھر تو ہرگز نہیں جانے دیں گے۔ وہ یہ رسک بالکل نہیں لیں گے کہ ایک جانا پہچانا بندہ شاہراہ قراقرم پر غائب ہو جائے۔ ہم اُسی روڈ بلاک کے قریب شب بسر کرنے کے منصوبے بنانے لگے۔ کامران پولیس سٹیشن کی دیوار سے لگی دو چارپائیوں کو اغوا کر لانے کے بارے میں سوچ رہا تھا، آدھ گھنٹے کے انتظار کے بعد جانے کس کی سفارش پر ہمیں سفر کرنے کی اجازت مل گئی لیکن چلاس تک کا وہ سفر بے حد ڈراؤنا تھا۔ شاہراہ پر سوائے ہماری ویگن اور اس سیاہ کار کے اور کچھ نہ تھا۔ البتہ دو تین ٹرک گزرے۔ دل میں وسوسوں کے سنپولیے سرسراتے تھے۔ ویگن کی ہیڈلائٹس چٹانوں پر پڑتی تو طرح طرح کے ہیولے جنم لیتے۔ بلکہ اب شاید تھوڑے سے پچھتا رہے تھے کہ اسی روڈ بلاک پر ٹھہر جاتے تو بہتر تھا۔ اس عظیم سیاہ شب میں ہمارے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ جب ہم رائے کوٹ پل عبور کر کے فیری میڈو تک جانے والے راستے کے قریب ہوئے تو یوں محسوس ہوا کہ اُن مردہ سیاحوں کی روحیں فریاد کر رہی ہیں کہ فیری میڈو نانگا پربت کے دامن میں تھا۔ ہم اس رات تنہا مسافر تھے جو گلگت اور چلاس کے درمیان شاہراہ پر سفر کر رہے تھے۔ سب خاموش تھے اور سب کی آنکھیں ہیڈ لائٹس سے روشن ہوتی سڑک اور چٹانوں پر لگی تھیں۔ ہم نے اطمینان کا پہلا طویل سانس تب بھرا جب ہماری ویگن چلاس کے شنگریلا ہوٹل کی عافیت میں داخل ہو گئی۔ منیجر صاحب ہمارے استقبال کے لیے ابھی تک جاگ رہے تھے۔ انہوں نے ہمارے لیے بہترین کمروں اور زبردست کھانے کا بندوبست کیا اور ہم نے یہاں تک کے ہول بھرے سفر کے دوران جتنی مسکراہٹیں اور قہقہے روک دیئے تھے ان سب کو کمروں میں پہنچ کر آزاد کر دیا۔ ہمارا خیال تھا کہ اگلی صبح ہم درہ بابو سر کے راستے کاغان پہنچیں، چونکہ میں نے اس راستے پر سفر نہیں کیا تھا اس لیے میں بہت پر اشتیاق تھا لیکن بتایا گیا کہ ادھر بھی آپ تنہا نہیں جا سکتے۔ پولیس گارڈ کا بندوبست کرنا ہو گا۔ درہ بابو سر پر ہی ایک بس کے تقریباً بیس مسافروں کے شناختی کارڈ دیکھ کر مختلف عقیدہ رکھنے کے جرم میں ہلاک کر دیا گیا تھا۔

چلاس کے علاقے میں چٹانوں پر سفید پینٹ سے نشاندہی ہو چکی ہے کہ جب دیامیر ڈیم تعمیر ہو گا تو جھیل کے پانیوں کی سطح یہاں تک ہو گی۔ اس ڈیم سے نہ صرف شاہراہ قراقرم کا ایک طویل حصہ بلکہ شنگریلا ہوٹل سمیت چلاس کا زیریں حصہ بھی ڈوب جائے گا۔ چلاس کی قربت میں متعدد ایسی چٹانیں ہیں جن پر ہزاروں برس پیشتر یہاں سے گزرنے والے مسافروں، بدھ راہبوں اور غیر ملکیوں نے نقش، گل بوٹے،

شکار کے منظر، سٹوپے اور مہاتما بدھ کی تصویریں بنائیں۔ یہ تاریخی چٹانیں بھی معدوم ہو جائیں گی۔ غیر ملکی محققین ان چٹانوں پر نقش قدیم تصویروں کو بین الاقوامی ورثہ قرار دیتے ہیں اور وہ ڈیم کی تعمیر سے پہلے پہلے ان میں سے کچھ چٹانیں منتقل کرنا چاہتے ہیں لیکن یہاں آنا گویا اپنے آپ کو خود ہلاک کرنا ہے اس لیے شاید یہ چٹانیں ہمیشہ کے لیے گم ہو جائیں اور صرف تصویروں میں باقی رہ جائیں۔ ہم نے حسب خواہش برنچ برسین کے موٹل میں آرام کیا۔ میں نے کمرہ نمبر چار میں کچھ دیر لیٹ کر اس کے ماحول کی اداسی کو محسوس کیا۔ آخر وہ کونسا شخص تھا جس کے ساتھ میں ایک شب یہاں آیا تھا۔ کسی پچھلے جنم میں شاید ایسا ہوا ہو لیکن اگر کوئی پچھلا جنم تھا تو ان زمانوں میں تو نہ شاہراہ قراقرم تھی اور نہ یہ موٹل تو پھر یہ کیا معمہ ہے۔

بشام میں چائے کے لیے کچھ دیر قیام کیا۔ دریائے سندھ کے پار گئے تو بارش شرو ع ہو گئی۔ مانسہرہ تک کا علاقہ سرسبز پہاڑیاں، گاؤں اور کھیت چیڑ کے جنگل سب کے سب نیم تاریکی میں بھیگنے لگے اور ایک عجیب الوہی دھند میں ڈوبتے منظر نے اپنی خوابناکی سے ہمیں مسخر کر لیا۔ بٹ گرام کا قصبہ چھم چھم بھیگ رہا تھا اورچپل کبابوں کی گرم خوشبو بازار کی بارش کی ہر بوند میں شامل ہو کر دھو میں اڑاتی پھرتی تھی۔

راولپنڈی رات میں آیا۔ لاہور پہنچے تو دن کی روشنی پھیل رہی تھی۔ راکا پوشی نگر کا یاد گار سفر تمام ہوا۔ کتابِ زندگی کا ایک باب ختم ہوا۔

18/9/13

ا ہم تانگے ہیں؟

مستنصر حسین تارڑ

بہت برس پیشتر انگلستان میں میرے ایک ترک دوست نے ہم پاکستانیوں کے بارے میں کہا تھا کہ مجھے تم لوگوں کی سمجھ نہیں آتی۔ تم ہمیشہ دنیا کے دیگر مسلمانوں کی نسبت اپنے آپ کو اسلام کے چیمپئن ثابت کرتے رہتے ہو۔ دوسروں کے معاملات میں اپنی ٹانگ اڑانا ایک مقدس فرض سمجھتے ہو۔۔۔ جان لو کہ دنیائے اسلام کی سٹیج پر تمہارا کوئی اہم کردار نہیں ہے، تم زیادہ سے زیادہ ایک ایکسٹرا کردار ہو۔۔۔ ظاہر ہے مجھے اس کے اس کومنٹ سے بے حد رنج پہنچا تھا کہ میڈیا سے متعلق ہونے کی وجہ سے میں خوب جانتا تھا کہ ایک ایکسٹرا کیا ہوتا ہے۔۔۔ کسی بھی ڈرامے میں ایک ویٹر جو میز پر چائے رکھ کر چلا جاتا ہے۔ ایک پان فروش جو ڈرامے کے کسی مرکزی کردار کو صرف اتنا کہتا ہے کہ باؤ جی پان کھاؤ گے، یا پھر کسی تاریخی ڈرامے میں دربار میں ساکت کھڑا ایک چوبدار۔۔۔ جب کسی ڈرامے کی کاسٹنگ مکمل ہو جاتی تھی تو پروڈیوسر اپنے اسسٹنٹ سے کہا کرتا تھا کہ سکرپٹ تمام اداکاروں کو پہنچا دو او رچار تانگوں کا بھی بندوبست کر دو۔۔۔ تانگے ٹی وی کی زبان میں ایکسٹرا اداکاروں کو کہا جاتا ہے اور یہ تانگے ٹیلی ویژن کے برآمدوں میں یا گیٹ کے باہر گھومتے پھرتے رہتے تھے کہ جانے کب ہماری ضرورت پڑ جائے۔

تو کیا ہم پاکستانی اسلام کی سٹیج کے تانگے ہیں، ایکسٹرا ہیں جن کا کوئی بنیادی کردار نہیں ہے۔۔۔ میں اس نکتہ نظر سے مکمل طور پر تو متفق نہیں ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ ہم ماضی میں بے حد اہم کردار ادا کر چکے ہیں لیکن ان دنوں مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ وہ تُرک ٹھیک کہتا تھا ہم اپنا گھر تو سنبھال نہیں سکتے او ردوسروں کو اپنے گرانقدر مشوروں سے نوازتے رہتے ہیں، آہستہ آہستہ تانگے ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑانا اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں۔ برما میں مسلمانوں پر ظلم ہوتا ہے تو شدید احتجاج کرتے ہیں لیکن اپنے ہاں عقیدے کے نام پر جو سینکڑوں قتل ہو رہے ہیں، ظلم ہو رہا ہے اس سے چشم پوشی کرتے ہیں، اگر احتجاج ہوتا ہے تو صرف اور صرف اس کمیونٹی کا جس کے افراد کو چن چن کر مارا جا رہا ہے اور یاد رہے اس احتجاج میں قطعی طور پر وہ لوگ شامل نہیں ہوتے جو برما کے مسلمانوں پر ظلم کے حوالے سے پیش پیش ہوتے ہیں۔ ہم اس سلسلے میں بنگلہ دیش کو بھی خوب رگیدتے ہیں کہ

وہ ان مسلمانوں کو پناہ کیوں نہیں دیتا۔ ہمیں دیکھ ہم نے بیس لاکھ افغانیوں کو پناہ دی جن کی وجہ سے پاکستان کی بنیادیں مضبوط ہو گئیں۔ ہیروئن اور کلاشنکوف کا دور دور تک نام و نشان نہیں۔۔۔ اور ہم نے بنگلہ دیش کے کیمپوں میں ذلت کی زندگی گزارنے والے ان بہاریوں کو پناہ دینے کے بارے میں کبھی نہیں سوچا جنہوں نے اپنی پاکستانی شناخت ترک کرنے سے انکار کر دیا۔۔ پچھلے دنوں بنگلہ دیش میں چند بزرگ مذہبی رہنماؤں کو عدالت نے غداری کے جرم میں موت کی سزا دی تو ہماری مذہبی جماعتیں سڑکوں پر آ گئیں اور بنگلہ دیش کی جمہوری حکومت کے خوب خوب لتّے لئے۔۔۔ کیا یہ بنگلہ دیش اور اس کی عدالتوں کا معاملہ نہیں ہے، بے شک ان فیصلوں میں سے انتقام کی شدید بُو آتی ہے لیکن ہمیں مداخلت کا کیا حق ہے۔۔۔ ہم یہ حق اپنے گھر میں سینکڑوں گمشدہ لوگوں کے بارے میں کیوں استعمال نہیں کرتے۔ درہ بابوسر اور شاہراہ قراقرم پر قتل کر دیئے جانے والے معصوم لوگوں کو ہم کیوں اپنی توجہ کا حقدار نہیں سمجھتے، نانگا پربت کے دامن میں ہلاک کئے جانے والے درجن بھر غیرملکی کوہ نوردوں کے لئے کیا کسی نے ایک آنسو بہایا؟ دراصل ہم اپنی اپنی سیاسی وابستگیوں اور مذہب کی اپنی توجیہہ کی روشنی میں کیا ظلم ہے اور کیا نہیں ہے، کا انتخاب کرتے ہیں۔ اگر کوئٹہ میں ایک درجن میڈیکل طالبات ایک خودکش حملے میں ہلاک ہو جاتی ہیں تو یہ ظلم نہیں ہے۔۔۔ انہیں ہلاک کرنے والوں کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں لکھا جاتا جب کہ نہ صرف ملالہ بلکہ اس کا پورا خاندان غدار قرار دیا جاتا ہے۔ باقاعدہ کف افسوس ملا جاتا ہے کہ ہائے ہائے یہ مر کیوں نہ گئی۔۔۔ کیسی گولی تھی جس کا نشان بھی باقی نہیں رہا۔۔۔ دماغ میں گولی لگتی تو مر نہ جاتی۔۔۔ وغیرہ۔۔۔ یو این او میں اس نے جو تقریر کی وہ یقیناًاس کی لکھی ہوئی نہیں تھی لیکن اس میں کون سا ایسا فقرہ تھا جس کے لئے اسے غدار قرار دیا گیا۔۔۔ تقریر کے اختتام پر پوری دنیا سے آئے ہوئے مندوبین اور ان میں مسلمان ممالک بھی شامل تھے اسے ایک سٹینڈنگ اوویشن دی۔۔۔ نیویارک میں متعین ایک پاکستانی سفارت کار کا کہنا ہے کہ ایک مدت بعد ہمیں بھی سر اٹھا کر چلنے کا موقع ملا۔

عرب بہار کی میرے لئے سب سے بڑی خوشخبری آمر حسنی مبارک کا زوال تھا اور محمد مُرسی کا مصری عوام کا متفقہ انتخاب تھا۔۔۔ مصر ایک ایسا ملک ہے جو عرب عوام کے راستے متعین کرتا رہا ہے۔ وہاں جمہوریت کا قیام میرے جیسوں کے لئے باعث مسرت و صد افتخار تھا۔۔۔ اور جب جنرل السیسی نے مُرسی کو معزول کر کے خود اقتدار سنبھال لیا اور ہزاروں لوگوں کو تہ تیغ کر دیا تو میں ایک گہرے رنج میں چلا گیا کہ کیا ہم مسلمان ہمیشہ بادشاہوں اور فوجی آمروں کے شکنجے میں ہی جکڑے رہیں گے۔ بعدازاں مُرسی کی حمایت میں سڑکوں پر نکل آنے والے عوام کو جس بے دردی سے ۔۔۔ جیسے وہ انسان نہ ہوں جانور ہوں ہلاک کیا گیا تو دنیا بھر میں اس کے ردعمل میں شدید احتجاج ہوا۔ یورپی یونین کے ممالک خاص طور پر جرمنی اور سویڈن نے محمد مُرسی کے حق میں بیان دیئے اور کہا کہ قانونی طور پر وہ اب بھی صدر ہیں یہاں تک کہ امریکہ نے بھی مذمت کی چاہے اندرخانے وہ خوش ہوا ہو۔۔۔لیکن یہ سعودی عرب تھا جو سب سے پہلے جنرل السیسی کے اس غیرجمہوری اقدام کی حمایت میں اتنا آگے چلا گیا کہ اس نے جنرل صاحب کو کروڑوں ڈالر کی امداد دینے کا وعدہ کیا۔۔۔ سعودی عرب نے تو محاورۃً گھی کے چراغ جلائے، قطر اور کویت نے بھی کھل کر جنرل کی حمایت کی۔۔۔ قتل عام کے بعد جب پوری دنیا اس وحشیانہ اقدام کی مذمت کر رہی تھی یہ سعودی عرب تھا جس نے جنرل السیسی سے کہا کہ مُرسی کی حمایت میں نکلنے والے سب لوگ دہشت گرد ہیں انہیں ہلاک کرنا جائز ہے۔ پاکستانی عوام اور میڈیا نے بھی جنرل السیسی کی سفاکیت کی کھلے لفظوں میں مذمت کی لیکن ہماری مذہبی جماعتوں کے ساتھ ایک عجیب ٹریجڈی ہو گئی، انہوں نے امریکہ کو موردالزام ٹھہرایا، امریکہ مردہ باد کے نعرے لگائے، محمد مُرسی کی حمایت کا اعلان کیا لیکن وہ سعودی عرب کے خلاف ایک نعرہ بھی بلند نہ کر سکے جو دراصل جنرل السیسی کا سب سے بڑا سپورٹر تھا، ہمہ وقت اسے ہلاشیری دیتا تھا کہ فکر نہ کرو میں تمہارے ساتھ ہوں۔۔۔ کیا کسی جماعت نے سعودی عرب کے سفارت خانے کے باہر کوئی مظاہرہ کیا۔۔۔ نہیں بالکل نہیں۔۔۔ وہ اس کی ناراضی مول لینا افورڈ نہیں کر سکتے تھے اس میں نقصان بہت تھا۔۔۔ بقول کسے کیا یہ ایک کھلا تضاد نہیں۔۔۔ دراصل مصر میں اخوان کی کامیابی نے پاکستان کی مذہبی جماعتوں کے دلوں میں اُمید کے چراغ روشن کر دیئے، محمد مُرسی کو

پاکیزہ عظمت کے میناروں پر چڑھا دیا گیا اور اخوان کو ایک آسمانی جماعت قرار دیا گیا اور قطعی طور پر اس حقیقت کو نظرانداز کر دیا گیا کہ محمد مُرسی کو صرف اخوان نے نہیں بلکہ تمام ایسی قوتوں نے ووٹ دیئے جو مصر میں جمہوریت کی بقا چاہتی تھیں اور جس کے لئے انہوں نے بھی بے شمار قربانیاں دی تھیں۔ اس کے علاوہ اخوان نے اپنی طویل جدوجہد کے دوران بے مثال استقامت کا مظاہرہ کیا، ان کے کارکنوں کو جیلوں میں ڈالا گیا، موت کے گھاٹ اتارا گیا لیکن انہوں نے کبھی بھی کسی آمر یا فوجی ڈکٹیٹر کے ساتھ مفاہمت نہیں کی، اپنے مؤقف پر ڈٹے رہے، اقتدار کے لالچ میں کسی آمر یا فوجی کی گود میں نہیں جا بیٹھے۔۔۔ جبکہ پاکستان کی بیشتر مذہبی جماعتیں۔۔۔ آپ سیانے ہیں تھوڑے لکھے کو بہتا سمجھیں، اُمید ہے سمجھ گئے ہوں گے۔

فی الحال محمد مُرسی کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا ہے۔۔۔ کوئی بھی جنرل آتا تو نوے دن کے لئے ہے لیکن جاتا سی وَن تھرٹی کی مرضی سے ہے۔۔۔ اگر برادر عرب یونہی جنرل السیسی کی پشت پناہی کرتے اسے مالامال کرتے رہیں گے، فوج، پولیس، انتظامیہ اس کے ساتھ ہے تو وہ آسانی سے تو نہ جائے گا۔۔۔ ہمیں اگلی عرب بہار کا انتظار کرنا ہو گا۔۔۔ کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر۔ (جاری

23/9/13

ہم ہیں چراغِ آخرِ شب

مستنصر حسین تارڑ

22-10-2013

کچھ برس پیشتر جرمن حکومت کے قائم کردہ ایک ادبی ادارے ”لٹریٹر ورک سٹاٹ“ نے مجھے میرے ناول ”راکھ“ کے حوالے سے سرکاری طور پر مدعو کیا۔۔۔ ایک محفل میں ”راکھ“ کے دو ابواب کا جرمن ترجمہ ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا۔ پروفیسر کرسٹینا آسٹنملڈ جو ہائڈل برگ یونیورسٹی میں جنوب مشرقی ایشیائی زبانوں کے شعبے کی انچارج ہیں ”راکھ“ کے بارے میں مضمون پڑھنے کے لئے خصوصی طور پر تشریف لائیں۔ اپنے افتخار عارف اور ندا فاضلی بھی مشاعرے کے لئے مدعو تھے۔۔۔ میں اور افتخار اکثر کسی تُرک کھوکھے سے دوپہر کا کھانا کھاتے کہ برلن کے ہر کونے میں تُرک شوارما اور سلاد کے کھوکھے مل جاتے ہیں۔ یہ سادہ خوراک جرمنوں کو بھی مرغوب ہے۔۔۔ ایک ایسے ہی کھوکھے پر ایک پاکستانی صاحب آتے ہیں اور تُرک سے کہتے ہیں ”یہ گوشت حلال ہے؟“ تُرک سینے پر ہاتھ باندھ کر جواب دیتا ہے کہ الحمدللّٰہ حلال ہے۔۔۔ پاکستانی شوارما خریدنے کے بعد کہتے ہیں ”بیئر کا ایک ٹِن بھی دے دو“ ترک مسکراتے ہوئے انہیں بیئر کا ٹن تھماتا ہے اور شرارت سے کہتا ہے ”برادر یہ حلال نہیں ہے“۔۔۔ اس پر پاکستانی ذرا طیش میں آ کر کہتے ہیں ”میں نے تم سے اس کے بارے میں پوچھا ہے کہ یہ حلال ہے یا نہیں“۔۔۔ ویسے یہ جواب بھی کمال کا تھا کہ بھئی میں نے گوشت کے بارے میں پوچھا تو تم نے بتا دیا۔۔۔ اس کے بارے میں تو پوچھا ہی نہیں۔۔۔ ویسے یہ قصہ کتنی خوبصورتی سے ہمارے قومی کردار کی عکاسی کرتا ہے۔۔۔ اور یہی ظاہر کرتا ہے کہ ہم دنیا کی سٹیج پر صرف ایک ایکسٹرا ہیں، ایک تانگے ہیں۔

اور ہاں محمد مُرسی کے حق میں نکالے گئے جلوسوں میں مذہبی جماعتوں کے کارکن نعرے لگا رہے تھے کہ مُرسی کو عوام نے منتخب کیا، وہ جمہوری انداز میں برسراقتدار آیا جب کہ السیسی ایک فرعون ہے، غاصب ہے۔۔۔ میں ان نعروں سے سو فیصد متفق ہوں لیکن ایک خیال نے مجھے مسکرانے پر مجبور کر دیا۔۔۔ بھٹو بھی تو ایک منتخب وزیراعظم تھا اور ضیاء الحق ایک غاصب لیکن انہی کارکنوں نے بھٹو کے خلاف نعرے لگا کر اپنے پسندیدہ فرعون کا استقبال کیا، کیا یہ کُھلا تضاد نہیں ہے۔۔۔کچھ عرصہ پہلے تک مجھ سے ملنے والے پہلا سوال یہ پوچھتے تھے کہ تارڑ صاحب آپ کی صحت کیسی ہے اور ان دنوں کیا لکھ رہے ہیں۔ اب پہلا سوال یہ پوچھا جاتا ہے کہ تارڑ صاحب پاکستان کا کیا بنے گا تو میں تفصیلی تجزیہ پیش نہیں کرتا بلکہ کہتا ہوں کہ پاکستان کا جو کچھ بننا تھا بن چکا۔۔۔ جب کبھی کوئی ملک اپنی کرتوتوں اور حماقتوں کی وجہ سے

تنزل کے گڑھے میں گرتا ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ وہ دنیا کے نقشے سے غائب ہو جاتا ہے، بحیرہ عرب میں ڈوب جاتا ہے یا ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے، وہ موجود تو رہتا ہے لیکن دنیا بھر میں اس کی یہ ناکام موجودگی ناموجودگی میں بدل جاتی ہے۔۔۔ افریقہ کے بے شمار ملکوں کی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔۔۔ ہمارے تقریباً تمام ادارے ناکام ہو چکے ہیں، ہماری نالائقی اور کرپشن نے انہیں کھنڈر کر دیا ہے۔۔۔ پی آئی اے، پاکستان ریلویز، سٹیل مل، امن عامہ کی صورت حال، ہمار ی سرحدیں اور دنیا بھر میں ہماری ماشاء اللہ نیک نامی۔۔۔ اور ذرا دیکھئے کہ قومی زوال کیسے کھیلوں پر بھی اثرانداز ہو رہا ہے۔ کرکٹ زیرو ہو چکی اور ہاکی جس پر ہم فخر کرتے تھے اب ہم کسی بڑے ٹورنامنٹ میں شریک تو کیا ہوں گے ہم اس کے لئے کوالیفائی بھی نہیں کر پاتے۔ ابتدائی میچوں میں ہی باہر ہو جاتے ہیں۔۔۔ اور یہ عذاب کہیں باہر سے نازل نہیں ہوا۔۔۔ شعلہ جس نے مجھے پھونکا میرے اندر سے اٹھا۔۔۔ وہ سب جو اس تنزل کے ذمے دار ہیں وہ سب ہم میں موجود ہیں اور ان کا تعلق صرف سیاست دانوں یا اہل اقتدار سے ہی نہیں ہے معاشرے کے ہر طبقے سے ہے۔۔۔ پٹواری اور تھانیدار سے لے کر وزارتوں کی تمام سطح تک۔۔۔ اور یہ لاکھوں کی تعداد میں ہیں، اتنا کچھ صرف چند ہزار افراد ہڑپ نہیں کر سکتے۔۔۔ ان گِدھوں نے پاکستان کی بوٹیاں نوچ کھائیں، اب اس کے ڈھانچے کے گرد پھڑپھڑاتے مگرمچھ کے آنسو بہا رہے ہیں۔۔۔ اور مجھ سے یہ بھی پوچھا جاتا ہے کہ آخر اس تنزل کا بنیادی سبب کیا ہے تو میں صرف ایک فقرہ کہتا ہوں ”ہم نے پاکستان سے پیار نہیں کیا“۔۔۔ ہم سارا جہاں ہمارا کے سراب میں مبتلا رہے اور اپنے جہان کی کچھ قدر نہ کی۔۔۔ ہم تو اس کے جغرافیے سے بھی آگاہ نہیں ہیں۔ ہم نے وطن پرستی کے جذبے کو عقیدے کی رُو سے ناجائز قرار دیا، نہ اس سرزمین سے محبت کی اور نہ اس دھرتی کو اپنی ماں کا درجہ دیا۔۔۔ اگر ایسا کرتے تو اپنی ماں کی بوٹیاں نوچ نہ کھاتے، کچھ تو شرم کرتے۔۔۔ اور ہاں میں یہ عرض کر دوں کہ اگر خدانخواستہ اس ملک کو کچھ ہوتا ہے تو بوٹیاں نوچنے والے تو آرام سے اپنے ہیلی کاپٹروں یا ذاتی جہازوں میں سوار سپین، فرانس، انگلستان اور امریکہ میں اپنے محلات، قلعوں اور شاہانہ رہائش گاہوں میں منتقل ہو جائیں گے۔ یہ سب گِدھ جو نہ صرف اس وطن کی بلکہ ہماری بوٹیاں نوچ نوچ کر اپھرائے گئے ہیں پھڑپھڑاتے ہوئے کوچ کر جائیں گے۔ اور ہم جیسے ایرے غیرے ماتم کرنے کے لئے رہ جائیں گے بلکہ ہمیں مطعون کیا جائے گا کہ یہ سب تمہارے اعمال کی سزا ہے۔۔۔ گناہوں کا نتیجہ ہے۔۔۔ بلکہ یہ بھی کہا جائے گا کہ یہ سب تمہارے سیکولر نظریات، روشن خیالی اور ترقی پسندی کا شاخسانہ ہے۔۔۔ ہم نہ کہتے تھے۔

میں شاید یہ قصہ پہلے بھی بیان کر چکا ہوں لیکن قصۂ پارینہ کو موجودہ صورت حال کے حوالے سے دوہرانے میں کچھ حرج نہیں۔۔۔ اور یہ قصہ اُن دنوں کا ہے جب ایک جانب سے ”ایشیا سُرخ ہے، سُرخ ہے“ کے فلک شگاف نعرے لگتے تھے اور دوسری جانب سے ”ایشیا سبز ہے، سبز ہے“ کے نعرے جواب میں آتے تھے لیکن نظریاتی اختلاف کے باوجود بعدمیں دونوں فریق ایک ہی میز پر بیٹھ کر چائے پیتے تھے، کلاشنکوف اور خودکش بمبار ابھی ایجاد نہ ہوئے تھے۔ میں ان دنوں لاہور کے حلقۂ ارباب ذوق کا سیکرٹری منتخب ہوا تھا اور گیسو دراز اختر کاظمی میرا نائب سیکرٹری تھا۔ حلقے کے ایک ہفتہ وار اجلاس کی صدارت بابا ظہیر کاشمیری کر رہے تھے جو نظریاتی طور پر بائیں بازو سے تعلق رکھتے تھے اور کمال کے شاعر اور دانشور تھے۔۔۔ کسی بھی موضوع پر بولتے تو ہر جانب سناٹا چھا جاتا، ہسپانوی خانہ جنگی ان کا محبوب موضوع تھا، ساری عمر انقلاب کے خواب دیکھتے رہے، اپنے نظریا ت پر قائم رہے اور کبھی ان کو فروخت کر کے اپنے آپ کو آسودہ نہ کیا جیسا کہ کچھ انقلابیوں نے کیا۔۔۔ تقریباً عسرت زدہ زندگی بسر کی اور بیڈن روڈ کے ایک تنگ مکان میں مر گئے۔۔۔ تو اُس اجلاس میں مجھے ٹھیک طرح سے یاد نہیں کہ اختلاف کیسے شروع ہو گیا۔ ایک صاحب افسانہ پڑھ رہے ہیں کہ جہاں تک نظر جاتی تھی سبزہ ہی سبزہ تھا تو انقلابی حضرات اعتراض کر دیتے کہ صاحب افسانہ رجعت پسند ہے اسے ہر طرف سبز ہی سبز نظر آتا ہے۔۔۔ اُدھر کسی شاعر نے آزاد نظم پیش کرتے ہوئے کوئی اس نوعیت کا مصرع پڑھ دیا کہ ۔۔۔ ٹریفک لائٹ سرخ ہو چکی تھی تو رجعت پسند حضرات سیخ پا ہو جاتے کہ یہ تو سرخ انقلاب کا نعرہ ہے۔ بہرطور اس شب بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا اور شدید بحث شروع ہو گئی اور ”سرخ ہے سرخ ہے“ اور ”سبز ہے سبز ہے“ کے نعرے لگنے لگے۔۔۔ بابا ظہیر

کاشمیری نے کچھ دیر تو ضبط کیا اور پھر گرج کر کہنے لگے، اوئے کمبختو چپ ہو جاؤ۔۔ سب حضرات فوراً چپ ہو گئے۔ ظہیر صاحب کہنے لگے "اوئے کمبختو۔۔ پاکستان ایک گھوڑا ہے اور تم لوگ آپس میں لڑ مر رہے ہو کہ اس پر سرخ کاٹھی ڈالنی ہے یا سبز۔۔ بھئی پہلے گھوڑے کی صحت کا خیا ل کرو۔۔ اسے خوب کھلا پلا کر موٹا تازہ کر لو پھر جونسی کاٹھی چاہے اس پر ڈال لینا۔ اوئے بیوقوفو اگر یہ گھوڑا مر گیا تو پھر کاٹھی کس پر ڈالو گے۔ ان دنوں بھی یہی حال ہے کہ گھوڑے کی کسی کو کچھ پروا نہیں۔۔۔ دوسروں کے گھوڑوں کی بڑی فکر ہے۔۔ مصر ، شام، ترکی، سعودی عرب وغیرہ کی بہت فکر ہے، اپنا گھر سنبھلتا نہیں اور دوسروں کو مشورے دے رہے ہیں۔ بھئی اگر اپنا گھوڑا مر گیا تو کاٹھی اسلام کی، جمہوریت کی یا آمریت کی کس پر ڈالو گے بیوقوفو۔

ظہیر کاشمیری کا کلاسیک شعر آپ نے سن رکھا ہو گا کہ:

ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغ آخر شب

ہمارے بعد اندھیرا نہیں اُجالا ہے

مجھے تو محسوس ہو رہا ہے کہ ہمارے بعد بھی اندھیرا ہی ہے۔ اجالا ہمارے نصیب میں کہاں!

25/9/13

اس شہرِ سنگدل کو جلا دینا چاہئے۔۔۔ پشاور

مستنصر حسین تارڑ

میں چوہتّر برس کا ایک ڈھیٹ بچہ ہوں۔۔۔ میں شروع سے ڈھیٹ نہیں تھا بلکہ بے حد حساس بچہ تھا، کسی غمزدہ کی آنکھ میں سے ایک آنسو گرتا تھا تو میری آنکھوں سے آنسوؤں کی آبشاریں گرنے لگتی تھیں، میں اتنا دکھی ہو جاتا تھا۔۔۔ میں اتنا حساس بچہ ہوا کرتا تھا لیکن مجھے ڈھیٹ بنا دیا گیا۔۔۔ کیسے بنا دیا گیا میں ابھی عرض کرتا ہوں۔۔۔ آپ سب جو بچوں والے ہیں اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ شاید مار پیٹ سے کوئی ایک بچہ سدھر بھی جاتا ہو اور اس نے مار پیٹ کے بغیر بھی سدھر جانا تھا لیکن کچھ بچے ایسے ہوتے ہیں کہ وہ پہلے تھپڑ پر خوب چیختے چلاتے ہیں، فریاد کرتے ہیں اور جب تھپڑوں کی بوچھاڑ روزانہ کا معمول ہو جاتی ہے تو آہستہ آہستہ وہ اس کے عادی ہو جاتے ہیں۔۔۔ آپ انہیں مارتے ہیں تو وہ بے خوفی سے آپ کو گھورتے رہتے ہیں، ان پر کچھ اثر نہیں ہوتا وہ ڈھیٹ ہو جاتے ہیں، ان کا بدن پتھر ہو جاتا ہے یہاں تک کہ ان کی آنکھیں بھی خشک رہتی ہیں اور مارنے والا مزید اشتعال میں آتا ہے کہ میرے ہاتھ تھک گئے ہیں، میری ہتھیلیاں سوج گئی ہیں اسے تھپڑ مارتے مارتے اور اس پر کچھ اثر ہی نہیں ہوتا۔۔۔میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی سانحہ ہوا ہے۔۔۔ چوہتّر برس کی عمر میں آ کر میں مکمل طو رپر ڈھیٹ ہو چکا ہوں، مجھ پر بھی کچھ اثر نہیں ہوتا۔ میرے ڈھیٹ ہو جانے کی داستان بہت طویل ہے اور آپ سب اس داستان سے واقف ہیں۔۔۔ شاید اس ڈھٹائی کا آغاز غریب محنت کش عیسائیوں کے شانتی نگر کو یوں جلا دینے سے ہوا کہ اس کی راکھ کریدنے والا بھی کوئی نہ رہا کہ اس راکھ میں بچوں اور عورتوں کی ہڈیاں سلگتی تھیں۔ کلیساؤں کی صلیبوں کے ٹکڑے اور بائبل کے جلے ہوئے اوراق دفن تھے۔۔۔ پھر گوجرہ میں بھی اس سانحے کا ایکشن ری پلے ہوا۔۔۔ اور تب چونکہ میں ابھی ڈھیٹ نہ ہوا تھا میں بہت آزردہ ہوا اور شرمندگی کی چادر اوڑھ کر آنسو بہاتا رہا۔۔۔ اور جب مساجد اور امام بارگاہوں میں عبادت گزاروں کے بدنوں کے لوتھڑے نزدیکی درختوں سے چپک کر یوں خون سے رسنے لگے کہ ان پر سرخ پھولوں کی میت کا گمان ہونے لگا تب بھی مجھے دکھ ہوا لیکن میری آنکھوں سے آنسو کم نکلے۔۔۔ اور ہاں میں آپ کو اپنے ایک دکھ میں شریک کر لوں، میں اتنا ڈرپوک ہو گیا کہ پچھلی عید پر حسب سابق میرے دونوں پوتے کُرتے شلواریں پہن کر، زری کے کُھسّے پاؤں میں

سجا کے تیار ہوئے کہ ہم دادا کے ساتھ عید کی نماز پڑھنے جائیں گے تو میں ڈرپوک ہو گیا، میرے دل میں ایک سہم جاگزیں تھا کہ کیا پتہ عید کی نماز کے موقع پر ہماری مسجد پر خودکش حملہ ہو جائے اور ایسا ہو چکا تھا تو میں زندگی میں پہلی بار اپنے پوتوں کو گھر چھوڑ گیا، میں اتنا ڈرپوک ہو گیا۔۔ اور میں نے سوچا کہ وہ کیسے لوگ ہیں جو آج کے بچوں کو مسجدوں سے دور رکھنے پر ہمیں مجبور کرتے ہیں، کیا ان معصوم بچوں کو اپنی اسلامی تہذیب اور شاندار ثقافت سے آگاہ ہونے، اس میں شریک ہونے کا حق حاصل نہیں۔۔
اور جب میں اپنے پوتوں کو گھر چھوڑ گیا کچھ بہانے بنا کر اور اپنے بیٹے کے ہمراہ عید کی نماز پڑھنے تو وہاں ہم محافظوں کی بھری ہوئی کلاشنکوفوں کے سائے میں نماز پڑھتے تھے، اور اس دوران کہیں پتا بھی کھڑکتا تو نمازی چوکنے ہو جاتے۔ تو کیا یہ صورت حال میرے لئے ایک تھپڑ سے کم نہیں۔۔ نوشہرہ میں ایک بے حد قدیم چرچ نذرآتش کر دیا گیا اور ٹیلی ویژن سکرین پر جلے ہوئے بائبل کے اوراق تھے، حضرت عیسٰے کی شبیہیں تھیں۔۔ پھر سوات میں ایک سکول ویگن یوں جلتی تھی کہ اس میں سوار سکول کی بچیاں بھی شعلوں کی مانند جلنے لگیں۔۔ وہ راکھ ہو گئیں۔۔ پشاور میں دو اپاہج بچیاں اور ان کی ماں انہیں نہلا دھلا کر کہ وہ خود نہا نہیں سکتیں، یونیفارم پہنا کر سکول ویگن میں بٹھاتی ہے اور اس ویگن کو بھی جلا دیا جاتا ہے۔ اپاہج بچیوں کو ہلاک کرنا کتنا بڑا کارنامہ ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ :سلسلہ ٹوٹا ہی نہیں درد کی زنجیر کا۔۔ ہمارے جری فوجی جوانوں کے خون آلود سر کھمبوں پر آویزاں ہیں، انہیں ذبح کرنے کی ویڈیو جاری کی جا رہی ہے اور پاک فوج کے ایک میجر جنرل کو ہلاک کیا جا رہا ہے۔ کوئٹہ میں نہ صرف ہزار لوگوں کو بیدردی سے قتل کیا جا رہا ہے بلکہ میڈیکل کالج کی بارہ طالبات کے بدن بارود سے مردہ کر دیئے جاتے ہیں۔ ہسپتال پر یلغار کے دوران چار نرسیں ہلاک کر دی جاتی ہیں اور اس شام کوئٹہ کے صحنوں میں سولہ معصوم بچیوں کی لاشیں پڑی ہیں۔ تین ایم اے اسلامیات کی طالبات اسلامیہ یونیورسٹی اسلام آباد میں زیرتعلیم ایک خودکش حضرت کے مقدس بم سے مردہ دلہنیں بن جاتی ہیں کہ ان کے چہرے اور ہاتھوں پر خون کی مہندی رچی ہے۔ درّہ بابوسر پر عقیدے کے نام پر قتل عام اور نانگا پربت کے دامن میں غیرملکی کوہ پیماؤں کی ہلاکت اور ان کا یقین مانئے ڈرون حملوں اور عافیہ صدیقی سے کچھ تعلق نہ تھا۔۔ چنانچہ آپ جان گئے ہوں گے کہ مجھے کتنی مار پڑ چکی ہے۔ میرا بدن کتنے دکھ سہہ چکا ہے اور میری آنکھیں کیوں خشک ہو چکی ہیں۔ ان میں نمی کا ایک قطرہ بھی کیوں موجود نہیں ہے۔ انسان کتنا روئے، کہاں تک روئے کہ آنکھوں میں بھی تو آنسوؤں کی فیکٹری تو نہیں لگی ہوئی، ایک محدود مقدار ہے۔
اسی لئے جب میں نے پشاور کے ایک قدیم کلیسا میں عبادت کے لئے جمع ہونے والے لوگوں، بچوں اور بوڑھوں کے اسّی کے قریب لاشے دیکھے۔۔ ان پر بین کرنے والی بال نوچتی عورتوں اور فرش پر موت کی شدت سے نڈھال نوجوانوں کو تڑپتے دیکھا تو یقین کیجئے مجھ پر کچھ اثر نہ ہوا۔۔کہ میں چوہتّر برس کا وہ بچہ تھا جو ڈھیٹ ہو چکا تھا بلکہ اُلٹا مجھے ان پر غصہ آ رہا تھا کہ ان صرف اسّی لاشوں نے میری شام غارت کر دی تھی، میں اچھا بھلا ٹیلی ویژن پر کترینہ کیف کی ”چکنی چھبیلی " کے چکنے پن سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور ان لاشوں نے میری شام کی لطف اندوزی کا ستیاناس کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ مجرموں کو کیفرکردار تک پہنچایا جائے گا سرکاری بیان آ رہے تھے۔ اور وہ مجرم جو ان کے پاس محفوظ تھے ان کو تو کیفرکردار تک پہنچانے میں دشواریاں تھیں تونئے مجرموں کو گرفتار کرنا بھی تو وقت کا زیاں تھا۔ اور یہ بھی سورج کی مانند روشن ہے کہ یہ حملہ اسلام کے خلاف ایک سازش ہے۔۔ ویسے مجھے کسی اور سے کچھ شکایت نہیں، نہ دربار سرکار سے، نہ علماء کرام سے، شکایت ہے تو ان اسّی لاشوں سے جنہوں نے یہ چکنی چھبیلی شام غارت کر دی۔
جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہو گا
کُریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے
مت کُریدو۔۔ راکھ مت کُریدو۔۔ کہ اسی میں عافیت ہے۔
:میں ایک چوہتّر برس کا وہ بچہ ہوں جو ڈھیٹ ہو چکا ہے۔۔ جسے منیر نیازی کا ایک شعر یاد آ رہا ہے

اس شہر سنگ دل کو جلا دینا چاہئے
پھر اس کی راکھ کو اُڑا دینا چاہئے

29/9/13

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

مستنصر حسین تارڑ

کبھی کبھار برس دو برس بعد کوئی ایسی خبر آجاتی ہے کہ مجھے ایک انسان ہونے پر فخر ہونے لگتا ہے کہ بے شک ہم مسلمانوں نے پچھلے شاید پانچ سو برس سے ایک نیل کٹر بھی ایجاد نہیں کیا، کوئی ایسی دوا دریافت نہیں کی جو نسل انسانی کی بیماریوں کی تریاق ہو جائے۔ چیچک یا پولیو کا خاتمہ کر دے ، کروڑوں انسانوں کو موت کے منہ سے بچا لے، بجلی کا ایک بلب ایجاد کرنا تک ہمارے بس میں نہ ہوا لیکن اس کے باوجود میں اس روئے زمین پر آباد انسانوں میں سے ایک ہوں، انسانیت کا حصہ ہوں ، اس لیے مجھے اپنے انسان ہونے پر فخر ہوا جب میں نے یہ خبر پڑھی کہ 1977ء میں وائجر نام کا یعنی مسافر نام کا جو خلائی جہاز امریکہ نے لانچ کیا تھا، جو بدستور سفر میں تھا، پچھلے ہفتے نظام شمسی کی حدود پار کر گیا ہے ایک اور نظام میں ایک اور جہان میں داخل ہو گیا ہے۔ اور مجھے قاسمی صاحب کا وہ مصرع یاد آ گیا کہ انسان عظیم ہے خدایا۔۔۔ اور مجھے علامہ اقبالؒ تو بہر طور یاد آئے جنہوں نے کہا تھا کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں، ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔ بے شک ہم اس شعر کو قوالیوں کی صورت تالیاں بجاتے الاپتے رہے اور کفار ستاروں سے آگے کے جہانوں میں چلے گئے۔۔۔ لیکن جیسا کہ چاند پر قدم رکھنے والے پہلے انسان نیل آرمسٹرانگ نے کہا تھا کہ یہ ایک چھوٹا سا قدم ہے اور انسانیت کے لیے یہ ایک جست ہے تو اسی طور وائجر اگر نظام شمسی کے اربوں کلو میٹر کے فاصلے طے کر کے اس کی سرحدوں کے پار کے جہانوں میں داخل ہو گیا ہے تو کسی ایک قوم کی نہیں پوری انسانیت کی فتح ہے۔ اور کیا کروں مجھے اس موقع پر نہ صرف قاسمی صاحب اور اقبال یاد آتے ہیں بلکہ لائل پور کے بے مثل مزاحیہ شاعر عبیر ابو ذری بھی یاد آنے لگتے ہیں جنہوں نے کہا تھا کہ۔۔۔ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ پرے سے پراں سے پراں اور بھی ہیں۔۔۔ اور اس پراں سے پراں کا بھی کچھ جواب نہیں جس میں لامحدود وسعتوں کی کیسی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے۔ یعنی پرے سے پرے اور اُس سے بھی پرے جہاں اور بھی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور خبر بھی دل کا عجب حال کر گئی کہ ناسا نے 2023ء کے لگ بھگ ایک ایسا خلائی جہاز مریخ کی جانب روانہ کرنے کی منصوبہ بندی شروع کر دی ہے جس میں مختلف قومیتوں کے چالیس مسافر سوار ہوں گے۔ تقریباً ایک لاکھ امیدواروں کی درخواستیں موصول ہو چکی ہیں (غیب کا علم نہ جاننے کے باوجود میں بتا سکتا ہوں کہ ان میں کوئی ایک بھی پاکستانی نہ ہو گا۔۔۔ بلکہ کوئی ایک بھی مسلمان ہوا تو مجھے حیرت ہو گی کہ ان میں سے چنیدہ لوگوں کو پورے آٹھ برس ٹریننگ دی جائے گی کہ مریخ پر پہنچ کر انہوں نے زندگی کیسے گزارنی ہے، سانس کیسے لینا ہے، کھانا کیا ہے، سونا جاگنا کب ہے، بچے کیسے پیدا کرنے ہیں، اپنی خوراک کا بندوبست کیسے کرنا ہے کہ یہ ایک ون وے ٹکٹ ہے۔ مریخ پر جو جائے گا واپس نہیں آئے گا، وہیں آباد ہو گا، ایک تازہ بستی آباد کرے گا، یہ چالیس مختلف اقوام کے لوگ ہی اہل نظرہوں گے۔ چند برس پیشتر میں ڈزنی لینڈ کی وسیع تفریح گاہ میں واقع خلائی تحقیق کے ایک حصے میں گیا تھا اور ان دنوں وہاں ”مریخ تک کا سفر“ نامی تصوراتی سفر بہت پاپو لر تھا۔ آپ ایک ایسی سرنگ میں داخل ہوتے ہیں جہاں ہر جانب سیارے گردش میں ہیں، چاند ابھرتے ہیں، زمین کی گردش کی آواز آتی ہے ۔ پھر ایک ٹرین میں سفر کرتے ہوئے اپنے ذاتی خلائی کیپسول تک پہنچتے ہیں جس میں صرف تین لوگوں کی گنجائش ہے۔ کمانڈر، انجینئر اور نیوی گیٹر۔ آپ اپنی نشستوں پر بیٹھے ہیں تو کیپسول کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ آپ کے سامنے ایک سکرین پر آپ کے کیپسول کو خلاء میں لے جانے والا راکٹ فائر ہوتا ہے۔ اور زلزلہ سا آجاتا ہے اور آپ خلا میں تیرنے لگتے ہیں۔ ایک عجیب بے وزن کی کیفیت میں چلے جاتے ہیں۔ کمانڈر کی نشست پر

بیٹھے ہوئے یکدم کیا دیکھتا ہوں کہ ہم چاند کی سطح سے ٹکرانے کو ہیں تو کمانڈ ملتی ہے کہ راکٹ نمبر دو اور تین فائر کر دو۔ میں بٹن دباتا ہوں تو ایک مہیب آواز سے راکٹ فائر ہوتے ہیں اور ہمارا کیپسول رخ بدل کر مریخ کی جانب بے آواز سفر کرنے لگتا ہے اور پھر ہم مریخ کی سُرخ سر زمین پر لینڈ کر جاتے ہیں۔۔۔ اور یہ تصوراتی سفر اتنا حقیقی تھا کہ میں بھی یقین کر بیٹھا کہ میں واقعی مریخ پر اتر چکا ہوں۔۔۔ اور تب مجھے ایک عجیب احمقانہ سا خیال آیا کہ اگر یہاں کوئی حادثہ ہو جائے، میرا دل تھم جائے اور مجھے مریخ کی سُرخ مٹی میں دفن کر دیا جائے تو میری قبر پر جمعرات کی جمعرات کوئی چراغ بھی جلانے نہ آئے گا کہ کون اتنا تردد کرے کہ زمین سے کسی خلائی جہاز میں سوارہو کر مریخ پر صرف اس لیے آئے کہ میری قبر پر ایک چراغ جلائے۔

میں موازنہ نہیں کرنا چاہتا کہ وہ کہاں پہنچ رہے ہیں اور ہم کہاں گر رہے ہیں۔۔۔ بچوں کو لولا لنگڑا ہونے سے بچانے کے لیے پولیو کے قطرے پلانے والے معصوم اور محسن لوگوں کو ہلاک کر رہے ہیں۔ سکول جانے والی بچیوں کی ویگن کو نذر آتش کر رہے ہیں اور تو اور ہمیں ابھی تک چاند تلاش کرنے میں شدید دشواری در پیش ہے۔ رویت ہلال سے، ہلال کمیٹی میں شامل درجنوں جید علماء۔۔۔ اور یہ سب کے سب نہایت اونچے گریڈوں میں اپنی ریشیں سہلاتے ہیں۔ سرکاری شوفر ڈرون گاڑیوں میں گھومتے ہیں۔ جہازوں میں بزنس کلاس میں سرکاری خرچے پر سفر کرتے ہیں اور فائیو سٹار ہوٹلوں میں قیام کرتے ہیں۔۔۔ پوری قوم کو صرف چاند کی تلاش میں یرغمال بنا لیتے ہیں بلکہ آپ سب بھی گواہ ہیں کہ پچھلی عید کی شب جب د وٹیلی ویژن چینلز پر ملتان اور کوئٹہ میں نمودار ہونے والا چاند براہ راست سکرین پر دکھایا جا رہا تھا تو بھی تلقین کی جا رہی تھی کہ حضرات صبر اور تحمل سے کام لیجیے۔ ابھی شہادتیں موصول ہو رہی ہیں اور پھر ہم حتمی اعلان کریں گے کہ چاند نظر آیا یا نہیں۔۔۔ میرے ابا جی کے دوست علامہ انڈوں والے کشمیری جنہوں نے مدراس کے ایک مندر میں ہندو بن کر ستاروں کا علم حاصل کیا تھا۔۔۔ اور وہ اپنی کوٹھڑی میں پہنچ کر نماز پنجگانہ بھی اداکرتے تھے، اُن کا کہنا تھا کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ پتہ نہیں آج چاند نظر آئے گا یا نہیں وہ منکر قرآن ہیں کہ قرآن میں درج ہے کہ یہ پورا نظام ایک طے شدہ تنظیم کے تحت چلتا ہے۔ یہاں تک کہ ہمارے رسول محمدؐ جب اپنے پیارے بیٹے حضرت ابراہیم کو دفن کر چکے تو سورج گرہن لگ گیا اور بعض لوگوں نے کہا کہ چونکہ آج ایک پیغمبر کے بیٹے کی موت ہوئی ہے تو اس لیے ایسا ہوا ہے۔۔۔ اس پر ہمارے رسولؐ نے صحابہؓ کو خبردار کیا کہ جان لو۔۔۔ یہ سورج چاند ستارے ایک طے شدہ نظام کے ماتحت ہیں، ان پر کسی پیغمبر کے بیٹے کی موت کا بھی کچھ اثر نہیں ہوتا۔ علامہ انڈوں والے کشمیری چاچا نے مجھے ایک کاغذ پر اگلے دس برس میں عید کے چاند کے طلوع ہونے کی تاریخیں لکھ دیں اور کہا کہ بیٹے اگر ان میں سے کوئی بھی تاریخ غلط ثابت ہوجائے تو بے شک اگر میں مر گیا تو میری قبر پر آکر مجھ پر لعن طعن کرنا۔۔۔ اور کیا مجھے کہنے کی ضرورت ہے کہ اُن کا ستاروں او ر چاند کے طلوع کا حساب کتاب کبھی غلط ثابت ہوا؟ نہیں !کبھی نہیں

موہنی روڈ کے بُغدا سائیں ہمہ وقت بھنگ گھوٹتے اور پیتے تھے۔ کسی نے کہا کہ بُغدا۔۔۔ دنیا تو چاند پر پہنچ گئی ہے اور تم ابھی تک یہاں ہو تو اس نے کہا ”بس مجھے بھنگ کا یہ آخری پیالہ پی لینے دو اس کے بعد میں بھی وہاں جا رہا ہوں“۔

تو ہم دراصل بُغدا سائیں ہیں۔ ہمارے پیالے میں مذہبی شخصیت، منافرت، جہالت اور ماضی کے تکبر کی بھنگ گھلی ہوئی ہے، ہم ذرا اس کو پی لیں پھر ہم بھی مریخ میں جا آباد ہوں گے۔۔۔ بھنگی اہل نظر

2/10/13

کاشغر گوادر ٹرین۔۔۔ ایک سراب

مستنصر حسین تارڑ

ان دنوں بلٹ ٹرین کا بہت چرچا ہے کہ ہم لاہور سے کراچی تک بُلٹ ٹرین چلا دیں گے۔۔۔ بھئی کیسے چلا دیں گے ہمیں بھی تو کچھ علم ہو۔۔۔ کیا یہ پرانے ریلوے ٹریک پر چلائی جائے گی یا اس کے لئے ایک نیا ٹریک بچھایا جائے گا۔۔۔ پرانے ٹریک کا تو یہ حال ہے کہ اس پر ڈنکی ٹرین نہیں چل سکتی تو بُلٹ ٹرین کہاں چلے گی اور دوسری جانب پچھلے چھیاسٹھ برس میں ہم نے کوئی نیا ٹریک تو بچھایا نہیں تو اب دوچار برسوں میں کیسے بچھا دیا جائے گا ۔۔۔ ویسے تو دہشت گردی کی بُلٹ ٹرین ایسی ہے جس کے لئے کسی ٹریک کی ضرورت نہیں، ایک مرتبہ اسے چالو کر دیں یہ نمازیوں کو، مسجدوں کو، فوجیوں اور سکول کی بچیوں کو روندتی چلی جائے گی۔۔۔ اور جب آپ اسے مذاکرات کی پیشکش کریں گے تو وہ احتیاطاً پاک فوج کے ایک جنرل کو ہلاک کر دے گی۔۔۔ اور اس پر جب جنرل کیانی بجا طور پر اپنے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہیں گے کہ ہم ان کے قاتلوں کو ضرور سزا دیں گے تو اس پر سب سے دلچسپ اور ایمان افروز بیان ایک مذہبی جماعت کے سربراہ کی جانب سے آتا ہے کہ جنرل کیانی کو سلالہ اور ڈرون حملوں میں ہلاک ہونے والوں کا کچھ دکھ نہیں ہوتا اور انہوں نے ایک جنرل مار دیا ہے تو بہت دکھ ہوا ہے۔ جیسے وہ جنرل ایک پاکستانی مسلمان جنرل نہ ہو۔ ایک یہودی اسرائیلی جنرل ہو۔۔۔ سبحان اللہ ہمارے بھی ہیں قہرماں کیسے کیسے۔۔۔ اب آپ جان گئے ہوں گے کہ بُلٹ ٹرین جو دہشت کی ہے اس کے انجن میں کوئلہ کون جھونکتا ہے۔

ہم کوئے یار سے نکلتے ہیں تو راستے میں کسی مقام پر نہیں ٹھہرتے سیدھے سُوئے دار جاتے ہیں۔ ریلوے سٹیشن بھائیں بھائیں کر رہے ہیں، میرے ایک ریلوائی دوست سعید بٹ کا کہنا ہے کہ تارڑ صاحب عوام کا پاکستان ریلوے پر اعتماد اٹھ گیا ہے، کوئی ٹرین وقت پر روانہ نہیں ہوتی، ہو جائے تو راستے میں ڈیزل ختم ہو جاتا ہے بلکہ ایک وقوعہ یہ بھی ہوا انجن ڈرائیور مسافروں سے معذرت کر کے بازار سے ڈیزل خریدنے چلے گئے۔ مجھے ریلوے سٹیشن کی ویرانی سے باقی صدیقی کا وہ قطعہ یاد آ جاتا ہے کہ:

گڈی لنگ گئی

تے باقی رہ گئے ۔۔۔شاں شاں کر دے کَن

تے بھاں بھاں کردا ٹیشن!

تو آپ بُلٹ ٹرین چلانے کے جھانسے دینے کی بجائے موجود ریلوے سسٹم کی اصلاح کیوں نہیں کرتے، ریلوے سٹیشن جو بھائیں بھائیں کر رہے ہیں انہیں آباد کیوں نہیں کرتے۔ صرف اس لئے کہ کسی بھی محکمے کو پھر سے رواں کرنے اور اسے مستحکم بنانے میں پڑتی ہے محنت زیادہ۔۔۔ اور اس کا کچھ تذکرہ بھی زیادہ نہیں ہوتا جبکہ ایک میگا پروجیکٹ کی دھوم پڑ جاتی ہے کہ دھوم مچا لے دھوم اور ہر جانب سے آپ کی پارٹی کے نکمے داد کے ڈونگرے برسانے لگتے ہیں کہ واہ جی میاں صاحب آپ تو اس عہد کے شیر شاہ سوری ہیں جنہوں نے موٹروے تعمیر کر دی۔۔۔ بلکہ شیر شاہ سوری تو یونہی واجبی قسم کا شیر تھا جبکہ آپ کی پارٹی کا نشان ہی شیر ہے۔۔۔ اور اب بُلٹ ٹرین کے اعلان کے بعد بھی اسی نوعیت کے چند بیان آئے ہیں کہ چین جاپان بھی حیران رہ جائیں گے جب ہماری بُلٹ ٹرین چھک چھک کرتی بس دوچار گھنٹوں میں لاہور سے کراچی پہنچ جائے گی بشرطیکہ راستے میں تخریب پسند عناصر نے ٹریک نہ اکھاڑ دیا ہو۔۔۔ اور ٹرین کے انجن کا ڈیزل ختم نہ ہو گیا ہو تو۔

یہ حقیقت ہے کہ میاں نوازشریف نے موٹروے تعمیر کر کے واقعی ایک کارنامہ سرانجام دیا تھا اور میں تو ازل سے مسافر ہوں میں ان کا شکرگزار ہوا تھاکہ انہوں نے لاہور سے اسلام آباد تک کی مسافتیں آسان کر دیں۔۔۔ اور جو بہت قنوطی لوگ تھے ان کا بھی یہ کہنا تھا کہ موٹروے پر جتنی رقم خرچ ہوئی اگر نہ خرچ کی جاتی تو ویسے بھی ادھر ادھر خردبُرد ہو جانی تھی تو کم از کم یہ تعمیر تو ہو گئی۔۔۔ یہ محض ایک اتفاق تھا کہ جس روز موٹروے کا افتتاح ہوا اس روز میں پاکستان ٹیلی ویژن کی سالگرہ کے موقع پر ایک مارننگ شو کی میزبانی کر رہا تھا۔۔۔ حکومت وقت کی خوشنودی حاصل کرنے کے خواہش مند صحافی، اداکار، میزبان اور نیوزکاسٹر پی ٹی وی کی انتظامیہ کی خوشامدیں کر رہے تھے کہ پلیز ہمیں بھی موٹروے کے اختتام کے موقع پر اپنے دلی جذبات کا اظہار کرنے کی اجازت دی جائے۔ اور ان سب نے اپنے بازوؤں پر ”موٹروے مبارک“ کی پٹیاں باندھ رکھی تھیں، پروڈیوسر صاحب نے مجھ سے بھی درخواست کی کہ آپ بھی ”موٹروے مبارک“

کا اشتہار اپنے بازو کے ساتھ باندھ لیں تو میں نے معذرت کر لی۔۔ اور اس مارننگ شو میں موٹروے کی توصیف میں کیسی کیسی موشگافیاں کی گئیں میں کیوں بیان کروں۔۔ اُدھر براہ راست نشریات میں اپنے طارق عزیز اپنا گلا مزید بٹھا رہے تھے اور میاں صاحب کی توصیف میں نہ صرف نعرے لگا رہے تھے بلکہ شعر بھی پڑھ رہے تھے۔۔ اور جو کوئی بھی مارننگ شو میں آتا وہ کہتا کہ موٹروے کی تعمیر سے پورے سنٹرل ایشیا کی تجارت کے راستے کھل گئے ہیں، سمرقند، بخارا، تاشقند سے اب قافلے آیا کریں گے یہ ایک نئی سلک روڈ پر جائے گی۔ ملک خوشحالی اور شادمانی سے سیراب ہو جائے گا۔ میں نے ان سے یہ نہیں پوچھا کہ یہ قافلے سمرقند اور بخارا سے اگر آ گئے تو لاہور تک آئیں گے اس سے آگے کدھر جائیں گے۔ چیچو کی ملیاں جائیں گے۔ میں ان کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ یقین کیجئے ان میں سے بیشتر آگاہ ہی نہیں تھے کہ یہ سمرقند اور بخارا ہیں کہاں۔۔ اور اب ایک پھل جھڑی چھوڑ دی گئی ہے۔۔ اسے آپ ایک چھچھوندر بھی کہہ سکتے ہیں کہ کاشغر سے گوادر تک ریلوے لائن بچھائی جا رہی ہے اور یوں ایک مرتبہ پھر صوبہ سنکیانگ اور قزاقستان تاجکستان وغیرہ پاکستان سے منسلک ہو جائیں گے وغیرہ وغیرہ۔۔ جب مجھے چین کے مسلمان صوبے سنکیانگ کے دورے کی سرکاری دعوت ملی اور اس میں سید مشاہد حسین کے مشورے بھی شامل تھے تو روانگی سے پہلے چینی سفیر کی موجودگی میں ایک شاندار دعوت کے دوران شاہ صاحب نے جہاں مجھے ضرورت سے زیادہ خراج تحسین پیش کیا وہاں انہوں نے یہ اعلان بھی کیا کہ چین کی حکومت کاشغر سے گوادر تک ایک ٹرین چلانے کے منصوبے پر غور کر رہی ہے۔ دعوت کے اختتام پر میں نے سید مشاہد سے پوچھا اور وہ ایک دیرینہ دوست اور خیرخواہ تھے کہ شاہ جی۔۔ کاشغر سے درہ خنجراب تک تو وہ ریل کی پٹڑی بچھا دیں گے لیکن اس کے آگے کیا ہو گا تو شاہ جی جو دائمی طور پر ایک مسکراہٹ کے مریض ہیں کہنے لگے ”تارڑ صاحب۔۔ اگر چینی بیجنگ سے تبت کے صدر مقام لاسہ تک ٹرین سے جا سکتے ہیں تو وہ اسے گوادر تک بھی لے جائیں گے“۔۔ بعد ازاں میں نے کاشغر سے درہ خنجراب تک سفر کیا۔۔ اور وہاں میدانی علاقہ تھا، اور ایک شاہراہ بامیر کی برفوں کے اندر تک چلی جا رہی تھی تو ان خطوں میں ریل کی پٹڑی بچھانا تو زیادہ دشوار نہ تھا لیکن درہ خنجراب کے پار برف کے انبار تھے، قراقرم کے پُرپیچ برفانی بلندیوں کے سلسلے تھے تو ان کے اندر ایک ٹرین کی پٹڑی بچھانا مجھے تو محال لگتا ہے۔

اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ کیا کاشغر کبھی گوادر سے ایک چھک چھک کرتی ٹرین سے منسلک ہو سکتا ہے تو میں انگریزی محاورے کے مطابق یہی کہوں گا کہ۔۔ میری زندگی میں تو نہیں۔۔ ہاں اگر میں ڈیڑھ سو برس تک زندہ رہوں تو شاید

9/9/13

خود کش سموسے اور کھسماں نوں کھانی کھیر

مستنصر حسین تارڑ

09-0-2013

تو پچھلے کالم میں تذکرہ ہوا تھا کہ اگر میاں نواز شریف اپنی دیسی اور لاہوری خوراکیں نہایت رغبت سے کھاتے ہیں ان کے شوقین ہیں تو مجھے ان کا یہ نہاری، سری پائے ذوق بے حد پسند ہے، بجائے اس کے کہ وہ برگر، پیزا، سٹیک اور چینی کھانوں کے رسیا ہوتے۔۔ یہ اُن کی حب الوطنی کی دلیل ہے۔

دراصل دنیا بھر میں ہمارے دیسی کھانوں کی لذت کی وہ دھوم نہیں پڑی جس کے وہ حقدار ہیں صرف اس لیے کہ اُن کا رشتہ ایک ترقی پذیر اور اقتصادی طور پر پس ماندہ خطے سے ہے۔۔ شروع سے ہوتا چلاآیا ہے کہ جو ملک اپنی عسکری اور اقتصادی قوت کے بل بوتے پر دنیا میں غلبہ حاصل کرتے ہیں، اُن کی تہذیب بھی دیگر ملکوں میں غالب آنے لگتی ہے۔ اُن کی موسیقی، ذوق لباس اور خوراک بھی چاہے وہ کیسی ہی بے ذائقہ اور معمولی ہو دنیا میں پسندیدہ ہو جاتی ہے۔۔ اب آپ ہی انصاف کیجیے کہ یہ جو برگر ہے جو خچروں کی خوراک ہے اسے کیسے ہمارے بچے کچر کچر کھاتے چلے جاتے ہیں، صرف اس لیے کہ دنیا بھر

میں اس کے آؤٹ لیٹ موجود ہیں اور اُن کی پشت پر امریکی غلبہ موجود ہے۔ مجھے یاد ہے کہ بیجنگ میں رات کے وقت میکڈونلڈ برگر کے نیون سائن کی روشنیاں ماؤزے تنگ کے مقبرے پر جلتی بجھتی ہیں تو میں نے لکھا تھا کہ ماؤ امریکہ کو کاغذ کا شیر کہا کرتا تھا اور امریکہ اپنی بے پناہ عسکری قوت کے باوجود ماؤ کے چین کا کچھ نہ بگاڑ سکا اور آج اس نے ایک برگر کے زور سے اس کے مقبرے کو زیر کر لیا ہے۔ البتہ ایک امر ملحوظ خاطر رہے، یہ کامیابی اُن کی خوراک کی وجہ سے نہیں بلکہ اُن کی کاروباری صلاحیت کی تنظیم اور ایمانداری کی مرہون منت ہے۔۔۔ آپ دنیا میں کہیں بھی چلے جائیے اُن کی خوراک کا معیار یکساں ہو گا۔۔۔ صفائی ستھرائی اعلیٰ درجے کی ہو گی یہاں تک کہ آپ موٹروے پر کسی امریکی چین میں چلے جائیے وہاں کے غسل خانے ویسے ہی صاف شفاف ہوں گے جیسے روم میں یا نیو یارک میں۔۔۔ روس میں جب کبھی ماسکو سے باہر کا سفر در پیش ہوتا تو راستے میں اگر غسل خانے جانے کی حاجت ہوتی تو روسی کہتے اگلے قصبے میں میکڈونلڈ کی ایک شاخ ہے اس کے غسل خانے صاف ستھرے ہوں گے۔ چین میں بھی یہی صورت حال تھی۔ اب ایک اور پاپولر خوراک پیزا کا تجزیہ کیجیے، یہ بنیادی طور پر ایک نان ہے جس کے اندر کچھ الابلا بھر کے پنیر چھڑک کر تندور سے پکا لیا جاتا ہے۔۔۔ ہم اسے قیمے والا یا سبزی والا نان کہہ سکتے ہیں۔۔۔ اور یہ ڈونٹ کیا ہے ایک خمیر شدہ بند جس پر چینی چھڑک کر کافی کے ساتھ پیش کر دیا جاتا ہے۔۔۔ پچھلے برس میر ابیٹا، سلجوق جوان دنوں یو این او میں سفارت کار ہے مجھے نیویارک کے ایک رائس پڈنگ پارلر میں لے گیا جو بے حد مقبول ہو چکا تھا اور وہاں کیا تھا؟ ہماری لوہاری دروازے یا گوالمنڈی کی کھیر۔۔۔ البتہ اس میں ورائٹی بے شمار تھی، یعنی پنیر ملی کھیر۔۔۔ اخروٹ، کشمش، سٹرابیری، انگور ۔۔۔اور دار چینی کے ذائقے والی کھیر اور یہاں بھی نفاست اور صفائی کمال کی تھی۔۔۔ یعنی ہم پیشکش اور تنظیم میں مار کھا جاتے ہیں ورنہ کھیر کے علاوہ ہمارے حلوے کا کچھ جواب ہے۔۔۔ خاص طور پر دیسی گھی میں نچڑتے ہوئے سوجی کے حلوے کا۔۔۔ مولوی حضرات تو مفت میں بدنام ہیں ورنہ میرے جیسا "روشن خیال" بھی حلوے کے شیدائیوں میں سے ہے۔ میرے ابا جی اپنے پچاسیویں برس میں کھانے کے بعد خدا جھوٹ نہ بلوائے آدھا کلو حلوہ نہایت رغبت بھری آسانی سے کھا لیتے تھے۔۔۔ اُن کا کہنا تھا کہ بیٹے حلوے کے بارے میں دو حقائق یاد رکھنا۔۔۔ ایک یہ کہ حلوہ کسی وقت بھی کھایا جا سکتا ہے اور دوسرا یہ کہ حلوہ ایک پہلے سے ہی ہضم شدہ خوراک ہے۔۔۔ کہتے ہیں پرانے زمانوں میں کسی دور افتادہ گاؤں میں ایک انگریز ڈپٹی کمشنر چلا گیا تو ایک کسان نے حیرت سے کہا کہ دیکھو تو سہی اس کا رنگ کتنا سفید ہے تو دوسرے کسان نے یہ مسئلہ حل کر دیا کہ اسے کم از کم پچاس روپے تنخواہ ملتی ہو گی اور پھر یہ اُن پچاس روپوں کا گڑ خرید کر کھاتا ہو گا تو اس نے اتنا سفید تو ہونا ہے۔ مجھے اپنے بچپن میں اپنے گاؤں کی بارات میں شامل ہونے کا اتفاق ہوا۔ میں پانچ برس کا تھا اور ابا جی کی انگلی تھام کر چلتا تھا۔ پہلے تو دودھ اور مٹھائی سے باراتیوں کی تواضع کی گئی پھر تھوڑی دیر بعد لڑکی والے گھر کے کچے صحن پر صاف ستھرے دستر خوان بچھا دیئے گئے جن کے گرد باراتی براجمان ہو گئے۔۔۔ ازاں بعد اُن پر براہ راست گھی سے نچڑتے زردے کی دیگیں اوندھی کر دی گئیں۔۔۔ باراتیوں نے نہایت تحمل سے میٹھے زردے کے ساتھ مکمل انصاف کیا۔ آخر میں پلاؤ کی صرف ایک دیگ دستر خوان پر اٹھائی گئی اور اعلان کیا گیا کہ جس نے منہ سلونا یعنی نمکین کرنا ہے کر لے۔۔۔ بہت کم لوگ راغب ہوئے کہ وہ زردے کا ذائقہ خراب نہیں کرنا چاہتے تھے۔۔۔ میٹھے کی یہ ہوس میرے جینز میں شامل ہے۔ میں یہاں میاں صاحب کی خدمت میں ایک نہایت منافع بخش عظیم کاروباری منصوبہ پیش کرنا چاہتا ہوں جو اُن کے بڑے سے بڑے ماہر اقتصادیات کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا کہ اُنہیں تو آئی ایم ایف کے سامنے "جی سر۔۔۔ بہترسر۔۔۔ بجلی پٹرول فوراً مہنگا سر" کہنے سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ منصوبہ یہ ہے کہ پوری دنیا میں "پیزا ہٹ" ، "میکڈونلڈ" ، "کے ایف سی"، "ڈنکن ڈونٹس" اور "سب وے" کی طرز پر پاکستانی کھانوں کے ریستوران قائم کیے جائیں۔۔۔ اگر میاں صاحب اسے لانچ کریں گے تواس کو اعتبار حاصل ہو گا کہ وہ خود ایک ماہر کھاباجات ہیں۔۔۔ ابتدائی طور پر پانچ مختلف خوراکوں کے ریستوران یا آؤٹ لیٹ لانچ کیے جا سکتے ہیں۔ میری ترجیح اول "پراٹھا پارلر" ہے جہاں درجنوں انواع و اقسام کے پراٹھے پیش کیے جا سکتے ہیں۔۔۔ مثلاً قیمہ، آلو، میتھی، گوبھی، دال، شملہ مرچ، ہری مرچ، اچار سے بھرے پراٹھے جن کے

مختلف پرکشش نام رکھے جا سکتے ہیں۔ یعنی۔۔۔ سیکولر پراٹھے، روشن خیال پراٹھے، اسلامی پراٹھے، بے ایمان پراٹھے، نظریاتی پراٹھے، پاگل پراٹھے، بے حجاب پراٹھے، پردیسی پراٹھے، مخرب الاخلاق پراٹھے وغیرہ۔
آپ جانتے ہیں کہ سموسوں میں بھی بے شمار ورائٹی پائی جاتی ہے۔۔۔ ان میں بھی ہر نوعیت کی سبزی، گوشت، پنیر اور گھاس پھونس وغیرہ بھرا جا سکتا ہے۔ اس ریستوران چین کا نام "سموسٹہ سموسہ" ہو سکتا ہے یا اگر جدید نام رکھنا مقصود ہو تو اسے "انکل سام سموسہ" بھی کہا جا سکتا ہے جہاں مینو میں مندرجہ ذیل اقسام درج کی جا سکتی ہیں۔۔۔ جن میں اولین نام "ڈرون سموسہ" ہو گا۔۔۔ اس کے علاوہ "نائن الیون سموسہ"، "گوانتا ناموبے سموسہ"، "کابل سموسہ"، "ٹون ٹاورز سموسہ" کے علاوہ ایک "خود کش سموسہ" بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ یہ دراصل سموسے کی شکل کا ایک ہنڈ گرنیڈ ہو گا جو عراق اور افغانستان میں تعینات امریکی فوجیوں میں بے حد مقبول ہو سکتا ہے۔ اُنہیں زبردستی بھی کھلایا جا سکتا ہے۔ وہ نہ کھائیں تو پاکستانی عوام آخر کس روز کام آئیں گے۔۔۔ اور وہ ایسے سموسوں کے کام آتے ہی رہتے ہیں۔ تیسرے لاہوری آؤٹ لیٹ کا نام "حلیم ہائے ہائے" مناسب رہے گا جس کے اندر ایک نارمل انسان داخل ہو گا۔۔۔ کھانے کے بعد باہر آئے گا تو اُس کے ناک منہ سے دھواں نکل رہا ہو گا۔ ناک اور کان سرخ ٹماٹر ہو رہے ہوں گے اور وہ مرچوں کی تاب نہ لا کر "ہائے ہائے" کر رہا ہو گا۔۔۔ البتہ حلیم الطبع حلیم کھانے والے مسکراتے ہوئے باہر آئیں گے اور ہر کس و ناکس سے بغلگیر ہوتے چلے جائیں گے اور بالآخر کسی خاتون کے ہاتھوں پٹ جائیں گے۔۔۔ اور چوتھے ریستوران کا نام "نہاری پیاری" ہوگا۔
اب ظاہر ہے کھانے کے بعد میٹھے کی طلب ہوتی ہے، تو میٹھے کے ریستوران کا نام صرف "حالوہ مانڈا" ہی ہو سکتا ہے۔ یہ حلوہ نہیں حالوہ ہو گا۔ آپ نے نوٹ کیا ہو گا کہ مولوی حضرات اس کو ہمیشہ ایک مخصوص لہجے میں "حالوہ" ہی پکارتے ہیں لیکن اس آؤٹ لیٹ میں حالوے کے علاوہ جلیبیوں، فالودہ اور کھیر کا بھی بندوست ہو گا۔۔۔ یعنی جلیبی شیبی۔۔۔ جلیبی دل جلی، جلیبی جا جا جا، فالودہ شلودہ۔۔۔فالود پھلودا (یاد رہے کہ حکیم الامت بھی فالودہ کو پھلودہ ہی کہتے تھے)۔۔۔ اور کھیر کی مختلف اقسام میں کھابا کھیر۔۔۔ کھی کبھی کھیر اور کھسماں نوں کھانی کھیر شامل ہوں گی۔۔۔ میاں صاحب آپ خدا کے نام لے کر ان دیسی ریستورانوں کو لانچ کر دیں، انشاء اللہ دنیا بھر میں میکڈونڈ، کے ایف سی اور پیزا ہٹ کی امریکی خوراک کا گو امریکہ گو ہو جائے گا اور ہر جانب "پراٹھا پارلر"، "سمہ سٹا سموسہ"، "حلیم ہائے ہائے"، "نہاری پیاری" اور "حالوہ مانڈا" کا ڈنکا بجنے لگے گا اور ہم اور کچھ نہ ہوئے تو کم از کم ایشین ٹائیگر ہو جائیں گے۔۔۔ بے ایمان پراٹھے۔ خودکش سموسے اور کھسماں نوکھانی کھیر کھانے والے ٹائیگر!

13/10/13

جب ضیاء الحق کو شہید قرار دیا گیا

مستنصر حسین تارڑ

یہ اُن بیت چکے زمانوں کا قصہ ہے جب میں پی ٹی وی کی اولین صبح کی نشریات کا مرکزی میزبان ہونے کے حوالے سے اسلام آباد کے ایم این اے ہوسٹل میں مقیم تھا۔۔۔ مری میں میڈیا اور نشریات کے موضوع پر منعقد کردہ ایک سیمینار میں ملک بھر سے مدعو کردہ ٹیلی ویژن ڈرامہ نگار، میزبان، اداکار اور پروڈیوسر شریک تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے ابا جی اور امی جی جو ان دنوں اسلام آباد میں میرے چھوٹے بھائی کرنل مبشر کے ہاں مقیم تھے مجھے ملنے کے لیے مری آئے تو حسینہ معین اور عبدالقادر جونیجو نے خاص طور پر میرے ابا جی کی شاندار اور مہربان شخصیت سے متاثر ہو کر مجھ سے درخواست کی کہ ہم آپ کے والدین کے ساتھ ایک تصویر کھنچوانا چاہتے ہیں۔ اس دوران شعیب منصور اور مرحوم حمید کاشمیری بھی اس گروپ فوٹو میں شامل ہو گئے۔ پی ٹی وی میں ان دنوں دو نثار ہوا کرتے تھے۔ ایک محمد نثار حسین جو ایم این ایچ کہلاتے تھے اور یہ وہی تھے جنہوں نے مجھے ایک اداکار کے طور پر اپنے ایک ڈرامے میں کاسٹ کر

کے متعارف کروایا اور دوسرے خواجہ نثار حسین تھے، جو کے این ایچ کہلاتے تھے۔ نہایت خوش شکل اور خوش لباس، ٹی وی کے پہلے ڈرامے کے پروڈیوسر، ایک پکے لاہورئیے جو ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہو جانے کے باوجود بسنت کے موقع پر پتنگیں اڑانے کے لیے خصوصی طور پر لاہور پہنچ جاتے تھے۔ خواجہ نثار بھی مری کے اس سیمینار میں مدعوتھے۔ ایک دھند آلود شام میں چائے سُرکتے مجھ سے کہنے لگے ”پی ٹی وی پر ہم لوگ شام کے علاوہ صبح کی نشریات کے آغاز کے امکانات کے بارے میں سوچ بچار کر رہے ہیں۔ اس کے مرکزی میزبان کے چناؤ کے لیے تمام سٹیشنوں پر خصوصی آڈیشن لیے جائیں گے۔ میری خواہش ہے آپ بھی آڈیشن ضرور دیں“۔۔ دو ہفتے بعد صبح کی نشریات کے آڈیشن ریکارڈ ہوئے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک معروف میزبان نے ایک اخباری انٹرویو میں دعویٰ کیا کہ بھلامیرے علاوہ پاکستان میں اور کون ہے جو ان نشریات کو سنبھال سکتا ہے۔۔ میرا چناؤ ہو چکا ہے۔۔ قصہ مختصر میرا آڈیشن ہیڈ کواٹر میں بہترین قرار دیا گیا اور صبح کی نشریات ”صبح بخیر“ کے آغاز کے لیے لاہور سے اسلام آباد منتقل ہو گیا۔ اس کے پہلے پروڈیوسر خالد محمود زیدی تھے جو اس سے پیشتر میرا پنجابی سیریل ”چانن تے دریا“ پروڈیوس کر چکے تھے۔ بریگیڈیئر ٹی ایم کے چھوٹے بھائی تھے۔ ٹی ایم ایک پیرا شوٹ جمپ کے دوران پیرا شوٹ نہ کھلنے سے گوجرانوالہ کے قریب شہید ہو گئے تھے۔ نشریات کا شیڈول بے حد جان لیوا تھا۔ ہر صبح چار بجے بیدار ہو کر تیار ہوتا، ناشتہ کرتا اور پھر ٹیلی ویژن سٹیشن کی جانب پیدل روانہ ہو جاتا۔ اس دوران اکثر ٹی وی کی گاڑی میرے ساتھ چلتی جاتی اور اس میں اکثر ان زمانوں میں گمنام افضل ریمبو میری دیکھ بھال کے لیے بیٹھا ہوتا۔ پورے سات بجے میں آن ایئر جاتا۔۔ نشریات نو بجے اختتام کو پہنچتیں۔۔ واپس ہوسٹل جا کر آرام کرتا، دوپہر کے کھانے کے بعد پھر ٹی وی سٹیشن، اگلے روز کے پروگراموں کو دیکھتا، سکرپٹ کے لیے نوٹس تیار کرتا، پھر واپس کمرے میں آکر سکرپٹ لکھتا اور رات کا کھانا کھا کر ساڑھے نو بجے سو جاتا۔۔ چنانچہ شبینہ حرکات بے حد محدود ہو گئیں۔۔ ویک اینڈ پر اپنے بال بچوں سے ملنے لاہور آجاتا۔

ایک شب میں حسب معمول تقریباً دس بجے نیم خوابیدہ کیفیت میں ایک اونگھ میں جا چکا تھا جب ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔۔ میں نے جان بوجھ کر نہ اٹھایا کہ میں اپنی نیند خراب نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن پھر فون بار بار آنے لگا چنانچہ میں نے تنگ آ کر اٹھا لیا، دوسری جانب خواجہ نثار تھے جو صبح کی نشریات کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر تھے۔ کہنے لگے ”آپ سو رہے ہیں؟“ میں نے بیزار ہو کر کہا ”ہاں۔۔ لیکن اب نہیں سو رہا“ کہنے لگے ”آپ نے نو بجے کی خبریں نہیں سنیں؟“

نہیں، میرے پاس تو ٹیلی ویژن نہیں ہے۔۔ کیا کوئی خاص خبر ہے؟“ خواجہ نثار کھانس کر بولے ”ضیاء الحق ” کا طیارہ بہاولپور کے قریب کریش کر گیا ہے اور وہ ہلاک ہو گئے ہیں۔ کوئی بھی مسافر زندہ نہیں بچا۔۔ کل صبح نشریات کے آغاز میں آپ پہلے شخص ہوں گے جو آن ایئر جائیں گے اور ضیاء الحق کی ہلاکت کی تفصیلی خبر دیں گے تو کچھ تیاری کر لیجیے۔ بے حد اہم ٹرانسمیشن ہے ساری دنیا دیکھ رہی ہو گی“۔

ضیاء الحق اور میرے درمیان جو کچھ بھی تھا بہر صورت محبت یا پسندیدگی نہ تھی۔ میں تفصیل میں نہیں جاتا۔۔ چنانچہ اس کی ہلاکت کی خبر سن کر میں ایک غیر جانبدار سناٹے میں چلا گیا۔ اسلام آباد میں چند بار اس کی بیٹی زین سے ملاقات ہوئی اور وہ ایک پیاری اور محبت کرنے والی بچی تھی۔ صبح کی نشریات کی شیدائی تھی۔ ایک بار اس نے مجھے اپنی سالگرہ پر بھی مدعو کیا اور میں صرف اس لیے نہ جا سکا کہ ان دنوں میں لاہور میں تھا۔ مجھے اس لمحے صرف زین کا خیال آیا کہ اس کا باپ مر گیا ہے، وہ ایک اپاہج بچی کیا محسوس کرے گی۔۔ جیسے مجھے بھٹو کی پھانسی کے بعد بینظیر کا خیال آیا تھا۔

نثار۔۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ اگلے چند روز کے لیے میری بجائے کسی ایسے میزبان کی ڈیوٹی لگا دی جائے ” جو موقع کی مناسبت سے رنج و الم میں ڈوبی ہوئی نشریات کرے“ لیکن نثار نے کہا کہ یکدم میری غیر موجودگی شکوک کو جنم دے گی۔ اس پر میں نے صرف یہ درخواست کی کہ جو کچھ کہنا ہے، اعلان کرنا ہے مجھے لکھ کر دے دیجیے گا میں پڑھ دوں گا۔

اگلی صبح نشریات کو کچھ اس طرح ترتیب دیاگیا کہ تازہ ترین خبریں اورصورت حال۔۔ پھر میرے اعلان۔ پھر ایک نعت رسول مقبولؐ اور پھرقاری عبدالرحمن صاحب قرأت کرتے تھے۔ میں اُن کی پرسوز قرأت کا دیرینہ مداح تھا

چنانچہ اگلے دو روز اُن کی رفاقت میں گزرے۔ درمیان میں جب وقفہ ہوتا تو مجھے لطیفے سنانے لگتے اور کیمرہ آن ہوتے ہی بے حد سنجیدہ ہو جاتے۔ مجھے ٹھیک طرح سے یاد نہیں کہ یہ ضیاء الحق کی ہلاکت کا دوسرا دن تھا یا تیسرا جب نشریات کے دوران مجھے ایک چِٹ بھیجی گئی جس پر لکھا تھا کہ ابھی ابھی کابینہ یا حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ ضیاء الحق شہید ہیں چنانچہ آئندہ اُن کے لیے ہلاک ہو گئے، جاں بحق ہو گئے وغیرہ کی بجائے شہید ہو گئے، کہا جائے۔۔۔ چنانچہ ازاں بعد حکومتی فیصلے کے مطابق وہ شہید قرار دیے گئے۔
اس میں کچھ شک نہیں کہ ضیاء الحق کا جنازہ بہت بڑا تھا اور اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ بوقت مرگ کرسئ صدارت پر رونق افروز تھے۔ جنازے کی تفصیلات تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں کہ براہ راست نشریات کے میزبان کیسے اشک بار ہوتے تھے اور کیسے انہوں نے فرط جذبات سے مغلوب ہو کر وہ بیان دیا جو تاریخ میں سنہری حرفوں میں لکھا گیا کہ کاش آج ضیاء الحق خود دیکھ سکتے کہ اُن کے جنازے میں کتنی دنیا آئی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ضیاء الحق کی دو تین برسیاں کتنی دھوم دھام سے منائی گئیں یہاں تک کہ ایک میں میاں نواز شریف نے بھی شرکت کی لیکن اس کے بعد ویرانی چھا گئی یہاں تک کہ اُن کے فرزند بھی شاید اُن کی برسی بھول جاتے۔ کہ اُن کی وراثت میں جتنا فائدہ اٹھانا تھا اٹھایا جا چکا۔ پچھلی عید پر ٹیلی ویژن کے ایک پروگرام میں پاکستان کی مختلف ادبی، قلمی اور سیاسی شخصیات کی قبریں دکھائی گئیں کہ عید کے موقع پر وہاں کتنے لوگ فاتحہ پڑھنے آئے۔ سب سے زیادہ اجاڑ ضیاء الحق کا مدفن تھا۔۔ قبر پر سوکھے ہوئے پھول پڑے تھے اور ایک رکھوالا شکایت کر رہا تھا کہ لوگ ضیاء الحق کو بھول گئے ہیں۔۔ بہت کم لوگ فاتحہ پڑھنے آتے ہیں۔۔ ’مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے!‘

16/10/13

اردو عالمی کانفرنس اور بولائے ہوئے بہرے ادیب
مستنصر حسین تارڑ

اردو کی دوسری عالمی کانفرنس کے موقع پر لاہور کے ایک فائیو سٹار ہوٹل کے ڈائننگ روم میں دوپہر کا کھانا تناول فرماتے ہوئے میں نے میز کے پار براجمان کشور ناہید کو پکارا۔۔ اس نے سنی ان سنی کر دی تو میں نے دوبارہ کہا ”کشور“۔۔ وہ بدستور کھانے میں مشغول رہی۔۔ جب تیسری بار بھی اس نے دھیان نہ دیا تو میں نے اس کے برابر میں بیٹھی ہوئی فہمیدہ ریاض سے کہا۔۔ فہمیدہ ذرا کشور کو متوجہ کرو۔۔ لیکن فہمیدہ بھی سویٹ کھانے میں مصروف رہی۔۔اس پر میں نے تنگ آ کر کراچی کی زاہدہ حنا کو پکارا تو اس نے سر اٹھا کر کہا۔۔ تارڑ صاحب آپ کچھ کہہ رہے تھے۔۔ میں نے درخواست کی کہ ذرا اپنے برابر میں تشریف فرما فہمیدہ ریاض سے کہئے کہ وہ کشور ناہید کو میری جانب متوجہ کرے۔۔ اس پر زاہدہ حنا نے عینک درست کر کے مسکراتے ہوئے کہا۔۔ شور بہت ہے سنائی نہیں دے رہا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔۔ میں نے ہتھیار ڈال دیئے اور کشور سے بات کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ شور واقعی بہت تھا۔۔ اتنی دیر میں انتظار حسین چونک گئے۔۔ کہنے لگے، کیوں بھائی یہ تم بار بار میز کے پار خواتین سے کیوں مخاطب ہو رہے ہو۔۔ میں نے کہا، انتظار صاحب میں کشور سے بات کرنا چاہتا تھا وہ سنتی ہی نہیں۔۔ انتظار نے متانت سے سر ہلایا۔۔ اور کہنے لگے، کون کس کی نہیں سنتی۔۔ میں نے بھنا کر کہا۔۔ چھوڑیئے انتظار صاحب۔۔ یہ بتائیے کہ کانفرنس کیسی جا رہی ہے۔۔ مسکراتے ہوئے بولے۔۔ کیا کہا کون کہاں جا رہی ہے۔۔ تو میں نے اپنا منہ ان کے کان کے قریب لے جا کر کہا۔۔ کشور سے بات کرنی تھی وہ سنتی ہی نہیں۔۔ انتظار صاحب خوش ہو گئے۔۔ ارے بھئی اس نے آج تک کسی کی سنی ہے جو تمہاری سنے۔۔ اس دوران برابر کی میز پر بیٹھے ہوئے اسد محمد خان جو اپنے ایک گیت کے حوالے سے ”انوکھا لاڈلا“ کہلاتے ہیں انہیں کچھ خیال آ گیا اور مجھ سے مخاطب ہو گئے۔۔ بھئی ہمیں بھی تو خبر ہو کہ آپ لوگ کیا باتیں کر رہے ہیں۔۔ میں نے کہا، خان

صاحب کوئی خاص بات نہیں ہے۔۔ خاطر جمع رکھیں۔۔ خان صاحب نے کچھ دیر غور کیا اور پھر کہنے لگے، تارڑ اب اس عمر میں جمع کر کے کیا کرنا ہے۔۔ یہ کہہ کر وہ اپنا گلاب جامن کھانے میں مصروف ہو گئے اور تب مجھے احساس ہوا کہ معاملہ کیا ہو گیا ہے۔۔ ہم میں سے بیشتر ستّر کی دہلیز یا تو کب کے پار کر چکے تھے اور یا پار کرنے والے تھے اور عمر ہم پر اثرانداز ہو رہی ہے۔۔ اور ہم اونچا سننے لگے تھے۔۔ مجھے ایک کمینی سی مسرّت ہوئی کہ جیسی میری حالت اب ہے کبھی ایسی تو نہ تھی۔۔ تو ان کی حالت بھی مجھ ایسی ہی تھی۔۔ دراصل پچھلے برس مجھے احساس ہوا کہ فون سنتا ہوں تو بائیں کان میں تو سرگوشی سی ہوتی ہے لیکن چونگا دائیں کان سے لگاتا ہوں تو آواز بہتر ہو جاتی ہے ۔۔ بیگم کے اصرار کرنے پر ڈاکٹر سے چیک کروایا تو وہ کہنے لگا۔۔ تارڑ صاحب آپ کا بایاں کان تو بالکل فارغ ہو چکا ہے البتہ دایاں کان تقریباً ستّر فیصد کارآمد ہے۔۔ آمنے سامنے کی گفتگو میں زیادہ دشواری نہیں ہو گی البتہ جہاں ہجوم ہو گا وہاں آپ کو کم سنائی دے گا۔۔ آپ آلۂ سماعت بھی کان میں فِٹ کروا سکتے ہیں۔۔ میں نے ”ٹُوٹی“ لگوانے سے انکار کر دیا۔۔ اب میں کہاں کہاں آلات لگواتا پھروں گا۔۔ کبھی کبھی شرمندگی بھی ہو جاتی ہے۔ پچھلے برس ایک ادبی کانفرنس کے موقع پر کچھ لوگ میرے گرد ہجوم کرتے تھے اور وہ جو کچھ کہتے تھے مجھے کم ہی سنائی دیتا تھا۔۔ میں میکانکی انداز میں ہر ملنے والے سے کہتا تھا۔۔ بہت بہت شکریہ اور بہت خوشی ہوئی۔ وہ ظاہر ہے تحریروں کی پسندیدگی کا اظہار کرتے تھے اور اپنا تعارف کرواتے تھے۔۔ بعد میں ایک صاحب کہنے لگے ”کوہاٹ کے ایک ادیب آپ سے بے حد خفا ہیں۔۔ ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے آپ سے کہا کہ تارڑ صاحب قبلہ والد صاحب کچھ عرصہ سے بیمار تھے اور آپ کو بے حد پسند کرتے تھے تو آپ نے کہا کہ بہت بہت شکریہ اور پھر انہوں نے کہا کہ دو ہفتے پیشتر وہ فوت ہو گئے اور آپ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔۔ بہت خوشی ہوئی۔۔ بعدازاں میں نے اس کوہاٹی ادیب کو تلاش کر کے بے حد معذرت کی اور اپنی معذوری بیان کی۔

اردو کی دوسری عالمی کانفرنس میں اردو کے مختلف مسائل کے بارے میں تنقیدی مضامین پیش کئے گئے۔ موجودہ تشویشناک صورت حال کے بارے میں تبادلۂ خیال ہوا لیکن اس کے سوا پرانے دوستوں اور نئے ادیبوں سے میل ملاقات کے جو مواقع نصیب ہوئے وہ حاصل کانفرنس تھے۔۔ اس کا انعقاد ایک میڈیا گروپ کی جانب سے کیا گیا تھا جو ایک خوش آئند اقدام تھا اور ادیبوں کا کہنا تھا کہ دوسرے اہم میڈیا گروپس کی جانب سے ایسی ادبی کانفرنسوں کا انعقاد ہونا چاہئے۔ کانفرنس میں روس، انگلستان، ہندوستان، ازبکستان، ہندوستان اور چین کے اردو دانوں نے شرکت کی۔۔ اور کیسے کیسے نابغۂ روزگار لوگ آئے۔۔ ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز۔۔ ابتدائی اردو ادب کی تاریخ کے محقق اور ان کی روسی اہلیہ لُڈمیلا۔۔ میری ان سے ملاقات نہیں تھی تو میری دیرینہ دوست ڈاکٹر لُڈمیلا واسالووا جو میر، غالب اور فیض پر ایک اتھارٹی ہیں انہوں نے میرا تفصیلی تعارف کروایا۔ ازبکستان کے ڈاکٹر طاش مرزا سے جب بھی ملاقات ہوتی ہے وہ پوچھتے ہیں اب کس کی تلاش میں نکلے ہیں کہ ”نکلے تری تلاش میں“ انہیں ازحد پسند ہے اور اس کے حوالے دیتے ہیں۔ ترکی کے ڈاکٹر خلیل توقار، ہندوستان کے ڈاکٹر شمیم حنفی اور زبیر رضوی سے تو ایک مدت کے یارانے ہیں۔ چین کے ڈاکٹر تھانگ منگ شنگ۔۔ اور ظاہر ہے روس کی لُڈمیلا واسالووا، ان سے کبھی ٹورنٹو میں ملاقات ہوئی اور کبھی ماسکو میں۔۔ جب مجھے ماسکو سٹیٹ یونیورسٹی نے سرکاری طور پر اردو ادب پر لیکچر دینے اور مجھے ایک گولڈ میڈل سے نوازنے کے لئے مدعو کیا تو لُڈمیلا جسے دوست صرف مِیلا کہتے ہیں مسلسل ہمارے ساتھ رہی بلکہ مجھے اور میری بیگم کو اپنے فلیٹ میں جسے وہ ”کبوتر خانہ“ کہتی تھیں ایک شب پُرتکلف کھانے پر بلایا جہاں ایک اور لُڈمیلا بھی تھیں، دیہاتی سی لگتی خاتون جنہوں نے پنجابی زبان میں ڈاکٹریٹ کر رکھی تھی چنانچہ میمونہ اور وہ پوری شام پنجابی میں گفتگو کرتی رہیں۔۔ ایک بار پاکستان آئیں تو مجھے ملنے میرے گھر چلی آئیں اور فیض صاحب کی قبر پر حاضری دینے کی خواہش کا اظہار کیا۔۔ جب ہم ماڈل ٹاؤن کے اس قبرستان میں داخل ہوئے جہاں فیض صاحب کا مدفن ہے تو لُڈمیلا نے بلندآواز میں، آئے تھے غم گسار چلے والی فیض کی غزل کے اشعار پڑھنے شروع کر دیئے اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ بلکہ انہوں نے میری تقلید میں ہاتھ اٹھا کر فیض صاحب کی قبر کے سرہانے پھول چڑھانے کے بعد فاتحہ پڑھی۔

ایک سیشن کا عنوان ”پاکستانی معاشرے کا خلفشار اور ادیب کا کردار“ تھا۔۔ میں نے جو معروضات پیش کیں وہ کبھی کسی آئندہ کالم میں عرض کروں گا۔۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی صدارت تھی اور وہ بھی سہارے کے بغیر قدم اٹھانے سے قاصر تھے۔۔ میرے علاوہ سلیم راز، مسعود اشعر، زاہدہ حِنا، سعود مفتی اور اسد محمد خان نے بھی اظہار خیال کیا۔
اور ہاں میں تو بھول چلا تھا کینیڈا سے آئے ہوئے دوست اشفاق حسین اور ان کی بیگم نرجس سے بھی ملاقات ہوئی، وہ اپنی بیٹی عینی کو بیاہنے کراچی آئے ہوئے تھے۔
بہرطور یہ ایک یادگار کانفرنس ثابت ہوئی جس کی یادوں میں میرے ہم عصر میری طرح کے بولائے ہوئے بہرے ہوتے ادیب شامل تھے۔۔ میں نے کشور سے پوچھا آپ اسلام آباد کب واپس جا رہی ہو تو وہ کہنے لگی ”کیا مطلب تم کل دوپہر میرے بھائی جان کے کھانے پر نہیں آ سکتے“ میں نے انتظار صاحب سے کہا، آپ کل کھانے پر جا رہے ہیں تو وہ مسکرا کر کہنے لگے۔۔ ”ہاں بھئی تمہاری تقریر بہت اچھی تھی۔۔ میں نے سنی تھی“۔
اسد محمد خان کہنے لگے، تارڑ آپ نے کچھ کہا۔۔ بھئی رس گلّے بہت عمدہ تھے۔
میں نے کہا۔۔ بہت بہت شکریہ۔۔ بڑی خوشی ہوئی

20/10/13

کیکر اور اچّیاں لمیاں ٹاہلیاں

مستنصر حسین تارڑ

20-10-2013

عہد حاضر میں تو نہ صرف تُرکی میں بلکہ پوری دنیا میں ناول نگار اورہان پاموک کا طوطی بولتا ہے اس لئے بھی کہ اسے ادب کا نوبل انعام مل چکا ہے لیکن اس سے پیشتر یاشار کمال تُرکی کا سب سے بڑا مصنف مانا جاتا تھا۔۔ اس کے ناول ”ونڈز فرام دے پلینز“، ”محمت مائی ہاک“ اور ”لیجنڈ آف دے تھاؤزنڈ بارسنر“ کلاسیک کا درجہ اختیار کر چکے ہیں۔ دو بار نامزد ہونے کے باوجود اسے نوبل انعام صرف اس لئے نہ مل سکا کہ وہ کُرد مسلمان تھا۔۔ تُرک جہاں عربوں کو بوجوہ پسند نہیں کرتے اور اسی لئے تُرکی دنیا کا پہلا ملک تھا جس نے اسرائیل کے وجود کو تسلیم کیا وہاں کُردوں کے ساتھ بھی ان کی گہری تاریخی مخاصمت ہے۔۔ چنانچہ حکومت ترکی نے یاشار کو نوبل انعام کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔۔ تُرکی میں کُرد زبان، تاریخ اور ثقافت کا تذکرہ بھی جرم ہے چنانچہ یاشار کو کُرد زبان کے حق میں بیان دینے پر پابند سلاسل کر دیا گیا۔۔ یہ شاید وزیراعظم سلمان ڈمرل کا عہد تھا اور جب ان سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے تُرکی کے سب سے بڑے ناول نگار اور دنیا بھر میں تُرکی کی پہچان کو کیوں جیل میں ڈال دیا تو وزیراعظم نے کہا۔۔ بے شک وہ تُرکی کا سب سے عظیم ادیب ہے اور اگر آپ میرے بیڈروم میں جائیں تو یاشار کمال کے ناول میرے سرہانے ملیں گے لیکن کیا کریں قانون توڑنے کی سزا تو دینی پڑتی ہے۔۔ انہی زمانوں میں میرا بڑا بیٹا سلجوق اپنے کالج کی ٹیم کے ساتھ تُرکی گیا تو میں نے خواہش کی کہ وہ میرا سفرنامہ ”خانہ بدوش“ ساتھ لے جائے جس میں تُرکی کا تذکرہ بھی ہے اور استنبول میں مقیم یاشار کمال کو تلاش کر کے اسے نہ صرف یہ سفرنامہ پیش کرے بلکہ پیغام دے کہ یہ تحفہ ان کے ایک مداح اور مرید کی جانب سے ہے۔ سلجوق واپس آیا تو مجھ سے بہت ناراض ہوا، کہنے لگا ”ابّو آپ تو مجھے مروانے لگے تھے۔۔ میں استنبول کی پریس کلب میں گیا تاکہ یاشار کمال کا پتہ دریافت کر سکوں۔۔ ایک نوجوان صحافی میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے تقریباً زبردستی باہر لے گیا اور کہنے لگا: ”اے نوجوان پاکستانی تمہارا دماغ خراب ہے کہ یوں دن دہاڑے یاشار کمال کے بارے میں پوچھتے پھرتے ہو۔۔ یوں کھلے عام اس کا تذکرہ کرنا تمہارے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔۔ وہ عوام کا پسندیدہ ہے لیکن ریاست اسے پسند نہیں کرتی“۔۔ اس کے باوجود میں نے اپنے پہلے پوتے کا نام یاشار رکھا۔۔ یاشار کمال کا ایک قول میرا بہت پسندیدہ ہے جس کا متن کچھ یوں ہے کہ جب تک آپ اپنے وطن کے

دریاؤں، ندیوں، کھیتوں کھلیانوں اور شجروں سے واقف نہیں یہاں تک کسی جنگل میں اگر ایک تالاب ہے تو اس میں پرورش پانے والی مچھلیوں، مینڈکوں اور دیگر کیڑے مکوڑوں کو نہیں جانتے آپ ہرگز ایک بڑے ادیب نہیں بن سکتے۔۔ اور میں اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ آپ ایک بڑے صحافی، بڑے سیاست دان یا بڑے عالم دین بھی نہیں بن سکتے اگرچہ ہمارے ہاں بن جاتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر اپنے نیم تاریک دفتروں، شاندار پُرتعیش ڈرائنگ روموں اور حجروں میں مقیم اپنے وطن کے جغرافیے سے بھی ناواقف بڑے بن جاتے ہیں۔۔

دراصل مجھے یاشار کمال یوں یاد آیا کہ مجھے سنکیانگ کا شہر ترپان یاد آ گیا جو انگوروں کا شہر کہلاتا ہے اور پھر مجھے میاں محمد صاحب کا یہ مصرع یاد آنے لگا کہ : کِکر تے انگور چڑھایا تے ہر گچھا زخمایا۔۔ یعنی کیکر پر انگور کی بیل چڑھائی تو اس کا ہر خوشہ زخم زخم ہو گیا۔ کیا ہی دل پر اثر کرنے والی شاعری ہے اگرچہ یہ صرف ایک شاعرانہ تخیل ہے۔ پنجاب کی گرم آب و ہوا میں کیکر تو بہت ہے لیکن یہاں باقاعدہ انگور اگانا قدرے دشوار ہے۔ ہم نہایت آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ پنجاب کا اگر کوئی نمائندہ درخت ہے تو وہ کیکر ہے۔ نہایت آسانی سے پرورش پانے والا، اکثر خود رو اور بے حد کارآمد۔۔ اس کی مسواک نہایت عمدہ۔۔ اس کی چھال کا دنداسہ حُسن پرور۔ اس کی گوند نہایت اعلیٰ اور اس کے مہک آور زرد پھولوں کے درمیان شہد کی مکھیوں کے چھتے سے جو شہد حاصل ہوتا ہے وہ مقوی اور دنیا بھر میں لاجواب۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ جب کیکرپر بہار آتی ہے تو اس کے زرد پھولوں کی خوشبو کنواریوں کو بھی پاگل کر دیتی ہے۔۔ راستے اس کے پیلے پھولوں سے اٹ جاتے ہیں۔۔ ویسے تو شنید ہے کہ کیکر کی چھال سے کشید کردہ شراب بھی لاجواب ہوتی ہے لیکن چونکہ مجھے اسے چکھنے کا اتفاق نہیں ہوا اس لئے صرف شنید ہے۔ خالد اقبال جو مصوروں کے مصور ہیں، پاکستان کے سب سے بڑے لینڈ سکیپ پینٹر ان کا پسندیدہ درخت بھی کیکر ہے جب میں نے سبب پوچھا تو انہوں نے ایک عجیب انکشاف کیا، کہنے لگے ”تارڑ صاحب۔۔ دنیا بھر میں مصوری کے حوالے سے سب سے تخلیقی درخت کیکر ہے۔۔ آپ کبھی غور کیجئے گا کہ انسانوں کی مانند کوئی ایک کیکر دوسرے سے نہیں ملتا۔۔ ہر کیکر کا قد بُت، پھیلاؤ، شاخوں کی بناوٹ، گھنا پن، قامت دوسرے کیکر سے مختلف ہوتا ہے۔۔ یعنی اگر میں ایک لاکھ کیکر مصور کروں تو ہر ایک کا تخلیقی امکان سراسر مختلف ہو گا“۔ اور یقین کیجئے کہ جب میں نے مختلف سفروں کے دوران خالد صاحب کی ہدایت کے مطابق کیکر کے درختوں کو غور سے دیکھا تو واقعی وہ سب کے سب مختلف تھے۔

میرے پاس گنجائش نہیں ہے ورنہ میں پنجاب میں پائے جانے والے شاندار شجروں کو تفصیل سے بیان کرتا کہ ان سب سے میرا گہرا یارانہ ہے۔۔ یہ میری تحریروں کو مہک آور بناتے ہیں اور انہیں کڑی دھوپ سے بچاتے ہیں۔۔ مثلاً شرینہہ کیسا پرشکوہ اور شاہانہ شجر ہے۔۔ شاید درختوں میں سب سے زیادہ حساس اور رومانوی۔۔ آپ تجربہ کرسکتے ہیں کہ اگر آپ کسی کلہاڑی سے اس کے تنے پر وار کریں تو فوری طور پر اس کی چوٹی پر جھومتے پتے مرجھا جاتے ہیں اور پھر میاں محمد صاحب نے بچھڑ چکے عاشقوں کی زرد رنگت کو بھی یوں بیان کیا ہے کہ۔۔ وچھڑ گیاں دی کی اے نشانی۔۔ جیویں ڈِیگر رنگ شرینہاں۔۔ یعنی وہ جو محبوب سے بچھڑ چکے ہوتے ہیں ان کی نشانی کیا ہوتی ہے، جیسے عصر کے وقت شرینہہ کے پتوں کا رنگ ہوتا ہے۔۔ اب ایک اور انکشاف ملاحظہ کیجئے۔ ہمارے ہاں نماز کی نیت پنجابی میں کی جاتی ہے، یعنی منہ وَل کعبے شریف اور کچھ نمازوں کے نام بھی ظاہر ہے پنجابی میں ہوتے ہیں۔۔ میری بے بے جی، نانی جان ہمیشہ ”کُفتاں ویلے“ اور ”ڈیگر“ کا ذکر کرتیں۔۔ بعد میں کھلا کہ ”کُفتاں“ دراصل ”خُفتاں“ ہے۔ میں نے سنکیانگ میں ایک مسلمان سے دریافت کیا کہ آپ کی ایغور زبان میں نمازوں کے نام کیا ہیں تو اس نے ”فجر“ کے علاوہ ”ڈیگر“ کا نام لیا تو میں حیران رہ گیا کہ دراصل ”ڈیگر“ کا لفظ ایغور یا تُرکی ہے جو پنجابی میں بھی مستعمل ہے۔ جیویں ڈیگر رنگ شرینہاں!

برگد یا بوڑھ اور پیپل کے علاوہ دھریک کا درخت بھی لاجواب ہے۔ نہایت تیزی سے بڑھتا ہے اس لئے پنجابی میں ”دھیّاں دھریکاں“ کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے کہ بیٹیاں دھریک کے درخت کی مانند دنوں میں جوان ہو جاتی ہیں۔۔ دھریک کے پھولوں کی مہک بلاشبہ ایک سحرانگیز خمار سے کم نہیں۔۔ برنے کا درخت پورے جوبن پر ہو تو کہتے ہیں آدھے گاؤں پر سایہ کر دیتا ہے۔ اس کے نازک پھول جب بہار پر آتے ہیں تو ان کی

خوشبو سے مرغان چمن کے پاؤں بھی بریاول میں اُلجھ اُلجھ جاتے ہیں۔۔ اور پھر بیری کے درخت کا کیا بیان ہو۔۔ باقی صدیقی کہتے ہیں۔۔ ”جوبن اِک بیری۔۔ جیہڑا لنگھے وٹّے مارے۔۔ ویہڑے وچ لگ گئی وٹّیاں دی اک ڈھیری۔۔ جوبن اِک بیری“۔

کیکر کے بعد پنجاب کا نمائندہ ترین تالیاں بجاتے پتّوں والا درخت شیشم ہے۔۔ جسے ٹاہلی پکارا جاتا ہے۔۔ آپ کو نازیہ حسن کا گیت: ”ٹاہلی دے تھلے بیہہ کے“ یاد آ گیا ہو گا۔۔ اور پھر :” اُچیاں لمیاں ٹاہلیاں تے وچ گُجری دی پینگھ وے ماہیا“۔۔ یاد رہے کہ پنجابی میں قوس قزح کو ”گُجری دی پینگھ“ یا ”گوجر دوشیزہ کا جھولا“ کہا جاتا ہے۔ ہمیں سروثمن اور گل و بلبل سے کیا لینا دینا ہمیں تو اپنے کیکر، شرینہہ، دھریکیں، ٹاہلیاں اور برنے درکار ہیں۔۔ ہماری فاختہ اُن کی بُلبُلوں سے اچھی۔۔ ان کے گُلوں کا کیکر اور دھریک کے پھولوں سے کیا مقابلہ۔۔ اپنے دریاؤں، ندیوں اور شجروں کو جانئے، اپنے پاکستان کو جانئے، ان کے بہاؤ اور ان کی مہک کب سے آپ کی توجہ کی منتظر ہیں۔۔ جوبن اِک بیری!

23/10/13

آساں جان کے میٹ لئی آکھ وے۔۔ زبیدہ خانم

مستنصر حسین تارڑ

یہ ماسکو کی ایک شب تھی طارق چوہدری کی سیاہ لموزین برچ کے سفید جنگلوں کے درمیان آہستگی سے رواں تھی۔۔ طارق چوہدری کا شمار ماسکو کے امیر ترین افراد میں ہوتا ہے، وہ متعدد سٹیل ملوں، فیکٹریوں اور ہوٹلوں کا مالک ہے لیکن اس کے باوجود وہ اس قدر دھیما اور سادہ خصلت کا ہے کہ اس کے رویے سے قطعی طور پر ظاہر نہیں ہوتا کہ قسمت اور دولت کی دیوی اس پر اس قدر مہربان ہے۔۔ اگرچہ مجھے ماسکو سٹیٹ یونیورسٹی کی جانب سے سرکاری طور پر یونیورسٹی میں لیکچر دینے کے لئے مدعو کیا گیا تھا۔۔ اس لئے بھی کہ پچھلے پینتیس برس سے ماسکو یونیورسٹی کے اردو کے نصاب میں میری چند تحریریں شامل ہیں لیکن میری آمد کی خبر سن کر طارق چوہدری نے اصرار کیا تھا کہ میری رہائش کا بندوبست اس کے ذمے ہو گا اور اس نے اپنے ایک ذاتی ہوٹل کا سب سے آخری منزل پر واقع ”پریذیڈنشل سویٹ“ میرے لئے مخصوص کر دیا تھا اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے ذاتی کتب خانے میں میرے سفر ناموں اور ناولوں کے لئے ایک الگ شیلف وقف شدہ تھا۔۔ وہ لائل پور کا رہنے والا تھا اور اس کے اندر اتنے برسوں بعد بھی اس خطے کی محبت اور مہک۔۔ پاگل پن کی حد تک محفوظ تھی۔ ہم اس کی شاہانہ رہائش گاہ کی جانب جا رہے تھے جہاں اس نے میرے اعزاز میں ایک شاہانہ دعوت کا اہتمام کر رکھا تھا۔

” تارڑ صاحب۔۔میں ابھی تک اپنی مٹی اور اپنی زبان سے جُڑا ہوا ہوں اور میں آپ کو بتاؤں کہ وہ کون سی مدھر آواز ہے جو مجھے اپنی مٹی اور وطن کے پاس لے جاتی ہے۔۔ ”اس نے ریموٹ کا ایک بٹن دبایا۔۔ ہمارے سامنے آویزاں سکرین پر کسی پاکستانی فلم کا بلیک اینڈ وہائٹ منظر نمودار ہونے لگا۔۔ مجھے یاد نہیں کہ یہ صبیحہ خانم تھی یا مسرت نذیر لیکن مجھے یہ یاد ہے کہ ان کے لبوں سے پھوٹتا گیت زبیدہ خانم کا ”آساں جان کے میٹ لئی آکھ وے۔۔ جھوٹھی موٹھی دا پا لیا اِی ککھ وے تے ساڈھے ول تک سجناں“ تھا۔۔ شاعری بھی بے مثل، آواز کی مدھرتا بھی دل میں چھید کرتی ہوئی اور دُھن بھی باکمال۔۔ آس پاس برچ کے سفید جنگل جو گزرتے تھے مجھے محسوس ہوا کہ زبیدہ خانم کی آواز ان کے اندر سرایت کرتی انہیں جھومنے پر مائل کرتی ہے۔ ازاں بعد اس وڈیو میں تمام کے تمام گیت زبیدہ خانم کی آواز کے پیغام تھے۔۔ ”میری چُنّی دیاں ریشمی تنداں تے میں گھٹ گھٹ دینی آں گنڈاں تے چناّں تیری یاد نہ بُھلے“۔۔ خواجہ

خورشید انور کی کمپوزیشن ”ہو دل جلا نہ دل والے“ ، ”میرا نشانہ دیکھے زمانہ“، ”تیری اُلفت میں صنم بہت درد سہے“ اور پھر وہ لازوال گیت جسے گانے والی ایک الیکٹرا لڑکی نیلو نام کی صرف اس گیت کی وجہ سے پاکستان کی چوٹی کی ہیروئن بن گئی یعنی۔۔ ”آئے موسم رنگیلے سہانے تو چھٹی لے کے آ جا بالما“۔۔ اور پھر ”گھونگھٹ اٹھالوں یا گھونگھٹ چھپا لوں“، ”کیا ہوا دل پہ ستم“۔۔ طارق چوہدری کی سیاہ لموزین کے اندر ماسکو کی ایک شب میں زبیدہ خانم کے گیت ہم دونوں کو اداس کرتے تھے۔

تارڑ صاحب یہ وڈیو میں روزانہ دیکھتا ہوں۔ یہ زبیدہ خانم کی آواز ہے جس نے مجھے اپنے لائل پور کی مٹی ” سے باندھا ہوا ہے۔ آوازیں اور بھی ہیں لیکن زبیدہ کی آواز کی سادگی اور گہری اداسی کسی اور میں نہیں ہے۔ وہ گاتی ہے تو گویا میرے دل کو اپنی مٹھی میں لے لیتی ہے۔۔ بے شک اس کے اردو گانے بھی شاہکار ہیں لیکن ایک امرتسری ہونے کے حوالے سے جو پنجابی رچاؤ اس کی گائیکی میں ہے وہ کسی اور کے نصیب میں نہیں ہے“۔ زبیدہ خانم نے ایک بھرپور اور پُروقار زندگی بسر کی۔۔ اٹھہتر برس کی عمر میں لاہور میں انتقال کیا۔۔ وہ کسی پروفیشنل گھرانے سے تعلق نہ رکھتی تھی، اس کی آواز خدا کی دین تھی۔ وہ ریاضت اور مشقت سے بے نیاز تھی۔ وہ لوگ جو نصف صدی پیشتر جوانی کی آگ میں سلگتے تھے ان زمانوں میں صرف سلیم رضا جسے ہم نے کبھی یاد نہ کیا اور زبیدہ خانم ہمارے دلوں کی دھڑکن کی ترجمانی کرتے تھے۔۔ موسیقی کے رازداں یہ کہتے ہیں کہ زبیدہ خانم کی آواز اگرچہ معمولی تھی لیکن اسے جو موسیقار اور شاعر ملے وہ غیرمعمولی تھے، شاید اس میں کچھ حقیقت ہو لیکن یہ بھی تو دیکھئے کہ اگر وہ نہ ہوتی تو ان کی ترتیب دی ہوئی دھنوں اور شاعری کو کون زبان دیتا۔۔ ابھی نورجہاں ایک پلے بیک سنگر کے طور پر، نسیم بیگم، مالا، رونا لیلیٰ یا نابید اختر گائیکی کے افق پر نمودار نہ ہوئی تھیں اور یہ زبیدہ خانم تھی جس نے بقول کسے مدھر گائیکی کے قلعے کی پاسبانی کی اور اس کی گائی ہوئی نعت ”شاہِ مدینہ، یثرب کے والی، سارے نبی تیرے دَر کے سوالی“ ایک کلاسیک کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔

دراصل میری عمر کے جتنے بھی لوگ ہیں ان کے جوانی کے دن زبیدہ خانم کی گائیکی کے سُریلے جہان میں گزرے اس لئے جب کبھی کوئی ایسی ہستی اس جہان سے گزر جاتی ہے تو گویا ہماری حیات کا ایک قصہ بھی اس کے ساتھ دفن ہو جاتا ہے۔۔ کل صبح پارک میں سیر کرنے کے بعد ہم جیسے ”بزرگ“ مل بیٹھے اور زبیدہ خانم کے گائے ہوئے گیتوں کے تذکرے چل نکلے۔ ہم اسے یاد کرتے رہے بلکہ زبیدہ کے کون سے گیت کے حوالے سے اوائل جوانی میں ہمارے رومان جو اکثر یک طرفہ ہوتے تھے پروان چڑھے۔۔ ڈاکٹر نسیم کو ”دوپٹہ بے ایمان ہو گیا“ پورے کا پورا یاد تھا۔۔ ڈاکٹر انیس احمد نے کچھ ایسے شعر سنائے جن میں زبیدہ خانم کے زمانوں کی جھلکیاں تھیں، ہم مشترکہ طور پر اس گلوکارہ کے لئے اداس ہوتے اور آخر میں فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے لیکن اس سے پیشتر ہم نے اطمینان کر لیا کہ وہاں کوئی ایسا شخص تو نہیں جس کے متعصب عقیدے کے مطابق ایک گانے والی کے لئے فاتحہ پڑھنا جائز نہیں۔ دراصل مہناز بیگم کی وفات پر ایک دو حضرات نے فاتحہ پڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔

مجھے ذاتی طو رپر زبیدہ خانم کی ”شاہِ مدینہ“ کے علاوہ جو گیت سب سے زیادہ پسند ہے اور جو اکثر میرے بدن میں گونجتا رہتا ہے وہ ”آساں جان کے میٹ لئی آکھ وے“ ہے۔۔ یعنی ہم نے جان بوجھ کر آنکھ بند کر لی ہے۔۔ تو یوں محسوس ہو رہا ہے کہ وہ مری نہیں بلکہ اس نے جان بوجھ کر آنکھ بند کر لی ہے۔۔ ایک شرارت کے ساتھ کہ میں ابھی کہیں نہیں گئی بلکہ ”آساں جان کے میٹ لئی آکھ وے“۔

27/10/13

کبھی ہم خوبصورت تھے

مستنصر حسین تارڑ

انگمار برگمین سویڈن کا ایک ایسا ہدایت کار ہے جس کا شمار دنیا کے عظیم ترین ہدایت کاروں میں ہوتا ہے۔
میں نے آج سے تقریباً پچپن برس پیشتر اس کی لازوال فلم ”دے سیونتھ سِیل“ دیکھی تھی اور میں آج تک
اس کے اثر سے آزاد نہیں ہوا۔ فرید الدین عطار کی ”منطق الطیر “ کے بعد یہ ”دے سیونتھ سیل“ ہے جس
کی جھلکیاں بار بار میری تحریروں میں سے ظاہر ہوتی ہیں لیکن آج مجھے برگمین کی ایک اور فلم ”شیم“
یعنی ”شرمندگی“ کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔۔۔ اس کی کہانی کچھ یوں ہے کہ کہیں آبادیوں سے دور ایک
کسان گھرانہ ایک پر سکون اور مطمئن زندگی بسر کر رہا ہے۔ کسان دن بھر کھیتوں میں مشقت کرتا ہے اور
اس کے بیوی بچے اس کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ وہ کتابیں پڑھنے کا بھی شوقین ہے۔۔۔ فارغ وقت میں وہ ریڈیو سنتا
ہے اور کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے۔۔۔ وہ بے حد حساس طبیعت ہے۔ جانوروں اور پرندوں سے پیار کرتا ہے۔۔۔ اپنے
بچوں سے محبت کرتا ہے، بیوی پر جان دیتا ہے۔البتہ بیوی اس کی حساس طبیعت سے بے حد تنگ ہے
کیونکہ وہ خوراک کے لیے بھی کسی جانور کو ہلاک نہیں کر سکتا۔ ایک مرتبہ اس کی بیوی اس کے ہاتھ میں
چھروں والی بندوق تھما دیتی ہے کہ تم اگر مرغی کی گردن پر چھری نہیں پھیر سکتے تو اس بندوق سے
فائر کر کے دو تین مرغیاں مار ڈالو۔ ہمیں گوشت کی ضرورت ہے اور وہ کسان لبلبی بھی نہیں دبا سکتا۔
مرغیوں کو مار نہیں سکتا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ ایک شب دور سے دھماکوں کی آواز آنے
لگتی ہے، گولیاں چلنے لگتی ہیں۔ ریڈیو پر خبر آتی ہے کہ جنگ شروع ہو گئی ہے۔ دو تین روز بعد دھماکوں
اور گولیوں کی آوازیں نزدیک آ جاتی ہیں۔ جنگ اُن کی دہلیز تک آنے والی ہے۔ اس کی بیوی کہتی ہے کہ ہمیں
یہاں سے منتقل ہو جانا چاہیے لیکن وہ کہتا ہے کہ ہمارا اس جنگ سے کیسا رابطہ۔ ہم تو یہ بھی نہیں
جانتے کہ یہ کون لوگ ہیں جو تباہی پھیلا رہے ہیں اور کیوں جنگ کر رہے ہیں۔۔۔ میں اپنا گھر چھوڑ کر نہیں
جاؤں گا۔ قصہ مختصر توپوں کے گولے اُن کے کھیتوں میں گرنے لگتے ہیں پھر فوجی اُن کے گھر پر یلغار کرتے
ہیں۔۔۔ اُس کی بیوی کو بے آبرو کرتے ہیں۔۔۔ وہ لاشیں دیکھتا ہے۔ انسانوں کو ایک دوسرے کو ہلاک کرتے
دیکھتا ہے۔۔۔ ذبح کرتے دیکھتا ہے۔۔۔ اس
کے سامنے انسانوں کے پرخچے اڑتے ہیں اور پھر اس میں ایک تبدیلی آنے لگتی ہے۔۔۔ وہ ایک مرے ہوئے
سپاہی کی بندوق اٹھا کر بے دریغ یہ جانے بغیر کہ وہ کون ہیں، دشمن ہیں بھی کہ نہیں لوگوں کو بے دردی
سے ہلاک کرنے لگتا ہے۔ اپنی بیوی پر ہاتھ اٹھاتا ہے، بچوں کو پیٹتا ہے۔۔۔ وہ خون دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ وہ
کسان جو ایک مرغی کو بھی ہلاک نہیں کر سکتا تھا جنگ نے اسے بھی ایک وحشی درندے میں بدل دیا
ہے۔۔۔ اس کی انسانی خصلت تبدیل ہو گئی ہے۔
کیا آپ کو محسوس ہوا کہ برگمین کی فلم ”شرمندگی“ کی کہانی ہماری آج کی کہانی ہے۔۔۔ کبھی ہم
خوبصورت تھے، پُر امن اور حساس تھے، کسی کو ہلاک کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے
کبھی ہم خوبصورت تھے،

کتابوں میں بسی خوشبو کی صورت
سانس ساکن تھی!
بہت سے ان کہے لفظوں سے تصویریں بناتے تھے
پرندوں کے پروں پر نظم لکھ کر
دور کی جھیلوں میں بسنے والے لوگوں کو سناتے تھے
جو ہم سے دور تھے
لیکن ہمارے پاس رہتے تھے
نئے دن کی مسافت
جب کرن کے ساتھ آنگن میں اترتی تھی
تو ہم کہتے تھے۔۔۔ امی
تتلیوں کے پر بہت ہی خوبصورت ہیں
ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو

کہ ہم کو تتلیوں کے، جگنوؤں کے دیس جانا ہے
ہمیں رنگوں کے جگنو، روشنی کی تتلیاں آواز دیتی ہیں
نئے دن کی ساخت رنگ میں ڈوبی ہوا کے ساتھ
کھڑکی سے بلاتی ہے
'ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو!
(احمد شمیم)
اور پھر یہ دن بیت گئے۔ افغان ”جہاد“ کے ثمرات میں سے مختلف ثمر ہمارے صحن میں آ کر گرنے لگے اور یہ خود کش ثمر ہوتے ہیں جو ہمیں ہمارے بچوں اور بوڑھوں سمیت ہلاک کر ڈالتے ہیں۔ ضیاء الحق کے تاریک زمانوں میں زبان و بیاں پر جو پابندیاں عائد تھیں، اُن سے ہم واقف تھے، ہم جانتے تھے کہ خلاف ورزی کی پاداش میں کم از کم کوڑے اور زیادہ سے زیادہ موت منتظر ہو گی اور اس کے باوجود اس سیاہ دور میں دائیں اور بائیں بازو کی تخصیص کے بارے میں شاندار مزاحمتی ادب تخلیق کیا گیا۔ شاعروں کو سہولت تھی اور کہ وہ اشاروں کنایوں میں استعاروں کی مدد سے جبر کی صورت حال کا اظہار کر ڈالتے تھے جب کہ نثر میں آپ کو عیاں ہونا پڑتا ہے۔۔ نثر دراصل ایک ایف آئی آر ہوتی ہے جو آپ خود لکھتے ہیں اور گواہ کے طور پر اپنے دستخط ثبت کرتے ہیں۔۔ میں تفصیل میں نہیں جاتا لیکن میرے کم از کم ایک افسانے ”بابا بگلوس“ کی پاداش میں ایک برس تک ٹیلی ویژن کے دروازے مجھ پر بند کر دیے گئے جو ان دنوں میرا واحد ذریعہ روزگار تھا۔۔ ایک سرکاری اخبار نے یہاں تک لکھا کہ یہ افسانہ لکھنے کے جرم میں مجھے پھانسی دینی چاہیے۔
بعد میں اس افسانے سے متاثر ہو کر گلزار نے دو نظمیں لکھیں جو اُن کے ایک شعری مجموعے میں شامل ہیں۔۔ لیکن اس کے باوجود ہمیں قلق نہ ہوتا تھا کیونکہ ہم نے اپنے ضمیر کی آواز پر یہ اظہار کیا تھا لیکن ان دنوں صورت حال مختلف ہو چکی ہے۔۔ اُن زمانوں میں ریاست کی جانب سے پابندیاں عائد ہوتی تھیں، کوڑے لگائے جاتے تھے اور پھانسیاں دی جاتی تھیں جب کہ معاشرہ ہماری مزاحمتی ادبی کاوشوں کی تحسین کرتا تھا اور ان زمانوں میں ریاست کی جانب سے کوئی پابندی نہیں، میڈیا آزاد ہے، آپ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں، لکھ سکتے ہیں لیکن اب معاشرے نے جبر اور ظلم اختیار کر لیا ہے۔۔ معاشرے میں ایسے افراد ہیں جنہوں نے جبر اور تعصب کے پرچم اٹھائے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کبھی ایک مرغی بھی ہلاک نہیں کر سکتے تھے۔ اتنے پر امن تھے لیکن جب سے ”جنگ“ کا آغاز ہوا ہے اس کی ہولناکیوں اور سفاکیوں نے آہستہ آہستہ انہیں بھی بے حس کر دیا ہے۔۔ اور وہ کیا کہتے ہیں کہ ’دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف۔۔اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی‘۔۔ ایک ہی شمارے میں ملالہ کے بارے میں تنقیدی کالموں کے ردعمل میں عارف نظامی نے ”ملالہ کو معاف کر دیجیے“ لکھا۔۔ شکریہ نظامی صاحب۔۔ میری بھی یہی درخواست ہے کہ۔۔ ملالہ کو معاف کر دیجیے اگرچہ وہ ملکی سلامتی کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے اور اس نے ہزاروں لوگوں کو بموں سے اڑا دیا ہے پھر بھی معاف کر دیجیے۔
ریاستی جبر ہمیشہ ایک مخصوص مدت کے لیے ہوتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کسی سی ون تھرٹی کی صورت میں فضل کر دیتا ہے لیکن معاشرے کے جبر کی کوئی طے شدہ مدت نہیں ہوتی۔۔ یہ طویل مدت کے لیے آتا ہے اور پھر جاتے جاتے جاتا ہے، اگر جاتا ہے تو!

30/10/13

سوچ کے دریا سے ابھرے گا ایک سفینہ۔۔ احمد شمیم
مستنصر حسین تارڑ
اپنے گزشتہ کالم میں، مَیں نے احمد شمیم کی نیرہ نور کی گائی ہوئی نظم ”کبھی ہم خوبصورت تھے“ کا

حوالہ دیا تھا۔۔ ایک پُرتاثیر نظم لکھنا مشکل ہوتا ہے، آپ کے پاس نہ تو قافیے ردیف کی قلابازیاں ہوتی ہیں اور نہ ہی آپ بے وجہ شوکت الفاظ کی ڈفلیاں بجا سکتے ہیں۔۔ اور ایک نظم کو آواز اور سُر میں ڈھالنا بھی کچھ کم مشکل نہیں ہوتا۔۔ لیکن "کبھی ہم خوبصورت تھے" کو نیر ہ نور نے جس طور ایک گہرے جذبے اور سُر سانس کے ساتھ گایا تو گویا اس نظم کو تتلیوں کے پَر لگ گئے اور یہ ہم سب کے دلوں میں اُتر کر پھڑپھڑانے لگی۔۔ تتلیوں کے پروں کے کچے رنگ ہمارے خون میں گردش کرتے ہمارے اندرون کو رنگین کر گئے۔۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ ہم احمد شمیم جیسے ترقی پسند کو آج یاد کر لیں۔۔ آج کے دَور میں جبکہ اچھی شاعری دبک کر گمنامی کے کونے میں جا بیٹھی ہے اور بُری شاعری ٹیلی ویژن، شاعروں اور اخباروں میں راج کرتی ہے ہم احمد شمیم کو یاد کر لیں اور ہمیں احساس ہو کہ بڑی شاعری کیا ہوتی ہے۔۔ احمد شمیم بلکہ آفتاب اقبال شمیم بھی میرے من پسند نظم گو ہیں۔ ایک شاعر کے بارے میں کہا گیا کہ وہ ایک مشہور شاعر ہے لیکن وہ ایک اچھا شاعر نہیں ہے۔۔ کسی نے کسی کے بارے میں یہ کہا، مجھے بھِڑوں کے چھتّے میں ہاتھ ڈالنے کی کیا ضرورت ہے۔۔ یہ نہیں کہ ان دنوں اچھی شاعری نہیں ہو رہی، بے شک ہمارے درمیان میں چند ایک کمال کے شاعر ہیں لیکن بُری شاعری کی بھرمار میں اچھی شاعری دفن ہوتی جاتی ہے۔۔ ویسے نظم کے حوالے سے مجھے مجید امجد، ن۔م۔ راشد، فیض اور اختر حسین جعفری اسی ترتیب سے پسند ہیں، عہدِ حاضر میں گلزار اور وحید احمد میرے دل کو لگتے ہیں۔۔ جبکہ نہ صرف احمد شمیم کشمیر کو اپنے وطن کی جنت کو ساری عمر یاد کرتا رہا لیکن وہ اس جنت میں دوبارہ نہ جا سکا۔ "وہ سرینگر کے ایک خوبصورت گوشۂ چنار کا مکین تھا، وہاں کی خوش رنگ فضاؤں میں پل کر جوان ہونے والا ہجرت تک چناروں کی آگ اپنے اندر سموتا رہا، کشمیر کی محبت اور اس سے دوری کا احساس، اس کی شاعری میں ٹھنڈک، مٹی کی خوشبو، ہواؤں کی لچک، چاند ستاروں کی روشنی اور گُل لالہ کی مہک کی طرح رچا بسا تھا۔ کشمیر سے دوری اور اپنی دھرتی سے محبت احمد شمیم کی شاعری کے جذباتی اور فکری مسائل کا مرکز اور محور نظر آتے ہیں"۔ احمد شمیم نے کشمیر کی آزادی کی خاطر بھارتی جیل بھی کاٹی:

جب ست رنگی آوازوں کی برکھا برسے بستی پر
سارے زخم ہرے ہو جائیں یاد آئے کشمیر بہت
اور بھی ہوں گے مُلک بہت سے ہرے بھرے کھیتوں والے
لیکن اُس مٹی کی خوشبو پاؤں کی زنجیر بہت

"کبھی ہم خوبصورت تھے" بھی کشمیر کے سوگ میں لکھی گئی نظم ہے۔ احمد شمیم نے اردو اور انگریزی کے علاوہ کشمیری زبان میں بھی اتنی بڑی شاعری کی کہ غلام احمد مہجور کے بعد انہیں اہم ترین کشمیری شاعر تسلیم کیا گیا۔۔ میرے سامنے اس کی کُلیات "کبھی ہم خوبصورت تھے" کی صورت کُھلی ہے اور میں چناؤ نہیں کر رہا جو بھی ورق سامنے آیا اس پر لکھی شاعری کو آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں تاکہ آپ ایک بڑے شاعر کی تخلیقی قربت سے لطف اندوز ہو سکیں۔

ہنستے بولتے لوگ بھی ہم کو حیراں حیراں تکتے ہیں
تو ہی بتا اے راہ تمنا ہم کس دیس سے آئے ہیں
تم اِک چاک گریباں دیکھ کے ہم کو رسوا کرنے لگے
اچھا کیا جو ہم نے تم سے دل کے چاک چھپائے ہیں
چین کہاں لینے دیتی ہے درد کی میٹھی میٹھی آگ
ہم نے چھپ کر دامن شب میں کتنے اشک بہائے ہیں
ایک ذرا سی بات تھی لاکھوں افسانے مشہور ہوئے
ہم بھی تیرے پیار کے صدقے دیوانے مشہور ہوئے

ہم کو تنہا تنہا چھوڑ کے کس نگری کو چلتے ہو۔۔چُپ چُپ چلنے والے لمحو ٹھہرو ہم بھی چلتے ہیں۔۔اپنی یادوں میں بسا رکھی ہیں کیا کیا صورتیں۔۔ سنگدل، گل رو، سمن بر، شعلہ آسا صورتیں ۔۔اور ہوں گے جن کے سینے میں اجالا کر گئیں۔۔ ہم کو یارو دے گئیں داغِ تمنا صورتیں ۔۔جب بھی تنہائی کے آنگن میں سنی

قدموں کی چاپ۔۔ درد بن بن کر ابھر آئیں سراپا صورتیں۔۔سوچ کے صحرا میں مرجھایا ہوا نخل خیال۔۔چھوڑ کے ایسے گئی ہیں ہم کو تنہا صورتیں۔۔خاک میں مِلتے دیکھے ہم نے کیا کیا راج دُلارے لوگ۔۔کیسی سُندر سندر کلیاں، کیسے پیارے پیارے لوگ۔۔میرؔ ملیں تو ان سے کہیو اب بھی اس دکھ نگری میں۔۔تیرے بہانے، اپنے فسانے، کہتے ہیں دکھیارے لوگ۔۔دھوپ کو اپنے گھروندوں میں سمیٹے رکھو ۔۔جانے کب برف پہاڑوں سے اترنا چاہے۔۔کون تجھ کو میرے ہونے سے رہائی دے گا۔۔جو ملے گا میرا ہم شکل دکھائی دے گا

احمد شمیم بیشتر شعراء کی مانند نعت کہتے نہیں تھے، بناتے اور گھڑتے نہیں بلکہ عشق رسولؐ ایک بے اختیار جھرنے کی مانند اُن کے سینے میں سے پھوٹتا انہیں سیراب کرتا تھا۔

ہم بھٹکتے ہیں خلاؤں میں صدا کی صورت
کون سنتا ہے ہمیں حرف دعا کی صورت
دل کے صحراؤں میں گونجی ہے دعا زمزم کی
یا نبیؐ تیری شفا برسے گھٹا کی صورت
تیرے انفاس میں چمکا ہے سماوات کا نور
تیری صورت میں نظر آئی خدا کی صورت
ریت میں پھول کِھلے تیری محبت کے طفیل
دھوپ ویرانوں پہ برسی ہے گھٹا کی صورت

احمد شمیم کے تخلیقی معجزے کا نکھار نظم میں ہے لیکن گنجائش کم ہے۔۔ غزل کی مانند آپ ایک دو شعروں کا چناؤ نہیں کر سکتے نظم کا تاثر اس کی کاملیت میں ہی ظاہر ہوتا ہے تو ان کی صرف ایک نظم پیش خدمت ہے۔۔ اس کی آخری دو سطروں نے تو میرا دل روک دیا۔۔ یہ ایک نعتیہ نظم ہے۔

میری عُمر کا سرکش گھوڑا۔۔چلتے چلتے تھک جائے گا ۔۔اپنے لہو میں سورج، ستارے اور دھرتی بہہ جائیں گے۔۔میں صدیوں کی نیندیں اوڑھ کے سو جاؤں گا ۔۔ رُت کا فسوں، بارش کا نوحہ، بین ہوا کا۔۔دن اور رات کے سب ہنگامے۔۔مجھ سے جدا فریاد کریں گے۔۔ جانے والے، آنے والے۔۔ مجھ کو بھولنے کی خواہش میں۔۔مجھ کو اکثر یاد کریں گے۔۔پھر صدیوں کے صحراؤں میں۔۔میری صورت۔۔آنے والے، جانے والے کھو جائیں گے!۔۔پھر آواز کی آہٹ سُن کر۔۔صدیوں کے در کھل جائیں گے۔۔میں اعمال کا میلا کُرتا، اوڑھ کے۔۔زندہ ہو جاؤں گا۔۔تیز ہوا میں۔۔تپتی دھوپ میں۔۔جلتی بارش کے طوفان میں ۔۔ میں سوچوں گا۔۔ کیا سوچوں گا۔۔سوچوں گا۔۔ سوچ کے دریا سے اُبھرے گا ایک سفینہ۔۔شہرِ مدینہ!

4/11/13

قصویٰ کی شان میں

مستنصر حسین تارڑ

چلئے آج میں آپ کے سامنے چودہ سو برس پیشتر کی کچھ تصویریں مصور کرتا ہوں۔ اُن کو آپ کی آنکھوں کے سامنے ناداری کے باوجود اپنے لفظوں سے متحرک کرتا ہوں۔ چلئے ہم آج کی ہولناک حقیقتوں سے لمحہ بھر کے لیے فرار حاصل کرتے ہیں جہاں ایک من پسند شریعت ایجاد کی جا رہی ہے جس کے تحت سیکڑوں اہل کتاب کو اُن کے بال بچوں سمیت ہلاک کر دینا اُنہیں جلا ڈالنا جائز ٹھہرایا جا رہا ہے۔ جائز ٹھہرایا جا رہا ہے بچیوں کے قتل کو۔۔ میرے ملک کے جاں نثار نوجوانوں کو ذبح کرنا اور اُن کے سر، کھمبوں پر آویزاں کر دینا جائز ٹھہرایا جا رہا ہے تو چلئے کچھ لمحوں کے لیے ہم اُن زمانوں میں چلتے ہیں جن زمانوں میں اگر ہمیں ایک لمحے کی زندگی نصیب ہو جاتی اور اُس لمحے میں ہم نبیوں میں رحمت لقب پانے والے دنیا کے سب سے خوبصورت انسان کے سراپے پر صرف ایک لمحہ آنکھیں بچھا سکتے تو ہم بلکہ میں اس چوہتر برس کی حیات کو بخوشی اُس لمحے کے لیے قربان کر دیتا۔

چلئے ہم چودہ سو برس پیشتر کے اُن زمانوں میں چلتے ہیں جب ہم خوبصورت تھے اور ایک اونٹنی کو یاد کرتے ہیں۔۔ اُس کے سوار کو یاد کرتے ہیں۔
قبا کے لوگ۔۔ یثرب سے کچھ فاصلے پر واقع ایک بستی کے لوگ، اُن تک خبر پہنچ چکی تھی کہ دو ' سانڈھنی سوار کسی بھی لمحے اُن کی بستی سے آغاز ہوتے صحرا میں سے نمودار ہونے والے ہیں۔ تو وہ اُس سویر بھی اپنی چھتوں پر چڑھ کر اُن کا انتظار کرتے رہے۔۔ اپنی آنکھیں اُن کے قدموں میں بچھانے کے منتظر رہے۔ دوپہر ہو گئی اور وہ نہ آئے تو لوگ مایوس ہو کر اپنے گھروں میں چلے گئے کہ اب اُن کی آمد کا کچھ امکان نہ تھا۔ صحرا دوپہر میں اتنا آتش پرست ہو جاتا ہے کہ اُس میں سفر ممکن نہیں ہوتا۔۔ اور پھر اُن کے کانوں میں ایک شخص کی پکار آتی ہے کہ لوگوتم جن کے منتظر تھے وہ افق پر نمودار ہو چکے ہیں، وہ آ رہے ہیں۔ لوگ گھروں سے نکل آئے، چھتوں پر چڑھ گئے اور تب انہوں نے دیکھا کہ آنکھوں کو چندھیا دینے والی سورج کی تپش سے جنم لینے والی گرم لہروں کے سراب میں سے دو سانڈھنی سوار۔۔ سفید۔۔ پگھلتے چاندی کے رنگ کے سفید براق پیر اہنوں میں ملبوس اُن کی جانب چلے آ رہے ہیں اور وہ مخمصے میں ہیں کہ ان دونوں میں وہ کون ہے جو نبیوں میں رحمت لقب پانے والا ہے۔۔ وہ کون ہے جو صرف اس جہان کے لیے نہیں، کل جہانوں کے لیے۔۔ وہ جہان جو تخلیق ہو چکے اور وہ جہان جو آئندہ تخلیق ہوں گے اُن سب کے لیے رحمت کا باعث ہو گا۔ وہ سانڈھنی سوار اُن کے قریب آ کر اپنی سانڈھنیوں سے اترتے ہیں۔ اُن سے سلام کلام کر کے اُن کے سامنے ریت پر بیٹھ جاتے ہیں۔۔ اُن سے باتیں کرنے لگتے ہیں۔۔ بیٹھے وہ سائے میں تھے لیکن اب اُن پر دھوپ آ جاتی ہے۔ اُن میں سے ایک اٹھتا ہے اور دوسرے پر اپنی چادر کا سایہ کر دیتا ہے۔ تب قبا کے لوگ جان جاتے ہیں کہ جس پر چادر کا سایہ کیا گیا وہ ہے جس کی آمد کے وہ منتظر تھے اور جس نے اپنی چادر سے اپنے یار کو دھوپ سے بچایا ہے وہ یارغار ہے۔ سائے میں تشریف فرما رسول اللہؐ اور سایہ کرنے والے حضرت ابوبکر صدیقؓ۔۔ کہ یاری تو یہی ہے کہ اپنے آپ کو دھوپ میں جلانا اور اپنے یار کو سائے میں بٹھانا۔ انہوں نے اپنی اونٹنیوں کو بستی میں داخل ہونے پر کھجور کے درخت کے تنے کے ساتھ باندھ دیا تھا اور اُن میں سے ایک کا مُہاندرا بہت سوہنا اور سجیلا ہے اور ایک جذبۂ تفاخر اُس کے انداز میں ہے اور یہ قصویٰ ہے جس پر سوار ہو کر رسول اللہؐ نے ہجرت کا سفر پُر دشوار اور پُر خطر طے کیا۔ غار ثور میں قیام کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ نے رسول اللہؐ کی خدمت میں قصویٰ تحفے کے طور پر پیش کی لیکن انہوں نے انکار کر دیا کہ نہیں آپ اس کی قیمت طے کریں میں اس کی ادائیگی کروں گا اور اس پر سوار ہوں گا۔۔ حضرت ابوبکرؓ اصرار کرتے ہیں لیکن رسول اللہؐ اونٹنی تحفے کے طور پر قبول کرنے پر مائل نہیں ہوتے۔
حضرت ابوبکر صدیقؓ تامل کرتے ہیں لیکن وہ جانتے ہیں کہ رسول اللہؐ راضی نہیں ہوں گے چنانچہ مجبوراً قصویٰ کی قیمت بتاتے ہیں اور پھر رسول اللہؐ اُس اونٹنی کے لیے ادائیگی کر کے اس کے مالک بن جاتے ہیں۔۔ اور وہ اونٹنی جونہی رسول اللہؐ اس پر سوار ہوتے ہیں دنیا بھر کے جانوروں سے افضل ہو جاتی ہے، وہ اترائے نہ تو اور کیا کرے اس کے نصیب جاگ اُٹھے کہ اُس کے نصیب میں یہ کیسا سوار آ گیا ہے، اُس کے بھاگ جاگ اٹھے کہ وہ اس شخص کی ملکیت میں آ گئی تھی جس کی غلامی میں آنے کے لیے چرند، پرند اور انسان ترستے تھے، بے دام غلام ہونا چاہتے تھے۔۔ پر اُن کے نصیب نہ تھے، یہ قصویٰ تھی جو اُن پر سبقت حاصل کر گئی کہ یہ اُس کے نصیب تھے۔۔ یہ بھاگوں والی اونٹنی زندگی بھر رسول اللہؐ کے ساتھ رہی۔۔ دن رات رہی۔۔ جنگ میں، امن میں وہ اپنے سوار کو لیے پھری کہ اُس کا تو بوجھ ہی نہ تھا، وہ ایک پر کی مانند ہلکا اور ہوا کے ایک جھونکے کی مانند لطیف اور کیف آور تھا۔۔ وہ اس پر سوار ہوتا تو اس کی تھکن اتر جاتی۔۔ اس کے وجود کی موجودگی اسے تروتازہ کرتی چلی جاتی۔ جب وہ اس پر سواری کرتا، جتنا عرصہ کرتا وہ مسرت سے لبریز رہتی اور جب اترتا تو وہ غمگین ہوجاتی۔۔ یہ تھی قصویٰ۔
اچھا اب یہ تصویر بنتی ہے کہ صحرا کے سراب میں سے دو سانڈھنی سوار جھملاتے ہوئے نمودار ہوتے ہیں اور وہ صاف شفاف سفید براق پیراہنوں میں ملبوس ہیں جو دھوپ کی تیزی میں دمکتے ہیں تو معاً یہ خیال آتا ہے کہ مکہ سے اتنے دنوں کی مسافت کے دوران اُن کے کپڑے تو میلے کچیلے ہونے چاہئیں لیکن وہ تو نئے اور شاندار ہیں تو اس کی توجیہہ بھی نہایت خوبصورت ہے۔ وہ دونوں عام طور پر دن کے وقت سفر کرنے سے

گریز کرتے تھے اس لیے کہ دن کی تیز دھوپ میں صحرا میں مسلسل سفر کرنا بے حد اذیت ناک ہوتا ہے، علاوہ ازیں قریش کے تعاقب کا خدشہ بھی موجود تھا۔ چنانچہ ہجرت کے پہلے دو چار دنوں کے علاوہ انہوں نے رات کے سفر کو ہی اپنایا۔۔۔ اور اس روز جب اہل قُبا بہت دیر انتظار کرنے کے بعد چھتوں سے اتر گئے تھے وہ بھی اس لیے کہ دھوپ تیز ہو چکی تھی اور اس میں سفر کرنا ممکن نہ تھا جب کہ وہ قُبا سے اتنے قریب ہو چکے تھے کہ انہوں نے کہیں قیام کرنے کی بجائے یہی بہتر جانا کہ دھوپ کی اذیت کچھ دیر برداشت کر لیں اور قُبا پہنچ جائیں۔ بہر طور ایک روز مسافت کے دوران انہوں نے صحرا کے کناروں پر نمودار ہوتے ایک قافلے کو یکدم اپنے سامنے پایا اور انہیں گمان ہوا کہ شاید یہ اُن کے دشمن قریش ہیں جو ان کے تعاقب میں ہیں لیکن معلوم ہوا کہ اس قافلے کے سالار حضرت ابو بکر صدیقؓ کے سگے بھتیجے ہیں جو ملک شام سے قریش کے سرداروں کے لیے نہایت بیش قیمت کپڑا لے کر واپس مکہ جا رہے ہیں۔ انہوں نے جب اپنے چچا اور رسول اللہ ؐ کو سفر کی دھوپ سے اٹے میلے کچیلے لباس میں دیکھا تو بے حد رنجیدہ ہوئے اور ان دونوں کی خدمت میں نئے سفید پیراہن پیش کر دیے۔ مجھے گمان ہے کہ رسول اللہؐ نے اپنے پیراہن کی قیمت ادا کی ہو گی۔۔۔ چنانچہ ان دونوں نے نئے سفید کپڑے پہنے اور سفر جاری رکھا۔ قُبا میں آمد پر اگر وہ صاف ستھرے سفید ملبوسات میں تھے تو اس کی یہی توجیہہ تھی۔

رسول اللہؐ کی حیات مبارکہ میں ہجرت کا باب ہمیشہ مجھ پر ایک خاص کیفیت طاری کر دیتا ہے۔۔۔ اور ہمیشہ میرے سامنے وہی منظر آجاتا ہے۔۔۔ دو سانڈھنی سوار سفید براق پیراہنوں میں صحرا کے سراب میں جگمگاتے ہوئے۔ آپ بھی کبھی اس منظر کو چشم تصور میں لائیے۔۔۔ تیز دھوپ ہے اور صحر امیں گرمی کی لہریں ایک سراب کی صورت اور اس سراب میں سے دو سفید پوش سانڈھنی سوار حقیقت کا روپ دھار کر ہولے ہولے آپ کی جانب چلے آ رہے ہیں۔۔۔ اور اُن میں سے ایک قصویٰ کا سوار ہے اور اس کے نورانی حُسن کے سامنے سورج ماند پڑتا ہے، آنکھیں نہ جھپکئے تو وہ آپ کے دل کے اندر اترتا چلا جائے گا۔۔۔ قصویٰ کا سوار ایسا ہے۔

(جاری ہے)

6/11/13

سادھے سجناں دی ڈاچی بادامی رنگ دی

مستنصر حسین تارڑ

محترم صلاح الدین محمود اللہ تعالیٰ انہیں جنت نصیب کرے میرے نہایت عزیز دوست تھے۔ ان کے جذبوں کا کچھ شمار نہ تھا.... سب سے محبوب عشق کتاب کا تھا.... پوری دنیا کی فلموں سے شغف تھا، موسیقی پر عبور حاصل تھا.... میرا بائی کے بھجن بھی عقیدت سے سنتے۔ ادبی جریدے ”سویرا“ کے ایڈیٹر رہے، مصوری کی پرکھ بھی رکھتے تھے، کمال کے شاعر تھے اور عشق رسول میں فنا تھے۔ ان کی بہت بڑی خواہش تھی کہ وہ اس راستے پر سفر کریں جس پر آج سے چودہ سو برس پیشتر دو سانڈھنی سوار چلے تھے.... لیکن سعودی حکومت کی جانب سے اجازت نامہ نہ مل سکا.... سعودی اپنی سلطنت کے اندرون تک جانے کی اجازت کسی کو نہ دیتے تھے بہرطور سفارشوں اور رابطوں کا کچھ اثر ہوا اور صلاح الدین محمود کو مکہ سے مدینہ جانے والے اس راستے پر صرف دو دن سفر کرنے کی اجازت مل گئی، ان کے ہمراہ ایک مسلح محافظ بھی تھا.... میں اکثر ان سے فرمائش کرتا کہ وہ اس مختصر سفر کی روئیداد سنائیں لیکن وہ سنا نہ سکتے اور جذباتی ہو جاتے.... ایک روز خود ہی کہنے لگے.... مقام وہی تھا جہاں رسول اللہ نے ایک شب گزاری تھی.... یعنی علاقہ تقریباً وہی تھا.... میں کھلے آسمان تلے سویا، فجر کے وقت آنکھ کھلی تو ہلکی سی ٹھنڈک کا احساس ہوا.... ہولے سے ایک ہوا چل رہی تھی جس میں خنکی تھی اور پھر میرے رخساروں کو اس ہوا کے ایک خنک جھونکے نے چھوا.... معاً مجھے خیال آیا کہ تب بھی یہی خنک ہوا ہو گی اور اس نے بھی میرے رسول اللہ کے رخساروں کو چھوا ہو گا.... صلاح الدین محمود کی آنکھیں بھیگنے لگیں، گلا رُندھ گیا اور وہ کچھ کہہ نہ سکے.... ازاں بعد وہ جب بھی اس سفر کی داستان سناتے اس مقام پر پہنچ کر آبدیدہ

ہو جاتے اور چُپ ہو جاتے.... انہی زمانوں میں میرے دل میں بھی اس تمنا نے جنم لیا کہ کاش میں بھی
ہجرت کے اس راستے پر سفر کروں، انہی منزلوں پر قیام کروں جہاں میرے رسول اللہ کے نقش پا ثبت
ہوئے.... میری یہ خواہش تو پوری نہ ہو سکی البتہ غار حرا میں ایک رات گزارنے کا مجھے موقع مل گیا اور یہ
میری حیات کی سب سے بخت آور رات تھی.... اور یہ میرے بخت میں خصوصی طور پر لکھی گئی تھی اس
لئے میرے نصیب میں آئی۔

آیئے ہم واپس چلتے ہیں قبا جہاں سے قصویٰ اپنے سوار کو مدینہ کی جانب لئے جاتی ہے.... رسول اللہ نہ
مقام قبا بنی عمرو بن عوف کے محلے میں تین روز ٹھہرے اور پھر مدینے کا سفر اختیار کیا.... تب سالم بن
عوف کے چند لوگ حاضر ہوئے اور عرض کی، اے اللہ کے رسول آپ ہمارے پاس تشریف فرما ہوں.... جو تعداد،
سازوسامان اور عزت میں زیادہ ہیں۔ آپ نے قصویٰ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ”اس کا راستہ چھوڑ دو
کیونکہ یہ اللہ کی طرف سے مامور ہے“ ان لوگوں نے راہ چھوڑ دی اور وہ چلی یہاں تک کہ بنی بیاضہ کے
احاطے کے برابر پہنچی تو ان کے چند افراد آپ

سے ملے اور عرض کی، اے اللہ کے رسول ہمارے پاس تشریف رکھئے جو تعداد، سازوسامان اور عزت میں
زیادہ ہیں، زیادہ تعداد والوں، سازوسامان والوں اور عزت والوں میں تشریف لایئے .... فرمایا، اس کا راستہ چھوڑ
دو کیونکہ یہ اللہ کی طرف سے مامور ہے.... ان لوگوں نے راہ چھوڑ دی اور وہ چلی.... راستے میں بنی
ساعدہ والوں نے بھی درخواست کی اور انہیں بھی یہی جواب ملا.... اونٹنی چلی یہاں تک کہ بنو عدی بن
نجار کے احاطے میں سے گزری جو رسول اللہ کے رشتے کے ماموں تھے، ان لوگوں نے بھی عرض کی کہ
اے اللہ کے رسول اپنے ننھیال میں تشریف لایئے تو انہیں بھی رسول اللہ نے یہی جواب میں کہا کہ.... اس
کی راہ چھوڑ دو کیونکہ یہ اللہ کی طرف سے مامور ہے.... جب میں سیرت النبی میں ہجرت کا یہ باب انتہائی
عقیدت اور دلچسپی سے پڑھ رہا تھا تو مجھ پر ایک عجیب انکشاف ہوا.... قصویٰ کوئی معمولی اونٹنی نہ
تھی، اسے تو پیدا ہی رسول اللہ کی سواری کے لئے کیا گیا تھا اور اسے خصوصی طور پر اللہ تعالیٰ نے
ایسی فہم و دانش سے نوازا تھا جو کسی اور جانور کے نصیب میں نہ آئی.... کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے
مامور کرنا تھا، اسے حکم دینا تھا کہ وہ کہاں ٹھہرے.... ہدایت کرنی تھی بس یہی مقام ہے جو تم نے رُک
جانا ہے.... اور قصویٰ اللہ تعالیٰ کے احکام سمجھنے والی تھی، وہ جانتی تھی کہ اسے چن لیا گیا ہے،
مامور کر دیا گیا ہے....یعنی قصویٰ معمولی اونٹنی نہ تھی وہ لاکھوں انسانوں سے زیادہ سمجھدار تھی،
اسے ایک ایسا دماغ عطا کیا گیا تھا جو اللہ تعالیٰ کے احکام وصول کر کے ان پر عمل کرنے کی صلاحیت
رکھتا تھا اور یہ بھی کوئی معمولی دماغ نہ تھا اس نے اللہ تعالیٰ کی رضا سے فیصلہ کرنا تھا کہ کون سا
مقام میرے عظیم سوار کے لئے موزوں ہے.... کیونکہ اس نے جہاں بیٹھنا تھا وہ جگہ ہمیشہ کے لئے درخشاں
اور تاباں ہو جانی تھی.... اس نے تاریخ ہو جانا تھا.... اس مقام کے لوگ یکدم گمنامی کے اندھیروں میں سے
نکل کر پوری دنیا کی آنکھوں کے نور ہو جانے تھے کہ وہ رسول اللہ کے میزبان ہو جانے تھے.... اور زرا غور
کیجئے کہ رسول اللہ بھی خود فیصلہ نہیں کر رہے، مبادا جو محروم رہ جائیں ان کے دل نہ دکھیں۔ انہوں نے
سارا معاملہ قصویٰ پر چھوڑ دیا ہے.... یہ نہیں کہ جہاں اس کا جی چاہے، ایک جانور کی طرح بلا سوچے
سمجھے بیٹھ جائے وہاں میں قیام کروں گا.... نہیں ایسا نہیں ہے.... رسول اللہ کم از کم چار بار یہ اعلان
کرتے ہیں ”اس کا راستہ چھوڑ دو.... کیونکہ یہ اللہ کی طرف سے مامور ہے“ فیصلہ اللہ نے کرنا ہے لیکن اس
پر عمل درآمد قصویٰ نے کرنا ہے.... یہ نکتہ قابل غور ہے کہ وہ کوئی عام سی اونٹنی نہ تھی، اللہ کے پیغام
کو سمجھنے والی اور اس پر عمل کرنے والی قصویٰ تھی تو اس کے رتبے کا بھی اندازہ کیجئے.... سیرت
النبی کامل مرتبہ ابن ہشام میں درج ہے۔”ان لوگوں نے بھی راہ چھوڑ دی اور سانڈنی چلی یہاں تک کہ جب
بنی مالک بن النجار کے احاطے میں آئی تو آپ کی مسجدکے دروازے کے پاس بیٹھ گئی.... جہاں ان دنوں
بنی النجار کی شاخ بنی مالک بن نجار کے دو یتیم لڑکوں سہل و سہیل کی کھجوریں سُکھانے کی جگہ
تھی جو معاذ بن عفرا کے زیرپرورش تھے جب وہ اونٹنی اسی حالت میں کہ رسول اللہ اس پر تشریف فرما
تھے بیٹھ گئی تو آپ اترے نہیں، پھر وہ اٹھی اور کچھ دور گئی۔ رسول اللہ نے اس کی نکیل اسی پر رکھ دی۔

اسے نکیل کے ذریعے سے کسی جانب موڑا بھی نہیں، آخر وہ پیچھے کی جانب پلٹی اور لوٹ کر وہیں آئی، جہاں پہلی بار بیٹھی تھی۔ اس کے بعد اس نے جسم ہلایا، جم کر بیٹھ گئی اور گردن نیچے رکھ دی کہ رسول اللہ اس سے اتریں۔ ابو ایوب خالد بن زید نے آپ کا پالان اٹھا لیا اور اسے اپنے گھر میں رکھ دیا"۔
یوں تو حج کے دوران ہر مقام پر رسول اللہ کی موجودگی کی آنچ آتی ہے لیکن یہ میدان عرفات ہے جہاں نہ صرف ان کی موجودگی بلکہ ان کی آواز کے شائبے بھی سنائی دینے لگتے ہیں.... میں تصور کرتا رہا کہ رسول اللہ قصویٰ پر سوار میدان عرفات میں کہاں سے داخل ہوئے ہوں گے.... وہ کون سا مقام ہے جہاں اونٹ کے سیاہ بالوں سے تیار کردہ خیمہ ان کے لئے نصب کیا گیا تھا.... تو اس میدان میں قصویٰ کے بھی آثار تھے.... گئی رات جب میں غار حرا کے باہر تن تنہا بیٹھا تھا، جبل نور پر میرے سوا اور کوئی شخص نہ تھا، چھپر ہوٹلوں والے اور بابا بنگالی شب بسری کے لئے نیچے اتر چکے تھے تو اس تنہائی میں مجھے خیال آیا کہ رسول اللہ ایک کوہ پیما کی مانند جبل نور پر چڑھتے اسی مقام پر آتے تھے.... مجھے یہاں دیکھ کر کہتے کہ تم کون ہو، میں نے آج تک تمہیں نہیں دیکھا اور میں عرض کرتا کہ حضور میں تو ایک مدت سے قصویٰ کے پیچھے پیچھے چلا آتا ہوں۔ پاؤں دھرتے احتیاط کرتا ہوں کہ کہیں قصویٰ کی مینگنیوں پر قدم نہ آ جائے.... آپ نے کبھی مُڑ کر دیکھا ہی نہیں کہ پیچھے کون چلا آتا ہے.... میں تو ایک مدت سے سر جھکائے قصویٰ کے پیچھے پیچھے چلا آتا ہوں۔
چھن چھن کردی گلی وچوں لنگدی
ساڈھے سجناں دی ڈاچی بادامی رنگ دی

10/11/13

ریشماں، منظور جھلا اور۔۔۔ وے میں چوری چوری
مستنصر حسین تارڑ
یہ اُن دنوں کا قصہ ہے جب میں اپنے والد چوہدری رحمت خان کی معاونت کے لیے چیمبر لین روڈ پر واقع بیجوں کی دکان "کسان اینڈ کمپنی" پر بیٹھا کرتا تھا۔ ہمارے دائیں جانب ملک محمد رفیع کا "نیو ماڈرن پریس" ہوا کرتا تھا اور بائیں جانب تاج سبزی والے کی دکان تھی۔ تاج کی دو خوبیاں تھیں ایک تو وہ اپنے کاہل اور غیر ذمہ دار بیٹے کو باقاعدگی سے زدو کوب کرتا تھا اور جب تک ہم لو گ دخل انداز ہو کر اُسے چھڑا نہ لیتے وہ اس دہشت گردی میں مشغول رہتا۔۔۔ دوسری خوبی یہ تھی کہ اس کے پاس کسی پرانے بزرگ کا عطا کر وہ شوگر کی بیماری کا نسخہ تھا، وہ اس نسخے کے مطابق پلے سے رقم خرچ کر کے دوائی تیار کرتا اور لوگوں میں مفت تقسیم کرتا کہ بزرگ نے ہدایت کی تھی کہ خلق خدا کی خدمت فی سبیل اللہ کرنی ہے۔۔۔ تاج ہر سبزی والے کی طرح سبزیوں پر مسلسل پانی چھڑک کر انہیں تروتازہ اور بھاری کرتا رہتا۔ کبھی کبھار ایک بے چارہ سا شخص ایک پرانی سائیکل پر سوار اس کے پاس آ بیٹھتا اور پھر تاج کی فرمائش پر اسے پنجابی میں گیت سنانے لگتا۔ دو تین گیتوں کے بعد تاج اسے گوبھی کا ایک پھول اور کچھ آلو ٹماٹر وغیرہ عنایت کرتا اور وہ انہیں شکر گزار ہو کر ایک گندے سے تھیلے میں ڈال کر اسے سائیکل کے ہینڈل سے لٹکا کر چلا جاتا۔ ایک روز تاج اسے میرے پاس لے آیا، کہنے لگا "باؤ جی یہ میرا یار ہے اس کا نام منظور جھلا ہے ، یہ جی شعر بناتا ہے پھر ان کے گانے بنا کر خود ہی گاتا ہے۔۔۔ بڑا سریلا ہے۔ یہ کہتا ہے باؤ جی مشہور آدمی ہیں، ٹیلی ویژن پر آتے ہیں میں نے انہیں اپنے گانے سنانے ہیں، شاید مجھے ٹیلی ویژن پر چانس مل جائے"۔ اس کا نام منظور تھا، جھلا اس کا تخلص تھا۔ پنجابی میں گیت لکھتا تھا، خود ہی دھن بناتا تھا اور خود ہی گاتا تھا۔ ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا تھا جس کا پیشہ گانا بجانا تھا لیکن اس کی قدر نہ ہوئی تھی اور وہ یونہی گھوم پھر کر تھوڑا بہت کما لیتا تھا، گزر اوقات مشکل سے ہوتی تھی۔ اس نے مجھے متعدد گیت سنائے، اُن میں سے ایک تو "شاماں پے گیاں" تھا بے حد پر اثر اور اداس لیکن یہ دوسرا گیت تھا جس کی دھن اور شاعری نے مجھے تو مبہوت کر کے رکھ دیا اور یہ تھا "وے میں چوری چوری تیرے نال لا لیاں اکھاں وے۔۔۔ میں چوری چوری"۔ دھن بھی منظور جھلے کی تھی اور شاعری بھی۔۔۔ اور وہ گاتا بھی ایک کمال کے رچاؤ کے ساتھ تھا۔ میں نے حسب مقدور اس کی گائیکی کے اعتراف میں کچھ معاونت کر دی اور ٹیلی ویژن کے کسی پروڈیو سر کے نام اپنا کارڈ دے کر کہا کہ اسے مل لو۔ شاید تمہیں کام مل جائے۔ وہ بعد میں بھی ایک دو بار آیا لیکن ٹیلی ویژن پر کسی نے اسے اس قابل نہ سمجھا کہ کسی پروگرا م میں شامل کرے۔۔۔

پھر ایک روز تاج نے بتایا کہ منظور جھلا کسمپرسی کی حالت میں مر گیا ہے۔ انہی دنوں پرانے الحمرا کے باہر ایک بورڈ پر یہ اعلان درج تھا "صدائے صحرا۔۔۔ ریشماں اور اس کی بہن (مجھے بہن کا نام یاد نہیں) صحرا کے نسخے پیش کریں گی" معلوم ہوا کہ ریڈیو کے ٹیلنٹ کو دریافت کرنے میں بے مثال سلیم گیلانی شاہباز قلندر کے عرس میں گاتی کسی خانہ بدوش لڑکی کو لاہور لے آئے ہیں۔ اور وہ بہت کھلی اور قدرتی آواز میں گاتی ہے۔۔۔ یہ ریشماں کا آغاز تھا۔۔۔ لیکن اسے ملک گیر شہرت تب نصیب ہوئی جب اس نے "وے میں چوری چوری" گا کر لوگوں کو لوٹ لیا۔۔۔ لیکن بہت کم لوگ آگاہ تھے کہ یہ گیت منظور جھلے کا لکھا ہوا ہے اور دھن بھی اسی کی ہے۔۔۔ اس گیت کی شہرت سرحد پار پہنچی اور لوگ اس کے دیوانے ہو گئے یہاں تک کہ لتا منگیشکر نے "یارا سلی سلی" کے نام سے اسی دھن میں گایا اور یہ گیت بھی بے حد مقبول ہوا۔ تقریباً بائیں برس پیشتر میں اپنی کوہ نورد ٹیم کے ساتھ دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے ٹو کے بیس کیمپ کی جانب ایک پر خطر سفر کر رہا تھا۔ راستے میں پائیو کے مقام پر شب بسری کے لیے خیمے نصب کیے گئے۔۔۔ بلتی لوگ گانے اور رقص کے بے حد شوقین ہیں، سارا دن بھاری بوجھ اُٹھائے جھکے ہوئے خطرناک گھاٹیوں اور برفزاروں میں مشقت کرتے چلتے ہیں اور جونہی شب کے قیام کے لیے پڑاؤ کیا وہ الاؤ روشن کر کے خالی کنستروں کو ڈھول کے طور بجاتے گانے لگتے ہیں اور رقص کرنے لگتے ہیں کہ بقول اُن کے رقص سے اُن کی تھکن اتر جاتی ہے۔ وہ بلتی گیت گانے لگے اور میں تھکن سے چور اپنے خیمے میں آرام کرنے چلا گیا۔۔۔ تھوڑی دیر بعد میرے کانوں میں ایک شناسا دھن اتری لیکن گیت بلتی زبان میں تھا۔ میں خیمے سے باہر اُن کے درمیان آ بیٹھا۔ آپ جان گئے ہوں گے کہ وہ "میں چوری چوری" گا رہے تھے لیکن بلتی زبان میں ترجمہ کر کے۔۔۔ دھن وہی تھی۔ تب میں نے سوچا کہ دنیا کے بلند ترین پہاڑوں کی تنہائی میں بھی منظور جھلے کے بول اور دھن لوگوں کے دلوں پر راج کرتے ہیں لیکن اسے اس کے عوض کیا ملا۔۔۔ گوبھی کا ایک پھول اور چند آلو اور ٹماٹر۔۔۔ لیکن ریشماں خوش نصیب رہی۔ وہ سندھ کے قصبے کندھ کوٹ میں گھوم پھر کر گڑوی بجا کر گاتی رزق کماتی تھی۔ شہباز قلندر اور دیگر صوفیوں کے عرسوں میں شریک ہو کر سینکڑوں دیگر گانے والوں کے ہمراہ لوگوں کا دل بہلاتی تھی۔۔۔ یہ صرف نصیب تھا جس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے شہرت کی روشن بلندیوں پر لے گیا۔۔۔ اگر اس عرس میں سلیم گیلانی شامل نہ ہوتے۔ اگر وہ اتفاقاً ادھر نہ جا نکلتے جہاں وہ گا رہی تھی تو وہ بھی منظور جھلے کی مانند گمنام مر جاتی۔ اس کی موت پر صدر اور وزیراعظم اظہار تعزیت نہ کرتے تو یہ صرف نصیب تھے۔ ٹیلنٹ تو بہت سوں میں ہوتی ہے لیکن اُن کے نصیب نہیں ہوتے۔ اس کی آواز میں جیسے صحراؤں میں بولے سے بادنسیم چلتی ہے وہ روانی بھی تھی اور ایک بے دریغ بلند آہنگی بھی بگولوں کی مانند اٹھتی دلوں پر اثر کرتی ہے۔۔۔ "وے میں چوری چوری" تو اس کا شاہکار تھا اور وہ اسے ہر بار ایک نئے آہنگ میں درد سے لبریز گاتی۔۔۔ لیکن یہ اردو گیت "میری ہم جولیاں، کچھ یہاں کچھ وہاں" تھا جس نے اسے ہمیشہ کے لیے امر کر دیا۔۔۔ آپ نے مشاہدہ کیا ہو گا کہ ماضی کے بیشتر مشہور گیت نسبتاً نئے گلوکار گاتے ہیں کہ ان کی دھنیں لازوال ہیں لیکن "میری ہم جولیاں" کو بہت کم گایا جاتا ہے کہ یہ سجتا ہی ریشماں کی پر درد آواز میں ہے۔۔۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ گیت بس وہی گا سکتی تھی۔ میں نے دیگر نامور گانے والوں کے علاوہ ریشماں کے ساتھ بھی متعدد موسیقی کے پروگرام پیش کیے۔۔۔ بیشتر گلوکار گفتگو نہیں کر سکتے، سوائے اس کے کہ۔۔۔ بس جی عوام نے پسند کیا۔۔۔ اللہ نے فضل کیا۔۔۔ لیکن ریشماں کمال کی گفتگوکرتی تھی۔۔۔جان بوجھ کر اپنا مذاق اڑا کر محفل کو کشت زعفران بنا دیتی تھی۔ اس کی سادگی میں ایک گہرا طنز ہوتا تھا۔۔۔ وہ عوام کے درمیان میں سے آئی تھی اور عوام سے کلام کرنا جانتی تھی۔ کبھی وہ اپنے غیر ملکی دوروں کے دوران اپنی انگریزی دانی کے مظاہرے کرتی کہ گورے نے پوچھا 'یوریشماں' تو میں نے کہا۔۔۔ یس یس۔ اس نے پوچھا یو پاکستان۔۔۔ میں نے کہا یس یس۔ پھر اس نے مجھ سے کچھ پوچھا جو میری سمجھ میں نہ آیا تو میں نے کہا۔۔۔ سارا کچھ یس یس۔۔۔ وہ اندرا گاندھی سے ملاقات کے قصے بھی مزے لے لے کر سناتی۔۔۔ وہ اس گیت لڑی کا ایک حصہ تھی جس میں پٹھانے خان، اُستاد جمن جیسے نایاب موتی منکے تھے۔

میرے موسیقی کے پروگرام "تیرے نام" میں شرکت کے لیے آئی تو میں نے بادامی آنکھوں والی ریشماں (یہ نام اسے مرحوم دلدار بھٹی نے دیا تھا) سے درخواست کی کہ آج وہ سناؤ جو تمہارا جی چاہتا ہے اور اس نے راجھستانی شادیوں کے ایسے پرسوز گیت گائے کہ لوگ آبدیدہ ہو گئے۔ اُن کی ریکارڈنگ شاید ٹی وی میں کہیں محفوظ ہو کہ کبھی ریکارڈ نہیں ہوئے تھے اور نایاب تھے۔

میں سمجھتا ہوں کہ کینسر کی موذی بیماری کے باوجود اس نے ایک خوش نصیب اور کامیاب زندگی گزاری۔۔۔ جب تک ہم ہیں تب تک ہم اس کی یاد میں وے میں چوری چوری اس کے ساتھ آنکھیں لگائے رکھیں گے۔

دیوانہ مر گیا، مجنوں مر گیا تو صحرا اداس تھا، ریشماں مر گئی تو صحرا خاموش ہو گیا۔

13/11/13

ہمارے شہید الگ آپ کے شہید الگ
مستنصر حسین تارڑ
میں شرمندگی اختیار کرتا ہوں۔۔۔
اے ارض وطن میں شرمندگی کے لبادے میں روپوش ہو کر آنسو بہاتا ہوں۔۔ اور ظاہر نہیں کرتا کہ میرے آنسو گرتے ہیں کہ مجھے ڈر ہے، میں ایک نامردمی کے خوف میں ہوں کہ اگر میں جو مجھ پر گزرتی ہے اس کا اظہار کروں گا تو زندہ جلا دیا جاؤں گا۔
تو میں شرمندگی اختیار کرتا ہوں۔۔۔
اے وطن میرے پیارے وطن میں تجھ سے معافی کا خواستگار ہوں۔۔ اُن شہیدوں سے معافی کا خواستگار جنہوں نے اپنی جان کے نذرانے تیری سالمیت قائم رکھنے کے لئے، تیرے بچوں بوڑھوں اور عورتوں کو پرخچوں میں بدل کر قتل ہو جانے سے بچانے کے لئے پیش کئے۔۔ بے شک اے راہِ حق کے شہیدو تمہاری شہادت کو مخدوش قرار دیا جا رہا ہے اور قاتلوں کو شہادت کے درجے پر فائز کیا جا رہا ہے لیکن۔۔ یہ لوگ قابل رحم ہیں، مجھے ان پر ترس آتا ہے کہ ذہنی زوال نے انہیں ذلت کے گڑھوں میں دھکیل دیا ہے اور اب ان کے حواری بہانے بناتے پھرتے ہیں کہ یہ تو ایک ذاتی بیان تھا اور اس کے آگے سوالیہ نشان تھا۔۔ ایک زمانے میں الطاف حسین جانے کون سی حالت میں مبتلا دھمکیاں دیا کرتے تھے کہ ہم نے آپ کے سائز کی بوریاں تیار کر رکھی ہیں، پاکستان انگریز کی سازش ہے اور اس کے ساتھ وہ رقص کرتے تھے اور گانے گاتے تھے تو ان کے ساتھیوں کو ان کا بہرطور دفاع کرنا تھا اور جب وہ ان اوٹ پٹانگ بیانات اور دھمکیوں کا مجبوراً دفاع کرتے تھے کہ وہ تو الطاف بھائی نے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی تھی، وہ سنجیدہ تو نہیں تھے۔۔۔ اگر انہوں نے ٹیلی ویژن کے میزبانوں کی مرمت کرنے کی بات کی تھی تو دراصل وہ یہ کہہ رہے تھے کہ ان کی سائیکلوں کی مرمت کی جائے، ان کے بیان کو آؤٹ آف کونٹیکس میں پیش کیا جا رہا ہے۔۔ تو مجھے ان حضرات پر بے حد ترس آتا تھا کہ لیڈر صاحب نے موڈ میں آ کر دل کی بات تو کہہ دی اور اب ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس کا دفاع کیسے کریں۔۔ ان دنوں ایک مرتبہ پھر وہی صورت حال ہے ٹیلی ویژن پر منور حسن اور فضل الرحمن صاحب نے جو گوہر افشانیاں کر کے کروڑوں لوگوں کے جذبات مجروح کئے ہیں ان کے حواری ان کا دفاع کررہے ہیں اور مجھے ان پر بھی ترس آتا ہے۔۔ وہ ادھر ادھر کی بے پَرکی ہانکتے چلے جاتے ہیں کہ دراصل اس بات کو صحیح تناظر میں نہیں دیکھا جا رہا۔۔ یہ تو علامتی باتیں تھیں جو عوام الناس سمجھ نہیں سکے۔۔ پُرلطف بات ہے کہ بے چاری فوج بھی ان علامتی باتوں کو نہیں سمجھ سکی۔۔ آج تک شاید ہی فوج کی جانب سے کسی سیاستدان کے بیان کے بارے میں اتنا سخت اور شدید ردعمل سامنے آیا ہو۔۔ فوج کی جانب سے یہ بیان میرے شیر جیسے بزدل کروڑوں پاکستانیوں کے دلی جذبات کی ترجمانی ہے۔۔ دراصل یہ سلسلہ ایک سیاسی لاگت بازی کا شاخسانہ ہے۔ منور حسن نے ہزاروں معصوموں کے بے رحم قاتل، نہ پاکستانی ریاست کو ماننے والے نہ اس کے دستور کو۔۔ پاکستانی فوج کے جوانوں کو ذبح کر کے ان کے سر میرانشاہ کے کھمبوں پر آویزاں کرنے والے اور کرنل امام ایسے درویش صفت شخص کو ہاتھ پاؤں باندھ کر قتل کر کے ان کے سر ان کے خاندان کو بھیجنے والے شخص کو شہید قرار دے دیا۔۔ مولانا فضل الرحمن جو عمران خان سے شکست کھا کر بھنائے پھرتے ہیں انہوں نے سوچا کہ اوہو یہ منور حسن تو طالبان کی ہمدردیاں حاصل کر لے گا اور انہوں نے نہلے پہ دہلا دے مارا کہ۔۔ میں ان کا بیان نقل نہیں کر سکتا، میری روح کانپ جاتی ہے کہ شہادت کی عظمت کس جانور پر منطبق کی جا رہی ہے، اب ان کے دہلے پر منور حسن نے جونسا پتہ بھی ہاتھ میں آیا دے مارا۔۔ کہ دہشت گردی کا مقابلہ کرنے والے فوجی نوجوان اور افسر شہید نہیں ہیں البتہ حکیم اللہ کی شہادت میں کچھ شک نہیں۔۔ وہ تو ماشاء اللہ شہید امن ہے۔
ویسے اگر میرا جیسا کوئی نابنجار شخص کوئی ایک ایسا بیان دیتا تو اب تک اس کے قتل کے فتوے یہی لوگ جاری کر رہے ہوتے۔۔ لیکن میں خدا کو حاضر ناظر جان کر قسم کھا کر یہ کہتا ہوں کہ "روشن خیال" ہونے کے باوجود کہ میں تاریک خیال نہیں ہو سکتا کم از کم جو کچھ فضل الرحمن نے کہا ہے وہ نہ کہہ سکتا۔۔ میں مر جاتا لیکن یہ نہ کہتا کہ ایک۔۔ بھی شہید ہے۔۔ کبھی نہ کہتا۔۔ میں اس فقرے کا تصور بھی کرتا ہوں تو میرے دل میں ایک بھالا اتر جاتا ہے۔۔ میری روح لرز جاتی ہے اور میں ان پر تو نہیں اپنے پر لعنت بھیجتا ہوں کہ میں ایک ایسے دور میں زندہ ہوں جس میں شہادت کی یہ توہین کی جا رہی ہے۔۔ میں سوائے اس کے کہ شرمندگی اختیار کروں اور کیا کر سکتا ہوں۔
میں تو اس دن سے ڈرتا ہوں جب ذہنی طور پر معذور کوئی شخص یہ بیان بھی جاری کر دے گا کہ چونکہ وہ

تمام لوگ جنہوں نے اس پاکستان کے لئے اپنی جان قربان کی تو انہیں شہید کے طو رپر دفن کیا گیا اور اب چونکہ ہم نے یہ فیصلہ دے دیا ہے کہ وہ شہید نہیں ہیں تو ان کی قبروں کو بھی بُلڈوز کر کے مٹا دیا جائے۔۔۔ میں جس پارک میں سیر کے لئے جاتا ہوں وہاں ظاہر ہے دوستوں کے ساتھ جو کچھ ہمارے ملک میں ہو رہا ہے اس کے بارے میں بھی تبادلۂ خیال ہوتا ہے۔۔۔ ان دوستوں میں ڈاکٹر انیس احمد بھی ہیں، مجھ سے بھی عمر میں بزرگ ہیں، شاعر بہت کمال کے ہیں اور نعت کہنے میں بے مثال ہیں، ظاہر ہے حساس طبیعت کے ہیں۔۔۔ جب کبھی کوئی خودکش حملہ ہوتا ہے، دھماکا ہوتا ہے اور بے گناہ معصوم لوگ مارے جاتے ہیں تو کئی روز تک رنجیدہ رہتے ہیں، قصہ خوانی میں خونریزی ہوئی تو پندرہ سولہ افراد کے خاندان میں سے صرف ایک بوڑھا دادا جو بچ گیا اور اس کے بیٹے پوتے پوتیاں سب شہید امن کے حکم سے ہلاک کر دیئے گئے۔۔۔تو ڈاکٹر صاحب کہنے لگے، تارڑ صاحب ہمارا قصور یہ ہے کہ ہم پُرامن ہیں، ہمارے ہاتھ میں کلاشنکوف نہیں ہے اور ان کے ہاتھوں میں کلاشنکوف ہے تو اس لئے وہ ہمیں ہلاک کر رہے ہیں۔۔۔ تو کیا بالآخر ہمیں خود اپنے بال بچوں اور ملک کو بچانے کے لئے اُن جیسا ہو جانا پڑے گا۔ لیکن ان دو زعماء کے بیانات پر ڈاکٹر انیس اس قدر دکھی ہوئے کہ ان کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔۔۔ تارڑ صاحب مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی، کچھ آوازیں آتی ہیں، آس پاس کچھ سرسراہٹیں ہوتی ہیں جیسے کہیں امیرالشہداحضرت حمزۃؓ شکایت کرتے ہیں کہ تم نے چودہ سو برس بعد میری شہادت کی یہ قدر کرنی تھی۔۔۔ اور کبھی حضرت امام حسینؓ کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے، کربلا کے شہیدوں کے چہرے دکھائی دینے لگتے ہیں۔۔۔ جنگ بدر، اُحد کے شہید نظر آنے لگتے ہیں۔۔۔ ستمبر 65ء اور دسمبر 71ء کی پاک فوج کے شہید نوحہ کناں سنائی دیتے ہیں اور تو اور وہ ڈاکٹر جنرل جس کی عبادتوں اور ریاضتوں کا کچھ شمار نہ تھا وہ بھی ایک امریکی ڈاکٹر تھا۔۔۔ اور جنرل نیازی کی ہلاکت پر وہ کیسے شادیانے بجاتے تھے۔۔۔ ہم لوگ اپنے بچوں اور بزرگوں اور عورتوں کے قاتلوں کو شہید قرار دیتے ہیں، ہم کیسے لوگ ہیں تارڑ صاحب۔۔۔ یقین کریں اس اسّی برس کی عمر تک آج تک مجھے اتنا بڑا دکھ برداشت نہیں کرنا پڑا۔۔۔ بتائیے میں کیا کروں۔۔۔ یہ ملک چھوڑ دوں، خودکشی کر لوں، کیا کروں۔۔۔ ڈاکٹر انیس کا گلا رُندھ گیا اور میں نے ان سے کہا اور میری رنجیدگی کی بھی کوئی حد نہ تھی کہ ڈاکٹر صاحب۔۔۔ ہمارے شہید اب ان کے شہیدوں سے الگ ہو گئے ہیں۔۔۔ ہمیں بدر، اُحد، کربلا اور جنگ ستمبر اور جنگ دسمبر کے شہید مبارک اور ان کو اپنے شہید مبارک۔۔۔ ایک جانور کو بھی شہید قرار دینے والے خود کیا ہیں، بس وہی ہیں۔۔۔ ویسے کسی ڈرون حملے میں اگر وہ حرام جانور بھی مارا جاتا ہے جس کا نام لینے سے زبان پلید ہوتی ہے تو آپ اُسے کس درجے پر فائز کریں گے۔
میں اُن پر نہیں اپنے آپ پر لعنت بھیجتا ہوں۔

17/11/13

محمد سلیم الرحمن اور ریاض احمد کا ’ سویرا‘
مستنصر حسین تارڑ

ادبی مجلے ’’سویرا‘‘ کا نام لیجیے تو ادب کی ایک کہکشاں ماضی کی دھند میں سے ظاہر ہو کر جگمگانے لگتی ہے۔۔۔ کیسے کیسے نایاب لوگ یاد آنے لگتے ہیں جنہوں نے اس کی ادارت کی۔ ساحر لدھیانوی، احمد راہی، صلاح الدین محمود، حنیف رامے۔۔۔ جیسے کیسے کیسے نابغۂ روزگر ادیب دل پہ دستک دینے لگتے ہیں جن کی نگارشات اس پرچے کی زینت ہوا کرتی تھیں۔۔۔ اور یہ فہرست بہت طویل ہے۔۔۔ یوں جانیے کہ اگر ’’سویرا‘‘ میں کوئی ادیب یا شاعر نہیں چھپا تو اس کا ادیب یا شاعر ہونا مخدوش ہے۔ میں نے شفیق الرحمن کے لازوال سفر نامے ’’ڈینیوب‘‘ اور ’’نیل‘‘ ’’سویرا‘‘ میں ہی پہلی مرتبہ پڑھے اور اسی شمارے میں قرطبہ کے بارے میں اشفاق احمد کا سفرنامہ بھی شامل تھا۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ، سعادت حسن منٹو، کوئی ایک سورج تھا۔۔۔ ’’سویرا‘‘ اب بھی شائع ہوتا ہے اور ہر چار چھ ماہ کے بعد جب اس کا تازہ پرچہ میرے سامنے کھلتا ہے تو میں حیرت میں مبتلا ہوتا ہوں کہ یہ کیسے خبطی لوگ ہیں جو اس گھاٹے کے سودے کو گلے لگائے بیٹھے ہیں۔۔۔ محمد سلیم الرحمن اور ریاض احمد کیسے ’’بیکار‘‘ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی زندگی ’’سویرا‘‘ کے لیے وقف کر رکھی ہے۔۔۔ اپنے حصے کی شمع جلاتے چلے جاتے ہیں اور یہ شمع بھی وہ اپنے پلے سے خرید کر جلاتے ہیں اور یہ پلا وہ کسی کے آگے پھیلاتے بھی نہیں تو یہ کیسے لوگ ہیں۔ دنیائے ادب میں ’’نقوش‘‘ ’’فنون‘‘ ’’نیا دور‘‘ اور ’’اوراق‘‘ ایسے پرچے نمایاں ہوئے جنہوں نے ادب کی ترویج اور ترقی میں درخشاں کردار ادا کیے اور پھر ماضی کا حصہ بن کر اوجھل ہو گئے۔ ظاہر ہے ’’سویرا‘‘ بھی اس

فہرست میں شامل ہے لیکن یہ پرچہ اُن سب میں سے منفرد اس لیے تھا کہ اعلیٰ ادب کی اشاعت کے علاوہ اس کی تزئین اور آرائش ایسی خوش نظر اور خوش جمال تھی کہ اس پر ایک "ورق آف آرٹ" کا گمان ہوتا تھا۔ اور اس کے لیے ہم محمد حنیف رامے کے تخلیقی کمالات اور اُن کے جدید اور منفرد ذوق جمال کا اعتراف کرتے ہیں۔ یہ رامے صاحب تھے جنہوں نے مصور خطاطی کی صنف ایجاد کی اور اس کے شاہکار باقاعدگی سے "سویرا" کی زینت بنتے تھے۔۔ ادب کی تاریخ میں "سویرا" کے علاوہ مختصر مدت کے لیے افق پر نمودار ہونے والے دو ادبی پرچے تھے جنہوں نے ادب اور مصوری کو یکجا کیا اور جن کی زیبائش کمال کی تھی۔ اشفاق احمد کا "داستان گو" اور آذر ذوبی کا "شعور"۔۔ اور یہ دونوں پرچے بھی غروب ہو گئے۔ کسی نے وادئ سوات کے بارے میں کہا تھا کہ اس وادی کا حسن بادشاہوں کے دلوں کو بھی خوشی سے بھر دیتا ہے۔ ہم تھوڑا بہت ادب لکھنے والے بادشاہ نہیں ہیں اور پھر بھی "سویرا" کے ہر شمارے کا حسن ہمارے دلوں کو بھی خوشی سے بھر دیتا ہے۔۔ اس میں شامل اعلیٰ پائے کی تخلیقات اپنی جگہ لیکن اس کی کمپوزنگ، چھپائی اور ترتیب نظر کو اتنی بھلی لگتی ہے کہ میں پھر کہوں گا۔۔ اسے ورق آف آرٹ۔۔ جیسے میں سگرٹ کا نیا پیکٹ کھول کر ہمیشہ اسے ناک کے قریب لے جا کر اس کے تمباکو کی مہک سے لطف اندوز ہوتا ہوں اسی طرح میں نئی شائع شدہ اپنی پسندیدہ کتاب یا ادبی مجلے کو بھی ناک کے قریب لے جا کر سونگھتا ہوں کہ کاغذ اور روشنائی کی خوشبو میرے پسندیدہ ترین خوشبو ہے۔ یقین کیجیے کہ "سویرا" کے ہر تازہ شمارے میں سے جومہک آتی ہے وہ کسی اور ادبی پرچے میں سے نہیں آتی۔۔ میرے لیے تو یہ مشک ختن سے بھی بڑھ کر سرور انگیز ہے۔ "سویرا" کو آپ سرسری طور پر نہیں دیکھ سکتے۔ اس کا ہر افسانہ، مضمون یا شعر آپ کی کامل توجہ کا طالب ہوتا ہے۔ اب یہ جو تازہ شمارہ میرے سامنے ہے اس کا سر ورق تحصیل سولنگی کا ترتیب شدہ ہے اور اس کے رنگوں کا امتزاج کشش رکھتا ہے۔۔ مضامین میں ڈاکٹر خورشید رضوی کا "عربی ادب قبل از اسلام" سر فہرست ہے اور یہ اس کی اٹھارہویں قسط ہے۔ میرا تحقیق یا شاعری اور وہ بھی عربی شاعری بلکہ قبل از اسلام عربی شاعری سے کچھ واسطہ نہیں اور اس کے باوجود میں اُن کے مضامین کا شیدائی ہوں۔ وہ زبان اور تاریخ کی اتنی باریکیوں میں جاتے ہیں کہ اگر وہ لوگ جو اُن زمانوں میں شاعری نہیں کرتے تھے یہ جان جاتے کہ آئندہ زمانوں میں کوئی ہندی خورشید رضوی نام کا ایسا ہو گا جو شعر کی پہچان اتنی دروں بینی سے کرے گا تو وہ بھی شاعری کرنے پر مائل ہو جاتے۔ ویسے خورشید رضوی مجھے تو قبل از اسلام کی ایک روح لگتی ہے جو انہی زمانوں میں مسلمان ہو گئی تھی۔ ایک اور مضمون "زٹل نامہ " محمد سلیم الرحمن کے قلم سے نہایت دلچسپ ہے۔ یہ جعفر زٹلی کے بارے میں ہے اور اس منہ پھٹ، پھکڑ اور بدنام شاعر کی زندگی کا احاطہ کرتا ہے اور جسے مغل شہنشاہ فرخ سیر نے اس کی بد کلامی پر موت کی سزا دی تھی۔۔ کاش کہ ہر دور میں کم از کم ایک شہنشاہ فرخ سیر ہو جو برے شاعروں کا قلع قمع کرے اور یقیناًوہ دن رات مصروف رہے گا۔۔ افسانوں کا حصہ بھی بے حد جاندار ہے۔ محمود احمد قاضی، طاہرہ اقبال، نجم الدین احمد، سعود میاں اور ظہر عباس کسی نہ کسی سطح پر متاثر ضرور کرتے ہیں۔۔ طاہرہ اقبال "نیلی بار" میں پنجابی کے تڑکے لگا کر ہمیں متاثر کر چکی ہیں لیکن اگر بار بار ایک ہی تڑکا لگایا جائے تو پیاز جل کر سیاہ ہو جاتا ہے۔ افسانوی حصے کا حاصل بہر طور محمد سلیم الرحمن کا "بیکار مباش" ہے اور آپ کی ادبی زندگی میں چند ایک ہی ایسے اضافے آتے ہیں جو آپ پر اتنا دیر پا اور گہر اثر چھوڑتے ہیں۔ اس کے کردار محترک اور عجیب ہیں اور اس کے موسم آپ کے بدن پر سانس لینے لگتے ہیں۔ میں نے کم از کم ایک بار ورق پلٹا کر اطمینان کیا کہ کہیں یہ کسی نوبل انعام یافتہ ادیب کی تحریر تو نہیں۔ اس کی منظر نگاری کے کچھ حصے میں نے بار بار پڑھے۔۔" جنوب میں کالی گھٹا امڈ رہی تھی۔ ہوا کبھی تیزی سے چلتی اور کبھی رک جاتی۔ دائیں طرف سڑک سے ہٹ کر ایک چھوٹاسا ٹوٹا پھوٹا مکان تھا جس کی صرف ایک طرف کی دیوار سلامت تھی۔ چھت گر چکی تھی جہاں دو وا زرہ تھا وہاں کوٹر کا ایک پٹ لٹک رہا تھا۔ بارش میں دھلنے سے گری پڑی اینٹوں کی سرخی نکھر آئی تھی۔ اُن کے گرد اور درمیان میں اُگی گہری سبز گھاس اور خود رو پودوں نے سبز اور سرخ کا عجیب سا ڈیزائن بنا دیا تھا جو آنکھوں کو بھلا معلوم ہوتا تھا جیسے مکان جو اصل حالت میں تو بالکل معمولی ہو گا۔ ٹوٹ پھوٹ کر بہت خوش نما ہو گیا ہو، جیسے ہر طرح کی افادیت سے لاتعلق ہونے کے بعد اس میں کوئی شان پیدا ہو گئی ہو" شاعری کے حصے میں "اک نئے آفاق میں پھر اک نیا منظر بنانا چاہتا ہوں" ذوالفقار احمد تابش نے گویا محمد سلیم الرحمن کے افسانے کی تفسیر کر دی۔ تابش واقعی نئے آفاق اور نئے منظر تخلیق کرنے پر قادر ہیں۔ اُن کی چاروں غزلیں اعلیٰ درجے کی تخلیق ہیں۔۔ "سویرا" کے موجودہ شمارے میں میرے لیے ایک اور کشش ہے یعنی ایوب خاور نے "اپنے گلزار صاحب" کی نظموں کا ایک خوبصورت انتخاب کیا ہے۔

پربت پربت پاؤں رکھتا نیچے اترا
رات کی گود میں شام پڑی تھی

دریا لپٹا ہوا کھڑا پیپل سے
اور پہاڑ کے سینے پر پہلی پہلی گھاس اُگی تھی
ایوب خاور کی طویل نظم "شجر" کا شمار اس کی اعلیٰ ترین تخلیقات میں ہونا چاہیے ۔۔ اسی شمارے میں شامل سب سے مؤثر اور مختصر نظم انوار ناصر کی ہے۔۔ ماتم کرنے والو، کوکھ میں مرنے والا شاید جان گیا تھا، لاحاصل ہے، جیسے تم جیتے ہو، جینا۔۔ جیسے تم مرتے ہو مرنا۔۔ ریاض احمد کی پنجابی نظم "پنڈ" نے میرا دل موہ لیا اور مجھے "ساوے پتر" کا عظیم شاعر موہن سنگھ یاد آ گیا۔ جس نے "رب ایک گورکھ دھندا" جیسی یاد گار نظم تخلیق کی ، ریاض احمد کی "پنڈ" بھی اسی تخلیقی سطح کو چھوتی نظر آتی ہے۔۔
ایک مرتبہ احمد بشیر صاحب نے اپنی ناول آپ بیتی "دل بھٹکے گا۔۔ لکھنے کے دوران مجھ سے ناول نایسی کے بارے میں کچھ سوال پوچھے، مثلاً حقیقی عشق کے قصے ناول میں کیسے سموئے جا سکتے ہیں اور پھر کہنے لگے میں نے تمہارا ناول "بہاؤ" پڑھا ہے۔ میرا خیال ہے تو روزانہ دو سو ڈنڈ بیٹھکیں نکالتے ہو گے، ورزش کرتے ہو گے اور پھر دودھ پی کر بادام کھا کر تب جا کر ایسے ناول کے چند فقرے لکھتے ہو گے اور ایسی مشقت مجھ سے تو نہیں ہوتی۔ اس شمارے میں اسلم سراج الدین کے ناول "تلاش وجود در اطراف چند۔۔ ایک کوشش محض" کا ایک حصہ شائع ہوا ہے جسے پڑھنے کے لیے میں نے ڈنڈ بیٹھکیں نکالنی شروع کر دی ہیں۔ ورزش کررہا ہوں بادام کھا کر چارپانچ کلو دودھ پینے کے بعد انشاء اللہ اسے پڑھنے کا آغاز کر دوں گا۔ آپ میرے حق میں دعا کیجیے گا۔

25/11/13

شام شہر یارقند

مستنصر حسین تارڑ

جب ہم قہوہ خانے کی قرابت میں داخل ہوئے تو وہاں "اللہ اللہ" کی صدائیں دھواں بھرے ماحول میں سرایت کرتی کبھی بلند آہنگ میں اور کبھی سرگوشی میں سنائی دیتی تھیں۔ ایک چوڑے تخت پوش پر جو قدیم پھول بوٹوں والے ایک سرخ قالین سے ڈھکا ہوا تھا درجن بھر شاہ مقام موسیقی گانے اور بجانے والے نہ صرف سنکیانگ بلکہ چین بھر میں سب سے ماہر اور جانے پہچانے موسیقار اور گلوکار براجمان تھے۔۔ کوئی ایک گلوکار کان پر ہاتھ رکھ کر اللہ کی تان لگاتا اور اس کے رفیق ایک کورس کی شکل میں اس کا ساتھ دینے لگتے۔۔ بقول الہام وہ کبھی کبھار اکٹھے ہو کر اس قہوہ خانے میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے اور آج خصوصی طور پر اس کی درخواست پر کہ ہمارے یارقند میں پہلی بار ایک پاکستانی ادیب اور ان کی اہلیہ تشریف لائے ہیں تو کیا آپ ان کے اعزاز میں ایک شاہ مقام محفل کا اہتمام نہ کریں گے وہ سب اور وہ جانے کیسے کیسے طویل مسافتوں والے دیہات سے چلے آئے تھے صرف ہمارے لئے آج اس قہوہ خانے میں اکٹھے ہوئے تھے۔
اس ماحول نے مجھ پر تو ایک عجیب افسوں پھونک دیا۔
تخت پوش پر براجمان سازندوں اور گلوکاروں نے ہماری آمد پر مسرت کا اظہار کیا لیکن موسیقی کی تانوں اور گائیکی میں کچھ وقفہ آنے دیا۔
جب ہم داخل ہوئے تھے تو وہ ایک وجد اور کیفیت میں اللہ اللہ پکارتے تھے۔
قہوہ خانے کے کچے فرش کو بوسیدہ قالین اور غالیچے بمشکل ڈھانپتے تھے۔۔ گمان ہوتا تھا کہ جب گئے زمانوں میں سینکڑوں برس پیشتر یہ قہوہ خانہ وجود میں آیا تھا تو تب سے یہی قالین اور غالیچے بچھے چلے آتے ہیں۔۔ کچی دیواروں کے ساتھ سرخ پایوں والے تخت پوش بچھے تھے اور وہ سب سُرخ غالیچوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔۔ وہ بھی تبھی بچھائے گئے تھے، اگر ان کے پائے مٹی پر آرام کر رہے ہوتے تو یقیناًاس میں سے نمی اور زرخیزی حاصل کر کے پھوٹنے لگتے، ایک شجر کی صورت بلند ہونے لگتے یہاں تک کہ تخت پوش عرش بریں پر جا پوش ہوتے۔
ہم سے پرے ایک غیرملکی جوڑا آنکھوں میں سے دھواں پونچھتا تکّوں کی سلاخوں میں سے دانتوں کی مدد سے گوشت اتارتا اسے دیر تک چباتا اور نگلتا تھا۔ موسیقی پر سر دھنتا مست سا ہوا جاتا تھا۔
اس غیرملکی کے سوا قہوہ خانے میں صرف ایک اور ایغور لڑکی تھی، تنگ جین اور پھولدار دوپٹہ نما حجاب میں گاہکوں کی مدارات میں بھاگتی پھرتی تھی۔۔ ان دو کے سوا برسُو مرد حضرات کی حکمرانی تھی، تخت پوش پر چوکڑی مارے براجمان ایغور ٹوپیوں اور چوغوں میں ملبوس ان میں سے بیشتر عمر رسیدہ اور کسی حد تک افلاس زدہ تھے لیکن ان سب کے چہرے آج کے نہ تھے۔۔ وہ قدیم ماضی کے یارقندی چہرے لئے تھے

جن میں کچھ ملاوٹ نہ ہوتی تھی۔۔ اگر اس لمحے سلک روڈ کا کوئی کارواں قہوہ خانے کے باہر کوچے میں نمودار ہو جاتا تو ان چہروں پر حیرت نہ پھوٹتی کہ وہ تو ابھی تک انہی زمانوں میں مقیم تھے۔
ہمارے لئے ایک تخت پوش خالی کر دیا گیا۔۔ چند ایغور بزرگوں نے خوش دلی سے اپنے چوغے سمیٹے اور برابر کے تخت پوش پر منتقل ہو گئے۔۔ پیالیوں میں جو زرد رنگت کا قہوہ انڈیلا گیا، اسے بے دھیانی میں ہونٹوں سے لگایا تو ہونٹ جل گئے، اتنا گرم تھا، ابھی تک حدت بھرے نان نہایت خستہ تھے۔ پرانی کیتلیاں، اگال دان، نیلے رنگ کی منقش پیالیاں جو پشاور کے چائے خانوں کی یاد دلاتی تھیں۔
الہام کے عجائب خانے کی مانند اس قہوہ خانے کی کچی چھت بھی ٹپکتی تھی۔۔ قہوے کی کسی پیالی میں ایک بوند گرتی اور اس میں چھت کی مٹی کی ملاوٹ کا ذائقہ گھل جاتا۔۔ ہمارے تخت پوش کے بوسیدہ قالین کا ایک حصہ جس پر ایک سرخ گلاب نقش تھا، گیلا ہو چلا تھا۔
شاہ مقام موسیقار انہی سازوں پر جھکے ان کے تار چھیڑتے تھے جنہیں ہم نے الہام کے عجائب گھر میں دیکھا تھا اگرچہ وہاں وہ خاموش تھے اور یہاں وہ سُرسنگیت سے آشنا انگلیوں کی زد میں آ کر الوہی گیت الاپتے تھے۔۔ ان میں سے بیشتر سفید ریش تھے اور ان کی ڈاڑھیاں سازوں کو کسی حد تک پوشیدہ کرتی تھیں۔ سارنگیوں، ستاروں اور گھنگھروؤں میں سے موسیقی کشید کرنے والوں کے علاوہ وہاں ایک بابا دف نواز بھی تشریف فرما تھے، پوپلے منہ والے۔۔ ستر برس گزرے بھی ان کو بہت برس گزر چکے ہوں گے۔۔ اور وہ اتنی خود فراموشی کے عالم میں دف بجاتے تھے کہ جیسے وہ خود ایک دف ہیں اور یہ دف ہے جو انہیں بجا رہی ہے۔ وہ اکثر دف پر تھاپ دے کر اسے کانوں کے قریب لے جا کر اس کی دھمک سے لطف اندوز ہوتے پوپلے مسکراتے لگتا جیسے اپنے آپ کو داد دے رہے ہوں کہ واہ دف پر کیسی تھاپ دی ہے۔
رباب کے تار چھیڑتے ہوئے ایک اور سفید ریش بزرگ یقیناًاس طائفے کے نمائندہ گلوکار تھے۔
اور ہاں ان سب میں ہمارے ہاں کے بیشتر موسیقاروں اور گلوکاروں کی مانند نمائش اور داد طلبی کی کچھ ہوس نہ تھی، اپنے آپ میں مگن وہ اپنے من میں ڈوب کر سراغ زندگی اور سراغ سُر پانے کی جستجو کرتے تھے۔۔ رباب والے سفید ریش بزرگ کے الاپ اور شعروں کی ادائیگی میں، اس کی آواز کے سوز اور گھمبیرتا میں مجھے پٹھانے خان سنائی دیتا تھا اور اسی لمحے تخت پوش پر چوکڑی مارے بیٹھی میمونہ کہنے لگی ”یہ تو اپنے پٹھانے خان کی مانند گاتا ہے۔۔ ویسے اس کی آواز میں جو رچاؤ اور غرق شدہ کیفیت ہے وہ زیادہ اثر انگیز ہے“۔
قہوہ خانے کے باہر جو قدیم کوچہ تھا اس میں گزرتے لوگ، گدھا گاڑیاں، سکوٹر، ریڑھیاں سرمئی دھندلاہٹ میں اتر گئے کہ شام دبے پاؤں چلی آئی تھی۔
آخر یہ شاہ مقام موسیقی ہے کیا؟
اسے کس طور بیان کیا جائے کہ اس کی قدیم روایت سے شناسائی ہو جائے۔ مجھے اقرار کرنا ہے کہ مجھ پر بھی کبھی واضح انکشاف نہ ہو سکا کہ دراصل شاہ مقام کیا ہے۔
بعدازاں جب ہم جیڈپتھر اور اخروٹوں کے شہر کوچین گئے جہاں ہمارے لئے شاہ مقام موسیقی کے ایک کنسرٹ کا اہتمام کیا گیا، اس کا وجدانی رقص پیش کیا گیا یا پھر ہم کاشغر سے صحرائے نکل مکان کے کناروں پر آباد نیم صحرائی ملکیتی کاؤنٹی میں گئے تو وہاں بھی شاہ مقام کی ایک شاخ دالان موسیقی کے موسیقاروں نے ہمارے اعزاز میں ایک محفل سجائی اور پھر بھی میں اس موسیقی کی گتھیاں سلجھا نہ سکا۔۔ بہرطور بے شک نہ سلجھیں لیکن سلجھانے کی کوشش تو کر دیکھتے ہیں۔۔ آخر یہ شاہ مقام ہے کیا؟
(شاہ مقام موسیقی کے تین مقام ہیں۔ (جاری ہے

شاہ مقام موسیقی کے مقام
مستنصر حسین تارڑ
شاہ مقام موسیقی کے تین مقام ہیں!
پہلا مقام۔۔ ابتدائیہ اللہ کے نام سے۔۔ اللہ کے ساتھ اپنے عشق کا اظہار
دوسرا مقام۔۔ ایک داستان محبت، اپنے محبوب کا بیان، جدائی کے نوحے
تیسرا مقام۔۔ یہ التجا کا مقام ہے۔ درخواست کا مقام ہے۔ اللہ کا ورد اور بالآخر وجد کی منزل۔ یہ مقام کہیں نہ کہیں عرب کی دور جاہلیت کی شاعری سے مماثلت رکھتے ہیں۔ یعنی آغاز میں اپنے محبوب کی جدائی کو شعروں میں ڈھالا جاتا ہے اور پھر اصل موضوع کا بیان شروع ہوتا ہے یہاں تک کہ جب مسجد نبوی میں تشریف فرما رسول اللہؐ کے سامنے کھڑے ہو کر زبیر بن کعب نے اپنا مشہور عالم قصیدہ بانت ساد پڑھا تو اس کا آغاز بھی محبوب کی جدائی اور اُس کے بدن کی خوبیوں سے ہوا۔

بڑی شاعری کبھی بھی کسی اور زبان میں ترجمے کی تاب نہیں لا سکتی اور وہ دم توڑ جاتی ہے تو اگر شاہ مقام کی ایغور شاعری مجھ تک جوائے کی غیر یقینی انگریزی میں پہنچتی ہے اور پھر میں اُسے اردو میں ڈھالتا ہوں تو لب اللہ اللہ ہی رہ جاتا ہے باقی سب کچھ اس ترجمہ در ترجمہ میں زائل ہو جاتا ہے لیکن وہ انگریزی زبان کا ایک محاورہ ہے۔ کچھ نہ کچھ، کچھ نہ ہونے سے بہتر ہے تو شاہ مقام شاعری کا کچھ نہ کچھ پیش خدمت ہے۔۔

میرے ہاتھوں میں ایک جام ہے اور اس میں روح کی شراب ہے اور میں یہ شاہ مقام شراب اللہ کے حضور ” پیش کرتا ہوں“۔

میں ستار کے تار اس لیے چھیڑتا ہوں کہ میرے دکھ چکے دل کو آرام نصیب ہو“۔”

میں اپنی روح اور زندگی کی ستا رپر اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کر رہاہوں“۔”

برادر مستنصر۔۔ یہ جتنے بھی آپ کو معمولی دکھتے دہقان شکلوں کے موسیقار تخت پوش پر براجمان آپ ” کے لیے گاتے ہیں، یہ سب ساز اور آواز کے اُستاد لوگ ہیں۔۔ بیجنگ میں منعقد ہونے والے اقلیتوں کی موسیقی کے فیسٹیول میں پہلا انعام حاصل کر چکے ہیں“۔

مجھے محسوس ہو چکا تھا کہ ہمارے برابر میں بیٹھا الہام ایک اضطراب میں ہے۔ اس کی انگلیاں موسیقی کی تھاپ پر تھرتھراتی ہیں، وہ ضبط کیے بیٹھا تھا اور پھر قدر سے بے اختیار ہوا اور ایک سارنگی تھام کر تخت پوش پر براجمان موسیقاروں کے ساتھ جا بیٹھا۔۔ سارنگی کے تاروں پر مہارت سے گز پھیرتا نہایت غرق شاہ مقام کی روح میں اتر کر گانے لگا۔۔ اور وہ بھی بلاشبہ ایک ماہر سا زندہ اور پرتاثر سوچ کا حامل گلو کار تھا۔۔ ہم نے تالیاں بجا کر اس کی موسیقاروں میں شمولیت کی داد دی۔

اس شام شہریاراں۔۔ یار قند میں شاہ مقام شاعری کا جو شعر میرا پسندیدہ ہوا اس میں ایک عجیب وارفتگی اور خود سپردگی کی کیفیت تھی۔ سنکیانگ کے مسلمانوں بلکہ چین بھر کے ہان نسل کے مسلمانوں کا سب سے بڑا خواب حج کی سعادت حاصل کرنا ہے۔ ظاہر ہے وہاں پر کوئی ہمارے مانند تقریباً ہر برس آسانی سے بے وجہ حج پر نہیں نکل جاتا کہ اس کے پلے میں مخدوش رزق بہت ہے۔۔ وہاں کچھ حدود ہیں۔ لوگ زندگی بھر ترستے ہیں تو اس پس منظر میں شاہ مقام کا یہ شعر دیکھیے۔

“اگر میں خوش نصیب ہوتا تو مجھے ایک سمندر میں پھینک دیا جاتا تو میں تیرتا ہوا مکہ پہنچ جاتا”

پرانے زمانوں میں رواج تھا کہ کسی قاتل یا مجرم کو دریائے یار قند میں پھینک دیا جاتا، اُسے ڈبو دیا جاتا تو شاہ مقام کا حج کا تمنائی شاعر کہتا ہے کہ ”میں مجرم ہو جاتا، قاتل ہو جاتا اگر مجھے یہ یقین دلا دیا جاتا مجھے دریائے یارقند میں نہیں ایک سمندر میں ڈبو دیا جاتا تو میں اس سمندر میں تیرتا ہوا مکہ پہنچ جاتا“۔

اللہ اللہ“ کی پکار ہوئی۔ محبوب کے رخساروں اور بوسوں کی توصیف ہوئی اور آخر میں التجا۔ توبہ اور ” درخواست کا مرحلہ شروع ہوا تو ساز جتنے بھی تھے، فریاد کرنے لگے۔ یار قندی پٹھانے خان وجد میں آ کر جھومتا تھا، بابا دف نواز ہر تھاپ پر اللہ کا نعرہ بلند کرتا تھا۔

اور بالآخر شاہ مقام کی سحر انگیزی خاموش ہو گئی۔۔ آخری تار کو چھیڑا جا چکا۔ دف پر آخری تھاپ پڑ چکی، آخری شعر اور ہو گیا تو مجھے دعوت دی گئی کہ میں اس یاد گار محفل کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کروں۔ میں اُن کمال کے نابغۂ روزگار موسیقاروں اور گلوکاروں کے برابرمیں تخت پوش پر جا بیٹھا۔ میں اُن کی توصیف کیا کرتا۔ یہ اقرار کیا کرتا میں جن دور کے ملکوں سے آیا ہوں وہاں ایک جبر ایک مختصر اقلیت نے لاگو کر دیا ہے کہ موسیقی حرام ہے۔ جبکہ یار قند میں آ کر احساس ہوا کہ کم از کم شاہ مقام موسیقی کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا۔۔ ایمان کیا ہے؟ وجد۔۔ذکر۔۔ نارسائی کی کسک، شک شبہات اور اپنے محبوب سے وصال کی خواہش کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔۔ اور جب موسیقی میں ایک ایسا شعر ہو تو وہ کیسے حرام ہو سکتی ہے کہ ”میں مجرم ہو جاتا، قاتل ہو جاتا اگر مجھے یہ یقین دلا دیا جاتا کہ مجھے دریائے یارقند میں نہیں ایک سمندر میں ڈبو دیا جاتا تو میں اس سمندر میں تیرتا ہوا مکہ پہنچ جاتا“۔

شامِ شہرِ یار قند۔

27/11/13

پاک ٹی ہاؤس اور ڈاکٹر موت

مستنصر حسین تارڑ

میں برسوں بعد خالد فتح محمد کے افسانوں کے مجموعے کی تقریب تعارف کی صدارت کے لئے پاک ٹی ہاؤس گیا۔۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے، نہ اس نے میری پہچان کی اور نہ ہی میں اسے

پہچان سکا۔ درودیوار پر اردو کے مشہور شاعروں اور ادیبوں کی تصاویر آویزاں تھیں اور ان میں سے کچھ وہاں باقاعدگی سے بیٹھنے والے تھے، ایسے لوگ جنہوں نے اپنے گھر کی نسبت زیادہ وقت یہاں گزارا۔۔ اب یہاں جو لوگ بیٹھے تھے ان میں سے بیشتر آگاہ ہی نہیں تھے کہ دیواروں پر جو تصویریں سجی ہیں یہ کون لوگ تھے اور آخر ان عجیب سے پریشان حال دکھائی دیتے لوگوں کی تصویریں یہاں کیوں لگی ہیں۔ البتہ بالائی منزل پر انجمن ترقی پسند مصنفین کے چند اراکین اب بھی اپنے نظریات پر قائم زوروشور سے کسی بحث میں مصروف تھے۔

ہمارے زمانوں کا ٹی ہاؤس اپنی ذات میں ایک جہان تھا۔۔ یہاں چائے کی پیالیوں میں سے انقلاب جنم لیتے تھے، ادب میں نئے رجحانات کا ظہور ہوتا تھا۔۔ لاہور میں آنے والے دوسرے شہروں کے ادیب ادھر کا رُخ کرتے تھے اور یہاں پورے لاہور سے ملاقات ہو جاتی تھی۔۔۔ میں نے بھی ایک عرصہ یہاں گزارا خاص طور پر جب میں حلقہ ارباب ذوق کا سیکرٹری منتخب ہوا تو پھر دن رات کا آنا جانا ہو گیا۔۔۔ کسی ادیب کی رحلت کی خبر پہلے ٹی ہاؤس پہنچتی اور لوگ یہیں سے اٹھ کر اسے کاندھا دینے کے لئے چل پڑتے۔۔۔ یہاں تک کہ باراتیں بھی یہاں جمع ہوتیں اور دولہا میاں چائے کی ایک پیالی پی کر سہرے باندھتے۔۔۔ لاہور سے باہر منعقد ہونے والے مشاعروں میں شرکت کرنے کے لئے شاعر یہاں اکٹھے ہوتے اور اکثر جو مدعو نہیں بھی ہوتے تھے وہ بھی ان کے ہمراہ ہو جاتے۔۔۔ ٹی ہاؤس کے تفصیلی تذکرے پھر کبھی سہی کہ یہ داستان بہت طولانی ہے۔ میں آج ٹی ہاؤس کے چند دلچسپ اور تاریخی کرداروں کا تذکرہ کرنا چاہوں گا۔۔۔ ان میں دو قدیمی ویٹر بھی شامل تھے یعنی شریف بنجارہ اور الٰہی بخش جسے میں کرنل الٰہی بخش کہا کرتا تھا۔ شریف جسے چِٹّا اَن پڑھ کہتے ہیں وہ تھا۔۔۔ لیکن شاعر تھا اور بنجارہ تخلص کرتا تھا۔۔۔ شروع میں جب میں اس کی شعری صلاحیتوں سے متعارف نہ تھا ایک بار چائے میرے آگے سجانے کے بعد اس نے ادھر ادھر دیکھ کر نہایت خفیہ طریقے سے ایک میلا سا کاغذ مجھے تھما دیا ”تارڑ صاحب۔۔۔ ذرا اسے پڑھ لو“ میں نے کھول کر دیکھا تو اس پر ایک عجیب بے راہرو قسم کی نظم وغیرہ لکھی تھی لیکن کہیں کہیں اس میں کچھ چاشنی بھی تھی، اردو بھی میرے جیسی تھی، اس دوران وہ میرے برابر میں فرش پر ایڑیوں کے بل بیٹھا رہا۔۔۔ میری جانب التجائی نظروں سے دیکھتا رہا۔۔۔ ”کیسی ہے جناب؟“ اس نے پوچھا ”اچھی ہے“۔تم نے لکھی ہے؟“ میں نے سوال کیا ”نہیں جی میں نے تو نہیں لکھی“ وہ کہنے لگا۔۔۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کسی اور کی نظم مجھے “کیوں پڑھوا رہا ہے ”تو پھر کس نے لکھی ہے؟

یہ جو باورچی نہیں ہمارا جو آپ کی پسندیدہ چانپ بناتا ہے اس نے لکھی ہے۔۔۔ لیکن یہ نظم میری ہے“ ” دراصل شریف بنجارہ ان پڑھ ہونے کی وجہ سے خود تو نہیں لکھ سکتا تھا تو وہ باورچی سے کہتا تھا کہ یار تو یہ شاعری جو میں نے بنائی ہے لکھ دے ۔۔۔ اس طور وہاں مقبول احمد مقبول آیا کرتے تھے جو شاعری کرتے تھے۔۔۔ جن دنوں میں لکشمی مینشن میں رہائش پذیر تھا تو ہمارے فلیٹ کے سامنے ہال روڈ کے فٹ پاتھ پر یہ صاحب پرانی کتابیں پھیلا کر کاروبار کرتے تھے۔ کتابوں کی رفاقت نے انہیں شاعر بنا دیا۔۔۔ دوسرے ویٹر الٰہی بخش صاحب بھی کمال کے کردار تھے۔۔۔ چھریرا قد، تیکھی مونچھیں اور سنورے چُپڑے ہوئے بال۔۔۔ ادیبوں نے انہیں ٹِپ سے تو کیا نوازنا تھا اکثر ان سے ادھار مانگتے رہتے۔۔۔ ایک مرتبہ ہندوستان سے ایک سِکھ ادیب اپنی انگریز بیوی کے ساتھ ٹی ہاؤس آئے تو حلقہ ارباب ذوق نے ان کے ساتھ ایک نشست کا اہتمام کیا۔ سردار صاحب تو محفل میں شریک ہونے کے لئے اوپر چلے گئے اور میں ان کی انگریز اہلیہ سے گفتگو کرنے لگا۔۔۔ معلوم ہوا کہ وہ بیس سال سے شادی شدہ ہیں اور ان کا قیام دلی میں ہے۔۔۔ میں نے الٰہی بخش کو بلا کر چائے وغیرہ کا آرڈر دیا۔۔۔ تھوڑی دیر بعد وہ چائے لے آیا اور وہ مسکرا رہا تھا، میز پر چائے کے برتن رکھتے ہوئے پنجابی میں مجھ سے کہنے لگا ”تارڑ صاحب ایہہ میم کِتھوں پھسائی جے“ یعنی یہ میم آپ نے کہاں سے پھانس لی۔ اس پر اس میم نے فوراً ٹھیٹھ پنجابی میں کہا ”کیوں میں تیری ماں بہن آں جے پچھناں اے“۔۔۔ الٰہی بخش کے ہاتھوں سے طشتری فرش پر گر گئی اور وہ باقاعدہ ٹی ہاؤس سے فرار ہو گیا۔ بعد میں مجھ سے شکایت کی کہ آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ میم پنجابی بولتی ہے تو میں نے کہا کہ الٰہی بخش مجھے بھی معلوم نہ تھا لیکن یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ ایک سردار کی بیس برس پرانی بیوی ہو اور اسے پنجابی نہ آتی ہو۔۔۔ سردار حضرات نے ہماری طرح اپنی مادری زبان کو تیاگ نہیں دیا۔

ٹی ہاؤس کے آس پاس خفیہ پولیس والے بھی منڈلاتے رہتے تھے اور ہم جانتے تھے کہ وہ جاسوسی کرنے کی غرض سے یہاں بیٹھ کر چائے وغیرہ بھی پیتے ہیں۔۔۔ خاص طور پر ضیاء الحق کے سیاہ دور میں۔۔۔ ان میں سے ایک دو حضرات کو ہم پہچانتے تھے اور کئی بار جان بوجھ کر ان کے قریب سے گزرتے ہوئے بظاہر بے دھیانی میں کہتے کہ آج فلاں شاعر حلقے کے اجلاس میں ضیاء الحق کے خلاف ایک نظم پڑھ رہا ہے۔ او رجلدی سے چائے پی کر اجلاس میں جا بیٹھتے وہاں جا کر معلوم ہوتا کہ اس شاعر کا نام تو پروگرام میں شامل ہی نہیں۔۔۔ ایک صاحب نہایت باقاعدگی سے شام کا کھانا وہاں کھاتے، ادھر ادھر بالکل نہ دیکھتے سر

جھکا کر کھاتے چلے جاتے اور پھر چپکے سے چلے جاتے۔۔ پتہ نہیں جاسوسی کیسے کرتے تھے۔۔ ویسے ممکن ہے کہ وہ کوئی خاموش طبع شریف آدمی ہوں جنہیں ہم خفیہ کا اہلکار سمجھ بیٹھے تھے۔۔ لیکن ٹی ہاؤس کا ایک کردار ایسا تھا جس کا آج بھی میں تصور کرتا ہوں تو بدن میں سنسنی سی دوڑ جاتی ہے اور وہ تھا ڈاکٹر موت۔۔ وہ زیادہ تر ٹی ہاؤس کے باہر دروازے کے قریب کھڑا دکھائی دیتا۔۔ بہت کم کسی سے بات کرتا بس کھڑا رہتا۔۔ وہ ہمیشہ میڈیکل کے طالب علموں کا سفید اوورآل پہنے ہوتا اور کبھی کبھی اس کے گلے سے ایک سٹیتھوسکوپ بھی لٹک رہی ہوتی۔۔ کہا جاتا تھا کہ وہ کنگ ایڈورڈز میڈیکل کالج کا طالب علم تھا اور عرصہ دراز سے طالب علم تھا۔ آج کل پتہ نہیں کیا قوانین ہیں لیکن ان دنوں مسلسل فیل ہونے والے طلباء کو کالج سے خارج نہیں کیا جاتا تھا اور وہ مسلسل تعلیم حاصل کرتے چلے جاتے تھے۔ ڈاکٹر موت بھی ان میں سے ایک تھا، وہ کم از کم بارہ تیرہ برس سے دکھی انسانیت کی خدمت کے جذبے سے سرشار فیل ہوتا چلا آیا تھا۔۔ اس کی رنگت خاصی سیاہ تھی اور شکل سے مخبوط الحواس لگتا تھا۔۔ سفید کوٹ کے ساتھ اس کا سراپا عجیب ہولناک منظر لگتا تھا۔ ڈاکٹر موت کے بارے میں یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ منشیات کا عادی ہو چکا ہے اور ان کے حصول کے لئے ٹی ہاؤس کے ادیبوں سے مالی امداد حاصل کرتا رہتا تھا۔۔ ایک شام ٹی ہاؤس سے نکل کر میں ٹولنگٹن مارکیٹ کی جانب گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ڈاکٹر موت فٹ پاتھ پر کھڑا ہاتھ پھیلائے بھیک مانگ رہا ہے۔۔ مجھے دیکھ کر وہ شاید شرمندہ ہوا اور کچھ دیر کے لئے بھیک مانگنا موقوف کر دیا۔۔ جب میں نے ادیب دوستوں سے اس ”سانحہ“ کا تذکرہ کیا تو وہ کہنے لگے ”ہمارے لئے یہ نہایت شرمندگی کا مقام ہے کہ ہمارا ڈاکٹر موت بھیک مانگتا پھرے۔ بہرطور وہ ٹی ہاؤس کے خاندان کا ایک رکن ہے۔۔ چنانچہ کچھ رقم درپردہ ڈاکٹر موت کے حوالے کردی گئی اور گزارش کی گئی کہ وہ آئندہ بھیک مانگنے سے گریز کرے ہم لوگوں کی بدنامی ہوتی ہے۔۔ تو یہ تھا ڈاکٹر موت۔ (جاری ہے)

1/12/13

اکیلے سفر کا اکیلا مسافر۔۔ یوسف کامران

مستنصر حسین تارڑ

آج پرانے ٹی ہاؤس کو یاد کرتا ہوں تو یوسف کامران کی یادوں کی پرچھائیاں بھی ساتھ چلی آتی ہیں۔ اس کا پہلا اور آخری مجموعہ کلام ”اکیلے سفر کا اکیلا مسافر“ جس کا دیباچہ منو بھائی نے لکھا تھا شائع ہوا تو اسے نظم کے بہترین شعراء میں شمار کیا گیا۔۔ ٹیلی ویژن پر ادیبوں سے ملاقات کا سلسلہ پروگرام ”داستان گو“ کی صورت میں شروع ہوا تو میزبان کی حیثیت سے اسے ملک گیر شہرت حاصل ہوئی اگرچہ وہ پہلے بھی مشہور تھا لیکن صرف کشور ناہید کے خاوند ہونے کی وجہ سے اور اسے یہ وجہ پسند نہ تھی کہ وہ خود ایک عمدہ شاعر تھا۔۔ ان دونوں کی دوستی مشاعروں میں پروان چڑھی۔۔ یوسف اندرون شہر کا بینڈ سم گورا چٹا کشمیری نوجوان اپنی شاعری پڑھتا تو لڑکیوں کے دل اس کی شباہت دیکھ کر دھک سے رہ جاتے۔ دوسری جانب بلند شہر کی سانولی سلونی غلافی آنکھوں والی بوٹے سے قد کی کشور ناہید اپنی اداس آواز میں شعر پڑھتی تو سبھی دل تھام کے رہ جاتے۔ ان زمانوں میں لڑکیوں نے زرد اوڑھنیاں اوڑھنا شروع کر دیں کہ کشور کی اوڑھنی کا رنگ زرد تھا۔ دونوں جانب برابر کی آگ لگی اور یہ آگ دونوں کے گھر والوں میں بھی لگی کہ۔۔ یہ شادی نہیں ہو سکتی۔۔ یہ ٹھیٹھ لاہوری کشمیری گورے چٹے موٹے تازے اور وہ نستعلیق دھان پان لوگ ۔۔ یہ ملاپ تو ممکن نہ تھا لیکن دونوں نے ساحر لدھیانوی کے اس مشورے پر عمل کیا کہ ۔۔ تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کردو۔ ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو۔۔ انہوں نے دنیا سے بغاوت کر دی اور شادی کر لی۔

یوسف ایک لاابالی اور زندگی سے لطف اندوز ہونے والا یاروں کا یار شخص تھا، میرا بھی یار تھا اور اس کے کرشن نگر والے گھر کے علاوہ ٹی ہاؤس میں بھی اس کے ساتھ نشست رہتی۔۔ اس کے سگرٹ پینے کا انداز ایک خاص رومانوی مزاج کا حامل تھا۔۔ کسی حد تک اشوک کمار اور ہمفری بوگارٹ کا امتزاج تھا، وہ زندگی میں سے خوشی اور شادمانی کا ایک ایک قطرہ کشید کر لینا چاہتا تھا۔۔ ایک مرتبہ کراچی سے ایک شاعر لاہور تشریف لائے اور ادیبوں سے ملنے ٹی ہاؤس چلے آئے۔ یوسف نے ان کی بہت خاطر کی اور پوچھا کہ حضرت قیام کہاں ہے تو وہ کہنے لگے بھئی گلبرگ میں ہمارے عزیزوں کی ایک وسیع و عریض کوٹھی ہے اس کا ایک حصہ ہمارے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔۔ اب یوسف کو اطلاع ملی تھی کہ وہ دراصل ٹی ہاؤس کے نزدیک ہی اندرون شہر کے کسی مکان میں ٹھہرے ہوئے ہیں تو اسے بہت تاؤ آیا کہ دیکھو ہم پر رعب جھاڑتا ہے۔۔ اس کا کچھ بندوبست کرنا پڑے گا۔۔ شاعر صاحب ٹی ہاؤس سے باہر نکلے تو یوسف نے انہیں اپنی کار میں بٹھا لیا کہ آئیے صاحب رات کے اس پہر آپ رکشا ٹیکسی کی تلاش میں کہاں مارے مارے پھریں گے میں آپ کو گلبرگ چھوڑ آتا ہوں۔ وہ صاحب نروس ہو گئے، نہیں نہیں آپ کو زحمت ہو گی۔ یوسف

کہنے لگا، حضور آپ ہمارے مہمان ہیں آپ کی خدمت کرنا ہمارا فرض ہے۔ چنانچہ یوسف انہیں گلبرگ چھوڑ کر واپس آیا۔ اگلے روز بھی وہ صاحب شام گزار کر ٹی ہاؤس سے باہر آئے تو وہاں مسکراتا ہوا سگرٹ پھونکتا یوسف منتظر تھا، آئیے صاحب، کیسا حسین اتفاق ہے کہ میں بھی گلبرگ ہی جا رہا ہوں۔ ان صاحب کی توسٹی گم ہو گئی۔ بہت منت سماجت کی کہ یوسف صاحب ابھی گھر نہیں جانا لیکن یوسف میزبانی کے تقاضوں کے عین مطابق انہیں پھر گلبرگ چھوڑآیا۔ وہ صاحب تین چار روز تو ٹی ہاؤس سے غائب رہے، ہم نے سوچا کراچی واپس چلے گئے ہیں لیکن ایک شام نمو دار ہوئے، پہلے اندر جھانک کر اطمینان کیا کہ کہیں یوسف کامران تو موجود نہیں اور پھر ادیبوں کی ایک محفل میں جا بیٹھے اور شعر سنانے لگے۔۔۔ ٹی ہاؤس بند ہونے لگا تو وہ اٹھے، ادھر یوسف جانے کس کونے میں گھات لگائے منتظر تھا لپک کر آیا اور کہنے لگا، آہا حضرت ہم نے تو آپ کی غیر حاضری میں آپ کو بہت یاد کیا، کہاں چلے گئے تھے۔ انہوں نے یہ تو نہ کہا کہ میں آپ کی مہمان نوازی سے فرار ہوا تھا، یونہی بہانے بنانے لگے کہ دراصل کچھ دوستوں سے ملاقات کرنی تھی، لاہور کے قابل دید مقامات دیکھنے تھے اور میں انشاء اللہ پرسوں واپس کراچی جا رہا ہوں۔ یوسف نے کف افسوس ملا کہ ہائے ہائے آپ کی مدارات کا ہمیں موقع ہی نہیں ملا۔ آپ کے لیے خصوصی طور پر ایک محفل مشاعرہ برپا کرنے کی تمنا تھی۔ بھلا روز روز آپ جیسے نابغۂ روزگار شاعر لاہور کہاں آتے ہیں، اب پرسوں آپ کی روانگی ہے۔ چلئے آپ کو گلبرگ چھوڑ آتے ہیں، راستے میں ذرا شعر و ادب پر گپ شپ رہے گی۔ ان صاحب کا تو رنگ فق ہو گیا، بہت بہانے کیے کہ نہیں نہیں آپ کو زحمت ہو گی، گلبرگ بہت دور ہے، میں خود چلا جاؤں گا، خداحافظ لیکن یوسف نے نہایت جذباتی انداز میں اُن کا ہاتھ تھام لیا کہ نہیں جناب آخر میری کار کس روز کام آئے گی۔ مجھے مہمان نوازی کی سعادت سے محروم نہ کیجیے۔۔۔ لاہور کی روایت ہے۔۔۔ مجھ پر احسان کیجیے۔۔۔ میں بہر صورت آج تو آپ کو گلبرگ چھوڑ کر ہی آؤں گا ورنہ میرا ضمیر مجھے ملامت کرے گا، آئیے۔۔۔ جب فرار کے تمام راستے مسدود ہو گئے تو وہ صاحب باقاعدہ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ یوسف صاحب نے دراصل اس روز بے دھیانی میں کہہ دیا کہ گلبرگ میں قیام ہے ورنہ میں تو یہاں سے نزدیک ہی ایک عزیز کے ہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔۔۔ پہلے روز مجھے آپ اس ویرانے میں چھوڑ آئے تو وہاں واپسی کی کوئی سواری دستیاب نہ ہوئی۔ پیدل واپس آیا۔ صبح دو بجے گھر پہنچا۔۔۔ ٹانگیں اکڑ گئیں۔۔۔ ازاں بعد بھی یہی حال ہوا۔۔۔ آپ کی میزبانی کا معترف ہوں لیکن آج مہربانی کیجیے۔ میرے چھوٹے چھوٹے بال بچے ہیں۔۔۔ یوسف اس اعتراف کے بعد ان صاحب کا گرویدہ ہو گیا۔ اگلے روز بہترین ریستوران میں کھانے پر مدعو کیا اور ان کے فضول سے شعر نہایت دل جمعی سے سنے۔۔۔ یہ تھا یوسف کامران۔۔۔ پھر وہ روزگار کے حصول کے لیے کسی عرب ریاست میں چلا گیا اور جب واپس آیا تو ایک تابوت میں بند آیا۔ اسے ہم نے اقبال ٹاؤن کے قبرستان میں سپرد خاک کیا۔

"اپنی قبر کی تلاش میں"

برسوں پہلے جب میری لاش کو غسل دے کر۔۔۔ مسجد سے مانگی ہوئی چارپائی پر لٹایا گیا۔۔۔ تو میرے " کفن پر ایک منقش سیاہ چادر اور پھول چڑھائے گئے۔۔۔ جنازہ گھر کی دہلیز سے نکلا تو ایک کہرام بپا تھا۔۔۔ مجھے باری باری کندھا دینے اور جنازے کے ساتھ چلنے والوں نے جناز گاہ پہنچ کر دم لیا تو میں نے ان کے چہروں پر لکھا سب کچھ پڑھ لیا۔۔۔ میری لاش کو مسجد میں اکیلا چھوڑ کر جب لوگ وضو کرنے لگے تو میں چپکے سے اٹھ کر گھر لوٹ آیا لیکن دروازہ کھٹکھٹانے پر، مجھ پر دروازہ نہ کھولا گیا۔۔۔ میری بیوی ماتم گساروں کی تواضع میں مصروف تھی اور عورتیں ٹولیوں میں بٹی مختلف موضوعات پر محو گفتگو۔۔۔ میں اُن کی بے اعتنائی دیکھ کر واپس قبرستان لوٹ آیا۔۔۔ اب میں اپنی قبر کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہوں"

(یوسف کامران)

15/12/13

کروں گا کیا جو محبت میں ہو گیا ناکام

مستنصر حسین تارڑ

تو میں اس فرانسیسی مصور کا قصہ بیان کر رہا تھا جس نے کہا تھا کہ" اگر کوئی شخص اپنے اندر تخلیق کے جرثومے رکھتا ہے اور وہ خوش بخت ہو تو وہ اپنے حصے کے بے وقوف پیدا کر لیتا ہے"چنانچہ میں کچھ زیادہ تخلیقی تو نہیں ہوں لیکن محض خوش بخت ہونے کی وجہ سے میں نے بھی اپنے حصے کے بے وقوف پیدا کر لیے ہیں۔۔۔ اور بے وقوف سے مراد ایسے لوگ ہیں جن کے ساتھ آپ کی فریکوئنسی مل جاتی ہے اور وہ آپ کی تحریر کے شیدائی ہو جاتے ہیں۔۔۔ اور ان میں سے سر فہرست "مستنصر حسین تارڑ ریڈرز ورلڈ"

کے اراکین ہیں جنہوں نے یہ ویب سائٹ میری بے خبری میں بنائی اور بہت بعد میں مجھے خبر ہوئی کہ یہ ہزاروں افراد آپس میں رابطہ رکھتے ہیں اور میری تحریروں کو کمپیوٹر پر زیر بحث لاتے ہیں۔۔۔ چند ماہ پیشتر ایک آئی ٹی انجینئر نے میرے حوالے سے ایک نئی ویب سائٹ لانچ کی تو اس کے آغاز کی تقریب میں یہ لوگ ملک بھر سے آئے اور شریک ہوئے۔ یہ ممکن نہ تھا کہ میں کراچی میں ہوتا اور کراچی سے تعلق رکھنے والے ریڈرز ورلڈ کے اراکین مجھ سے ملاقات کے لیے نہ آتے۔۔۔ اس سے پیشتر میں جمیل عباسی اور اس کی بیگم عظمیٰ جمیل کا تذکرہ کر چکا ہوں جو اندرون سندھ سے تقریباً سات گھنٹے سفر کرتے ہوئے کراچی پہنچ گئے تھے۔ ادھر ساہیوال سے سمیرہ انجم اور امریکہ میں مقیم عاکف فرید کراچی میں سب سے رابطہ رکھے ہوئے انہیں ہدایات دے رہے تھے کہ کس طرح میرے آرام کا خیال رکھا جائے اور میری آؤ بھگت کی جائے چنانچہ اس سلسلے میں تہمینہ صابر اور ان کے خاوند صابر صاحب نے اپنے ہاں ایک تقریب کا اہتمام کیا جس میں ریڈاز ورلڈ کے درجنوں اراکین نے شرکت کی اور وہ سب ایک خاندان کی مانند تھے، ایک دوسرے کے ساتھ چُہلیں کرتے میری آمد پر مسرت کا اظہار کرتے تھے، مجھ سے میری تحریروں کے بارے میں پوچھتے تھے۔۔۔ ایک روز تہمینہ نے مجھ سے فون کر کے دریافت کیا کہ آپ کھانے میں کیا پسند کرتے ہیں تو میں نے کہا کہ میں بہت کم خوراک کا عادی ہوں لیکن کراچی آ کر مچھلی زیادہ مرغوب ہو جاتی ہے۔۔۔ تہمینہ کے ہاں مچھلی اتنی وافر اور مختلف اقسام کی تھی کہ اُس پر مچھلی منڈی کا گمان ہوتا تھا۔۔۔ اور اسے مچھلی بنانے کا سلیقہ بھی آتا تھا۔۔۔ مجھے سب لوگوں کے نام تو یاد نہیں آرہے لیکن حجاب پوش تھنک معنک اور خوشگوار معصومہ تھیں۔۔۔ ڈاکٹر نازش کا خوشی دینے والا چہرہ تھا۔۔۔ باجرہ ریحان اور ان کے خاوند۔۔۔ بیگم فریال۔۔۔نسرین غوری۔۔۔ عمارہ خان۔۔۔ مریم کاشف، ثوبیہ عثمان موجود تھے اور جب یہ لوگ مجھے ہوٹل چھوڑنے جا رہے تھے تو میں ایک شکر گزاری اور ندامت کی کیفیت میں تھا کہ میری کوئی حیثیت نہ تھی اور ان لوگوں نے مجھے اپنی چاہت سے حیثیت والا بنا دیا۔۔۔ بس یہی تو خوش بختی ہوتی ہے ورنہ ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے۔۔۔ مجھ سے بہت اچھے، بہتر کہنے والے اور اس کے باوجود اتنی ڈھیر ساری محبتیں میرے حصے میں آ گئیں۔ جی ہاں صرف خوش بختی!

کانفرنس کے دوران بے شمار دوستوں نے مجھے اپنی تخلیقات سے نوازا اور مجھے خوشی ہوئی کہ ہمارے ہاں اتنے لوگ سنجیدگی سے ادب تخلیق کر رہے ہیں، میں اُن سب کا شکر گزار ہوں، انشاء اللہ اگلے برس تک میں ان کتابوں کے مطالعے سے فارغ ہوجاؤں گا۔۔۔ زندگی میں پہلی بار اردو نظم کے شاید سب سے بڑے نظم گو ستیہ پال آنند سے ملاقات ہوئی اور وہ کیسے جواں سال دکھتے ہیں۔۔۔ انہوں نے مجھے اپنے دو شعری مجموعوں سے نوازا جن میں ”ستیہ پال آنند کی تیس نظمیں“ اور ”جو نسیم خندہ چلے“ شامل تھے۔۔۔ انہوں نے خصوصی طور پر اپنی آپ بیتی بھجوانے کا وعدہ کیا۔۔۔ وہ امریکہ سے تشریف لائے تھے۔۔۔ لیکن مجھے اس کانفرنس میں سب سے زیادہ خوشی ایک نوجوان عماد قاصر سے ملاقات پر ہوئی کہ وہ میرے ”فنون“ کے زمانوں کے مرحوم دوست غلام محمد قاصر کا بیٹا تھا اور خصوصی طور پر مجھے ملنے کے لیے آیا تھا۔۔۔ میرے لیے اس کی عنایت کردہ ”کلیات قاصر“ ”اِک شعر ابھی تک رہتا ہے“ بہت بڑا تحفہ تھی۔۔۔ قاصر کے کئی شعر کلاسیک کا درجہ اختیار کر چکے ہیں اور میرے بھی پسندیدہ ہیں۔

کروں گا کیا جو محبت میں ہو گیا ناکام
مجھے تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا
تم یونہی ناراض ہوئے ہو ورنہ مے خانے کاپتا
ہم نے ہر اس شخص سے پوچھا جس کے نین نشیلے تھے

یہ شاید آج سے چالیس برس پیشتر کا قصہ ہے جب ایک خاموش طبع نوجوان شاعر میری دکان پر آیا کرتا تھا اور ان دنوں ریلو سے میں کوئی معمولی ملازمت کر کے بمشکل گزر اوقات کرتا تھا۔۔۔ وہ شعر سناتا نہیں تھا میری فرمائش پر سنا دیتا تھا اور اُس میں ایک نایاب جوہر تھا۔ پھر وہ کراچی چلا گیا جو اسے راس آ گیا اور آج غزل اور گیت میں اس کی ناموری بے مثل ہے۔ اس نے حال ہی میں ”ہیر رانجھا“ کو اردو میں ڈھال کر اپنی قادر الکلامی کی دھاک بٹھا دی ہے اور اس کا نام صابر ظفر ہے جس کی دنیا وی اور شعری کامیابیاں مجھے مسرت سے ہمکنار کرتی ہیں۔۔۔

ہر برس کراچی آرٹس کونسل اردو کانفرنس میں کسی ایک ادبی شخصیت کو ”اعتراف کمال“ کے لیے منتخب کرتی ہے اور اس بار میرا انتخاب ہوا جس کے لیے میں احمد شاہ اور اُن کے رفقاء کار کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔۔۔ اس محفل میں رضا علی عابدی نے میرے سفر ناموں کی بات کی اور صاحب صدر عبداللہ حسین نے میرے ناولوں کے بارے میں تحسین آمیز کلمات کہے۔۔۔ میزبانی کے فرائض ڈاکٹر ضیاء الحسن نے بخوبی سر انجام دیے۔

ایک یاد میں ثبت ہو جانے والی شب نوجوان ناول نگار ایچ ایم نقوی کے ہاں گزری۔۔۔ اس نے مجھ سے اور

عبداللہ حسین سے ملاقات کے لیے شہر بھر کو مدعو کر رکھا تھا۔۔ عرفان جاوید اور اس کی بیگم بھی موجود تھے۔ نقوی نے مجھے اپنا ناول ”بوم بوائے“ عنایت کیا جس کی توصیف دنیا بھر میں ہوئی، اسے ایک سانس روک دینے والا ناول کہا گیا۔۔ اس دوران شیما کرمانی اپنے خاوند کے ہمراہ تشریف لے آئیں اور اُن کی آمد سے محفل میں روشنی بڑھ گئی۔ وہ بے حد الفت سے ملیں جس کی یاد گار ایک تصویر ہے۔ نقوی نے مدارات میں کچھ کسر نہ چھوڑی تھی۔ وہ ایک پرانی طرز کے منیشن میں رہتا تھا، جب میں نے پوچھا کہ یہ گھر تمہارا ہے تو کہنے لگا ”نہیں، ہم تو گھر داماد ہوا کرتے ہیں“ اللہ تعالیٰ ایسے سسرال سب کو نصیب کرے۔
ضیاء محی الدین کی شام میں ساحرہ کاظمی اور راحت کاظمی سے ایک عرصے کے بعد ملاقات ہو گئی اور دل کا عجب حال ہوا کہ ہم نے ایک مدت ٹیلی ویژن کو اپنا گھر بنائے رکھا تھا۔۔ جب یہ مثالی جوڑا لاہور میں تھا تو اکثر ان کے گھر آنا جانا رہتا تھا۔۔ سب خواب ہوا۔۔ انور سجاد جسے کراچی نے قید کر لیا ہے، دور سے نظر آئے، ہجوم کے باعث اس پرانے دوست تک پہنچ ہی نہ سکا۔۔ افسوس ہوا۔
میرے لیے کانفرنس کا اہم ترین اجلاس ”اداس نسلیں“ کی اشاعت کے پچاس برس کا جشن تھا۔ عبداللہ حسین نے جتنی شہرت اس ایک ناول سے حاصل کی اتنی ناموری کسی اور کے حصے میں نہ آئی۔ اپنی زندگی میں ہی اپنے ناول کا کلاسیک میں شمار ہو جانا کتنی بڑی خوش نصیبی ہے۔ جیسا کہ میں نے شروع میں اُن کی دراز قامتی کے حوالے سے لکھا تھا کہ زندگی بھر عبداللہ حسین کو نہ اپنے قد کے مطابق چارپائی نصیب ہوئی اور نہ ہی کوئی نقاد۔۔ ہماری رفاقت تقریباً چالیس برس پر محیط ہے اور کم از کم میں عبداللہ حسین کے بغیر اپنی زندگی کا تصور نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ اسے صحت اور زندگی دے۔
کانفرنس ختم ہوئی تو منیر نیازی یاد آگیا۔
کتاب عمر کا ایک اور باب ختم ہوا
شباب ختم ہوا اِک عذاب ختم ہوا

18/12/13

صدائے روس کے شیدائی اور آنیا
مستنصر حسین تارڑ
مجھے ریڈیو کی طاقت اور اثر انگیزی کا اندازہ نہ تھا۔۔ میرا جنم ٹیلی ویژن میں ہوا اور میں نے کبھی ریڈیو کو سنجیدگی سے نہ لیا۔۔ کبھی کبھار شائستہ حبیب کے صبح کے پروگرام کے لئے صرف اس لئے سکرپٹ لکھ دیتا کہ وہ کمال کی دلکش شاعرہ تھی اور جب وہ فخر زمان سے شادی کرنے کے بعد کینسر کا شکار ہوئی تو میں نے ان زمانوں کے سب سے بڑے کینسر سرجن ڈاکٹر افتخار راجہ سے منت کی کہ یہ خاتون مجھے بے حد عزیز ہیں آپ پلیز فرصت نکالئے اور ان کا آپریشن کیجئے اور وہ مان گئے۔۔ شاید اس لئے بھی کہ میں نے مرحوم مصطفی چوہدری، بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی فرمائش پر ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ کے سفرنامے کا دیباچہ تحریر کیا تھا۔۔ ڈاکٹر افتخار راجہ ایک ایئر کریش میں ہلاک ہو گئے۔ شائستہ کو آپریشن کے باوجود بہت کم جینے کی مہلت ملی اور وہ مر گئی۔۔چنانچہ صرف شائستہ کی خاطر میں اس کے ریڈیو مارننگ شو کی سکرپٹ لکھا کرتا تھا، چند ایک ڈراموں میں بھی صداکاری کی لیکن ریڈیو مجھے راس نہ آیا، میں ٹیلی ویژن کا رسیا رہا۔
میں اکثر تذکرہ کرتا ہوں کہ ماسکو سٹیٹ یونیورسٹی کے اردو کے نصاب میں میری تحریریں پچھلے تیس چالیس برس سے شامل ہیں اور جب یونیورسٹی نے مجھے لیکچرز دینے کے لئے مدعو کیا تو میرے قیام کے دوران ایک روسی خاتون میرا انٹرویو لینے کی خاطر ہوٹل پہنچ گئیں اور وہ مجھے پہلے تو خبر نہ تھی کہ روس میں کئی برسوں سے جاری ایک اردو پروگرام کی انچارج ہیں جو ”صدائے روس“ کہلاتا ہے اور وہ بہت رواں اردو بولتی تھیں۔۔ اور یہاں میں آج سے پچپن برس پہلے کے زمانوں میں چلا جاتا ہوں جب میں برطانوی وفد کے ایک ممبر کے طور پر ”آہنی پردے“ کے پار سوویت یونین میں گیا تھا اور ان پہلے پاکستانیوں میں تھا جنہوں نے اس زمانے کے سوویت یونین کو دیکھا تھا جس کی دہشت سے مغرب اور امریکہ لرزہ براندام تھے۔۔ اور یہ وہ زمانے تھے جب کراچی میں بائیں بازو کے لوگ جلوس نکال کر امریکہ کے خلاف نعرے لگاتے تھے تو جماعت اسلامی کے لوگ ان پرحملہ آور ہو جاتے تھے کہ تاریخ کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔۔ ان دنوں جماعت کا سب سے پسندیدہ ملک امریکہ ہوا کرتا تھا۔۔ وہ اس کے خلاف نعرہ بازی برداشت نہیں کر سکتے

تھے۔۔ تو ان زمانوں میں سوویت یونین میں اردو کا بہت چلن تھا۔۔ مجھے یاد ہے جب میں نے اپنی مترجم گانیاسے کہا کہ مجھے اپنے کیمرے کے لئے فلم درکار ہے تو اس نے کہا تھا۔۔ اجی حضرت فلم نہ کہئے۔۔ یہ کہئے کہ آپ کو کیمرے کے لئے فیتہ درکار ہے اور پھر غالب، اقبال اور فیض کے شعر پڑھنے لگتی۔ چنانچہ منتشر ہو چکے سوویت یونین اور لمحۂ موجود کے مختصر ہو چکے روس میں بھی اردو کا چلن بہت ہے۔

اس برس ”صدائے روس“ کی نمائندگی کرنے والی میرے ایک عزیز روسی دوست کی بیٹی آنیا تھی۔ تنویر بھٹہ جو بیشتر پاکستانی ہے اور کافی حد تک روسی ہے اس نے مجھ سے درخواست کی کہ ”صدائے روس“ کے حوالے سے جو تقریب منعقد کی جا رہی ہے، پلیز آ جائیے۔۔ اور آ جائیے۔

ایک فائیوسٹار ہوٹل کے وسیع ہال میں پہنچ کر مجھے ریڈیو کی طاقت اور اثرانگیزی کا اندازہ ہوا۔۔ کہ وہاں جتنے بھی لوگ جمع تھے وہ سب کے سب کئی برسوں سے ”صدائے روس“ کی نشریات نہ صرف باقاعدگی سے سنتے تھے بلکہ پروگراموں میں شریک بھی ہوتے تھے۔۔ وہ نہ صرف اپنے پسندیدہ پروگراموں کے حوالے دے رہے تھے بلکہ اپنے پسندیدہ صداکاروں کا نہایت محبت سے تذکرہ بھی کر رہے تھے۔۔ ”صدائے روس“ کے شیدائی فیصل آباد، حیدرآباد، بدین اور ڈیرہ اسماعیل خان تک سے صرف اس تقریب میں شرکت کی خاطر آئے تھے۔۔ اور حیرت انگیز طور پر ان میں سے بیشتر ان نشریات کے حوالے سے ایک دوسرے سے واقف بھی تھے۔۔ اور یہ حقیقت مجھ پر منکشف ہوئی کہ ریڈیو کا حلقہ اثر بہت وسیع ہے بلکہ ٹیلی ویژن کی نسبت یہ زیادہ لوگوں تک پہنچتا ہے۔۔ خاص طور پر شہروں سے دور علاقوں میں لوگ ریڈیو کی نشریات سے زیادہ آگاہ ہوتے ہیں۔۔ آپ ہمہ وقت تو ”ایڈیٹ بوکس“ یعنی ٹیلی ویژن کے سامنے تو نہیں بیٹھ سکتے جبکہ آپ ریڈیو کو چلتے پھرتے، سفر کرتے، کار میں سوار یا پھر ایک اونٹ پر سواری کے دوران بھی سن سکتے ہیں۔ اس کی ایک واضح مثال اشفاق احمد کا پروگرام ”تلقین شاہ“ تھا۔

مجھے ہال میں داخل ہوتے دیکھ کر آنیا جو سٹیج پر بیٹھی تھی لپکتی ہوئی آئی اور نہایت گرم جوشی سے مجھے ملی۔۔ کبھی انگریزی بولتی اور کبھی اٹک اٹک کر اردو بولنے لگتی، کہ آپ کب دوبارہ ماسکو آئیں گے، سب لوگ آپ کو یاد کرتے ہیں، میمونہ آنٹی کا کیا حال ہے وغیرہ۔۔ سٹیج پر ایک روسی سفارتکار کے علاوہ روس کے اعزازی کونسل جنرل حبیب احمد بھی تشریف رکھتے تھے جنہوں نے ایک پُرجوش تقریر کی کہ روس سے کاروباری اور ثقافتی رابطے بڑھانے چاہئیں۔۔ انہوں نے متعدد بار ان تین تقریبات کا حوالہ دیا جو انہوں نے روس کے سرکاری دنوں پر منعقد کیں۔۔ ظاہر ہے میں نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔۔ اور 1958ء میں سوویت یونین کے اس دورے کا حوالہ دیا جب میں برطانوی ڈیلی گیشن میں شامل ہو کر اس زمانے کے ”آہنی پردے“ کے پار گیا تھا اور پھر لندن واپسی پر ”لندن سے ماسکو تک“ کے نام سے مجید نظامی صاحب کی فرمائش پر اپنی زندگی کا اولین سفرنامہ تحریر کیا تھا جو ہفت روزہ ”قندیل“ میں قسط وار شائع ہوا تھا۔ تقریب کے اختتام پر ”صدائے روس“ کے پرجوش سامعین میں انعامات تقسیم کئے گئے۔

روس اور پاکستان کے روابط ہمیشہ سے شکوک کا شکار رہے ہیں اور اس کا آغاز لیاقت علی خان کے دورۂ امریکہ سے ہوا اور پھر ہم امریکہ سے نتھی ہوئے کہ آج تک ”نَتھ“ نہیں کھل سکی۔۔ ہم ان زمانوں میں سیٹو اور سنٹو معاہدوں میں شریک ہوئے جو صرف کمیونسٹ روس یا سوویت یونین کے گرد ایک ہتھیار بند حصار کے طور پر تشکیل دیئے گئے۔ یہاں تک کہ پاکستانی سرزمین سے امریکی فضائی اڈوں سے یعنی بڈابیر وغیرہ سے یُوٹو جاسوس جہاز اڑائے جاتے تھے جو سوویت یونین کی جاسوسی کرتے تھے اور پھر روسیوں نے ایک یُوٹو مار گرایا اور اس کے پائلٹ کو گرفتار کر لیا۔ ان زمانوں میں نکیتا خروشچوف نے دھمکی دی تھی کہ ہم نے ایٹمی جنگ کے لئے پشاور کے گرد ایک سرخ نشان لگا کر اسے ایک ہدف قرار دے دیا ہے۔ بہرطور نہ تو سوویت یونین رہا اور نہ ہی روس کا وہ قدیم مزاج رہا۔۔ حالات بدل رہے ہیں، ہمیں بہرطور روس کی جانب بالآخر دوستی کا ہاتھ بڑھانا ہو گا ورنہ ہماری امریکی ”نتھ“ کبھی نہ کھل سکے گی۔

میں ”صدائے روس“ کو پاکستان میں خوش آمدید کہتا ہو

22/12/13

خطاطی کا بازار

مستنصر حسین تارڑ

شی آن ایک زمانے میں چین کا دار السلطنت ہوا کرتا تھا۔ ایک ایسا شہر جو ثقافت اور ذوق جمال کے حوالے سے دنیا بھر میں پہچانا جاتا ہے۔ میں اکثر اسے چین کا لاہور کہا کرتا ہوں کہ دونوں میں قدامت اور تہذیب

قدیم ہے۔۔ دنیا کا آٹھواں عجوبہ یعنی ٹیرا کوٹا آرمی جسے آپ مٹی کی فوج بھی کہہ سکتے ہیں ، اسی شہر سے کچھ فاصلے پر واقع ہے۔۔ ایک پرانی فصیل کے آثار ابھی تک باقی ہیں۔ میں پاکستانی ادیبوں کے ایک وفد کے ہمراہ شی آن میں تھا۔۔ ایک روز ہم ”پتھروں کا جنگل“ دیکھنے کے لیے گئے اور راستے میں ”خطاطی کا بازار“ پڑتا تھا۔۔ اس منفرد بازار میں صرف خطاطی کے لیے استعمال ہونے والا سامان ملتا ہے۔۔ یعنی کاغذ، سیاہیاں، رنگ، برش اور قلم وغیرہ۔۔ مجھے حیرت اس بات پہ ہوئی کہ وہاں بچوں کی کثرت تھی۔۔ بے شمار بچے اپنے والدین کے ہمراہ یا سکول ٹیچرز کے ساتھ اس بازار میں سے خطاطی میں استعمال ہونے والی اشیاء خرید رہے تھے۔۔ اور دکاندار نہایت خوش مزاجی سے بچوں کو بتا رہے تھے کہ انہیں خطاطی کے لیے کونسا کاغذا استعمال کرنا چاہیے۔۔ کونسا قلم اور کس موٹائی کا اُن کے لیے موزوں رہے گا۔۔ ظاہر ہے وہاں ایسے بوڑھے بھی تھے جن کا مشغلہ خطاطی کرنا تھا اور ایسے نوجوان بھی جو اس فن کے شیدائی تھے۔۔ تقریباً آدھے کلو میٹر پر محیط یہ بازار بے حد پر رونق تھا۔۔ بازار کے اختتام پر ایک صاحب جن کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ چین کے ایک معروف خطاط ہیں، اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے، اپنے آگے پھیلے خصوصی کاغذ پر وہ اپنے برش اور قلم کے جوہر دکھا رہے تھے اور اُن کے گرد جمع لوگ اُن کی ہر سٹروک پر یوں داد دے رہے تھے جیسے وہ کسی مشاعرے میں شریک ہوں۔۔ وہ خطاط لوگوں کو دعوت دے رہے تھے کہ وہ بھی شریک ہوں اور اُن ی رہنمائی بھی کر رہے تھے۔۔ اگرچہ میں ایک بد خط شخص ہوں، گو ہر قلم وغیرہ نہیں ہوں نہ ہی نفیس رقم ہوں بلکہ لکھائی کے حوالے سے مجھے آسانی سے پاپوش رقم کا خطاب دیا جا سکتا ہے لیکن پھر بھی میں نے آگے بڑھ کر خطاط کو اپنے پاکستانی ہونے کا بتایا اور پھر کاغذ پر اپنا نام، پاکستان اور اللہ کے حروف اپنی طرف سے نہایت خوش خط لکھے۔۔ خطاط صاحب خاصے حیران ہوئے، وہ ہمارے رسم الخط پر فدا ہو رہے تھے اور میری ”خطاطی“ کی تعریف اس لیے کر رہے تھے کہ اُن کے خیال میں ہمارے ہاں اسی نوعیت کی خطاطی ہوتی ہو گی۔ شاید انہوں نے چینی زبان میں مجھے نادر القلم وغیرہ کا بھی خطاب دیا۔۔ میں نے انہیں بتایا کہ ہم مسلمانوں میں بھی خطاطی کی ایک قدیم اور شاندار روایت موجود ہے اگرچہ ہم اس کی جانب زیادہ توجہ نہیں کر رہے۔ ہمیں اپنے سوا دنیا بھر کے ملکوں کے اندرونی معاملات میں زیادہ دلچسپی ہے۔۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ہم خطاطی ایسے شاندار ورثے سے شدید غفلت برت رہے ہیں۔ نہ اسے حکومت کی سرپرستی حاصل ہے اور نہ ہی اسے سیکھنے کے لیے کوئی معروف ادارے ہیں، جو لوگ یہ فن سیکھنا چاہتے ہیں وہ خطاط حضرات کے پیچھے دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔ اُدھر بیشتر خطاط بھی اپنی ”کاتب“ ذہنیت سے باہر نہیں آئے اور سکھانے میں بخل اور تکبر سے کام لیتے ہیں بلکہ سکھاتے کم ہیں اور طالب علموں سے ”چھوٹے“ کا کام زیادہ لیتے ہیں، اوئے استاد کے سامنے مؤدب ہو کر بیٹھو۔۔ میری جوتیاں سیدھی کرو۔۔ بازار سے ذرا پکوڑے تو لے آؤ پھر ”الف“ لکھنا سکھائیں گے۔۔ اس سے بہتر تو ہمارے زمانے تھے کہ ہم باقاعدگی سے تختی لکھتے تھے، اپنے قلم گھڑتے، سیاہی خود بناتے تھے اور تختی پر چکنی گاچی مل کر اُسے تیار کرتے تھے۔ علاوہ ازیں خوش خطی کے نمبر الگ ملتے تھے جو مجھے پاپوش رقم ہونے کے حوالے سے کبھی نہ ملے۔۔ میرے ابا جی بے حد خوش خط تھے اور انہوں نے باقاعدہ خطاطی سیکھی تھی کہ اُن زمانوں میں اسے ذوق نفیس کا ایک معیار گردانا جاتا تھا۔ خطاطی کو ہمارے معاشرے میں ایک باعزت مقام اس لیے بھی نہ مل سکا کہ ”کاتب“ ہونا بھی باعث عزت نہ تھا ۔۔ جتنے بھی خصوصی پیشے تھے انہیں حقارت کی نظر سے دیکھاجاتا تھا۔۔ فلاں کمہار ہے، جولاہا ہے، گلوکار، میراثی ہے، نائی یا دھوبی ہے یا پھر کاتب وغیرہ ہے۔۔ اور یہ ذہنیت ابھی تک چلی آتی ہے۔۔ ہم ہاتھ سے کام کرنے والے ہنر مندوں کو قدر کی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے، اور نہ ہی اب دیکھتے ہیں۔ اس کے باوجود ہمارے ہاں کیسے کیسے نابغۂ روزگار پیدا ہوئے اور انہوں نے دنیا بھر میں اپنے فن کی دھاک بٹھا دی۔ میں یہاں خطاطی کی تاریخ بیان نہیں کروں گا کہ آپ اس کے

لیے گوگل سے رجوع کر سکتے ہیں جس کے پاس مجھ سے کہیں وسیع معلومات محفوظ ہیں۔۔ مجھے برصغیر کے نامور خطاط حافظ یوسف سدیدی سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور وہ ایسے درویش صفت شخص تھے کہ انہوں نے بہت سے لوگوں کو فیض پہنچایا، اپنا فن بغیر کسی معاوضے کے لالچ کے سکھایا اور کبھی بخل سے کام نہ لیا۔۔ میں خطاطی کے فن کی باریکیوں سے آگاہ تو نہیں لیکن اس کے باوجود میں یوسف سدیدی کا ہاتھ درجنوں نمونوں میں سے پہچان سکتا ہوں کہ وہ اس فن میں یکتا تھے۔۔ 1975ء میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد میرا خالہ زاد بھائی کیپٹن ساجد نذیر اپنے جہاز کے کوئٹہ میں کریش ہو جانے سے شہید ہو گیا۔۔ میری درخواست پر حافظ صاحب نے اس کی قبر کا کتبہ رقم کیا۔۔ جب میں نے براہ راست نہیں کسی کے ذریعے معاوضے کے بارے میں استفسار کیا تو اُن کا جواب تھا ”میں شہید کا کتبہ رقم کرنے کا معاوضہ لینا گناہ سمجھتا ہوں۔۔ یہ تو میرے لیے باعث برکت ہے“۔۔ اور ایک آج کے مکمل طور پر کمرشل ہو چکے خطاط ہیں کہ اُن سے ایک صرف ”اقرأ“ لکھنے کی درخواست کریں تو وہ آپ کوفوراً ایک لمبی تفصیل

بتائیں گے کہ فلاں میوزیم نے اُن کی خطاطی اتنے ہزار پاؤنڈ میں خریدی ہے اور فلاں صاحب نے مجھے اتنی رقم دی تھی تو بہر حال موقع ملا تو لکھ دیں گے۔۔۔ میرے زمانے میں محمد حسین شاہ صاحب کا بھی بہت چرچا تھا، اُن کے بیٹے خالد سیف اللہ میرے دوست بھی تھے اور ناشر بھی بلکہ روزنامہ ”مشرق“ میں انہوں نے میری کالم نویسی کا آغاز کروایا۔ وہ خود بھی باکمال خطاط تھے۔۔۔(جاری ہے)

25/12/13

خطاطی، رنجیت سنگھ اور گوہر قلم
مستنصر حسین تارڑ

بلتستان کی وادئ شگر میں ساڑھے چھ سو سال پرانی ایک مختصر مسجد ہے، وہاں ایک کونے میں ایک پھٹی پُرانی بوری پڑی تھی جس میں قرآن پاک اورکچھ مذہبی کتابوں کے منتشر اوراق موجود تھے۔ مجھے ایک مقامی شخص نے بتایا کہ تقریباً ہر گھر میں قرآن پاک کے قلمی نسخے ہوا کرتے تھے، پرنٹنگ پریس میں شائع شدہ قرآن پاک کی آمد سے یہ بوسیدہ ہو چکے نسخے کارآمد نہ رہے اور لوگ انہیں یہاں مسجد میں جمع کروا جاتے تھے، ہر ماہ ہم ان اوراق کو دریائے برالڈو کے سپرد کر دیتے ہیں۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ ان میں سے کچھ پُرانے اوراق مجھے عنایت کر دیں تو وہ کہنے لگے آپ بے شک پوری بوری لے جایئے۔ بہرطور میں ان میں سے کچھ اوراق اپنے ہمراہ لے آیا اور یہ خطاطی کا ایک انمول خزانہ تھا جس میں مختلف رسم الخط نہایت خوش خطی سے اپنے آپ کو نمایا ں کرتے تھے۔۔۔ ان زمانوں میں چونکہ قرآن پاک ہاتھ سے لکھے جاتے تھے اس لئے خطاط حضرات کو قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔۔ پرنٹنگ پریس کی ایجاد نے فن خطاطی کو گہنا دیا اور یہ فن چند خاندانوں تک محدود ہو کر رہ گیا۔ لاہور کے فقیر خانہ میوزیم میں تاج محل پر نقاشی کرنے والے خطاط کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے قرآنی اوراق موجود ہیں۔ اس کے ایک پرانے مہتمم کا کہنا ہے کہ وہ ایک زمانے میں صبح سویرے دریائے راوی کے کنارے جایا کرتے تھے جہاں کئی بار ایسے لوگ آتے تھے جو اپنے خاندانی نسخوں کے پھٹے پُرانے اوراق کو دریا بُرد کرنا چاہتے تھے اور یہ مہتمم ان سے درخواست کر کے یہ اوراق حاصل کر لیتے تھے۔ تاج محل کے خطاط کے لکھے ہوئے اوراق بھی راوی کنارے حاصل ہوئے۔۔۔ اسی میوزیم میں ایک اور شاندار قلمی قرآن پاک ہے جس کے حصول کی روایت بے حد دلچسپ ہے۔۔۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں گوجرانوالہ کے ایک خطاط نے پوری عمر اس قرآن پاک کی خطاطی کرنے اور اس کی تزئین و آرائش کرنے میں بسر کر دی۔ اس قلمی نسخے کے مکمل ہونے پر اس نے اسے ایک بیل گاڑی پر احترام سے سجایااور سفر پر روانہ ہو گیا۔ لاہور میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے دیکھا کہ ایک بیل گاڑی ہے جس کے گرد ایک ہجوم جمع ہے اور لوگ اس پر پھول نچھاور کر رہے ہیں۔۔۔ مہاراجہ متجسس ہوا اور اس شخص کو اپنے پاس بلایا کہ یہ کیا ہے اور تم کہاں جا رہے ہو۔۔۔اس پر خطاط نے بتایا کہ یہ قرآن پاک اس کی عمر بھر کی کمائی ہے اور وہ اسے کسی مسلمان حکمران کی خدمت میں پیش کرے گا تاکہ انعام و اکرام سے نوازا جائے اور بقیہ زندگی آسائش سے بسر کر سکے ۔۔۔ اس پر مہاراجہ اپنے گھوڑے سے نیچے اتر آیا اور خطاط کے کندھے تھپک کر بولا۔۔۔ تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں، میں کسی ایک مذہب کے ماننے والوں کا نہیں سب کا مہاراجہ ہوں اور مسلمانوں کا بھی ہوں۔۔۔ یہ قرآن پاک مجھے عنایت کر دو، یہ پنجاب میں رہے گا۔۔۔ مہاراجہ نے اس خطاط کو گوجرانوالہ میں انعام کے طور پر آٹھ گاؤں تفویض کر دیئے۔ آج بھی وہ گاؤں اس خطاط کی آل اولاد کی ملکیت میں ہیں۔ مہاراجہ نے یہ قلمی قرآن اپنے مسلمان وزیراعلیٰ کو پیش کر دیا جن کا تعلق فقیر خاندان سے تھا اس لئے وہ نسخہ آج فقیرخانہ میوزیم میں محفوظ ہے۔ میں نے دنیا بھر کے عجائب گھروں میں قرآن پاک کے جو نادر قلمی نسخے نمائش پر دیکھے ہیں ان کا تذکرہ پھر سہی۔

ظاہر ہے کہ خطاطی کا فن ہمارے ہاں اُدھر سے ایران توران اور عرب سے آیا۔۔۔ وہاں اب بھی یہ روایت بے حد توانا ہے۔۔۔ خاص طور پر ایران میں جہاں حکومتی سطح پر نہ صرف اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے بلکہ یہ نصاب میں بھی شامل ہے۔ عراق، شام اور مصر کے خطاط بھی دنیا بھر میں مانے جاتے ہیں۔ سلطنت عثمانیہ کے دور میں خطاطی کو بھی بے حد عروج نصیب ہوا، مسجد نبوی کے تُرک حصے کے فانوسوں اور دیواروں پر بھی تُرک خطاطوں کے کمالِ فن کے نادر نمونے ہیں جن کی دل کشی میں کچھ شبہ نہیں۔۔۔ خطاطی تُرک ثقافت کا اتنا اہم حصہ رہی ہے کہ نوبل انعام یافتہ تُرک ادیب ادہان پاموک کا ناول ”مائی نیم اِز ریڈ“ کی بنیاد ہی خطاطی اور مصوری کا فن ہے اور یہ ایک ایسا ناول ہے جس کی تخلیقی قوت کے باعث پاموک کو نوبل انعام سے نوازا گیا۔۔ اسی ناول میں درج ہے کہ ان زمانوں کے خطاط اور مصور آخری عمر میں

اندھے ہو جاتے تھے۔ وہ جو دیدہ ریزی تھی دن رات کاغذ پر جھکے ہوئے سانس روکے ہوئے موم بتی یا دیئے کی ناکافی روشنی میں بالآخر دیدے تاریک کر دیتی تھی۔۔ اگر آج میں آپ کو خطاطی کے بازار میں لے آیا ہوں اس کے تخلیقی جہان کو اپنے محدود علم سے بیان کر رہا ہوں تو اس کا سبب کچھ نہ کچھ تو ہے۔۔ اور اس کا سبب ایک گوہر ہے جو میری میز پر ایک کوہ نور کی مانند دمکتا ہے، اس کی آب و تاب پر نظر نہیں ٹھہرتی اور یہ گوہر قلم ہے۔۔ آفتاب جہاں ہے خورشید عالم ہے۔۔مختصراً یہ کہ میرے سامنے خورشید عالم گوہر قلم کی خطاطیوں کا ایک مجموعہ ہے۔۔ بس گوہر کی خطاطی دیکھ کر ہی مجھے خطاطی کا بازار یاد آیا کہ وہ کمال فن کی منزلیں طے کر کے ستاروں سے آگے جو جہان ہیں اُدھر کا مسافر ہو گیا ہے۔۔ میں کیسے اس کے ہنر اور یکتائی کو بیان کر سکتا ہوں کہ میں بے ہنر ہوں، کوئی ہنر والا ہی اسے پرکھے اور داد دے۔ بس میں تو اتنا ہی کہہ سکتا ہوں جیسے مُرشد رخصت ہوتے ہوئے اپنے کسی مرید کے سر پر اپنی دستار فضیلت باندھ کر اپنا جانشین مقرر کر جاتے ہیں ایسے حافظ یوسف سدید اپنا قلم، خورشید عالم کے سپرد کر گئے ہیں کہ میں ان کے خط میں حافظ صاحب کے کمال فن کی جھلکیاں دیکھ سکتا ہوں۔۔ اور یہ گوہر قدرے گمنام رہتا اگر سنگ میل پبلی کیشنز کے افضال احمد اسے اشاعت کے معجزے کی صورت نہ چھاپتے۔۔ اس کی پرنٹنگ شاید یورپ میں بھی اس پائے کی نہ ہو سکتی اور اس ترتیب بھی کیسی پُرکشش اور بے مثال ہے۔ سنگ میل کے بانی نیاز احمد کو انتظار حسین نے پاکستان کا نول کشور قرار دیا تھا۔۔ لکھنؤ کا یہ جینئس ناشر نادر اُردو کتب کی اشاعت کے حوالے سے ایک داستانوی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ ایک بار میں نے ان سے پوچھا کہ نیاز صاحب۔۔ آپ کچھ ایسی نایاب کتابیں زرکثیر خرچ کے چھاپتے ہیں اور یہ سراسر گھاٹے کا سودا ہوتا ہے۔۔ انہیں کون خریدتا ہے تو آپ کیوں اپنے پاؤں پر کلہاڑی نہیں کلہاڑے مارتے ہیں۔۔ نیاز صاحب کہتے لگے، تارڑ صاحب۔۔ سنگ میل کی پاکستان میں جو تکریم ہے، لوگ عزت کرتے ہیں تو انہی نادر، کمیاب کتابوں کی وجہ سے کرتے ہیں، ورنہ کتابیں تو سبھی چھاپتے ہیں۔۔ یقیناًاس ورک آف آرٹ یعنی ”کیلی گرافی“گوہر قلم کی اشاعت سے سنگ میل کی تکریم میں مزید اضافہ ہو گا۔ بڑے سائز کے سینکڑوں صفحات پر محیط اس عالی شان مجموعے میں گوہر قلم نے جہاں کلاسیکی خطاطی کے جواہر پارے تخلیق کئے ہیں وہاں انہوں نے مصور خطاطی کے کچھ نمونے بھی پیش کئے ہیں بلکہ ایک خطاطی کے بارے میں درج ہے کہ یہ پکاسو کے سٹائل میں ہے۔ اسی طور متعدد نمونوں میں صادقین کا رنگ بھی بہت نمایاں ہے بلکہ ان کی خطاطی کا سٹائل بھی نظر آتا ہے۔۔ گوہر قلم کو پکاسو کی مانند ان کے فن کا اعتراف بھی کرنا چاہئے تھا۔۔ اسی طور اگر وہ غالب، فیض، وارث شاہ یا شاہ بھٹائی کے کلام کو بھی خط کرتے تو وہ اپنی دھرتی کی نمائندگی بھی کرتے۔۔ اگر حافظ شیرازی کا کلام لکھا گیا ہے تو وہ ایک پنجابی ہونے کے ناتے شاہ حسین اور بلّھے شاہ کو بھی اپنے فن سے نکھار سکتے تھے۔۔ شنید ہے کہ انہوں نے خطاطی کا ایک ادارہ بھی قائم کر رکھا ہے اور میں اُمید کرتا ہوں کہ وہ اپنے فن کو اگلی نسل میں منتقل کریں گے، شاگردوں سے جوتیاں سیدھی نہیں کروائیں گے اور نہ ہی ان سے بازار سے پکوڑے منگوائیں گے، عبدالرحمن چغتائی جن کی تصویریں ان زمانوں میں بھی لاکھوں میں فروخت ہوتی تھیں اور معاوضے کے بغیر ایک لکیر بھی نہیں لگاتے تھے، کسی بھی کتاب کا سرورق بنانے سے انکار نہ کرتے تھے اور مصنف سے ایک پیسہ بھی نہ لیتے تھے، وہ کہتے تھے یہ میرے فن کی زکوٰۃ ہے۔ ”نکلے تری تلاش میں“ کے پہلے ایڈیشن کا سرورق انہوں نے تخلیق کیا اور مفت عطا کیا۔۔ صادقین کا بھی یہی وطیرہ تھا۔۔ سوال یہ ہے کیا گوہر قلم اور دیگر استاد خطاط بھی کبھی اپنے فن کی زکوٰۃ دیتے ہیں، نہیں دیں گے تو گناہ ہو گا۔

30/12/13

مارے بھی ہیں۔۔ فین کیسے کیسے

مستنصر حسین تارڑ

ہر وہ شخص جو کسی نہ کسی طریقے سے میڈیا سے منسلک ہوتا ہے، ادیب، شاعر یا مصور، موسیقار ہوتا ہے اس کے چاہنے والے ہوتے ہیں، مداح ہوتے ہیں جنہیں عرف عام میں فین کہا جاتا ہے۔۔ میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے بھی میرے حصے کے بیوقوف۔۔ معاف کیجیے گا فین مل گئے ہیں لیکن میرے حصے کے فین بھی میری طرح کچھ بے چارے سے ہیں۔ ملنے کے لیے آتے ہیں تو کوئی نہ کوئی نذرانہ لے کر آتے ہیں جو عموماً کسی کتاب یا کیک وغیرہ کی صورت میں ہوتا ہے جب کہ کچھ کالم نگاروں اور بیشتر ٹیلی ویژن میزبانوں کے ”فین“ بے حد متمول اور دریا دل ہوتے ہیں، وہ خود آئیں نہ آئیں لیکن ایک معمولی سا لینڈ کروزر نذرانے کے طور پر بھجوا دیتے ہیں۔ ماہانہ ”لفافہ“ اس کے سوا ہوتا ہے۔ شروع میں مجھے بھی سیاسی

نوعیت کے پروگراموں کی میزبانی کی پیشکش ہوئی جو میں نے قبول نہ کی کہ چند شریف یا غیر شریف سیاست دانوں کو شو میں مدعو کر کے اُنہیں آپس میں لڑانا یوں کہ وہ باقاعدہ حیوانی آوزوں میں دست و گریباں ہو جائیں کچھ باعث عزت پیشہ تو نہیں۔۔ اور اب اپنی حماقت پر پچھتاتا ہوں۔ کہ اب میں اس حال میں ہوں کہ دن رات کاغذ کالے کرتا رہتا ہوں اور بقول بلھے شاہ 'اک کاغذاں پایا جھل'۔۔ یعنی کاغذوں نے مجھے پاگل کر دیا ہے اور اس کے باوجود بمشکل دال روٹی تو نہیں گوشت پلاؤ وغیرہ چلتا ہے، بمشکل پٹرول چلتا ہے، بل ادا ہوتے ہیں۔ گھر کے دیگر اخراجات چلتے تو ہیں لیکن اب لنگڑا لنگڑا کر چلتے ہیں کہ ان کے پاؤں کے ساتھ مہنگائی کے پتھر بندھتے چلے آتے ہیں، کار پرانی ہو رہی ہے اور سردیوں کی سویروں میں دمے کا شکار ہو جاتی ہے، سانس نہیں آتا۔۔ اگر میں آج ایک ٹی وی اینکر ہوتا تو میرے دروازے پر ہاتھی جھول رہے ہوتے۔۔ یعنی لینڈ کروزر وغیرہ نہایت کروفر سے دمک رہے ہوتے اور میں ہر شام اعلیٰ مشروبات سے حظ اٹھا رہا ہوتا۔۔ لیکن اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت اور اب نذرانہ شدہ قیمتی کاروں میں چہچہاتی ہیں۔ قصیدے گاتی ہیں، گیت الاپتی ہیں اور اسلام اور حب الوطنی کے پھریرے بلند کر کے قوم اور ملک کی زبوں حالی پر آٹھ تو بہت کم ہیں بیس بیس آنسو بہاتی ہیں یہ چڑیاں۔۔ اور میں بجلی کے بل دیکھ کر اور پٹرول کی قیمت ادا کرتے ہوئے آنسو بہاتا ہوں۔

میرے فین وہ جیسے کیسے بھی ہیں۔ جہاں بھی ہیں۔ جتنے بھی ہیں دو اقسام کے ہیں۔ ایک ٹیلی ویژن فین اور دوسرے ادبی فین۔ فی الحال میں صرف ادبی فین حضرات کی اور خواتین کی بات کروں گا۔ انہیں آسانی سے تین کیٹیگریوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پاگل فین، معتدل فین اور صرف فین۔۔ ایک پاگل فین یکدم نمودار ہوتا ہے، آپ کی تحریروں کے سحر میں مبتلا اُسے اور کچھ سجھائی نہیں دیتا۔۔ وہ دن رات فون کرتا ہے یا کرتی ہے۔۔ روزانہ تحفے چلے آتے ہیں۔۔ آنسوؤں میں بھیگے خط چلے آتے ہیں اور پھر یکدم یہ فین توبہ تائب ہو کر مجھ سے مایوس ہو کر یا میری کسی بات پر روٹھ کر ہمیشہ کے لے غائب ہو جاتا ہے۔۔ معتدل فین کسی حد تک سنجیدہ ہوتا ہے۔۔ ہر نئی کتاب پڑھنے کے بعد فون پر اپنے تاثرات میں شریک کرتا ہے، پائیدار ہوتا ہے اور دیر تک چلتا ہے۔ اور یہ جو صرف فین ہوتا ہے یہ بہت عارضی ہوتا ہے۔ اس نے آپ کی ایک آدھ کتاب اتفاقاً پڑھ لی ہے اور وہ توقع کرتا ہے کہ آپ نہایت توجہ سے اس کی دکھوں سے بھری زندگی کی کہانی سنیں اور پھر اس کے بارے میں ایک شاندار ناول لکھیں اور جب آپ معذرت کرتے ہیں تو وہ سلام دعا لیے بغیر غائب ہو جاتا ہے۔ اور ہاں ایک خطرناک فین بھی ہوتا ہے۔۔ وہ آپ کو اپنے فون سے ایک محبت نامہ لکھتا ہے اور آپ کو دھمکی دیتا ہے کہ اگر آپ نے اپنی فلاں فلاں کتابیں دستخط کر کے اسے روانہ نہ کیں تو وہ خود کشی کر لے گا۔۔ اگرچہ وہ خون سرخ روشنائی ہے جیسا کہ ایک بین الاقوامی مولانا نے اپنے لباس پر سرخ روشنائی انڈیل کر اسے اپنا خون قرار دیا تھا۔۔ ایسے خطرناک فین کو احتیاط سے ہینڈل کرنا چاہیے کیا پتہ وہ واقعی خودکشی کر لے اور اپنے آخری نوٹ میں آپ کو اپنی موت کا ذمہ دار ٹھہرا دے۔ ایک اور قسم بھائی پھیرو فین ہوتی ہے۔ یہ چلتے پھرتے آ جاتے ہیں۔ یعنی گھنٹی بجتی ہے اور میں اپنی بڑھاپے کی اونگھ سے بمشکل باہر آ کر ازار بند اڑستا گیٹ کھولتا ہوں وہاں دانت نکالتے ہوئے دو حضرات کھڑے ہیں اور میں کہتا ہوں ، جی فرمائیے تو وہ کچھ جواب نہیں دیتے۔۔ "وہی ہے ناں" وہ آپس میں تبادلہ خیال کرنے لگتے ہیں "ہاں لگتا تو وہی ہے لیکن یہ زیادہ بوڑھا نہیں ہے؟۔۔" "پھر ملنا ہے کہ نہیں" "چلو آئے ہیں تو مل لیتے ہیں" تب وہ ہاتھ بڑھا کر دعا سلام کرتے ہیں اور میں پھر پوچھتا ہوں "جی فرمائیے۔۔" تب ایک صاحب مسکراتے ہوئے کہتے ہیں "آپ سے کوئی کام تو نہیں ہے، ادھر سے گزر رہے تھے آپ کے نام کی تختی دیکھی سوچا مل لیتے ہیں، آپ سے گپ لگاتے ہیں، ایک کپ چائے پیتے ہیں۔۔" میں نہایت تحمل سے اپنی مصروفیت کا بہانہ کرتا ہوں تو وہ خفا ہو کر کہتے ہیں "کمال ہے ایک تو آپ لوگ رونا روتے ہیں کہ معاشرہ ہماری عزت نہیں کرتا۔۔ اب ہم عزت کرنا چاہتے ہیں تو آپ کرواتے نہیں۔۔ بددماغی کی بھی حد ہوتی ہے" اور بڑ بڑاتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔۔ ایک قسم فرینک فین ہوتی ہے۔ یہ بھی گھنٹی بجائیں گے۔ آپ کو دیکھتے ہی پرانے دوستوں کی مانند زبردستی بغلگیر ہو جائیں گے اور پھر آپ کے کندھے پر ایک زور دار دھپ لگا کر کہیں گے "کیسے ہو؟" آپ قدرے خجل ہو کر معذرت کرتے ہیں کہ معاف کیجیے گا آپ کو پہچانا نہیں تو ایک اور دھپ لگا کر کہیں گے "ارے بھول گئے۔۔ پچھلے برس فلاح شادی پر کھانے کے بعد تمہارے لیے کشمیری چائے نہیں لایا تھا۔۔ تم نے شکریہ بھی ادا کیا تھا۔ بھابی کیسی ہیں" اس دوران وہ آپ کو تقریباً دھکیلتے ہوئے گھر کے اندر داخل ہو جاتے ہیں اور آپ مجبوراً انہیں اپنی سٹڈی میں بٹھا لیتے ہیں۔ملازمہ چھٹی کر چکی ہے۔ اُن کے لیے خود چائے بنا کر واپس آتے ہیں تو اُن کے سامنے آپ کی تین چار کتابیں دھری ہیں جو انہوں نے لائبریری کے شیلفوں میں سے نکال لی ہیں "یار میں تو مصروف شخص ہوں پڑھنے کا وقت کہاں البتہ تمہاری بھابی تمہاری کتابیں بہت شوق سے پڑھتی ہے۔ شگفتہ شاہین نام ہے اس کا۔ تو ان کتابوں پر کیا اپنے دستخط نہیں کرو گے۔۔ شگفتہ کے لیے لکھنا۔۔ محبت کے ساتھ نہ لکھنا۔۔ ذرا جلدی کرو مجھے اور بھی کام ہیں اور

"یار چائے ٹھنڈی تھی، مزہ نہیں آیا۔۔ اچھا خدا حافظ۔۔
ایک ڈانٹ ڈپٹ والے فین ہوتے ہیں۔ وہ کسی شاپنگ مال یا بازار یا پارک میں آپ کو گھیر لیتے ہیں اور لعن طعن کرنے لگتے ہیں کہ آپ ادیب حضرات اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں۔ اپنے آپ کو دانشور کہتے ہیں اور اس قوم کی زبوں حالی کا احساس ہی نہیں، قوم سو رہی ہے آپ اسے جگاتے کیوں نہیں۔ سیکولر اور مغرب زدہ روشن خیال طاغوتی طاقتیں اس کی سلامتی کے در پے ہیں۔ ایمان کی شمع جلائے چند پروانے ہیں جو اُن کے راستے میں حائل ہیں اور آپ ہیں کہ ناول اور سفرنامے لکھتے چلے جا رہے ہیں۔ ایک وقت آئے گا جب قوم آپ سے حساب لے گی۔ اور وہ آپ کو جواب دینے کی مہلت بھی نہیں دیتے، بڑ بڑاتے چلے جاتے ہیں۔
ایک اور قسم ہوتی ہے جسے میں "ہُوں ہُوں" قرار دیتا ہوں۔ یہ عام طور پر عمر رسیدہ ہوتے ہیں۔ آمنا سامنا ہوتا ہے تو آپ کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں "ہُوں ہُوں"۔۔ آپ بونقوں کی مانند مسکراتے رہتے ہیں کہ شاید وہ کوئی بات کریں لیکن وہ آپ کے چہرے کو غور سے دیکھ کر پھر کہتے ہیں "ہُوں ہُوں" اور چلے جاتے ہیں۔
پچھلے ہفتے باغ جناح میں ایک "کیا خیال ہے" فین سے ملاقات ہوئی "آپ تو اس ملک کا سرمایہ ہیں، کیا خیال ہے۔۔ آپ نے "بہاؤ " ایسا ناول کبھی نہیں لکھنا، آپ فضول چیزیں بھی لکھتے ہیں، کیا خیال ہے۔۔ یہ نواز شریف کچھ کرے گا کہ نہیں، کیا خیال ہے۔ مصباح الحق نے جان بوجھ کر میچ ہار دیا کیا خیال ہے۔۔ کرینہ کپور نے سیف علی خان سے شادی کر لی ہے۔۔ آپ ان دنوں ٹی وی پر نہیں آ رہے کیا خیال ہے۔۔ باغ جناح میں ٹوائلٹ بہت گندے ہیں کیا خیال ہے۔۔"
تو ایسے ہوتے ہیں ہمارے فین حضرات۔۔ کیا خیال ہے؟

3/1/14

بانسائی بونے درخت اور عامر بن منیر
مستنصر حسین تارڑ
ان دنوں بانسائی کا بہت رواج ہے۔۔ آپ کسی بھی نرسری میں چلے جائیے وہاں دیگر گل بوٹوں، درختوں، آرائشی پودوں کے علاوہ بانسائی بہتات میں پائے جاتے ہیں ۔۔اور بانسائی ہے کیا؟ ایک مختصر قامت کا مکمل درخت، ایک بونا، ایک ٹھگنا لیکن مکمل درخت۔۔ جس کی شاخوں کو تاروں سے باندھ کر اُنہیں ایک مخصوص جمالیاتی شکل دی جاتی ہے۔۔ اور ایک بانسائی کیسے تخلیق کیا جاتاہے؟ کسی بھی مناسب درخت کا ایک پودا اگا کر اُس کی بڑھوتی کو قابو کیا جاتا ہے۔ باقاعدگی سے اُس کی جڑیں کاٹی جاتی ہیں اور شاخوں کی تراش خراش کی جاتی ہے۔ یوں اُس کی شکل تو عام درخت کی مانند پرورش پاتی ہے لیکن اس کا قد بے حد مختصر رہ جاتا ہے۔ جاپان جو بانسائی کا گھر ہے وہاں زراعت سے متعلق اداروں میں بانسائی تخلیق کرنے کے مکمل کورس پڑھائے جاتے ہیں اور اس میں دو سے چار برس کا عرصہ لگ سکتا ہے۔ بانسائی بنانا ایک پیچیدہ عمل ہے جس کے لیے تکنیکی ہنر مندی کے علاوہ بے پناہ صبر اور استقامت درکار ہوتی ہے۔۔ یہ مشغلہ میرے جیسے بابا ہو چکے لوگوں کے لیے نہیں ہے کہ بانسائی بنانا شروع کریں تو اس میں کم از کم چھ سات برس تو صرف ہو جاتے ہیں اور تب جا کر اس کی شکل نکلتی ہے۔ جاپان میں بانسائی میوزیم بھی ہیں جہاں کئی بونے درخت سوبرس سے زائد کی عمر کے دیکھے جا سکتے ہیں۔ بانسائی جاپان کی بہت سی ثقافتی قدروں کی مانند چین کا باشندہ ہے لیکن ان دنوں پوری دنیا میں اسے بنایا جاتا ہے۔۔ جاپان میں اس کی پسندیدگی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہاں زمین کی شدید کمی ہے۔۔ لوگوں کے پاس سونے کی جگہ کم پڑ جاتی ہے تو وہاں گل بوٹے اُگانے، درخت لگانے اور گھریلو باغیچے بنانے کے لیے گنجائش کہاں سے آئے تو اس مجبوری کے تحت "جاپانی گارڈن" کی تخلیق ہوئی یعنی ایک مختصر سے زمین کے ٹکڑے پر ننھی منی ندیاں اُن پر کھلونا پل، پستہ قد اور زمین پر بچھے پودے، جھاڑیاں، ایسے مخصوص پتھر جن پر ایک چٹان کا شائبہ ہو اور ان کے درمیان یہی بانسائی کے بونے شجر جن پر ایک جنگل کا گمان ہوتا ہے۔ چین، ویت نام، تھائی لینڈ وغیرہ میں ان کی مانگ پوری کرنے کی خاطر سینکڑوں ایکڑوں میں انہیں کمرشل طور پر تیار کیا جاتا ہے۔۔ پاکستان میں یہ ایک کثیر تعداد میں درآمد کیے جاتے ہیں، نرسریوں کے مالک ان ممالک میں جا کر ایسے بانسائی ہزاروں کی تعداد میں خرید کر خصوصی کنٹینروں میں پیک کر کے پاکستان لاتے ہیں لیکن دراصل یہ بانسائی نہیں ہوتے۔۔ انہیں تکنیک اور مہارت کے ساتھ تجارتی بنیادوں پر دو چار برسوں میں ہی تخلیق کیا جاتا ہے۔ انہیں آپ جعلی بانسائی کہہ سکتے ہیں لیکن یہاں خریدار اتنا سمجھدار نہیں کہ اصلی اور جعلی میں تمیز کر سکے۔۔ ورنہ بانسائی بنانے میں تو برسوں درکار ہوتے ہیں اور ذوق جمال ہی ان کی شکل اور تراش خراش کی رہنمائی کرتا ہے۔
میں نے زندگی میں بہت سے بکھیڑے پالے، بہت سے خبط مجھ پر حاوی رہے اور اُن میں سے ایک بانسائی

بھی ہے۔۔ ایک بار خاصی رقم برباد کر کے دبئی سے ایک چھوٹا سا بانسائی خریدا۔۔ اُسے گود میں رکھ کر پاکستان لایا۔۔ جونہی موسم گرما شروع ہوا، لاکھ احتیاط کے باوجود اس کے پتے گرنے لگے اور بالآخر مر گیا۔ ہالینڈ کے شہر ایسٹرڈیم میں ایک بانسائی دیکھا اور اُس پر فدا ہو گیا۔۔ میری بیگم نے بہت منع کیا کہ یہ پاکستان کے موسموں کو سہار نہیں سکے گا لیکن میرا جو از یہ تھا کہ بھلے یہ ایک دو ماہ چلے لیکن اتنا عرصہ تو میں اسے دیکھ دیکھ کر خوشی حاصل کر لوں گا۔۔ اتنی ساری خوشی کے لیے کچھ رقم خرچنا اور اسے پاکستان سے جانے کا تردد کرنا جائز ہے۔۔ اور ایسا ہی ہوا۔۔ مجھے کچھ پچھتاوا نہ ہوا کہ میں اس سے لطف اندوز ہوا تھا اور اس کی شکل آج بھی میرے ذہن پر نقش ہے اور مجھے مسرت سے ہمکنار کرتی ہے۔۔ آپ پوچھ سکتے ہیں کہ آخر میں بونسائی کے عشق میں کیوں گرفتار ہوں تو ہر عشق کی مانند اس کی شکل بہت دل کش ہوتی ہے۔۔ اس کے علاوہ میں ایک تصوراتی شخص بھی ہوں۔ میں ایک بانسائی کو نہایت مگن ہو کر دیکھتا رہتا ہوں اور پھر میں تصور کرتا ہوں کہ میں اس کے سائے میں بیٹھ چکا ہوں اور وہ ایک عظیم اور تناور درخت ہے جو مجھ پہ سایہ فگن ہے اور میں اس کیفیت سے بے حد مسرت کشید کرتا ہوں۔۔ جی ہاں میں تو مانتا ہوں کہ میں ایک خبطی شخص ہوں اور مجھے اس پر کوئی شرمندگی نہیں۔ میری بانسائی کی کولیکشن بہت محدود ہے۔ کل پانچ نمونے میرے صحن کو اپنا حسن بخشتے ہیں۔۔ ان میں سے دو تو ذرا معمولی سے ہیں لیکن بہت مدت پیشتر ایک پاکستانی بانسائی خبطی نے مجھے برگد کا ایک بانسائی تحفے میں دیا تھا۔ اس کا قد ایک فٹ بھی نہ ہو گا لیکن یہ تقریباً اٹھارہ برس کا ہے۔ ایک قدرے پھیلا ہوا مروا پودے کا بانسائی اور مجھے امید ہے کہ موسم بہار میں یہ مجھے چند مہک آور پھولوں سے نوازے گا۔۔ ایک ان سب میں سے خوش شکل کا بیس سالہ پرانا بانسائی ہے، آپ اداس ہوں تو اسے ایک نظر دیکھ لیجیے خوش ہو جائیں گے۔۔ اسے تادیر دیکھنے سے آپ جاپان میں سانس لینے لگتے ہیں۔

پچھلے ہفتے کسی محفل میں عامر بن منیر نام کے ایک بانسائی شیدائی سے ملاقات ہو گئی، موصوف مجھ سے کہیں زیادہ بانسائی خبطی ہیں، پیشے کے حوالے سے پرنٹنگ انجینئر ہیں، پچیس برس ایک بین الاقوامی ادارے کے ساتھ منسلک رہے اور اب اپنے ذاتی کاروبار میں مصروف ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ کو بانسائی سے کیسے دلچسپی ہو گئی، کہنے لگے میں کاروبار کے سلسلے میں باقاعدگی سے جاپان اور چین جاتا ہوں، تقریباً آٹھ برس پیشتر یونہی وقت گزاری کے لیے ایک نرسری میں جا نکلا اور وہاں بانسائی نمائش پر تھے اور میں ان کا گرویدہ ہو گیا۔ وہ دن اور آج کا دن میں اس جمالیاتی مختصر درخت کے عشق میں مبتلا ہوں۔ یہاں تک کہ چین میں زراعت کا ایک مختصر کورس بھی اٹینڈ کیا تا کہ بانسائی کی باریکیوں سے آگاہ ہو سکوں۔ اُن کا کہنا تھا کہ دنیا بھر میں سب سے قدیم بانسائی درخت جو پانچ سو ساٹھ سال پرانا ہے ان دنوں ٹوکیو میوزیم میں نمائش پر ہے۔۔ یہ جونیپر کا درخت ہے جو آٹھ پشتوں سے ایک ہی خاندان میں چلا آ رہا تھا اور اب اسے حکومت کے سپرد کر دیا گیا ہے تا کہ اس کی مناسب دیکھ بھال ہو سکے۔ اس درخت کو جاپان کا قومی ورثہ قرار دیا گیا ہے۔۔ عامر بن منیر کا کہنا تھا کہ دو ہزار برس پہلے بانسائی تخلیق کرنے کا فن چین میں شروع ہوا۔ تقریباً ایک ہزار برس پیشتر ایک بدھ بھکشو ایک درخت جاپان لایا اور جاپانی شہنشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔۔ اور یوں جاپانیوں نے اس کو نپ لیا کہ یہ اُن کے مختصر ملک کے لیے بے حد موزوں تھا۔۔ اگلے روز عامر بن منیر مجھے نہر کنارے ای ایم ای سوسائٹی کے قریب اپنے قائم کردہ بونسائی سنٹر "پلینے ٹیریم" لے گئے جہاں اُنہوں نے مجھے بانسائی کے علاوہ قدیم درختوں کے حیرت انگیز نمونے دکھائے۔ مثلاً ایک ساڑھے تین سو برس پرانے تنے کو کسی عمل کے ذریعے دوبارہ زرخیز کیا گیا اور اب اس میں سے پتے پھوٹ رہے تھے۔۔ ایک خشک ہو چکا تقریباً پتھر ہو چکا کدو سا تھا جس میں سے شاخیں نکل رہی تھیں۔ علاوہ ازیں کرسمس ٹری پھولدار جھاڑیوں اور پتھر چٹ پودے کے بھی بے حد پر کشش بانسائی نمائش پر تھے۔۔ یہ اُن کا کاروبار نہیں ایک ذاتی مشغلہ ہے۔ جاپان جاتے ہیں مشینیں خریدتے ہیں پھر بانسائی درختوں کی تلاش میں نکل جاتے ہیں۔ عامر بن منیر سے یہ ملاقات میرے لیے انتہائی خوشی کا سبب ہوئی۔۔ کہ ایسے باذوق لوگ ہمارے معاشرے میں کم کم پائے جاتے ہیں۔

بانسائی کے بارے میں یہ کالم لکھتے ہوئے مجھے ایک عجیب سا خیال آیا کہ ہم سب پاکستانی بھی تو بانسائی ہو چکے ہیں۔۔ ہم ایک قد آور شجر کی مانند بلند نہیں ہو سکے۔ ٹھگنے اور بونے ہو گئے ہیں۔ بانسائی ہو چکے ہیں۔۔ برسوں سے جہالت، تنگ نظری، مذہبی اور لسانی تعصب ہماری جڑیں کاٹ رہے ہیں۔ ہمیں بڑھنے نہیں دیتے اور ہم پر جو پھول آتے ہیں، بدن میں سے پتے پھوٹتے ہیں انہیں کرپشن اور بے غیرتی کی قینچیاں مسلسل کاٹتی جاتی ہیں اور ہمارا قد نہیں بڑھتا۔۔ ہم کیسے شاندار اور بلند قامت ہوا کرتے تھے اور اب اپنوں کے ہاتھوں بونے ہو گئے ہیں۔۔ بانسائی ہو گئے ہیں

5/1/14

!نیو ایئر نائٹ، ویلنٹائن یا بسنت اور بیساکھی

مستنصر حسین تارڑ

اس برس جتنے وسیع پیمانے پر اور جوش و خروش سے نئے سال کو خوش آمدید کہا گیا ہے اس نے مجھے رنجیدہ اور خوفزدہ کر دیا ہے۔ ٹیلی ویژن کے بیشتر چینلز پر نیو ایئر نائٹ کے منظرباہ راست دکھائے جا رہے تھے۔ لاہور اور کراچی میں تو یہ تقریبات ایک معمول ہیں لیکن اس بار اسلام آباد م، مری، ملتان، حیدر آباد، گوجرانوالہ یہاں تک کہ کوئٹہ میں بھی عوام کی کثیر تعداد شدید سردی کے باوجود اس جشن میں شریک تھی اور اُن میں سے بیشتر بے تحاشا رقص کر رہے تھے اور نعرے لگا رہے تھے۔ فیصل آباد میں دو سو پونڈ وزنی کیک کاٹ کر تقریبات کا آغاز کیا گیا۔۔ اس بار تو خود ساختہ صالحین کے ڈنڈے بردار دستے بھی کہیں دکھائی نہ دیئے اگر دکھائی دیتے تو یہ اُن کے حق میں مفید ثابت نہ ہوتا۔۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس بار وہ خود ڈنڈے ترک کر کے نیو ایئر نائٹ میں شرعی نوعیت کے بھنگڑے ڈال رہے ہوں۔ کیا یہ امت خرافات میں کھو گئی ہے۔ نہیں، اس امت کو خرافات میں دھکیل دیا گیا ہے۔ جائز تفریح کو بھی حرام قرار دے کر انہیں اس بلّے گلّے کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ میلے ٹھیلے، سنیما، ثقافتی تقریبات۔۔ خوشی کا ہر اظہار ناجائز ٹھہرایا گیا تو باقی کیا رہ گیا۔۔ زیادہ سے زیادہ کسی ریستوران میں جا کر بدذائقہ کھانا کھا لینا۔۔ دوستوں کے ہمراہ بے مقصد گھومتے رہنا اور ٹیلی ویژن پر واہیات اسلامی ترک ڈرمے دیکھنا۔۔ ابھی پچھلے دنوں کی بات ہے کہ لاہور کی بسنت ایک بین الاقوامی تہوار کی صورت اختیار کر گئی جس میں بچے بوڑھے عورتیں سب شریک ہوتے تھے۔۔نہ صرف پاکستان سے بلکہ امریکہ اور کینیڈا تک سے شائقین لاہور کا رخ کرتے تھے۔۔ ایک بسنت کے موقع پر اسلام آباد سے آتے ہوئے دو غیر ملکی سفیروں کو کسی بھی ہوٹل یا گیسٹ ہاؤس میں جگہ نہ ملی تو اُنہیں اپنی کاروں میں شب بسری کرنی پڑی۔۔ کاروبار یکدم شوٹ کر گیا۔۔ بین الاقوامی ادارے صرف ایک شب کے لیے کسی عام سی چھت کے لیے لاکھوں روپے ادا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ اُن دنوں میری بیٹی عینی فلوریڈا سے آئی ہوئی تھی جب مجھے چونا منڈی کی حویلی دھیان سنگھ میں بسنت رات کے لیے خصوصی دعوت نامہ وصول ہوا۔۔ وہ ایک حیرت انگیز شب تھی، لاہور شہر کی چھتیں اور آسمان ایسے روشن ہو رہے تھے جیسے وہاں مسلسل پھلجھڑیاں اور انار چھوٹ رہے ہوں اور پھر اس قدیم حویلی کے نیم روشن در و دیوار۔۔ اور پھر کیا ہوا؟ اُن کے غنڈے زیادہ مال بنا رہے ہیں ہمارے غنڈوں کا کیا قصور ہے۔ دھاتی ڈوروں نے بچوں کو ذبح کرنا شروع کر دیا اور میں نے تب بھی لکھا تھا کہ اگر کسی بسنت کے نتیجے میں ایک بچے کے ہلاک ہونے کا بھی امکان ہو تو میں ایسی بسنت پر لعنت بھیجتا ہوں لیکن اس خونی ڈور کے استعمال کو روکا جا سکتا تھا، یہ کوئی ایسا مسئلہ نہ تھا جسے حل نہ کیا جا سکتا تھا لیکن بہت سارے سیاسی مفادات کا ٹکراؤ تھا جن کی بھینٹ یہ شاندار تاریخی تہوار چڑھ گیا ۔ اور پھر یہ واویلا کہ بسنت تو ایک ہندو تہوار ہے۔۔ اور ان خوبصورت تہواروں کی بجائے کونسے غیر ہندو تہوار رائج ہو گئے، نیو ایئر نائٹ اور ویلنٹائن ڈے ایسے بے روح تہوار۔۔ اور ویلنٹائن کا جنون تو اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ سرخ گلاب کا ایک پھول سو سو روپے میں فروخت ہوتا ہے۔ میں پارک میں سیر کرنے والی ایسی بڑی بوڑھیوں کو جانتا ہوں جو اس روز کے لیے خصوصی طور پر سرخ جوڑے بنواتی ہیں۔ کیا اس سے بہتر نہ تھا کہ بسنت کے موقع پر پیلے جوڑے پہن لیے جائیں وہ کم از کم بہار کی آمد کی نوید تو دیتے ہیں اور پھر ویلنٹائن ڈے کی شب پر تکلف دعوتوں کی بھرپور ہوتی ہے۔ دل کی شکل کے غبارے سجے ہیں۔ ایک دوسرے کو پھول دیئے جا رہے ہیں اور ویلنٹائن ڈے مبارک کہا جا رہا ہے۔ چلئے یہاں تک تو خیریت گزرتی ہے لیکن ایک اور خوفناک تہوار ہولو وین بھی ہمارے ہاں پاپو لر ہو رہا ہے۔ یعنی آپ طرح طرح کے ہولناک نقاب پہن کر گھومتے پھرتے ہیں۔ گھیا کدو تراش کر خوفناک چہرے بنا کر گھر سجائے جاتے ہیں، موت کے نقاب پہن کر دوستوں کو ڈرایا جارہا ہے ۔ کراچی کی ایک بہت مشہور شاپنگ مال میں جانے کا اتفاق ہوا۔ میں اپنے پوتوں کے لیے کھلونے خریدنے کے لیے ایک کھلونا شاپ میں گیا۔۔ اندر داخل ہوا تو یوں محسوس ہوا جیسے لنڈن کے مادام تساؤ کے مومی میوزیم کے ”ہاور چیمبر“ میں آ گیا ہوں۔ ہر جانب کھوپڑیاں، خوفناک شکلوں کے نقاب، مردہ چہرے، چڑیلیں اور بدشکل گڑیائیں وغیرہ۔ یا وحشت کیا آج کے بچے ان کھلونوں سے کھیلتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ ہالووین سیکشن ہے۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب شب برأت بچوں اور جوانوں کا ایک ایسا تہوار تھا جس کا بے چینی سے انتظار کیا جاتا تھا۔۔ بزرگ عبادت کرتے تھے اور بچے آتش بازی چھوڑ کر لطف اندوز ہوتے ہے۔ موچی دروازے کے باہر خاص طور پر پھلجھڑیوں، اناروں، پٹاخوں، شُرلیوں، ہوائیوں، چھچھوندروں اور طرح طرح کی آتش بازی کے سٹال لگتے تھے اور ایک میلے کا سماں ہوتا تھا۔بچے اپنی پسند کے ”شُرلیاں پٹاکے“ خریدتے تھے اور گھروں کی چھتوں پر چڑھ کر شام ہونے کا انتظار کرتے تھے۔ تاریکی پھیلتی تھی تو پورے لاہور کا آسمان دمکنے لگتا تھا۔

علاوہ ازیں منڈیروں پر دیئے روشن کرنے کا رواج تھا اور اس مقصد کے لیے بازار سے کچے دیئے خرید کر اُن میں تیل ڈال کر، روئی سے بتیاں بنا کر اُنہیں جلایا جاتا تھا اور منڈیروں اور چھتوں کو سجایا جاتا تھا۔ پھر اس تہوار پر اعتراضات ہونے لگے کہ یہ تو ایک مقدس رات ہے جو صرف عبادت کے لیے مخصوص ہے اور آتش بازی چلانا اور دیئے جلانا بدعت ہے چنانچہ یہ تہوار بھی تعصب کی نذر ہو گیا اور اب لوگ نیو ایئر پر آتش بازی چھوڑ کر لطف اندوز ہو لیتے ہیں تو کیا یہ بہتر آپشن ہے۔۔۔ میں بہت سے مسرت دینے والے میلوں اور تہواروں کا تذکرہ کر سکتا ہوں جو تنگ نظری کا شکار ہو گئے اور اُن میں سے ایک بیساکھی کا تہوار تھا جو پنجاب بھر میں فصل کٹنے کے موقع پر منایا جاتا تھا۔ خاص طور پر ایمن آباد کی بیساکھی تو پورے ہندوستان میں مشہور تھی اور کسان دور دور سے ٹولیوں کی شکل میں اس میں شریک ہونے کے لیے آیا کرتے تھے، تو اس پر اعتراض ہوا کہ جی یہ تو سکھوں کا تہوار ہے۔۔۔ بھئی پاکستان کے قیام سے پہلے ان خطوں میں سکھ کثرت سے تھے تو وہ بھی شریک ہوتے تھے تو کیا اُن کی شمولیت سے یہ اُن کا تہوار ہو گیا ہے۔ یہ تو بنیادی طور پر فصل کی کٹائی کے بعد کسانوں، زمینداروں اور کاشتکاروں کا ایک ہنگامہ خیز جشن ہوا کرتا تھا جس میں شہروں کے لوگ بھی شریک ہوتے تھے، گاتے بجاتے تھے، رقص کرتے تھے، کھاتے پیتے تھے اور اپنی مشقت بھری زندگی سے ایک لمحاتی فرار حاصل کرکے خوش ہو لیتے تھے۔۔۔ ویسے ایسے تہواروں کا تعلق موسموں سے ہوتا ہے کسی مذہب سے نہیں ہوتا۔۔ تو اپنے مقامی، ثقافتی اور اس سر زمین کی مٹی سے پیوستہ تہواروں کو جب آہستہ آہستہ عقیدے اور تنگ نظری کے نام پر ملیا میٹ کر دیا گیا تو اُن کی جگہ ان واہیات تہواروں نے لے لی جن کا ہم سے کچھ واسطہ نہیں۔ کوئی دن جاتا ہے جب یہاں لوگ ہولی کھیلنے لگیں گے اور دیوالی منانے لگیں گے۔۔۔ کیونکہ اُنہیں جائز تفریح سے روک دیا گیا ہے اور انسان نے کہیں نہ کہیں سے تو خوشی حاصل کرنا ہے چاہے وہ نیو ایئر نائٹ ہی کیوں نہ ہو۔۔ اپنی زمین کی روایت، موسم اور ثقافتی قدریں ترک کر دینے والی قوموں کا یہی حشر ہوتا ہے۔۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ اس برس جس وسیع پیمانے پر اور جوش و خروش سے نئے سال کو خوش آمدید کہا گیااس نے مجھے کیوں زنجیدہ اور خوفزدہ کر دیا۔۔ کیونکہ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے اس جشن میں شریک جتنے بھی چہرے تھے جو بے تحاشا، دیوانگی کی حد تک پر جوش ہو رہے تھے تو ان سب چہروں پر دراصل خوف ہے۔ وہ مہنگائی، کرپشن، بے انصافی، لاقانونیت کے شکار ہیں اور وہ جان گئے ہیں کہ مستقبل بہت تاریک ہے تو وہ اس خوف سے نجات حاصل کرنے کے لیے اپنے آپے سے باہر ہوئے جاتے ہیں۔۔۔ وہ نا امید ہو چکے ہیں۔۔۔ جب کوئی شخص موت کو دیکھ لیتا ہے تو وہ اس کی دہشت سے آزاد ہونے کی خاطر یونہی بے وجہ قہقہے لگاتا ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ وہ بہت خوش ہے۔

8/1/14

"مدھوبالا اور پاگل نگر"

مستنصر حسین تارڑ

مشتاق احمد یوسفی نے ”آبِ گُم“ کے دیباچے میں لکھا ہے ”جب انسان کوماضی، حال سے زیادہ پُرکشش نظر آنے لگے اور مستقبل نظر آنا ہی بند ہو جائے تو باور کرنا چاہئے کہ وہ بوڑھا ہو گیا ہے“ اس کلیے کے مطابق اگرچہ میں اللہ کی عنایت سے پچھتر برس کا ہونے کو ہوں۔۔ لیکن میں بوڑھا نہیں ہوں، میں اپنے حال سے بے حد خوش ہوں، ماضی مجھے حال کی نسبت ہرگز پُرکشش نظر نہیں آتا اور مستقبل کے بارے میں پُرامید ہوں، اگر مستقبل مجھے نظر نہیں آتا تو شاید میری عینک کا نمبر تبدیل ہونے والا ہے اور یوں بھی عمر میں اتنی گنجائش باقی نہیں ہے کہ مستقبل کے بارے میں فکرمند ہوتا پھروں ہاں اپنی اولاد کے لئے فکرمند ہوتاہوں جو کہ والدین کا فل ٹائم مشغلہ ہوا کرتا ہے۔ میں اپنے ہم عمر بزرگوں، بابوں اور عمر رسیدہ دوستوں میں زیادہ مقبول نہیں کیونکہ میں ان کے عمر بھر کے تجربوں کے نچوڑ سے اتفاق نہیں کرتا۔۔ کچھ مدت پہلے ایک پرانے سکول فیلو نے نہایت عرق ریزی اور بھاگ دوڑ سے اور کھوج کر کے ہماری کلاس کے درجن بھر ابھی تک زندہ ”لڑکوں“ سے رابطہ کر کے ایک عدد اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے قیام کااعلان کر دیا۔۔ پہلی میٹنگ میں عجیب مزاحیہ قسم کی صورت حال پیدا ہو گئی کہ وقت کے پُلوں تلے سے بہت سے پانی بہہ گئے تھے اور ان کے ساتھ ہماری شکلیں، شوخیاں اور جوانی بہہ گئے تھے چنانچہ ہم پہچانے نہ گئے۔۔ یوں بھی ہر بابا اپنے آپ کو معزز اور دانش مند ثابت کرنے کے لئے فری ہونے سے گریز کر رہا تھا۔۔ اس اجتماع میں دس دبیز عینکیں، تین لرزش میں آئے ہوئے سَر۔۔ ایک جھکی ہوئی کمر۔۔ دو لاٹھیاں اور دو بیساکھیاں شامل تھیں۔۔ چار داڑھیاں بھی تھیں۔۔ اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ ہم ایسے گیٹ اپ میں اپنے سکول کے

زمانے کے لڑکوں کو کیسے تلاش کر لیتے بہرحال تفصیلی تعارف ہوا، کچھ پہچانے گئے اور کچھ کی پہچان نہ ہو سکی لیکن آہستہ آہستہ دھند چھٹنے لگی اور چہرے شناسا ہونے لگے۔۔ دبے دبے لفظوں میں سکول کے زمانے کی شرارتوں کا تذکرہ ہوا تو ان کے حوالے سے کچھ لوگ دیکھے ہوئے لگے۔۔ یہ عمل خاصا پیچیدہ تھا کہ پہلے یہ جو بابا جی ہیں ان کے سر کی لرزش کو قابو میں کیا جائے، ان کی داڑھی مونچھیں صاف کی جائیں، ان کے گنجے سر پر کچھ گھنے بال کاشت کئے جائیں اور پھر اوئے تو اشرف کالیا ہے ناں۔۔ جو ماسٹر صاحب کا ٹفن کیریئر چوری کر کے ان کا کھانا کھا جاتا تھا۔۔ پی ٹی ماسٹر کو ہر ہفتے شربت کا گلاس پلاتا تھا اور وہ تجھے مارتے نہیں تھے اور ہاں اشرف تجھے یاد ہے جب تو نے ایک لڑکی کو چھیڑا تھا تو اس کے بھائیوں نے تجھے پھینٹی لگائی تھی اور تو ہائے ہائے کرتا پھرا تھا۔۔ تو وہی ہے ناں۔۔ اشرف کالیے کی تو سِٹی گم ہو گئی، وہ اب ایک معزز شخص ہو چکا تھا، کسی پرائیویٹ کالج میں اس کے تئیں پارٹ ٹائم پروفیسر تھا، محلے کی مسجد کمیٹی کا رکن تھا اور سال میں ایک مرتبہ تبلیغ کے لئے بھی نکل جاتا تھا یعنی معاشرے میں نہایت برگزیدہ ہو چکا تھا۔۔ وہ ان حقائق سے انکار تو نہیں کر سکتا تھا لیکن شاید اسے ماضی کی یہ جھلکیاں زیادہ پسند نہ آئیں اور اس نے نہایت بردباری سے داڑھی کو سنوارتے ہوئے کہا۔۔ بھئی بچپن میں اس نوعیت کی لغزشیں ہو ہی جاتی ہیں، میرا خیال ہے اب ان کا ذکر مناسب نہیں ہمیں اپنی آخرت کی فکر کرنی چاہئے۔۔ اِن اولڈ بوائز میں ایک شرمیلا سا بابا تھا جو اس گفتگو کو بے حد انجوائے کر رہا تھا وہ کہنے لگا ”یار ہم لوگ یہاں اکٹھے ہی اس لئے ہوئے ہیں تاکہ سکول کے زمانوں کو یاد کریں۔۔ یوں بھی ہم کیسے ایک دوسرے کو شناخت کریں گے اگر ان دنوں کے حوالے نہیں دیں گے۔۔ میرا خیال ہے میں خود اپنا تعارف کرواتا ہوں۔۔ میں مدھوبالا ہوں ”ہر جانب ایک سنسنی خیز مسرت پھیل گئی، ساری نظریں شرمیلے بابے پر ٹھہر گئیں۔۔ اوئے تو اقبال ہے، تو۔۔ مدھوبالا ہے۔۔ اور واقعی جب میں نے غور کیا تو وہ مدھوبالا ہی تھا۔۔ اگرچہ اس کے چہرے پر بڑھاپے کے سائے گہرے ہو رہے تھے لیکن اس کا رنگ ابھی تک گورا تھا، آنکھیں بڑی بڑی تھیں بے شک خزاں رسیدہ تھیں، اقبال ہماری کلاس کا سب سے خوبصورت لڑکا تھا اور قدرے شرمیلا تھا۔۔ بے حد لائق اور مہذب تھا جو کہ ہم نہ تھے۔۔ بہت سے لڑکے اسے محبت بھرے خط لکھتے تھے جو وہ ماسٹر صاحب کے حوالے کر دیتا تھا اور ان لڑکوں کی شامت آ جاتی تھی۔۔ اقبال سول سروس کے ایک اعلیٰ عہدے پر ریٹائر ہوا تھا اور اسی لئے اس میں ایک خاص نوعیت کا اعتماد تھا۔۔ یکدم اقبال، اشرف کالیے سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔۔ اوئے کالیے تو بھی تو مجھے خط لکھا کرتا تھا۔۔ اخباروں میں سے مدھوبالا کی تصویریں کاٹ کاٹ کر مجھے بھیجا کرتا تھا لیکن میں نے تمہاری شکایت ماسٹر صاحب سے کبھی نہ کی۔۔ یاد ہے؟۔۔ اشرف کالیے کی تو حالت غیر ہو گئی لیکن وہ اب معزز لبادے سے باہر آ کر ذرا کھلنڈرا ہونے لگا ”اوئے اقبال۔۔ قسم لے لو جو میں نے تمہیں پہچانا ہو۔۔ بچپن برس ہو گئے تمہیں دیکھے ہوئے۔۔ کیا حال ہے یار۔۔“ اقبال کے کھلے اعتراف کے بعد کہ وہ مدھوبالا ہے بقیہ اولڈ بوائز بھی ذرا فرینک ہو گئے اور ان میں ظفر ڈھینگر بھی شامل تھا اگرچہ وہ اب ڈھینگر نہ رہا تھا ایک خاصا فربہ اور تنومند بوڑھا تھا۔۔ ظاہر وہ نہایت منحنی اور لمبا سا لڑکا ہوا کرتا تھا اس لئے ڈھینگر کہلاتا تھا۔ اس کا کمال یہ تھا کہ وہ مار کھانے میں چیمپئن تھا، شرارتیں کرنے میں اس کا جواب نہ تھا اور جب ماسٹر صاحب سے مار کھاتا تو مسکراتا رہتا۔۔ وہ ہانپ جاتے تب بھی کھڑا رہتا کہ اچھا جی بس۔۔ ظفر ڈھینگر کی ایک اور خصوصیت تھی، وہ سائیکل پر اُلٹا بیٹھ کر اسے چلا سکتا تھا غرض کہ بہت سی خوبیوں کا مالک تھا۔ علاوہ ازیں خلیفہ نثار بھی موجود تھا، وہ ہم سب سے بڑا تھا اور بیساکھیوں کے سہارے بمشکل آیا تھا۔۔ وہ ایک ارب پتی کاروباری تھا اور متعدد حج کر چکا تھا۔۔ اسے خلیفہ اس لئے کہا جاتا تھا کہ آٹھویں جماعت میں وہ اتنی مدت اٹکا رہا کہ نہ صرف اس کے کلاس فیلو بلکہ پیچھے سے آنے والے طالب علم بھی کالج میں جا داخل ہوئے اور وہ آٹھویں جماعت کا طالب علم ہی رہا، غالباً اسی کلاس سے ریٹائر ہوا۔۔ میں کسی حد تک خوش قسمت تھا کہ ٹیلی ویژن اور ادب کے حوالے سے سبھی لوگ مجھے آسانی سے پہچان لیتے تھے۔۔ اوّل اوّل تو سب لوگ میری شہرت سے مرعوب رہے، پھر کُھلنے لگے اور بالآخر میری بھی شامت آ گئی۔۔ ”یار تارڑ ٹھیک ہے تو اب بڑا مشہور ہو گیا ہے اور ہم فخر سے کہتے ہیں کہ تو ہمارا کلاس فیلو ہے لیکن۔۔ تم ہو تو پاگل نگر۔۔ کیا خیال ہے۔۔ اس پر اقبال مدھوبالا نے ذرا جھجھکتے ہوئے کہا۔۔ پاغل ای اوئے۔۔ میں یکدم طیش میں آنے لگا اور پھر اپنے آپ پر قابو پا لیا کہ تم جو لوگوں کی بچپن کی پگڑیاں اچھال رہے ہو تو بھلا تمہاری پگڑی کیسے سلامت رہ سکتی ہے ویسے تم پاگل نگر تو ہوا کرتے تھے ناں۔۔ تفصیل اس اجمال کی کچھ یوں ہے کہ ہر جمعہ کے روز ہماری کلاس کے پہلے پیریڈ میں بزم ادب کا ایک جلسہ ہوتا تھا جس کی صدارت ایک منتخب صدر کیا کرتا تھا، اس اجلاس میں طالب علم اپنی تخلیقات پیش کرتے تھے اور میں اکثر اس میں کسی نہ کسی صورت حصہ لیتا تھا، کبھی کوئی کہانی پڑھ دی، کبھی کوئی اپنے تئیں مزاحیہ تحریر پیش کر دی لیکن جس تخلیق سے مجھے پورے سکول میں شہرت دوام حاصل ہوئی وہ ”پاگل نگر کی خبریں“ کا آئٹم

تھا۔۔ میں یونہی اوٹ پٹانگ سی خبریں بنا کر انہیں ریڈیو پر نشر ہونے والی خبروں کے انداز میں بھاری نستعلیق آواز میں سنایا کرتا تھا چنانچہ جدھر جاتا ”پاگل نگر“ کے نعرے لگتے، پھر کسی نابنجار نے اختراع کر کے مجھے ”پاغل ای اوئے“ کے نعرے سے نوازا اور یہ نعرہ قبول عام کی سند حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا چنانچہ جہاں جاتا پیچھے سے ”پاگل ای اوئے“ کے نعرے لگنے لگتے۔
اشرف کالیا جو اب تک بچپن کے غیرشرعی حوالوں کی وجہ سے جھینپا بیٹھا تھا وہ بھی مسرور ہو گیا۔
“یار تارڑ اگر میں تمہیں پاغل ای اوئے کہوں تو تم بُرا تو نہیں مانو گے؟”
نہیں اشرف میں بالکل بُرا نہیں مانوں گا۔۔ ویسے تم بھی بُرا نہ ماننا اگر میں اُس لڑکی کا نام بتاؤں جسے ” عشقیہ خط لکھنے کی پاداش میں اس کے بھائیوں نے تمہیں پھینٹی لگائی تھی“۔
(اللہ تعالیٰ پردہ پوشی کو پسند کرتا ہے پاگل خانے“ وہ مسکرانے لگا۔ (جاری”

12/1/14

چھوٹے مودودی اور چھوٹے تارڑ کا الیکشن
مستنصر حسین تارڑ
تو سکول کی بزم ادب کے اجلاس میں ہر ہفتے میں ”پاگل نگر کی خبریں“ نہایت ریڈیائی انداز میں پڑھا کرتا تھا اور یہ سلسلہ اتنا مقبول ہوا کہ مجھے ”پاگل نگر“ کا خطاب دے دیا گیا اور پھر میرے پیچھے ”پاغل ای اوئے“ کے نعرے لگنے لگے تو انہی دنوں بزم ادب کے صدر کے لیے الیکشن کے انعقاد کا اعلان ہو گیا۔۔ میں بھی صدارت کے لیے کھڑا ہو گیا اور حزب مخالف نے عمر فاروق مودودی کو بہلا پھسلا کر میرے خلاف الیکشن لڑنے پر آمادہ کر لیا۔۔ عمرفاروق، مولانا مودودی کا بیٹا تھا اور وہ ایک نہایت شریف الطبع، نستعلیق قسم کا بچہ تھا۔ ہمیشہ صاف ستھرے لباس میں اچکن پہنے ہوئے نہایت دھیمے مزاج کا۔۔ ہمیشہ آپ جناب سے مخاطب کرتا۔۔ مثلاً اگر میں آدھی چھٹی کے وقت اُسے کہتا کہ اوئے عمر فاروق چل یار نان اور چھولے کھاتے ہیں تو وہ کہتا، جناب آپ تناول فرما آئیے، مجھے بازار کی چیزوں سے پرہیز ہے۔۔ ہم سب اُس کی شرافت کے مداح تھے۔۔ البتہ پڑھائی کے معاملے میں وہ خاصا ناتواں تھا، مشکل سے پاس ہوتا اگر ہوتا۔۔ اتنا شریف تھا کہ ماسٹر صاحب کے بید ہاتھوں پر وصول کرتے ہوئے بھی انتہائی تحمل اور بردباری کا مظاہرہ کرتا اُف تک نہ کرتا۔۔ ہم اچھے دوست ہوا کرتے تھے بلکہ اُن دنوں مجھے آٹو گراف جمع کرنے کا شوق تھا تو میں نے اُسے اپنی آٹو گراف بک دی کہ اس پر اپنے ابا جی کے دستخط کروالانا۔۔ مولانا مودودی نے میری آٹو گراف بک کے صفحے پر لکھا ”خدا کا خوف ہر نیکی کی جڑ ہے“ ابھی پچھلے دنوں میرے ایک چاہنے والے عبید اللہ کیمر نے اپنی ویب سائٹ پر مولانا کے یہ آٹو گراف منتقل کیے اور میرے بچپن کی ایک تصویر کے ساتھ مولانا کی تصویر لگائی اور لکھا کہ دیکھئے تارڑ صاحب نے سکول کے زمانے میں مولانا کے آٹو گراف حاصل کیے یعنی میں اُن کا اتنا مداح تھا۔ اس پر میں نے ہلکے پھلکے انداز میں اُسے کہا کہ بھئی عبید اللہ اس بچپن میں میں نے ہالی وڈ کی فلم ایکٹرس ایواگارڈنر اور مِس یونیورس کے علاوہ نورجہاں کے دستخط بھی حاصل کیے تھے تو اُن کی تصویریں بھی لگا دیتے تو کیا مضائقہ تھا۔ بہرطور الیکشن ہوئے اور عمر فاروق مودودی مجھ سے بری طرح ہار گیا۔۔ میرے سپورٹر جن میں افضل کالیا اور مدھوبالا سر فہرست تھے بے حد متحرک اور خاورزماں جو بعد میں آئی جی سندھ تعینات ہوا اور پھر آسٹریلیا میں ہمارا ہائی کمشنر مقرر ہوا، میرا بہت بڑا سپورٹر تھا۔۔ اُدھر عمر فاروق کچھ اس طرح سے ووٹ مانگتا کہ دیکھئے حضور اگر ناگوار خاطر نہ گزرے تو اس حقیر پُرتقصیر کو ووٹ عنایت کر دیجیے گا اور اگر آپ ووٹ نہ دیں گے تو واللہ آپ سے کچھ شکایت نہ ہو گی۔۔ اب آپ ہی بتائیے اس طرح ووٹ ملتے ہیں۔۔ بہر حال مودودی نے فراخ دلی سے شکست تسلیم کر لی اور مجھے مبارکباد دی۔۔ غالباً یہ اُس کا پہلا اور آخری الیکشن تھا۔ اگرچہ مجھے 70ء کے الیکشنوں کے دوران ایک پارٹی کی جانب سے نیشنل اسمبلی کا ٹکٹ آفر کیا گیا لیکن میں نے معذرت کر لی کہ بھئی میں تو شریف آدمی ہوں۔۔ ازاں بعد حلقہ ارباب ذوق لاہور کے الیکشن میں اُمیدوار ہوا اور سیکرٹری منتخب ہو گیا اور یہ میرا آخری الیکشن تھا۔۔ اولڈ بوائز کے ساتھ گپ شپ کے دوران عمر فاروق مودودی اور میرے درمیان الیکشن کے قصے بھی چھڑ گئے۔۔ مدھوبالا کہنے لگا ”ویسے یار کچھ پتہ ہے کہ عمر فاروق ان دنوں کہاں ہے۔۔ اگر ہے تو۔۔ “ اس پر کسی نے کہا ”شنید ہے کہ اس نے عربی میں ایم اے کیا اور کسی زمانے میں مدینہ منورہ میں پڑھاتا تھا۔۔ ان دنوں جانے کہاں ہے“۔
اگر یہ کالم عمر فاروق مودودی کی نظر سے گزرے تو میں اس سے درخواست کروں گا کہ حضور اگر ناگوار خاطر نہ گزرے تو ہم سے رابطہ کر لیجیے، یہ حقیر پر تقصیر از حد شکر گزار ہو گا۔۔ آپ سے ملنے کو بہت

جی چاہتا ہے یار"۔
عمر فاروق مودودی کی باتیں ہوئیں تو کسی نے شجاع کا قصہ چھیڑ دیا اور پھر اس کے حوالے سے اپنی یادوں کے قبرستان میں اتر گئے۔۔۔ شجاع کی زندگی بھی عجیب تھی۔ سکول کے زمانوں میں ٹخنوں سے اونچا دھاریدار پاجامہ پہنتا۔۔۔ آنکھوں میں سُرمہ لگاتا اور بُرش کی بجائے مسواک استعمال کرتا۔ نماز روزے کا بھی پابند تھا۔۔۔ ہمیشہ آنکھیں جھکا کر چلتا تاکہ کسی بے پردہ لڑکی پر نظر نہ پڑ جائے، اس کے نزدیک یہ ایک گناہ تھا بلکہ وہ اسے نظر کا زنا کہتا۔۔۔ میڈیکل کالج میں داخل ہوا تو صورت حال کچھ تسلی بخش ہو گئی۔ ڈاکٹر کے طور پرچند برس انگلینڈ میں بسر کر کے آیا تو لُٹیا ہی ڈوبی ہوئی، مکمل طور پر دہریا ہو چکا تھا اور مذہب کی مخالفت میں جانے کیا کیا حوالے دیتا۔۔۔ پھر خبر آئی کہ شجاع مر گیا تھا پھر زندہ ہو گیا۔۔۔ اُسے دل کا دورہ پڑا اور اپنے ہی ہسپتال میں عارضی طور پر فوت ہو گیا۔ اس کے ساتھی ڈاکٹروں نے دل کو بجلی کے دھچکے دے کر پھر سے چالو کر دیا۔۔۔ شجاع کمپیوٹر پر اپنے دل کی حرکت کی ریکارڈنگ دیکھتا رہتا۔۔۔ لکیریں ابھرتی ہیں، کبڑی ہو کر یکدم ہموار ہو جاتی ہیں اور ایک عرصہ ہموار رہنے کے بعد پھر سے انگڑائی لے کر ابھرنے لگتی ہیں اور شجاع یہ سوچتا رہتا کہ جتنا عرصہ میرا دل رُکا رہا، میں مرا رہا تب میں کہاں تھا۔۔۔ یہ سوچ سوچ کر کبھی اس کا دماغ چل جاتا اور وہ ہنسنے لگتا۔۔۔ ایک عرصے کے بعد نارمل ہوا اور پھر داڑھی بڑھا کر نماز روزے کا پابند ہو گیا۔۔۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک مرتبہ پھر باغی ہو گیا، اس دوران پھر اُسے دل کا دورہ پڑا اور اس مرتبہ اُس کا دل ہمیشہ کے لئے رُک گیا۔
کسی نے صلاح الدین شیخ کے بارے میں پوچھا۔۔۔ وہ میرا بہت قریبی دوست ہوا کرتا تھا اور اس کی زندگی کی کہانی بھی بہت حیرت بھری ہے، کبھی پھر سہی۔۔۔ میں نے انہیں بتایا کہ صلاح الدین کو مرے ہوئے بھی ایک مدت ہو چکی ہے۔
ابھی سب اولڈ بوائز چہک رہے تھے، بچوں کی طرح خوش ہو رہے تھے، بلکہ ایسا لگتا تھا کہ ہم پھر سے بچے ہو گئے ہیں، سکول سے فارغ ہو کر گول باغ میں گپیں لگا رہے ہیں اور ابھی ہم گھر چلے جائیں گے جہاں امی جان فکرمند ہو رہی ہوں گی کہ مستنصر کو بہت دیر ہو گئی ہے، ابھی تک آیا نہیں، کسی ملازم کو روانہ کر دیں گی کہ پتہ کرو، سکول جا کر معلوم کرو کہ کتنے بجے چھٹی ہوئی تھی۔۔۔ اور ہم اس سراب میں بہت دیر مبتلا رہے اور جب اس سے باہر آئے تو پھر بوڑھے ہو چکے تھے۔ ماں باپ کب کے مر چکے تھے، اب گھر میں کسی کو بھی ہمارا انتظار نہ تھا۔۔۔ وہ جو بچھڑ گئے تھے، ہمارے کلاس فیلو مر چکے تھے، ان کی یاد میں ہم پہلے تو آزردہ ہوئے اور پھر سب کے اندر موت کی آہٹ سنائی دینے لگی کہ ہم سب زندگی کے آخری برسوں میں تھے، ہم نے اپنی آخری کار خرید لی تھی، کہ اب نئے ماڈل تک کون جانے کیا ہو۔۔۔ اور کون جانے اگلی بار ہم میں سے کس نے غیرحاضر ہونا تھا، اپنے رب کے پاس حاضر ہونا تھا۔۔۔ ویسے ہم سب اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہوئے کہ اس نے یہ زندگی عطا کی۔ اپنی بے شمار نعمتوں سے نوازا، اولاد سے نوازا، کبھی بھوکا نہ رکھا، رہنے کو گھر دیا، پہننے کو لباس دیا، اتنا کچھ دیا، کیا کیا نہ دیا۔۔۔ پر ہم نے اتنا شکر ادا نہ کیا جتنا ہم پر واجب تھا۔۔۔ ہم کیسے قسمت والے تھے کہ تقریباً ساٹھ برس بعد پھر سے اکٹھے ہو گئے تھے۔۔۔ اولڈ بوائز ہو گئے تھے۔۔۔ ہم ایک دوسرے سے رخصت ہوئے تو ایسے رخصت ہوئے جیسے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہے ہوں۔

19/1/14

پرندے نیاز احمد کے لیے شور کرتے تھے
مستنصر حسین تارڑ

ماڈل ٹاؤن کے لان کی دیوار کے ساتھ جو پنجرے تھے اُن میں پرندے، رنگ رنگ کے طوطے، چڑیاں، 7-128 محبت کے پرندے، سرخ فاختائیں مسلسل کوکتی تھیں، پرندے شور کرتے تھے، شاید وہ بھوکے تھے اور نہیں جانتے تھے کہ اُنہیں ہر سویر جو شخص پکارتا، اُن کی سیٹیوں کی آوازیں سن کر مسکراتا، مہربان شکل کا معصوم سا شخص جو اُنہیں دانہ ڈالتا تھا، اُن سے باتیں کرتا تھا، مر چکا تھا۔۔۔ اُس کے چھوٹے سے کمرے کے در و دیوار اس کے بچوں اورپوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کی تصویروں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ اُس کے جوانمرگ بیٹے کی مسکراہٹ سے سجے ہوئے تھے، وہ اُن کے درمیان پر امن تھا اور اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ منجمد ہو چکی تھی کہ وہ آج سویرے ان تصویروں اور یادوں کے درمیان، مر چکا تھا۔۔۔ اُنہیں دانہ ڈالنے والا، پانی پلانے والا شخص رخصت ہو چکا تھا۔ پرندے اپنے پنجروں میں پھڑ پھڑاتے تھے جیسے اس

قفس سے آزاد ہو جانا چاہتے ہوں کہ اس شخص کی روح بھی تو قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی، وہ بھی اسی کے ساتھ چلے جانا چاہتے تھے، وہ جانتے تھے کہ پرندے سب کچھ جانتے ہیں کہ اس شخص نے آج تک خلق خدا کو کوئی دکھ نہیں دیا، رزق حلال کمایا، بہت خاموشی سے سینکڑوں لوگوں کی چپکے سے مدد کی، اُن کے دامن بھر دیئے، نہ صرف اُن کی خوشیوں بلکہ دکھوں میں بھی شریک ہوا، اپنے رزق میں اُنہیں بھی حصے دار بنایا۔۔۔ ہمیشہ سرنگوں رہا، کبھی تکبر نہ کیا، کبھی غرور آشنا نہ ہوا اور کبھی بخیل نہ ہوا، وہ عہد حاضر کا ایک حاتم طائی تھا جس کا دستر خوان وسیع تھا، اُس کے در سے کوئی خالی نہ لوٹا، اس نے ہر ایک کا دامن بھر دیا۔ بے شک اسے اپنے نوجوان بیٹے اعجاز احمد کی ناگہانی موت کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ وہ بجھ سا گیا پر اس کی مسکراہٹ اس کے چہرے سے رخصت نہ ہوئی۔۔۔ اولاد کے حوالے سے اس کی قسمت نے اس کا ساتھ نہ دیا، اس کے باوجود وہ دوسروں کی قسمت سنوارتا رہا۔۔۔ وہ دشمنوں کو معاف کرتا رہا اور دوستوں کے لیے ایک رحمت ثابت ہوتا رہا۔۔۔ اپنے زور بازو سے اور حیرت انگیز تخیل سے ایک معمولی سیلز مین سے بلند ہوا اور بر صغیر کے سب سے بڑے اشاعتی ادارے کا نگہبان ہو گیا۔ لوگ اسے دیکھنے آتے کہ یہ کون شخص ہے۔۔۔ جس کے نام اور کام کی دھوم کل دنیا میں ہے، لوگ امریکہ، انگلستان، ہندوستان، جاپان یہاں تک کہ آئس لینڈ سے آتے کہ دیکھیں تو سہی کہ وہ کون شخص ہے جس نے کتاب کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے، ادیب جو اس سے پیشتر رلتے پھرتے تھے، کوئی انہیں پوچھتا نہ تھا۔ اس شخص نے انہیں شہرت اور ناموری کے سنگھاسن پر بٹھا دیا۔۔۔ اُنہیں شہزادے کردیا، رائلٹی بنا دیا، اُنہیں آسودہ اور خوش حال کر دیا کہ وہ پاکستان میں پہلا ناشر تھا جو ہر ادیب اور شاعر کے گھر پہنچ کر اُس کی رائلٹی ادا کرتا تھا چاہے وہ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ ہوں۔ انتظار حسین، عبداللہ حسین یا مستنصر حسین ہوں یہاں تک کہ گوپی چند نارنگ یا قرۃ العین حیدر ہوں یا پھر سعادت حسن منٹو کی بیٹیاں ہوں۔۔۔ قرۃ العین حیدر پوچھتی ہیں کہ بھئی یہ کون شخص ہے نیاز احمد۔۔۔ باؤلا لگتا ہے، پاکستان میں بے شمار ناشر میری کتابیں میری اجازت کے بغیر شائع کرتے رہتے ہیں اور یہ کون شخص ہے جو میری تحریری اجازت کے ساتھ میری تمام تخلیقات کو کیسی شان شوکت سے شائع کرتا ہے اور میں دنیا میں جس خطے میں بھی ہوں، رائلٹی روانہ کر دیتاہے۔ عبداللہ حسین کا کہنا ہے کہ مجھے اپنے ناول ”اداس نسلیں“ کے لیے ناشر نے آج تک ایک پائی بھی ادا نہیں کی اور نیاز احمد۔۔۔ شرمندہ سا لگتا آتا ہے اور مجھے چیک تھما دیتا ہے۔ منٹو کی بیٹیاں ہر انٹرویو میں اقرار کرتی ہیں کہ آج تک کبھی کسی ناشر نے ہمیں پوچھا تک نہیں، ہمارے والد کی کتابیں شائع کر کے ثروت مند ہوتے گئے اور ہم نیاز احمد کی شکر گزار ہیں کہ وہ ہمیں ہمارے گھر آ کر رائلٹی ادا کرتے ہیں اور کیسی آن بان اور خوبصورتی سے ہمارے والد کی کتابیں شائع کرتے ہیں۔ صرف یہی نہیں اگر کوئی ادیب یا شاعر کسی بھی مالی مشکل میں مبتلا ہو وہ اسے بھی اس نے جو کتاب نہیں لکھی اس کی بھی رائلٹی ادا کرنے کے لیے اس کے گھر پہنچ جاتے ہیں۔۔۔ اور لوگ جب اس باؤلے شخص کو دیکھنے آتے ہیں تو وہاں۔۔۔ سر جھکائے، مسکراتا ہوا، ایک خدمت گار اور اپنی انکساری میں سرنگو سا ہوتا معمولی دکھائی دیتا ایک شخص ہوتا ہے جو اپنی بچوں جیسی مسکراہٹ سے اُن کا دل موہ لیتاہے۔ تو یہ پرندے اپنے قفس توڑ کر بس اسی شخص کی روح کے ساتھ پرواز کر جانا چاہتے ہیں کہ۔۔۔ پرندے جانتے ہیں۔۔۔ کہ اس شخص کا عرشوں پر استقبال ہو گا اور وہ خلد بریں کے ایک محل کا مکیں ہو گا اور اس کے برابر میں ایک باغ ہو گا اور وہ پرندے اس باغ میں آشیانے بنائیں گے، چہچہائیں گے اور وہ شخص اُنہیں ہر سویر دانہ ڈالے گا، اُن کی چہکار سے خوش ہو گا، اُن کی بولیاں سنے گا۔۔۔ اس لیے وہ اپنے پنجرے توڑ کر اس کے ہمراہ پرواز کر جانا چاہتے ہیں۔

وہ ایک قلندر تھا، جتنا رزق تقسیم کرتا تھا بڑھتا جاتا تھا۔

اور پرندے چپ نہ رہتے تھے، چہکتے غل کرتے تھے۔

اس کا بیٹا افضال احمد، ابھی کل تو نوجوان تھا ان پرندوں کی مانند چہکتا تھا اور ابھی باپ کی رخصتی پر بوڑھا ہونے لگا تھا کہ اس کے کاندھوں پر پورے خاندان اور وسیع کاروبار کا بوجھ آن پڑا ہے۔۔۔ وہ کھلنڈرا سا لڑکا ہوا کرتا تھا اور اس کا بڑا بھائی اعجاز احمد اس سے لاڈ کرتا تھا، اگر نیاز احمد سنگ میل پبلی کیشنز کا

دماغ تھا تو اعجاز حرکت اور مشقت تھا۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی افضال سے کہتا، تم نے کچھ کام نہیں کرنا۔۔ زندگی سے لطف اُٹھاؤ، موج کرو، میں جو ہوں کام کرنے کے لیے اور پھر ایک شب مجھے نیاز صاحب کی بھرائی ہوئی آواز ٹیلی فون سے آئی ”اعجاز چلا گیا ہے“۔۔ نہ کوئی بیماری نہ کوئی علامت۔۔ جوان جہان اس جہان سے یکدم چلا گیا۔۔ افضال جب بھی ہماری ملاقاتاتیں ہوئیں گفتگو کے دوران ایک لمحے کے لیے سوگوار ہو جاتا اور کہتا، اعجاز نے بڑی زیادتی کی، مجھے اپنے لاڈ پیار سے چَوڑ کر دیا اور یکدم چلا گیا،میری حیاتی کو بکھیڑوں میں ڈال گیا۔۔ وہ ہمیشہ اس کے سوگ میں مبتلا رہا۔ اپنی بیٹی اعجاز کے بیٹے علی سے بیاہ دی اور علی بھی ہوبہو اپنے باپ کی مانند شریف النفس اور کام سے لگن رکھنے والا لڑکا ہے۔ میں کبھی اُسے گود میں کھلایا کرتا تھا۔۔ اور آج افضال، اعجاز کے بعد اپنے باپ کے بچھڑ جانے پر میرے سامنے بوڑھا ہو گیا تھا۔ میں نے پہلی بار نوٹ کیا کہ اس کے بالوں میں سفیدی اترتی جا رہی ہے۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ میرے برابر میں انتظار حسین ایک قراقلی کیپ میں سر جھکائے بیٹھے تھے۔ اکرام اللہ اور ڈاکٹر سلیم اختر جو نیاز احمد کے دیرینہ دوست تھے اور انہوں نے اکرام اللہ کلا ناول ”گرگ شب“ شائع کیا جس پر پابندی لگ گئی اور سلیم اختر کا ناولٹ ”ضبط کی دیوار“ چھاپا۔۔ سلیم اختر چلنے پھرنے سے معذور ہو چکے تھے۔

جنازہ ابھی نہ اٹھ سکتا تھا۔۔ نیاز کا چہیتا پوتا ایاز دبئی میں کسی کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے گیا تھا، اس کی آمد کا انتظار تھا۔

پرندے غل کرتے تھے، انہوں نے موت کی بو سونگھ لی تھی، شور کرتے تھے۔

(جاری ہے)

26-01-2014

یہ دھواں کہاں سے اٹھتا ہے

مستنصر حسین تارڑ

یہ دھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے۔۔ کوئٹہ سے اٹھتا ہے، وزیرستان سے اٹھتا ہے، راولپنڈی کے راجہ بازار سے اٹھتا ہے جہاں مائیں اپنے سکول جانے والے بچوں کے لاشے سینے سے لگائے فریاد کرتی ہیں کہ ان ظالمان کو خدا غارت کرے۔۔ حکومت کب تک سوتی رہے گی۔ ٹیلی ویژن کی سکرین پر جن کے عزیز اور جگر گوشے ہلاک ہو گئے ہیں وہ ماتم کر رہے ہیں۔۔ کوئٹہ میں قطار اندر قطار تابوت سجے ہیں اور اُن میں کچلے گئے ہلاک شدہ خوبصورت ہزارہ چہرے ہیں، اُن کے لواحقین ملک بھر میں، اسلام آباد، لاہور اور کراچی میں احتجاج کر رہے ہیں اور وہ انکار کرتے ہیں اپنی لاشوں کو دفن کرنے سے کہ ایک مرتبہ لاش دفن ہو جائے تو وہ فراموش ہو جاتی ہے۔ انتقام اور احتجاج کی آگ تب تک جلتی رہتی ہے جب تک آپ کے نوخیز بیٹے، ماں یا بھائی کی لاش آپ کے سامنے پڑی رہتی ہے۔ اگر دین کے بیوپاری خفا نہ ہوں تو میں ایک حوالہ دینے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ میں ایک تاریک خیال نہیں ہو سکتا روشن خیال ہو سکتا ہوں۔۔ اُحد کا میدان ہے۔۔ امیر الشہداء حمزہؓ کی لاش مسخ شدہ حالت میں پڑی ہے۔ وحشی نے جب اُنہیں برسر پیکار دیکھا تو کہا کہ وہ شخص ایک بھورے اونٹ کی مانند اپنے دشمنوں پر حملہ کرتا تھا، وہ تاک میں رہا اور جب اس نے اپنا بھالا پھینکا تو وہ امیر حمزہؓ کی ناف کے آر پار ہو گیا۔۔ اور پھر ہندہ نے بدر میں ہلاک ہونے والے اپنے عزیزوں کے بدلے میں اُن کی لاش کی بے حرمتی کی۔ مثلہ کیا اور جب اللہ کے رسول محمدؐ اپنے عزیز از جان چچا کی لاش دیکھتے ہیں تو طیش میں آ جاتے ہیں۔ وہی چچا جنہوں نے ابوجہل کے چہرے پر اپنی کمان مار کر اسے لہو لہان کر دیا تھا کہ تیری یہ جرأت کہ میرے پیارے بھتیجے کو دشنام کرے۔۔ لے میں بھی تیرے سامنے کلمہ پڑھتا ہوں، محمدؐ کو اللہ کا پیغمبر مانتا ہوں، مسلمان ہوتا ہوں۔۔ تو اس جری اور اسلام کے دفاع میں ایک دیوار چچا کی اُحد کے میدان میں پڑی لاش میرے حضورؐ دیکھتے ہیں تو طیش میں آجاتے ہیں اور کہتے ہیں، میں اپنے چچا کے بدلے میں قریش کے ہلاک شدگان کا مثلہ کروں گا۔۔ اور میں حمزہ کی لاش کو دفن نہیں کروں گا تا آنکہ ان کا گوشت پرندوں کے پوٹوں یا بدن میں نہ اتر جائے۔ یونہی لاش کو پڑا رہنے دوں گا اور تب وہ آیت اترتی ہے۔۔ اور میرے رسولؐ اعلان کرتے ہیں کہ نہیں۔۔ ہم اُن جیسے نہیں، مثلہ کرنا جائز نہیں۔۔ میرے چچا کو دفن کیا جائے ،اور کیسی بے سروسمانی تھی کہ کفن کی چادر اتنی مختصر تھی کہ پاؤں ڈھکتے تھے تو چہرہ عیاں ہو جاتا تھا، اُسے ڈھانپتے تھے تو پاؤں ننگے ہو جاتے تھے چنانچہ اُن کے پاؤں کو گھاس سے ڈھکا گیا۔ صرف ایک نہیں، امیر حمزہ کی بہتر بار نماز جنازہ ادا کی گئی اور سب کی سب میرے رسولؐ اللہ نے پڑھائیں۔

تو یہ ایک پرانی رسم ہے کہ اپنے عزیزوں کو دفن نہ کرو۔۔ اُن کے لاشے پڑے رہنے دو تاکہ اُن کی معصومیت اور ہلاکت کو ہر شخص دیکھ لے۔۔ لیکن ہر کسی میں بلکہ کسی میں بھی نہیں میرے رسولؐ کا جگرا تو نہیں ہوتا، کہ معاف کر دے، درگزر کر دے۔۔ یہ معمولی انسان ہیں وہ اپنے عزیزوں کے لاشے سامنے رکھے اُنہیں دفنانے سے انکاری ہوتے ہیں۔ میں اس الجھن کو کبھی سلجھا نہیں سکا کہ دور دیس کے بنگلہ دیش میں اگر ایک منتقم مزاج عورت ایک ملا کو پھانسی پر چڑھا دیتی ہے تو ہر جانب کیسی ہاہاکار مچ جاتی ہے۔ ایک کربلا بپا ہو جاتی ہے جبکہ اپنے وطن میں بے گناہ لوگوں کی لاشوں کے ڈھیر لگے ہیں، چھ بہنوں کا اکلوتا بھائی خود کش حملے میں مارا جاتا ہے۔ ہمارے اپنے فوجی ہلاک کر دیئے جاتے ہیں۔۔ راجہ بازار میں مائیں اپنے بچوں کی لاشیں سینے سے لگائے انصاف کے لیے پکارتی ہیں اور۔۔ سب کے سب اپنے تئیں علمدار چپ رہتے ہیں۔ اگر آپ سلجھا سکتے ہیں تو پلیز اس گتھی کو سلجھا دیجیے۔ مجھ پر کرم کیجیے۔

اگلے روز پارک میں سیر کرتے ہوئے ایک صاحب جو اجنبی تھے میرے پاس آئے اور کہنے لگے ''تارڑ صاحب۔۔ آپ کے نام کے ساتھ ''حسین'' ہے تو ان دنوں ذرا احتیاط کیجیے''۔

اُن کا مشورہ میری سمجھ میں نہ آیا۔۔ ''لیکن کیوں''۔۔ ہم تینوں بھائیوں کے نام کے ساتھ ''حسین'' منسلک ہے تو۔۔ میں ایک خاصا راسخ ''عقیدے کا سنی مسلمان ہوں لیکن حسین ہمارے بھی تو ہیں تو میں۔۔ اپنے نام سے حسین خارج کر دوں نہیں۔۔ تارڑ صاحب۔۔ لوگ اندھے ہو چکے ہیں، احتیاط کیا کیجیے''۔''

پچھلے دنوں ایک موٹے تازے سویٹ سے بچے اعتزاز حسن نے اپنے سکول کے ساتھیوں کو موت سے بچانے کی خاطر موت کو اپنے گلے لگا لیا۔۔ اور حملہ آور کون تھا۔۔ ہمارے ''دانشوروں'' کی پسندیدہ تنظیم کا ایک فرد۔۔ ویسے میں بہت خوش ہوا کہ یہ بچہ مارا گیا۔۔ اگر یہ بچ جاتا، اس کے دماغ کو چھوتی ہوئی کوئی گولی نکل جاتی اور وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا پشاور اور اسلام آباد کے فوجی ہسپتالوں میں زیر علاج رہ کر کہیں برطانیہ یا امریکہ کے کسی خصوصی ہسپتال میں منتقل کر دیا جاتا اور ۔۔ صحت یاب ہو جاتا تو اس کی کیسی کم بختی آ جاتی۔۔ کہ یہ بدبخت مر کیوں نہ گیا۔۔ مغرب اس کی تعظیم کر رہا ہے تو نہ صرف وہ بلکہ اس کا پورا خاندان غدار ہے۔۔ ہمارا ہیرو تو وہ ہے جسے ڈرون حملے نے ہلاک کر ڈالا۔۔

ہائے ہائے کیسا ستم ہو گیا۔ بے شک اس کی تنظیم نے ہزاروں بچوں، بوڑھوں اور فوجی نوجوانوں کو مار ڈالا۔۔ پر ہم اس کی یاد میں سینہ کوبی کرتے ہیں، شہید تو بس وہی ہے۔

یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے۔۔

دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے۔۔

میرے پاکستان سے اٹھتا ہے۔۔

میں اپنے نام سے ''حسین'' کیسے حذف کر دوں کہ وہ میری پہچان ہے۔ میں ابو بکر صدیقؓ، حضرت عثمانؓ اور عمر بن خطابؓ کی عظمتوں کی خاک کا پیرو کار۔۔ حسینؓ کی قربانی کو کیسے بھلا دوں۔۔ حذف کر دو

28/1/14

تِری لحد پہ کھلیں جاوداں گلاب کے پھول

مستنصر حسین تارڑ

جنازہ ابھی نہ اٹھ سکتا تھا، نیاز احمد کا چہیتا پوتا ایاز دوبئی میں کسی کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے گیا تھا۔۔ اس کا انتظار تھا۔

!پرندے غُل کرتے تھے، انہوں نے موت کی بُو سونگھ لی تھی، شور کرتے تھے

سردی بڑھتی جاتی تھی اور رات کی سوگوار سیاہی گہری ہوتی جاتی تھی۔

جب میں خزاں کے دنوں میں تھا وہ بہار بن کر میری زندگی میں آیا۔۔ ابّا جی کے بعد اگر کسی نے میرا ہاتھ تھاما تو وہ نیاز احمد تھے۔۔ تیس برس سے زائد ہو گئے جب مجھے کشور ناہید کا فون آیا ”مستنصر یوں سمجھ لو کہ تم نے مجھے اپنی کوئی کتاب اشاعت کے لئے دینی ہے۔۔ نیاز احمد صاحب بڑے بھلے آدمی ہیں، ابھی تک درسی کتابیں چھاپتے تھے، وہ سنجیدہ ادب شائع کرنا چاہتے ہیں، وہ تمہارے پاس آئیں گے“ اور وہ آ گئے، اتنے دھیمے اور انکسار پسند۔۔ چھوٹے معصوم بچوں ایسی مسکراہٹ اور دل کومسخر کر دینے

والی شخصیت۔۔۔میرے پاس ”پیار کا پہلا شہر“ کی کتابت بیکار پڑی تھی میں نے ان کے حوالے کردی۔۔ آج اس ناول کے پچاس سے زائد ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔۔ انہوں نے میرے نئے سفر نامے ”خانہ بدوش“ کے لئے اتنی رائلٹی کی پیشکش کی کہ آج تک شاید ہی اردو کے کسی بھی شاعر یا ادیب کو اتنی رائلٹی ملی ہو۔۔ میں نے اپنے قرض ادا کر دیئے، آسودہ ہو گیا۔۔ میں اپنا پرانا موٹرسائیکل فروخت کر کے ایک نیا موٹرسائیکل حاصل کرنا چاہتا تھا۔۔ انہوں نے کہا ”نہیں اب آپ موٹرسائیکل پر اچھے نہیں لگتے آپ ایک نئی کار خریدیں گے“۔۔ میں ان کی مہربانی سے زندگی میں پہلی بار صاحبِ کار ہو گیا۔ میری زندگی میں آج تک جتنی کامیابیاں ہیں اور خوشحالی ہے ان سب میں نیاز احمد کی شفقت شامل ہے۔۔ بچوں کی شادیوں کے مراحل آئے تو وہ ایک شام پہلے آتے اور شرماتے ہوئے ایک براؤن لفافہ میرے قریب رکھ دیتے، میں احتجاج کرتا کہ نیاز صاحب مجھے ضرورت نہیں، اگر ہوئی تو میں آپ سے مانگ لوں گا۔۔ اور وہ کہتے، رکھ لیں، ہو سکتا ہے ضرورت پڑ جائے۔۔ نہیں تو واپس کر دیجئے گا اور جب ایک بار مجھے ضرورت نہ پڑی اور میں نے رقم واپس کرنے کی کوشش کی تو کہنے لگے ”آپ کی چھ کتابوں کے نئے ایڈیشن شائع ہو رہے ہیں، یہ ایڈوانس رائلٹی ہے“۔
اُن کے پرانے شو روم میں داخل ہوتے ہی سامنے پہلے شیلف پر میری کتابیں نمائش پر ہوتیں اور جب مجھ سے سینئر ادیب جُز بُز ہوتے تو وہ کہتے ”آج اگر سنگِ میل پبلی کیشنز پاکستان کا سب سے بڑا اور مؤقر ادبی اشاعت گھر ہے تو اس کی ایک وجہ تارڑ ہے، وہ میرے لئے خوش نصیبی لے کر آیا ہے۔۔ اس کی کتابیں ہمیشہ پہلے شیلف پر ہی سجیں گی“ اور حقیقت اس کے برعکس تھی، یہ نیاز احمد تھے جو میری زندگی کی سب سے بڑی خوش نصیبی ثابت ہوئے تھے۔۔ اگر وہ نہ ہوتے تو آج میں وہ نہ ہوتا جو میں ہوں۔۔ ایک بار میں نے نہایت سنجیدگی سے اپنا آبائی کاروبار پھر سے بڑے پیمانے پر شروع کرنے کا ارادہ کیا کہ بچے بڑے ہو رہے تھے اور ٹیلی ویژن اور ادب کی آمدنی ناکافی تھی، ان سے مشورہ کیا تو کہنے لگے ”آپ کاروبار کرنے والوں میں سے نہیں ہیں، آپ لکھ سکتے ہیں تو صرف لکھئے۔۔ اور جب تک میری زندگی ہے میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو مالی طور پر کبھی دشواری نہ ہو گی“۔۔ اور ایسا ہی ہوا۔۔ اگر میں نے زندگی بھر صرف ادب تخلیق کیا، اور کچھ نہ کیا تو یہ کمال بھی نیاز احمد کا ہے۔ وہ نہ صرف میرے بلکہ میرے بچوں کے بھی دوست تھ اور عینی تو ان پر جان دیتی تھی، امریکہ سے آتی تو اسی روز یا اگلے دن انکل نیاز کے گھر جاتی اور انہیں جپھا مار لیتی۔۔ اور وہ اسے لاکھوں دعائیں اور ہزاروں پیار دیتے۔۔ عینی کہا کرتی تھی کہ ابو بے شک میرے خون کے رشتے دار بھی مجھ پر جان دیتے ہیں لیکن مجھے ان سب سے پیارے نیاز انکل ہیں۔۔ اسی لئے میں نے نیاز احمد کے چلے جانے کی اسے اطلاع نہ کی تھی، اس نے فلوریڈا میں اپنے گھر میں۔۔ تنہا، بہت رونا تھا۔۔ وہ پچھلی بار پاکستان آئی اور نیاز صاحب سے ملنے گئی۔۔ وہ ان دنوں علیل تھے، کچھ گمشدہ اور منتظر تھے۔ گھر واپسی پر عینی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ”ابو۔۔ نیاز انکل ٹھیک نہیں ہیں، میں نے ان کے سُوجے ہوئے پاؤں اور آنکھوں کی بے رونقی دیکھی ہے، وہ ٹھیک نہیں ہیں“ میں نے اس کی ڈھارس بندھانے کی کوشش کی تو کہنے لگی ”ابو۔۔ وہ اس لئے بھی ٹھیک نہیں ہیں کہ آج پہلی بار انہوں نے میری ہتھیلی پر کچھ نہیں رکھا۔۔ وہ ہمیشہ مجھے عیدی دینے بھی آتے تھے، وہ ٹھیک نہیں ہیں“ بعد میں افضال احمد نے بتایا کہ عینی کی آمد کی خبر سن کر انہوں نے خاص طور پر اس کے لئے کچھ رقم اپنے کُرتے کی جیب میں رکھی تھی اور وہ بھول گئے“۔۔ بعد میں یاد آیا تو کہنے لگے، افضال۔۔ عینی خالی ہاتھ چلی گئی ہے، تم یہ رقم اسے امریکہ بھجوا دو“۔
جیسا ایک نوجوان صحافی لڑکی نے اپنے انگریزی اخبار کے انٹرویو کے لئے مجھ سے کہا تھا کہ سَر۔۔ مجھے اپنی زندگی کے بارے میں تفصیل سے بتائیں تو میں نے اس کی سادگی کو پسند کرتے ہوئے کہا تھا کہ۔۔ میں چوہتّر برس کا ہو گیا ہوں اور اس زندگی کی تفصیل بیان کرنے کے لئے بھی مجھے چوہتّر برس درکار ہیں تو کچھ اسی طور نیاز احمد کی شفقت، محبت اور عنایت کی گھنی چھاؤں تلے جو تقریباً چالیس برس گزرے انہیں تفصیل سے بیان کرنے کے لئے بھی مجھے اتنے ہی برس درکار ہیں۔
نیاز احمد کا دراز قامت خوش شکل پوتا ایاز اس سوگوار رات میں دوبئی سے آ گیا اور اپنے مشفق دادا کو

اپنے نوجوان کاندھوں پر اٹھا لیا۔۔ وہی قبرستان تھا جہاں ہم نے نوجوان اعجاز احمد کو سپردخاک کیا تھا۔ اس کے پہلو میں نیاز احمد کو ہم نے لحد میں اتارا، میں نے آگے بڑھ کر چند مٹھیاں مٹی کی اس کے جسد خاکی پر نچھاور کیں اور اس مٹی کے ہر ذرّے سے کہا کہ تو نے جب نیاز احمد کے چہرے پر بکھرنا ہے تو اس سے کہنا ہے کہ بہت بے وفا ہو۔۔ مجھے بے سہارا چھوڑ کرچلے جاتے ہو۔۔ اور تب ایک شخص زیدی نے بلند آواز میں کہا ”لوگو یہ ایک بہترین شخص تھا جس نے خلق خدا میں سکھ تقسیم کئے، کسی کو دکھ نہ دیا۔۔ گواہ رہنا“۔۔ اور میں نے زیرلب کہا۔۔ ہاں میں گواہی دیتا ہوں۔

قبر پر گلاب کے پھولوں کے ڈھیر تھے۔۔

کٹی ہے عمر بہاروں کے سوگ میں امجد

مری لحد پہ کھلیں جاوداں گلاب کے پھول

پرندے چپ ہو چکے تھے، ان کے پنجرے خالی تھے، وہ نیاز احمد کی روح کے ہمراہ پرواز کر چکے تھے

30/1/14

رنجیت سنگھ کی رانی موراں کی مسجد اور حویلی نونہال سنگھ

مستنصر حسین تارڑ

یہ جو موسم سرماکے ٹھٹھرتے دن ہیں۔۔ میرے صحن میں سربلند چیڑ کا درخت دھند میں ملفوف ہو جاتا ہے، دھند اس کی شاخوں اور باریک بالوں سے لپٹتی ہے تو نمی میں بدل جاتی ہے اور آنسوؤں کی صورت فرش پر گر کر اسے گیلا کرتی ہے۔۔ صبح کی سیر کے لئے پارک میں جاتا ہوں تو سب شجر، جھاڑیاں اور سیر کرتے لوگ دھند کی سفید عبا میں لپٹے اس میں روپوش ہوتے ہیں اور جب دھوپ نکلتی ہے تو اس کی زردی بدن کو بھلی لگتی ہے تو ان دنوں میں مجھے لاہور کا قدیم اندرون بلاتا ہے، سینکڑوں برس قدیم شکستہ برج، مینار، جھروکے، حویلیاں، کھنڈر ہو چکے گھر، تاریخی مسجدیں اور گئے زمانوں کے آثار بلاتے ہیں۔۔ گلی کوچوں کی گندگی کی بُو اور حلوہ پوڑی اور نہاری کی مہک بلاتی ہے تو میں پارک کے ساتھیوں کو آمادہ کرتا ہوں کہ آؤ کچھ وقت لاہور کے قدیم گلی کوچوں میں گزارتے ہیں کہ آثار مٹتے جاتے ہیں، پرانا لاہور ٹریڈر مافیا کے اژدہے نگلنے والے ہیں۔۔انہیں کوئی نہیں پوچھتا کہ حکمران بھی تو تاجر ہیں۔۔ پچھلے دنوں تاریخی شیرانوالہ دروازے کے باہر ایستادہ شیروں کو ڈھا دیا گیا اور جب لوگوں نے احتجاج کیا، تو خیر سے ایک نوخیز شیر لاہور نے جنہیں ان دنوں ہم پر مستقبل میں حکمران ہونے کے لئے گروم کیا جا رہا ہے انہوں نے ذاتی طور پر مداخلت کی کہ نہیں ان لوگوں کو شیر تو کیا پورا دروازہ گرانے دو کہ یہ ان کا حق ہے، یہاں پلازہ تعمیر کیا جائے گا، تاریخ کو محفوظ رکھنے سے کچھ فائدہ نہیں، پلازے تعمیر کرنے سے ہی سیاست ہو سکتی ہے اور مال پانی کی فراوانی ہو سکتی ہے۔ مجھے اندرون شہر کے باسیوں نے بتایا کہ ایک مشہور پہلوان کی خدمات ایک کثیر معاوضہ ادا کر کے حاصل کی گئیں تاکہ وہ شیرانوالہ دروازے کے آس پاس جو مکین اور دکاندار ہیں انہیں کچھ دے دلا کر مائل کرے اگر نہ مائل ہوں تو زور بازو سے انہیں بے دخل کر کے نئی تعمیرات کی راہ ہموار کرے۔۔ چنانچہ یہ سب کچھ گم ہونے کو ہے تو آؤ اس شہر بے مثال کی آخری جھلکیاں دیکھ لو۔ لاہور یاترا کا جو پہلا اتوار تھا اس میں کیچڑ بہت تھا کہ پچھلے روز مینہ بہت زور کا برسا تھا۔ ہم لوہاری دروازے کے عظیم الشان پھاٹک سے اندرون شہر داخل ہوئے۔۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ تاریخی ”بیٹھک کاتباں“ اور وہ جھروکے دار کوٹھا اب موجود نہ تھا جہاں روایت کے مطابق برصغیر کے ایک عظیم موسیقار کی قریبی عزیزہ رقص کیا کرتی تھی۔۔ لوہاری کے آغاز میں ہر جانب خوراکوں اور مٹھائیوں کی دکانوں پر اس سویر بھی لاہوریوں کے ہجوم تھے، دنیا کے بہترین کھانے، حلوہ پوڑی، نہاری، سرخ بوٹی، سری پائے اور جانے کیا کیا، ذرا آگے جا کر ایک دوراہا آیا۔۔ ڈاکٹر انیس نے ایک نانبائی سے پوچھا کہ بھائی جی اس جگہ کو کیا کہتے ہیں تو وہ کہنے لگا ”بھا جی۔۔ یہ چوک چکلا ہے“۔۔ ڈاکٹر انیس نے حیرت سے میری طرف دیکھا ”تارڑ صاحب آپ

کے ناول ”راکھ“ کا آغاز مجھے بے حد پسند ہے کہ چار چیزیں ہیں جو ہر دسمبر میں مجھے بلاتی ہیں۔۔ قادر آباد جھیل میں مرغابیوں کا شکار، دریائے راوی کے کنارے کامران کی بارہ دری، سوات کا ایک سلیٹی منظر "اور۔۔چوک چکلا۔۔ تو میرا خیال تھا کہ چوک چکلا آپ کے تصور کی پیداوار ہے۔۔ یہ تو واقعی ہے۔۔ یہی ہے؟ ہاں۔۔ کسی زمانے میں یہاں طوائفوں کے کوٹھے تھے جن کی نسبت سے یہ چوک چکلا کہلایا، اور پھر یہ ” نام شرعی طو رپر کچھ لوگوں کی طبع پر گراں گزرا۔۔ انہوں نے اسے ایک شرعی نام دیا لیکن۔۔ لاہور کے پُرانے باسی اسے آج بھی اس کے پُرانے نام سے پکارتے ہیں“۔گلیوں میں کیچڑ بہت تھا یہاں تک کہ بجری سے لدے گدھے بھی پھسلتے تھے اور ڈاکٹر نسیم دندان ساز تو بہت ہی پھسلتا تھا کہ وہ گردن اٹھائے جھروکوں میں سے جھانکتی گھریلو خواتین کو دیکھتا تھا اور کبھی کبھار ”ہائے اوئے“ کا نعرہ لگاتا تھا۔ ہمارے ہمراہ بلوری آنکھوں والا ملک سرفراز بھی تھا۔۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ تین چیزوں کو جانتا ہے۔۔ دودھ، دہی اور مکھن کو کیونکہ وہ ایک گوجر ہے۔۔ کاغذ کے کاروبار کو اور تیل کو کہ یہی اس کا روزگار ہے۔۔ اندرون شہر میں وہ ایک شہزادہ تھا، جدھر بھی جاتا پہلوان، دکاندار، بوڑھے لاہورے اس کے آگے بچھتے چلے جاتے۔ وہ ایک حیرت انگیز شخص ہے جو خود تو ایک لقمہ بھی نہیں لیتا لیکن اپنی لاہوری خوراکوں کی دعوتوں میں دوستوں کو کھلا کھلا کر نڈھال کر دیتا ہے۔۔ مجھے اس کی آنکھیں بے حد پسند ہیں۔ اگرچہ میں متعدد بار دیکھ چکا تھا لیکن خواجہ تنویر، امجد، صدیق بلوچ، سعید بٹ اور فرزند علی کی خواہش تھی کہ وہ ”نیویں مسجد“ اور ”کنجری کی مسجد“ دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ فرزند علی وہی دراز قامت کاؤ بوائے قسم کے صاحب ہیں جو ایک ماہ ابوظہبی کے صحراؤں میں تیل تلاش کرتے ہیں اور پھر ایک ماہ کے لئے رخصت پر پاکستان آتے ہیں اور پارک کے دوستوں کے لئے دنیا کا بہترین پنیر، شہد، کریم، دہی۔۔ ٹیونا فش اور لبنانی قیمہ بھری روٹیاں، کافی اور دودھ لاتے ہیں اور کسی سویر اس عجیب پُرکیف ناشتے کا اہتمام کرتے ہیں۔۔ چنانچہ پارک میں انہیں پنیر والے صاحب کے نام سے بہت یاد کیا جاتا ہے۔ ”نیویں مسجد“ بند پڑی تھی، اس کے صحن میں اترنے کے لئے سیڑھیاں اترنی پڑتی تھیں کہ وہ بازار کی سطح سے بہت نیچے تھی۔ ”کنجری کی مسجد“ کا نام بھی ذرا گراں گزرتا تھا اس لئے آج وہ ”مائی موراں کی مسجد“ کہلاتی ہے، اور یہ موراں کون تھی۔۔ لاہور کی ایک دلربا طوائف جو ایک مور کی مانند رقص کرتی تھی اس لئے موراں کہلاتی۔۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ جس کا کہنا تھا کہ مجھے دو چیزیں پسند ہیں۔۔ ایک اتھری گھوڑی۔۔ نہیں ایک ایسی تھرکتی بے چین گھوڑی جو کسی کو اپنے اوپر سوار نہ ہونے دے اور دوسری۔۔ ایک اتھری رَن۔۔ مہاراجہ نے موراں کو اپنے حرم میں داخل کر لیا۔ اتنا گرویدہ ہوا کہ لاہور ٹکسال سے اس کے نام کا سونے کا سکہ ڈھالا گیا، محقق حضرات کے مطابق برصغیر میں موراں پہلی عورت تھی جس کے نام کا سکہ جاری ہوا۔۔ ”مائی موراں کی مسجد“ بھی مقفل تھی۔

اور تب ہم تنگ گلیوں اور نیم تاریک کوچوں میں سے گزرتے یکدم ٹھٹک گئے کہ ہمارے سامنے شہزادہ نونہال سنگھ۔۔ رنجیت سنگھ کے پوتے کی۔۔ ایک ایسی پُرشکوہ اور شاندار حویلی ظاہر ہوئی کہ ہم سب کا دم رُکنے کو آیا۔ ایک لاہوری تاج محل۔۔ جس کی پیشانی پر شیروں کے مجسمے آرام کرتے تھے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ لاہور شہر کی گھناوٹ اور بوسیدگی کے اندر ایک ایسی عمارت ہو جو الف لیلیٰ کا ایک خواب ہو۔۔ ایک مقامی مہربان نے مجھے پہچان کر دعوت دی کہ تارڑ صاحب۔۔ میرا گھر حویلی کے مقابل میں ہے اور اس کی چھت سے اس کا منظر دیکھنے کے لائق ہے۔۔ میں آپ کو لے چلتا ہوں تو ہم سب چلے۔۔ تنگ اور مختصر سیڑھیاں بمشکل چڑھتے، ہونکتے ہانپتے چھت پر پہنچے۔۔ وہاں سے حویلی نونہال سنگھ کا بالائی منظر بے (شک حیرت انگیز تھا لیکن۔۔ ڈاکٹر انیس فرش پر گرے اور بیہوش ہو گئے۔ (جاری ہے

2/2/14

داراشکوہ کا دروازہ، آنند پال اور اوم پرکاش
حویلی ن

مستنصر حسین تارڑ

ونہال سنگھ کے بالائی منظر کو دیکھنے کی چاہت میں جب ہم تنگ تاریک سیڑھیاں چڑھتے اس کے مقابل میں ایک گھر کی چھت پر پہنچے تو ڈاکٹر انیس تقریباً بیہوش ہو گئے۔
ننگے فرش پر لیٹ گئے اور بے جان سے ہو گئے اور ہم سب کی جان نکل گئی۔ اور میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے کہ انہیں اگر یہاں خدانخواستہ کچھ ہو جاتا ہے تو بیٹی تزئین کا سامنا کیسے کروں گا کہ تارڑ انکل۔۔۔ آپ کیوں میرے اسی برس سے تجاوز کرتے ابو کو ورغلا کر لے گئے۔۔۔ اور میں شرمندگی محسوس کرتا ہوں کہ اس لمحے یہ حساب کتاب کر رہا تھا کہ اگر ڈاکٹر انیس کو یہاں کچھ ہو جاتا ہے تو ہم انہیں نیچے کیسے لے جائیں گے۔۔۔ سڑھیاں تو بہت تنگ ہیں۔
تب ڈاکٹر رانجھا نے ڈاکٹر انیس کی نبض پر ہاتھ رکھا۔۔۔ ان سے کچھ سوال جواب کیے اور پھر اہل خانہ کو لانے کے لیے کہا۔ ڈاکٹر انیس نے دو چار گھونٹ بھرے اور جی اٹھے اور کہنے لگے ”میں کہاں ہوں؟“ پھر فوراً ہی “کہنے لگے ”اوہو۔۔۔ یہ سامنے حویلی نونہال سنگھ کا کیا شاندار منظر ہے۔۔۔ تارڑ ذرا دیکھیے۔۔۔
یہ ڈاکٹر رانجھا۔۔۔ ایک خوش نظر پپو قسم کے ڈاکٹر ہیں۔ اپنے دوست ناصر اعوان کے ہمراہ کبھی کبھار پارک میں چلے آتے ہیں اور میری تحریر کے متاثرین میں سے ہیں۔
مجید شیخ جو معروف صحافی ”سول اینڈ ملٹری گزٹ“ کے ایڈیٹر حمید شیخ کے بیٹے ہیں ہر ہفتے ایک انگریزی اخبار میں لاہور کے بارے میں کوئی تاریخی اور تحقیقی مضمون تحریر کرتے ہیں۔میں سمجھتا ہوں کہ منشی کنہیا لال کے بعد اگر کسی نے لاہور کے سپوت ہونے کا حق ادا کیا ہے وہ مجید شیخ ہیں۔۔۔ اُنہی کے کالم ”پارکنگ بیگ“ میں مجھ پر کھلا کہ موری دروازے کے باہر اب بھی وہ ایک ہزار برس پرانا برگد موجود ہے جہاں لاہور کے راجپوت راجہ جے پال نے محمود غزنوی سے پشاور کے قریب شکست کھا کر زندہ رہنا توہین جانا اور شاہانہ لباس میں ملبوس، اپنے عوام کے سامنے ”جوہر“ کی رسم ادا کی یعنی اپنے آپ کو آگ کے سپرد کر دیا۔۔۔ جے پال سے پیشتر اس کا باپ اور وہ بھی ایک جری شخص تھا محمود غزنوی کے سامنے نہ ٹھہر سکا۔۔۔ البتہ جے پال نے طے کر لیا کہ وہ بہر طور محمود غزنوی کا راستہ روکے گا۔ اس غرض سے اُس نے ان علاقوں کے دیگر راجوں سے رابطے کیے۔ انہیں اپنے ساتھ ملایا اور پشاور کے آس پاس محمود غزنوی کے سامنے سینہ سپر ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بے مثال بے جگری سے لڑا۔۔۔ لیکن جنگ کے دوران بہت سے راجے اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔۔۔ وہ چاہتے تھے کہ جے پال کو شکست ہو۔۔۔ اور جانتے تھے کہ محمود غزنوی بہرطور اپنے ہاتھیوں پر ہندوستان کے خزانے لدوا کر واپس غزنہ چلا جائے گا اور پھر وہ جے پال کی سلطنت پر قابض ہو جائیں گے۔ بری طرح شکست کھانے کے بعد جے پال واپس لاہور پہنچا، اپنی رعایا سے معافی کا خواستگار ہوا اور موری دروازے کے باہر ایک برگد تلے اپنی چتا تیار کر کے جل مرا۔۔۔ دراصل موری دروازہ نہ تھا۔۔۔ شہر کی فصیل میں ایک سوراخ یا موری تھی جہاں سے مردوں کو فصیل کے باہر جلانے کے لیے چوری چھپے لایا جاتا تھا۔ ان دنوں جہاں مچھلی منڈی ہے وہاں ایک شمشان گھاٹ ہوا کرتا تھا۔۔۔ اب نہ کسی موری کا نشان ہے اور نہ ہی کسی دروازے کا البتہ وہاں کم از کم تین برگد اب بھی موجود ہیں۔۔۔ حسب توقع وہاں بھی ایک لاہوری بزرگ نے ملک سرفراز کو دیکھا تو ان سے لپٹ گیا۔ چائے پانی کے لیے اصرار کرنے لگا تب میں نے پوچھا کہ بزرگو ان پرانے برگدوں میں سے کونسا برگد زیادہ بوڑھا ہے۔ اُن بزرگ نے ایک اصطبل کی جانب اشارہ کیا۔ کوٹھڑیاں، کچے گھروندے، میرا خیال ہے کہ وہ ہے، گمان غالب ہوا کہ اس برگد تلے آج سے ایک ہزار برس پیشتر راجہ جے پال نے محمود غزنوی سے شکست کھا کر زندہ رہنا اپنی راجپوتی شان کے منافی سمجھا تھا اور اپنے آپ کو آگ لگا لی تھی۔ ہم اپنی تاریخ پر ایک نظر کریں تو کیا ہم میں سے کسی نے اپنامشرقی راج پاٹ کھونے کے بعد۔۔۔ بری طرح شکست کھا کر خودکشی کی، اپنے آپ کو جلایا۔۔۔ کسی نیازی نے اس توہین کو برداشت نہ کرتے ہوئے ”جوہر“ کی رسم ادا کی۔

ملک سرفراز نے ہمیں ایک قدیم اکھاڑا دکھایا جہاں اب بھی کچھ پہلوان زور کر رہے تھے۔ ”تارڑ صاحب۔۔ آپ جانتے ہوں گے کہ اداکار اوم پرکاش ایک لاہوریا تھا اور پہلوانی کا شوقین تھا، وہ اسی اکھاڑے میں زور کیا کرتا تھا“۔

پرانی تاریخ کی پکار اپنی جگہ لیکن بھوک کی فریاد اس سے کہیں بلند ہوتی تھی۔ ناشتے کے لیے ہم نے حاجی نہاری ہاؤس کا رخ کیا۔۔ اور وہاں اس دوران عادل بھی ہمارے ساتھ تھا۔۔ اور وہ مسلسل بڑ بڑا رہا تھا۔۔ آخر یہ لاہوریے اتنے گندے کیوں ہیں، ہر جانب گندگی کے ڈھیر ہیں اور یہ اُن کے کناروں پر بیٹھے سری پائے کھا رہے ہیں۔ غلاظت سے بھری نالیوں کے ساتھ نان چھولے کھا رہے ہیں۔ گلیاں کیچڑ سے بھری ہیں اور یہ ان میں موٹر سائیکلیں چلاتے پھرتے ہیں، تاریک اور سیلن زدہ کوٹھڑیوں میں رہتے ہیں جن کے آگے کوڑے کے انبار ہیں، ہر جانب کیسی ناگوار بو ہے۔ آخر یہ لوگ بنیادی ستھرائی یا ہائی جین سے کیوں واقف نہیں ہیں، لاہور کے یہ سوکالڈ زندہ دلان اتنے غلیظ ماحول میں کیسے زندگی بسر کرتے ہیں۔ عادل ایک ہیرا شخص ہے اگرچہ وہ کبھی ہیرا منڈی نہیں گیا، اس کی حس مزاح۔۔ مشرق اور مغرب کے امتزاج سے دو آتشہ ہوتی ہے، کم از کم میں نے ایسا ہنس مکھ، گہری دانش رکھنے والا، داستان گو ایسا کہ ماڈل ٹاؤن پارک کے شجروں میں اداس بیٹھے پرندے اس کی خوش نوائی سے نہ صرف چہکنے لگیں بلکہ چہکتے چہکتے لوٹ پوٹ ہو کر درختوں سے گر جائیں، ایسا شخص نہیں دیکھا۔۔ اس کا تکیہ کلام ”بہترین“ ہے۔ گڑ کے باسی چاولوں پر دہی کی ملائی ہو۔۔ بہترین! وہ جو میڈم تھیں، شادی شدہ نہیں تھیں، بہترین۔۔ کل میں فیصل آباد گیا۔ ایک جنازہ تھا، بہترین!۔۔ بہرطور صدیق بلوچ نے زرکثیر خرچ کرکے ہمیں حاجی کی نہاری کھلائی۔۔ بہترین! بلوچ صاحب اگلے کئی روز تک پارک میں اداس پھرتے رہے۔۔ بہترین!۔۔ چونکہ وہ ایک شوقیہ گلوکار بھی ہیں اس لیے گاتے پھرے کہ ۔۔ میں زندگی میں ہر دم روتا ہی رہوں گا۔۔ حاجی نہاری کا بل اتنا زیادہ تھا کہ بلوچ صاحب۔۔ یعنی، بہترین!

اگلے اتوار کی دُھندلی سویر میں ہم سب زائرین دلی دروازے کے باہر رکتے جاتے تھے۔۔ لاہور کا دروازہ جس کا رخ دلی کی جانب تھا۔۔ جہاں سے لاہور کا گورنر داراشکوہ۔۔ جس کے نام کا شاہ دارا اب شاہدرہ کہلاتا ہے فجر کی نمازکے بعد نکلتا تھا اور اپنے مرشد میاں میر صاحب کی قبر پر حاضری دینے کے لیے پیدل جاتا تھا۔۔ اس نے راجپوتانے کا سرخ پتھر منگوایا۔۔ وہی سرخ پتھر جس سے فتح پور سیکری کے محلات تعمیر ہوئے اس لیے منگوایا کہ مرشد کی قبر تک ایک روش تعمیر کی جائے، باغ بنائے جائیں لیکن ”یہ حسرتِ تعمیر ادھوری رہ گئی، اگرچہ کراؤن پرنس تھا، شاہجہان کے تخت کا قانونی وارث تھا۔۔ لیکن اورنگ زیب جس نے بقول ابن انشاء نہ کبھی کوئی نماز چھوڑی اور نہ ہی کوئی بھائی۔ اسے معزول کیا اور قتل کروا دیا۔۔ چند تاریخ دان ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اگر اصول کے مطابق داراشکوہ مغلیہ تخت کا وارث ہوتا تو شاید مغل سلطنت کا زوال قدرے تاخیر سے ہوتا ۔ دلی دروازہ۔۔ داراشکوہ کا دروازہ ہے۔ (جاری ہے)

5/2/14

شاہی گذرگاہ، چاٹی کی لسّی اور سُریلا جاوید

مستنصر حسین تارڑ

لاہور کا دلّی دروازہ۔۔ داراشکوہ کا دروازہ ہے۔۔ وہ فجر کی نماز ادا کر کے لاہور کے گورنر ہونے کی حیثیت میں نہیں ایک مرید کے طور پر پیدل اپنے مرشد میاں میر صاحبؒ کے آستانے پر جا کر حاضری دیتا۔ اس نے اپنے مرشد کی قبر تک جانے کے لئے، اس راستے کی تعمیر کے لئے راجپوتانے سے جو پتھر منگوایا تھا پارسا اورنگ زیب نے اسے قتل کرنے کے بعد اس پتھر سے بادشاہی مسجد تعمیر کی۔۔ میں دیکھ نہیں سکا لیکن بتایا جاتا ہے کہ میاں میر صاحبؒ کے مزار کی دیوار پر اسی سرخ پتھر کی ایک سِل نصب ہے۔ یہ وہی بزرگ باکمال ہیں جنہوں نے سکھوں کے سب سے مقدس مقام دربار صاحب امرتسر کی بنیاد اپنے ہاتھوں سے

رکھی تھی۔۔ اگر میاں میر صاحبؒ آج کے زمانوں میں ہوتے تو طالبان یا ان کے ہمدرد ”دانشور“ انہیں دائرہ اسلام سے خارج کر کے ہلاک کر دیتے کہ انہوں نے کفار کے ”مکہ“ کی بنیاد رکھی۔
دلّی دروازے کے باہر۔۔ ڈاکٹر نسیم کا مہیا کردہ جاوید نام کا ایک ٹورسٹ گائیڈ ہے چینی سے ہماری آمد کا منتظر تھا۔ ہم میں سے جب کسی نے پوچھا کہ آپ ٹورسٹ گائیڈ ہیں تو یہ جاوید خفا ہو گیا۔۔ سَر میں ایک سینئر ٹورازم آفیسر ہوں۔۔ ڈاکٹر نسیم اور تارڑ صاحب کے لئے خصوصی طور پر حاضر ہوا ہوں ورنہ میں تو صرف گورے لوگوں کی راہنمائی کیا کرتا ہوں۔ اس کی لچھے دار اور پُرمزاح گفتگو سے میں نے اندازہ کیا کہ موصوف خاندانی ہیں، نہایت اُلجھے اور سُلجھے ہوئے ہیں۔۔ جاوید اندرون شہر کا پروردہ ایک جاندار شخص تھا، بات کرتا تھا تو سُر میں کرتا تھا، بلکہ سُرتال میں کرتا تھا۔۔ اس نے بتایا کہ ان کے والد صاحب ایک ماہر جانے پہچانے طبلہ نواز تھے۔۔ بعد میں اس نے مجھے اپنے ہونہار فرزند۔۔ سے بھی ملایا جو اپنے دادا کے فن کو آگے بڑھانے کے لئے طبلہ بجانا سیکھ رہا ہے۔ چنانچہ جاوید آبائی طور پر سُریلا شخص تھا جو ہمیں دلّی دروازے کے اندر شاہی حمام میں لے گیا۔۔ میں اس حمام کو دیکھ چکا تھا لیکن ابھی حال ہی میں اس کی کھدائی کے دوران کچھ قدیم آثار ظاہر ہوئے ہیں۔۔ کیسے زیرزمین گرم پانیوں کی ندیاں بہتی تھیں اور مغل شہزادیاں بھاپ آلود حمام میں غسل کرتی تھیں۔۔ دلّی دروازے میں داخل ہو کر آپ ”شاہی گذرگاہ“ کے کوچے میں چلتے ہیں۔ یہ پورا علاقہ ناروے کی مدد سے اور آغا خان پروجیکٹ کے تعاون سے دوبارہ تعمیر کیا گیا ہے۔۔ اور ”دیکھ لاہور“ کے منصوبے کے تحت اسے بہت سے لوگ، غیرملکی لوگ بھی دیکھنے آتے ہیں۔
اس شاہی گذرگاہ کے کوچے میں ایک دُھندلی سویر تھی، صبح کے ناشتے کے ٹھیلے اور خوانچے پُرہجوم ہوتے تھے۔ ایک چاٹی کی لسّی پیش کرنے والے ریڑھی والے نے مجھے پکارا ”تارڑ جی۔۔ ہم آپ کے چاہنے والے ہیں، ہماری کچی چاٹی کی لسّی کے دو گھونٹ بھر کے دیکھو۔۔ نظارے آ جائیں گے“۔۔ اس نے کچی لسّی میں تازہ مکھن کا ایک پیڑا گھولا اور گلاس مجھے تھما دیا۔۔ واقعی نظارے آ گئے۔۔ لسّی اتنی پُرکیف تھی کہ میں پوری چاٹی پی سکتا تھا۔۔ مجھے اس مہربان کا نام یاد نہیں لیکن۔۔ اے دلّی دروازے کے اندر اس دُھندلی سویر میں چاٹی کی کچی لسّی فروخت کرنے والے میں تمہارا شکرگزار ہوں اور تمہیں یاد کرتا ہوں۔
ہم پھر سے تزئین کردہ ”گلی سُرجن سنگھ“ گئے جس کے بیشتر پُرانے مکان جو شکست ہو رہے تھے انہیں نہایت عرق ریزی اور محبت سے دوبارہ بحال کیا گیا ہے۔۔ سُرجن سنگھ پُرانے لاہور کے ایک معروف حکیم اور شاعر تھے اور وہ یہاں رہتے تھے۔۔ اس گلی کی بغل میں شاید نہیں یقیناًانتہائی تنگ ترین ایک گلی ہے اور اس میں متعدد خاندان رہائش پذیر ہیں۔ یہ اتنی تنگ ہے میرے جیسا بھدّے اور موٹے بدن کا شخص آسانی سے اس میں داخل نہیں ہو سکتا، بمشکل ذرا پیٹ سکیڑ کر پہلے کندھے اندر داخل کر کے نہایت ناپ تول کر کے داخل ہو سکتا ہے۔
صرف ڈاکٹر نسیم اور ڈاکٹر انیس اپنے مختصر سراپے کے ساتھ بے دھڑک جا سکتے تھے جبکہ عادل اس گلی میں پھنس سکتا تھا، یہ اتنی تنگ تھی۔ بتایا گیا کہ اگر خدانخواستہ کوئی موت واقع ہو جائے تو چارپائی کے لئے تو جگہ نہیں ہے اس لئے متوفی کو اٹھا کر بمشکل باہر گلی سُرجن سنگھ میں لاتے ہیں اور پھر چارپائی پر ڈال کر جدھرلے جانا ہو لے جاتے ہیں۔ اس تنگ گلی میں البتہ ایک خوبی تھی کہ اگر خوباں دوسری جانب سے چلاآئے۔۔ تو آپ سے لپٹ ہی جائے۔۔ کہاں جائے۔۔ آئے ہیں اس گلی میں تو۔۔ لپٹ ہی جائیں ۔۔ جاوید مسلسل چہکتا تھا ۔۔ اور اس چہکار کے دوران اس نے کہا ”سَر۔۔ میں اب آپ کو شیش محل میں لے کر جاؤں گا۔۔ شاہی قلعے میں جو مشہور زمانہ شیش محل ہے وہاں نہیں، آج تک لوگوں کی آنکھوں !!سے پوشیدہ، ایک خفیہ، ایک ذاتی شیش محل میں۔۔آئیں
جاوید۔۔ ”میں نے اسے ڈانٹا“ تم اتنے سُریلے نہ ہو جاؤ کہ مجھے یہ خبر کرو کہ لاہور میں شاہی قلعے کے ” “شیش محل کے سوا بھی کوئی اور شیش محل موجود ہے۔۔ اگر ہے تو کہاں ہے؟
ہم میں سے بیشتر لوگ جھونپڑوں میں زندگی کرتے ہیں اور خواب دیکھتے ہیں شیش محلوں کے۔۔ تو اس زندگی میں اگر کوئی خبر کرے کہ ۔۔ شیش محل موجود ہیں، تمہاری آنکھوں سے اوجھل ہیں پر وہ ایک

حقیقت ہیں اور تم انہیں دیکھ سکتے ہو تب دل پہ کیا گزرتی ہے۔۔۔ وہی مجھ پر گزری۔
"سَر آپ نے سلطان ٹھیکیدار کا نام سنا ہے؟"
باں۔۔۔ وہ لاہور کی تاریخ کا ایک اہم شخص ہے۔ مولانا احمد علی کے مدفن کے قریب اس کی قبر ہے جہاں " میں جا چکا ہوں ۔۔۔ جس کے نام کی سلطان کی سرائے ہے، جس نے مغل عہد کے کھنڈرات سے اینٹیں اکھاڑ کر انگریزوں کے لئے عمارتیں تعمیر کیں، یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ اس نے کچھ مسجدوں کو بھی مسمار کر دیا اور اس پاداش میں اس کی موت دردناک ہوئی اور غربت میں ہوئی، لاہور کا برصغیر کا سب سے پُرشکوہ قلعہ نما ریلوے سٹیشن اسی سلطان ٹھیکیدار نے تعمیر کیا تھا، میں اس کے نام سے واقف ہوں"۔
آپ تو بہت واقف ہیں"۔"
میں نے کنہیالال کی "تاریخ لاہور" پڑھ رکھی ہے۔ فارسی اور عربی کا وہ عظیم سکالر منشی کنہیا لال۔ اس " لئے میں سلطان ٹھیکیدار کے نام سے واقف ہوں، "سلطان ٹھیکیدار نے مسجد وزیر خان کے پہلو میں اس عہد کی سب سے شاندار حویلی تعمیر کی تھی۔۔۔ ہمارے ہمراہ جو نوجوان گائیڈ نعمان چلا آتا ہے یہ حویلی اس کے دادا شیر محمد جلیل نے خریدی تھی۔۔۔ٹھیکیدار سلطان کی کوئی اولاد نہ تھی۔۔۔ اس نے ایک بچی کو گود میں لیا جس کے ہاں چار بیٹیوں نے جنم لیا، ان میں سے دو لندن چلی گئیں اور دو حیدرآباد چلی گئیں، ان چاروں نے عمر کے آخری حصے میں یہ حویلی 1968ء میں شیخ محمد جلیل کو فروخت کر دی۔۔۔ اور اُس کی بالائی منزل پر سلطان ٹھیکیدار کا شیش محل ابھی تک موجود ہے۔۔۔ تارڑ صاحب۔۔۔ آپ اور آپ کے "دوست وہ پہلے لوگ ہوں گے جو اسے دیکھیں گے۔ یہ شیش محل آج تک کسی اور نے نہیں دیکھا

12/2/14

ایاز کی قبر،اور پرانے لاہور کے نقوش
مستنصر حسین تارڑ

حویلی میاں سلطان ٹھیکیدار کی چھت پر جو سب کی نظروں سے اوجھل ایک مختصر شیش محل تھا اور اس کے کوٹھے پر سے شہر لاہور اور مسجد وزیر خان کا دھندلا سرمائی منظر تھا اس نے میری آنکھوں میں وہی پُرمسرت حیرت بھری جو تاج محل دیکھنے کے بعد میری آنکھوں میں نقش ہوئی تھی۔۔۔ یہ میری زندگی کے خوبصورت ترین تجربوں میں سے ایک تھا۔
نیچے شہر لاہور کے گلی کوچے پُررونق اور آباد تھے۔۔۔ اور ان پر حویلی دیناناتھ کا نوتعمیرشدہ چہرہ جھکتا تھا اور وہ کیسا دل نشیں تھا۔۔۔ ذرا آگے دیناناتھ کا ڈھکا ہوا قدیم کنواں تھا جس کے برابر میں کیسے خستہ پراٹھے اور کڑک چائے میسر تھی۔۔۔ ایک مزدور صبح کے ناشتے کے طور پر چنگیر میں پراٹھا رکھے چائے کے ساتھ کھاتا تھا جب سعید بٹ نے خوشبو کی تاب نہ لا کر کہا "سَر جی۔۔۔ آپ مائنڈ نہ کریں تو میں اس مزدور کی اجازت سے پراٹھے کا ایک لقمہ لے لوں"۔
خبردار" میں نے اسے ڈانٹا، اگرچہ میں بھی اسی سوچ میں تھا۔۔۔ دیناناتھ کے کنوئیں کے سامنے پیپلز " پارٹی کے سب سے وفادار سیاست دان جہانگیر بدر کے والد کی مچھلی اور پکوڑوں کی دکان اب بھی موجود ہے۔ اختلاف اپنی جگہ لیکن جہانگیر بدر نے اپنے اس خاندانی پس منظر کو کبھی نہیں چھپایا، اس پر فخر کیا ہے اور مجھے یہ فخر پسند ہے۔۔۔ وہ پیپلز پارٹی کے وڈیروں اور جاگیرداروں کے ہجوم میں ایک واقعی عوامی نمائندہ ہے۔ اگرچہ وہ بھی خاصا متموّل ہو چکا ہے۔۔۔ اور ہاں دیناناتھ لاہور کا گورنر ہوا کرتا تھا۔
سنہری مسجد کا دروازہ مقفل تھا لیکن جاوید نے سفارش کی اور وہ ہم پر کُھل گیا۔۔۔ ایک دمکتی ہوئی قدیم تاریخی مسجد جس کے گنبد سرما کی دھوپ میں روشن ہوتے تھے۔۔۔ اور تب ہم دکانوں اور مکانوں کی بھیڑ میں سے ایک تنگ راستے میں داخل ہوئے تو سنہری مسجد کے عقب میں ایک وسیع باغ ہماری نظروں میں پھیل گیا۔ یہ ممکن نظر نہ آتا تھا کہ پُرانے لاہور کے اندر اس شیش محل کی مانند ایک چمن زار بھی پوشیدہ ہو سکتا ہے۔۔۔ "یہ گورو ارجن دیو کی باؤلی والا باغ ہے" جاوید سُریلا بولتا چلا جاتا تھا "باؤلی تو کب کی معدوم ہو چکی لیکن سِکھ حضرات اب بھی اس کی یاترا کے لئے آتے ہیں"۔ ہم اس پوشیدہ باغ سے نکلے اور دائیں جانب کچھ قدم چلے تو وہاں میرا رنگ محل مشن ہائی سکول تھا، اس میں میرا بچپن ہمکتا تھا۔۔۔ اور میں 47ء میں اسی سکول کی شاندار کالونوئیل طرز تعمیر سے نکلا تھا، شہر میں کرفیو نافذ ہو چکا تھا اور میں روتا ہوا بھاگتا چلا جاتا تھا جب سرکلر روڈ کی ویرانی میں، مَیں نے اپنی زندگی کی پہلی لاش دیکھی

تھی۔۔ کچھ پہچان نہ ہوتی تھی کہ ہلاک کیا گیا شخص کس مذہب کا تھا، اس کا خون سڑک پر پھیلتا تھا اور خون سے کچھ اندازہ نہ ہوتا تھا کہ یہ ایک ہندو کا ہے یا مسلمان کا۔

رنگ محل مشن ہائی سکول کے سامنے محمود غزنوی کے ایاز کی قبر تھی۔ لاہور کے گورنر ایاز کی۔۔ اس کی قبر کے گرد تعمیر کی گئی مسجد ایاز بھی مقفل پڑی تھی۔

جاوید ہمیں ایک تنگ گلی میں لے گیا جہاں گئے زمانوں میں ”کابلی حویلی“ ہوا کرتی تھی اور اب اس کے چہرے کے کچھ آثار ، کچھ جھروکے رہ گئے تھے۔

کابلی حویلی“ والی گلی سے باہر آئے تو ایک عجیب سانحہ ہو گیا، ایک سالخوردہ، عمررسیدہ خاتون ” مجھے دیکھ کر جذباتی ہو گئیں، جھک کر کہنے لگیں ”تارڑ صاحب۔۔ میں آپ کو بچپن سے دیکھتی آئی ہوں۔۔ آپ ہمارے بزرگ ہیں، مجھے پیار دیں، ان کے سر کے بال مہندی رنگے تھے میں نے مجبوراً ان کے سر پر ایک تھپکی دی لیکن یقین کیجئے بے حد سبکی محسوس ہوئی البتہ میرے ساتھی ازحد پُرمسرت اور کمینے ہو گئے کہ تارڑ صاحب۔۔ آپ کا ایسا دردناک انجام ہونا تھا۔۔ اس دوران ایک اور برقعہ پوش خاتون ان گنت انواع و اقسام بچوں کے ہمراہ وارد ہو گئیں ”اُدھر دیکھئے، مسجد وزیر خان کے برابر میں جو مکان ہے میں وہاں سے آپ کو دیکھ کر نیچے آ گئی ہوں۔۔ آپ تو ہمارے چاچا جی ہیں، میرے بچوں کو پیار دیجئے، دعا کیجئے“۔۔ چنانچہ میں نے باری باری ہر بچے کے رخساروں کو تھپکا اور اس خاتون کے سر پر بھی مجبوراً پیار کی تھپکی دی۔۔ کیسا دردناک انجام تھا۔

انگریزوں کے زمانے میں تعمیرشدہ ”پانی والا تالاب“ کے وسیع قلعہ نما کمپلیکس نے بھی ہمیں حیران کر دیا۔ ان وقتوں میں شہر لاہور کو اسی تالاب سے تازہ اور شفاف پانی مہیا کیا جاتا تھا۔

چند قدم چلے تو ایک نو گز لمبی قبر تک پہنچے۔۔ یہ بابا نوگزے کی تاریخی قبر تھی۔۔ قبر کے احاطے کے باہر ایک کوزے میں نمک پڑا تھا۔ بابا کا ایک ملنگ نمودار ہو گیا ”حق اللہ“ اس نے نعرہ لگایا ”پیٹ میں درد ہو، مروڑ اٹھتے ہوں۔۔ سر پھٹا جاتا ہو تو بابا نوگزے کے نمک کی ایک چٹکی لے لو۔۔ سب کافور۔۔ درد دور“۔ ہم نے ایک گھر میں قید ایک مندر کا مخروطی مینار دیکھا جس میں بہت سے ہندو دیوتا نقش تھے، یہ کالی کا مندر تھا۔۔ یہ وہی کالی کلکتے والی تھی جو لاہور میں گمنام ہوئی جاتی تھی، تاریخ کی بھوک برداشت ہو جاتی ہے لیکن پیٹ کی بھوک برداشت نہیں ہو سکتی اور ہم خوراک کی تلاش میں سردار ہیرا سنگھ کے نام سے موسوم ہیرامنڈی میں آ نکلے جہاں ہیروں کی فروخت پر پابندی لگ چکی ہے البتہ موسیقی کے ساز تیار کرنے والے دنیا کے بہترین کاریگر اب بھی موجود ہیں۔۔ لاہور کی ساختہ ستار اور طبلے کی دھوم بالی وڈ میں بھی سنی جا سکتی ہے۔۔ ہیرے نہ سہی وہاں ”پھجّے کے پائے“ تو خریدے جا سکتے ہیں۔۔ اور وہاں ایک ہجوم تھا۔ پائے اور مغز کا ناشتہ کرتے ہوئے نعیم قریشی کہنے لگے ”تارڑ صاحب۔۔ ہم کس علاقے میں ہیں“ میں نے عرض کیا کہ حضور آپ ہیرامنڈی میں فروکش ہیں“ قریشی صاحب کا تو رنگ فق ہو گیا ”ہیں؟۔۔ ہیرا منڈی؟ لا حول ولا۔۔ وہ۔۔ یعنی اگر کسی نے ہمیں یہاں دیکھ لیا تو کیا ہو گا۔۔ میں نے ان کی ڈھارس بندھائی کہ قریشی صاحب اب یہ علاقہ توبہ تائب ہو کر شریف ہو چکا ہے۔۔ آپ فکر نہ کریں“۔

ہم واپس دلّی دروازے آ رہے تھے کہ سامنے سے ایک بارات آ گئی۔ ایک بے چارہ سا دولہا تھا جو زرق برق سہرے سے پاؤں تک ڈھکا ہوا تھا۔۔ اس کے پیچھے کوئی درجن بھر فلاکت زدہ سی عورتیں سر پر شادی کے صندوق اٹھائے چلی آ رہی تھیں۔ دولہے کے ہمراہ ایک ڈھول والا تھا اور اس کے برابر میں ایک لپا پوتا ہوا غریب سا خواجہ سرا یعنی کُھسرا۔۔ ڈھول بجنے لگا اور کُھسرا ناچنے لگا۔۔ باراتیوں نے اپنی معمولی حیثیت کے مطابق ناچتے ہوئے خواجہ سرا پر دس روپے کے دو تین نوٹ نچھاور کئے۔۔ سعید بٹ کو اس ناچتے ہوئے خواجہ سرا پر بے حد ترس آیا اور موصوف نے آگے بڑھ کر سو کا ایک نوٹ دولہا کے سر پر گھما کر خواجہ سرا پر نچھاور کر دیا۔۔ وہ یقین نہ کر سکا اور پُرمسرت ہو کر اپنا رقص تیز کر دیا۔۔ سعید بٹ نے ایک اور سو کا نوٹ نکالا اور کُھسرے پر وار دیا۔۔ پُرلطف بات یہ ہوئی کہ اس دوران دولہا نہایت حسرت زدہ ہو گیا کہ اسے بھی سلامی میں صرف دس دس کے نوٹ مل رہے تھے چنانچہ جونہی بٹ نے ایک اور سو کا نوٹ خواجہ سرا کی جانب بڑھایا تو دولہا میاں نے اسے دبوچ کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔۔ بعد میں، مَیں نے بٹ کو سرزنش کی کہ اس نے کیوں پانچ چھ سو روپے فضول میں نچھاور کر دیئے تو اس نے بڑی حساس توجیہہ پیش کی ”تارڑ صاحب یہ خواجہ سرا بہت غریب لگتا تھا۔۔ اسے کبھی کبھار دس کا ایک نوٹ مل جاتا تھا۔۔ آج شام جب وہ گھر جائے گا تو اس کی جیب میں پانچ چھ سو روپے ہوں گے تو وہ کتنا خوش ہو گا اور وہ اپنے لئے کوئی نیا لباس خریدنے کا منصوبہ بنائے گا، اچھا کھانا خریدے گا، آپ نے مجھے روک لیا ورنہ میں اسے اس سے زیادہ رقم دینا چاہتا تھا“۔ یہ درست کہ سلطان ٹھیکدار نے ایک شاندار شیش محل تعمیر کیا، لیکن اپنے لئے کیا، اپنے دوستوں کی عیش و عشرت کے لئے لیکن سعید بٹ نے ایک غریب خواجہ سرا کے خوابوں میں

خواہشوں کی تکمیل کا ایک شیش محل بنا دیا۔۔ اپنے رزق حلال سے اس کی حسرتوں کی آبیاری کر دی تو میرے لئے یہ شیش محل زیادہ خوبصورت اور روشن ہے

15/12/14

شہباز شریف صاحب۔۔ پلیز مجھے قید نہ کریں
مستنصر حسین تارڑ
محترم جناب وزیراعلیٰ پنجاب/ خادم اعلیٰ پنجاب!
آپ کا اقبال دائم رہے، شیر گرجتا رہے اور آپ فیض کے اسباب بناتے رہیں، پل بناتے رہیں، چاہ بناتے رہیں، یہ ناچیز بندہ نہ آپ سے پلاٹ مانگتا ہے، نہ کوئی سفارت یاوزارت مانگتا ہے اور نہ ہی مالی مدد کے لیے درخواست گزار ہے ، صرف اپنے گھر کا راستہ مانگتا ہے، قید سے رہائی مانگتا ہے۔
حضور والا۔۔ اگر ایک سویر آپ بیدار ہوں اور چاہے رائے ونڈ میں ہوں، ماڈل ٹاؤن میں ہوں یا وزیراعلیٰ ہاؤس میں ہوں اور آپ کو خدانخواستہ قید کر دیا جائے تو آپ کیسا محسوس کریں گے۔۔ یعنی آپ کو اپنے گھر سے باہر نکلنے کا راستہ نہ ملے۔۔ اگر نکل جائیں تو واپسی کا راستہ نہ ملے اور ٹریفک پولیس آپ کا چالان کرے تو آپ کیسا محسوس کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ طیش میں آ کر گرجنے لگیں گے، اور برسنے بھی لگیں گے لیکن یہ بندۂ ناچیز چونکہ ایک معمولی ادیب، قلم سے روزی کمانے والا مزدور ہے، یہ نہ گرج سکتا ہے اور نہ برس سکتا ہے۔ اگر گرجے گا تو اپنی قسمت اور بیگم پر اور برسے گا تو اپنے ہی آپ پر، اپنے آپ کو بھگولے گا اور سردی میں نمونیہ کروا بیٹھے گا۔ محترم میں اگرچہ پچھلے چالیس برس سے ملک کے مختلف اخبارات اور جرائد میں کالم نویسی کرتا رہا ہوں لیکن میں ایک معتبر اور با رسوخ کالم نویس کے طور پر اپنی پہچان نہیں کروا سکا کہ نہ میں اہل اقتدار کو بلیک میل کرنے پر یقین رکھتا ہوں اور نہ ہی مسلسل اُن کی کاسہ لیسی کر سکا ہوں، خوشامد کے معاملے میں میں ایک گھامڑ شخص ہوں۔۔ جس کے نتیجے میں نہ میرا سیاستدانوں سے میل جول ہے اور نہ ہی بیورو کریسی، اللہ کریسی اور خصوصی طور پر پولیس کے ساتھ میرے کچھ روابط ہیں۔ البتہ میرا بڑا بیٹا سول سروس کے امتحان میں سرخرو ہو کر فارن سروس میں چلا گیا۔ اس دوران اس نے سوچا کہ ذرا پولیس سروس کا ذائقہ بھی چکھ لیا جائے لیکن کچھ روز وہ اے ایس پی انڈر ٹریننگ رہا اور اس نے اپنے آپ کو پولیس سروس کے لیے ناموزوں پا کر فارن سروس میں جا پناہ لی۔۔ بے شک وہ ان دنوں نیو یارک میں یواین او میں ڈائریکٹر وغیرہ تعینات ہے لیکن میرے کس کام کا۔۔ پولیس میں ہوتا تو آج ڈی آئی جی ہوتا اور اپنے چوہتر برس کے بوڑھے باپ کے کام آتا۔ سخت نالائق ثابت ہوا ہے۔ تو وزیراعلیٰ صاحب۔۔ میرا کوئی پرُسان حال نہیں ہے۔ آپ کے در پردستک دیتا ہوں کہ مجھے اس قید سے رہائی دلا دیجیے۔۔ میں اپنے گھر میں قید ہوں یعنی ’’انڈر ہاؤس اریسٹ‘‘ ہوں۔
تفصیل اس قید کی کچھ یوں ہے کہ یہ بندۂ ناچیز، حقیر، پرُتقصیر گلبرگ کی فردوس مارکیٹ کی قربت میں جے بلاک میں پچھلے بتیس برس سے قیام پذیر ہے۔ آغاز میں ہم شاہراہ سے دائیں جانب مڑتے تھے تو مکان نمبر 22 جے آجاتا تھا۔ پھر آپ نے کیولری برج تعمیر کروایا اور اچھا کیا لیکن ہم ایک سائڈ لین کے پابند ہو گئے۔ اس پابندی کی عادت ہو گئی۔۔ اور پھر چند روز پیشتر ایک سویر بیدار ہوتے ہیں اور میری بیگم کہتی ہے کہ مجھے نثار روڈ پر واقع کیولری کے علاقے میں واقع میرے بھائی آفتاب کے ہاں لے چلو۔۔ اور ہم وہاں کیوں جانا چاہتے تھے، خاندان میں ایک اور موت ہو گئی تھی اور میں ایک ذاتی المیے کو بیان نہیں کرنا چاہتا۔۔ ہم کار پر سوار ہو کر فردوس مارکیٹ کے چوک میں نکلتے ہیں تو وہاں ہر جانب بیری کیڈ ایستادہ ہیں، رکاوٹیں کھڑی کر دی گئی ہیں جیسے فرانسیسی انقلاب کے دوران پیرس کی شاہراہوں پر مسلح جدوجہد کی خاطر بیری کیڈر موچے یا رکاوٹیں کھڑی کر دی گئی تھیں۔ معلوم ہوا کہ نہ تو ہم فردوس مارکیٹ کے چوک سے دائیں جانب مڑ کر بیگم کے بھائی اور میرے سسرال جا سکتے ہیں اور نہ ہی ہم سڑک کے پار ایم ایم عالم روڈ پر جا سکتے ہیں۔ ہمیں پہلے دو کلو میٹر کا فاصلہ طے کر کے سنٹر پوائنٹ سے پھر سے واپس آنا پڑے گا۔۔ اور اگر ایم ایم عالم روڈ یا حسین چوک جانا ہے تو پھر پہلے آپ سنٹر پوائنٹ کے راستے لبرٹی چوک پر گھوم کر لبرٹی مارکیٹ کا چکر لگا کر تین چار کلو میٹر کا فاصلہ طے کر کے حسین چک تک پہنچئے۔۔ اور اگلی سویر اگر میں ماڈل ٹاؤن پارک میں سیر کر کے واپس لوٹتا ہوں تو فردوس مارکیٹ چوک سے اپنے گھر نہیں جا سکتا۔۔ مجھے کیولری برج عبور کر کے وہی دو کلو میٹر طے کر کے واپس آنا ہو گا۔
محترم وزیراعلیٰ۔۔ فردوس مارکیٹ چوک سے جو راستے نکلتے ہیں وہ گلبرگ کے اور مکہ کالونی کے لاکھوں مکینوں کے گھروں تک جاتے ہیں اور وہ سب بند کر دیئے گئے ہیں اور ایک ٹریفک وارڈن کے بقول چونکہ

فردوس مارکیٹ کے چوک میں ٹریفک کا ہجوم ہوتا تھا اور وزیراعلیٰ جلد از جلد کیولری کے پل کے پار پہنچنا چاہتے تھے اس لیے اُن کی جانب سے یہ حکم صادر ہوا ہے۔۔ اگرچہ ان رکاوٹوں کے باوجود لاکھوں افراد کو قید کر دینے کے باوجود۔۔ اگر آپ تفتیش کریں تو کھلے گا کہ اب ٹریفک کی صورت حال سنبھلی نہیں، پہلے سے ابتر ہو گئی ہے۔ محترم وزیراعلیٰ براہ کرم جس نابغۂ روزگار نے ٹریفک کا یہ عجوبۂ روزگار فردوس مارکیٹ چوک کا ہنگامۂ دل آزار منصوبہ بنایا ہے پلیز اسے حکم دیجیے کہ وہ میرے گھر بائیس جے گلبرگ سے باہر کی دنیا میں جانے کے لیے ایک منصوبہ ایسا بنائے کہ مجھے کئی کلو میٹر خوار نہ ہونا پڑے۔ گیلنوں پٹرول نہ پھونکنا پڑے تب میں اس کی عظمت کو کھڑے ہو کر سلام کروں گا۔۔
کچھ نابنجار لوگوں کا کہنا ہے کہ چونکہ اس حلقے سے عمران خان کے امیدوار کامیاب ہوئے تھے صرف اس لیے اُنہیں یوں قید کر دیا گیا ہے۔۔ سزا دی گئی ہے۔
مجھے نہیں معلوم کہ برادر عزیز شعیب بن عزیز ”نئی بات“ میں شائع ہونے والے کالموں کو اس قابل سمجھتے ہیں یا نہیں۔۔ کہ اُنہیں تراشوں کی صورت میں آپ کو پیش کیا جائے کہ صرف شعیب کے اس شاندار شعر کی تفسیر کچھ یوں ہوئی جاتی ہے اور اوزان کا خیال نہ رکھئے گا کہ جب جان پر بنی ہو تو اوزان وغیرہ خطا ہوہی جاتے ہیں کہ۔۔ اب اداس پھرتے ہو فردوس مارکیٹ کے چوک میں، ذلیل ہوتے بھٹکتے پھرتے ہو تو۔۔ اس طرح توہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں! حضور، یہ ناچیز، غیر سیاسی کالم نگار، حقیر ادیب، ایک بوڑھا، نہ آپ سے پلاٹ مانگتا ہے، نہ کوئی سفارت یا وزارت، صرف اپنے گھر کا راستہ مانگتا ہے۔ قید سے رہائی مانگتا ہے۔ پلیز مجھے آزاد کر دیجیے

17/12/14

راچی لٹریری فیسٹول اور راج موہن گاندھی

مستنصر حسین تارڑ

کراچی کے کولونیل طرز تعمیر کے بیچ لگژری ہوٹل کے قدیم کمروں کی کھڑکی کھولئے تو سمندر کی نمکین آلودہ مہک اندر آجاتی ہے اور آپ کے بدن میں رچ کر اسے بھی نمکین اور گیلا کر دیتی ہے۔ مجھے آج سے پچاس برس پیشتر کا وہ زمانہ یاد آجاتا ہے جب میں نے اس کے ڈرائنگ روم میں زندگی کا بہترین کیکڑا اور تلے ہوئے جھینگے کھاتے تھے اور لکڑی کے فرش پر اس سہانی شام جوڑے رقص کرتے تھے۔ اُن دنوں ابھی موت کے رقص کا رواج نہ ہوا تھا، لسانی اور مذہبی تعصب نے اس فراخ دل شہر میں زہر نہ گھولا تھا۔ اگر کبھی دھماکے ہوتے تھے تو آتش بازی کے ہوتے تھے۔ گولی نہ چلتی تھی۔ بادِ نسیم چلتی تھی لیکن بے شک چار روز کے لیے ہی سہی اس بدقسمت شہر میں پھر سے زندگی درآئی۔ ذوق جمال کے آئینے سج گئے۔ ملک ملک کے ادیب، شاعر، رقاص، اداکار، سفارت کار، ہدایت کار، تاریخ دان اور فلسفی جمع ہوئے اور تاریکیوں کو عارضی طور پر زندگی کے نصاب سے خارج کر دیا۔۔ یہ پانچواں کراچی لٹریری فیسٹول تھا، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی امینہ سید کی کاوشوں کا ثمر اور آصف فرخی کی مشقتوں کا اجر۔۔ اسے تفصیل سے بیان کرنے کے لیے ایک ضخیم کتاب درکار ہے اس لیے میں اس کی سینکڑوں محفلوں میں سے چند ایک کی محض جھلکیاں پیش کروں گا۔ بیچ لگژری کے وسیع لان میں افتتاحی تقریب منعقد ہوئی جس میں امینہ سید کے علاوہ جرمن، اطالوی اور فرانسیسی سفیروں نے تقریریں کیں لیکن۔۔ جس شخص کے علم و فضل، متانت اور سادگی نے مجھے مسخر کر لیا وہ دراز قامت راج موہن گاندھی تھا، مہاتما گاندھی کا بین الاقوامی طور پر شہرت یافتہ مصنف اور فلسفی پوتا۔۔ میمونہ، میری اہلیہ بھی میرے ہمراہ تھی وہ کہنے لگی ”آخر ہمارے رہنماؤں کے بیٹے یا پوتے ایسے مفکر اور غربت کی حد تک سادہ کیوں نہیں ہوتے“ تو میں نے کہا ”پنجاب میں عجیب سے ہیئر سٹائل والا حمزہ شہباز شریف یوتھ فیسٹیول کروا رہا ہے اور ادھر سندھ میں بلاول زرداری سندھ کی ثقافت کے نام پر موئنجودڑو کے کھنڈروں کے کفن میں آخری کیل ٹھونک رہا ہے تو تمہیں اور کیا چاہیے۔۔ اے نادان عورت۔۔
راج موہن گاندھی کے ساتھ میرا ایک واسطہ تھا۔۔ دلی میں منعقد ہونے والے سارک ادیبوں کے فیسٹیول میں شرکت کے لیے روانہ ہونے لگا تو میرے بیٹے سُمیر نے مجھے اپنی آٹو گراف بک دیتے ہوئے کہا ”ابو اگر دلی میں آپ کو کوئی کام کا آدمی ملا تو اس سے دستخط کروا لینا، کاٹھ کباڑ ادیبوں اور فضول سے شاعروں کے آٹو گراف نہ لے آنا“ اور وہ ایسا کیوں نہ کہتا کہ شاعر اور ہدایت کار گلزار اس کی مصوری کی توصیف کرتے ہوئے اُسے تمہارا انکل گلزار، لکھتا تھا اور اس کی آٹو گراف بک میں گلزار کے علاوہ، منیر نیازی، مشتاق احمد

یوسفی، احمد فراز، احمد راہی، احمد ندیم قاسمی، عبداللہ حسین، انتظار حسین بھی تو تھے۔۔ انڈیا انٹرنیشنل سنٹر کے بارکم ریستوران میں ایک شب جب ”امراؤ جان ادا“ کے ہدایت کار مظفر علی ہماری میز پر موجود تھے اور میرا دوست اور چاہنے والا ونود دعا میزبان تھا، ایک دراز قامت وجیہہ شخص، کھدر کے کرتے پاجامے میں ریستوران میں داخل ہوتا ہے۔ چپکے سے اپنے لیے مخصوص ایک کونے میں بیٹھ جاتا ہے، ویٹر اس کی پسند کا کوئی مشروب مؤدب ہو کر اس کے سامنے رکھتا ہے اور وہ شخص سب سے لاتعلق ہو کر کسی گہری سوچ میں مستغرق ہو جاتا ہے۔۔ ”یہ رامو گاندھی ہیں“ ونود سرگوشی کرتا ہے ”مہاتما گاندھی کے پوتے۔۔ ایک تاریخ دان فلسفی، ہارورڈ میں پڑھاتے رہے ہیں۔ ہندوستان میں بہت کم لوگ اتنے پڑھے لکھے ہیں۔ یہاں سے قریب ایک معمولی سے سرونٹ کوارٹر میں رہتے ہیں، مہاتما گاندھی کی سادگی اور متانت نسل در نسل چلی آ رہی ہے“۔

میں سُیمر کی آٹو گراف بک تھامے ونود کے ہمراہ اُن کی تنہائی میں مخل ہو گیا۔۔ ونود نے میرا مختصر تعارف کروایا اور میں نے جھک کر کہا کہ سر۔۔ مجھے آپ کے آٹو گراف درکار ہیں۔۔ رامو گاندھی نے لاتعلقی سے کہا ”میں آٹو گراف نہیں دیا کرتا“۔۔ تب میں اپنی میڈیا کی عیاری اور ادب کی لفاظی کے ہیر پھیر کو بروئے کار لایا ”سر۔۔ دراصل مجھے آپ کے آٹو گراف درکار نہیں۔۔ میرے بیٹے نے کہا تھا کہ ابو اگر ہندوستان میں کوئی کام کا آدمی ملا تو میرے لیے آٹو گراف لے آنا۔۔ تو واپسی پر میں اسے کہہ دوں گا کہ بیٹے میری نظر میں ایک ہی کام کا آدمی آیا تھا لیکن اُس نے آٹو گراف دینے سے انکار کر دیا تھا۔ بہت بہت شکریہ“ میں جانے کو تھا کہ رامو گاندھی نے مجھے روک لیا اور ہاتھ بڑھا کر آٹوگراف بک لے لی۔۔ ”بیٹے کا نام کیا ہے؟“ ”سمیر“ میں نے کہا۔۔ ”اس کا مطلب کیا ہے؟“ ۔۔ ”اس کے دو مطلب ہیں، ایک تو گندمی رنگت کا حسین شخص اور “دوسرا ایک داستان گو، کہانیاں سنانے والاشخص۔۔

رامو گاندھی ایسا پتھر پگھل گیا، وہ کھڑا ہو گیا اور نہایت گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہنے لگا۔۔ اور اس نے کیا ہی خوبصورت فقرہ کہا جو میری یادداشت میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا ”واہ۔۔ یہ تو زبردست کمبی نیشن ہے۔۔ باپ کہانیاں لکھتا ہے اور بیٹا کہانیاں سناتا ہے، اور انہوں نے پہلے ہندی میں اور پھر انگریزی میں سمیر کا نام تحریر کر کے دستخط کر دیئے۔۔

راج موہن کے گرد بہت بھیڑ تھی اس لیے میں الگ رہا۔۔ ناشتے کے دوران وہ مجھ تنہا مل گئے تو میں نے اپنا تعارف کروا کے یہی قصہ بیان کر دیا تو وہ باقاعدہ مجھ سے لپٹ گئے، آبدیدہ ہو گئے ”آپ میرے بڑے بھائی رامو کے دوست ہیں۔۔“ میں نے شرمندگی اختیار کی ”نہیں سر۔۔ میں دوست تو نہیں، بس ایک دو ملاقاتیں ہوئی تھیں“ راج موہن جذباتی ہو گئے ”آپ جانتے ہوں گے کہ اُن کا انتقال ہو چکا ہے اور یہ صرف رامو تھے جو مجھے بہت عزیز تھے، ہمارے خاندان میں وہ سب سے لائق اور عظیم شخص تھے، آپ کی اُن سے ملاقات رہی ہے اس لیے آپ بھی مجھے عزیز ہو گئے ہیں“۔

(جاری ہے)



19/12/14

پانی پرندے اور موت کراچی میں

مستنصر حسین تارڑ

ازاں بعدجب بھی اپنی کتاب ”پنجاب۔ اے ہسٹری فرام اورنگ زیب ٹو ماؤنٹ بیٹن“ پر دستخط کرتے۔کسی دعوت کے دوران، مداحوں میں گھرے ہوئے جب کبھی مجھے دیکھ لیتے تو سب کو چھوڑ کر میرے پاس چلے آتے اور کہتے ”آپ میرے بھائی کے دوست ہیں، سمیر کا کیا حال ہے۔۔ اسے میرا پیار دیجئے گا“۔ وہ میرا ہاتھ دیر تک تھامے رکھتے۔۔ بلکہ پہلی ملاقات پر میں نے اپنا مختصر تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ میرے نام کو چھوڑیئے، یہ بہت مشکل ہے تو راج موہن کہنے لگے ”آپ بتائیے تو سہی“ جب میں نے بتایا تو انہوں نے میرے نام کو نہایت آسانی سے درست تلفظ کے ساتھ دوہرا دیا۔

اس لٹریری فیسٹیول کے دوران اگرچہ میرے لکھے ہوئے معمولی حرفوں کی بہت پذیرائی ہوئی، بے شمار محبتیں اور عقیدتیں نصیب ہوئیں لیکن میرے لئے سب سے پُرفخر اور درخشندہ وہ لمحہ تھا جب مہاتما گاندھی کے پوتے نے مجھ سے درخواست کی کہ۔۔ تارڑ صاحب۔۔ اس کتاب پر اپنے آٹوگراف دیجئے۔۔ پلیز!

جی ہاں، مہاتما گاندھی کے پوتے راج موہن گاندھی نے مجھ سے درخواست کی کہ۔۔ تارڑ صاحب۔۔ اس کتاب پر اپنے آٹوگراف دیجئے۔۔ دراصل میں سمندر میں جھولتے ہوئے ریستوران سے لوٹ رہا تھا اور اس دوران کراچی لٹریری فیسٹیول کے موقع پر وہاں سجے بُک سٹالوں میں سے گزر ہوا اور وہاں سنگ میل پبلی کیشنز

کے سٹال کے سامنے گاندھی صاحب کھڑے تھے۔۔ سٹال پر میری درجنوں کتابیں بھی نمائش پر تھیں جن میں سے دو تین کے سرورق پر میری تصویریں نمایاں تھیں۔ گاندھی صاحب ان کی جانب اشارہ کر کے بولے "میں اس شخص کو جانتا ہوں، آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ آپ اتنی کتابوں کے مصنف ہیں" اس پر میں قدرے شرمندہ ہوا اور کہا "کتابیں تو ساٹھ کے قریب ہیں لیکن میں لکھنے والا بہت معمولی ہوں۔ اور یہ ہیں بھی اردو زبان میں۔۔اگر آپ اردو جانتے تو یقیناًمیں آپ کی خدمت میں کوئی سفرنامہ یا ناول پیش کرتا۔۔ اس پر گاندھی کہنے لگے "میں اردو بول تو سکتا ہوں، پڑھ نہیں سکتا لیکن میری بیٹی سپریا اردو جانتی ہے اور میری خواہش ہے کہ آپ سپریا کے لئے کوئی اپنی کتاب عنایت کر دیجئے۔۔ اور وہاں وہ نہ صرف اردو بلکہ فارسی بھی جانتی ہے، بول سکتی ہے، پڑھ سکتی ہے"۔میں نے بک سٹال سے سفرنامہ "سنولیک" اور اپنا ضخیم ناول "خس و خاشاک زمانے" اٹھائے اور گاندھی صاحب کی خدمت میں پیش کر دیئے۔۔ وہ کہنے لگے، نہیں ایسے نہیں، ان پر سپریا کے لئے کچھ لکھ کر آٹوگراف دیجئے۔۔ چنانچہ اس فیسٹیول کے دوران میرے لئے یہ سب سے پُرفخر او ردرخشندہ وہ لمحہ تھا جب مہاتما گاندھی کے پوتے نے مجھ سے آٹوگراف حاصل کئے۔

فیسٹیول کے اختتام کے فوراً بعد ایک وسیع ہال میں میرے حوالے سے ایک تقریب کا اہتمام تھا جس کا موضوع تارڑ کی تحریروں میں "پرندے، پانی اور موت"تھا۔۔ اس تقریب کے میزبان نہایت تخلیقی کہانی کار اور نوجوان دانشور عرفان جاوید تھے جنہوں نے کمال خوبی سے اس تقریب کو بے حد سلیقے سے نبھایا۔۔ اس کی تفصیل پھر کبھی سہی لیکن مجھے ان ہزاروں لوگوں کا شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے نہایت تحمل اور محبت سے میری گفتگو سنی اور پھر بے حد پُرمغز اور سنجیدہ سوالات کئے۔۔ سامعین میں عبداللہ حسین، کشور ناہید، منیزہ ہاشمی، راحت سعید اور عاصمہ جہانگیر کی موجودگی باعث طمانیت تھی اور کچھ دیر راج موہن گاندھی بھی شریک محفل ہو گئے۔

اکثر اوقات ایسے ادبی میلوں میں، مَیں اور عبداللہ حسین اکڑھے سفر کرتے شریک ہوتے ہیں۔ ایک قدیمی دوست اور بڑے ناول نگار کی حیثیت میں وہ میرا اور مَیں ان کا خیال رکھتا ہوں اور برابر کے کمروں میں قیام کرتے ہیں۔ ()()()لگژری ہوٹل میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ چوتھی منزل پر ہیں اور مِرا کمرہ تیسری منزل پر واقع ہے تو عبداللہ حسین نے ہنگامہ کر دیا "بھئی میں گنٹھیا کا مریض ہوں، چلنے میں دشواری ہوتی ہے، میرے بائیں ہاتھ میں لاٹھی ہوتی ہے اور دائیں ہاتھ سے تارڑ کے کندھے کا سہارا لیتا ہوں تب چل سکتا ہوں، تو اب میں چلوں گا کیسے۔۔ مجھے تارڑ کے برابر والا کمرہ چاہئے ورنہ"۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ اس فیسٹیول کی درجنوں تقریبات کا تفصیلی تذکرہ کرنے کے لئے ایک کتاب درکار ہے اس لئے میں ان میں سے چند تقریبات اور کچھ یادگار لمحوں کی مختصر جھلکیاں پیش کروں گا۔

ایک ناشتے کے دوران مَیں نے اس فیسٹیول کی پردھان محترمہ رضیہ سید سے کہا کہ : خوگر حمد سے تھوڑا سا گلا بھی سن لے۔۔ یہ جو اوپن ایئر وسیع افتتاحی سٹیج ہے یہاں صرف انگریزی میں لکھنے والوں کی تقریبات طے ہیں، چاہے ان میں سے کسی ایک نے بس ایک ہی ناول لکھ رکھا ہو جبکہ اردو لکھنے والے بڑے ادیبوں کے لئے ہوٹل کے کچھ مناسب اور کچھ مختصر ہال مخصوص ہیں اور وہاں اتنا ہجوم ہو جاتا ہے کہ لوگوں کو کھڑے ہونے کی جگہ نہیں ملتی۔۔ یہ زبان پرستی تو کچھ بھلی بات نہیں۔۔ کیا عبداللہ حسین، انتظار حسین، اسد محمد خاں، کشور ناہید، زاہدہ حنا، فہمیدہ ریاض، حسن منظر وغیرہ اوپن ایئر سٹیج کے لائق نہیں ہیں۔ آپ کے کی نوٹ سپیکرز بھی بیشتر انگریزی میں لکھنے والے ہیں اور میں اردو کے چند بڑے ناموں کو بھی یہاں نہیں دیکھتا۔۔ مظہر اسلام ایسا کہانی کار، رشید امجد، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر خواجہ ذکریا، محمد کاظم، طاہرہ اقبال، خالد فتح محمد جیسے لوگ کہاں ہیں۔

عمر شاہد حامد نے "دی پرزنر"نہیں "قیدی" کے نام سے ایک ناول لکھا ہے جو پہلے ناول ہونے کی حیثیت سے اس کی تخلیقی قوت کی شاندار نمائندگی کرتا ہے۔۔ یہ کسی حد تک ایک سرگزشت ہے۔۔ عمر کے والد ایک سینئر بیوروکریٹ، کراچی میں پوسٹنگ کے دوران ایک سیاسی جماعت کے جاں نثاروں کی گولیوں سے چھلنی کر دیئے گئے۔ عمر نے سول سروس کا امتحان نمایاں حیثیت میں پاس کر کے پولیس کا محکمہ اختیار کیا اور کراچی میں پوسٹنگ کروانے کو ترجیح دی اور ۔۔ اپنے والد کے قاتلوں کی سرکوبی کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا۔۔ جی دار اور نڈر چودھری اسلم سے جینا اور نڈر ہونا سیکھا۔۔ زیرعتاب آ گئے اور انگلستان چلے گئے۔ ناول "قیدی" ان کی اپنی حیات ہے جس میں انہوں نے کراچی کے سیاسی اور مذہبی مافیا کو بے نقاب کیا ہے۔۔ عمر شاہد حامد میرے چھوٹے بیٹے سمیر کے سول سروس میں بیچ میٹ ہیں۔۔ میں نے سمیر سے پوچھا کہ عمر اس خطرناک ناول لکھنے کے باوجود کیسے کراچی فیسٹیول میں شریک ہو رہا ہے۔ اسے بوریوں سے ڈر نہیں لگتا تو اس نے کہا "ابو۔۔ وہ ڈرنے والوں میں سے نہیں ہے"۔۔ اس نے

مجھ سے ذاتی طور پر درخواست کی کہ انکل آپ نے بہرصورت میرے ناول کی تقریب میں شرکت کرنی ہے چنانچہ میں شامل ہوا اور دعاگو ہوا کہ اللہ کرے اسے کوئی گزند نہ پہنچے۔
اور وہاں عظمیٰ بھی تھی جو میرے ہاتھوں میں پلی بڑھی، میری بیگم میمونہ کی سگی بھتیجی۔۔ میرے پسندیدہ ترین برادر نسبتی، پی آئی اے کے ڈائریکٹر، اسلم خان کی بیٹی۔۔ عظمیٰ اسلم خان جو اب انگریزی ناول نگاروں میں ایک بلند مقام رکھتی ہے اور اپنا نیا ناول مجھے پیش کرتی اس پر لکھتی ہے ”پھوپھا جان کے لئے“ نہ صرف اس کے اعزاز میں ایک تقریب ہوئی بلکہ اسے ”پیس پرائز“ سے بھی نوازا گیا۔۔ بھابھی مسرت، کب کی اپنے شوہر اسلم خان کی موت پر سوگ میں تھیں، اپنی بیٹی کی پذیرائی پر آبدیدہ ہو گئیں۔
عظمیٰ سٹیج پر سے اتری اور مجھ سے لپٹ گئی ”ہیلو پھوپھا جان“ اور میں ایک پُرفخر پھوپھا جان ہو گیا۔
اس شب سمندر میں اُگے ہوئے مین گرو گھنے جنگلات روشن ہو گئے، جیسے گھرے سرسبز بادل ہوں جو سمندر پر اتر گئے ہوں اور ان میں سے چند پرندے اڑے اور وہ برف سفید تھے۔ میں نے فہمیدہ ریاض سے مخاطب ہو کر کہا ”فہمیدہ۔۔ دیکھو سرسبز بادلوں کی گھناوٹ میں سے سفید پرندے نمودار ہوئے ہیں تو وہ کہنے لگی ”تارڑ۔۔ تمہیں ہر جانب پرندے نظر آ جاتے ہیں، مجھے نظر نہیں آئے“

بدریا برس گئی اُس پار

مستنصر حسین تارڑ
روزنامہ نئی بات.
2014-02-26

شاید پندرہ برس پیشتر ٹیلی ویژن کے لاابالی پروڈیوسر یعقوب ناسک نے باقاعدہ میری منت سماجت کی کہ یار بے شک تم نے بہت یادگار شوز اور پروگراموں کی میزبانی کی ہے لیکن اپنی زبان کا بھی کوئی حق ہوتا ہے۔۔ پیسے تو کم ملیں گے لیکن میرے لئے کوئی پنجابی پروگرام کر دو اور تم جو کہو گے وہ کروں گا۔۔
یعقوب ناسک کے بارے میں تفصیل سے لکھنا ایک قرض ہے، کیسے وہ دو تین بار فوت ہو کر پھر سے زندہ ہوگیا تھا اور یہ اس کے سینے میں پیوست کر دیئے گئے ایک آلے کا کمال تھا جو ایک جھٹکے سے اس کے تھمے ہوئے دل کو پھر سے رواں کر دیتا تھا اور یہ چھوٹی سی مشین انگریز کفار نے مفت میں مہیا کر دی تھی کہ وہ اسے ایک برطانوی شہری کے باپ کے طور پر بے شک وہ پاکستانی ہو، مرنے نہیں دینا چاہتے تھے، پاکستانی کرنسی میں اس مشین کی قیمت تیس لاکھ روپے کے قریب تھی بہرحال پچھلے برس وہ بالآخر لندن میں مر گیا۔۔ بہرطور میں نے تجویز پیش کی کہ ایک ایسا پروگرام شروع کیا جائے جس میں صرف گمنام لوگ مہمان ہوں لیکن وہ ایسے بڑے تخلیق کار ہوں جن کی زمانے نے قدر نہ کی۔ پروگرام کا نام ”فوکس پنجاب“ تجویز ہوا۔۔ اس پروگرام کے لئے یعقوب ناسک اور اس کے بالکوں نے جانے کہاں کہاں سے نابغۂ روزگار لوگ تلاش کئے۔۔ میلوں ٹھیلوں میں گانے والے، دیہاتی تھیٹروں میں کام کرنے والے اداکار، گلوکار اور موسیقار۔۔ ہیر پڑھنے والے استاد حضرات جنہوں نے ہیر پڑھنے کی تعلیم دینے کے لئے باقاعدہ ڈیرے قائم کر رکھے تھے اور یہ سب اپنے فن میں یکتا تھے اگرچہ گمنام تھے۔ ایک روز یعقوب کے کمرے میں ایک ستّر برس سے تجاوز کرتی نہایت معمولی لباس میں، کوئی ملازمہ لگتی لاچار سی عورت بیٹھی تھی اور وہ میرے شو کی مہمان تھی۔ میں یعقوب کو کمرے سے باہر لے گیا ”اوئے یہ کون ہے۔۔ خدا کے لئے کیا اب میں اس قسم کی معمولی اور غریب سی عورتوں کو انٹرویو کروں گا“۔ ”تارڑ۔۔ اس سے بات کر کے دیکھو۔۔ یعقوب مسکرانے لگا“۔ کیمرے آن ہوئے تو میں نے پوچھا ”بی بی کیا آپ بتائیں گی کہ آپ کون ہیں، کیا کرتی ہیں۔۔ اپنے حالات زندگی کے بارے میں کچھ بتایئے“۔ وہ خاتون اپنی کسمپرسی میں سہمی ہوئی تھی ”تارڑ صاحب۔۔ میں تو جی اپنے کوارٹر میں بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی کہ ٹیلی ویژن والے آ گئے۔۔ میں اس سے پیشتر کبھی ٹیلی ویژن پر نہیں آئی، میری تو کچھ اوقات نہیں، پتہ نہیں ٹیلی ویژن والوں نے مجھے کیسے کھوج نکالا“۔ وہ چپ ہو گئی۔۔ میں نے ذرا بے صبری سے کہا کہ بی بی آپ براہ کرم اپنی زندگی کے بارے میں بتایئے کہ آپ کس شعبے سے منسلک تھیں۔۔ کیا کرتی تھیں۔ ”جی یہ کوئی ساٹھ برس پیشتر کی بات ہے، ہم لاہور کے رہنے والے ہیں، مجھے اور میری بہن کو گانے کا بڑا شوق تھا تو کسی نے مشورہ دیا کہ بمبئی چلے جاؤ تو ہم دونوں چلی گئیں۔۔ وہاں کچھ کام نہ ملا تو کسی نے مشورہ دیا کہ کلکتے جاؤ وہاں شاید تمہارا کام ہو جائے۔۔ اور ہمارے پاس تو کلکتہ جانے کا کرایہ بھی نہ تھا، اور ہم دو دن سے بھوکی تھیں“۔ ”پھر کیا ہوا؟“ میں نے بیزار ہو کر پوچھا۔ ”وہاں جی ہمیں پرتھوی راج تھیٹر میں کام مل گیا۔۔ پہلے ہم کورس میں گاتی تھیں پھر پرتھوی راج کو میری آواز پسند آ گئی اور میں سٹیج پر سولو گانے لگی۔۔ پھر راج صاحب نے کہا کہ تمہاری شکل اچھی ہے، آواز اچھی ہے تو اداکاری کرو تو میں ڈراموں میں اداکاری کرنے لگی“۔ ”کیا آپ نے پرتھوی راج کے ساتھ کسی ڈرامے میں سٹیج پر اداکاری کی؟“ ”ہاں جی۔۔ درجنوں بار۔۔

پرتھوی راج ہیرو تھے اور میں ہیروئن۔۔ ان میں آغا حشر صاحب کے ڈرامے بھی تھے۔۔ تارڑ صاحب۔۔ ان زمانوں میں نہ صرف کلکتہ بلکہ پورا بنگال مجھے جانتا تھا، ایک سٹیج ڈرامے میں راج کپور اور ششی کپور میرے چھوٹے بھائی بنے تھے۔۔ مجھے بھول رہا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ میرے بھائی بنے تھے“۔ میں ہراساں ہوگیا۔۔یہ بے چاری سی افلاک زدہ ملازمہ دکھائی دیتی بوڑھی خاتون کیا واقعی کلکتہ کے تھیٹر میں پرتھوی راج کی ہیروئن ہوا کرتی تھی لیکن ابھی میری حیرت کو کچوکے دینے والے کچھ اور سامان بھی تھے ”کلکتہ سے میں واپس بمبئی آ گئی اور فلموں کے لئے گانے لگی۔ سینکڑوں گانے گائے۔۔ میں نے ان زمانوں کے سب بڑے بڑے گانے والوں کے ساتھ سنگت کی۔۔ لتا منگیشکر، رفیع صاحب، مکیش صاحب۔۔ دو سو کے لگ بھگ سولو گانے بھی ریکارڈ کروائے“۔ اب میں پشیمان بھی تھااور مرعوب بھی کہ یہ خاتون، میرے سامنے سہمی ہوئی ڈری ہوئی خاتون کیا واقعی۔ ”ان زمانوں کا کوئی ایسا گیت جو آپ نے گایا اور وہ مقبول ہوا“۔ ”ہاں جی۔۔ میں نے مکیش جی کے ساتھ ایک گیت گایا تھا جو لوگوں نے بہت پسند کیا تھا۔۔ آپ نے تو نہیں سنا ہو گا۔۔ اس کے بول تھے۔۔ ”بدریا برس گئی اُس پار“ ۔ میں ایک سناٹے میں آ گیا۔۔ میرے ضخیم ناول ”خس و خاشاک زمانے“ میں بخت جہان کی ڈھے چکی حویلی کے کھنڈر میں جو گراموفون ریکارڈ تھے ان میں سے ایک ”بدریا برس گئی اُس پار“ تھا۔۔ اور وہ بخت جہان، نوّے برس کی کھولت میں، ایک اکڑی ہوئی گردن کے ساتھ، نیلی آنکھوں کی بجھتی ہوئی روشنی میں، افیون کے خمار میں یہ ریکارڈ سنا کرتا تھا۔۔ ”بدریا برس گئی اُس پار“ ان زمانوں میں پورے برصغیر میں گونجتا تھا اور اس کی گائکہ آج میرے سامنے ایک لاچار اور غربت زدہ عورت کی صورت ڈری بیٹھی تھی، میں ایک سناٹے میں آ گیا۔۔ زندگی، نصیب اور زمانے کیسے کیسے ستم ڈھاتے ہیں۔ پروگرام کے بعد وہ خاتون جس کا نام میں فراموش کر چکا یعقوب ناسک سے چند روپے رکشے کے کرائے کے لئے مانگ کر اپنے کوارٹر میں واپس گئی تھی۔ اس پروگرام کا کچھ اثر ہوا۔۔ اس کے قدیم گانوں کی کچھ کیسٹ ریلیز ہوئیں اور اسے کراچی میں ایک بڑے میوزیکل شو میں خراج تحسین پیش کیا گیا۔ اگلے برس وہ مر گئی۔۔ جانے کہاں دفن ہوئی، اگر اس کی قبر پر کوئی کتبہ ہوتا تو اس پر درج ہوتا ”بدریا برس گئی اُس پار“۔ گلوکار سریندر کی زبان میں ”کیوں یاد آ رہے ہیں گزرے ہوئے زمانے“ اس لئے یاد آ رہے ہیں کہ میں نے ابھی ابھی محمد ابراہیم ضیاء کی شاہکار کتاب ”پشاور کے فنکار“ کو شروع سے لے کر آخر تک پڑھا ہے اور ان کی تحقیق اور جستجو کا گرویدہ ہو گیا ہوں۔ بلکہ ایک اداسی میں مبتلا ہو گیا ہوں کہ کیسے کیسے نابغۂ روزگار لوگ سرزمین پشاور میں پیدا ہوئے اور آج وہ گمنام ہیں۔۔ بدریا برس گئی اُس پار۔

پیر جہاں گرداں کے اعترافات

مستنصر حسین تارڑ

05-03-2014

یکم مارچ۔۔ میں پچہتر برس کا ہو گیا ہوں۔۔ تین سالگرہ کیک، تین مختلف مقام، ماڈل ٹاؤن پارک کی صبح، ایک ہوٹل کی دوپہر، میرے گھر کی شام، اور ہر تقریب میں مختلف لوگ اور میں ”راکھ“ کے ایک کردار کی مانند، حیران پریشان، جنگل بیابان اور ان تینوں جگہوں پر ایک ہی سوال میرے ذہن میں گردش کرتا ہے کہ۔۔ کیوں، آخر میں ہی کیوں۔۔ میری اوقات ہی کیا ہے۔۔ نہ زبان پر عبور اور نہ جذبات پر قابو اور نہ ہی میں دانش کے کسی سمندر کا شناور تو پھر یہ ہزاروں لوگ مجھ پر کیوں نچھاور ہوتے جاتے ہیں، مجھے اپنی عقیدت اور محبت سے مارے ڈالتے ہیں، کہیں نہ کہیں کوئی بھید ہے جس سے میں آشنا نہیں، ان لوگوں کو کچھ خبر ہے جس کی مجھے خبر نہیں۔۔ یہ میری زندگی میں ہی میری اتنی قدر کیوں کر رہے ہیں، میرے لکھے ہوئے حرف کی اتنی توقیر کیوں کر رہے ہیں، یہ اعزاز تو اگر نصیب ہو تو مرنے کے بعد نصیب ہوتا ہے۔۔ یہ سوال، یہ ایک ہی سوال میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا جب میری پچہترہویں سالگرہ کی تینوں تقریبات پر میڈیا اور پریس کے نمائندے میرے انٹرویو ریکارڈ کر رہے تھے اور جب ایک نجی ٹیلی ویژن چینل نے اپنے پورے دن کی نشریات اور خبروں کی شہ سُرخیاں میرے لئے مخصوص کر دی تھیں اور ہر آدھ گھنٹے کے بعد میری تخلیقی حیات کی مختلف دستاویزات سکرین پر نمودار ہو رہی تھیں، کہیں نہ کہیں کوئی بھید تھا، کوئی خبر تھی جس سے میں بے خبر تھا۔۔ اور میں صدق دل سے بیان کرتا ہوں کہ اس میں میری کاوش کا ذرّہ برابر دخل نہ تھا، یہ سب کچھ جیسے غیب سے ظہور پذیر ہو رہا تھا۔

اپنی تشہیر اور خودنمائی کی خاطر اپنے قلم سے ایک کالم لکھنا بے حد معیوب حرکت ہے اور آپ آگاہ ہیں کہ میں اس کا ارتکاب کم ہی کرتا ہوں لیکن یہ بھی تو ایک معیوب بات ہے کہ آپ ایسے نایاب اور بے لوث پیار سے لوگوں کا تذکرہ ہی نہ کریں جن کا واحد جرم یہ ہے کہ وہ دور کے شہروں سے آتے ہیں اپنے محدود مالی وسائل کو میری تحریر کی چاہت کی آگ میں پھونک دیتے ہیں، میرے لئے گیت گاتے ہیں، مجھ پر بے وجہ نثار ہوتے ہیں، بے شک آپ اُن کی ذہنی حالت پر شک کیجئے کہ وہ مجھ پر ہی کیوں نثار ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود اُنہیں گمنام رکھنا، اُن کی محبتوں کا اقرار نہ کرنا بھی تو جائز نہیں۔۔ بے شک یہ لوگ ناموری اور شہرت کے طلب گار نہیں صرف میرے طلب گار ہیں لیکن میں خود کو مجرم محسوس کروں گا اگر میں

حسب معمول ایک نارمل زندگی گزارتا رہوں اُن کا تذکرہ نہ کروں، اپنے محسنوں کا نام تک نہ لوں۔۔ پہلے تو کبھی ایسا نہ ہوا تھا، میری سالگرہ کے موقع پر ایک آدھ تقریب ہو جاتی تھی پر اس یکم مارچ کو تو کچھ غدر سا برپا ہو گیا اور میں بے خبری میں اس کا شکار ہو گیا اور ہمہ وقت وہی ایک سوال، میں ہی کیوں۔۔ آخر اتنی توقیر اور محبت کیوں۔۔ یا شاید یہ میں نہیں کوئی اور ہے جس کی پذیرائی ہو رہی ہے۔۔ کہ مجھ سے بہتر لکھنے والے، اعلیٰ لکھنے والے موجود ہیں، ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے اور میرا انداز بیاں بھی کچھ اور تو نہیں ہے۔۔ تو پھر میں ہی کیوں؟ماڈل ٹاؤن پارک میں ہر سویر اُس کی ہریاول اور شجروں میں پوشیدہ پرندوں کی چہکار کے سائے سائے سیر کرنا میری زندگی کا معمول ہے۔۔ یکم مارچ کی سویر بھی ایک ایسی ہی سویر تھی اگرچہ آج صبح میری آنکھوں کی روشنائی میرے دونوں پوتے یاشار اور طلحہ مجھے متعدد "پاریاں" کر کے "ہیپی برتھ ڈے دادا" کہہ چکے تھے۔۔ میں حسب معمول اپنی کار پارک کر کے اپنی قدیم ہو چکی اہلیہ میمونہ کے ہمراہ پارک کے گیٹ پر پہنچا تو بھونچکا رہ گیا۔۔ گیٹ پر ایک بہت بڑا شاہکار نوعیت کا بینر آویزاں تھا جس پر میری نوجوانی کی ایک تصویر اور میرے سفروں کے کچھ نقش ثبت تھے اور میری سالگرہ پر مبارک کے کلمات درج تھے۔۔ یہ پہلی حیرت تھی کہ یہ اتنے پُرکشش بینر کس نے تخلیق کئے اور یہاں آویزاں کر دیئے۔۔ گیٹ کے اندر داخل ہوا ہوں تو وہاں دوستوں، اجنبیوں اور کیمروں کا ایک ہجوم۔۔ میں باقاعدہ بوکھلا گیا۔۔ میں کبھی لفظوں کی غربت سے آشنا نہ ہوا تھا اور یہاں اپنی حیات، تحریروں اور سالگرہ کے حوالوں سے کئے گئے سوالوں کے جواب میں ہکلانے لگا۔۔ سیر کرنے کا ارادہ بھی ناکام ہوا کہ کیمرے اور لوگ مجھ پر ہجوم کرتے تھے۔۔ پھر پارک کے نکھرے ہوئے ہریاول سے نچڑتے ہوئے ماحول میں زندگی کے ہر لمحے سے زبردستی مسرت کشید کرنے والا "بہترین" عادل میری سالگرہ کا اہتمام کرتا تھا، اور وہاں کیسے کیسے پیارے راج دُلارے لوگ میرا استقبال کرتے تھے، ندیم شیخ، ملک سرفراز، ڈاکٹر نسیم، ڈاکٹر انیس احمد، سیف، سعید بٹ، صدیق بلوچ، خواجہ صالح، خواجہ تنویر، فرخ رضوی، سیٹھی صاحب، چیمہ صاحب، ڈاکٹر رانجھا، فوٹوگرافر کامران سیالکوٹی، عاکف سعید، کراچی سے براہ راست ماڈل ٹاؤن پارک میں لینڈ کرتی عمارہ، اسلام آباد سے گھنگھریالے بالوں والی عطیہ ذوالفقار، شیروں کی جوڑی شیخ ایوب اور اعجاز، ڈوگر صاحب، جاوید سُریلا، میاں جاوید، گورنمنٹ کالج کے سابق وائس چانسلر خالد آفتاب، کاردار صاحب، ایم ٹی خان، قاسم اور کہاں تک نام لوں۔۔ اور پھر گُلوں میں رنگ بھرنے کے لئے فیض صاحب کی بیٹی اور میری نایاب دوست منیزہ ہاشمی ، اُن کی فخریہ پیشکش اُن کا بیٹا عدیل، محمد قوی خان، نورالحسن، عاصم بخاری، حفیظ طاہر، قاضی جاوید، صدیق چودھری، سعادت شیخ اور مجھے سب نام یاد نہیں آ رہے اور پارک کے شجروں میں چہکتے پرندے۔۔ میں باقاعدہ اپنے آپ سے حسد کرنے لگا۔۔ عادل کا فراہم کردہ لذیذ کیک اتنا خوش نما کہ اُسے کاٹنے کو جی نہ چاہ رہا تھا اور برابر میں حلوہ پوڑی اور پٹھوروں کا بھی بندوبست گرم ہو رہا تھا۔۔ جاوید اپنے ہمراہ اندرون شہر کا ایک باکمال کلارنٹ نواز لایا تھا اور جب اُس نے "بہارو پھول برساؤ میرا محبوب آیا ہے" کا الاپ شروع کیا تو عدیل کی حس مزاح پھڑکی نہیں پھڑپھڑانے لگی "تارڑ صاحب کا یہ حال بھی ہونا تھا"۔۔ اُدھر جیو ٹیلی ویژن کا میزبان حفیظ اپنے لہجے اور مخصوص لاہوری سٹائل کی پھلجھڑیاں بکھیر رہا تھا کہ یہ تقریب براہ راست ٹیلی کاسٹ کی جا رہی تھی۔ سب سے زیادہ پُرمسرت میرے پوتوں کے معصوم چہرے تھے اور یاشار ٹیلی ویژن کیمرے کے سامنے نہایت اعتماد سے کہہ رہا تھا "دادا بہت اچھے ہیں، مجھے چاکلیٹ لا کر دیتے ہیں اور مجھ سے لاڈیاں کرتے ہیں" اور میں تصور کرتا تھا کہ آج سے پچاس برس بعد اگر میرا کوئی تخلیقی نشان موجود رہا تو شاید میری یاد میں کسی تقریب کی صدارت کرتے ہوئے وہ آج کے دن کو یاد کرے گا کہ ہاں میں اپنے دادا کی پچھترہویں سالگرہ پر موجود تھا۔۔ اور اُن سے کہہ رہا تھا، آئی لَو یُو دادا۔۔ جیسے میں اپنے دراز قامت نیلی آنکھوں والے ابّا جی کو آج یاد کر رہا ہوں۔ کلام پر حیرت انگیز قدرت رکھنے والے شاعر انیس احمد میری سالگرہ پر یوں کلام کرتے تھے:

"نذر پیر جہاں گرداں"

اک عمر تری دشت نوردی کے طفیل
اک عمر تری افسانہ طرازی دیکھی
ہر رنگ میں دیکھا ہے تجھے مثل بہار
خار و خس و خاشاک سے تاخاکِ تمنا
برفیلے پہاڑوں کی تنک تیز ہوائیں
ہر لفظ میں بہتے ہوئے پانی کا بہاؤ
ہر حرف میں چشموں کی روانی دیکھی
ہر روز لکھو اب بھی کہ باقی ہیں حکایات
یہ دشتِ غزالانِ شبِ تار کی دھرتی
پیار کے اس شہر کی تازہ ہوں روایات

ہر روز ہی دیکھیں ترے افکار کی بارات
(جاری)

کیا یہ غار حرا میں اترتی چاندنی کے دھبوں کا کرشمہ ہے
مستنصر حسین تارڑ
09-03-2014
یکم مارچ۔۔۔ میں پون صدی کا ہو گیا ہوں۔ تین سالگرہ کیک۔۔۔ تین مختلف مقام اور ایک ہی سوال میرے ذہن میں گردش کر رہا ہے کہ یہ جو نوازشیں، محبتیں اور چاہت بھری عقیدتیں مجھ پر نچھاور ہو رہی ہیں جن کا میں کچھ حقدار نہیں تو ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ کوئی نہ کوئی بھید ہے جو مجھ پر آ شکار نہیں ہوتا، کوئی نہ کوئی خبر ہے جس سے میں بے خبر ہوں۔۔۔ اور کیسے کیسے نابغۂ روزگار لوگوں کے سالگرہ مبارک کے پیغام آتے چلے جاتے ہیں۔۔۔ مہاتما گاندھی کے پوتے راج موہن گاندھی کے۔۔۔ عبداللہ حسین اور میرے من پسند ہدایت کار اور شاعر گلزار صاحب کے۔۔۔ یہاں تک کہ ممبئی سے علی ظفر کا فون آتا ہے کہ انکل سالگرہ مبارک اور بہت سے دوسرے۔۔۔
ماڈل ٹاؤن پارک کی سویر میں عادل، ندیم شیخ اور تنویر خواجہ کی ترتیب شدہ تقریب کے بعد مجھے گھر پہنچ کر کچھ آرام ملا اور پھر۔۔۔ دوسری تقریب کا انعقاد ایک مقامی ہوٹل کی دسویں منزل پر واقع ہال میں ہوا۔۔۔ یہ بندوبست میرے نام کی ریڈرز ورلڈ کے اراکین کی جانب سے تھا جنہوں نے پچھلے برس بھی یکم مارچ کو ”تارڑ ڈے“ کے نام سے پکارا اور ایک پر بہار محفل کا انعقاد کیا۔۔۔ یوں تو بہت ہیں جو مجھے پڑھتے ہیں لیکن ریڈرز ورلڈ کے اراکین ایک انگریزی محاورے کے مصداق ”مرمٹنے والے شیدائی“ ہیں اور ان کی تعداد ہزاروں میں ہیں۔۔۔ بہاول نگر، سون سکیسر، اسلام آباد، کراچی اور جانے کہاں کہاں سے آئے تھے۔۔۔ صرف کراچی سے نو اراکین اس تقریب میں شرکت کے لیے لاہور پہنچے تھے۔۔۔ امریکہ میں مقیم عاکف فرید نے ریڈرز ورلڈ کی بنیاد رکھی اور اسے مستحکم کرنے کے لیے ساہیوال کی سمیرہ انجم اور کراچی کی نسرین غوری نے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔۔۔ اور اب یہ ایک بڑے خاندان کی صورت اختیار کر چکا ہے۔۔۔ یہ سب لوگ آپس میں رابطے میں رہتے ہیں۔ میری تازہ ترین کتاب کے بارے میں خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور ۔۔۔ مجھ سے والہانہ محبت کرتے ہیں۔۔۔ کراچی کی تہمینہ صابر کو گویا میری تحریروں پر گفتگو کرنے کے سوا اور کوئی کام نہیں۔۔۔ یہاں اس سالگرہ کی محفل میں سینکڑوں لوگ شامل تھے۔۔۔ فرحت بخاری جو مکمل طور پر پردہ پوش ہونے کے باوجود میرے سفر نامے ”کے ٹو کہانی“ سے متاثر ہوکر اسی پردہ پوشی میں کے ٹو کے بیس کیمپ تک جا پہنچی۔ فریال عثما ن، مومنہ، عطیہ ذوالفقار اور پھر میرے دیرینہ دوست سرور سکھیرا جس کے ”دھنک“ کے رنگ آج بھی شوخ اور پیارے ہیں۔ ایک بڑا نثر نگار ذکاء الرحمن۔۔۔ میرا جوانی کا دوست صدیق چوہدری۔۔۔
دسویں منزل پر ہوٹل کی چھت پر سالگرہ کیک پر بارش کی بوندیں گرتی تھیں اور میں تشکر اور کسی حد تک ندامت کی حالت میں اگر اپنے آپ پر قابو نہ رکھتا تو اس کیک پر میری آنکھوں میں جنم لینے والی بوندیں بھی گر سکتی تھیں۔ وہاں ایک ایسا نوجوان تھا جس نے میرا سفر نامہ ”شمشال بے مثال“ پڑھ کر شمشال کی بلند ترین چوٹی کو سر کیا ااور برفانی بلندیوں پر پہنچ کر اس نے میرے نام ایک پیغام ریکارڈ کیا مجھے تقریب میں سکرین پر دکھایا گیا۔ امریکہ کے عاکف فرید اور ایک نوجوان کے پیغام بھی سکرین پر نمودار ہوئے۔ ہم سب کو یہاں جمیل، عظمیٰ عباسی اور ڈاکٹر نازش کی کمی بے حد محسوس ہوئی۔ تقریب میں شرکت کرنے والے ہر رکن کی خدمت میں ایک خصوصی مگ پیش کیا گیا جس پر میری تصویر اور آٹو گراف نقش تھے۔
ریڈرز ورلڈ کے اراکین نے اگلی سویر لاہور کے پرانے شہر میں میری سالگرہ کی خوشی میں ایک واک کا اہتمام کیا۔ ان میں سے کچھ نے میری کتابوں کو سینے سے لگا رکھا تھا۔ سرور سکھیرا کا کہنا تھا کہ یہ ایک منفرد تقریب تھی کیونکہ وہاں موجود سب کے سب لوگ تمہیں پڑھنے والے تھے اور شاید اسی لیے ہمارے لیے پاگل ہو چکے تھے۔۔۔ دراصل سرور سکھیرا۔۔۔ ”دھنک“ اور ”مساوات“ کا ایڈیٹر بینظیر بھٹو کا پریس سیکرٹری ہی وہ شخص تھا جس نے مجھ سے ”پیار کا پہلا شہر“ لکھوایا جس کے اب تک پچپن سے زیادہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس تقریب سے واپس گھر آیا ہوں تو وہاں بھی میرے لیے حیرت کا ایک اور سامان تھا۔۔۔ مختصر صحن میں کرسیاں لگی ہیں، قالین بچھے ہیں اور چیٹر کے درخت کے سائے میں چار موسیقار میرے لیے ”ہیپی برتھ ڈے ٹو یو“ کی دھن بجا رہے ہیں۔۔۔ اور یہ شاندار اہتمام پنجاب آرٹس کونسل کی جانب سے سرکاری سطح پر کیا گیا تھا۔۔۔ کونسل کے خوش وجاہت خواجہ صاحب کے علاوہ میرے دیرینہ دوست خالد اقبال بھی موجود تھے۔۔۔ اور محترم شہباز شریف کی جانب سے مجھے پھول پیش کرنے کے لیے ننکانہ صاحب سے متعلق ایک پارلیمانی سیکرٹری صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ میں نے اُن سے گزارش کی کہ براہ کرم شہباز شریف صاحب سے میری جانب سے درخواست کیجیے گا کہ فردوس مارکیٹ میں ایستادہ رکاوٹوں کے باعث میں نہ اپنے گھر سے نکل سکتا ہوں اور نہ اس میں داخل ہو سکتا ہوں تو کیا ہی اچھا ہوتا

کہ وہ مجھے ایک گل دستہ بھیجنے کی بجائے میرے گھر کے راستے کھول دیتے۔۔۔ مجھے اس قید سے آزاد کرا دیتے۔۔۔ خواجہ صاحب نے مجھے اپنی پینٹ کردہ میری پورٹریٹ پیش کی جو نہایت لا جواب تھی۔۔۔ اورہاں ریڈرز ورلڈ کی تقریب میں ان دنوں سعودی عرب میں مقیم انجینئر عثمان تارڑ کی اہلیہ نے اپنے خاوند کی مصوری کی میری شکل بھی مجھے عطا کردی۔ یہ ایک نہایت تخلیقی ڈرائنگ تھی۔۔۔ یہاں کراچی سے آنے والی عمارہ بھی موجود تھی جو مجھ سے بات کرتے ہوئے جانے کیوں آبدیدہ ہو جاتی تھی۔۔۔ میرا مختصر صحن گل دستوں کے انبار سے بھر گیا تھا۔۔۔ موسیقار ”رم جھم رم جھم پڑے پھوار“ بجا رہے تھے کہ بارش کی بوندیں گرتی جاتی تھیں۔

مارچ کے مہینے میں ان تین تقریبات کے علاوہ بھی بہت سے اہتمام کیے گئے تھے۔۔۔ اپنے پرانے مسلم ماڈل سکول اور گورنمنٹ کالج میں پڑھنے والوں کی رفاقت میں یاد یں تازہ کرنا لیکن اس سلسلے کی آخری تقریب فیروز پور روڈ پر واقع علی آڈیٹوریم میں 23 مارچ کے دن طے ہو چکی تھی۔

اس غیر معمولی بے وجہ پذیرائی میں کوئی نہ کوئیبھید تھا جو کھلتا نہ تھا۔۔۔ میں قطعی طور پر ایک انکسار پسند، بندہ کس لائق ہے، ناچیز حقیر پر تقصیر ہے لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ میری تخلیقی اوقات کیا ہے اور وہ از حد معمولی ہے تو پھر یہ غیر معمولی پذیرائی کیوں۔۔۔ یہ عنایات کیوں۔۔۔ صحرا کے ایک حقیر ذرے پر ہی اس کے کرم کی بارش کیوں۔۔۔ شاید یہ میری دادی جان رابعہ بی بی کے ایک خواب کا کرشمہ ہے اور یہ خواب بھی پھر کبھی بیان کروں گا۔ میرے ابا جی کی نیلی آنکھوں میں اترنے والا ایک خواب ہے۔ میری امی کے دوپٹے میں سے مجھے جو خوشبو آتی تھی اس کا کمال ہے۔ ان کے سفید بالوں میں سے پھوٹنے والی سفید روشنی ہے جو مجھے روشن کرتی ہے۔۔۔ یا پھر۔۔۔ غار حرا کی اس شب میں میری پشت اس پتھریلے مقام میں ثبت ہوئی تھی جہاں میرے نبیؐ کی پشت نے آرام کیا تھا۔ میرے بدن پر چاندنی کے وہی دھبے اترے تھے اور وہاں اترے تھے جہاں جہاں وہ رسولؐ اللہ کے اطہر بدن پر اترے تھے۔۔۔ اور طائف کے اس باغ میں جہاں رسول اللہؐ نے زخمی حالت میں انگور کی ایک بیل کے سائے میں پناہ لی تھی، میں نے جہاں وہ بیٹھے تھے اس مقام پر سجدہ کرنے کی خواہش کی تھی۔۔۔ یا شاید وہ شب۔۔۔ جب میں چند لمحوں کے لیے روضۂ رسولؐ کی جالی کے سامنے یکسر تنہا تھا اور انہوں نے میرے کشکول میں اپنی شفاعت کا ایک سکہ ڈال دیا تھا جس کی کھنک آج بھی میرے کانوں میں گونجتی ہے۔

کوئی نہ کوئی بھید ہے۔ کوئی ایسی خبر ہے جس سے میں بے خبر ہوں۔۔۔ کہیں نہ کہیں کوئی راز ہے جس سے میں نا آشنا ہوں۔۔۔ آخر مجھ بے خبر اور نا آشنا پر یہ عنایات کیوں۔ اگر کوئی آشنا ہو، جسے خبر ہو وہ مجھے بتلا دے تو میں حج کا تو نہیں، ایک عمرے کا ثواب نذر کروں

کاریز کی اندھی مچھلیاں

مستنصر حسین تارڑ

12-03-2014

ٹُرپان (سنکیانگ) کے کاریز عجائب گھر کے آغاز میں ایک پکنک سپاٹ ہے، ایک تفریحی مقام ہے جہاں انگوروں کی بیلوں کے سائے میں شرقی تخت بچھے ہیں جن کے تلے ایک کاریز کے پانی بہتے ہیں جن کی سرسراہٹ مدھم اور کیف آور ہے۔۔۔ پانیوں میں مچھلیاں تیرتی پھرتی ہیں۔

”یہ کون سی نسل کی مچھلیاں ہیں؟“

ہمارے استقبال کے لئے آنے والے سیاحت کے ترپانی ڈائریکٹر کہنے لگے ”بس یہ کاریزوں میں جنم لینے والی مچھلیاں ہیں اور ہم ان کی بے حد تعظیم کرتے ہیں، ان کا شکار نہیں کرتے، انہیں اپنی خوراک نہیں بناتے کہ ان کے بغیر کاریزیں گندے جوہڑوں میں بدل جائیں، یہ کاریز میں نمودار ہونے والی کائی اور کیڑوں مکوڑوں کو کھا جاتی ہیں اور یوں پانیوں کو ستھرا اور شفاف رکھنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں“۔

کیا یہ اندھی ہیں؟“ میں نے ”سفید اندھی مچھلیوں “ کا حوالہ دیا۔”

شاید نہیں۔۔۔ لیکن میں نے ان پر کبھی غور نہیں کیا“ ڈائریکٹر صاحب مسکرانے لگے۔”

البتہ میں نے جھک کر نہایت دلجمعی سے غور کیا۔۔۔ اُن کی آنکھیں تھیں جبکہ ایرانی کاریزوں میں پائی جانے والی سفید مچھلیوں کے گلپھڑوں کے دونوں جانب کچھ بھی نہ تھا، وہاں آنکھوں کی تخلیق کے کوئی آثار نہ تھے۔

عجائب گھر کے کُھلے حصے میں کاریز کھودنے کے مختلف قدیم مراحل کو مجسموں اور ماڈلوں کی صورت میں دکھایا گیا تھا۔۔۔ وہ نہایت ابتدائی اوزار نمائش پر تھے جن کی مدد سے گئے زمانوں کے لوگ زمین کے گہرے اندھیروں میں نقب لگا کر اس کے پاتال میں اتر کر مِٹّی کے ایک دیئے کی روشنی میں کاریزیں کھودتے تھے۔۔۔ اور اُن میں سے کئی اس مشقت کے دوران دم گھٹنے یا سُرنگ مسمار ہونے پر مٹّی میں دفن ہو جاتے تھے۔۔۔ یہ جان جوکھوں کا کام تھا جسے بڑے دل والے ہی سرانجام دیتے تھے۔۔۔ ایک سفید ریش ایغور

بزرگ کھدر کے چوغے اور چوکور ٹوپی میں کاریز کے کنویں میں سے پانی نکال کر اپنے کھیتوں کو سیراب کر رہے ہیں اور وہاں ایک نہایت ابتدائی نوعیت کا قدیم چرخہ بھی تھا، لکڑی کے دو تختوں کو جوڑ کر ایک پنکھے کی صورت میں بنایا ہوا۔۔ برابر میں کوئی بہت پُرانی بجھی ہوئی بھوری ہو چکی تصویر تھی جس میں ایک ایغور خاتون نہایت چنگیزی نقش و نگار والی اسی نوعیت کے چرخے کی ہتھی گھماتی سُوت کات رہی تھی۔
گھوم چرخڑا گھوم۔۔ تیری کتن والی جیوے
اس ابتدائی تعارف کے بعد ہم نیم تاریک سُرنگوں میں داخل ہو کر زیرزمین اترنے لگے جہاں ایک گہرائی میں سینکڑوں برسوں سے رواں ایک کاریز بہتی تھی۔۔ یہ زیرزمین راستے سیاحوں کے لئے بنائے گئے تھے تاکہ وہ گہرائی میں اتر کر کاریز کے پانیوں کی روانی کا مشاہدہ کر سکیں ورنہ کاریزوں تک کوئی راستہ نہ جاتا تھا۔ سطح زمین پر جو کنویں کھودے جاتے تھے ان میں اتر کر ان کے پانیوں تک رسائی حاصل ہوتی تھی اور ان میں نہایت باقاعدگی سے کاریزوں کی صفائی اور دیکھ بھال کے ماہر لوگ اترتے تھے۔۔ دیواروں پر سیاحوں کی آگہی کی خاطر کاریز کے مصور نقش تھے۔۔ ایک حجاب پوش عورت سطح زمین پر عارضی طور پر نمودار ہونے والے کاریز کے پانیوں سے اپنا مٹی کا مرتبان لبریز کر رہی ہے۔ ایک ایغور بابا جی آستینیں چڑھائے گہرے سبز پانیوں پر جھکے وضو کر رہے ہیں۔
زیرزمین غار میں ایک ہلکی سی روشنی تھی۔ روشنی کی رفتارتو ہوتی ہے آواز نہیں ہوتی لیکن زیرزمین اندھیروں میں روپوش جانے کتنے فاصلے طے کرتی ایک کاریز کے پانیوں کی سرسراہٹ بھری آواز تو تھی۔ جہاں سے کاریز ظاہر ہوتی تھی اُس دہانے کے اوپر ایک چٹان پر فارسی رسم الخط میں ”کاریز“ نقش تھا۔ میں نے ذرا جھک کر جوانی کی آسانی سے نہیں بڑھاپے کی ناتوانی سے بمشکل جھک کر اس نیم تاریک خلاء میں جھانکا جس میں سے کاریز کے پانی کروٹیں بدلتے، سرسراتے چلے آ رہے تھے، صرف یہ جاننے کے لئے کہ کیا ان پانیوں میں کوئی ایک سفیدمچھلی ہے۔۔ نہیں تھی۔۔ اگر ہوتی۔۔ تو وہ میں ہوتا۔۔ ایک ناانصاف، مذہبی تعصب سے آلودہ، تنگ نظر اور دل آزار معاشرے میں ایک ایسی اندھی مچھلی جسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا۔۔ وہ زیرزمین اندھیاروں میں بھٹکتی پھرتی ہے، اسے کہیں بھی روشنی نظر نہیں آتی۔۔ اور وہ سدا سے نابینا نہ تھی، اس کی آنکھیں ہوا کرتی تھیں پر ان پر جبر، استبداد اور دہشت کی پٹی کس کر باندھ دی گئی اور اس پٹی کے اوپر ایک اور سیاہ پٹی تھی جو اپنی ایجادکردہ شریعت کے موت کے پیغمبروں نے باندھ دی تھی جن کے نادان بچے اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر ”کافروں“ کے گلوں پر خنجر پھیر کر انہیں ہولے ہولے ذبح کرتے تھے، ان کے سر کاٹ کر کھمبوں پر لٹکاتے تھے جیسے سلطنت روم کے زوال کے دنوں میں سرکشی کرنے والوں کو صلیبوں پر گاڑ دیا جاتا تھا، سکول جانے والی بچیوں کی ویگن کو جلا کر راکھ کر دیتے تھے، میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے والی درجن بھر بچیوں کے بدن لوتھڑوں میں بدل دیتے تھے اور۔۔کوئی بولتا نہ تھا۔۔ اگر بولتا تھا تو بچوں کے قتل کواپنی شریعت کے مطابق جائز قرار دیتا تھا۔ دُکھ تو یہ ہے کہ مذہبی سیاستدان اور کچھ صحافی اور ادیب بھی ان کی مدح سرائی کرتے تھے۔۔ تو کیا یہ میرے حق میں بہتر نہ تھا کہ میں ایک اندھی مچھلی ہوں۔۔ اگر میری آنکھیں ہوتیں تو میں خود انہیں پھوڑ لیتا کہ ایسے منظر مجھ سے دیکھے نہیں جاتے۔
کاریز کے سرسراتے ایک تاریک گپھا میں سے برآمد ہوتے پانیوں سے میں نے جھک کر اپنے چہرے پر چھینٹے مار کر اُسے نم کیا۔۔ چُلّو بھر کر انہیں اپنے حلق میں اتارا اور ایک سرد اور پُرمسرور راحت سے آشنا ہوا اور ان پانیوں میں بسی اپنی مٹی کی مہک محسوس کی جیسے ترپان اور لاہور کے درمیان مشترکہ ثقافت، تاریخ اور عقیدے کی ایسی کاریزیں ہیں جو لاہور سے بہتی چلی آتی ہیں اور ترپان میں آ کر زمین کے پاتال سے ظاہر ہو جاتی ہیں۔ پھر اس لمحے جب میں جھکا ہوا تھا، میرے چہرے پر کاریز کی خنک بوندیں سرکتی تھیں اس لمحے پانیوں کی تہ میں ریت پر سرکتی ایک مچھلی نظر آ گئی، اس کی آنکھیں نہیں تھیں پر مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھے دیکھتی ہے، کہتی ہے کہ تم بھی میری مانند حالات کے جبر سے نابینا کر دئیے گئے ہو تو وہاں کیا کر رہے ہو آؤ کاریز کے ان پانیوں کی تاریکی میں ایک نابینا حیات کرتے ہیں۔۔ اندھیروں میں اتر آؤکہ ان زمانوں میں اسی میں عافیت ہے۔۔ روشنی کی آرزو مت کرو۔
کاریز میں ریت پر سرکتی وہ اندھی مچھلی مجھ سے کلام کر کے پانیوں میں بہتی پھر سے زمین کے گہرے اندھیروں میں روپوش ہو گئی

“یہ ذوق جمال کیا شے ہے؟”
مستنصر حسین تارڑ
16-03-2014
یہ ذوق جمال کیا شے ہے۔ ابر ہے،ہوا ہے کیا ہے۔۔ جسے انگریزی میں ”ایستھیٹکس“ کہا جاتا ہے کیا ہے۔ میں نہایت آسانی سے جیسا کہ ان دنوں رواج ہے گوگل وغیرہ میں جا کر دنیا بھر کے مشاہیر ذوق جمال کی

توصیف اور تعریف کیا کرتے ہیں اُن کے حوالے دے سکتا ہوں لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ صرف اپنے ذاتی مشاہدے اور تجربات کی روشنی میں اس حس لطیف کے بارے میں کچھ بیان کروں گا۔۔ ذوق جمال کا واسطہ نہ تعلیم سے ہے اور نہ امارت سے ہے، یہ ایک آبائی حس ہوتی ہے جو آپ کے جینز کے ذریعے سفر کرتی آپ کے اندر سرایت کرتی ہے اور مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ بیشتر پاکستانی اس کا کچھ شعور نہیں رکھتے اور خاص طور پر ہم پنجابی تو اس معاملے میں کافی حد تک بے بہرہ اور بے ذوق ہیں۔۔ ہم نے صرف دودھ، دہی، پراٹھے یا کڑاہی گوشت کو ہی اپنا ذوق بنا رکھا ہے۔ موسیقی سے بہت شغف پیدا ہوا تو ڈھول بجانا شروع کر دیا۔ آپ شہر کے ثروت مند افراد کے شاہانہ گھروں میں جائیں، وہاں لاکھوں روپے کے بھڑکیلے فانوس اور پان سگرٹ والی دکانوں کی رنگ برنگی روشنیاں تو نظر آئیں گی لیکن مجال ہے دیواروں پر مصوری کا کوئی شاہکار آویزاں ہو۔۔ کوئی مجسمہ کوئی نایاب آرائش سجی ہو۔۔ اگر تصویر آویزاں ہو گی تو وہ انار کلی کے فٹ پاتھ سے خریدی ہوئی کوئی "سینری" ہو گی۔ جب کہ ہم پنجابی اپنے جن پٹھان بھائیوں کو کرخت اور کٹھور سمجھتے ہیں وہ اپنے اندر ایک لطیف حس جمال رکھتے ہیں۔ پھولوں سے اتنی محبت رکھتے ہیں کہ اُن کے آدھے پھولوں کے نام ہوتے ہیں۔ گل خان، گلاب خان، گلستان خان یا گل مکئی وغیرہ اور دیگر ناموں میں بھی اپنے ماحول اور قدرت کے مظاہر کی ترجمانی ہوتی ہے۔ دریا خان، سمندر خان، زبردست خان، ثمر آور خان وغیرہ۔۔ پختون موسیقی میں جتنی درد آمیز اثر انگیزی اور اداسی پائی جاتی ہے وہ ہمارے خطے کی کسی اور موسیقی میں محسوس نہیں ہوتی۔۔ برصغیر کے عظیم موسیقاروں کے نغموں میں خاص طور پر خواجہ خورشید انور اور نوشاد کی دھنوں میں پختون گیتوں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ ایک شام میں برات میں تھا، ایک مختصر سا باغیچہ تھا جہاں برات کے باسی اپنے بال بچوں کے ساتھ کھلی فضا سے لطف اندوز ہوتے تھے۔۔ میں نے کونے میں بیٹھے پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس ایک مزدور کو دیکھا ،اس کے دائیں ہاتھ میں ایک پھول تھا جسے وہ ایک شاہجہاں کی مانند سونگھتا تھا اور بائیں ہاتھ کو فضا میں بلند کر کے مسرت کا اظہار کرتا تھا۔ ہمارے اپنے گلگت بلتستان میں کچے اور پتھریلے گھروندوں کی دیواروں پر ٹین کے ڈبوں میں اگائے ہوئے پھول سجے ہوتے ہیں۔آپ کسی کوہ نوردی کی مہم کے دوران دشوار گزار راستوں اور مرگ صفت گھاٹیوں میں سے گزر رہے ہیں تو آپ کا کوئی ایک پورٹر، اپنا سامان اتار کر رکھتا ہے اور ایک گہری کھائی میں جان ہتھیلی پر رکھ کر اتر جاتا ہے کہ وہاں ایک پھول ہے، وہ اسے توڑتا ہے اور اپنے ٹوپی میں سجا کر مسکرانے لگتاہے۔ بس یہی ذوق جمال ہے۔

منیر نیازی نے ایک نہایت پڑھے لکھے نوجوان نقاد کے بارے میں کہا تھا کہ وہ تو پٹھان کی سائیکل ہے جس پر پلاسٹک کے گل دستے، جھنڈیاں، پھریرے اور گھنٹیاں سجی ہوئی ہیں۔ منیر اگرچہ خود پٹھان سے تھے اور انہوں نے یہ کومنٹ تحقیر کے لہجے میں دیا تھا لیکن انہوں نے انجانے میں اقرار کیا تھا کہ پٹھان ایک ذوق جمال رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنی سائیکل کو بھی پلاسٹک کے پھولوں سے ہی سہی سجاتا اور سنوارتا ہے۔ اور کیا آپ نے بنوں کے لختئی لڑکوں کا والہانہ رقص دیکھا ہے جو سر خوشی اور ذوق جمال کا ایک کمال ہے۔۔ جیسے وہ اپنے دراز گیسوؤں کو جھٹکتے موسیقی کی ردھم کے ساتھ زین پر پاؤں دھرتے ہے خود ہوتے ہیں یہ بھی ذوق جمال کا ایک پر مسرت مظہر ہے۔

اگر ہم اپنے سندھ کی جانب نظر کریں تو وہاں کے دور افتادہ فلاکت زدہ دیہات کے پس ماندہ لوگ بھی ایک قدیم ذوق جمال کی نمائندگی کرتے ہیں۔۔ میں نے ثقافت کے بارے میں منعقد ہونے والے ایک سیمینار میں برملا کہا تھا کہ اگر ہم نے پاکستانی ثقافت کا تعین کرنا ہے تو وہ یا تو وادئ سوات کی قدیم ہنر مندی ہے اور یا پھر وادئ سندھ کی صوفی روایت، وہاں کے لوک گیت، کڑھائی اور زندگی کرنے کے آداب ہیں۔ وہاں کا دھیما پن اور سرنگوں اطاعت ہے۔ یہاں مجھے عابدہ پروین یاد آ رہی ہیں جنہوں نے مجھے اسلام آباد میں اپنے گھر آنے کی دعوت دی اور پوچھا کہ تارڑ بھائی آپ کو کھانے میں کیا پسند ہے تو میں نے کہا تھا کہ عابدہ۔۔ مجھے کسی ایسی خوراک کی خواہش ہے جو خالص سندھی ذائقے کی ترجمانی کرتی ہو۔۔ میں اور میری بیگم ذرا بھٹکتے پھرے، ہمیں دیر ہو گئی اور جب ہم عابدہ کے گھر پہنچے تو وہ اپنے خاوند شیخ صاحب جو تب حیات تھے اور اپنی بیٹیوں کے ہمراہ باہر کھڑی ہماری منتظر تھیں۔ انہوں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ہمیں خوش آمدید کہا اور ہم بہت شرمندہ ہوئے کہ وہ جانے کب سے وہاں کھڑے ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔ اور کھانے میں سندھی بریانی سر فہرست تھی جس کے ذائقے میں شاہ لطیف کی شاعری کا رچاؤ تھا۔۔ سچل سرمست کی مستی کے لطف تھے اور موئنجودڑو کی قدامت کی علامتیں تھیں۔۔ عابدہ کہنے لگیں "تارڑ بھائی میں نے پوری دوپہر کچن میں کھڑے ہو کر صرف آپ کے لیے یہ بریانی پکائی ہے تو زہے نصیب آپ نے میرے پکوان کو پسند کیا"۔

عابدہ پروین جن کے صوفیانہ کلام کی درد مندی سے کل جہان گونجتا ہے، کیسی صوفی مزاج اور اپنی دھرتی سے جڑی ہوئی خاتون ہیں کہ نہ اُن میں کچھ تکبر ہے اور نہ اپنی شہرت کا کچھ فخر۔۔ ایک گھریلو عورت کی مانند اپنے ایک معمولی سے مہمان کے لیے سندس بریانی کا دیگچہ چڑھائے بیٹھی ہیں۔۔ یہ

بھی ذوق جمال کا ایک پرتو ہے--اگر ہم پاکستان سے باہر نظر کریں، بقیہ دنیا پر نظر کریں تو آج کے سعودی ذوق جمال کے سامنے میں آخری سیڑھی پر بھی نہیں ہیں۔ میں نے جدہ، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ یا ریاض میں کسی ایک سعودی کو بھی نہ خوش شکل پایا اور نہ خوش لباس پایا۔ شاہوں کے محلات میں سونے چاندی کی بھڑک تھی--- آنکھوں کو دکھ دینے والی گرچہ نہایت گراں آرائش تھی--- اور میں جس طور انہوں نے مسجد نبوی کی نو تعمیر کی اس میں امارت کے سونے چاندی کے ستون تعمیر کیے ، ان کے بارے میں لب بستہ رہتا ہوں۔ لیکن عرب ہمیشہ سے ذوق جمال سے یوں ناآشنا نہ تھے۔
میرے دل میں ہمیشہ کے لیے سجے، میرے رسول اللہؐ، ذوق جمال کا کامل نمونہ تھے۔ حسن جمال کا آخری کمال تھے۔
(عرب ہمیشہ سے اتنے کور ذوق تو نہ تھے۔ (جاری ہے

اِیں گلشن است

مستنصر حسین تارڑ

19-03-2014

عرب ہمیشہ سے اتنے کور ذوق نہ تھے۔
میرے دل میں ہمیشہ کے لئے سجے، میرے رسول اللہؐ، ذوق جمال کا کامل نمونہ تھے۔ حُسن جمال کا آخری کمال تھے--- حُسن کی پرکھ رکھتے تھے، جمال سے متاثر ہوتے تھے اور اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے منسوب مختلف احادیث نبوی میں اس کی گواہی ملتی ہے۔ رسول اللہؐ ایک کامل انسان تھے اور ان میں ذوق جمال کی کاملیت بھی مکمل تھی--- وہ اگرچہ سادہ مگر ستھرا اور دیدہ زیب لباس زیب تن کرتے اور ذرا یہ بھی تو تصور کیجئے کہ اس پوتر بدن پر جونسا لباس بھی ہوتا وہ اس کی قربت سے یوں بھی دنیا کاخوبصورت ترین لباس ہو جاتا۔ نہ صرف لباس میں بلکہ نشست و برخواست میں، گفتگو میں اور طعام میں، یہاں تک کہ عبادت میں بھی ذوق جمال کا حُسن ایسا ہوتا کہ چہرے دمک اٹھتے اور لوگوں کی آنکھوں میں چراغ روشن ہو جاتے--- ریش مبارک اور گیسو ہمیشہ چمکدار اور آراستہ ہوتے--- جن اشیائے خوردنی کی مہک پسند نہ کرتے انہیں ہاتھ نہ لگاتے---دندان مبارک ہمیشہ آبدار اور مسواک شدہ ہوتے--- اور جب کسی جانور کو پسند فرماتے تو اس کی شکل شباہت کو ملحوظ خاطر رکھتے--- اگر انہوں نے قصویٰ اونٹنی کو پسند کیا تو یہ اس کا رنگ اور چلنے کا انداز تھا جس نے ان کے دل میں گھر کیا--- مدینہ منورہ میں آمد پر بچیوں کے استقبالیہ نغموں اور موسیقی کو پسند کیا یہاں تک کہ حضرت عائشہؓ کی قربت میں گیت گانے والی بچیوں کی نغمگی سے لطف اندوز ہوئے--- اُحد کی جنگ میں جب زخمی ہوئے تو صحابہ کرام ”چڑیوں کی مانند اُڑتے ہوئے“ ان کے پاس آئے اور پینے کے لئے جو پانی پیش کیا وہ قدرے گدلا تھا تو پیاس کے باوجود اسے پینا پسندنہ کیا اور پھر حضرت علیؓ اپنی ڈھال میں کچھ شفاف پانی لے کر آئے تو رسول اللہؐ نے اسے اپنے حلق سے اتارا--- ایسے نفیس طبع اور ذوق جمال والے تھے--- اور اس موضوع کے لئے جو وسعت بیاں اور تفصیلی تذکرے درکار ہیں ان کے لئے تو کئی دیوان درکار ہیں، اس مختصر مضمون میں یہ سکت کہاں کہ رسول اللہؐ کے ذوق جمال کو بیان کرے۔
چنانچہ عرب ہمیشہ سے اتنے کور ذوق اور حِس جمال سے عاری تو نہ تھے--- مسلمانوں میں، میں نے البتہ ایرانیوں کو ذوق جمال سے بہت آراستہ پایا--- محض حافظ، سعدی اور عمر خیام کے حوالے کافی ہیں، مولانا روم کی حُسن پرستی اور مظاہر قدرت سے شیفتگی یا فردوسی کی شاعری اپنی جگہ لیکن میرا مشاہدہ ہے کہ ایک عام ناخواندہ ایرانی بھی ذوق جمال کی ایک لطیف آبائی حِس کا مالک ہوتا ہے--- چھٹی کے روز بیشتر ایرانی خاندان کھلی فضا میں کسی دریا کے کنارے، کسی صحرا کی قربت میں، کسی جنگل میں جا کر پکنک کا اہتمام کریں گے۔ میں نے ایک غریب مزدور کو دیکھا جو بس پر سوار ہو کر تہران سے باہر دریائے خراج کے پتھریلے کناروں پر جا بیٹھتا ہے--- کسی پتھر پر چادر بچھا کر اس پر ایک تربوز یا چند کھیرے سجاتا ہے، کوئی پسندیدہ مشروب پیتا ہے اور ٹیپ ریکارڈر پر حافظ کی کوئی غزل سنتا جھومتا ہے اور قریب سے گزرنے والوں کو دعوت طعام دیتا ہے۔ ایرانیوں کی گفتگو بھی نہایت لچھے دار ہوتی ہے۔ ایک ویٹر آپ کی

انگلیوں کی تعریف کرے گا، آپ پر قربان ہوتا چلا جائے گا چاہے وہ بعد میں آپ کے سامنے نہایت بدذائقہ خوراک پیش کر دے اور بل ایسا لے آئے کہ آپ کنگال ہو جائیں۔
میرے ایک قدیمی دوست پنجابی کے ایک بڑے نثرنگار اور شاعر حسین شاہد نے ہالینڈ میں منتقل ہونے سے پیشتر چند برس ایران میں قیام کیا۔ وہ اپنی موجودہ رہائش سے مطمئن نہ تھے چنانچہ انہوں نے اپنے دفتر کے کچھ ایرانی ساتھیوں سے درخواست کر رکھی تھی کہ وہ ان کے لئے کسی مناسب رہائش کا بندوبست کر دیں، تو ان میں سے ایک صاحب نے پیشکش کی کہ آقا حسین شاہد میری ملکیت میں ایک گھر ہے جو آئندہ ماہ خالی ہوجائے گا اور وہ آپ کے لئے ہو گا اور آقا۔۔ اس میں تو ایک گلشن ہے۔۔ چنانچہ اس دوران سب لوگ ان کی قسمت پر رشک کرتے رہے کہ آقا حسین شاہد ایک ایسے گھر میں قیام کریں گے جس میں گلشن ہے۔۔ یعنی گلشن دارد۔۔ بالآخر جب وہ گھر خالی ہوا اور وہ صاحب حسین شاہد کو لے کر وہاں گئے تو بقول حسین شاہد، ایک دس فٹ بائی دس فٹ کا ایک معمولی سا صحن تھا اور اتنا ہی ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جو ستھرا تو تھا پر قدرے مختصر تھا چنانچہ شاہد نے پوچھا ”آقا گلشن کجا است؟“ اور یاد رہے کہ شاہد بھی ایک شعر وہ اس دوران خواب دیکھتے رہے تھے کہ میرا ایک گھر ہو گا اور اس میں ایک گلشن ہو گا اور میں انگور کی بیلوں اور گلاب کے پھولوں اور چہکتی بلبلوں وغیرہ کے سائے میں بیٹھ کر شاعری کیا کروں گا۔۔ تو ان صاحب نے دروازے کی چوکھٹ کے ساتھ ویران صحن کے ایک کونے میں جو ایک پژمردہ سی بیل تھی اس کی جانب اشارہ کر کے کہا ”ایں گلشن است“۔
چنانچہ یہ تو آپ کا حُسن نظر ہے کہ ایک قطرے میں دجلہ دیکھ لیں، ایک نڈھال سی بیل کے چند پتوں کو گلشن تصور کر لیں۔
عمر خیام بھی تو اگر خواہش کرتے تھے تو شراب کتاب محبوب کے علاوہ ایک ایسے ہی گلشن کے تصور میں شاعری کرتے تھے، یہی ذوق جمال ہے۔ ابن انشا نے بھی تورکنا باد ندی کا سراغ لگایا جس کی توصیف میں شعراء نڈھال ہوئے جاتے تھے اور وہ ندی نہ تھی ایک گدلی سی نالی تھی۔
کبھی کبھار۔۔ یعنی کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے کہ اگر ہمارے ہاں ذوق جمال کا کسی حد تک فقدان ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ ہمیں دنیا کے دیگر خطوں کی نسبت قدرت نے کچھ زیادہ ہی مالا مال کر دیا ہے۔۔ہمارے پاس اتنی کثرت اور فراوانی ہے۔۔ ہریاول، جنگلوں، پانیوں، خوراکوں، چہروں، جانوروں، صحراؤں اور پہاڑوں کی کہ ہم ان کی قدر نہیں کرتے۔ یعنی اپنے عظیم شاعروں کے کلام میں کھوج کیجئے، یہ میرؔ ہو، غالبؔ ہو یا داغؔ ۔۔ حرام ہے کہ ان کی شاعری میں رنج و الم۔۔ محبوب کی بے وفائی اور موت کے تذکروں کے سوا قدرت کے مناظر کی کہیں توصیف ہو۔۔ اگر کہیں گلشن ہے تو اس حد تک کہ۔۔ چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے۔۔ اور یہ بھی طے نہیں ہے کہ گلشن نام کی کوئی طوائف ہے جس کا کاروبار نہیں چل رہا۔۔ البتہ پنجابی اور سندھی شاعری میں قدرتی مناظر کے بیان کمال کے ہیں۔۔ وہ بھٹائی کے صحرا ہوں یا خواجہ فرید کی روہی ہو۔۔ خوشحال خان خٹک کے چٹیل پہاڑ ہوں۔۔ یہ سب اُن کی شاعری کی لینڈ سکیپ میں رنگ بھرتے ہیں۔
!تو یہ ذوق جمال کیا شے ہے۔۔ ابر ہے، ہوا ہے، کیا ہے
گلاب کے پھولوں کے انبار کو دیکھ کر صرف یہ خیال آنا کہ سبحان اللہ ان سے ایک پورا مرتبان گلقند کا تیار ہو سکتا ہے جسے ہم نوش کریں گے یا پھر کسی ایک گلاب کے پھول کو سونگھ کر شاعری پر آمادہ ہو جانا، مست ہو جانا۔۔ ذوق جمال کیا ہے؟

خشونت سنگھ: ایک ڈرٹی اولڈ مین کی موت

مستنصر حسین تارڑ
23-03-2014

میانوالی ائیر بیس کو فضائیہ اور پاکستان کے عظیم ہیرو ایم ایم عالم کے نام کرنے کی تقریب سے واپسی پر میں میاں طاہر سلیم کے ذاتی جہاز سیسنا میں واپس لاہور آ رہا تھا جب دریائے جہلم کے ادھر خوشاب کے نواح میں طاہر نے ایک چھوٹے سے قصبے کی جانب اشارہ کیا، یہ ہڈیالی کا قصبہ ہے، کیا آپ اسے جانتے ہیں! ”ہڈیالی؟“ میں نے حیرت سے کہا ”میں آج اسے پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں اور وہ بھی چھ ہزار فٹ کی

بلندی سے۔۔ یہاں خشونت سنگھ پیدا ہوا تھا۔۔ اسی شام میں ”ریڈنگز“ کی بک شاپ میں جاتا ہوں تو محمود مجھ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ”تارڑ صاحب، بابا سنچری نہیں کر سکا، ننانوے پر آؤٹ ہو گیا ہے“ ”کونسا بابا؟“ ”خشونت سنگھ مر گیا ہے“ میں ایک نامعلوم سناٹے میں آگیا۔۔ اس کی موت کی خبر سے اتنا نہیں جتنا اس احساس سے کہ یہ اتفاق نہیں ہو سکتا کہ میں آج پہلی بار خشونت سنگھ کی جائے پیدائش کے اوپر سے گزرتا ہوں اور اسی روز اس کی موت کی خبر آجاتی ہے۔ اگر یہ اتفاق نہیں تو اور کیا ہو سکتا ہے۔۔ میں کبھی خشونت سنگھ سے نہیں ملا لیکن میں اسے اپنے کئی دوستوں کی نسبت زیادہ جانتا ہوں کہ اس کی شخصیت اور تحریروں نے زندگی بھر مجھے مسرت کے قریب رکھا، انسانیت اور فراخ دلی کے قریب رکھا۔۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ میں اس گرینڈ اولڈ مین سے دِلی طور پر محبت کرتا تھا۔۔ 1992ء میں میں نے کسی دوست کے کہنے پر اسے اپنا ناول ”بہاؤ“ روانہ کیا اور اس کی جانب سے مجھے ایک پوسٹ کارڈ موصول ہوا جس پر لکھا تھا ڈیئر تارڑ۔۔ میں تمہیں جانتا ہوں۔۔ میری بینائی کم ہوتی جا رہی ہے اس لیے شاید میں اسے پورا نہ پڑھ سکوں، تم مجھے معاف کر دینا۔۔ پھر مجھے دہلی میں منعقد کردہ سارک ادیبوں کی کانفرنس میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا اور میں نے اپنے دوست ونود دعا سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں اس شہر میں صرف تین لوگوں سے ملاقات کرنے کا تمنائی ہوں۔۔ قرۃ العین حیدر، امرتا پریتم اور خشونت سنگھ۔۔ قرۃ العین حیدرنے جس روز اپنے ہاں کھانے کا اہتمام کیا اس روز میں تاج محل دیکھنے جا رہا تھا۔۔ امرتا پرتیم اتنی علیل تھیں کہ بستر سے اُٹھ نہ سکتی تھیں۔۔ البتہ خشونت سنگھ نے میری آمد پر مسرت کا اظہار کیا اور ونود سے کہا کہ ہفتے کے روز تم اور تارڑ ڈنر پر میرا ساتھ دو گے اور ہم دیر تک باتیں کریں گے۔۔ اور میں مجبور تھا کہ میری پرواز لاہور کے لیے ایک زور پہلے تھی۔۔ ونود نے اصرار کرتے ہوئے کہا، تارڑ جی، خشونت سنگھ بہت کم لوگوں کو ڈنر کے لیے اپنے گھر مدعو کرتے ہیں۔ آپ کے لیے وہ کوئی خاص جذبات رکھتے ہیں ورنہ وہ تو وزیراعظم ہندوستان کو بھی چائے پر ٹرخا دیتے ہیں تو آپ روانگی مؤخر کر دیں، لیکن یہ ممکن نہ ہوا۔۔ مجھے پاکستانی ادیبوں کے ہمراہ واپس آنا پڑا۔۔ یوں میں نے خشونت سنگھ کو کبھی نہ دیکھا، آج اس کا آبائی گاؤں دیکھا اور اس لمحے وہ مر چکا تھا۔۔

وہ ایک ایسا سردار تھا جو سرداروں کے لطیفے جمع کر کے اُنہیں شائع کرتا تھا اور ان پر قہقہے لگاتا تھا۔۔ ”ٹرین ٹو پاکستان“ اور ”دلی“ جیسے کلاسیک ناولوں کا مصنف تھا۔۔ اگرچہ وہ مذہب پر یقین نہ رکھتا تھا لیکن اسے کسی گورو ددوارے یا مسجد میں داخل ہو کر سکون ملتا تھا۔۔ ”ٹائمز آف انڈیا“ کا ایڈیٹر رہا۔۔ اندرا گاندھی کے خاندان کے بہت قریب رہا۔۔ ہندوستان پارلیمنٹ کا ممبر رہا۔۔ سکھوں کی طویل تاریخ قلمبند کی۔۔ بے مثال کالم نگار تھا اور اس کی خود نوشت روسو کی آپ بیتی کے ہم پلہ ٹھہرتی ہے کہ اس نے بھی اپنی تمامتر برائیوں اور خامیوں کا اعتراف کیا لیکن یہ بھی اعلان کیا کہ روز آخر اگر وہاں کوئی ہوا تو میں کہوں گا کہ ذرا یہ دیکھ لو کہ کیا کسی انسان نے ایسے اعترافات بھی کیے ہیں، مجھے داد دو۔۔ ایک عظیم مصنف، دانشور، تاریخ دان، انسانیت پرست ہونے کے علاوہ پاکستان اور لاہور سے اس کی جو محبت تھی وہ مجھے اس کے قریب لاتی ہے۔۔ جیسے پاکستان میں ایسے بہت سے ”محب الوطن “ اور متشرع لوگ ہیں جو ان لوگوں کو حقارت اور تذلیل کا نشانہ بناتے ہیں جو ہندوستان سے دوستانہ نہ سہی بہتر تعلقات کی خواہش کرتے ہیں، اسی طور، اصل میں دونوں ایک ہیں، ادھر ہندوستان میں بھی تعصب اور مذہبی منافرت میں نچڑتے ہوئے لوگ موجود ہیں جو ہر اس شخص پر حملہ آور ہو جاتے ہیں جو پاکستان سے دوستی اور محبت کے رشتے استوار کرنا چاہتا ہے۔ خشونت سنگھ زندگی بھر اس جرم کی سزا کاٹتا رہا کہ وہ پاکستان اور مسلمانوں کے لیے دل میں ایک نرم گوشہ رکھتا تھا۔۔ سرحد کے دونوں جانب زہریلے لوگوں کی کمی نہیں ہے اور وہ ہمیشہ مذہب کی آڑ میں شکار کھیلتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے اپنی خود نوشت ”کار جہاں دراز ہے“ میں لکھا ہے کہ جب وہ ”ٹائمز آف انڈیا“ کے ادبی حصے کی انچارج تھیں اور خشونت سنگھ ایڈیٹر تھے تو ہمیشہ کہتے ”عینی ۔۔ اگر تمہیں کوئی ایسا افسانہ موصول ہوتا ہے جس کا معیار مناسب نہیں اور وہ کسی مسلمان کا لکھا ہوا ہے تو اسے رد نہیں کرنا، شائع کرنا ہے“ دہلی شہر کے درمیان میں خشونت سنگھ کی اربوں روپوں کی وسیع جائیداد ہے اور وہ وہاں ایک مختصر سے پرانے مکان میں رہا کرتا تھا۔۔ اس نے اپنی زندگی میں یہ ساری جائیداد خلق خدا کی رفاہ کے لیے وقف کر دی تھی۔۔ مکان کے اندر داخل ہوتے ہی دروازے کے اوپر ایک فریم میں جڑا کلمہ شریف آویزاں تھا۔۔ وہ رسول اللہؐ سے بھی بے پناہ عقیدت رکھتا تھا۔۔ میرے چھوٹے بیٹے سمیر کانزدیکی دوست علی حسنین پچھلے برس دلی گیا۔وہ خشونت سنگھ کی تحریروں کا شیدائی تھا لہٰذا اس کے گھر جا پہنچا اور وہاں جو مراثھی دربان تھا اس کے پاؤں چھوئے کہ میں سردار صاحب سے ملنے آیا ہوں تو وہ کہنے لگا ”بابا، ادھر تو ہجاروں لوگ صاحب کو ملنے آتا ہے، وہ نہیں مل سکتا“ اس پر علی حسنین نے کہا ”آپ اُن کو کہیے کہ میں اُن کے عزیز ترین دوست منظور قادر کے شہر لاہور سے آیا ہوں“ اگلے لمحے علی حسنین دھوپ سینکتے خشونت سنگھ کے ساتھ بیٹھا تھا۔۔ وہ منظور قادر اور ان کے خاندان سے عشق کرتا تھا۔۔ اس کی ہر تحریر میں منظور قادر کا تذکرہ ہے۔ لاہور مجبوراً

چھوڑتے ہوئے خشونت سنگھ اور اس کے خاندان نے اپنے حویلی نما مکان کی چابیاں منظور قادر کے سپرد کر دی تھیں اور وہ ایک عرصہ اس کی دیکھ بھال کرتے رہے کہ ان دنوں اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ یہ قتل و غارت عارضی ہے ہم اپنے گھروں کو لوٹ آئیں گے۔۔ خشونت سنگھ جتنی بار لاہور آیا۔۔ وہ سب سے پہلے منظور قادر کی قبر پر گیا اور اس کی یاد میں آنسو بہائے۔۔
علی حسنین کو خشونت سنگھ نے اگلے روز آنے کو کہا۔۔ اور اگلے روز سردار جی کی ننانویں سالگرہ تھی اور علی حسنین سالگرہ کیک کا ذائقہ ابھی تک یاد کرتا ہے۔۔ اس نے خشونت سنگھ کی موت کی خبر سنتے ہی سمیر کو فون کیا کے ابو کو بتا دو کہ ہمارا بابا مر گیا ہے۔ (جاری ہے)

خشونت سنگھ، تم جہاں بھی ہو خوش رہو

مستنصر حسین تارڑ

26-03-2014

چنانچہ بابا خشونت سنگھ ننانوے پر آؤٹ ہو گیا، خواہش کے باوجود سنچری نہ کر سکا۔۔ علی حسنین کا کہنا ہے کہ جب وہ اگلے روز خشونت سنگھ کے گھر پہنچا تو سردار جی زبردست موڈ میں تھے، سکھوں کے لطیفے سنا رہے تھے، لاہور کی باتیں کر رہے تھے اور درمیان میں ہندوستان اور دنیا بھر سے سالگرہ مبارک کے فون جو چلے آتے تھے انہیں اٹینڈ کر رہے تھے۔۔ وزیراعظم، صدر، گورنر، ادیب، صحافی سب ان کو خراج تحسین پیش کر رہے تھے اور سردار جی کہہ رہے تھے کہ جی تو چاہتا ہے کہ سنچری کر جاؤں، نہ کر سکا تو بھی میں نے زندگی کی اننگ کھیلتے ہوئے بہت انجائے کیا ہے۔
خشونت سنگھ کو صرف کالموں میں سمونا، دریا نہیں، سمندر کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے اور اسے بند نہیں کیا جا سکتا اس لئے اس کی حیات کی محض چند جھلکیاں جو مجھے یاد آ رہی ہیں۔
کسی نے پوچھا کہ سردار جی آپ یہ فرمائیں کہ لاہور اور دلّی میں کیا فرق ہے۔۔ خشونت نے سر ہلا کر کہا ”بھئی جب میں لاہور گیا تو مجھے کنیئرڈ کالج میں مہمان خصوصی کے طور پرمدعو کیا گیا۔ تقریر کے دوران میں نے ہال میں براجمان سینکڑوں لڑکیوں میں سے کسی ایک ایسی لڑکی کو تلاش کرنا چاہا جو شکل کی اچھی نہ ہو۔۔ ایک بھی نہ تھی۔۔ پچھلے ہفتے میں یہاں دلّی کے ایک گرلز کالج میں بلایا گیا تو تقریر کرتے ہوئے میں نے ہال میں بیٹھی ہوئی لڑکیوں میں سے کسی ایک ایسی لڑکی کو تلاش کیا جس کی شکل اچھی ہو۔۔ ایک بھی نہ تھی۔۔ یہ فرق ہے لاہور اور دلّی میں“۔
خشونت سنگھ 1915ء میں اس جہلم دریا کی قربت میں واقع قصبے ہڈالی میں پیدا ہوا جسے میں نے آج پہلی مرتبہ ایک سیسنا ہوائی جہاز میں پرواز کرتے دیکھا۔۔ وہ اپنے قصبے کے بارے میں لکھتا ہے کہ اگرچہ سکھ اور مسلمان ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے، دوستیاں بھی بہت تھیں لیکن ان کے درمیان عقیدے اور ثقافت کے فاصلے تھے۔ مسلمان عام طور پر زمین کے جھگڑوں اور باہمی عداوتوں کا شکار رہتے تھے، قتل و غارت سے بھی گریز نہ کرتے تھے لیکن خوشاب کے یہ مرد نہایت دراز قامت اور خوش شباہت ہوتے تھے۔۔
خشونت کا باپ ایک بہت بڑا ٹھیکیدار تھا، برصغیر کے امیر ترین افراد میں شمار ہوتا تھا۔ خشونت نے کچھ عرصہ لاہور ہائی کورٹ میں وکالت کی جہاں وہ منظور قادر کی شرافت اور ذہانت کا معتقد ہوا۔۔ ہائی کورٹ کے عین سامنے جہاں اب بھی عینک ساز ای پلومر کی دکان ہے وہاں اس کا پُرتعیش فلیٹ تھا۔
دلّی میں کناٹ پیلس کی بیشتر عمارتیں اس کے والد نے تعمیر کروائی تھیں۔ اس نے ایک سفارت کار کے طور پر دنیا بھر میں ہندوستان کی نمائندگی کی۔ اس کا قلم کسی بھی پابندی کو نہ مانتا تھا۔۔ اس کی تحریر پڑھتے ہوئے باعفت بیبیوں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے اور شرفاء ”رام رام“ یا ”لاحول ولا“ بڑبڑانے لگتے تھے لیکن اسے پڑھتے ضرور تھے۔۔ سکاچ وہسکی کے ساتھ اس کی خاندانی وابستگی تھی جو دادی صاحبہ سے لے کر والدہ کے آخری دموں تک چلی آتی تھی۔ اگرچہ کوئی ایک شخص ایسا نہیں جو یہ دعویٰ کرے کہ اس نے کبھی سردار جی کو ”ٹُن“ حالت میں دیکھا ہو کہ وہ توازن پر یقین رکھتا تھا۔ نوّے برس کی عمر تک ٹینس کھیلتا رہا۔ گھر میں ایک تختی پر لکھا تھا ”مہمان حضرات سے درخواست ہے کہ وہ دس بجے تک رخصت ہو جائیں“ تاکہ سردار صاحب اپنے بستر پر دراز ہو جائیں۔ شنید ہے کہ ایک ہندوستانی وزیراعظم ان

کے ہاں ڈنر پر تشریف لائے اور بیٹھے ہی رہے، اور تب ان کی اہلیہ نے کہا "مسٹر وزیراعظم۔۔ آپ شاید یہ تختی نہیں پڑھ سکے" چنانچہ وزیراعظم نے معذرت کی اور رخصت ہو گئے۔
اندرا گاندھی کے ساتھ نہایت قریبی خاندانی تعلقات کے باوجود جب اس نے دربار صاحب امرتسر پر کرنیل سنگھ بھنڈرانوالا پر فوج کشی کی تو خشونت نے احتجاج کے طو رپر اپنے تمام سرکاری اعزازات واپس کر دیئے۔۔ اندرا کے قتل کے بعد پورے ہندوستان اور خاص طور پر دلّی میں جس طور سکھوں کا بہیمانہ قتل عام ہوا اس کی تصویر کشی "دلّی" ناول میں کمال کی ہے۔۔ وہ نہ صرف غالب کا پرستار تھا بلکہ میر او رداغ کے شعر بھی اسے ازبر تھے۔
ایک روزاس کی پوتی نے اس کے ساتھ لاڈ کرتے ہوئے پوچھا "دادا، کیا آپ ایک ڈرٹی اولڈ مین ہیں!"خشونت کو دھچکا سا لگا کہ میری پوتی کیا کہہ رہی ہے۔۔ پوچھنے پر پوتی نے کہا "دادا، آپ کی ایک کہانی میرے نصاب میں شامل۔۔ آج استانی اسے پڑھاتے ہوئے کہنے لگیں، بچو یہ جو خشونت سنگھ ہے ناں یہ ایک ڈرٹی اولڈ مین ہے۔۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ میں آپ کی پوتی ہوں" اگلے روز سردار صاحب پوتی کے سکول پہنچ گئے اور اس استانی سے کہنے لگے "بی بی۔۔ میں نے آپ کے ساتھ کون سا ڈرٹی کام کیا ہے جو آپ مجھے ڈرٹی اولڈ مین کے خطاب سے نوازتی ہیں"۔
اور ہاں خشونت سنگھ کی شادی کے مہمانوں میں قائداعظمؒ بھی شامل تھے۔۔ وہ ان کے والد کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔۔ اس کی آپ بیتی میں میری پسندیدہ امرتا شیر گِل کا بھی تفصیلی تذکرہ ہے۔۔ جس کی ماں ایک ہنگیرین خاتون تھیں اور باپ ایک سکھ سردار سردار شیر گِل نام کا شیر گِل علامہ اقبال کے بہت عزیز دوستوں میں سے تھا۔ بلکہ علامہ اپنے پیرس کے قیام کے دوران اسی کے شاندار گھر میں ٹھہرے اور وہیں پر شیرگِل نے حضرت علامہ کی وہ یادگار تصویر اپنے کیمرے میں محفوظ کی جس میں وہ ایک فلسفیانہ سوچ میں متغرق ہیں اور ان دنوں یہی تصویر اس عنوان کے ساتھ شائع ہوتی ہے کہ حضرت علامہ اقبال پاکستان کے قیام کا خواب دیکھتے ہوئے۔۔ جبکہ دراصل وہ اس لمحے زکام سے نڈھال تھے اور ایک صوفے پر آرام کر رہے تھے تو شیر گِل نے یہ تاریخی تصویر کھینچی۔۔ یہ حوالہ علامہ اقبال کی مجلس اقبال کی شائع کردہ ایک حیات اقبال میں درج ہے۔
خشونت سنگھ نے امرتا شیر گِل کے بارے میں جو لکھا وہ یہاں درج نہیں کیا جا سکتا، توفیق ہو اور ایمان عزیز نہ ہو تو خود ہی پڑھ لیجئے گا۔
آج صبح ماڈل ٹاؤن پارک میں میرے ساتھ سیر کرنے والے دوست بھی خشونت کو یاد کرتے تھے۔۔ڈاکٹر انیس احمد کہنے لگے "تارڑ صاحب کیا ہم اس کی موت پر۔۔ انا للہ وانا علیہ راجعون۔۔ پڑھ سکتے ہیں"۔۔ تو میں نے کہا کہ کیوں نہیں۔۔ اس دنیا میں جو بھی نفس ہے اس نے اللہ کی جانب ہی لوٹنا ہے چاہے وہ یقین نہ بھی رکھتا ہو"۔ خشونت بابا تم اب جہاں بھی ہو خوش رہو کہ تم نے خلق خدا کو خوشی دی اور اگر کہیں نہیں ہو تو بھی لودھی گارڈن کے آتش کدے میں جلائے جانے کے بعد جو تمہاری راکھ ہے وہ بھی خوش رہے۔۔ اور یہ راکھ جہاں دفن ہو گئی اس کا کتبہ خشونت سنگھ نے سعادت حسن منٹو کی مانند پہلے سے لکھ رکھا تھا اور یہ اس کا آزاد اردو ترجمہ ہے۔
یہاں وہ شخص دفن ہے جس نے نہ انسان کو بخشا اور نہ خدا کو۔۔"
اس کے لئے اپنے آنسو مت ضائع کرو کہ وہ ایک اخلاق باختہ
گھاس کا ٹکڑا تھا۔
بیہودہ تحریریں لکھتا تھا جن کو وہ مزاح سمجھتا تھا۔
خدا کا شکر ادا کرو کہ وہ مر گیا ہے، وہ واہیات شخص"۔
خشونت سنگھ کی مغفرت تو کہاں ہونی ہے۔۔ لیکن، عجب آزاد مرد تھا۔

یم ایم عالم بیس میانوالی اور سی ون تھرٹی
مستنصر حسین تارڑ

30-03-2014

میں ایک گمشدہ شہری گائے ایئر فورس کے وی آئی پی لاؤنج میں دبکا ہوا بیٹھا تھا اور میرے آس پاس ادھیڑ عمر چھریرے بدن کے متعدد حضرات آپس میں خوش کلامیاں کرنے میں مشغول تھے اور ان میں سے تقریباً نصف درجن کے قریب پاکستان فضائیہ کے سابق سربراہ تھے اور بقیہ سربراہی تک پہنچتے پہنچتے رہ گئے تھے۔ ان کے ہمراہ ان کی بیگمات بھی تھیں لیکن وہ قدرے فربہ ہو رہی تھیں۔ میرے سامنے براجمان ایک باوقار اگرچہ عمر رسیدہ خاتون بار بار مجھے غور سے دیکھتیں اور کہتیں۔ میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔۔ اور میں مسکرا دیتا۔۔ کچھ دیر بعد خفا سی ہو کر کہنے لگیں، میں نے آپ کو کہاں دیکھا ہے۔۔ تو میں نے صورت حال سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا، خاتون، میری شاہ عالمی میں بچوں کے کھلونوں کی دکان ہے شاید مجھے آپ نے وہاں دیکھا ہو۔۔ انہوں نے سر ہلایا پھر زور زور سے ہلایا۔۔ نہیں کہیں اور دیکھاہے ۔۔ اس پر میرے برابر میں بیٹھے ایک دیرینہ شناسا اور ایئر فورس کے افسر باسط نے کہا، خاتون تارڑ صاحب ایک ادیب ہیں، شاید آپ نے ان کی کوئی کتاب پڑھی ہو۔۔ اردو کے بڑے اچھے لکھنے والے ہیں، وہ ناک چڑھا کر بولیں، میں اردو نہیں پڑھتی۔۔ یہ انگریزی میں کیوں نہیں لکھتے۔۔ تو میں نے انہیں کہاں دیکھا ہے۔۔ میں نے زچ ہو کر کہا ہی ہی ایک زمانے میں میں ٹیلی ویژن پر نمودار ہوا کرتا تھا، شاید آپ نے مجھے وہاں دیکھا ہو۔۔ انہوں نے پھر سر ہلایا۔۔ میں ٹیلی ویژن نہیں دیکھتی۔۔ آپ کو کہاں دیکھا ہے۔۔ اس دوران ایئر فورس کی پی آر او سکوڈرن لیڈر جمیلہ افراتفری میں چلی آئیں، مجھ سے کچھ معذرت کی اور پھر میرے ناول ”اے غزال شب“ پر آٹو گراف لیے اور کہنے لگیں ”میں ان دنوں آپ کا ناول۔۔ ”خس و خاشاک زمانے“ پڑھ رہی ہوں۔ اس کے بعد یہ غزال والا پڑھوں گی“۔۔ مجھے واقعی حیرت ہوئی کہ ایئر فورس والے تو صرف فلائٹ مینول پڑھتے ہیں، ناول وغیرہ کیسے پڑھنے لگے۔یہ جمیلہ ہی تھیں تو پچھلے کئی روز سے میرے کان کھا رہی تھیں کہ سر۔۔ میانوالی ایئر بیس کو ایم ایم عالم ایئر بیس کا نام دیا جا رہا ہے۔۔ اور ایئر چیف کی خواہش ہے کہ آپ اس تقریب میں شامل ہوں۔۔ ہمارا آپ پر حق ہے کہ آپ نے ایئر فورس کے بارے میں پہلا ٹیلی ویژن سیریل ”شہپر“ تحریر کیا تھا اور مجھے خوشی بے پایاں ہوئی کہ بالآخر ایئر فورس کو اپنے سب سے بڑے ہیرو ایم ایم عالم کا خیال آ ہی گیا جب کہ برسوں پہلے ایئر فورس نے متعدد پائلٹوں کے نام اپنی بیسوں کو دیئے تھے لیکن ایم ایم عالم کو ہمیشہ ایک اچھوت سمجھا گیا۔۔ شاید اسی لیے کہ اس نے ایئر فورس کے ایک چیف کی کرپشن پر بے شمار سوال کیے تھے، تحریری احتجاج کیا تھا تو اس ایئر چیف نے پاکستان کی فضائی تاریخ کے سب سے بڑے ہیرو کو جبری طور پر ریٹائر کر دیا تھا۔۔ ایم ایم عالم ایک درویش شخص تھا اس نے پنشن لینے سے انکار کر دیا اور عسرت میں زندگی بسر کی۔۔ اسے بنگلہ دیش کی جانب سے پیشکش کی گئی کہ وہ پاکستان ترک کر کے بنگلہ دیش آ جائے اور اسے وہاں کی ایئر فورس کی سربراہی سپرد کر دی جائے گی۔۔ ایم ایم عالم نے انکار کر دیا۔۔ اس کے خون میں پاکستان کی محبت گردش کرتی تھی، اس کی رگوں میں صرف پاکستان کا آسمان تھا۔۔ ایک ایسا ملک جس کے ہیرو دہشت گرد اور سفاک قاتل ہوں وہاں ایم ایم عالم کی گنجائش نہ تھی۔۔ پھر شاید ایسا ہوا کہ اس سے محبت کرنے والے، اسے اپنا گرو ماننے والے معتقد لوگ ایئر فورس کے سربراہ ہو گئے اور انہوں نے میانوالی ایئر بیس کو ایم ایم عالم کے نام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔۔ مجھے اس تقریب میں شمولیت کا دعوت نامہ ملا تو میں نے کچھ گریز نہ کیا، فوراً آمادگی ظاہر کر دی کہ ایم ایم عالم کے ساتھ میری ایک وابستگی رہی ہے اور اس کی وفات پر لکھے جانے والے دو کالموں میں میں نے اس کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ مختصراً یہ کہ میں اسے 1975ء میں دمشق کے پاکستانی سفارت خانے میں ملا اور وہاں وہ ایک پوشیدگی میں تھا۔ جنگ رمضان کے دوران ذوالفقار علی بھٹو نے اسرائیل کے خلاف شام کو پاکستان کی فوج اور ایئر فورس کی قوت پیش کر دی تھی۔۔ پاکستان ایئر فورس نے ایم ایم عالم کی قیادت میں دمشق کے آسمانوں کا اسرائیلی ایئر فورس کے خلاف دفاع کیا۔۔ ہمارے توپ خانے نے گولان کی پہاڑیوں سے ادھر مالٹوں کے ایک باغ میں ڈیرہ ڈال کر اسرائیل پر گولے برسائے۔ اسی لیے ان زمانوں میں شام میں ہر پاکستانی کے ہاتھ چومے جاتے تھے اور کہا جاتا تھا ”بھوتو اِز اے گڈ مین“۔۔ اور میں اس مالٹوں کے باغ کا اور دمشق میں پاکستان ایئر فورس اور ایم ایم عالم کی موجودگی کا گواہ ہوں۔۔ اس کے برعکس معدودے چند لوگوں کا ایک پسندیدہ فرعون تھا جس نے اردن میں بلیک ستمبر کے دوران فلسطینیوں کے قتل عام میں بھرپور شرکت کی تھی اور ان خدمات کے عوض اسے اردن نے ایک فوجی ایوارڈ سے نوازا۔۔ فرعون صاحب نہایت فخر سے جب پوری وردی زیب تن کرتے تھے تو یہ ایوارڈ ان کے نور بھرے سینے پر ہمیشہ آویزاں ہوتا تھا۔

اور ہاں دمشق میں ایم ایم عالم نے میرے ڈرامے ”نواب سراج الدولہ“ کی پسندیدگی کا اظہار کیا جس میں میں نے اس بدقسمت نواب کا کردار ادا کیا تھا۔

اس دوران سامنے بیٹھی ادھیڑ عمر خاتون ایک اونگھ میں چلی گئی تھیں، بیدار ہوئیں تو پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں ”میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے“

یہاں میانوالی کی جانب پروا ز کرنے کے انتظا ر میں ایئر مارشل عمر فاروق سے ایک عرصے کے بعد ملاقات ہو گئی۔۔۔ عمر فاروق ان زمانوں میں پی آئی اے کے سربراہ تھے۔ انہوں نے میرے سفرنامے ’’کے ٹو کہانی‘‘ کی افتتاحی تقریب کا یوں اہتمام کیا کہ پی آئی اے کا ایک خصوصی سفاری جیٹ ہوائی جہاز عین کے ٹو کی چوٹی پر پرواز کر رہا تھا جب آٹھ منٹ کے دوران میرے سفر نامے کے بارے میں مختصر مضامین پڑھے گئے، صدارت عمر فاروق کی تھی اور بندوبست انور محمود کا تھا۔۔۔ کے ٹو کی چوٹی دکھائی دے رہی تھی بلکہ طیارے کی ونڈ سکرین پر حاوی ہو رہی تھی جب میں نے کیپٹن سخاوت کو ’’کے ٹو کہانی‘‘ پیش کی۔۔۔ اور یہ ایک نوعیت کا ورلڈ ریکارڈ تھا کہ آج تک کسی کتاب کی رونمائی کے ٹو کی چوٹی پر پرواز کرتے نہ ہوئی تھی اور وہ کتاب بھی کے ٹو کی کہانی ہو۔۔۔ دنیا بھر کے ٹیلی ویژن چینل اس انوکھی تقریب کو ریکارڈ کرنے کی خاطر اسی طیارے میں سوار تھے۔ مجھے یاد ہے کہ مرحوم خالد حسن نے اپنے انگریزی کالم کو ’’ایم ایچ ٹی آن کے ٹو‘‘ کا نام دیا تھا۔ تو یہ وہی عمر فاروق تھے جو اتنی مدت بعد ملے تھے۔ میں نے ان سے ان کی نہایت شاندار اور مجھ سے الفت رکھنے والی بیگم صاحبہ کے بارے میں پوچھا تو وہ کہنے لگے ’’بارہ برس پیشتر۔۔‘‘ میں بتا نہیں سکتا کہ مجھے ان کے انتقال پر کتنا رنج ہوا۔۔۔ تب اعلان ہوا کہ میانوالی جانے والی پرواز طیار نہیں تیار ہے۔۔۔

ایک دیو زاد ۔۔۔ بہت بڑے حجم والا۔۔۔ ایک عمارت جتنا جہاز رن وے پر کھڑا تھا۔۔۔ میں نے ایک نوجوان افسر سے پوچھا کہ اس طیارے کا نام کیا ہے تو وہ کہنے لگا ’’سی ون تھرٹی‘‘۔۔۔

میں نے طیارے کو ایک تھپکی دی۔۔۔ شکریہ۔۔۔ یہ تم ہی تھے جس نے پسندیدہ فرعون کو آسمانوں میں غرق کر دیا۔۔۔ شکریہ۔۔۔

صد شکر کہ طیارے کے اندر ایئر فورس کے لوگوں کے سوا صرف میں اور مجیب الرحمن شامی تھے، آموں کی پیٹیاں نہ تھیں جو ایکسپلوڈ بھی کر سکتی ہیں۔

(جاری ہے)

شہباز کرے پرواز۔۔۔ ایم ایم عالم

مستنصر حسین تارڑ

03-04-2014

چنانچہ ہم اس محسن طیارے سی ون تھرٹی میں داخل ہوئے، میانوالی جانے کے لئے ۔۔۔ کیا دیکھتے ہیں کہ کرسیوں کی بجائے کچھ جھلنگے سے ہیں جو ڈھیلی نواڑ کے ہیں، ان میں بیٹھئے تو محسوس ہوتاہے جیسے ایک ڈھیلے ہو چکے نواڑی پلنگ میں دھنس گئے ہیں۔۔۔ اور ہاں میں نے شکر کیا کہ مجیب الرحمن شامی چلے آئے تھے ورنہ میں تنہائی میں ہے موت مارا جاتا، شامی صاحب جانے کون سے شامی ہیں، ایک شامی تو دن بھر شام کا انتظار کرتے ہیں تاکہ اِک گونا بے خودی کے سپرد ہو جائیں، اور مجھے شک ہے کہ یہ وہ والے شامی شاید نہیں ہیں، دوسرے شامی، ملک شام کے ہوتے ہیں، لیکن ان کا ڈیل ڈول اور شخصیت دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ یہ شام کے ہیں، اکھاڑے میں اُتر کر مخالفین کو پچھاڑنے والے پہلوان ہیں۔۔۔ بہرطور وہ جو بھی شامی ہیں، نہایت نفیس اور گرجدار شامی ہیں۔۔۔ ان کی رفاقت نہایت پُرلطف رہی۔۔۔ سی ون تھرٹی کے انجن سٹارٹ ہو چکے تھے اور اتنا شور تھا کہ میرا اکلوتاکارآمد کان بھی بہرا ہو گیا اور میں مکمل طو رپر ’’بولا‘‘ ہو گیا یعنی بہشتی ہو گیا۔۔۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے شوروغل کے بعد میں نے برابر میں بیٹھے ایک نوجوان افسر سے پوچھا ’’کیا ہم میانوالی لینڈ کر چکے ہیں‘‘؟ وہ کہنے لگا ’’سر ابھی تو ہم نے لاہور سے ہی ٹیک آف نہیں کیا‘‘۔

بہرطور ہم اُڑے، قیامت کے شور میں اُڑے اور میانوالی لینڈ کر گئے۔۔۔ اور وہاں بہت رونقیں تھیں۔ ایم ایم عالم کی شاندار یادگار دھوپ میں روشن ہوتی تھی۔ اس مرد مجاہد کی جہازی تصویریں آویزاں تھیں اور ظاہر ہے ہر جانب ایئرفورس کی نیلی وردیاں چھب دکھلاتی تھیں اور ان میں خواتین افسر بھی شامل تھیں جو کچھ زیادہ ہی چھب دکھلاتی ہیں۔ ازاں بعد ہمیں ایک سیاہ رنگ کے وسیع خیمے میں بٹھا دیا گیا۔۔۔اگلی نشستوں پر نہ بٹھایا گیا کہ وہ صوفے تھے اور صرف معززین کے لئے وقف تھے، مجھے اور شامی صاحب کو پچھلی نشستوں پر بے آرام کرسیوں پر بٹھایا گیا مبادا ہم متکبر ہو جائیں کہ ہمیں ایئرچیف نے خصوصی طور پر مدعو کیا ہے۔ شامی صاحب کے برابر میں کمشنر سرگودھا ڈویژن آ بیٹھے اور ان کے ساتھ دیر تک رازونیاز کرتے رہے۔ شامی صاحب کمال حوصلے سے سنتے رہے اور سر دھنتے رہے۔۔۔ بالآخر وزیراعظم پاکستان نوازشریف کی آمد ہوئی۔۔۔ سب سے پہلے ایم ایم عالم کی حیات پر مبنی ایک ڈاکومنٹری دکھائی گئی جو میرے عزیز دوست گل حسن کے بیٹے حسن حیات خان نے پروڈیوس کی تھی اور کیا ہی خوب کی تھی۔۔۔ اس ڈاکومنٹری میں میرے تاثرات بھی شامل کئے گئے تھے۔۔۔ وزیراعظم نے اپنی تقریر میں ایک خوبصورت بات کی۔۔۔ انہوں نے کہا کہ ایم ایم عالم صرف ایک نہیں، صرف ایئرفورس میں نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں

کوئی نہ کوئی ایم ایم عالم ہے جس کی حوصلہ افزائی ہم پر واجب ہے، ہمیں اس کی قدر کرنی چاہئے کہ وہ ہمارا ہیرو ہے۔ وزیراعظم رخصت ہوئے تو بھوک کے مارے میں بھی رخصت ہونے لگا۔۔ صبح پانچ بجے ناشتے کا ایک ٹوسٹ آخر کہاں تک ساتھ دیتا۔ میانوالی آمد پر ہماری آؤ بھگت تو بہت ہوئی، آؤ، زیادہ ہوئی اور بھگت، یعنی چائے بسکٹ وغیرہ ذرا کم ہوئی۔ اس دوران ایک فرشتے کی صورت میں ائیرفورس کے درجات پر بلندافسر طارق محمود نمودار ہو گئے، ہماری بلائیں لینے لگے، میں نے کہا کہ پلیز ہماری بلائیں مت لیں ہمیں کھانے کے لئے کچھ دیں۔۔ ورنہ خوش رہو اہل ایئرفورس ہم تو سفر کرتے ہیں۔۔ طارق فوراً ہمیں اس خیمے میں لے گئے جہاں خوراک کا بندوبست تھا اور وہاں وزیراعظم کے سامنے فلائی پاسٹ کرنے والے جیٹ ہوائی جہازوں کے چار پائلٹ صرف مجھے ملنے کے لئے آ گئے۔۔ ”سر ہم آپ کے لئے کیا کر سکتے ہیں۔۔ ہم آپ کے فین ہیں“ میں نے کہا کہ آپ فوری طور پر یہ کر سکتے ہیں کہ مجھے کافی پلائیں اور یہ جو چکن تکّا سلگتے ہیں وہ میری خدمت میں پیش کریں۔۔ انہوں نے نہایت فرمانبرداری کا مظاہرہ کیا اور سب کچھ پیش بلکہ پیش پیش کر دیا طارق محمود کی آمد اور اس کی دیکھ بھال اور کافی کے ایک کپ نے مجھے زندہ کر دیا اور میں پھر سے چہکنے لگا۔۔ میانوالی لینڈ کرنے کے بعد ایک نوجوان احسن نے مجھے سلیوٹ کر کے پوچھا تھا کہ۔۔ سر مجھے امید ہے کہ آپ نے سی ون تھرٹی میں پرواز کو انجائے کیا ہو گا تو میں نے بیزار ہو کر کہا تھا ”یہ ایک ہولناک تجربہ تھا“ چنانچہ طارق محمود نے ہمارے لئے لاہور واپسی کے لئے ایک متبادل بندوبست کر رکھا تھا۔۔ ہم ایک پرائیویٹ سیسنا طیارے میں لوٹ رہے تھے۔۔ اور ہاں میں نے ایم ایم عالم کی موت پر جو کالم تحریر کئے ان میں یہ درخواست بھی تھی کہ لاہور کی ایم ایم عالم روڈ کے آغاز میں اس کی یادگار تعمیر کی جائے جس پر اس کے شاندار کارناموں کی تفصیل درج ہو کہ لوگ ایم ایم عالم روڈ کو محض ایک فوڈ سٹریٹ سمجھتے ہیں۔۔ مجھے طمانیت ہو گی کہ شاید میری درخواست پر یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ وہاں ایم ایم عالم کے شایان شان ایک یادگار بہت جلد تعمیر کی جائے گی۔

ایم ایم عالم کی یادگار میانوالی ائیربیس میں، جو اب ایم ایم عالم ائیربیس ہے ایک خوبصورت یادگار ہے جس کے سامنے کھڑے ہو کر میں نے تقریباً آدھی ائیرفورس کے ہمراہ تصویریں اتروائیں اور اس دوران دو خواتین نے بھی میرے ساتھ تصویر اتروانے کی فرمائش کی اور تصویر کے بعد ان میں سے ایک نے کہا ”ہم دونوں ایم ایم عالم کی بہنیں ہیں“۔۔ میں آبدیدہ سا ہو گیا۔ ان میں مجھے ایم ایم عالم کی جھلکیاں نظر آ رہی تھیں۔۔ بہنوں کو بھائیوں پر مان ہوتا ہے۔۔ اور اگر بھائی ایم ایم عالم ایسا ہو تو مان، مہا مان ہو جاتا ہے۔۔ میں نے ان سے کہا ”بہن۔۔ پہلی تصویر درست نہیں اتری۔۔ تب میں آپ کو جانتا نہ تھا، اب میں آپ کے ساتھ ایم ایم عالم کی بہنوں کے ساتھ تصویر اتروانا چاہتا ہوں“۔

کیسا شاندار شخص تھا۔۔ ایم ایم عالم۔۔ عالم میں انتخاب تھا۔ عہد حاضر کا خالد بن ولید تھا جس نے کسی میدان جنگ میں شکست نہ کھائی، جس کی موت پر حضرت عمر فاروقؓ نے کہا کہ ہاں تم لوگ اس شخص کی موت پر آنسو بہا سکتے ہوکہ اس جیسا کسی اور ماں نے جنم نہ دیا۔۔ ایم ایم عالم ایسا بھی تو اب کس ماں نے جنم دینا ہے۔

ہم میانوالی سے ٹیک آف کر کے ایک سیسنا طیارے میں سوار لاہور کی جانب اڑے جاتے تھے اور ایم ایم عالم کی یادیں ایک شہباز کی مانند ہمارے ساتھ پرواز کرتی چلی آتی تھیں

کرد یا شار کمال اور ترک ارحان پاموک

مستنصر حسین تارڑ

06-04-2014

میں ارحان پاموک سے شدید نفرت کرتا تھا۔۔

اگرچہ یہ ارمان یا پاموک وغیرہ جس کے نام سے میں واجبی طور پر آشنا تھا، یہ جو کوئی بھی تھا اسے اس سے کچھ فرق نہ پڑتا تھا کہ کوئی نامعلوم پاکستانی ادیب اس کے لیے اپنے بدن میں نفرت کا ایک الاؤ جلائے بیٹھا ہے۔۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ میری نفرت کی تپش پاکستان سے سفر کرتی اسے استنبول میں جا لے گی اور اسے بھسم کر دے گی۔۔ اس کی ادبی، رومانوی اور جنسی زندگی برباد ہو کر رہ جائے گی۔۔

اس نفرت نے عین اس لمحے جنم لیا جب 2006ء میں میں نے نہایت اشتیاق سے اخبار میں اس برس کے نوبل انعام برائے ادب حاصل کرنے والے ادیب کا نام تلاش کیا اور وہ یہی کمبخت ارحان پاموک تھا۔۔ ایسا ہرگز نہیں کہ میں اس برس اپنے لیے نوبل انعام کی توقع کر رہا تھا۔۔ اس لیے حسد کی آگ میں جل کر گل و گلزار نہ ہوا کریں، ابراہیم نہ تھا بلکہ خاک ہو گیا۔۔ نہیں میں نے اسے دل کی گہرائیوں سے صرف اس لیے ناپسند کیا کہ اس نے میرے پسندیدہ ناول نگار یاشار کمال کے حق پر ڈاکہ ڈالا تھا۔ نوبل اسے ملنا چاہیے تھا اور یہ درمیان میں پاموک کہاں سے آ گیا جس کا نام بھی انتہائی مزاحیہ ہے۔۔ جنگ یرموک ہے یا دریائے شیوک

وغیرہ ہے۔۔۔
میں یاشار کمال کا ایک مدت سے شیدائی تھا یہاں تک کہ میں نے اپنے پہلے پوتے کا نام بھی یاشار رکھا تھا۔ اس سے بڑھ کر عقیدت اور محنت کی معراج بھلا اور کیا ہو سکتی ہے۔ یاشار سے میری قربت جو محبت میں بدل گئی آج سے تقریباً چالیس برس پیشتر شروع ہوئی جب میں نے مکتبہ فرینکلن کی جانب سے شائع کردہ۔۔۔ اور یہ ایک امریکی اشاعتی ادارہ تھا جو نہ صرف زر کثیر سے امریکی ادب بلکہ بین الاقوامی ادب کے شاہکار بھی پاکستانی عوام تک پہنچاتا تھا، ہم امریکیوں کے شکر گزار ہو کر طالبان کے متشرع قہر کو کیوں دعوت دیں، اس لیے ہم شکر گزار نہیں ہوں گے بلکہ گو امریکہ گو کے نعرے بلند کریں گے۔ چنانچہ جب میں نے مکتبہ فرینکلن کی جانب سے شائع کردہ یاشار کمال کا ناول ”ونڈزفرام دے پلینز“ پڑھا تو اس کا گرویدہ ہو گیا۔۔۔ برادر گوئندی بھی اقرار کرتا ہے کہ اس نے یاشار کے ان ناول کا تذکرہ پہلی بار میری بیجوں کی دکان پر بیٹھے مجھ سے سنا تھا اور بالآخر اب جب کہ وہ پاکستان کا ایک انوکھا اور نظریاتی ناشر ہو چکا ہے اس نے یاشار کے اس ناول کا اردو ترجمہ شائع کر دیا ہے۔ بعد ازاں میں نے یاشار کی تمام میسر تحریروں کو دیمک کی مانند چاٹ ڈالا۔۔۔ ”مہمت مائی ہاک“ سے لے کر ”لیجنڈ آف اے تھاؤزنڈ بارس “ تک اور میں نے اسے ناول نگاری میں ایک اور مرشد مان لیا۔۔۔ میرا کراؤن پرنس یعنی بڑا بیٹا سلجوق، ایک مرتبہ پھر ترکی کے ساتھ میری وابستگی کا ثبوت اپنے کالم کے ہمراہ ترکی گیا اور خاص طور پر سلجوق نام کے شہر گیا جہاں سے اس نے مجھے ایک تصویری کارڈ روانہ کیا تھا جس پر صرف اتنا لکھا تھا ”سلجوق فرام سلجوق“ تب میں نے اس کے میک میں اُن زمانوں کے سفر نامے ”خانہ بدوش“ کو رکھ دیا کہ بیٹے جب استنبول پہنچو تو وہاں اس بوڑھے ناول نگار کو مچھیروں کی کسی بستی کے قہوہ خانہ میں تلاش کرنا جہاں وہ ایک آنکھ سے معذور اپنی یہودی بیوی کے ہمراہ ایک شب غم گزار تا۔ عمر رفتہ کو آواز دیتا شاید تمہیں مل ہی جائے اور یہ اس کی بیوی ہے جس نے اس کے بیشتر ناول ترکی سے انگریزی میں ترجمہ کیے، اُسے تلاش کرنا اور یہ سفرنامہ جس میں ترکی کے تذکرے بھی ہیں اس کے چرنوں میں رکھ کر کہنا کہ یا یاشار میرا باپ ایک ایسا ادیب جو اپنے وطن میں تو جانا جاتا ہے پر اس کی سرحدوں کے باہر اسے کوئی نہیں جانتا اور وہ آپ کا چاہنے والا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ یہ کتاب جو آپ ہی کی لشکری زبان اردو میں لکھی گئی آپ کے کتب خانے کے کسی شیلف میں جگہ پا جائے تو وہ اپنے آپ کو ایک کامل خوش بخت تصور کرے گا۔۔۔ سلجوق ترکی سے واپس آیا تو ایک خفا حالت میں آیا ”ابو آپ مجھے مروانے لگے تھے۔۔۔ استنبول پہنچ کر یاشار کمال کے ٹھکانے کی کھوج کرنے کی خاطر میں وہاں کی پریس کلب میں جا پہنچا اور وہاں ٹرکش کافی پیتے، تمباکو پیتے صحافی حضرات سے جب میں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں یاشار کمال سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں تو ہر سو سناٹا چھا گیا۔۔۔ پریس کلب میں یکدم خاموشی چھا گئی۔۔۔ اور تمام آنکھیں مجھ پر مرکوز ہو گئیں۔ تب ایک نوجوان صحافی مجھے بازو سے پکڑ کر باہر لے گیا اور کہنے لگا۔۔۔ لڑکے، کیا تم نہیں جانتے کہ ترکی میں یاشار کمال ایک ممنوعہ نام ہے، ایک ٹیبو ہے، بے شک وہ ترکی کا سب سے بڑا ناول نگار تسلیم کیا جاتا ہے اور اس کے ناول کسی بھی ترک وزیراعظم کے سرہانے پائے جا سکتے ہیں لیکن۔۔۔ وہ ایک کرد ہے۔۔۔ اور ہم ترک یونانیوں کے ساتھ تو ہاتھ ملا سکتے ہیں لیکن کرد۔۔۔ ہم تو تمہارے ہیرو صلاح الدین ایوبی کو بھی ناپسند کرتے ہیں کہ وہ ایک کرد تھا اور تم یہاں آ کر کھلے عام یاشار کمال کی بات کرتے ہو۔ خفیہ اداروں کو اپنے پیچھے لگانا چاہتے ہو۔۔۔ اگر تمہیں جان عزیز ہے تو اس کرد کا نام لیے بغیر ترکی سے رخصت ہو جاؤ“۔
یاشار کمال کو متعدد بار نوبل انعام کے لیے نامزد کیا گیا لیکن میری معلومات کے مطابق ترک حکومت نے اسے منظور نہ کیا۔ اُنہیں ایک کرد منظور نہ تھا۔
چنانچہ جب میں نے ادب کے نوبل انعام کے حقدار کا نام پڑھا اور وہ یاشار نہ تھا ارحان تھا، تب اس لمحے سے میرے اندر اس کے لیے نفرت کا جنم ہوا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میری محبوبہ کے سر پر حسینہ عالم کا تاجر نہ سجے اور کوئی پاموک، یرموک، شیوک وغیرہ نوبل انعام کی مس یونیورس ہو جائے۔
تب میں نے ایک تاریخی فیصلہ کیا اپنے بدن میں مکمل کینہ بھر کے، بغض کے سیاہ زہر کو اپنی شریانوں میں انجیکٹ کر کے کہ میں اس پاموک شاموک نام کے ناول نگار کی تمام تحریریں پڑھ کر ایک اخباری مہم کا آغازکروں گا کہ کیا نوبل انعام کمیٹی کے سبھی اراکین اندھے تھے۔ ان کی آنکھوں میں دھول پڑ گئی تھی کہ انہوں نے یاشار کی بجائے ارحان پاموک کو انعام کا حقدار قرار دیا۔

”مائی نیم از ریڈ“
مستنصر حسین تارڑ
10-04-2014
میں جو بچپن سے ہی ایک عدد کیڑا تھا، کتابوں کا کیڑا تھا، میں نے نہایت نخوت سے، تیوڑ ی چڑھائے، یہ

فیصلہ کر کے کہ میں نے اس شخص کے ناولوں کو پسند نہیں کرنا میں نے ”دے وہائٹ کاسل“ کا مطالعہ کیا۔ پھر ”سائلنٹ ہاؤس“ کی ورق گردانی کی۔۔ جب میں ”دے بلیک بک“ تک پہنچا تو نہ چاہتے ہوئے بھی ارحان کی نفرت میں کمی ہونے لگی، وہ ایک مکڑی کی مانند اپنی تحریروں سے میرے وجود کے گرد جالے بن رہا تھا، مجھے پھانس رہا تھا، میں ایک مکھی کی مانند تگ و دو کرنے لگا کہ ان جالوں کا شکار نہ ہو جاؤں۔۔ اور تب ”سنو“ میری آنکھوں میں اتری تو میری ناپسندیدگی اور نفرت کی برف پگھلنے لگی۔۔ اور میں تب بھی تھرتھراتا تھا، اس کے بنے ہوئے تانے بانے سے آزاد ہونے کی سعی کرتا شکار نہ ہونا چاہتا تھا اور پھر ”مائی نیم از ریڈ“ ایک مصیبت ایک لاچاری کے طور پر مجھ پر نازل ہوئی۔ اس ناول کی پیچیدگی، بنت، کاری گری اور تخلیقی صناعی ایسی کمال کی تھی کہ میں ڈھیر ہو گیا۔ میں نے اس عظیم ناول کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ نفرت کی تلوار اور ناپسندیدگی کی ڈھال اس کے قدموں میں رکھ کر شکست کا اعترا ف کر لیا۔۔ میں سرنگوں ہو گیا۔ شرمندہ ہو گیا۔۔“ مائی نیم از ریڈ“ مجھے ایسے جہانوں میں لے گیا جن کے وجود سے میں واقف ہی نہ تھا، ارمان نے ایک ایسی قدیم دنیا کے نقشے تخلیق کیے تھے جو ابھی وجود میں ہی نہ آئی تھی۔

سرخ رنگ نہ صرف انقلاب کا بلکہ ملامتی صوفیوں کا بھی رنگ ہے۔۔ اور میرا شاہ حسین کہتا ہے کہ۔۔ ’دھواں دُکھے میرے مرشد والا، جاں پھولاں تاں لال نیں یا مینوں مرشد نال پیار نیں۔۔ اُدھر لال میری پت رکھیو بھی لالو لال ہے۔۔ ہر جانب جہاں بھی کریدتا ہوں سرخ چنگاریاں برآمد ہوتی ہیں اور اُن میں مجھے ارحان پاموک کا چہرہ نظر آنے لگتا ہے۔

مجھے مینچر پینٹنگ یا مختصر مصوری کے بارے میں اتنا ہی علم ہے جتنا کہ ارحان پاموک کو میری تحریروں کے بارے میں علم ہے لیکن میں نے ہرات کے مصور بہزار کے ”تیمور نامہ “کے کچھ مصور اوراق دیکھ رکھے ہیں جن میں تصویر شدہ ہر گھوڑا سانس لیتا ہے، تو اُس کے نتھنوں سے خارج ہونے والی بھاپ تصویر کو زندہ کر دیتی ہے۔۔ جنگ کے مناظر میں تلواروں کی لِشک آنکھوں کو چندھیا دیتی ہے اور وہ تصویر سے باہرآکر آپ کے بدن پر وار کرتی ہیں، شیر گرجتے ہیں اور ہاتھی چنگھاڑتے ہیں، شہزادے اور بادشاہ اپنی کنیزوں کے ساتھ ندیوں کے کنارے استراحت فرماتے غیر شرعی افعال میں مشغول ہوتے ہیں۔۔ بہزاد ایک ایسا سامری ہے جو کاغذ پر مصور کیے گئے مناظر پر جب اپنی سانس لیتا ہے تو وہ زندہ ہو جاتے ہیں۔۔ لیکن یہ سرسری علم تھا۔۔ ”مائی نیم از ریڈ“ مجھے مختصر مصوری کے ایسے جہانوں میں لے گئی جہاں اس فن کے استاد آخری عمر میں بہر طور اندھے ہو جاتے ہیں، اُن کی آنکھیں عمر بھر کاغذ پر مرکوز رہ کر پتھرا جاتی ہیں اور بالآخر وہ کسی اندھے کنویں میں پھینک دیئے جاتے ہیں۔

ناول نگاری میں کوئی پیغمبر آخر الزماں نہیں ہوتا۔۔ تخلیق کے معجزے مسلسل رونما ہوتے رہتے ہیں، ان پر آسمانی صحیفے اترتے رہتے ہیں۔ موسیٰ کے بعد عیسیٰ کا بھی ظہور ہوتا ہے۔ ٹالسٹائی اور دوستو وسکی کے بعد جیمز جوائس، گارسیا مار کیزیا بوسے سرا ماگو کا ظہور ہوتا ہے تو اسی طور یاشار کمال کے بعد ارحان پاموک بھی خلق خدا کے دُکھ سکھ اور محبتوں میں شریک ہونے کے لیے ہمارے درمیان ایک اور تخلیقی پیغمبر کے طور پر ”مائی نیم از ریڈ“ ایسے صحیفے تھامے ہم پر اترتا ہے۔

بے شک میں ارحان کے کلاسیک ناول ”مائی نیم از ریڈ“ کا ابتدائیہ لکھ رہا ہوں لیکن میں یہ ظلم کیسے کروں کہ اس کے آخری ناول ”دے میوزیم آف انوسنس“ کا تذکرہ نہ کروں جو میرے نزدیک ”اینا کرنینا“ کے بعد محبت کی سب سے بڑی کہانی ہے۔ اس ناول نے محبت کی شدت سے مجھے مسمار کر ڈالا۔۔ میں ہمیشہ سے اس یقین کا اسیر رہا کہ یہ جو محبت کی دیوانگی ہے اسے صرف وارث شاہ۔ حافظ برخوردار یا شو کمار بٹالوی ایسے نابغۂ روزگار شاعر ہی بیان کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔

عشق بولدا نڈھی دے تھاؤں تھائیں۔۔

حافظ ہاتھی عشق دا پوش کرندا پوش۔۔

عشقے دا اساں پلنگ نیواڑی دے چاننیاں وچ ڈاہیا۔۔

لیکن یہ کیا ہے کہ پاموک نے محبت کے آسمانی صحیفے کی ایک اور تفسیر لکھ ڈالی ہے۔۔ وہ اپنی بچھڑ چکی محبوبہ۔۔

یہ میری زندگی کا سب سے پُرمسرت لمحہ تھا اگرچہ میں اس لمحے آگاہ نہ تھا۔۔”

فسوں کے کندھے پر بوسہ دیتے ہوئے، جو محبت کے کرشمے سے نم آلود ہو چکی تھی میں نے نہایت نرمی سے اس کے کان کو کاٹا، اس کا جھمکا آزاد ہو گیا۔ اور شاید ایک لمحہ کے لیے فضا میں معلق رہنے کے بعد گر گیا“

اپنی بچھڑ چکی محبوبہ فسوں کے آثار جمع کرتا ہے۔۔ لباس، خوشبو کی بوتلیں۔ سگریٹ کے ٹکڑے۔۔ بستہ اور چادریں غرض کہ ہر وہ شے جسے فسوں کے بدن نے چھوا ہو، جمع کرتا ہے اور پھر ان آثار کو ایک عجائب گھر ”میوزیم آف انوسنس“ کی شکل دیتا ہے۔

مارکیز نے کہا تھا کہ ہر شخص کی زندگی میں اگر وہ خوش بخت ہو تو ایک ایسی عورت آتی ہے جو اسے مرد بنا دیتی ہے۔۔ ایک فسوں آتی ہے۔۔ پاموک کا ناول پڑھنے کے بعد میں نے سوچا کہ میری فسوں کونسی ہے۔۔ میں بھی تو اس کے آثار تلاش کروں۔۔ کوئی زرد پیراہن، پرانی اینٹوں سے لپٹی ایک زرد پھولوں والی بیل۔۔ مدھم ہو چکی آنسوؤں میں بھیگی تحریریں۔۔ کوئی رومال جس میں وصال کی مہلک حنوط ہو۔۔ ریل کا ایک ٹکٹ۔۔ بارش میں بھیگ کر اپنے رنگ کھو دینے والی کوئی پینٹنگ یا آصف جاہ کے مقربے کی کوئی محراب جس کی اینٹوں میں اس کی سسکیاں جذب ہو گئی ہوں۔۔لیکن۔۔ میں پاموک نہ تھا، روایتوں، بوسیدہ اخلاقیات اور معاشرے کی زنجیریں بندھا ایک غلام تھا، میں اگر ذرّہ بھر روگردانی کروں تو میری پیٹھ پر کوڑے برسنے لگتے تھے۔۔ میں کیسے ایک اپنا "میوزیم آف انوسنس" قائم کر سکتا تھا۔
مجھے بہرطور "مائی نیم از ریڈ" کی جانب لوٹ آنا ہے۔
اور میں یہ ظلم بھی نہیں کر سکتا کہ اس ناول کی چُپ چاپ، دھان پان، نازک ملوک ٹرکی ہُما انور کو کھڑے ہو کر سلام نہ کروں جس نے اس مشکل ناول کا اردو ترجمہ جانے کیسے کر لیا ہے اور ایسے کر لیا ہے کہ یہ انگریزی کی نسبت کہیں بڑھ کر مؤثر اور تخلیقی ہو گیا ہے۔ ترجمے کے بارے میں کسی نہ کسی نے تو کہا تھا کہ ایک بوتل میں بند خوشبو کو ایک اور بوتل میں اُنڈیلنا ترجمہ ہے اور اس اُنڈیلنے کے دوران بہت سی خوشبو زائل ہو جاتی ہے۔ ہُما انور خوشبو انڈیلنے کی ایسی ماہر ہیں کہ وہ ہو بہو بغیر کسی ضیاع کے اردو کی بوتل میں منتقل ہو گئی ہے۔
جیسے رباعیات عمر خیام کے فز جیرلڈ کے ترجمے کے بعد جب ادریس شاہ اور ایڈگر سنونے مل کر ایک پرانے مخطوطے کی مدد سے عمر خیام کی رباعیوں کا ترجمہ کیا تو "ٹائم" میگزین نے اپنے ادبی جائزے میں لکھا کہ "یہ تازہ ترین ترجمہ۔۔ادریس شاہ اور ایدگر سنوایسے شاعر کا ایک عقاب کی مانند ہے جب کہ فرجیرلڈ کا ترجمہ اس کے مقابلے میں محض ایک چڑیا ہے صرف اس فرق کے ساتھ کہ یہ عقاب حنوط شدہ حالت میں کارنس پر سجا ہے جب کہ چڑیا فضائے بسیط میں پرواز کر رہی ہے"۔
ہُما انور کی چڑیا بھی آسمانوں پر اڑان کرتی ہے۔
کیا میں اب بھی ارحان پاموک سے نفرت کرتا ہوں؟ ہاں۔۔ جب تک کہ وہ میری حیات کو بامعنی اور پر تاثیر بنانے کے لیے کم از کم د س ناول اور نہ لکھے، میں اس سے نفرت کرتا رہوں گا۔

طاؤس و رباب کا تاریخی مغالطہ

مستنصر حسین تارڑ

13-04-2-14

ونسٹن چرچل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک بار وہ جدید مصوری کی ایک نمائش میں وزیراعظم برطانیہ کے طور پر مدعو ہوا۔ ایک صحافی نے پوچھا کہ سر۔۔ کیا آپ کو اس جدید مصوری کی سمجھ آئی ہے تو اس نے کہا کہ میں زندگی میں ایک نتیجے پر پہنچا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ضروری نہیں کہ آپ ہر چیز یا نظریے کو سمجھ سکیں۔ تو میں بھی سمجھ نہیں سکا لیکن سمجھنا چاہتا ہوں کہ کیوں صرف ہم پاکستانی ہیں جو شمشیردسناں اول، طاؤس ورباب آخر کے تاریخی مغالطے کے فریب میں مبتلا ہیں کہ دنیا میں جتنی بھی عظیم اور شاندار تہذیبوں نے جنم لیا اُن سب میں شمشیر وسناں اور طاؤس و رباب ساتھ ساتھ چلے۔۔ چلئے ہم کفار اور بے دین لوگوں کی تہذیبوں، رومن، فراعنہ کے مصر، بابل، نینوا، یونان، چین یا ہندوستان کی بات نہیں کرتے مسلمانوں کی عظمت کے دنوں میں جھانکتے ہیں۔۔ میں بہرطور ایک ادیب ہوں، دانشور یا محقق نہیں ہوں۔۔ جن دنوں میں آج سے تقریباً چالیس برس پیشتر کا قصہ ہے اپنے سفرنامے "اندلس میں اجنبی" کے لیے تاریخی مواد کی جستجو میں تقریباً ایک برس ہر دوپہر سے شام تک پنجاب پبلک لائبریری کے تہ خانے میں براجمان ہو کر قدیم مخطوطوں اور بوسیدہ کتابوں کی ورق گردانی کیا کرتا تھا اور میں نے اُندلس کی تاریخ، ثقافت اور تمدن کے جو حوالے نقل کیے وہ تقریباً ایک ہزار مضمون پر محیط ہو گئے۔ تب میں نے سوچا کہ ایک سفرنامے کی بجائے میں کیوں نہ اُندلس کے بارے میں ایک تحقیقی اور تاریخی دستاویز تحریر کروں کہ میرے پاس مواد کی کثرت تھی اور پھر اس ارادے سے اس لیے باز آیا کہ محقق ایک نہایت کٹھور دل ناک کی سیدھ میں صرف حقائق کے حوالے دینے والا شخص ہوتا ہے۔ وہ مسجد قرطبہ کی تاریخ، مختلف ادوار میں اس میں رونما ہونے والی تبدیلیاں اور سلطانوں کے نام تو درج کر سکتا ہے لیکن اس میں جذبات نام

کو نہیں ہوتے اور میں ایک آوارہ گرد جذباتی اور رومانوی خصلت کا مالک شخص تھا۔ میں مسجد قرطبہ و شام کے صحراؤں میں اِک ہجوم نخیل۔۔۔ جس طور مجھ پر وارد ہوئی، لبنانی لڑکی ناژلا سعد کے سنگ میں نے اس کی ہر محراب کو اپنے پپوٹوں سے محسوس کیا، اس کے "صحن نارنجستان" کی نارنگیوں کی زرد کھٹی خوشبو سے وجد میں آیا۔۔۔ میں نے تو اسے ان جذبات سے مغلوب ہو کر بیان کرنا تھا۔۔۔ چنانچہ میں نے اُندلس کے بارے میں ایک تحقیقی دستاویز مرتب کرنے سے اجتناب کیا۔۔۔ آپ ذرا اس حقیقت کو پرکھیے کہ علامہ اقبالؒ اگر جذباتی اور رومانوی نہ ہوتے، صرف ایک محقق ہوتے تو کیا وہ "مسجد قرطبہ" ایسی شاہکار نظم تخلیق کر سکتے۔۔۔ بہرطور اُندلس کا عہد جسے مسلمانوں کا سب سے زریں زمانہ گردانا جاتا ہے اس تحقیق کے دوران آشکار ہوا کہ وہاں طاؤس و رباب کی کیسی قدر و منزلت تھی۔۔۔ وہاں کے گلوکار اور موسیقار ایسے تھے کہ پس ماندہ یورپ کے لوگ اُن کی پیروی کرتے تھے۔۔۔ اور اس درخشاں دور کا سب سے درخشاں شخص موسیقار زریاب تھا۔۔۔ یہ زریاب ایک اُستاد گلوکار اور موسیقار ابن اسحاق کا شاگرد تھا، بغداد کے عباسی خلیفہ کے دربار میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتا تھا۔۔۔ کہا جاتا ہے کہ ایک روز گلوکاری میں وہ ایسی بلندیوں پر پہنچ گیا کہ ابن اسحاق کو ماند کر دیا۔۔۔ تب زریاب کو اپنی جان کی فکر مندی ہوئی کہ کہیں میرا اُستاد طیش میں آ کر مجھے قتل نہ کروا دے کہ ان زمانوں میں بھی یہی دستور تھا۔ زریاب اپنے چند ساتھیوں سمیت بغداد سے روپوش ہو ااور قرطبہ میں جا ظاہر ہوا۔۔۔ قرطبہ کے سلطان کو اس کی آمد کی خبر ملی تو وہ اس کے استقبال کے لیے اپنے شاہی قصر سے باہر آگیا۔۔۔ زریاب سے کہا کہ جب تک آپ کے شایان شان رہائش کا بندوبست نہیں ہوتا آپ میرے محل میں قیام کریں گے اور میں اس دوران کہیں اور منتقل ہو جاؤں گا۔ زریاب نے قرطبہ کی زندگی میں ایک انقلاب برپاکردیا۔۔۔ وہ محض موسیقار نہ تھا۔۔۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے چمڑے کا میزپوش ایجاد کیا کہ خوراک کی ننگی میز پر کھانا ذوق جمال کے منافی ہے۔۔۔ یورپ بھر کے حکمران اُن زمانوں میں نہایت بد ذوقی سے لکڑی کی میزوں پر دھری کچی پکی بکرے کی رانیں نگلا کرتے تھے۔ اور حیرت در حیرت، کھانے کے دوران چھری کانٹے کا استعمال اس نے رائج کیا جسے ہم آج انگریزوں کی اختراع سمجھ بیٹھے ہیں اور اُنگلیاں چاٹنے کو ثواب گردانتے ہیں۔۔۔ زریاب ایک ڈریس ڈیزائنر بھی تھا۔۔۔ اس کے اختراع کردہ ملبوسات، ماڈل زیب تن کر کے "کیٹ واک" کرتے، موسم سرما، گرما اور خزاں کے لباس وہ ڈیزائن کرتا اور اُن کی پیروی پورا یورپ کرتا جو ابھی تک جانوروں کی کھالوں میں ملبوس تھا۔

ہم مسلمانوں کو دو خطے زیر کرنے کے بعد کچھ نفسیاتی مسائل نے آلیا، ایک ایران کی قدیم اور شاندار تہذیب تھی اور پھر ہندوستان کی ہزاروں برس پرانی علمی، ادبی اور رومانی ثقافت تھی۔۔۔ ایران کا تذکرہ پھر کبھی سہی لیکن ہندوستان میں ہم نے اپنے آپ کو مکمل طور پر جدا کرنے کی خاطر ہر اس شے کو حرام قرار دے دیا جو یہاں کے باشندوں کی ثقافتی پہچان تھی، اور اس میں شادی بیاہ اور موت کی رسوم، موسیقی اور رقص وغیرہ سر فہرست تھے۔۔۔ دنیا بھر میں جتنے بھی مسلمان خطے تھے وہاں موسیقی اور رقص کو کچھ پرابلم نہ ، صرف ہمارے ہاں تھی اور اب بھی ہے۔۔۔ لیکن ہم ان سے پیچھا نہ چھڑا سکے۔۔۔

برصغیر کے عظیم ترین کلاسیکی گلوکار، سازندسے اور موسیقار مسلمان تھے اور ہیں۔ البتہ ہم نے ایک اہتمام کیا، ہم نے قوالی کی صورت میں موسیقی کو متشرع کر لیا اور چونکہ بت پرستی ہماری سرشت میں تھی، ہم اس پر لعنت بھیجتے تھے لیکن ہم نے بتوں کی بجائے قبروں کو پوجنا شروع کر دیا۔۔۔ اُن کی پرستش شروع کر دی۔۔۔ میری ساس صاحبہ۔۔۔ زینت بیگم۔۔۔ جن کے خاوند چوہدری عبدالرحمن شیرانوالا کے صوفی بزرگ مولانا احمد علی کے خلیفہ تھے جب کبھی مجھے اور اپنی بیٹی میمونہ کو ملنے کے لیے آتیں تو ہمیشہ شکایت کرتیں۔۔۔ اور وہ ہمیشہ ایک صوفیانہ صاف ستھرے لباس میں، دل نشیں ناک نقشے والی گڑیا سی بڑھیا ساس شکایت کرتیں کہ۔۔۔ مستنصر تمہارے گھر میں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں میں نماز پڑھ سکوں۔۔۔ ہر دیوار پر تصویریں ہیں اور مجسمے سجے ہیں۔ تو میں اُن سے لاڈ کرتا ہوا کہتا، امی جی اگر آپ یہاں سجدے میں جاتی ہیں تو کیا مہاتما بدھ کا یہ قدیم گندھارا مجسمہ آپ سے شکایت کرتا ہے کہ آپ اُدھر کیوں سجدہ کرتی ہو۔ مجھے کیوں نہیں کرتیں۔۔۔ یقین کیجیے کہ جب کبھی میں نماز پڑھتا ہوں تو یہ مجسمہ مجھے کچھ نہیں کہتا۔۔۔ یہ میرے لیے محض ایک پتھر ہے۔ تو بجا طور پر وہ مجھ سے عارضی طور پر

خفا ہو جاتیں۔
تو کیا ابھی تک ہماری آستینوں میں بت ہیں اور ہم خجالت اور شرمندگی میں طاؤس ورباب کو حرام قرار دیئے جاتے ہیں۔ (جاری ہ

بم اپنے زوال کے بہانے تلاش کرتے ہیں
مستنصر حسین تارڑ

تو میں یہی جاننے کی سعی کرتا ہوں کہ کیا واقعی شمشیر و سناں اول اور طاؤس و رباب آخر ایک حقیقت ہے یا کہ ایک تاریخی مغالطہ ہے۔ میں نے آغاز میں دنیا کی بڑی تہذیبوں کے حوالے دینے سے اجتناب کیا تھا جہاں شمشیروسناں اور طاؤس و رباب ساتھ ساتھ چلتے تھے کیونکہ وہ بے دین اور کفار حضرات کی تہذیبیں تھیں، میں نے اپنے آپ کو صرف مسلم تہذیب تک محدود رکھنے کی کوشش کی ہے۔ چلئے ہم عرب دنیا کی موسیقی سے شیفتگی کا مختصر جائزہ لیتے ہیں۔۔۔ مجھے یہاں محمد رسولؐ اللہ کی مدینہ منورہ میں آمد پر اُن کے استقبال کے لئے گاتی اور دف بجاتی لڑکیوں کی بے پایاں مسرت کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ سب جانتے ہیں۔ عربوں کا پسندیدہ ساز دَف تھا اور آج بھی ہے جو کہ بنیادی طور پر ڈھول یا طبلے کی ایک قسم ہے۔ اگر اُن دنوں ستار یا گٹار رائج ہوتے تو انہیں بجا کر حضورؐ کا استقبال کیا جاتا۔۔۔ اگر ایک ساز بجانا جائز ٹھہرا تو دیگر سازوں نے کیا قصور کیا ہے۔۔۔ آج کی عرب دنیا میں بھی موسیقی کی اثرانگیزی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔۔۔ ایک وقت تھا جب تمام عرب ملکوں میں اُم کلثوم کی سحر طراز آواز گونجتی تھی۔۔۔
مجھے ایک دلچسپ وقوعہ یاد آ رہا ہے۔۔۔ میں اپنی جوانی کے رومان میں اور فلسطین کی اسرائیل کے خلاف جدوجہد میں حصہ لینے کے لئے پی ایل او میں شامل ہونے کے لئے بیروت پہنچ گیا تھا اور میں انجانے میں بیروت کی خانہ جنگی میں ہلاک ہوتے ہوتے بچ گیا تھا۔ اُن آفت زدہ زمانوں میں بھی بیروت کے مسلمان اور عیسائی علاقوں میں یکساں طو رپر جدھر جاتا اُم کلثوم کی آواز مسلسل سنائی دیتی رہتی۔۔۔ میں اس حصے میں ٹھہرا ہوا تھا جو فلسطینی علاقہ تھا۔ ایک روز وہاں سے بیروت کی شانزے لیزے یعنی ”حمرا“جانے کے لئے سواریوں والی ٹیکسی میں سوار ہوا۔۔۔ اور ظاہر ہے ٹیکسی کے ریڈیو پر اُم کلثوم نغمہ سرا تھی۔
میرے برابر میں بیٹھے ہوئے لبنانی صاحب کچھ زیادہ ہی وجد میں آ گئے، جہاں کہیں وقفہ آتا وہ سر ہلا ہلا کر ”واللہ۔۔۔واللہ“ پکارنے لگتے۔ منزل پر پہنچے تو مسافر اترنے لگے۔۔۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اُن صاحب سے کہا کہ حبیبی ہم حمراپہنچ گئے ہیں، اتر جایئے تو وہ خفا ہو کر کہنے لگے ”اُم کلثوم گا رہی ہو اور میں اُس کا گیت ختم ہونے سے پیشتر اٹھ کر چلا جاؤں۔۔۔ توبہ، یہ گستاخی مجھ سے نہ ہو گی۔۔۔ تم مجھے بے شک واپس لے چلو، جب یہ گیت جہاں بھی ختم ہوا وہاں اتر جاؤں گا“۔ اُم کلثوم نے 67ء کی تباہ کن عرب شکست کے بعد قسم کھا لی کہ وہ آئندہ پوری زندگی کوئی رومانوی نغمہ نہیں گائے گی، صرف ملّی نغمے گا کر اسرائیل کے خلاف آتش انتقام سلگائے رکھے گی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ اس نے عربی میں اقبال کے شکوہ جواب شکوہ کو کتنی مہارت اور دل گرفتگی سے گایا تھا۔۔۔ جب وہ فوت ہوئی تو مصر کی تاریخ میں اس کا۔۔۔ جمال عبدالناصر کے بعد سب سے بڑا جنازہ تھا۔۔۔ ان دنوں اُم کلثوم کی جگہ لبنانی گلوکارہ فیروز بے حد پسندیدہ ہے۔۔۔ مجھے ذاتی طو رپر عبدالوہاب کی موسیقی کی اثرانگیزی اِک عجیب عالم میں لے جاتی ہے۔
میں نے پہلی مرتبہ عبدالوہاب کو اپنی دوست جپسی کے فلیٹ میں سوئٹزرلینڈ میں آج سے چالیس برس پیشتر سنا تھا اور اُس کا اسیر ہوا تھا۔
بے شک موسیقی کے جائز اور ناجائز ہونے کے حوالے سے بہتر فرقوں کی مانند بہتّر مختلف عقیدے ہیں لیکن ”فتوحات مکیہ“ والے ابن العربی جن کی جائے پیدائش اُندلس میں واقع قصبے مُرسیہ میں مجھے حاضری کا اتفاق ہو چکا ہے ۔ اُن کا کہنا ہے کہ جس شخص پر موسیقی اثرانداز نہیں ہوتی وہ انسان کے درجے پر فائز نہیں ہو سکتا۔۔۔ علی ہجویری نے بھی اسے معیوب نہیں قرار دیا۔۔۔ مولانا روم کی مثنوی ”ہست قرآں در زبانِ پہلوی“ کاآغاز بھی ”سَنو“ سے ہوتا ہے، بانسری کی لَے سے ہوتا ہے۔۔۔ لحن داؤدی سے کون انکار کر سکتا ہے۔۔۔ بُلّھے شاہؒ ، شاہ حسینؒ ، شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ ، سچل سرمستؒ کے کلام راگوں کی

بنیاد پر رکھے گئے۔۔ اور کیا قرآن پاک ایک مسلسل دل میں اتر جانے والی نغمگی نہیں ہے۔۔ مصری قاریوں کی قرأت میں جو سحر طرازی ہے اُس میں بھی کیفیت راگ کی ہے۔۔ ہمارے مقدس جانور اونٹ بھی حُدی خوانی کی لَے سے مسحور ہو کر منزل کو جا لیتے ہیں۔۔ اس مختصر گزارش میں گنجائش نہیں ہے اور یہ ایسے پُرتعصب اور تنگ نظر زمانے ہیں کہ میں ٹیلی ویژن پر اُن دنوں کا ایک قصہ بیان کر سکوں جب میاں شہریار نے درود شریف کو موسیقی کے پس منظر میں محمد نثار حسین کے ایک ڈرامے کے لئے مرتب کیا تھا جس میں میں مرکزی کردار ادا کر رہا تھا اور کیسے ہم سب اس کی اثرانگیزی سے اشک بار ہو گئے تھے۔۔ ظاہر ہے بعد میں موسیقی حذف کر کے صرف اس کی لَے ڈرامے کا حصہ بنی اور میں اس درود شریف کی دل میں اتر جانے والی کیفیت بیان نہیں کر سکتا۔

کیا میں کسی ایک دُم پر پاؤں رکھ رہا ہوں یا بہت سی خشونت آمیز دُموں پر پاؤں رکھتا ہوں، میں ابھی سے معافی کا خواستگار ہوں۔۔ ہم نادان، بے راہرو لوگ ہیں پلیز درگزر کیجئے۔۔ بقول آپ کے بیگانے اور بھٹکے ہوئے لوگ ہیں۔

ایک اور عجیب حقیقت یہ ہے کہ بنیادی طور پر زیادہ تر یہ پنجاب کے باسی ہیں جو موسیقی او ررقص وغیرہ کی لغویات سے پرہیز کرتے ہیں۔ انہیں حرام قرار دے کر اجتناب کرتے ہیں جب کہ سندھی اور وہ بھی مسلمان ہی ہوا کرتے ہیں بے دریغ رقص کرتے موسیقی پر سر دُھنتے ہیں۔ بلوچ بھائی اپنے قدیم سازوں سے پیار کرتے ہیں اور الاؤ کے گرد اِک عالم وجد میں ناچتے ہیں۔۔ یہاں تک کہ پشتون بھائی بھی کچھ عار نہیں سمجھتے اور خٹک ڈانس میں تلواروں کے سائے میں رقص کرتے چلے جاتے ہیں۔۔ گلگت بلتستان میں تو دن بھر کی کوہستانی مشقت کی تھکن اتارنے کا واحد علاج رقص ہے، موسیقی ہے۔ شاید پنجاب کے لوگوں نے اپنی زبان اور ثقافت کو حقیر جانا، اس سے اجتناب کیا اور صرف عقیدے پر انحصار کیا تو وہ بے سروساماں رہ گئے۔

ہم دراصل اپنے زوال کے بہانے تلاش کرتے ہیں۔۔ اپنی محرومیوں کو طاؤس و رباب کے سپرد کر کے سرخرو ہو جاتے ہیں۔ ہم جدید علم و فضل، تحقیق اور جستجو سے اجتناب نئے زمانوں کی حقیقتوں کا سامنا نہ کرنے اور ذاتی عیش و عشرت کو شمار نہ کر کے۔۔ اپنی نالائقیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے صرف طاؤس و رباب کو موردالزام ٹھہراتے ہیں جبکہ ہمارے ہاتھ میں اب نہ شمشیر ہے اور سناں تو کب کی ٹوٹ چکی

"رانجھن یار طبیب و ڈاکٹر انیس احمد"

مستنصر حسین تارڑ

20-04-2014

ڈاکٹر انیس احمد دراصل ’رانجھن یار طبیب سدیندا‘ کی ایک من موہنی تفسیر اور تصویر ہے۔ ’کاغذ کے پھول سر پہ سجا کے چلی حیات۔ نکلی برونِ شہر تو بارش نے آلیا‘۔ انیس کو بھی ایسی بارش نے آلیا اور اس کے بھی سبھی کاغذ کے پھول بھیگ گئے۔ ان کا رنگ روپ بچھڑ گیا اور اس کے باوجود وہ ہمہ وقت مسکراتا ہوا ایک ایسا شخص ہے جو رانجھن یار بھی ہے اور ایک بے مثل طبیب بھی ہے۔ اس کی قربت کے تمنائی ہمیشہ دہائی دیتے ہیں کہ وہ۔۔ ’چھیتی بوڑھیں ویے طبیبائیں تے میں مر چلی آں‘۔ کسی وجہ سے سویر جب اس رانجھن یار کی موت نظر نہ آوے، نہ پنچھی چہکتے ہیں اور نہ گلوں میں رنگ بھرتے ہیں اور کچھ بیچارے تو بیمار پڑ جاتے ہیں۔

احمد ریاض ایسے نظریاتی اور اپنے کھرے شعر کے معجزوں سے دل میں جا کرنے والے شاعر کی رفاقت گویا ایک پارس تھی جس نے اسے بھی کندن کر دیا۔ ساحرؔ اور فیضؔ کا یہ رفیق احمد ریاض ہمیشہ پس پردہ رہا۔ اگرچہ اس کا تذکرہ ہر اس محفل میں آیا جس میں بڑی شاعری کی بات چل نکلی لیکن وہ تقریباً گمنام رہا۔۔ نوجوانی میں مر گیا۔ اس کا یہ بھتیجا اسی کی مانند نالائق نکلا۔ شعر کہتا رہا اور گمنامی کو ہی اپنا شعار کیا۔ ناموری اور شہرت کا تمنائی نہ ہوا۔ وہ شاعری کے عشق کو رسوا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ایسے لوگ کم کم ملتے ہیں اور ایسے ہی لوگ دراصل شاعر ہوتے ہیں۔ ہمارے پاس کچھ واجبی سے گشتی شاعر ہوتے ہیں جو ڈالر اور پاؤنڈ بھی اپنی پھیلی ہوئی جھولی میں بخوشی قبول کرتے ہیں۔ وہ اکثر یورپ اور امریکہ میں کسی گمنام، درد مند، متمول شاعر بلکہ عظیم شاعر کو دریافت کر لیتے ہیں۔ وطن واپسی پروہ نہ صرف ان کی مدح میں کالم تحریر کرتے ہیں بلکہ ان کے دیوانوں (یہ دیوان کی جمع ہے) کو توصیف کے دیباچے بھی قلمبند کرتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں وہ عظیم شاعر انہیں باقاعدگی سے آنے جانے کا ہوائی ٹکٹ بھیجتے

ہیں۔ اور وہ جب جاتے ہیں تو آنے کا نام نہیں لیتے اور ان کی خوب آؤ بھگت ہوتی ہے۔ بلکہ وہ بھابی کے پلاؤ سے اتنے لطف اندوز ہوتے ہیں کہ وطن واپسی پر اس پلاؤ کی شان میں اپنے کالم میں ایک بے مثال قصیدہ لکھ ڈالتے ہیں۔ اگلے برس بھابی کی جانب سے ہوائی ٹکٹ آجاتا ہے۔

کاش کہ انیس احمد بھی کسی دیار غیر میں گمنام پڑا ہوا ایک شاعرہوتا۔ میں اس کی شاعری کا دیباچہ لکھ کر انعام و اکرام اور پلاؤ وغیرہ کا حقدار ٹھہرتا۔۔ پر ’یہ نہ تھی ہماری قسمت‘۔ میں نے اسے لندن یا شکاگو کے ٹاؤن ہال میں نہیں، لاہور کے ماڈل ٹاؤن میں دریافت کیا اور اس کی شاعری کا اس قدر گرویدہ ہوا کہ ذاتی طور پر درخواست پیش کی کہ حضور ہم تو کان پر قلم رکھ کر صرف اس لیے گھر سے نکلتے ہیں کہ اگر کسی نے دیباچہ لکھوانا ہو تو ہم سے لکھوائے۔ تو میں نے بہرطور، آپ پسند کریں یا نہ کریں، آپ کے آئندہ شعری مجموعے کا دیباچہ لکھنا ہے۔ اگر نہیں لکھوائیں گے تو اس پارک میں جو ’تکیہ تارڑ‘ ہے اور جہاں آپ گھگو بن کر آ بیٹھتے ہیں بیٹھنے نہیں دوں گا اور آپ کا اٹھنا بیٹھنا میں حرام کر دوں گا۔ یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور وہ جسے بادلِ ناخواستہ کہتے ہیں اُس دل کے ساتھ مجبوراً مان گئے۔

میں نہایت سہولت کے ساتھ مروجہ دیباچہ نویس کے ’پہاڑے مع گُر‘ کے مطابق یہاں ان کے چیدہ چیدہ شعر درج کر کے سرخرو ہو سکتا تھا اور میں اس نیت سے ان کے شعری مجموعے کو بہ نظر غائر دیکھ کر اور یہ نظر جہاں کہیں بھی شعری فن کمال اور حسین انداز پر ٹھہری، اُس شعر پر سرخ مار کر سے نشان لگاتا گیا اور یقین کیجیے کہ تقریباً پورا مجموعہ لہولہان ہو گیا۔

میں خوب جانتا ہوں یہ نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں اس لیے میں یہ بھی جانتا ہوں کہ انیس اس پانچویں شعری مجموعے اور میرے دیباچے کے باوجود گمنام رہے گا اور اس کے کمال فن کی کوئی داد نہ دے گا۔ کسی تذکرے میں اس کا نام نہیں آئے گا۔ برسر دشنام بھی نہ آئے گا۔ وہ یونہی اپنے سفید بالوں اور چھریرے بدن کے ساتھ اپنے آپ میں مسکراتا ہر سویر پارک میں سیر کرتا رہے گا۔ اسے کچھ قلق نہ ہو گا کہ زمانے نے اس کی قدر نہ کی۔ اور وہ بھی تو زمانے کی پروا نہیں کرتا تھا۔ لیکن اس کے اندر تخلیق کی تپش بھڑکتی رہے گی۔ بظاہر وہ ہمارے درمیان موجود ہو گا لیکن خاموشی سے چپ چاپ اپنی جنوں خیزی کی حدت میں سلگتا جائے گا کہ۔۔ ’جنوں میں جتنی بھی گزری‘۔۔ جیسے سچل سرمست ہفت زباں شاعر کہلاتے ہیں اسی طور انیس احمد ہفت زباں نہ سہی کم از کم چہار زباں شاعر تو بہر طور ہیں۔ اُن کی بے تکلفی تو ظاہر ہے اردو سے ہے، فارسی سے بھی چھیڑ چھاڑ کر لیتے ہیں، چوری چھپے انگریزی میں بھی اظہار کرتے ہیں اور جب موج میں آجائیں تو اُن کی پنجابی شاعری میں چناب کی روانی آجاتی ہے۔۔ ایک زمانے میں جب کبھی تحریر کے دوران کہیں فارسی اور عربی سے پالا پڑتا تھا تو میں اپنی بیوی سے رجوع کر لیتا تھا، یوں بھی اس عمر میں آ کر بیوی سے صرف اسی نوعیت کا زبانی رجوع ہی ممکن رہ جاتا ہے۔۔ لیکن بیگم بربار فارسی یا عربی میں معاون ثابت ہونے سے پیشتر ناک چڑھا کر کہا کرتی تھیں، پتہ نہیں تم اپنے تئیں کیسے ایک ممتاز ادیب وغیرہ بن گئے ہو کہ تمہیں فارسی اور عربی کی نہ شُدھ ہے اور نہ بُدھ۔۔ تو اس طعنہ زنی سے تنگ آ کر اب میں انیس احمد سے رجوع کر لیتا ہوں اور وہ مجھے نہ صرف الفاظ کے معانی بتاتے ہیں بلکہ عربی فارسی کی پوری گرائمر بھی پڑھا دیتے ہیں۔ یوں جانیے جیسے صوفی تبسم، فیض صاحب کے مددگار ہوتے تھے ایسے انیس احمد ان زبانوں میں میرے رہنما ہو جاتے ہیں بلکہ اُن کی اہلیہ بھی شعری ذوق اور زباں دانی میں اُن سے کم نہیں۔۔ ایں ہمہ خانہ۔

مجھے نہیں معلوم کہ پنجاب آرٹس کونسل کے خواجہ خضر، معاف کیجیے گا نظر خواجہ کو کیسے یہ خیال آ گیا کہ اس شہر میں ایک بے مثل شاعر گمنام پڑا ہے تو اُسے گمنامی کی دھول سے جھاڑ پونچھ کر پاک ٹی ہاؤس میں اُن کے ”جنوں میں جتنی بھی گزری“ شاعری کے مجموعے کی ایک تقریب رونمائی منعقد کر ڈالی جائے۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ بڑی شاعری اب بھی ہو رہی ہے لیکن بُری شاعری کی بھرمارنے اُسے اتنا خوفزدہ کر رکھا ہے کہ وہ ماڈل ٹاؤن پارک سے باہر نہیں آتی۔۔ ڈاکٹر انیس احمد بجائے خوش ہونے کے فکر مند ہو گئے ”تارڑ صاحب۔۔ پلیز ان لوگوں سے کہیں کہ۔۔ گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے۔۔ مجھے کیوں بے آرام کرتے ہیں۔۔ میرے لیے یہی کافی ہے کہ آپ ایسے چند دوست پارک میں میری شاعری سن لیتے ہیں، پلیز میں مشہور نہیں ہونا چاہتا۔۔ انہیں روکیں“

چنانچہ ایک شب ڈاکٹر انیس احمد کو باقاعدہ باندھ کر بے بس کر کے پاک ٹی ہاؤس کی بالائی منزل پر اُن کے اعزاز میں ایک محفل بہرطور منعقد کی گئی اور مجھے خدشہ تھا کہ وہ کسی بھی لمحے فرار ہو سکتے ہیں اس لیے تقریب کے دوران میں نے اُن پر کڑی نظر رکھی۔۔ غالب کے حافظ اور شعر شناس فرخ رضوی کرس�ئ صدارت پر جلوہ گر ہوئے اور اس عہد کے ممتاز شاعر حفیظ طاہر نے نظامت کے فرائض سر انجام دیئے اور خوب سر انجام دیئے۔۔ پارک کے تمام دوست اُن کی محبت میں بندھے چلے آئے اور انیس احمد کو نہایت شاندار لفظوں میں خراج تحسین پیش کیا اور ان میں شان صاحب کی شان نرالی تھی۔ بعد ازاں حسب دستور شاعر کا کلام اُن کی زبان سے سنا گیا اور فرمائش در فرمائش سنا گیا۔۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ

جب میں نے ”جنوں میں جتنی بھی گزری“ کے اوراق پر درج اپنے پسندیدہ اشعار پر ایک سرخ مار کر سے نشان لگائے تو پورا دیوان لہولہان ہو گیا تو کچھ حرج نہیں کہ ان میں سے چند اشعار یہاں نقل کر دیئے جائیں۔۔

میری تحریر میں ہے وقت کا منظر نامہ۔۔ میں جو کہتا ہوں وہ دیوار پہ لکھا سمجھو۔’
خمخانۂ تسنیم و کوثر، اُس کے زیر دسترس۔۔ اُس کے کرم کا منتظر، تشنہ لب ہر مے گسار’
عہد خون آشام میں، سر چشمۂ رحمت ہے وہ۔ وہ ہے نقیب آشتی، امن کا وہ پاسدار
ترکہ اُس کا حرف قرآں، باعث تسکین جاں۔ جس کا ایک ایک لفظ ہے، آ گہی کی جوئبار
گل فروشوں سے عقیدت ہے ہمیں، گل سے نہیں۔ شعبدہ بازوں کو ہم، ارباب ہنر کہتے ہیں’
یہ تفاخر، یہ تکبر، یہ رعونت، یہ غرور، خاک کے پُتلے کو دنیا میں بشر کہتے ہیں
ہم نہ واعظ ہیں، نہ ناصح ہیں، نہ مفتی نہ ولی، پھر بھی جو کہتے ہیں بے خوف و خطر کہتے ہیں۔
خیال حور نے اس کو کیا ہے دیوانہ، فقیہہ شہر سے خوباں کی بات کیا کیجیے’
ہر ایک شخص کے دل میں نہاں ہے بت خانہ۔ دیار کفر میں ایمان کی بات کیا کیجیے
ہمارے شہر میں پھرتے ہیں ظلمتوں کے نقیب۔ اب ان سے صبح درخشاں کی بات کیا کیجیے
گرمئ صَہبا ہے کہ عارض کی تمازت۔ شیشے میں اتر آئی ہے سرخی تیرے طلب کی’
میں حدی خواں ہوں، مجھے وسعت صحرا ہے عزیز۔ میں کسی گنبد میں مقید کوئی واعظ تو نہیں’
محفل رنداں سے مستی کا سماں غائب۔ مے خانہ ہوا ویرانہ اور پیر مغاں غائب’
تکیہ یہ فقیروں کا، ہے چشم براہ کب سے۔ اے پیر جہاں گرداں رہتے ہو کہاں غائب

پنجابی ہی کیوں عظیم داستان گو ہیں
مستنصر حسین تارڑ
23-04-2014

برصغیر اور خصوصی طور پر پنجاب کے باسیوں کی خصلت میں داستان گوئی کا فن شامل ہے۔۔ میں ہمیشہ اقرار کرتا ہوں کہ ایک کہانی کی تفصیل سے بیان کرنا، اُسے دلچسپ اور سحر انگیز رکھنا میں نے اپنی والدہ اور بڑی خالہ جان ثریا بیگم سے سیکھا۔ اُن دنوں تو میں اُن کے ایک معمولی واقعے کو مکمل جزیات اور تفصیل سے بیان کرنے کے دوران اُکتا جاتا تھا لیکن مستقبل میں مجھ پر کھلا کہ یہ کہانی کہنے کی تفصیلات اور مشاہدے کی باریک بینی کے اولین سبق تھے جنہوں نے بعد میں میری رہنمائی کی۔۔ مثلاً میں گاؤں جاتا ہوں اور ایک دوپہر خالہ جان سے پوچھتا ہوں کہ خالہ جان آج دوپہر کے کھانے میں کیا پکایا ہے تو خالہ جان آغاز کرتی ہیں، ماں رَجھ گئی۔۔ ہے یعنی ”تمہیں دیکھ کر مجھے بھوک نہیں رہی، میں سیر ہو گئی ہوں“ یہ اُن کا خوبصورت تکیہ کلام تھا تو وہ کہتی ہیں۔۔ میں ناں جوہڑ کے کنارے والی گلی میں جا رہی تھی اور جوہڑ میں تین بطخیں تیر رہی تھیں، ایک سیاہ رنگ کی تھی اور دو ڈب کھڑبی تھیں، وہاں مجھے فاطمہ کمہارن مل گئی، وہ کہنے لگی چوہدران کدھر جا رہی ہے تو میں نے کہا میں جدھر بھی جا رہی ہوں تو بتا اتنے روز کہاں دفع ہو گئی تھی۔ وہ کہنے لگی۔ میرے سسر کا سگا چاچا فوت ہو گیا تھا، اچھا بھلا کنویں پر گیا اور دھڑام سے گرا منڈیر پر اور مر گیا۔ میں نے فاطمہ سے اُس کے سسر کے چاچے کا افسوس کیا اور پھر جولاہوں کی گلی میں آئی ہوں تو خورشیداں جولاہی اپنے صحن میں بیری کے درخت کے سائے میں چرخہ کاٹ رہی تھی اس نے آواز دی کہ ثریا بیگم یہ تو کوئی بات نہیں کہ چپکے سے گزری جاتی ہو، یاد نہیں جب ہم دونوں بیساکھی کے دنوں میں پینگیں چڑھایا کرتے تھے۔۔ خورشیداں کا بڑا بیٹا دبئی گیا ہوا ہے اور اُس نے ایک بڑا سوٹ کیس کپڑے لتّے کا وہاں سے بھیجا تھا۔ مستنصر میں کیا بتاؤں کہ اُس میں کیسے کیسے جوڑے تھے۔ دو سوٹ تو تھے کمخواب کے۔۔ ایک سوٹ شنگھائی کا تھا ریشمی۔۔ تین تکیے کے غلاف تھے جن پر گلابوں کے چھاپے تھے۔۔ یاد نہیں آ رہا کہ ہر تکیے کے غلاف پر کتنے گلاب تھے۔۔ پتہ نہیں چار تھے یا پانچ تھے۔۔ اور ہاں میں تو بھول ہی گئی ولایتی صابن بھی تھے۔۔ یاد نہیں آرہا اُن کے رنگ کیا تھے۔۔ اور بالآخر مستنصر بھانجے کا پیمانہ صبر لبریز ہو جاتا ہے اور وہ کہتا ہے، خالہ جان۔۔ میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ دوپہر کے کھانے میں کیا پکا ہے تو خالد جان بے حد خفا ہو کر کہتی ہیں ”ایک تو تم میں صبر ہی نہیں ہے۔ بے صبرے کہیں کے۔۔ ٹینڈے پکے ہیں اور ٹینڈے نہایت نرم اور نرول وہ ارائیں نہیں ہے بھائی شفیق وہ دے گیا تھا۔۔“ میری امی جان بھی ہر دو تین ماہ کے بعد سامان باندھ کر ملازم سے اٹھواتیں اور چپکے سے روانہ ہو جاتیں۔۔ شام کو ابا جی گھر آتے تو پوچھتے امی کہاں ہے تو ہم کہتے وہ روانہ ہو گئی ہیں۔ دراصل وہ حساب رکھتی تھیں کہ اپنے گاؤں کہ برادری میں، آس پاس کے دیہات میں، دور پار کے عزیزوں میں، اپنے کمہاروں، جولاہوں، ترکھانوں، لوہاروں، میراثیوں وغیرہ میں جو بچے پیدا ہوئے ہیں اور جو فوت ہو گئے ہیں، امی جان باقاعدگی سے ابا جی سے پوچھے بغیر مبارکباد دینے اور تعزیت کرنے کے لیے روانہ ہو جاتی تھیں۔۔ اور

جب وہ واپس آتیں تو پوری دوپہر اپنے سفر کی کتھا بیان کرتی رہتیں اور ہم جمائیاں لیتے رہتے۔۔ یہاں سے مجھے بس مل گئی جو مجھے سیدھی گجرات لے گئی۔ بس میں تیس مسافر سوار تھے۔ ایک بارات بھی تھی جو دلہن لے کر جا رہی تھی، دلہن کا سرخ جوڑا جس پر مکیش کے ٹانکے تھے مجھے بہت بھلا لگا۔۔ اندر سے خوش تھی پر جھوٹ موٹ آنسو بہاتی تھی۔ اُس کے کانوں میں سونے کے جھمکے تھے۔۔ ہر جھمکے میں بیس بیس سرخ نگینے تھے البتہ بائیں کان کے جھمکے کا ایک نگ غائب تھا۔۔ کہیں گر گیا ہو گا اور ۔۔ دلہن کے بائیں ہاتھ کی تیسری اُنگلی میں جو دو انگوٹھیاں تھیں۔۔ ازاں بعد وہ درجن بھر نوزائیدہ بچوں کے ناک نقشے کی تفصیل بیان کرتیں۔ جہاں جہاں تعزیت کے لیے گئی تھیں تمام فوت ہو چکے خواتین و حضرات کی آخری سانسوں کی روئداد سناتیں اور پھر واپسی کا سفر بھی اسی تفصیل کے ساتھ۔۔ پوری دوپہر گزر چکی۔۔ اور بیان مکمل نہ ہوتا تھا۔ میں اپنی والدہ کا بڑا بیٹا ہوں اور خالہ جان کا عزیز جان بھانجا تو مجھ میں بھی تفصیل اور مشاہدے کی داستان گوئی کی یہی خصلت درآئی ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ قرۃ العین حیدر کے سوا اردو ادب کے مہمان اور عظیم داستان گو، ناول نگار، کہانیاں لکھنے والے سب کے سب پنجاب کی سر زمین کے بیٹے تھے۔۔ کوئی تیس پینتیس برس پیشتر کا قصہ ہے کہ ایک امریکی اردو دان لِنڈا ونیٹک برکلے یونیورسٹی کی جانب سے جدید اردو افسانے پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھنے کے لیے تحقیق کے لیے پاکستان آئیں۔ انہوں نے برصغیر کے چالیس افسانہ نگاروں کو منتخب کیا اور اُنہی دنوں میرا تادم تحریر پہلا اور آخری افسانوی مجموعہ ”سیاہ آنکھ میں تصویر“ شائع ہوا تھا چنانچہ میں بھی اُن کی فہرست میں آگیا۔ وہ میری رہائش گاہ پر تشریف لائیں اور ایک تفصیلی انٹرویو کیا جو بعد میں ”ماہ نو“ میں شائع ہوا۔۔ اور لِنڈا نے پہلا سوال یہ کیا کہ آپ فکشن یا نثر ہی کیوں لکھتے ہیں؟ تو میرا جواب تھا کہ اس لیے کہ میں ایک پنجابی ہوں۔ لِنڈا کو اس عجیب سے جواز کی توقع نہ تھی، کہنے لگیں ”کیا آپ اس پر کچھ روشنی ڈال سکتے ہیں؟“ تب میں نے قرۃ العین حیدر کا تذکرہ کرنے کے بعد پنجاب سے متعلق اور ٹھیٹھ پنجابی فکشن رائٹرز کے نام گنوانے شروع کر دیئے، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ، سعادت حسن منٹو، کنہیا لال کپور، پطرس بخاری، اوپندر ناتھ رشک، رام لعل، عبداللہ حسین، فکر تونسوی، ممتاز مفتی، شفیق الرحمن، اے حمید، سریندر پرکاش، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، نثار عزیز بٹ، جمیلہ ہاشمی، وغیرہ وغیرہ۔۔ تو لِنڈا نے اپنا ٹیپ ریکارڈر بند کرکے کہا ”تارڑ صاحب۔۔ کیا یہ واقعی ایک حقیقت ہے۔ مجھے اپنے تھیسس کو دوبارہ لکھنا پڑے گا۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ اردو زبان کے سب سے عظیم لکھاری جو تھے اور ہیں اُن کی مادری زبان اردو نہیں پنجابی ہے“۔۔

ویسے یہ بھی عجیب بات ہے کہ پاکستانی ناول نگار جو انگریزی میں لکھتے ہیں اُن میں سے بیشتر کا تعلق پنجاب سے ہے۔ محمد حنیف، ندیم اسلم، محسن حامد، بیپسی سدھوا، عظمیٰ ، اسلم خان، سیالکوٹ کے غوث، عمر شاہد حامد۔۔۔ سب کے سب اُس سرزمین سے جڑے ہوئے ہیں جس کا نام پنجاب ہے۔

داستان گوئی پنجاب کی سرشت میں گُندھی ہوئی ہے اور اس میں میری والدہ اور بڑی خالہ جان بھی شریک ہیں جنہوں نے اس دوپہر کے کھانے کے لیے ٹینڈے بنائے تھے اور میں ہی بے صبر تھا جو اُن کی ٹینڈا داستان نہ سن سکا تھا۔

کیا ایک کنگرو یا ست رنگے طوطے کے لیے آسٹریلیا کا سفر جائز ہے

مستنصر حسین تارڑ

27-04-2014

دنیا کے بلند ترین میدان دیوسائی کی جانب سفر کرتے ہوئے میں وسوسوں کا شکار تھا۔ کیا صرف ایک بادل کے لیے، ایک پھول کے لیے اور ایک ریچھ کے لیے دیوسائی کے مرگ اور موسموں کی جانب سفر کرنا جائز ہے کہ دیو سائی جو تقریباً چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے وہاں آسمان قریب آجاتا ہے اور اس پر جو بادل تیرتے ہیں وہ عجیب طلسم شکلوں کے حیرت بھرے ہوتے ہیں، اُس کی بلندی پر جو پھول کھلتے ہیں اُن کے رنگ انوکھے اور خوابناک ہوتے ہیں اور وہاں بھورے ہمالیاتی ریچھ رہتے ہیں جو برفانی موسموں میں غاروں میں پوشیدہ ہو کر نیند میں چلے جاتے ہیں تو کیا ایک بادل، ایک پھول کے لیے اور ایک ریچھ کے لیے اتنی کٹھن مسافتیں طے کرنا جائز ہے۔۔ اور بعد میں آشکار ہوا کہ جب تک میں نے دیو سائی کے بادل، پھول اور ریچھ نہ دیکھے تھے میں نے گویا دنیا میں کچھ نہ دیکھا تھا، میں نامکمل تھا اور مجھے ایک بادل ، پھول اور ریچھ نے مکمل کر دیا۔

اور اب ایک مدت کے بعد میں پھر اسی نوعیت کے وسوسوں کا شکار تھا۔ کیا ایک کنگرو، ایک کورلا ریچھ، ایک

ست رنگے طوطے، ایک بادبانی کشتی کی شکل کا آپرا ہاؤس اور صحراؤں میں پڑی دنیا کی سب سے بڑی چٹان آلورو دیکھنے کے لیے ایک اجنبی براعظم کی جانب پرواز کرنا جائز ہے۔۔۔ آسٹریلیا تک کا تھکا دینے والا طویل ہوائی سفر جائز ہے۔

جی ہاں، میں بالآخر آسٹریلیا کا مسافر تھا۔ میں نے یورپ بہت دیکھا، امریکہ بھی کچھ دیکھ لیا، افریقہ کو صر ف چھوا اور ایشیا کا تو میں باشندہ تھا اور یہ صرف آسٹریلیا تھا جہاں میرے قدم آج تک نہ پہنچے تھے۔ اور سچ پوچھئے مجھے کچھ اتنی خواہش بھی نہ تھی آسٹریلیا دیکھنے کی۔۔۔ کون جائے لاہور کی گلیاں چھوڑ کر۔۔۔ لیکن وہاں سڈنی میں کوئی کوچۂ ثقافت نام کی ادبی تنظیم تھی اور یہ کوچہ کسی جاوید نظر نے آباد کر رکھا تھا اور وہ مجھے دن رات فون کرتے تھے کہ پلیز ہمارے کوچے میں چلے آئیے۔۔۔ اور اُن کے لہجے میں محبت کے رچاؤ کے سوا اور کچھ نہ تھا۔۔۔ اور یوں بھی آسٹریلیا میں میرے دلدار رہتے تھے، بے وفا سہی پر رہتے تھے، انگلستان کے زمانوں کا میرا دوست سکھدیپ سنگھ رَنگی رہتا تھا، میری کوہ نو ردیوں کا نوجوان برخور دار ساتھی سلمان رہتا تھا۔ چنانچہ میں مائل ہو گیا۔ آسٹریلوی ویزے کے لیے قدرے خجل خواری ہوئی بلکہ 75برس کا ہو جانے کی پاداش میں میرا میڈیکل ٹیسٹ ہوا اور اس ٹیسٹ کی انچارج لیڈی ڈاکٹرز نے بجائے اس کے کہ وہ مجھے ٹھوک بجا کر دیکھتے، میرے ساتھ تصویریں اتروانے اور کتابوں پر آٹوگراف لینے میں زیادہ دلچسپی رکھتی تھیں، اچھی خوش شکل بچیاں تھیں، ٹھوک بجا کر دیکھ لیتیں تو اچھا تھا۔

میمونہ جو میری اہلیہ ہوا کرتی ہیں، میرے ہمراہ تھیں۔۔۔ جب سے میں بے ضرر ہوا تھا میں غیر ملکی دعوتوں کے جواب میں میمونہ کو بھی ہم رکاب کر لیتا تھا۔

بینگ کاک یا بنگاک ایئر پورٹ عجیب وحشت کی بھول بھلیاں تھا۔ اور تب میں نے اپنی پی آئی اے کو بہت یاد کیا۔۔۔ یہ تھائی ایئر لائن کسی شمار میں نہ تھی، تھائی لینڈ جو اپنے ”تھائیز“ کی فروخت سے متمول ہو گیا تھا کیا دونمبر ملک تھا پاکستان کے مقابلے میں۔ اور آج ہم پاکستانی دربدر ہوتے پھرتے تھے کہ بیشتر اداروں کی مانند ہم نے۔۔۔ گریٹ ٹو فلائی ود۔۔۔ پی آئی اے کو بھی نوچ کھایا۔۔۔ اس کے جہاز ناکارہ ہو گئے۔ متعدد ملکوں نے اس کے جہازوں کو لینڈ کرنے کی اجازت منسوخ کر دی کہ ہم تو ملک میں اسلام نافذ کرنے کے در پے تھے اور سیاست دان، صحافی، سرمایہ دار، دفاعی ادارے اور دانشور اس ملک کی بوٹیاں نوچ رہے تھے۔

بہر طور یقین کیجیے اس زوال میں بھی پی آئی اے کی سروس بہترین ہے، عملہ مدد گار ہے اور پھر یقین کیجیے کہ تھائی ایئر لائن سے کہیں بہتر ہے۔

سڈنی تک کی طویل پرواز کے دوران ہم ایک تقریباً ویران جہاز میں ٹانگیں پسارے استراحت فرماتے رہے۔۔۔ ناریل کے تیل سے تیار کردہ کھانے ہماری جان کا عذاب اور معدے کا امتحان تھے۔۔۔ میں اتنا بیزار ہو چکا تھا، تھک چکا تھا کہ جب کوئی پاکستانی مسافر مجھے پہچان کرپوچھتا ”تارڑ صاحب آپ آسٹریلیا جا رہے ہیں؟“ تو میں کہتا کہ ۔۔۔ نہیں میں تو ٹمبکٹو جا رہا ہوں۔۔۔ آپ کہاں جا رہے ہیں۔

سڈنی ایئر پورٹ کے عملے نے ہم سے نہ سوال کیے نہ اعتراض کیے، لمحوں میں فارغ کر دیا۔ ہم اپنا سامان دھکیلتے باہر آئے تو بارش ہو رہی تھی۔۔۔ اور اس بارش میں بھیگتے ہم کیا دیکھتے ہیں کہ ایک سفید ریش حضرت، لمبے کرتے اور گھٹنوں سے اوپر کے پاجامے میں، اور اُن کے ہمراہ کچھ خواتین بھی ہیں جو حجاب میں ہیں اور اسی نوعیت کے شرعی نوعیت کے کچھ لوگ ہماری جانب لپکتے چلے آ رہے ہیں۔

مونا۔۔۔“ میں نے براساں ہو کر کہا ”یہ ہم سڈنی میں آئے ہیں یا رائے ونڈ کے تبلیغی اجتماع میں چلے آئے ” ہیں۔۔۔ فرار نہ ہو جائیں؟“

اس سے پیشتر کہ ہم فرار ہوتے ان خواتین اور حضرات نے ہمیں دبوچ لیا۔۔۔ چنانچہ یہ جاوید نظر تھے۔۔۔ کہتے ہیں کہ متشرع ہونے کا آسان ترین نسخہ یہ ہے کہ آپ بڑے بھائی کا کرتا پہن لیں اور چھوٹے بھائی کی شلوار زیب تن کر لیں۔۔۔ جاوید کے بھائیوں میں ”مونتاژ“ ایسے ادبی جریدے کے مدیر اقبال نظر تھے اور مصور اور مجسمہ ساز انجم ایاز تھے۔۔۔ جانے جاوید نے کس کی شلوار اور کس کا کرتا پہن رکھا تھا۔

جاوید کے ہاں کھانے کا اہتمام تھا اور پھر ریحان علوی جو آئی ٹی انجینئر ہیں اور ریڈیو کے معروف براڈ کاسٹر ہیں ہمیں اپنی بیگم درخشاں کے ہمراہ اپنے گھر لے گئے، بے شک ان دونوں میاں بیوی کے دل میں ہمارے

لیے بہت جگہ تھی لیکن وہ کمرہ نما جس میں ہمیں ٹھہرایا گیا، قدرے مختصر تھا، ڈبل بیڈ پر پہلے میمونہ لنگر انداز ہوئی اور اس کے بعد میں دراز ہوا۔ قدرے مختصر تھا۔۔۔ بعض اوقات انسان کا دل چاہتا ہے کہ دل میں بے شک جگہ کم ہو لیکن کمرے میں جگہ ذرا زیادہ ہو۔۔۔ اور پھر واش روم بھی کمرے کے باہر واقع ہوا کرتا تھا۔ اور اس عمر میں واش روم کی قربت بے حد عزیز ہوا کرتی ہے۔

صبح سویرے درخشاں ایک معصوم سادہ روح ہمارے ناشتے کے انتظامات میں بھاگتی پھرتی تھی، باؤلی ہوئی جاتی تھی۔

اور باہر ایک سویر تھی، آسٹریلیا میں ہماری پہلی سویر تھی اور دور کہیں سے طوطوں کے چہکنے کی (آوازیں آتی تھیں۔ (جاری ہے

بلو ماؤنٹین اور شوکت مسلمین کے ساتھ پارلیمنٹ میں ناشتہ

مستنصر حسین تارڑ

30-04-2014

ہم نیلے پہاڑوں کی جانب سفر کرتے تھے۔۔۔ سڈنی سے تقریباً ایک گھنٹے کی مسافت پر واقع ”بلوماؤنٹین“ دیکھنے جاتے تھے جہاں اتنے گھنے جنگل ہیں کہ پرندے وہاں آشیانے نہیں بناتے، وہ ان جنگلوں کی گھناوٹ میں اُلجھ کر آشیانے کا رستہ بھول جاتے ہیں اور وہاں تین بہنیں تھیں جن سے میں ملنا چاہتا تھا۔

سرزمین کیسی بھی ہو، بنجر ہے آباد ہو یا صحرا ہو یا وہاں کے درختوں میں رنگین طوطوں کے غول غُل کرتے ہوں وہ سرزمین آپ کے دل میں صرف اس لئے اترتی ہے کہ وہاں آپ کا کوئی پیارا، آپ کا محبوب، کوئی یار قدیم آباد ہو۔۔۔ اس کی شکل آپ اس سرزمین کے نقشوں میں دیکھتے ہیں۔۔۔ اور آسٹریلیا میں میری کوہ نوردیوں کا ساتھی بھالو سلمان رشید تھا جس نے شادی کی پہلی شب اپنی ڈاکٹر بیگم عائشہ سے کہا تھا کہ دیکھو مجھ میں صرف دو کمزوریاں ہیں، ایک فوٹوگرافی اور دوسری تارڑ زدگی۔۔۔ تم نے اعتراض نہیں کرنا۔ آسٹریلیا آنے کی خبر سلمان تک پہنچی تو اس نے شکرانے کے طور پر اپنے گھر کے درختوں میں پوشیدہ کاکاٹو رنگین طوطوں کو مونگ پھلی کے دانے کھلائے۔۔۔ اس کے متعدد فون آ چکے تھے۔۔۔ اور پھر وہاں سکھدیپ سنگھ رنگی تھا، انگلستان کے زمانوں کا میرا قدیمی یار جس کا تذکرہ میرے اولین سفرناموں ”نکلے تری تلاش میں“ اور ”خانہ بدوش“ میں ہے اور آج بھی میرے پڑھنے والے اسے اپنا پسندیدہ کردار ٹھہراتے ہیں۔۔۔ سکھدیپ سنگھ رنگی کا خاندان تہران میں کئی وسیع کاروباروں کا مالک تھا، امام خمینی کی آمد سے پیشتر اُنہوں نے سب کچھ سمیٹا اور آسٹریلیا منتقل ہو گئے۔ بدقسمتی سے جہاں کہیں بھی مذہب کے نام پر کوئی حکومت اقتدار میں آتی ہے تو اس کا مقدس فرض اولین یہ ہوتا ہے کہ اقلیتوں کی مناسب گوشمالی کی جائے۔۔۔ ایران میں بہائی فرقے کی شامت آ گئی، مصر میں کوٹپک عیسائیوں کا گھیراؤ کیا گیا، افغانستان میں شمال کے لوگوں پر قہر نازل ہو گیا اور پاکستان۔۔۔ اگرچہ یہاں مذہبی حکومت نہیں ہے لیکن زیرعتاب عیسائی اور ہندو آ جاتے ہیں چنانچہ سکھدیپ کے خاندان نے مناسب جانا کہ آسٹریلیا میں منتقل ہو کر قسمت آزمائی کی جائے۔۔۔ میں نے جب سکھدیپ کو فون کر کے کہا کہ۔۔۔ میں یکم اپریل کو سڈنی میں وارد ہو رہا ہوں۔۔۔ میرا کمرہ تیار رکھو تو وہ کہنے لگے ”اوئے چوہدری واہگرو کے خالصے کو اپریل فول بناتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔۔۔ اوئے تو مجھے تقریباً چالیس برس پیشتر تہران میں ملا تھا اور ہم آدھی رات کو کیسپئین سمندر دیکھنے گئے تھے۔۔۔ میں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں مجھ سے مذاق نہ کر۔۔۔ مجھے اپریل فول نہ بنا۔۔۔ تو نے کہاں آسٹریلیا آنا ہے“۔

میں نے بہتیری قسمیں کھائیں کہ یہ محض اتفاق ہے لیکن میں واقعی یکم اپریل کو سڈنی میں لینڈ کر رہا ہوں لیکن سکھدیپ نے ماننے سے انکار کر دیا۔۔۔ سڈنی پہنچ کر جب میں نے اسے فون کیا تو وہ اتنا جذباتی ہو گیا کہ اس کی آواز رُندھ گئی ”چوہدری۔۔۔ چھوڑ ان ادبی دوستوں اور محفلوں کو سیدھا میرے پاس آ، میں اور رُوپی تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔۔۔ اور ہاں شیرا بھی تمہارا انتظار کر رہا ہے وہ میرا لاڈلا کُتا ہے“۔

جاوید نظر نے اپنے کام اور تبلیغ سے چھٹی کر رکھی تھی اور وہ مجھے ملک ملک کے ریستورانوں میں لئے

پھرا۔۔ چینی، لبنانی، پاکستانی، ترکی کھانے کھلا کھلا کر مجھے بے حال کر دیا۔۔ اس دوران اس کے ہاں عظمیٰ گیلانی سے بھی ملاقات ہو گئی۔۔ عظمیٰ گیلانی، روحی بانواور خالدہ ریاست اورایک زمانے میں ٹیلی ویژن کے ڈراموں کی شہزادیاں تھیں۔ میں نے بھی کچھ ڈراموں میں عظمیٰ کے ساتھ اپنی اداکاری کے ”جوہڑ“ دکھائے تھے۔ وہ ان دنوں یہیں آسٹریلیا میں زندگی کے آخری ایام ماضی کی یادوں میں گم۔۔ زمانے سے شکایت کرتی۔۔کہ یہاں اسے کون پہچانتا تھا، شہرت تو ایک بے وفا محبوبہ ہوتی ہے۔۔ آج تمہاری آغوش میں اور کل کسی اور کی بغل میں۔۔ عظمیٰ زندگی گزارتی تھی، اس نے کوچہ ثقافت کی محفل کی میزبانی کرنی تھی، ہم دونوں نے گئے وقتوں کو یاد کیا، جو دوست ٹیلی ویژن کے بچھڑ چکے تھے ان کے لئے آبدیدہ ہوئے۔

اس دوران سڈنی پارلیمنٹ کے واحد مسلمان ممبر شوکت مسلمین نے مجھے پارلیمنٹ میں ناشتے کے لئے مدعو کیا، وہ لبنانی ہیں لیکن مسلمان کمیونٹی کے لئے دن رات ایک کرتے ہیں۔۔ کہنے لگے ”تارڑ صاحب یہاں صرف ساٹھ ہزار یہودی ہیں اور وہ سب متحد اور متمول ہیں، معاشرے میں ایک قابل قدر مقام رکھتے ہیں اور ہم مسلمان تین چار لاکھ ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرتے ہیں، فرقہ بندی عروج پر ہے، متحد ہو جائیں تو آسٹریلیا میں ایک بڑی قوت کے طور پر ابھر سکتے ہیں۔ میں نے شوکت مسلمین کی خدمت میں ایک سندھی اجرک پاکستان کی جانب سے پیش کی جسے اوڑھ کر وہ ایک لال شہباز کے ملنگ نظر آنے لگے۔ انہوں نے مجھے ایک خوبصورت کلاک تحفے کے طور پر عطا کیا۔۔ پارلیمنٹ میں ان کے ذاتی کمرے کی کھڑکی سڈنی کے سب سے دل کش منظر پر کھلتی تھی۔ کمرے میں مہاتما گاندھی کی تصویر آویزاں تھی کہ شوکت کے بقول وہ امن اور آشتی کا پیغام بر تھا۔۔ جو نیلسن منڈیلا کا آئیڈیل تھا۔۔ اس کا پیرطریقت تھا۔

نیلے پہاڑوں کے قریب پہنچے تو پھوار شروع ہو گئی اور مجھے شک ہوا کہ برستی بوندیں بھی نیلاہٹ میں رنگی ہوئی ہیں۔ کیسا دلفریب اور دل میں اتر جانے والا قصبہ تھا اور وہاں تاحد نظر جو پہاڑ اور جنگل تھے وہ سب ”میں نیل کرائیاں نیلکاں، میرا تن من نیلو نیل‘ کی تفسیر تھے۔۔ ہم نے ایک کیبل کار میں سفر کیا اور بہت گہرائی میں آبشاریں گرتی تھیں۔۔ اور پھر بارشوں سے بھیگا ایک جنگل تھا جس میں کیسے کیسے شجر اور اَن دیکھے بوٹے اور جھاڑیاں تھیں۔ میری شلوار قمیض اور بلیزر کا رنگ بھی نیلا تھا تو میں تو نیلاہٹ میں رنگا گیا۔۔ بلو ماؤنٹین ایک ناقابل فراموش منظر والا تجربہ تھا۔۔ اور یہ مجھ تک جاوید نظر کے توسط سے آیا۔

اقرار کرنا چاہئے کہ جب آپ ایک نئے براعظم آسٹریلیا کے شہر سڈنی میں ایک مسلمان علاقے میں سے گزرتے ہیں تو کوئی پاکستانی خاتون باقاعدہ آپ کا ہاتھ تھام لیتی ہے کہ آپ صبح کی نشریات کے چاچا جی ہیں، کوئی بوڑھا ایک کتاب آگے کر کے آٹوگراف طلب کرتا ہے اور کوئی شخص بلاتکلف آپ کو گلے لگا لیتا ہے کہ تارڑ صاحب آپ۔۔ اقرار کرنا چاہئے کہ بہت اچھا لگتا ہے، بندہ مزید جھک جاتا ہے، شرمندہ ہوتا ہے کہ رب العزت نے مجھے اس عزت سے سرفراز کیا۔۔ جس کا میں حقدار نہ تھا۔

کوئی ایک رنگین پروں والا طوطا تھا جو میری آمد پر خوش تھا۔ گیت گاتا، چہکتا تھا اور مجھے آسٹریلیا میں خوش آمدید کہتا تھا۔ (جاری)

“کچھ باتیں فن کی، کچھ من کی اور ڈاکٹر سعید خان کا دریائی گھر’

مستنصر حسین تارڑ

04-04-2014

سڈنی کے اندر کہیں قدیم طرز تعمیر کا، کولونیئل نہایت بلند چھت اور شہتیروں والا ایک وسیع ہال تھا جہاں کوچۂ ثقافت کا تخلیقی بازار سجنے کو تھا۔۔ ہال اتنا بڑا تھا کہ جاوید نظر کو خدشہ لاحق ہوا کہ یہ شاید بھرنہ پائے سونا پڑا رہے۔۔ بھلا ایک پاکستانی ادیب کی گفتگو سننے اور ایک مصور کی تصویر دیکھنے تیس ڈالر کا ٹکٹ خرید کر کون آتا ہے۔۔ اور یوں بھی سڈنی شہر میں کتنے پاکستانی ہوں گے جنہیں ادب کا عارضہ لاحق ہے۔۔ لیکن ہوا یہ کہ کچھ تو جاوید نظر کی انتظامی صلاحیت کی وجہ سے اور کچھ اس خاکسار کی محبت میں لوگ طویل فاصلوں سے کھنچے چلے آئے اور ہال اتنا لبریز ہوا کہ شائقین ادب نے برآمدوں میں کھڑے ہونا

بھی معیوب نہ جانا۔۔ عظمیٰ گیلانی نہایت زرق برق ساڑھی میں کسی حد تک اپنی جوانی کے زمانوں کی جھلکیاں جھلکاتی مسکراتی مجھے سٹیج پر بلانے کے بعد اسد محمد خان کی ایک کہانی ڈرامائی انداز میں پڑھنے لگی۔۔ اس دوران زرد کُرتے میں ملبوس انجم ایاز کا تعارف ہوا اور وہ سٹیج پر آویزاں ایزل پر رکھے کینوس پر صاقینی انداز میں غالب کے ایک شعر کی تصویر خطاطی کرنے میں مگن ہو گئے۔ میں نے آغاز میں کچھ گفتگو کی۔۔ کچھ باتیں من کی اور کچھ فن کی۔۔ پھر گدھوں کے بارے میں ایک کالم نما تحریر پڑھی جسے پسند کرنے کے لیے گدھا ہونا شرط نہ تھی۔ سوالوں کا سلسلہ ختم نہ ہوتا تھا۔۔ اس دوران ہجوم میں سے ایک ڈاکٹر خاتون برآمد ہوئیں اور کہنے لگیں۔۔ میں تعریف کرنے نہیں شکایت کرنے آئی ہوں، آپ کو مورد الزام ٹھہرانے آئی ہوں۔۔ آپ نے ”خانہ بدوش“ اور ”نکلے تری تلاش میں“ جیسے سفرنامے لکھ کر ہمیں خانہ بدوش کر دیا۔۔ ہمیں دربدر کر دیا یہاں تک کہ آپ کی وجہ سے میں یہاں آسٹریلیاں میں آ بیٹھی ہوں اورآپ خود۔۔ اپنے لاہور سے ٹس سے مس نہیں ہوئے۔۔ آپ نے ضرور ہمیں اپنے وطن سے نکالنا تھا۔۔ آپ ہمیں اچھے نہیں لگتے۔۔ اگرچہ حاضرین میں سے کچھ نے اس ڈاکٹر خاتون کے طرز تکلم کو پسند نہ کیا لیکن میں نے بہت کیا کہ وہ میری تحریروں کی شیدائی تھیں، اگر مجھ سے محبت کرتی تھیں تو شکایت کرنا بھی اُن کا حق بنتا تھا۔ اور ہاں اس بات کا کریڈٹ جاوید نظر کر دیجیے کہ اس سے پیشتر آسٹریلیا میں بھانت بھانت کے مزاحیہ، شکل سے بھی مزاحیہ صرف شاعر بلائے جاتے تھے اور پہلی بار کسی نثرنگار کو یہاں مدعو کیا گیا تھا۔۔ اور اُنہیں کریڈٹ اس لیے بھی زیادہ جاتا ہے کہ وہ معروف شاعر نظر امروہوی کے صاحبزادے ہیں اور خود بھی ایک عدد شاعر ہیں۔۔ نظر صاحب کے بیٹیوں میں بے حد ورائٹی پائی جاتی ہے۔ جاوید ایک سفید ریش حضرت آسٹریلیا کے ویرانوں میں تبلیغ کے لیے نکل جاتے ہیں کہ شاید کوئی ابودفیل مسلمان ہو جائے، بت شکن ہیں اور اُن کے بڑے بھائی انجم نیاز بت بناتے ہیں لیکن قاسمی صاحب کی کلاسیک نظم کے مطابق ریت سے نہیں بناتے۔۔ اُدھر کراچی میں ”مونتاژ“ ادبی جریدے کے مدیر اقبال نظر ہیں۔۔ انجم نیاز اور اقبال میں صرف اُن کی وگ مشترک ہے جو شاید ”ایک خریدئیے اور دوسری مفت حاصل کیجیے“ کی پیشکش کے مطابق ہوبہو تھی۔۔ تقریب کے بعد ڈنر کا اہتمام تھا اور وہاں میں بھوکا رہا کہ بہت دور کے شہروں سے آنے والے مہربان تھے۔۔ ایک صاحب نے خصوصی انتظام کر کے میری کتابیں بائی ایئر پاکستان سے منگوائی تھیں اور مجھ سے آٹو گراف کرنے کی درخواست کرتے تھے۔۔ آسٹریلیا کے مختلف شہروں سے آنے والوں نے مجھے اپنے شہروں میں آنے کے لیے، تمام اخراجات برداشت کرنے کی دعوتیں بے شمار دیں کہ اگر میں اُن سب کو قبول کر لیتا تو اگلا ایک برس آسٹریلیا میں ہی گزارتا۔۔ تھینک یو آسٹریلیا۔

ایک سڈنی کا سب سے چمکدار دن تھا جب ڈاکٹر سعید خان نے اپنے محل نما گھر میں، ایک دریا کے کنارے بلند ہونے والی چٹانوں میں تعمیر شدہ ایک خوابناک رہائش گاہ میں مجھے اور میمونہ کو مدعو کیا اور میں نے اس گھر میں داخل ہوتے ہوئے کہا ”یہ شخص زندگی سے لطف اندوز ہونا جانتا ہے“۔ بے شمار لوگ مدعو تھے اور خورو نوش کے بے دریغ انتظامات ایسے تھے کہ ہر کوئی بے دریغ خوش ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر سعید خان اور ان کی خوش لباس اور خوش نظر اہلیہ نے ہم دونوں کا استقبال کیا۔۔ اُن کے شاہانہ، ذوق جمال سے آراستہ گھر کے کھلے ٹیرس سے نیچے بہتے دریا اور اس میں بہتی کشتیوں اور جنگلوں کا منظر ایسا کھلتا تھا کہ میں سحر زدہ ہو گیا۔ آسٹریلیا میں قیام کے دوران اگرچہ میرے اعزاز میں بہت سے لنچ اور ڈنر ہوئے، ڈاکٹر حضرات نے بھی میری توقیر کی لیکن یہ ڈاکٹر سعید خان نام کا شخص اُن سب سے الگ شناخت رکھتا تھا کہ۔۔ وہ زندگی سے لطف اندوز ہونا جانتا تھا۔۔ اگر اپنی شب و روز کی مشقتوں سے متمول ہوا تھا تو دولت جمع کرنے کی مشین نہیں ہو گیا تھا۔ شاندار اور شاہانہ طریقے سے زندگی کرتا تھا اور مجھ ایسے معمولی ادیب کے لیے بھی اتنے وسیع اہتمام کرتا تھا اور ہمہ وقت میرا شکریہ ادا کرتا تھا۔

اور یہاں آسٹریلیا میں مقیم سب سے اہم ادیب اور ناول نگار اشرف شاد بھی موجود تھا جو اپنی سفید مونچھوں اور دل فریب بش شرٹ میں نہایت دل کش لگ رہا تھا۔ اُس کا ناول ”بے وطن“ میرے پسندیدہ ترین ناولوں میں سے ہے اور میمونہ کو بھی یہ ناول بے حد پسند ہے۔ اشرف شاد نے میرے بارے میں نہایت مبالغہ آمیز گفتگو کی۔۔ کہ آپ لوگ آج سے تیس برس بعد فخر کریں گے کہ ہم ایک ایسی دعوت میں شریک تھے جہاں تارڑ صاحب تھے جو ہم سے باتیں کرتے تھے۔ مجھے اشرف شاد کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ اب میرے دن تھوڑے ہیں۔ اور مجھے اندازہ بھی ہے کہ پچھلے دنوں راولپنڈی سے ایک صاحب کا محبت بھرا خط آیا کہ میرے پسندیدہ ترین ادیبوں میں، اشفاق احمد، ممتاز مفتی اور آپ شامل ہیں، میں اب تینوں سے ملنا چاہتا تھا لیکن اشفاق صاحب اور مفتی صاحب فوت ہو گئے۔۔ اس لیے میں آپ سے جلد از جلد ملنا چاہتا ہوں۔۔ تو میرے دن تھوڑے تھے۔

موقع غنیمت جان کر اس محفل میں عظمیٰ گیلانی کی حیات کے بارے میں ایک کتاب کی رونمائی کا بھی اہتمام کیا گیا اور صدارت کا منصب مجھے سونپا گیا۔ یہ ایک عجیب بلکہ حسین اتفاق تھا کہ عظمیٰ کی یہ سرگزشت ابھی تک میری نظر سے نہ گزری تھی اور اس کے باوجود مجھے صدارتی خطبہ پیش کرنا تھا۔۔ یہ

سرگزشت ایک نوجوان سیال نے تحریر کی تھی اور خوب تحریر کی تھی۔
یہ مبالغہ نہیں، ایک حقیقت ہے کہ آسٹریلیا کی ہر شام میں مجھے کو کُتے، غُل کرتے، چھکتے پرندے گھنے شجروں میں پوشیدہ سنائی دیتے تھے اور اُس شب وہ کچھ زیادہ ہی غل کرتے تھے تو وہ کون ہے ان خطوں میں جو مجھے ان رنگین پرندوں کی صورت پکارتا ہے۔ کوئی تو ہے، کوئی تو غزالِ شب ہے۔۔۔ کون ہے؟ (جاری ہے)

ممتاز ناول نگار، مستنصرحسین تارڑ سے خصوصی مکالمہ
اقبال خورشید

آوارہ گرد ہوں، دائمی شہرت کی خواہش نہیں
بہاؤ – جیسا ناول اردو کا کوئی اور ادیب نہیں لکھ سکتا

ممتاز ناول نگار، مستنصرحسین تارڑ سے خصوصی مکالمہ

اقبال خورشید

اُس کے سفید پروں تلے ریت تھی؛
تو یوں اُس قصّے کا آغاز ہوا، جس نے کنک کوٹنے کی عظیم دَھم دَھم کو جنم دیا۔
ایک شاہ کار قصّہ، جس نے ایک ہندوستانی نقاد کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ اردو ناول کا مستقبل اب لاہور سے وابستہ ہے۔ لاہور جہاں اِس قصّے کا خالق بستا ہے۔
لاہورتہذیب کا مرکز۔ علم و ادب کا گہوارہ۔ مگر میرے لیے لاہور فقط پرانے فیملی البم کی اُن بے رنگ تصاویر تک محدود تھا، جن میں شاہی قلعے، مینار پاکستان اور شالامار باغ کے سامنے میں خود کو موجود پاتا ہوں۔ اور اُن تصاویر میں اتنا کم سن ہوں کہ کچھ یاد نہیں رکھ سکتا جلد ان مناظر کو بھول جاؤں گا۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔
لاہور برسوں میرے لیے فقط بے رنگ، بے بو فیملی البم تک محدود رہا، مگر پھر ادب کی دنیا میں ایک واقعہ رونما ہوا۔ ایک انوکھی گھڑنت، جس سے تبدیلی کا پہیا چلا۔ لاہور نے یک دم نئی صورت اختیار کر لی۔ ایک نئی وابستگی کا میرے بھیتر جنم ہوا۔
لاہور اب میرے لیے ایک شخص تھا۔ ایک قصّہ گو۔
رواں برس، جب پیشہ ورانہ ذمے داریاں ایک ادبی کانفرنس کے سلسلے میں لاہور لے گئیں — اور یہ پہلا موقع تھا، جب میں نے شعوری حالات میں خود کو وہاں موجود پایا — تو دل میں ایک خواہش تھی۔ لاہور دیکھنے کی خواہش نہیں۔ قطعی نہیں، بلکہ اُسے دیکھنے کی خواہش، جس سے مجھ میں سانس لیتا قاری جُڑچکا تھا۔
کانفرنس کے آغاز سے قبل دیے جانے والے عشائیے میں وہ نہیں پہنچا حالانکہ وہ مدعو تھا، مجھے کچھ اور انتظار کرنا تھا۔
دوسرے دن کا سورج طلوع ہوا۔ پُرسکون ہال میں اجلاس جاری تھا۔ اور تب میں نے اُسے دیکھا۔
وہ بوڑھا ہوگیا تھا۔ چند دانت گر گئے۔ بہت سے بال سفید ہوگئے مجھے وہ توقع سے زیادہ پُراسرار اور تروتازہ محسوس ہوا۔
تو میں نے اُسے دیکھا (گو میں اُسے پہلے بھی دیکھ چکا تھا)، اور اُسے سنا، (گو پہلے بھی سن چکا تھا)، اور اُس آواز کو اتنا ہی جوان پایا، جتنی پہلے تھی۔
مقرر وقت پر ہم جمگھٹے سے پرے، اس کے مداحوں سے دور، پنج ستارہ ہوٹل کے ایک پُرسکون گوشے تک پہنچ گئے، جہاں میز پر ہوسے سارا ماگو کا ایک ناول دھرا تھا۔ ہوسے سارا ماگو، جسے پڑھ کر اُس نے اپنی کتابیں جلا دینے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اور مجھے صدمہ پہنچا تھا کہ ان میں وہ ناول بھی تھا، جو پاروشنی کا سراپا تھا۔
ہوسے کے ناول کے ساتھ ”ڈاکیا اور جولاہا“ رکھا تھا۔ اُس کے دیگر قصّوں کے مانند ایک اور حیران گھڑنت؛

ناممکن کا اسرار۔
تو میں ”بہاؤ“ کے خالق کے سامنے تھا۔ ایک ہمہ جہت انسان کے سامنے۔ تارڑ کے سامنے۔
مستنصر حسین تارڑ کی ہر جہت انوکھی ہے، مگر میری دل چسپی کا محور ایک خاص جہت تھی؛ ناول نگاری۔ اور کئی ناولز میں سے ایک خاص ناول؛ ”بہاؤ“۔
میں آپ کو یہ نہیں بتانا چاہتا کہ ”بہاؤ“ ایک شاہ کار ادب پارہ ہے۔ نہیں، یہ بھی نہیں بتاؤں گا کہ ایک ہندوستانی ادبی جریدے کے تحت ہونے والے سروے میں، جس میں اردو کے اہم ناقدین نے حصہ لیا، ”بہاؤ“ کو اردو تاریخ کے دس بڑے ناولز میں شمار کیا گیا۔ یہ تذکرہ بھی ضروری نہیں کہ بی بی سی نے اپنے تبصرے میں ”بہاؤ“ کو کلاسک کا درجہ دیتے ہوئے اُس کا موازنہ گیبرئیل گارسیا مارکیز کے لازوال ناول One Hundred Years of Solitude سے کیا۔
میں تو فقط یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ تحیرخیز ہے!
تارڑ صاحب سے جو گفت گو ہوئی، اُس تک رسائی سے قبل کیوں نہ ان کی زندگی پر سرسری نظر ڈال لی جائے۔ اور ایک آوارہ گرد کی زندگی پر، جس کی زیست درجنوں کتابوں میں بکھری پڑی ہے، یہاں فقط سرسری نظر ہی ڈالی جاسکتی ہے!

مستنصر حسین تارڑ یکم مارچ 1939 کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد، رحمت خان تارڑ گجرات کے ایک کاشت کار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ مستنصر صاحب نے اپنے والد سے گہرا اثر قبول کیا۔ بیڈن روڈ پر واقع لکشمی مینشن میں اُن کا بچپن گزرا۔ سعادت حسن منٹو پڑوس میں رہتے تھے۔ وہ مشن ہائی اسکول، رنگ محل اور مسلم ماڈل ہائی اسکول کے طالب علم رہے۔ میٹرک کے بعد گورنمنٹ کالج میں داخلہ لے لیا۔ ایف اے کے بعد برطانیہ کا رخ کیا، جہاں فلم، تھیٹر اور ادب کو نئے زاویے سے سمجھنے، پرکھنے اور برتنے کا موقع ملا۔ پانچ چھے برس وہاں گزرے۔ 1957 میں شوق آوارگی انھیں ماسکو، روس میں ہونے والے یوتھ فیسٹول لے گیا۔ اُس سفر کی روداد 1959 میں ہفت روزہ قندیل میں شایع ہوئی۔ یہ قلمی سفر کا باقاعدہ آغاز تھا۔
پاکستان لوٹنے کے بعد جب اندر کا اداکار جاگا، تو انھوں نے پی ٹی وی کا رخ کیا۔ پہلی بار بہ طور اداکار ”پرانی باتیں“ نامی ڈرامے میں نظر آئے۔ ”آدھی رات کا سورج“ بہ طور مصنف پہلا ڈراما تھا، جو 74ءمیں نشر ہوا۔ آنے والے برسوں میں مختلف حیثیتوں سے ٹی وی سے منسلک رہے۔ جہاں کئی یادگار ڈرامے لکھے، وہیں سیکڑوں بار بہ طور اداکار کیمرے کا سامنا کیا۔ پاکستان میں صبح کی نشریات کو اوج بخشنے والے میزبانوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ بچوں کے چاچا جی کے طور پر معروف ہوئے۔
1969 میں وہ یورپی ممالک کی سیاحت پر روانہ ہوئے، واپسی پر ”نکلے تری تلاش میں“ کے نام سے سفرنامہ لکھا۔ یہ 71ءمیں شایع ہوا۔ قارئین اور ناقدین دونوں ہی نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اِسے پڑھنے کے بعد محمد خالد اختر نے لکھا تھا:”اُس نے مروجہ ترکیب کے تاروپود بکھیر ڈالے ہیں!“ اِس کتاب کو ملنے والی پذیرائی کے بعد انھوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اگلا سفر نامہ ”اندلس میں اجنبی“ تھا، جسے پڑھ کر شفیق الرحمان نے کہا: ”تارڑ کے سفرنامے قدیم اور جدید سفرناموں کا سنگم ہیں!“
بیالیس برسوں میں تیس سفرنامے شایع ہوئے۔ بارہ صرف پاکستان کے شمالی علاقوں کے بارے میں ہیں۔ پاکستان کی بلند ترین چوٹی ”کے ٹو“ پر ان کا سفرنامہ اس قدر مقبول ہوا کہ دو ہفتے میں پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا۔ اِس علاقے سے اُن کے گہرے تعلق کی بنا پر وہاں کی ایک جھیل کو ”تارڑ جھیل“ کا نام دیا گیا۔ چند نمایاں سفرناموں کے نام یہ ہیں: خانہ بدوش، نانگا پربت، نیپال نگری، سفرشمال کے، اسنولیک، کالاش، پتلی پیکنگ کی، ماسکو کی سفید راتیں، یاک سرائے، ہیلو ہالینڈ اور الاسکا ہائی وے۔
سفرنامے کے میدان میں اپنا سکا جما کر ناول نگاری کی جانب آگئے۔ اولین ناول ”پیار کا پہلا شہر“ ہی بیسٹ سیلر ثابت ہوا۔ اب تک اِس کے پچاس سے زاید ایڈیشن شایع ہوچکے ہیں۔ یوں تو ہر ناول مقبول ٹھہرا، البتہ ”راکھ“ اور ”بہاؤ“ کا معاملہ مختلف ہے۔ خصوصاً ”بہاؤ“ میں اُن کا فن اپنے اوج پر نظر آتا ہے، پڑھنے والوں

نے خود کو حیرت کے دریا میں بہتا محسوس کیا۔ اِس ناول میں تارڑ صاحب نے تخیل کے زور پر ایک قدیم تہذیب میں نئی روح پھونک دی۔ ”بہاؤ“ میں ایک قدیم دریا سرسوتی کے معدوم اور خشک ہوجانے کا بیان ہے، جس سے پوری تہذیب فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے۔
راکھ“ کو 1999 میںبہترین ناول کے زمرے میں وزیر اعظم ادبی ایوارڈ کا مستحق گردانا گیا، جس کا بنیادی ” موضوع سقوط ڈھاکا اور بعد کے برسوں میں کراچی میں جنم لینے والے حالات ہیں۔ ”قلعہ جنگی“ نائن الیون کے بعد افغانستان پر امریکی حملے کے پس منظر میں لکھا گیا۔ اردو کے ساتھ پنجابی میں بھی ناول نگاری کا کام یاب تجربہ کیا۔ اس سفر میں افسانے بھی لکھے۔ ان کی شناخت کا ایک حوالہ کالم نگاری بھی ہے، جس میں ان کا اسلوب سب سے جداگانہ ہے۔
مطالعے کی عادت جتنی پختہ ہے، اتنی ہی پرانی۔ اردو میں قرة العین ان کی پسندیدہ لکھاری ہیں۔ اُن کا ناول ”آخری شب کے ہمسفر“ اچھا لگا۔ ٹالسٹائی اور دوستوفسکی کے مداح ہیں۔ ”برادرز کرامازوف“ کو دنیا کا سب سے بڑا ناول خیال کرتے ہیں۔ شفیق الرحمان کی کتاب ”برساتی کوے“ کو اپنے سفرنامے ”نکلے تری تلاش میں“ کی ماں قرار دیتے ہیں۔ کرنل محمد خان کی ”بجنگ آمد“ کو اردو کا بہترین نثری سرمایہ سمجھتے ہیں۔ غیرملکی ادیبوں میں رسول حمزہ توف کی ”میرا داغستان“ اور آندرے ژید کی خودنوشت اچھی لگیں۔ کافکا اور سارتر بھی پسند ہیں۔ ترک ادیب، یاشر کمال اور اورحان پامک کے مداح ہیں۔ مارکیز اور بوسے سارا ماگو کو بھی ڈوب کر پڑھا۔ ممتاز ادیب، محمد سلیم الرحمان کی تنقیدی بصیرت کے قائل ہیں۔ اپنی تخلیقات کے تعلق سے ان سے مشورہ ضرور کرتے ہیں۔ نوبیل انعام یافتگان کی تخلیقات پر بھی گہری نظر ہے۔ ان کی کتب خصوصی توجہ سے پڑھتے ہیں، اور بہ قول ان کے، جو پسند آتا ہے، اس سے اثر بھی لیتے ہیں۔

تارڑ صاحب کی زندگی کے اِس مختصر جائزے کے بعد سوال و جواب کی دنیا میں داخل ہوتے ہیں، جو فکشن کی دنیا تو نہیں ہے، مگر اُس سے کم پُرتجسس بھی نہیں۔

اقبال: ”پوسٹ ماسٹر“، جس کا علم اور فیصلہ حتمی ہے، آپ کے ناول ”ڈاکیا اور جولاہا“ پر چھایا نظر آتا ہے۔ بہ طور تخلیق کار آپ خود کو پوسٹ ماسٹر یا خدا کے سامنے کتنا بااختیار اور بے اختیار محسوس کرتے ہیں؟ تقدیر کے کس حد تک قائل ہیں؟
سے مراد تقدیر نہیں۔ تقدیر کے متعلق Fate کہہ لیں۔ Fate تارڑ: خدا کے معاملے کو رہنے دیتے ہیں۔ آپ اِسے کہا جاتا ہے کہ وہ لکھی جاچکی ہے۔ اِسے یوں سمجھتے ہیں کہ ملالہ تین لڑکیاں ہیں۔ ایک ملالہ حملے میں بچ جاتی ہے، اور ہیروئن بن جاتی ہے۔ باقی دو بھی اذیت سے گزری ہوں گی، مگر پہلی لڑکی کے حصے میں ۔ جسے Jonathan Livingston Seagullکا ایک ناول تھا، Richard Bach ہے۔ امریکی رائٹر Fate شہرت آئی۔ یہ شروع میں رد کر دیا گیا۔ کئی برس یونہی پڑا رہا۔ اتفافیہ طور پر کسی نقاد کے ہاتھ لگ گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ یہ تو بڑا ناول ہے۔ اُس نے ٹائم میگزین میں اس پر تبصرہ لکھ دیا۔ اور یوں راتوں رات وہ بیسٹ سیلر بن ہے، کیوں کہ اس میں مصنف کی صلاحیت کا عمل دخل نہیں۔ ٹیلنٹ تو Fate گیا، منصف لکھ پتی ہوگیا۔ یہ اس میں تھا، مگر اورروں میں بھی ایسا ٹیلنٹ موجود تھا۔ اِسی طرح میں کہتا ہوں؛ مجھ میں جو ٹیلنٹ ہے، وہ نگاہ سے میں دنیا کا خوش ۂاور رائٹرز میں بھی ہے، لیکن میری کتابیں لوگوں کو پسند آتی ہیں۔ اِس نقطہ بخت ترین آدمی ہوں۔ مثلاً میں نے ایک فضول سا پروگرام ”شادی آن لائن“ شروع کیا۔ خیال تھا کہ وہ جلد بند ہوجائے گا، وہ سات سال چلتا رہا۔ مارننگ ٹرانسمیشن کا معاہدہ چھے ماہ کے لیے تھا، وہ آٹھ سال چلا۔ بلاشبہہ، ان پروگرامز کی مقبولیت میں میری محنت بھی ہے۔ میں اپنے پروفیشن کو بہت سنجیدگی سے کے عمل دخل کو نظر انداز نہیں کرسکتے۔ Fate لیتا ہوں، مگر آپ

اقبال: آپ کی پہلی کتاب ”نکلے تیری تلاش میں“ اردو ڈیپارٹمنٹ، ماسکو اسٹیٹ یونیورسٹی کے نصاب میں تھا؟ Fate شامل ہوئی۔ کیا یہ بھی
لائبریری گئیں، اور اُنھیں Galina Deshenko تارڑ: ہاں! وہ اِس لیے نصاب میں شامل ہوئی کہ ایک روز پروفیسر

Fate وہ کتاب مل گئی۔ وہ اُس سے متاثر ہوئیں۔ اب وہاں کسی اور کی کتاب ہوتی، تو وہ سامنے آجاتا۔ تو یہاں اپنا اثر دکھاتا ہے۔

اقبال: توجہ آپ کے ناولز کی جانب مبذول کرتے ہیں۔ "بہاؤ" میں آپ کا قلم ایک نئی دنیا تخلیق کرتا ہے۔ اِس ناول کی تکمیل میں بارہ برس صَرف ہوئے۔ کیا وہ برس تخلیقی مسرت سے بھرپور رہے، یا وہ کرب ناک تجربہ تھا؟

تارڑ: گذشتہ دنوں میں ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ اُس میں ایک سطر تھی کہ History is written by the invisible ink. یعنی اُسے آپ کوئی بھی پہناوا پہنا سکتے ہیں۔ اُسی طرح شاعری آنسوؤں سے لکھی جاتی ہے، اور فکشن خون سے۔ تو فکشن کا یہ معاملہ ہے۔ یہی معاملہ "بہاؤ" کا تھا۔ اب "بہاؤ" میں نے تین بار Rewrite کیا۔ باقی جتنی بھی تحریریں ہیں، چاہے وہ سفرنامے ہوں یا ناول، انھیں دو بار لکھتا ہوں۔ یعنی میں نے اُس پر محنت کی۔ کچھ عرصے پہلے کوئی وفا اور بے وفائی کی بات کر رہا تھا۔ تو میں نے کہا؛ سب سے زیادہ وفا مجھ سے میری رائٹنگ ٹیبل اور قلم نے کی۔ اُنھوں نے کبھی مجھ سے بے وفائی نہیں کی۔ اور میں نے بھی نہیں کی۔ ہر شام سات بجے میں لکھنے کی میز کے سامنے بیٹھ جاتا ہوں، اور رات گیارہ بجے تک بیٹھا رہتا ہوں۔

اقبال: "بہاؤ" لکھتے ہوئے بیٹھک اتنی طویل کیوں ہوگئی؟ بارہ برس معنی رکھتے ہیں۔

تارڑ: اُسے لکھنے میں وقت نہیں لگا۔ اصل وقت تحقیق میں لگا۔ زبان کا کیا رنگ ڈھنگ ہونا چاہیے؟ یہ اہم سوال تھا۔ جب میں نے اُسے لکھنا شروع کیا، تو پچاس ساٹھ صفحات لکھ کر اُسے پڑھا۔ اندازہ ہوا کہ جو زبان میں نے لکھی ہے، وہ آج کی زبان ہے۔ مثلاً لڑکا لڑکی سے کہتا ہے: "مجھے تم سے محبت ہے!" اب پانچ ہزار سال پہلے تو یہ بات اِس طرح نہیں کہی جاتی ہوگی۔ منشی پریم چند کے زمانے میں بھی محبت کا اظہار اِس طرح نہیں کیا جاتا تھا۔ اِس کے بجائے کہا جاتا تھا: "تم نے مجھے موہ لیا ہے۔" اگر ساٹھ ستر سال میں Expression اتنا تبدیل ہوگیا، تو پانچ ہزار سال پہلے کا Expression کیا ہوگا۔ پھر چند ماہر لسانیات، مثلاً علی عباس جلال پوری اور فرید کوٹی سے مشورے کیے کہ اُس زمانے میں کون کون سی زبانیں تھیں۔ اتفاق سے اُن ہی دنوں مجھے The ancient Tamil poetry کے موضوع پر برکلے یونیورسٹی کا ایک تھیسس ملا۔ یہ بڑا دل چسپ امر ہے کہ تامل اور براہوی، دو زبانیں ایسی ہیں، جنھوں نے دراوڑی زبان سے سب سے زیادہ الفاظ لیے۔ میں نے سوچا کہ قدیم تامل شاعری کا Expression ضرور اُس زمانے میں رائج دراوڑی بولی کے قریب تر ہوگا۔ تو اس تھیسس کا پورا مطالعہ کیا۔ ردھم اور اس زمانے کے استعاروں کو سمجھا۔ "بہاؤ" میں آپ کو کوئی جدید استعارہ نہیں ملے گا۔ جب کردار کی چال کا تذکرہ آتا ہے، تو یہ کہا جاتا ہے؛ اُس کی چال اتنی خوب صورت تھی کہ شہد کی مکھیاں اُس کے پیچھے پیچھے چلی جاتیں۔ یا پھر؛ اس کے Hip (سرین) کوبرا کے پھن کی طرح تھے، جن میں زہر بھرا تھا، جن سے وہ مجھے ڈس سکتی تھی۔ یعنی میں نے قدیم تامل شاعری پڑھی، اور اس میں اختراع کی۔ اگر مجھے پیٹرن مل جائے، تو میں اختراع کر لیتا ہوں۔ میرا جو آخری ناول ہے "اے غزال شب"، اس میں مرکزی کردار "گیتا" سے کرشن کے مکالمے بولتا ہے۔ میں نے چار پانچ فقرے وہاں سے لیے، باقی خود لکھے۔ مگر پڑھنے والے کو لگتا یہی ہے کہ کرشن بول رہا ہے۔ مثلاً اِس کا ایک فقرہ ہے: "اے ارجن، اس دنیا میں رہو، لیکن اس سے آلودہ نہ ہو، جیسے ایک مرغابی پانی میں رہتی ہے، مگر اس کے پر گیلے نہیں ہوتے۔" اِسی طرح میرا ایک سفرنامہ ہے، "الاسکا ہائی وے!" اُس میں ایک منظر تھا، جو میں نہیں بیان کر سکا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اُسے کس طرح لکھوں۔ پھر خیال آیا، قدیم عربی شاعری میں قصیدے لکھے جاتے تھے۔ میں نے دو تین قصیدے پڑھے۔ اور اُن کے پیٹرن پر وہ منظر لکھا۔ یعنی پڑھنے اور سیکھنے کا عمل مسلسل جاری رہتا ہے، اور یہ آپ سے وقت کا تقاضا کرتا ہے۔

اقبال: فکشن میں مشاہدے اور تجربے کو گوندھا جاتا ہے، مگر "بہاؤ" میں نہ تو مشاہدہ میسر تھا، نہ ہی تجربہ۔ فقط تخیل تھا۔ خالص تخیل کی بنیاد پر لکھنا مشکل ہے، یا نسبتاً سہل کہ اِس ضمن میںاعتراضات کا امکان مٹ جاتا ہے؟

تارڑ: جہاں تک ”بہاؤ“ کا تعلق ہے، اُسے ادب کے قارئین کے علاوہ سنجیدہ مورخین اور ماہرین نے بھی پڑھا۔ کچھ نے چند غلطیوں کی بھی نشان دہی کی۔ مثلاً کسی نے کہا؛ آپ نے فلاں جگہ لکھا، جو کی کاشت ہورہی تھی مگر اُس زمانے کا موسم جو کی کاشت کے لیے مناسب نہیں تھا۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ لکھتے ہوئے حقائق ساتھ لے کر چلوں۔ میں نے تحقیق کی۔ ملتان کے ایک صاحب تھے، ابن حنیف۔ اُنھوں نے میرا بہت ساتھ دیا۔ میں اُنھیں لکھ بھیجتا، وہ اُسے دیکھ لیا کرتے۔ میں نے ویدوں کو بھی پڑھا۔ دیکھا کہ اُن میں اِن علاقوں کو کیا کہا گیا ہے۔ میں نے پڑھا کہ اُس زمانے میں لوگ فقط تین رنگوں کو پہچانتے تھے۔ تو میں نے شعوری پر ناول میں کہیں تین سے زیادہ رنگوں کا تذکرہ نہیں کیا، اگر میں کر جاتا، تو شاید کسی کو اندازہ نہیں ہوتا۔ اِس طرح میں اپنی تسلی کے لیے تحقیق کرتا ہوں۔ اور تخیل کو حقائق کے قریب تر لانے کی کوشش کرتا ہوں۔

اقبال: ”بہاؤ“ کی تکمیل کے بعد، اُس کے اثر سے نکلنا کتنا دشوار ثابت ہوا؟ کیا اب بھی من کے بَن میں مور بولتا ہے؟

تارڑ: ہوتا یہ ہے کہ لکھتے ہوئے میں اُسی دنیا میں چلا جاتا ہوں، کیوں کہ بنیادی طور پر میں آوارہ گرد ہوں۔ تو وہ کیفیت خود پر طاری کر لیتا ہوں۔ چند لوگوں نے کہا؛ پاروشنی کے ہاں بچہ ہونے کے منظر کو میں نے بہت گرفت کے ساتھ لکھا ہے۔ سبب یہ ہے کہ میں محسوس کرتا ہوں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میرے اندر 30 فی صد عورت ہے۔ اور ہر تخلیق کار، چاہے وہ رائٹر ہو، موسیقار ہو، یا رقاص، اس میں عورت ضرور ہوتی ہے۔ اُس کے بغیر وہ مکمل ادب تخلیق نہیں کرسکتا۔ اگر میں مکمل طور پر مرد ہوں، تو ناول میں عورت کے کردار سے کردار Female انصاف نہیں کر سکوں گا۔ عبداللہ حسین نے بھی کہا کہ پاروشنی اردو ادب کا مضبوط ترین ہے۔ اسی طرح پاسکل ہے۔ یعنی میرے نسوانی کردار زیادہ مقبول ہوئے۔ اگر میں اُنھیں محسوس نہیں کرتا، تو وہ کبھی بڑے کردار نہیں بن پاتے۔

اقبال: بلاشبہہ، پاروشنی اردو فکشن کا مضبوط ترین نسوانی کردار ہے۔ یہ خالصتاً تخیل کی پیداوار ہے، یا سیاحت کے دوران اُس پری وش سے سامنے ہوا؟

تارڑ: دراصل پاروشنی ایک ایسی لڑکی تھی، جو بہت خوب صورت تھی۔ میرے اور اُس کے درمیان ایک رشتہ Understanding تھا۔ کا رشتہ، یا اور محبت کا رشتہ کہہ لیں۔ پاروشنی اسی کا سراپا ہے۔ چال ڈھال، جسمانی خطوط میں نے وہاں سے لیے، مگر میں اسے پانچ ہزار سال پیچھے لے گیا۔

اقبال: ”بہاؤ“ کی بُنت کا آغاز کیسے ہوا؟

تارڑ: دراصل مجھے رات میں اٹھ کر پانی پینے کی عادت ہے۔ میں سائیڈ ٹیبل پر پانی سے بھرا گلاس رکھ لیتا ہوں۔ اور میں شیشے کا گلاس نہیں رکھتا۔ مجھے پکے گلاس میں پانی پینے کی عادت ہے۔ تو وہ بہت گرم رات تھی۔ جب نیم غنودگی میں اٹھ کر میں نے پانی پیا، تو احساس ہوا کہ گلاس میں، میرے اندازے کے مطابق، جہاں تک پانی ہونا چاہیے، وہ اُس سے تھوڑا کم ہے۔ بیرونی حصے میں پانی کی ٹھنڈ یا نمی وہاں محسوس نہیں ہوئی، جہاں پہلے ہوا کرتی تھی۔ وہ پہلا موقع تھا، جب ”بہاؤ“ کا ابتدائی خیال کہ پانی خشک ہورہا ہے، میرے ذہن میں آیا۔ پھر میں نے ایک آرکیالوجسٹ، رفیق مغل کی تحریر پڑھی، جو چولستان کے بارے میں تھی۔ اس میں ایک لائن تھی، جو مجھے اب تک یاد ہے: ”اساطیری دریا سرسوتی ان دنوں چولستان میں بہا کرتا تھا۔ پھر کسی نامعلوم سبب وہ خشک ہوگیا!“ یہ سطر میرے ذہن میں بیٹھ گئی۔ میں چولستان گیا۔ وہاں مجھے وہ ٹھیکریاں سی ملیں، جنھیں میں نے بعد میں ناول میں استعمال کیا۔ پھر مزید تحقیق کی، ناول کی شکل سامنے آئی۔ تو جیسا میں نے کہا، میں اپنے کام پر بہت محنت کرتا ہوں۔ شاید اسی وجہ سے ”بہاؤ“ کو پسند کیا گیا، اور اس نے اپنی جگہ بنا لی۔

اقبال: ناول نگار، سفرنامہ نویس، اداکار، کالم نویس، ڈراما نویس؛ خود کو کس طرح شناخت کروانا پسند کرتے ہیں؟

تارڑ: نہیں، میں خود کو کسی طرح شناخت کروانا پسند نہیں کرتا، ماسوائے اِس کے کہ میں ایک آوارہ گرد

ہوں، جو کہیں ٹک کرنہیں بیٹھ سکتا۔ کبھی وہ افسانے کی گلی میں چلا جاتا ہے، کبھی ناول تو کبھی سفرنامے کی جانب نکل جاتا ہے، کیوں کہ وہ Brand بننا پسند نہیں کرتا۔ یہی میرا معاملہ ہے۔ اگر آپ بڑے تخلیق کاروں کی زندگی کا جائزہ لیں، تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ اُنھوں نے سب کچھ کیا۔ مثلاً منٹو صرف افسانے نہیں لکھتا تھا۔ اس نے اداکاری بھی کی، ڈرامے بھی لکھے۔ بیدی اور کرشن چندر کو دیکھ لیں۔ تو میں Oneness کا قائل نہیں۔ شناخت کرنے والے کرتے کیا ہیں کہ اچھا تو آپ سفرنامہ نویس ہیں، ٹھیک ہے۔ آپ پر Brandٹھپا لگا کر، بنا کر دراز میں بند کر دیا۔ اِس سے انھیں تسکین ملتی ہے۔ اب میں دراز میں بند نہیں ہوتا۔ اور وہ کر بھی نہیں سکتے۔

اقبال:دراز میں بند نہ ہونے کا فیصلہ شعوری تھا، یا لاشعوری؟
تارڑ: نہیں، قطعی شعوری نہیں تھا۔ میں نے کبھی منصوبہ بندی کرکے ادب نہیں لکھا کہ یہاں سے شروع کرنا ہے، یہاں پہنچنا ہے۔ یہ امیج بنانا ہے۔ میرا یہ معاملہ نہیں۔

اقبال: بلاشبہہ، آپ Brand بننا پسند نہیں کرتے، مگر آپ کے فن کی کئی جہتیں ہیں، کیا سوچتے ہیں، کون سی جہت آپ کو زندہ رکھے گی؟
تارڑ: سچ کہوں تو اِس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرے مرنے کے بعد اگر ملک کے ہر چوک پر میرے مجسمے لگا دیے جائیں، تو اِس سے مجھے کیا حاصل ہو گا۔ مجھے دائمی شہرت کی خواہش نہیں۔ اور مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اگر دنیا مرنے کے بعد مجھے یک سر بھول جائے۔

اقبال: آپ نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ مستقبل میں آپ کو آپ کے ناولز زندہ رکھیں گے؟
تارڑ: دراصل یہ سوال Comparasion میں پوچھا گیا تھا۔ اور میرا جواب "If" میں تھا۔ اور یہ ایک بڑا "If" تھا۔ تو میں نے کہا تھا کہ اگر میں باقی رہتا ہوں، تو ممکنہ طور پر اِس کا سبب میرے ناول ہی ہوں گے۔ سفرنامہ تو ہوسکتے ہے، مگر معلومات کی حد تک۔ اس بات پر پوری دنیا متفق ہے کہ ناول ہی ادب کا Reference مرکزی حوالہ ہے۔

اقبال: اِسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ یہ صدی، ناول کی صدی ہے؟
تارڑ: ناول کی صدی ایک طویل عرصے سے چلی آرہی ہے۔ روسیوں نے، فرانسیسیوں نے، امریکیوں نے سب ہی نے ماسٹر پیس تخلیق کیے۔ تو ناول ایک طویل عرصے سے ادبی دنیا پر غالب ہے۔

اقبال: "پیار کا پہلا شہر" کا شمار بیسٹ سیلرز میں ہوتا ہے۔ اب تک اس کے کتنے ایڈیشن آچکے ہیں؟
تارڑ:جو آخری ایڈیشن آیا ہے ویسے میری کتابوں پر ایڈیشن نہیں لکھا ہوتا۔ یہ میری بیوی کا مشورہ تھا۔ وہ کہتی ہیں کہ اس سے نظر لگ جاتی ہے۔ (قہقہہ) خیر، ابھی 56 واں ایڈیشن آیا تھا۔ اور یہ سرکاری اعدادوشمار ہیں۔ ورنہ تعداد بڑھ سکتی ہے۔

اقبال: کیا پہلے ناول کی اتنی پذیرائی متوقع تھی؟
تارڑ: قطعی نہیں۔ میں اُسے زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیتا۔ سفری ناول کہتا ہوں۔ البتہ اس میں کوئی ایسا جادو ضرور ہے، جس سے میں لاعلم ہوں، مگر جس نے پڑھنے والوں کو گرویدہ بنا لیا۔ اِس پر پوری کتاب لکھی جاسکتی ہے کہ "پیار کا پہلا شہر" کس طرح لوگوں کی زندگی پر اثر انداز ہوا، کیوں بیسٹ سیلر بنا۔ مجھے یاد ہے، پنجاب یونیورسٹی کی ایک لڑکی تھی، جو لنگڑاتی تھی۔ سب اسے پاسکل کہا کرتے تھے۔ اُس وقت اس نے میرا ناول نہیں پڑھا تھا۔ ناول پڑھنے کے بعد اس نے رابطہ کیا، اور کہا؛ میری زندگی بہت ہی اذیت ناک تھی، مگر یہ ناول پڑھ کر مجھے بہت اعتماد ملا۔ اب یہ نقص میری پہچان بن گیا ہے۔ اسی طرح "شادی آن لائن" میں ایک دفعہ تین انتہائی پڑھی لکھی، مگر اپاہج لڑکیاں آئیں۔ تینوں نے اپنا نام پاسکل بتایا۔ اور یہی کہا کہ اِس ناول سے انھیں بہت اعتماد ملا۔ تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اگر اِس ناول نے لوگوں کو خوشی دی ہے، اِس سے قطع نظر کہ وہ بڑا ناول ہے یا نہیں، اُسے یاد رکھا جائے گا۔

اقبال: آج قارئین آپ کو ”پیار کا پہلا شہر“ کے مصنف کے طور پر یاد رکھتے ہیں، یا ”بہاؤ“ کے مصنف کے طور پر؟
تارڑ: رائے بدلتی رہتی ہے۔ ابتدا میں تو ”پیار کا پہلا شہر“ ہی پہچان کا حوالہ تھا، مگر دھیرے دھیرے ”بہاؤ“ کا اثر غالب آنے لگا۔ دراصل کسی ناول کے بارے میں حتمی رائے تیس سال بعد ہی دی جاسکتی ہیں۔ میرے آخری ناول ”اے غزال شب“ کی بہت پذیرائی ہوئی۔ گذشتہ دنوں ڈاکٹر لڈمیلا روس سے آئی ہوئی تھیں، اُنھوں نے اِس کا ذکر کیا، مگر اِس کا قطعی مطلب نہیں کہ یہ بڑا ناول ہے۔ اِس کا اندازہ ہمیں بیس پچیس سال بعد ہی ہوگا۔

اقبال: ”ڈاکیا اور جولاہا“ ایک ”ناممکن“ کو ”ممکن“ کرنے کی کوشش ہے۔ کچھ یہی معاملہ ”بہاؤ“ کا بھی ہے۔ ناممکن میں ایسا کیا اسرار ہے کہ تخلیق کار اس کا تعاقب کرتا ہے؟
تارڑ: جو نامعلوم ہے، وہ متوجہ کرتا ہے۔ نامعلوم کے ساتھ میرے ناولوں میں موت بھی ایک اہم عنصر ہے۔ میرے نزدیک موت انسان کے لیے قدرت کا سب سے بڑا تحفہ ہے۔ موت نہیں ہوتی، تو زندگی بے معنی ہو جائے۔ یہ فنا کا خوف ہی ہے، جو انسان کو موجودات کے حسن سے آگاہ کرتا ہے۔ جہاں تک ناممکن کا تعلق ہے ممکن تو انسان کے بس میں ہے۔ تخلیق کار ممکن سے پار جانے کی کوشش کرتا ہے، یہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ جسے ناممکن کہا جاتا ہے، وہ کس حد تک ناممکن ہے۔

اقبال : کیا یہی اسرار آپ کے ناولز کی مقبولیت کا بنیادی سبب ہے؟
تارڑ: کوئی نہ کوئی بھید ہوتا ہے، کوئی چیز ہوتی ہے، جو قاری کو گرفت میں لیتی ہے۔ گذشتہ پندرہ بیس سال سے میں بیسٹ سیلر ہوں۔ پہلے جب ہمارے وہ ساتھی، جو خود کو سنجیدہ رائٹر کہتے ہیں، مجھے بیسٹ سیلر کہہ کر مخاطب کرتے، تو مجھے بڑی شرمندگی ہوتی تھی۔ پھر مجھ میں تھوڑا اعتماد آیا۔ میں نے سوال اٹھایا کہ وہ کتاب، جس کے سرورق پر گرد جم جائے، جسے کوئی نہ پڑھے، اُس کا کیا حاصل۔ اگر کسی رائٹر کو لوگ پڑھتے ہیں، تو آپ اِس پر پھبتیاں کسنے لگتے ہیں۔ میں چار پانچ نام لیتا ہوں،جو بیسٹ سیلر ہیں؛ کرشن چندر، منٹو، بیدی، قرۃ العین حیدر، آج کے دور میں انتظار حسین، اشفاق احمد۔ یہ تمام بیسٹ سیلر ہیں۔ بلاشبہہ، بیسٹ سیلر ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ آپ بڑے ادیب ہیں، مگر یہ مطلب بھی نہیں کہ آپ بڑے ادیب نہیں ہیں۔

اقبال: ناولز کی فروخت کے معاملے نے اردوفکشن میں ایک تقسیم پیدا کی، جسے سنجیدہ ناول اور کمرشل ناول کہہ کر شناخت کیا گیا۔ گذشتہ دس برس سے ڈائجسٹ کی طرز پر، الوہیت کو موضوع بنا کر لکھے جانے والے ناول خوب بک رہے ہیں۔ اُن سے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟
تارڑ: یہ جو پاپولر رائٹر ہیں، یعنی ڈائجسٹ والے اُن کے اندر بھی کوئی خاص بات ہے۔ وہ بے سبب پاپولر نہیں۔ ہم ان کا ٹھٹھا نہیں اڑا سکتے۔ ایک بار رضیہ بٹ میرے ہاں آئیں۔ اُنھوں نے شکایت کی کہ میری بیٹیاں میرے ناول نہیں پڑھتیں، آپ کے ناول پڑھتی ہیں۔ خیر، تو وہ مجھے پلندہ دی گئیں اپنے ناولوں کا۔ چند ناول پڑھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کہانی کی بُنت جانتی ہیں۔ اُن کی کتابیں یونہی فروخت نہیں ہوتیں۔ تو یہ جو پاپولر رائٹر ہوتے ہیں، ان میں کوئی نہ کوئی جوہر ہوتا ہے۔ بس ایک فرق ہے، وہ تخصیص نہیں کرسکتے کہ کتنا کہنا ہے، اور کہاں رکنا ہے۔

اقبال: لیکن یہ اندیشہ بھی تو ہے کہ شاید بیس برس بعد فقط کمرشل ادب باقی رہے۔ شاید لوگ قرۃ العین حیدر اور ”آگ کا دریا“ کو بھول جائیں، ”پیرکامل“ ہی سب سے بڑا ناول ہو؟
تارڑ :میں عرض کروں، یہ ہوگا نہیں۔ اِس کی چند وجوہات ہیں۔ اب میں جانتا ہوں کہ ”پیار کا پہلا شہر“ پچاس سال بعد بڑا ناول نہیں ہوگا۔ زندہ رہنے والے ادب کے Parameters اور ہیں۔ امریکا میں جو بیسٹ سیلر ہیں، وہ بڑے ادیب نہیں۔ مثلاً سڈنی شیلڈن نے بہت اچھا لکھا، مگر وہ بڑا ادیب نہیں ہے۔ Walt Whitman کی ایک Leaves of Grass کتاب ہے، وہ Survive کر گئی۔ لوگوں کی درجنوں کتابیں Survive نہیں کرسکیں۔ تو میرے نزدیک یہ ممکن نہیں ہے۔ مجھے یاد ہے، جب ”راکھ“ شایع ہوا، تو کراچی میں ایک صاحب ریاض صدیقی ہوا

کرتے تھے۔ میں اُن سے کبھی نہیں ملا۔ تو انھوں نے اِسے بہت پسند کیا۔ اِس پر مضامین لکھے۔ اُنھوں نے کسی محفل میں کہہ دیا کہ یہ ”آگ کا دریا“ سے بڑا ناول ہے۔ مجھے اس معاملے کا تب پتا چلا، جب کراچی سے کچھ دوستوں نے مختلف افراد کے مضامین کے تراشے بھجوائے، جن میں اِس بات پر شدید اعتراض کرتے ہوئے ”راکھ“ پر کڑی تنقید کی تھی۔ میں نے کہا، ٹھیک ہے، کوئی مسئلہ نہیں۔ بس شکایت یہ تھی کہ کرتے ہوئے ایک React ”آگ کا دریا“ سے موازنے والی بات میں نے تو نہیں کہی۔ بعد میں مَیں نے اِسی پر کانفرنس میں سوال اٹھایا کہ کیا ”آگ کا دریا“، ”اداس نسلیں“ بائبل ہیں؟ کیا ان سے بہتر نہیں لکھا جاسکتا؟ نہیں یہ بائبل نہیں ہیں۔ یہ آپ کی کم علمی ہے۔ آپ نے فقط دو ناول پڑھے ہیں، اُن ہی کا حوالہ دیتے رہتے ہیں۔ اس بات پر شمیم حنفی نے احتجاج بھی کیا۔ میرے نزدیک ناولوں کا موازنہ نہیں ہوسکتا۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ قرۃ العین کا ناول ہے، یہ عبداﷲ حسین کا ناول ہے، اور یہ تارڑ کا۔ مجھے یاد آیا، گوپی چند نارنگ نے ایک بار کہا تھا؛ ہم پاکستان میں فکشن کے حوالے سے تین حُسین کے قائل ہیں۔ انتظارحسین، عبداﷲ حسین اور میں۔ موازنے کی ضمن میں آپ کو مثال دوں۔ ترکی کا بڑا مشہور ناول نگار ہے، یاشر کمال۔ مجھے وہ بہت پسند ہے۔ میں نے اپنے پوتے کا نام بھی اُسی کے نام پر رکھا۔ پھر اورحان پامک کا ناول My Name Is Red پڑھا، جس نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا۔ اب آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یاشر کے ناول سے بڑے ہیں، یا یہ ناول یاشر کی تخلیقات سے بڑا ہے۔ تو میری یہی درخواست ہے کہ میرے My Name Is Red ناولوں کا دوسروں کے ناولوں سے موازنہ نہ کریں۔ اور یہی معاملہ دیگر کے ناولز کا ہے۔

اقبال: ”راکھ“ میں آپ نے ”سقوط ڈھاکا“ کو موضوع بنایا۔ اس ناول کی اشاعت سانحے کے کئی برس بعد ہوئی۔ دوسری جانب ”قلعہ جنگی“ افغانستان پر امریکی حملے کے پس منظر میں لکھا گیا۔ یہ ایک تازہ واقعہ تھا، مگرردعمل فوری آیا، اِس کا کوئی خاص سبب؟

تارڑ: سبب یہ تھا کہ ”قلعہ جنگی‘ ایک مخصوص مقام پر جنم لینے والے سانحے سے متعلق تھا۔ جب کہ ”راکھ“ ایک ایسے المیے کے بارے میں تھا، جس نے پورے ملک کو متاثر کیا۔ جس نے مسلمانوں کی، پاکستانیوں کی تاریخ بدل ڈالی۔ ایسے بڑے سانحے پر ایک دم نہیں لکھا جاسکتا۔ مسعود مفتی ڈھاکا کے ڈی سی رہے۔ سقوط کے بعد دو برس وہاں قید کاٹی۔ وہاں کے متعلق لکھا بھی۔ اُنھوں نے ”راکھ“ پڑھا، تو بہت تعریف کی۔ مجھ سے سوال کیا کہ آپ کبھی وہاں گئے ہیں؟ میں نے کہا؛ نہیں، میں کبھی مشرقی پاکستان نہیں گیا، مگر اس خطے سے میری روحانی وابستگی ہے۔ میں آج بھی کہتا ہوں کہ میرے اندر مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا گھاؤ ہے۔

اقبال: آپ ایک ایسے عہد میں لکھ رہے ہیں، جہاں بات ”آگ کا دریا“ اور ”اداس نسلیں“ سے آگے نہیں بڑھ رہی۔ ایسے میں تجربات کے لیے، کچھ نیا لکھنے کے لیے ایک خاص نوع کے اعتماد کی بھی تو ضرورت ہوتی ہوگی۔

تارڑ: دیکھیں، جب ”بہاؤ“ چھپا، تو اس سے متعلق میری اپنی دو آرا تھیں۔ ایک تو یہ کہ اِسے رد کر دیا جائے گا۔ اور دوسری یہ کہ ”بہاؤ“ مجھے وہاں لے جائے گا، جہاں بہت کم لوگ پہنچے ہیں۔ جیسے چینی ادیب مُو یان سے پوچھا گیا کہ ادبی دنیا میں آپ خود کو کہاں دیکھتے ہیں؟ اس نے کہا؛ میں خود تو اپنے مقام کا تعین نہیں کرسکتا، لیکن ایک چیز کا دعویٰ کرسکتا ہوں، اور کوئی اسے رد نہیں کرسکتا کہ Red Sorghum جیسا ناول اور کوئی چینی نہیں لکھ سکتا۔ میں بھی اسی تناظر میں یہ دعویٰ کرسکتا ہوں کہ ”بہاؤ“ جیسا ناول، جیسا بھی وہ ہے، کوئی اور اردو ادیب نہیں لکھ سکتا۔ مجھے یاد ہے، میں سارک کانفرنس میں شریک تھا۔ منتظمین نے عین وقت پر بتایا کہ آپ کو اپنی کوئی تحریر انگریزی میں پڑھنی ہوگی۔ میرے پاس انگریزی میں کچھ تھا نہیں، البتہ ”بہاؤ“ کی کاپی میرے پاس تھی۔ میں نے اس کا پہلا باب پڑھ دیا۔ چار پانچ برس بعد ایک خاتون مجھے ڈھونڈتی ہوئی آئیں۔ وہ میرا نام نہیں جانتی تھیں، بس لوگوں کو یہی حوالہ دیتی تھیں کہ سارک کانفرنس میں اُنھوں نے ایک اردو رائٹر کو سُنا تھا، اور یہ تجربہ اُن کے لیے سحر انگیز رہا۔ اس طرح انھوں نے مجھے تلاش کیا۔ تو یہ ”بہاؤ“ کا اثر ہے۔ تو اس طرح کے ردعمل سے اعتماد پیدا ہوتا ہے۔

اقبال: نوبیل انعام یافتگان پر آپ کی گہری نظر ہے، ان کی تخلیقات بھی مطالعے میں رہتی ہیں۔ یہ فرمائیں، اردو کے ادیبوں کو اِس انعام کے حق دار ٹھہرائے جانے والے ادیبوں کے مقابلے میں آپ کہاں دیکھتے ہیں؟
تارڑ: میں نوبیل انعام یافتہ فکشن نگاروں کو پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اور جو اچھا لگتا ہے، اُسے پورا پڑھتا ہوں۔ میرا بیٹا باہر ہے، وہ کتابیں بھیج دیتا ہے۔ اگر ہم اپنے ادیبوں سے موازنہ کریں، تو میں کہوں گا کہ اگر دس نوبیل انعام یافتہ ادیبوں کو سامنے رکھا جائے، اُن میں سے سات تو ایسے ہیں، جن کی ہم گرد بھی نہیں پا سکتے۔ مثلاً اورحان پامک کے My Name Is Red یا ہوسے ساراماگو کے Blindness جیسا ناول یا جیسا ناول آپ نہیں لکھ سکتے۔ اور اس کا سبب ہمارے محدودات ہیں۔ ہم میں قبولیت نہیں ہے۔ سمجھتے ہیں، ہمارے اندر کا سچ ہی آخری سچ ہے۔ یہ تو سات کا معاملہ ہوگیا۔ باقی جو دو ہیں، وہ بھی اچھے ہیں، مگر وہ اس معیار کے نہیں، جیسے پہلے سات ہیں۔ اب دس میں سے ایک ایسا ضرور ہوگیا، جس کے متعلق مجھے لگتا ہے کہ اُس سے اچھا ہم لکھ سکتے ہیں۔ اور لکھ رہے ہیں۔ دراصل اردو ادب کا ترجمہ نہیں ہوسکا، اِس لیے اِس زبان کے رائٹرز دنیا کے سامنے نہیں آسکے۔

اقبال: کیا یہ دُرست نہیں کہ ہم نے ترجمے کے معاملے میں غفلت برتی؟
تارڑ: بالکل۔ ہم نے اِس کام کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ دنیا کی مختلف زبانوں کے ادب کا انگریزی میں ترجمہ ہوا، مگر ہم اردو ادب کو دنیا کے سامنے پیش کرنے میں ناکام رہے۔ ہم کہتے ہیں، سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے، یہ بات بالکل غلط ہے۔ آخر دنیا کے کتنے ممالک کی یونیورسٹیوں میں اردو چیئر ہے، اور دیگر زبانیں کہاں کہاں پڑھائی جارہی ہیں۔ گذشتہ برس کراچی فیسٹول میں مَیں نے کہا تھا؛ ہمارے ابتدائی زمانے کے جو ناول تھے، امراؤ جان ادا اور توبة النصوح وغیرہ، معاف کیے جائیے گا، وہ بڑے ناول نہیں تھے، بلکہ انتہائی معمولی ناول تھے۔ اُسی زمانے میں "وار اینڈ پیس"، "برادرز کرامازوف"، "مادام بواری" اور نہ جانے کیا کیا لکھا جارہا تھا۔ تو میں کہتا ہوں کہ اردو کے ناول نگار نے بڑا سفر طے کیا ہے۔ وہ بہت آگے گیا ہے۔ اُس کا آغاز تو انتہائی معمولی تھا۔ اب اگر اردو ناولوں کا انگریزی میں ترجمہ ہو، تو چاہے ان کا شمار بین الاقوامی ادب میں نہ کیا جائے، مگر اُن کا نوٹس ضرور لیا جائے گا۔

اقبال: مستقبل میں اردو قارئین کو، بہ ذریعہ ترجمہ بیرونی ادیبوں سے، اپنے پسندیدہ تخلیق کاروں سے متعارف کروانے کا ارادہ ہے؟
تارڑ: نہیں، میرے پاس اتنا وقت نہیں۔ مجھے بہت سے لوگوں نے کہا کہ اپنے کسی ناول کا انگریزی میں ترجمہ کریں۔ میں یہی کہتا ہوں کہ اپنے ناولوں کے ترجمے کے لیے جو ادبی زبان اور وقت درکار ہے، وہ میرے پاس نہیں۔ "بہاؤ" یا "راکھ" کا فقط ترجمہ نہیں کرنا، بلکہ ادبی ترجمہ کرنا ہے۔ کچھ برس پہلے عارف وقار نے بی بی سی نیوز کے لیے میرے متعلق رائٹ اپ لکھا۔ اُس وقت انھوں نے کہا؛ رپورٹ انگریزی میں ہے، اِس مناسبت سے "اے غزال شب" کے کچھ حصوں کا انگریزی میں ترجمہ کر دیں۔ اُن کے اصرار پر میں نے ترجمہ کیا۔ وہ اتنا پُراثر تجربہ رہا کہ مجھے شدت سے احساس ہونے لگا، اردو زبان میں بڑے ناول کی سکت نہیں ہے، جو انگریزی میں ہے۔ خیر، اس رائے کو آپ میری کم مائیگی بھی کہہ سکتے Expression نہیں ہے۔ وہ ہیں۔

اقبال : اوروں نے تو آپ کے کام کو انگریزی کے قالب میں ڈھالنے کی خواہش ظاہر کی ہوگی؟
تارڑ: ہاں، کچھ لوگوں نے رابطہ کیا۔ انگریزی کے ایک پروفیسر ہیں، ڈاکٹر اسیر۔ انھوں نے بہت عجیب و غریب بیان دیا۔ اُنھوں نے کہا؛ میں اردو ادب کو درخور اعتنا نہیں سمجھتا تھا، مگر "بہاؤ" نے میرے خیالات بدل دیے۔ پھر انھوں نے میرے دیگر ناول بھی پڑھے۔ انھوں نے "بہاؤ" کے ترجمہ کی خواہش ظاہر کی۔ کام شروع کر بھی دیا، مگر کچھ عرصے بعد اُنھوننے کہہ دیا کہ یہ ممکن نہیں۔ دراصل "بہاؤ" کی سب سے بڑی Attraction ہے، اس کی زبان۔ ترجمے میں وہ سلیس انگریزی میں آجائے گی۔ اگر فقرہ ہے؛ تم نے مجھے موہ لیا ہے، یا ہی ترجمہ ہوگا۔ تو بات نہیں بنے گی۔ عبدااللہ Tree اور رُکھوں کا Love وہ رُکھوں کا جھنڈ تھا انگریزی موہ کا حسین نے اپنے ناول کا خود ہی انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اس پر کسی نے اعتراض کیا، تو عبدااللہ حسین نے

کہا؛ میں نے بہت انتظار کیا کہ کوئی ترجمہ کرے جب کسی نے نہیں کیا، تو مجھے خود ترجمہ کرنا پڑا۔ اب میں خود ترجمہ نہیں کرنا چاہتا۔ اس سے بہتر ہے کہ انگریزی ہی میں کوئی ناول لکھ دوں۔

اقبال: آپ نے ہمیشہ کہا کہ اردو ادب جمود کا شکار نہیں۔ وہ کون سے عوامل ہیں، جن کی وجہ سے آپ یہ رائے رکھتے ہیں؟
تارڑ: دیکھیں، یہ ایک سلوگن بن گیا ہے۔ ہم قیام پاکستان سے یہ سنتے آرہے ہیں کہ ادب جمود کا شکار ہے۔ پہلے اُنھوں نے کہا کہ کرشن چندر، منٹو اور بیدی چلے گئے، سب خالی ہوگیا، اب کون ہے؟ مگر پھر لوگ آئے۔ اُس نسل کے جانے کے بعد اب نئے لوگ آرہے ہیں۔ اصل میں ادب میں جگہ بنانے میں وقت لگتا ہے۔ ہم نے کچھ کلیشے بنا لیے ہیں؛ ادب جمود کا شکار ہے مطالعہ گھٹ گیا ہے نئی نسل کو پڑھنے کا شوق نہیں۔ یہ باتیں بالکل غلط ہےں۔ نوجوانوں میں پڑھنے کا شوق ہے۔ وہ پڑھ بھی رہے ہیں۔ میری ایسے کئی نوجوانوں سے ملاقات رہتی ہے۔ پھر اگر کوئی کمپیوٹر پر بیٹھ کر کتاب پڑھ رہا ہے، تو وہ بھی مطالعہ ہی کر رہا ہے۔ ایک زمانے میں منٹو، بیدی اور عینی آپا کی کتابوں کے ایک ہی ایڈیشنز برسوں کُتب خانوں میں پڑے رہتے تھے۔ اب جا کر پبلشرز سے معلوم کریں کہ کتنی کتابیں چھپ رہی ہیں۔ پھر ادبی پرچے شایع ہورہے ہیں، جن میں اچھا ادب لکھا جارہا ہے۔

اقبال: آپ کے بیش تر ناولز میں آپ کے تجربات، مشاہدات، آپ کی شخصیت نظر آتی ہے۔ کیا آپ ذاتی تجربات کو تخلیقی عمل کی بنیادی شرط سمجھتے ہیں؟
تارڑ: ہر ایک کا اپنا اپنا پیٹرن ہوتا ہے۔ مجھے اپنی آوارہ گردی کا Edge حاصل ہے۔ میں اُسے استعمال کرتا ہوں۔ اِس طرح میری شخصیت تحریر میں آجاتی ہے۔ پھر جتنے بڑے ناول ہیں، وہ سب Semi-Autobiographies ہیں۔ ہیمنگ وے کے تمام ناول ہیں ہی Semi-Autobiographies، کیوں ہیں۔ میرے ناولوں میں یہ بات پکڑی جاتی ہے، کہ لوگ میری ذاتی زندگی کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں، لیکن جو نہیں جانتے، ان کے لیے وہ خالص فکشن ہے۔

اقبال: آج کل الوہیت کو بنیاد بنا کر کمرشل بنیادوں پر لکھے جانے والے ناولز کا چرچا ہے، آپ اِس تجربے کو کیسے دیکھتے ہیں؟
تارڑ: یہ بھی ایک Trands ہے، جو کچھ عرصے رہے گا، اپنا اثر چھوڑے گا، پھر ختم Trands بدلتے رہتے ہیں۔ ہوجائے گا۔

اقبال : پاک و ہند کے ان ادیبوں کو جو انگریزی میں ادب تخلیق کر رہے ہیں، بین الاقوامی اعزازت سے نوازا جارہا ہے۔ اِس کا سبب ان کی تخلیقی قوت ہے یا مغرب کی اِس خطے میں بڑھتی دل چسپی؟
تارڑ: دیکھیں یہ ایک لمبی بحث ہے۔ میں نے اِس پر لکھا بھی ہے۔ میرے نزدیک اس وقت، برصغیر میں جو انگریزی ناول لکھے جارہے ہیں، وہ کچھ برس بعد پاکستان اور ہندوستان میں تو Reference کے طور پر باقی رہیں گے، مگر باقی دنیا میں ان کا کوئی Reference نہیں ہے۔ جب آپ موجودہ عہد کے بڑے لکھاریوں کی بات کرتے ہیں، تو یہ رائٹرز اُن میں یہ نہیں آتے۔ ان کا ہوسے سارا ماگو اور اورحان پامک سے موازنہ نہیں ہے۔ یہ ایک عارضی مرحلہ ہے۔ کسی نے مجھ سے کہا تھا، اور یہ بات میں نے دہرائی بھی کہ اِس خطے کے انگریزی ناول نگار بلبلوں کی طرح ہیں، انھیں پتا ہی نہیں کہ تہ میں کیا ہے۔

اقبال : تو پھر بین الاقوامی توجہ کا سبب کیا ہے؟
تارڑ: دراصل وہ موضوعات ایسے لے رہے ہیں، جو آج بین الاقوامی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں، مثلاً دہشت گردی، افغانستان، عراق، آمریت۔ اچھا ایسا نہیں ہے کہ سب ایک جیسے ہیں۔ کچھ اچھے لکھنے والے بھی ہیں۔ محمد حنیف اچھا رائٹر ہے، اُس سے میری بڑی دوستی ہے۔ اس کا پہلا ناول A Case of Exploding Mangoes مجھے بہت اچھا لگا۔ البتہ Our Lady of Alice Bhatti مجھے گرفت میں نہیں لے سکا، گو اُس کی انگریزی اچھی تھی، Description اچھی تھی۔ مثلاً ندیم اسلم جو ہے، اُس کا ناول Maps for Lost Lovers

بہت برا تھا۔ اس نے گیلری کے لیے لکھا Season of the Rainbirds پڑھا۔ بہت اچھا تھا۔ البتہ اس کا پہلا ناول کے متعلق پوچھا۔ میں نے کہا؛ آپ مجھے Moth Smoke تھا۔ کسی نے مجھ سے محسن حامد کے پہلے ناول کاغذ قلم دے دیں، میں صبح تک اس سے بہتر ناول، انگریزی میں لکھ کر دوں گا۔ وہ برا ناول تھا، البتہ اس کا بہتر تھا۔ میرے نزدیک اب انھیں خود محسوس ہورہا ہے کہ The Reluctant Fundamentalist دوسرا ناول شہرت تو حاصل ہوگئی ہے، مگر ہم نے اپنا اصل بیان نہیں کیا۔ تو اب وہ بھی دھیرے دھیرے بدل رہے ہیں۔

اقبال : آپ نے خاصا لکھا، کبھی ایسا محسوس ہوا کہ آپ خود کو دہرا رہے ہیں؟
تارڑ: نہیں۔ دراصل جب لکھتے ہوئے مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اِس خیال یا پیٹرن پر میں پہلے ناول لکھ چکا ہوں، تو میں لکھنا ترک کر دیتا ہوں۔ صرف دو ناول ”راکھ“ اور ”خس و خاشاک زمانے“ کا پیٹرن ایک ہے۔ باقی سب کے موضوعات ہی الگ ہیں۔ ”قلعہ جنگی“، ”ڈاکیا اور جولاہا“ اور ”اے غزال شب“ بالکل الگ ہیں۔ میں پیٹرن ہی بدل دیتا ہوں۔ مجھ سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ آیندہ کے لیے میرا کیا منصوبہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں شاید آیندہ کوئی ناول نہیں لکھ پاؤں۔ البتہ حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ہوتا یہ تھا کہ ناول لکھتے ہوئے میں دیگر کام بھی ساتھ ساتھ کرتا رہتا ہوں، سفرنامہ، کالم وغیرہ۔ تو شروع میں ناول کے دوران ہی کوئی خیال تشکیل پانے لگتا تھا۔ اور اِس ناول کو ختم کرکے میں اس پر کام شروع کردیتا۔ اِس بار ”اے غزال شب“ لکھتے ہوئے کسی خیال یا شے نے ذہن میں جڑ پکڑی نہیں۔

اقبال: ”پیار کا پہلا شہر“ پر بات کرتے ہوئے اُس جادو کا تذکرہ آیا، جس نے قارئین کو گرویدہ بنا لیا، مگر جس سے آپ لاعلم ہیں آج دنیائے ادب میں طلسماتی حقیقت نگاری کا چرچا ہے۔ مارکیز کے مانند آپ کو پڑھتے ہوئے بھی محسوس ہوتا ہے کہ حقیقت کے ساتھ جادوئی عناصر چل رہے ہیں۔ اسلوب کی اس مماثلت کو آپ کیسے دیکھتے ہیں؟
تارڑ: ہاں میرے یہاںیہ عوامل ہیں، اور بہت زیادہ ہیں۔ میرے خیال میں اردو کے کسی اور ناول نگار نے یہ پیٹرن استعمال نہیں کیا۔ میرا ناول ہے؛ پکھیرو، جس کا بعد میں مَیں نے اردو میں ترجمہ کیا۔ جب 1970 میں مارکیز انگریزی میں آیا، تو چند لوگوں نے کہا کہ تارڑ صاحب یہ پیٹرن آپ One Hundred Years of Solitude کا ناول One Hundred Years of نے وہاں سے لیا ہے۔ میں نے جواب میں کہا؛ جب پکھیرو چھپا تھا، اُس وقت تو Solitude ہے۔ اِس خطے کی بھی اساطیر ہے، جادو اور پریاں ہیں۔ اب Potential تھا ہی نہیں۔ ہمارا اپنا بھی تو ”داستان امیر حمزہ“ میں نے پوری پڑھی ہوئی ہے۔ جس کا مجھ پر سب سے زیادہ اثر رہا، وہ فریدالدین عطار کی کتاب ”منطق الطیر“ ہے۔ اُس کا بار بار میرے ہاں حوالہ آتا ہے، پرندے۔ سچ کی تلاش۔ میرے ناول ”خس و خاشاک زمانے“ کا پورا باب، تقریباً ستر صفحات اسی پر Base ہیں۔ تو یہ Inspiration ہماری اپنی ہے۔ یہ Imported نہیں۔ ہاں، میں ان سے متاثر ضرور ہوتا ہوں، مگر پیٹرن میں اختراع کرتا ہوں۔

اقبال: بائبل کے اسلوب نے بھی متاثر کیا؟
تارڑ: نہیں۔ پرانے قصّے کہانیوں کی حد تک تو، مگر ادبی سطح پر نہیں۔ دراصل مجھ پر قدیم چینی شاعری کا بہت اثر ہے۔ دراصل جو کچھ آپ نے پڑھا ہوا ہے، وہ کہیں نہ کہیں ظاہر ہوتا ہے۔

اقبال: ناول نگاری کے میدان میں قدم رکھنے والوں کو کوئی مشورہ؟
تارڑ: مطالعہ کریں۔ اور ہر قسم کا مطالعہ۔ ایک ناول نگار کو زندگی کے ہر طبقے کا تجربہ ہونا چاہیے۔ تاریخ بھی پڑھیں، فلسفہ بھی پڑھےں۔ اور بیرونی ادب ضرور پڑھےں۔

اقبال: آپ کے خیال میں اردو ادب کو بین الاقوامی دنیا میں متعارف کروانے کے لیے ہمیں کن خطوط پر کام کرنا ہوگا؟
تارڑ: ہم پاکستانی ادیب کنویں کے مینڈک ہیں۔ ہم اپنی تخلیقات کے لیے بین الاقوامی معیار کی بات کرتے ہیں۔ کہانی کی سطح پر تو شاید کہیں کوئی معیار ہو، مگر ناول میں ہم کہیں نہیں کھڑے۔ پہلے تو اِس خیال سے جان چھڑانی ہوگی۔ پڑھنا ہوگا۔ ساتھ ہی ترجمے کی جانب توجہ دینی ہوگی۔

اقبال: کیا ادب نظریے سے بالاتر ہے؟
تارڑ: نظریہ تو اُس کی By Product ہے۔ چند روز پہلے ڈاکٹر لڈمیلا سے بات ہورہی تھیں، اُنھوں نے کسی روسی ادیب کا جملہ دہرایا کہ ”روس میں اکتوبر انقلاب سے پہلے بڑا ادب پیدا ہوا، اکتوبر انقلاب کے بعد بڑا قاری پیدا ہوا۔“ یہ بات دُرست ہے۔ روسی بہت پڑھتے ہیں۔ میں نے خود اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ تو خیر، ادب بلاشبہہ برتر ہے۔

اقبال: ادیب پر اصلاح معاشرے کی شرط عاید کی جانی چاہیے؟
تارڑ: نہیں، بالکل بھی نہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِس طرز میں جبر اور آمریت آجاتی ہے کہ اِس طرح کا نظام ہون

کینبرا میں کنگرو اور ہائی کمشنر کی دعوت
مستنصر حسین تارڑ
11-05-2014
سڈنی کے یاد گار لمحوں میں جہاں کوچۂ ثقافت کی میرے اعزاز میں بھرپور اورپر ہجوم تقریب تھی، ڈاکٹر سعید خان کے شاہانہ برلب دریا گھر میں ایک دوپہری دعوت تھی، سڈنی کے اکلوتے مسلمان پارلیمنٹ ممبر شوکت کا میرے لیے خصوصی ناشتہ تھا وہاں میرے لیے ان سب سے زیادہ یادگار لمحہ وہ تھا جب میں نے سڈنی اور آسٹریلیا کی پہچان سمندر میں معلق بادبانی کشتی کی طرز کے آپرا ہاؤس میں مجھے ایک بیلے رقص والا شاندار ڈرامہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔۔ اور یہ بھی سلمان کی مہربانی تھی ورنہ آپرا ہاؤس کے ٹکٹ اپنے پلّے سے خریدتے تو کنگال ہو جاتے۔ صرف وہ لوگ اس ہیجان آمیز مسرت سے آگاہ ہیں جو کسی تھیٹر یا آپرا ہاؤس میں کوئی پرفارمنس دیکھنے سے آپ کی رومانوی اور تخلیقی جذبوں کو سرشار کرتی ہے کہ کسی تھیٹر میں بیٹھ کر کوئی مشہور عالم کھیل دیکھنا یا آپرا گائیکی سے لطف اندوز کیسا ہیجان خیز تجربہ ہے، بے شک اس کے ٹکٹوں کے حصول کے لیے فقیروں کی سب کمائی لٹ جائے۔ میں لندن یا نیویارک کے بہت سے یادگار لمحوں کو بھلا چکا ہوں لیکن وہاں کے تھیٹروں میں دیکھے گئے کھیل مجھے ابھی تک یاد ہیں۔ بہرطور تین گھنٹے کے بیلے ڈرامہ نے مجھے اور میمونہ کو خوشی سے لبریز کر دیا۔ آپرا ہاؤس سے باہر آئے تو رات کے اُس پہر اس کی عمارت روشنیوں میں نہائی ہوئی سڈنی بندرگاہ میں ایک روشن بادبان کشتی کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔ اگلی صبح ہم آسٹریلیا کے صدر مقام کینبرا کے مسافر تھے صرف اس لیے کہ پاکستانی سفیر نے ہماری آمد کی خبر پا کر ہمیں خاص طور پر کھانے کے لیے مدعو کیا تھا۔۔ پونے تین سو کلو میٹر کا فاصلہ طے کر کے صرف ایک کھانے کے لیے جانا تو نہایت بیہودہ بات تھی چاہے وہ آپ کے ملک کے سفیر کی جانب سے ہی کیوں نہ ہو لیکن میرے لیے کینبرا میں کچھ اور کشش بھی تھی، ایک تو میرا عزیز از جان بچپن کا دوست خاور زمان ایک زمانے میں وہاں پاکستان کا ہائی کمشنر تعینات رہا تھا اور اُس کا بیٹا علی جو کینبرا میں پی ایچ ڈی کر رہا تھا وہ بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ علاوہ ازیں ڈپٹی ہائی کمشنر کے طور پر میرے بیٹے کی ایک کولیگ وہاں اپنے فرائض سر انجام دے رہی تھی اور یہ مونا تھی جو بہرطور کینبرا کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی تھی کہ اُس کے بھائی احمد شفاعت نے 1964ء میں اس شہر سے حساب کے مضمون میں پی ایچ ڈی کی تھی، جس کے بارے میں نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر عبدالسلام نے پیشین گوئی کی تھی کہ یہ نوجوان مستقبل میں پاکستان کے لیے حساب کے مضمون میں پہلا نوبل انعام حاصل کر سکتا ہے۔ احمد شفاعت کا تقریباً تین ماہ پیشتر کینیڈا میں انتقال ہو گیا تھا۔ وہ حساب ترک کر کے مذہب کی جانب چلا گیا، کیسے اور کیوں؟ یہ ایک الگ داستان ہے۔
کینبرا ایک بے روح ،سپاٹ، ایک بے جان اگرچہ دل کشی کا حامل شہر تھا۔۔ محترم ہائی کمشنر اور پاکستانی سفارت خانے کے تمام اہلکار ہمارے استقبال کو آئے اور ایک عثمانی ترک ریستوران میں ہمارے لیے ایک دعوت کا اہتمام کیا۔۔ سلجوق کی فارن آفس کی کولیگ نے میمونہ سے جی بھر کے باتیں کیں۔۔ ہائی کمشنر مالک صاحب دھیمے اور مسکراتے ہوئے تھے اور وہاں میرے دوست خاور زمان کی سفارت کے دنوں کی بہت توصیف ہوئی۔۔ شام کا کھانا ڈاکٹر محمد علی کی رہائش گاہ پر تھا لیکن اس سے پیشتر انہوں نے ہماری فرمائش پر ہمیں کچھ خاص علاقوں میں ٹہلتے، اچھلتے اور ہمیں دلچسپی سے دیکھتے کنگرو دکھائے۔ میں کیمرہ سنبھالے اُن کے بہت قریب چلا گیا اور اس لمحے سورج غروب ہو رہا تھا۔ وہ پچھلی ٹانگوں پر کھڑے، اپنی لامبی تھوتھنیاں اٹھائے مجھے حیرت سے دیکھتے تھے۔ کنگرو ایک خوبصورت جانور نہیں ہے، کچھ اپاہج اور معذور سا لگتا ہے لیکن اس لحاظ سے منفرد ہے کہ صرف آسٹریلیا میں پایا جاتا ہے، وہ کیوں افریقہ یا پاکستان میں نہ پایا گیا۔ اس بھید کو کھولنے میں قاصر ہوں۔ بہر طور یہ ایک شاندار تجربہ تھا۔
ڈاکٹر محمد علی کے آرام دہ گھر میں بہت آرام ملا۔ علی زمان اور اس کی بیگم اپنی اس بیٹی کے ہمراہ جو

اُن کے خاندان میں درجنوں بیٹوں کے بعد لاکھ دعاؤں سے پیدا ہوئی تھی، موجود تھے ، اور حیرت در حیرت کہ "تارڑ ریڈرز ورلڈ" کا وہ نوجوان سعد علوی جس نے میرے بارے میں ایک ویب سائٹ لانچ کی تھی وہ بھی میری خبر پا کر وہاں پہنچ گیا تھا۔ اور چند لمحوں بعد اس کی کھینچی گئی تصویروں سے ایک دنیا کو خبر ہو گئی کہ میں کینبرا میں ہوں اور ہائی کمشنر کے کھانے کے بعد ڈاکٹر محمد علی کے ہاں مہمان ہوں۔۔ کینبرا کے سفر کے دوران جہاں جاوید نظر تھے اور انجم ایاز تھے وہاں خاموش طبع مصطفی بھی تھے جن کی رفاقت نے مجھے مسرت سے ہمکنار کیا۔۔ پونے تین سو کلو میٹر واپس گئی رات سڈنی آئے اور اگلی سویر وولوگانگ کے دل کش ساحلی قصبے کا سفر اختیار کیا جہاں سمندری چٹانوں کے ایک غار میں سے سمندر کی وحشت ایک سفید فوارے کی مانند اُچھلتی آپ کے بدن بھگوتی ہے۔۔ رات کو کھانے کے لیے ہم ڈاکٹر کے ہاں مدعو تھے جو ضمیر جعفری صاحب کے بھتیجے ہیں۔ ایک مدت سے وولو گانگ میں مقیم ڈاکٹر صاحب نے اپنی محنت سے ایک میڈیکل ایمپائر تخلیق کر لی ہے۔ وہاں بھی مجھ سے ملاقات کرنے دور دور سے لوگ آئے جن میں سے بیشتر ڈاکٹر حضرات تھے۔
اگلے روز میں اپنے انگلستان کے زمانوں کے دیرینہ دوست جسے "نکلے تری تلاش میں" اور "خانہ بدوش" کے پڑھنے والے "تہران کا سکھدیپ " کے طور پر جانتے اور اس سے محبت کرتے ہیں، اگلے روز میں سینٹ آئوز میں واقع اُس کے گھر پر دستک دیتا تھا۔ ہم تقریباً چالیس برس کے بعد مل رہے تھے۔۔ وہ بھی میری طرح بوڑھا ہو چکا تھا۔۔ اس کی ڈاڑھی سفید ہو چکی تھی۔۔ اُسے گلے لگاتے ہوئے مجھ پر کیا گزر گئی میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس کی بیوی رُوپا ہمیں دیکھ دیکھ کر مسکراتی تھی اور اس کا کتا شیرا دُم ہلا کر میرا (استقبال کرتا تھا۔۔ (جاری ہے

سکھدیپ اور سلمان کے گھر
مستنصر حسین تارڑ
14-05-2014
سکھدیپ کو تقریباً چالیس برس بعد گلے لگاتے ہوئے مجھ پر کیا گزر گئی اس کا بیان ممکن نہیں ہم تب نوخیز بے دریغ اور جوانی کے خمار میں دن رات کرتے تھے جب ہم انگلستان میں اکٹھے پڑھتے تھے، پھر تہران میں یورپ کی جانب سے سفر کرتے ملاقاتیں ہوئیں اور اب ہم سڈنی میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے، زمانہ کیا کیا رنگ دکھلاتا ہے۔۔ یہ حقیقت ہے کہ سکھدیپ ایسے ہمدم دیرینہ سے ملنا بہتر تھا ملاقات مسیحا و خضر سے۔۔ اور ہم دونوں بوڑھے پھونس ہو چکے تھے۔۔ سکھدیپ کے خاندان کا شمار تہران کے متمول ترین خاندانوں میں سے ہوتا تھا اور مجھے یاد ہے کہ اس نے تہران کلب کا وہ شاندار محل نما کمرہ میرے لئے ڈنر کے لئے کھلوا لیا تھا جہاں کبھی کبھار شاہِ ایران اپنے قریبی دوستوں کے ساتھ شب گزارتا تھا۔۔ امام خمینی کی آمد سے پیشتر سکھدیپ کے خاندان نے اپنا کاروبار سمیٹا اور وہ آسٹریلیا منتقل ہو گئے۔۔ اس دوران ہمارا رابطہ برقرار رہا۔۔ جب مجھے گوردوارہ جنم استھان میں ایک شلوکا پیش کیا گیا تو میں نے وہ شلوکا سکھدیپ کو بھیج دیا کہ وہی اپنے پیغمبر کے جائے پیدائش سے آنے والے شلوکا یا چادر کی قدر کر سکتا تھا۔۔ وہ ہر سردار کی مانند دارو کا رسیا تھا، جی ہاں وہی دارو۔۔ کہ تینوں پین گے نصیباں والے نِیں دارو دیئے بند بوتلے۔۔ کبھی کبھار اس کی بیوی روپی آسٹریلیا سے فون کرتی "چوہدری جی۔۔ سکھدیپ آج پھر خمار میں ہے اور آپ کو یاد کرتا رو رہا ہے، اس سے بات کریں" اور سکھدیپ گلوگیر ہو کر کہتا "اوئے چوہدری۔۔ یار تو آسٹریلیا آ جا۔۔ تجھے ملنے کو بہت دل کرتا ہے، تو میرے اچھے دنوں کی خوشبو ہے، میری جوانی کی شبنم ہے" اور میں بھی آبدیدہ ہو جاتا۔
سینٹ آئیوز میں جنوبی افریقہ سے منتقل ہونے والے یہودیوں کی رہائش گاہیں تھیں اور یہ ازحد مہنگا علاقہ تھا۔۔ سکھدیپ نے اپنا موجودہ گھر تیس برس پیشتر خریدا تھا اور یہ ایک نظر کو سکھ دینے والا خاموش اور خوش نظر گھر تھا لیکن میں نے دیکھا کہ سکھدیپ ایک اداس شخص ہے، اس کی آنکھوں میں صرف تب خوشی کی لِشک آتی جب وہ میری طرف دیکھتا۔۔ میں نے پہلی مرتبہ آسٹریلیا میں اپنے گھر کی آسودگی کو محسوس کیا۔۔ روپی کہنے لگی "چوہدری جی، ہماری بڑ ی پوتی کا نام دل آرام ہے اور چھوٹی کا منّت۔۔ ہمارا بیٹا ان دنوں دوبئی میں تھا۔۔ ہم میں رواج ہے کہ بچے کی پیدائش پر گرنتھ صاحب کھولتے ہیں اور گوروبانی کے پہلے حرف پر نام رکھتے ہیں چنانچہ جب "د" آیا تو پوتی کا نام دل آرام رکھا اور جب "میم" آیا تو منّت رکھا" ۔ اس گھر میں ہم دونوں نے اس لئے بھی طمانیت محسوس کی کہ اردو اور انگریزی سے نجات ملی اور ہم پنجابی کے کھلے صحن میں نکل آئے۔
سکھدیپ کے بک شیلف میں میرے اولین سفرناموں کا مجموعہ سجا تھا، جب کوئی اردو جاننے والا اس کے ہاں آتا تو وہ اس سے فرمائش کرتا کہ ذرا پڑھ کر سناؤ کہ چوہدری نے میرے بارے میں کیا لکھا ہے اور کبھی وہ قہقہے لگاتا اور کبھی مجھے بُرا بھلا کہتا کہ چوہدری نے میرے بارے میں سب کچھ لکھ دیا، اپنے بارے

میں کچھ نہیں لکھا۔۔۔ کاش کہ میں ایک ادیب ہوتا تو میں لکھتا کہ چوہدری کیسے کیسے گُل کھلاتا تھا۔
اور وہاں سکھدیپ کے دماغ کی شریانوں میں کچھ اُلجھاہٹ آ گئی تھی چنانچہ ڈاکٹروں نے اسے شراب نوشی سے منع کر دیا تھا البتہ وائن پر پابندی نہ تھی۔۔۔ اور وائن اس کے لئے محض پانی تھی تو پانی کیا پینا۔
سکھدیپ کے گھر میں گزارے ہوئے لمحے سب کے سب ماضی کی اداسی میں ڈوبے ہوئے تھے۔۔۔ رخصت ہوتے ہوئے کہنے لگا ”چوہدری، آسٹریلیا چھوڑنے سے پیشتر بے شک ایک دن کے لئے میرے ہاں آ جانا کہ۔۔۔ چوہدری اب ہم نے دوبارہ نہیں ملنا“۔
ہم بالآخر سلمان کے گھر پہنچ گئے۔۔۔ ایک برخوردار، کوہ نوردی کا ساتھی اور مجھ پر جان چھڑکنے والا۔۔۔ جس نے شادی کے بعد اپنی خوش شکل ڈاکٹر بیوی سے کہا تھا کہ زندگی میں میری دو کمزوریاں ہیں جن پر تم نے اعتراض نہیں کرنا۔۔۔ ایک فوٹوگرافی کا عشق اور دوسرا تارڑ کی تحریروں کا جنون۔۔۔ سلمان کے گھر میں جتنے شجر تھے ان پر صبح سویرے رنگین طوطے غُل کرتے تھے اور اس کے جڑواں بیٹے احمد اور حسن سکول جانے کے لئے بھاگتے پھرتے تھے۔ مجھے پہچان نہ ہوتی ، میں ایک بچے کو دبوچ کر پیار کرتے ہوئے کہتا کہ۔۔۔ ہیلو احمد۔۔۔ تو وہ کہتا، دادا میں حسن ہوں اور جب اپنے تئیں حسن کو پیار کرتا تو وہ کہتا۔۔۔ میں تو احمد ہوں۔ مجھے یہاں وہی آرام ملا جو سلجوق یا سمیر کے گھر میں مجھے نصیب ہوتا ہے اور اس دوران سلمان نے خصوصی طور پر میرے لئے سری پائے بنائے اور لاہور قریب آ گیا۔ہم تینوں سڈنی سے اس جادوئی سُرخ چٹان آنرک راک یا الورو چٹان کی جانب پرواز کرتے تھے جو آسٹریلیا کا سب سے بڑا امتیازی نشان ہے۔
آسٹریلیا کے ویرانوں کے عین درمیان میں واقع ساٹھ ہزار برس سے ان صحراؤں میں زندگی کرتے مقامی لوگوں کا سُرخ معبد ہے۔۔۔ چٹیل ہموار ویرانوں کے درمیان یہ نوکلومیٹر طویل اور سوا ہزار فٹ اونچی چٹان لگتا تھا کہ آسمان سے گری ہے ۔ تقریباً ساڑھے تین گھنٹے کی پرواز کے بعد ہم ایک صحرا میں اتر گئے۔۔۔ کوئی ویرانی سی ویرانی تھی۔ اگرچہ حالیہ بارشوں کی وجہ سے صحرا میں سرسبز بہار آئی ہوئی تھی۔
الورو چٹان سے دس کلومیٹر اِدھر ایک ٹورسٹ ریسارٹ تھا جہاں روزانہ ایک ہزار سیاح آتے تھے اور جاتے تھے اور یہاں آنے کے لئے کئی ماہ پیشتر ایڈوانس بکنگ کروانی پڑتی تھی لیکن سلمان کی کاریگری ایسی تھی کہ ہمیں اس کی پرواز نصیب ہو گئی اور ریسٹورٹ میں ایک دو بیڈ روم رہائش گاہ مل ہی گئی۔۔۔ صرف یہ چھوٹا سا سیاحوں کے لئے ایک مختصر گاؤں تھا ورنہ یہاں سے نزدیک ترین انسانی آبادی ایلس سپرنگ قصبہ تھا جو تقریباً چار سوکلومیٹر کی صحرائی مسافت پر واقع تھا۔
کوئی ویرانی سی ویرانی تھی۔۔۔ لیکن یہ میری زندگی کی سب سے پُرلطف اور ہیجان خیز ویرانی تھی۔۔۔ اس شب ہم نے ”خاموشی کی آوازیں“ سنیں۔۔۔ الورو چٹان پر سورج غروب ہوتے دیکھا، ایک صحرائی طلسم میں یوں مبتلا ہوئے کہ ہم نے ڈنر میں کنگرو کے علاوہ مگرمچھ کھایا۔ (جاری)

آسٹریلیا کے درمیان میں الورو سرخ چٹان
مستنصر حسین تارڑ
18-05-2014
اور آسٹریلیا کی ویران وسعت کے عین درمیان میں ایک ایسی ویرانی میں جہاں سے نزدیک ترین انسانی آبادی ایلس سپرنگ تقریباً چار سو کلو میٹر کے فاصلے پر تھی اور جہاں سیاحوں کے لیے ایک مختصر قصبہ تھا وہاں کی پہلی شب ہم صحرا کے اندر گئے۔۔۔ پانچ کلو میٹر کے فاصلے پر دنیا کی سب سے بڑی چٹان ہموار میدان میں 9 کلو میٹر طویل سرخ چٹان الورو ابھی تک ڈھلتی دھوپ میں دکھائی دے رہی تھی۔۔۔ ہم سیاحوں کے اس مختصر گروپ کے ساتھ جنہوں نے ”خاموشی کی آوازیں“ نام کے بیچ صحرا ڈنر کے لیے سینکڑوں ڈالر جلائے تھے، ایک کوچ میں سوار ہو کر صحرا کی جانب گئے، پھر کچھ دور پیدل چلے اور پھر ایک نسبتاً بلند سطح پر جہاں سے سرخ چٹان کی عظمت پورے شباب پر تھی ہم ٹھہر گئے کہ ہم نے اس حیرت انگیز چٹان کو غروب کے منظر میں اترتے دیکھنا تھا۔ ایک موسیقار ابور خبل لوگوں کا ایک بھونپو نما سا ز پھونک رہے تھے اور اُس کی قدیم جنگلی آواز سرخ چٹان کے آس پاس پھیلے بارشوں سے سر سبز ہو چکے صحراؤں میں سرگرداں ہوتی تھی۔۔۔ یہ کسی حد تک سوئٹزر لینڈ کے قدیم زمانوں کے اُس ساز سے مشابہت رکھتا تھا جس میں پھونک مار کر پہاڑوں میں اپنے رشتے داروں کو بلایا جاتا تھا۔ تقریباً دو گز لمبے اس ساز میں پھونک مارنے کے لیے مضبوط پھیپھڑے اور سانس درکار تھا۔۔۔ میمونہ نہایت دھیان سے اس قدیم موسیقی کو سنتی رہی۔۔۔ یہاں سیاحوں کے لیے باریک اور پتلے گلاسوں میں آسٹریلیا کی مشہور وائن ”شیراز“ سرو کی جا رہی تھی اور جب میں نے ایک بہت موٹے آسٹریلوی کو بتایا کہ شیراز دراصل ایران کا ایک شہر ہے اور دنیا بھر میں وہاں کی انگوروں کی شراب مشہور تھی جس کا نام ہی ”شیراز“ تھا تو وہ غریب خوفزدہ سا ہو گیا ”تمہارا مطلب ہے ملّاؤں کا ایران۔۔۔ وہ شراب بھی کشید کرتے ہیں“ تو میں نے اُسے

تسلی دی "یہ پرانے زمانوں کے قصے ہیں، شیراز کے لوگ اندلس میں اپنی انگور کی بیلیں لے گئے اور وہاں بھی ان سے شراب کشید کی جو یورپ بھر میں بے حد مقبول ہوئی۔۔ انہوں نے اپنے نئے قصبے کا نام بھی شیراز رکھا جو ابھی بھی "خیرنیر" کے نام سے موجود ہے۔۔ اور شیرازی انگوروں سے اب بھی وہاں وائن بنائی جاتی ہے"۔
سورج الورو چٹان پر غروب ہونے لگا اور وہ جیسے ایک دھیمی آگ میں جلنے لگی، آس پاس ویرانے میں تاریکی اترتی تھی اور اس کے درمیان میں الورو چٹان کی سرخی بھڑکتی تھی اور پھر ہولے ہولے وہ مدھم ہوتی اور تاریکی میں اتر گئی۔۔ ایک کتا خوراک کی بو سونگھتا کہیں سے آ نکلا۔۔ میں قریب ہو کر تصویر اتارنے کو تھا کہ ہمارے گائیڈ نے منع کر دیا، یہ کتا نہیں ہے، صحرا کا لگڑ بگڑ ہے اور بے حد خطرناک ہے۔ اس سے دور رہیے۔
غروب کے مقام سے کچھ فاصلے پر اس جنگل میں کیا ہی زبردست منگل تھا بلکہ وہ بدھ یا جمعرات بھی ہو سکتا تھا کہ ڈنر کا اتنا پر لطف اہتمام تھا۔۔ الورو چٹان نیم تاریکی میں بھی نمایاں نظر آ رہی تھی اور خنکی بڑھتی جا رہی تھی جس کے سدباب کے لیے ہر میز کے پہلو میں ہیٹر نصب تھے۔۔ اسی کھانے کے دوران جب ہم اپنی پسند کی خوراکیں اپنی اپنی پلیٹ میں ڈال رہے تھے تو میں نے کنگرو کے گوشت کے کچھ ٹکڑے بھی منتقل کر لیے اور جب میں نے "مگر مچھ" لکھا دیکھا تو ظاہر ہے یہ سمندری خوراک تھی، حلال تھی، اس کے دو پارچے بھی پلیٹ میں ڈال لیے۔۔ کنگرو تو بکرے جیسا تھا اور مگر مچھ۔۔ پتہ نہیں کس جیسا تھا، حلق سے اترتا ہی نہ تھا۔
کھانے کے بعد تمام روشنیاں گل کر دی گئیں اور تاریکی کے ہمراہ ستارے بھی نیچے آ گئے۔ "خواتین و حضرات آپ سے درخواست ہے کہ خاموشی اختیار کریں اور خاموشی کی آوازیں دھیان سے سنیں۔۔ اور صحرا کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔۔ جانے کون کون سے جانور، جھینگر، چھپکلیاں اور ٹڈے بولتے تھے اور پھر ایک خاتون اُٹھیں اور انہوں نے نہایت ڈرامائی انداز میں آسمان پر روشن ستاروں کا تعارف کروایا اور ان میں مریخ بھی تھا، وہ سرخ تھا، الورو چٹان سرخ تھی اور ہمارے پاؤں تلے کی صحرائی زمین بھی سرخ تھی۔
آساں اندر باہر لال ہے
ساہنوں مرشد نال پیار ہے
آسٹریلیا کے عین درمیان میں اس صحرائی شب میں ایک قدیم طلسم تھا اور میں سحرزدہ، سحر زدہ اور آج تک سحر زدہ۔۔
اُس ریسٹورنٹ کا نام یُولارا تھا۔ کہیں قریب ہی ابور خبل لوگوں کا ایک گاؤں تھا۔ وہ دن میں ایک بار بس پر سوار ہو کر یولارا آتے، گھریلو استعمال کی اشیاء اور خوراک خرید کر واپس چلے جاتے۔۔ سیاحوں سے دور رہتے۔۔ فوٹو گرافی ناپسند کرتے۔۔ شاید اُنہیں پسند نہ تھا کہ جس سر زمین پر وہ پچھلے ہزاروں برسوں سے آباد ہیں وہاں وہ مقدس چٹان الورو ہے جس کی پرستش اُن کا آبائی مذہب ہے وہاں باہر کے لوگ آئیں اور اُس کا تقدس پامال کریں۔ ریسٹورنٹ
میں ابور خبل رقاص بھی ناچتے تھے اور ایک صاحب "بُوم رنیگ" پھینکنے کے فن سے بھی آگاہ کرتے تھے۔
اگلے روز سلمان نے بمشکل ایک کار کرائے پر حاصل کی کہ کاریں کم تھیں اور اُنہیں حاصل کرنے کے تمنائی بہت۔۔ اور ہم الورو چٹان کے دامن میں چلے گئے۔۔ میں نے اور سلمان نے جلتی دھوپ میں اس کے دامن سے لگ کر ایک مختصر ٹریک کیا۔ اسے سو رنگ میں دیکھا۔ پانی کا وہ تالاب دیکھا جو چٹان پر برسنے والی بارشوں کے نتیجے میں لبریز ہو جاتا ہے۔ ازاں بعد ہم چالیس کلو میٹر کے فاصلے پر واقع چٹانوں کے ایک جمگھٹے "کاٹا ٹوٹا" تک گئے اور اُن پر آفتاب کو غروب ہوتے دیکھا۔۔ اس سرخ منظر کو بیان کرنے کے لیے کوئی معجزہ قلم درکار ہے جو میں تو نہیں ہوں اور پھر انہی سرخ چٹانوں کے درمیان میں سے کیا آپ یقین کریں گے، چودھویں کے چاند کا تھال ابھرا۔۔ اب میں اگر معجزہ قلم ہوتا تو بھی بیان نہ کر سکتا، کل چودھویں کی رات تھی ، شب بھر رہا چرچا ترا۔
اگلی سویر۔۔ ابھی نیم تاریکی تھی، میری آنکھوں میں نیند کی سیاہ تتلیاں پھڑ پھڑاتی تھیں اور ہم، میں اور سلمان الورو چٹان پر طلوع آفتاب کا منظر دیکھنے کے لیے پاگل پن میں چلے جاتے تھے۔ وہاں الورو چٹان کے سامنے راستے تھے جو اُن بلند سطحوں پر لے جاتے تھے جہاں سے طلوع آفتاب کا منظر کھلتا تھا اور وہاں اتنے لوگ پہنچ چکے تھے جیسے کسی میلے میں شرکت کرنے کے لیے آئے ہوں بلکہ سلمان نے کہا کہ سر ۔۔ لگتا ہے کہ لوگ جس طور کشاں کشاں چلے آ رہے ہیں، عید کی نماز پڑھنے کے لیے چلے آتے ہیں۔
زندگی نے وفا کی تو میں الورو چٹان پر غروب اور طلوع کے مناظر کو تفصیل سے لکھوں گا۔
مختصر یہ کہ۔۔ سحر زدہ، سحرزدہ!
کیا ایک کنگرو۔۔ ایک کوالا ریچھ۔۔ سڈنی آپرا کی بادبانی کشتی، آپرا ہاؤس کی عمارت اور ایک سرخ چٹان کے لیے آسٹریلیا تک کا طویل پر محویت سفر جائز ہے؟ ہاں جائز ہے بلکہ اس براعظم تک سفر نہ کرنا، ناجائز ہے!

ہم پاکستان کی جانب اڑے جاتے تھے اور میرے جوگرز کے تلوے سرخ تھے، اُن میں الورو چٹان کی مٹی سرایت کر گئی تھی۔ تھینک یو آسٹریلیا!

انسانوں کا چڑیا گھر
مستنصر حسین تارڑ
21-05-2014

ایک زمانہ تھا کہ میرے معاصرین مجھ پر پھبتی کسا کرتے تھے کہ یہ کیسا ناہنجارکالم نگار ہے کہ یہ زیادہ تر جانوروں کے بارے میں کالم لکھتا ہے۔ اسے انسانوں سے زیادہ لگڑ بگڑ، شتر مرغ، اُلّو، گدھے، زرافے، ہاتھی اور گدھ وغیرہ مرغوب ہیں اور یاد رہے کہ ان میں سے بیشتر معاصرین کی شکلیں حیرت انگیز طور پر کسی نہ کسی جانور یا پرندے سے مشابہ ہیں۔۔۔ چند برس پیشتر میں اپنے عمیق مشاہدے اور تخیل کی بلند پروازی کے زور پر ایک نتیجے پر پہنچا تھا کہ تقریباً ہر انسان بڑھاپے کی دہلیز پر پہنچ کر ایک جانور کی شکل اختیار کرنے لگتا ہے۔۔۔ اور ابھی تک کسی محقق یا ماہر حیوانات نے میرے اس تھیسس سے اختلاف نہیں کیا۔ امکان غالب ہے کہ انہوں نے بھی اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا ہو گا۔۔ نیکی گھر سے شروع کرتے ہیں اور میں اپنے آپ کو اس حیوانی تجربہ گاہ میں پیش کرتا ہوں۔۔۔ جوانی میں ہماری شکل تیکھی ناک کی وجہ سے اس عقاب سے ملتی تھی جو لہو گرم کرنے کی خاطر عقابی نازنینوں پر جھپٹتا پلٹتا تھا۔۔۔ آنکھیں ذرا نشیلی اور بڑی تھیں اس لئے بعض اوقات مجھ پر ایک ناآسودہ اُلّو کا گمان بھی ہوتا تھا لیکن پچھلے چند برس سے صورت حال میں تغیر رونما ہو چکا ہے۔۔۔ اب صبح سویرے آئینہ دیکھتا ہوں تو اس میں ایک عمر رسیدہ ہوس پرست گدھ نظر آتا ہے جس کی آنکھوں میں موتیا اتر چکا ہے، تیکھی چونچ بُھر چکی ہے اور بال و پر مسلسل جھڑنے سے تقریباً گنجا ہو چکا ہے۔۔۔ جوانی میں مجھ پر الزام لگایا جاتا تھا کہ میں نرگسیت کا شکار ہوں، اپنے آپ کو پسند کرتا ہوں اور میں اقرار کرتے ہوئے کہ یہ الزام درست تھا۔ تبھی میں جب آئینہ دیکھتا تھا تو مجھے اپنی شکل اچھی لگتی تھی تو کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکر نہ ادا کرتا، اس پر ناز نہ کرتا۔۔۔ اگر دیگر معاصرین اپنی جوانی میں آئینہ دیکھ کر مایوس ہوتے تھے، انہیں وہاں ایک ڈھیلے منہ اور ہیبت ناک ناک کا نقشہ نظر آتا تھا اور ان کا جی چاہتا تھا کہ وہ ذاتی طور پر اسے دیکھتے ہوئے پکار اٹھیں کہ فِٹے منہ۔۔۔ تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔۔۔ جیسے ایک سردار صاحب قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے کہا کہ تم میرا شکر ادا کیوں نہیں کرتے، میں نے تمہیں بندہ بنایا تو سردار جی نے اپنے سراپے کی جانب اشارہ کر کے کہا یہ بندہ بنایا ہے! تو اسی طور معاصرین حسد کی آگ میں راکھ ہوتے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھ کر کہتے ہوں گے "یہ بندہ بنایا ہے" بہرطور اگر میں نرگسیت میں مبتلا تھا اور اب اقرار کرتاہوں کہ اس بڑھاپے میں مجھے آئینے میں ایک بوسیدہ سا گدھ نظر آتا ہے، سالخوردہ ناآسودہ اُلّو نظر آتا ہے تو وہ بھی اقرار کر لیں کہ ان دنوں وہ کیا نظر آتے ہیں۔ میرے ایک عزیز دوست ہیں جنہیں جوانی میں بہت ناز تھا کہ وہ وحید مراد لگتے ہیں، بوڑھے ہوئے ہیں تو بے دھیانی میں ان پر نظر پڑ جائے تو ایک دھچکا سا لگتا ہے، انسانوں کی ابتدائی شکل لگتے ہیں۔۔۔ ٹیلی ویژن پر نمودار ہونے والے سیاستدان، سینئر تجزیہ نگار، دانشور وغیرہ کیا لگتے ہیں، میں نے اس ملک میں رہنا ہے، کیوں بیان کروں کہ وہ کیا لگتے ہیں۔۔۔ پہلے ہی میرے دشمنوں کی تعداد بہت ہے۔۔۔ لیکن ان میں سے ایک صاحب جو ہماری قسمتوں کے مالک رہے۔۔۔غیرممالک میں جائیدادوں اور محلات کے بھی مالک رہے ہمہ وقت دندان کی نمائش کرتے پتہ نہیں کیا لگتے تھے۔ ان میں ایک موٹی موٹی آنکھوں والی لومڑی بی بی بھی ہیں۔۔۔ ان کے سوا ایسے لوگ ہیں جن کی شکلیں پتھر کے زمانوں کے انسانوں کی ہیں، اگرچہ ہمارے کچھ دانشور اور صحافی ان کو پوجتے ہیں۔۔۔ وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں کرتے۔۔۔ ہم آہ بھی بھرتے ہیں تو روشن خیال اور سیکولر ہو جاتے ہیں۔ ملالوی وغیرہ قرار دیئے جاتے ہیں۔ اب ذرا انصاف کیجئے کہ ٹیلی ویژن پر جو "مناظرے" ہوتے ہیں، جن میں شامل سیاست دان، سینئر تجزیہ نگار اور دانشور دانت نکوستے ایک دوسرے پر غراتے حملہ آور ہوتے ہیں تو کیا آپ کو کسی وفادار جانور کا گمان نہیں ہوتا۔۔۔ رزق گدا کم نہ کر سکنے والے جانور۔۔۔ ویسے یہ جانور اگر میرا کالم پڑھ لیں تو کیسے دکھی ہوں کہ ہم تو اصحاب کہف کے پیروکار ہیں، ہم میں جو صفات ہیں اگر وہ ایک انسان میں ہوں تو وہ ولی اللہ ہو جاتا ہے تو ہمیں کیوں انسانوں سے مشابہ کیا جا رہا ہے۔۔۔ ہم پر یہ دن بھی آنے تھے۔ مجھ پر اگر الزام لگایا جاتا رہا کہ میں انسانوں کی نسبت جانوروں سے زیادہ رغبت رکھتا ہوں تو مجھے کچھ شرمندگی نہیں ہے۔۔۔ اگر شرمندگی ہوتی تو میں اپنی کتابوں کے نام "اُلّو ہمارے بھائی ہیں"، "فاختہ"، "پکھیرو"، "گدھے ہمارے بھائی ہیں" اور "شُترمرغ ریاست" وغیرہ کیوں رکھتا۔۔۔ اور ہاں مجھے بہت حیرت تھی، ایک گُتھّی تھی جو سُلجھتی نہ تھی کہ میرے تقریباً درجن بھر اخباری کالموں کے مجموعوں میں سے یہ "اُلّو ہمارے بھائی ہیں" جس کے ایڈیشن دھڑا دھڑ آتے چلے جاتے ہیں جبکہ دیگر مجموعے بھی اتنے ہی اچھے یا بُرے ہیں۔ تب انکشاف ہوا کہ یہ پاکستانی بہنوں کی سب سے پسندیدہ کتاب اس لئے ہے کہ وہ

اپنے بھائیوں کو سالگرہ کے تحفے پر یہ کتاب پیش کرتی ہیں کہ۔۔ اُلّو ہمارے بھائی ہیں۔ جانوروں اور پرندوں سے محبت کرنے والوں کی پاکستان میں کمی نہیں، باغ جناح میں متعدد افراد روزانہ صرف پرندوں کو دانہ ڈالنے آتے ہیں لیکن ثواب کی خاطر نہیں صرف ان سے محبت کی خاطر۔۔ پرندوں کو ثواب کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔۔ نہر کے کنارے، گلبرگ کے کسی چوک میں صبح سویرے آپ کو ایسے افراد ملیں گے جو شاپر بیگز میں گوشت اور چھیچھڑے فروخت کر رہے ہوتے ہیں، ایک موٹرسائیکل سوار یا کار والا رُکتا ہے، شاپر بیگ خریدتا ہے اور وہیں فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر چیلوں کو کھلا کر اپنے گناہ بخشوا لیتا ہے، صدقہ خیرات کر کے مطمئن ہو جاتا ہے۔۔ مجھے ہمیشہ حیرت ہوتی ہے کہ ایسے موقع پر یکدم چیلیں کہاں سے نمودار ہو جاتی ہیں۔۔ اس صدقے کے گوشت کی نچھاوری کا سب سے پُرلطف مظاہرہ دریائے راوی کے پُل پر دیکھا جاتا ہے جہاں مختلف افراد بلندی سے گوشت اور چھیچھڑے نیچے پھینکتے ہیں اور درجنوں چیلیں انہیں پانی میں گرنے سے پیشتر دبوچ لیتی ہیں۔۔ ثواب کی کمائی اور نیک دلی کا ایک اور طریقہ ان دنوں نہایت پاپولر ہے۔۔ یعنی پرندوں کو آزاد کیجئے۔ ادھر لاہور کے جدید علاقوں میں تو کم کم لیکن سرکلر روڈ، داتا صاحب اور اندرن شہر آپ کو پرندوں کے سوداگر کثرت سے ملیں گے۔ لوگ معقول رقم ادا کر کے انہیں آزاد کرتے ہیں اور پھر یہ سوداگر انہیں دوبارہ پکڑ کر پھر سے برائے فروخت کر دیتے ہیں۔ اندرون شہر کی پچھلی یاترا کے دوران سعید بٹ نے ایک ایسے ہی سوداگر سے چار کوّے، سو روپے فی کوّا کے حساب سے خریدے اور میرے سر سے چھو کر صدقے کے طو رپر انہیں آزاد کر دیا۔ میں نے سرزنش کی تو کہنے لگا، سَر جی ہم آپ سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ دنیا بھر کے کوّے آپ پر نثار کر دیں۔۔ اگر کچھ بُلبُلیں، ہُد ہُد یا طوطے وغیرہ مجھ پر نثار کئے جاتے تو چنداں مضائقہ نہ تھا لیکن کوّوں کا مجھ پر نثار کیا جانا مجھے کچھ اچھا نہ لگا۔

پرندوں سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے
مستنصر حسین تارڑ
25-05-2014

پرندوں اور جانوروں سے محبت کرنے والوں کی دو قسمیں ہیں۔۔ ایک تو مجھ ایسے جن کے دل میں پرندے کی کُوک سے دل میں ہوک اٹھتی ہے۔ اُنہیں ہر پرندہ فرید الدین عطار کا وہ پرندہ نظر آتا ہے جو سچ کی تلاش میں اپنے آپ کو موت، تنہائی، خود فراموشی اور سناٹے سے بھری وادیوں میں اُڑانیں کرتا یا تو بھسم ہو جاتا ہے اور یا پھر قاف کی پہاڑیوں میں پہنچ کر اپنے آپ کو رو برو پاتا ہے کہ وہ خود ہی سچ ہوتا ہے۔۔ امام غزالی نے فرمایا تھا کہ درویش جب جنگل میں جاتا ہے تو اس کے گل بوٹے، شجر یہاں تک کہ پتھر بھی اس سے ہم کلام ہوتے ہیں اور میں ذاتی تجربہ بیان کرتا ہوں کہ اگرچہ میں درویش نہیں دنیا دار ہوں اس کے باوجود پرندے مجھ سے باتیں کرتے ہیں، ہم کلام ہوتے ہیں۔ باغ جناح میں قدیم اور گھنے درختوں کی گھناوٹ کے اندر ایک پرندہ پوشیدہ ہر سویر جب میں سیر کرتا اُدھر سے گزرتا تھا تو وہ نہایت سریلے انداز میں کو کتا تھا۔۔ ایک روز میں نے اُس شجر کے نیچے کھڑے ہو کر اُس کی کُوک کا جواب دیا۔کچھ دیر تو خاموشی رہی اور پھر یکدم اس نے نہایت پر مسرت ہو کر پھر سے چہکار کی۔۔ نہایت مترنم انداز میں پکار کی۔۔ میں نے پھر اس کی نقل اتاری تو سلسلۂ کلام باقاعدہ شروع ہو گیا۔ اب میں روزانہ اس شجر کے نیچے کھڑے ہو کر منہ اٹھا کر کُوکتا تو شاخوں کے گھنے اندھیرے میں سے جواب آجاتا۔۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس پوشیدہ پرندے کے بال و پر کیسے تھے، رنگین تھے یا سادہ تھے، وہ کونسی نسل کا تھا اور کبھی گمان گزرتا کہ وہ ہے بھی یا نہیں، یہ میں خود ہی ہوں جو وہاں درختوں کی گھناوٹ میں بسیرا کرتا ہوں اور اُن کے نیچے بھی میں ہوں، میں خود ہی پرندہ ہوں اور خود ہی اپنے آپ سے ہم کلام ہوتا ہوں۔۔ جیسے چیانگ چونے خواب میں دیکھا تھا کہ وہ تتلی بن گیا ہے اور پھر وہ عمر بھر اس مخمصے میں رہا کہ شاید میں دراصل تتلی ہوں جس نے خواب میں دیکھا کہ وہ چیانگ چوہے۔۔ کہیں یہ انا الحق کے سلسلے کی ایک کڑی تو نہیں ہے۔۔ سیر کے دوران ایک واقف کار صاحب نے یونہی پوچھا کہ تارڑ صاحب۔۔ میں نے نوٹ کیا ہے کہ ہر سویر آپ ایک درخت کے قریب رُک کر منہ اٹھا کر کچھ کہہ رہے ہوتے ہیں تو کیا کرتے ہیں، میں نے سنجیدگی سے کہا۔۔ وہاں اس شجر کی گھناوٹ میں پوشیدہ ایک پرندہ ہے جس کے ساتھ میں باتیں کرتا ہوں۔ ازاں بعد وہ صاحب مجھے دیکھ کر کترا کر اِدھر اُدھر ہو جاتے، اگر آمنا سامنا ہو جاتا تو مجھ سے خوفزدہ ہو کر فرار ہو جاتے کہ پرندوں سے باتیں کرنے والوں سے دور ہی رہنا چاہیے۔۔ دیوانے لوگ ہیں، فرزانے لوگ ہیں۔
پرندوں اور جانوروں سے محبت کرنے والوں کی دوسری قسم ذرا فیشنی اور جدید نوعیت کی ہے۔۔ یہ لوگ غیر ملکی سرمائے سے تحفظ حیوانات اور پرندہ جات کی انجمنیں قائم کرتے ہیں، کسی ایک آوارہ بلی کو جو کسی کتے کی زخمی کردہ ہوتی ہے اُسے گھر لا کر اُس کی مر ہم پٹی کرتے ہیں اور تصویریں اتروا کر کُل دنیا میں چرچا کرتے ہیں کہ اے لوگو ذرا دیکھو ہم پاکستانی کتنے رقیق القلب ہیں، بلیوں سے بھی پیار

کرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں اُنہیں تحفظ حیوانات اور بلی جات کے سلسلے میں منعقد کردہ بین الاقوامی سیمیناروں میں شرکت کے سندیسے دھڑا دھڑ ملتے چلے جاتے ہیں۔۔۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مارننگ شو میں جس کی میزبانی بھولی بھالی سی لگتی جگن کاظم کر رہی تھی، میرے برابر میں ایک کبھی کی نہایت مبحوت کر دینے والی شکل کی اور اب ادھیڑ عمر خاتون براجمان تھیں جن کے لباس کے بخیے اُن کے بے قابو ہوتے پژمردہ اور بے روح بدن کے زور سے اُدھڑتے جاتے تھے جانوروں سے اپنے عشق کا اظہار کرتے ہوئے کہہ رہی تھیں، ہم تیسری دنیا کے لوگ جانوروں سے محبت نہیں کرتے، میں نے تو اپنی زندگی پرندوں اور جانوروں کی بہبود کے لیے وقف کر رکھی ہے بلکہ میرے گھر میں اس وقت بھی نوبلیاں، چھ خرگوش، ڈیڑھ درجن بطخیں اور طوطے اور ایک گدھا ہے جن کے ساتھ میں رہتی ہوں، ابھی دو چار روز پیشتر آدھی رات کے وقت ایک صاحب میرے گھر آئے اور وہ مجھے ایک لاوارث بلی دے گئے۔ اس پر میں نے ازراہ ہمدردی کہا کہ خاتون۔۔۔ اور یاد رہے کہ یہ خاتون ایک زمانے میں ٹیلی ویژن پر اداکاری کرتی تھیں اور اُن کی وجۂ شہرت قصر صدارت سے بھی منسلک تھی، نہایت اعلیٰ پائے کی انگریزی کالم نگار ہیں اور مسلسل اور بے وجہ بولنے میں مہارت رکھتی ہیں تو میں نے ان سے کہا کہ خاتون۔۔۔ اگر شہر میں کہیں بھی کوئی لاوراث بلی ہو تو بلا خطر اُسے آپ کے گھر آدھی رات کے وقت پہنچا دیا جائے تو وہ مجھ سے خشمگیں اور خفا سی ہو گئیں اور کہنے لگیں ہاں میں لاوارث بلیوں کو تو پناہ دے سکتی ہوں، لاوراث بلوں کو نہیں۔۔۔ کچھ دیر بعد انہوں نے پھر اپنی حیوانی محبت کے اظہار کے طور پر پر جوش ہو کر کہا میرے گھر میں اس وقت بھی نو بلیاں، چھ خرگوش، ڈیڑھ درجن بطخیں اور طوطے اور ۔۔۔ ایک گدھا موجود ہے۔۔۔ تو میں نے بصد ادب کہا کہ واہ۔۔۔ ایک گدھا بھی آپ کے ساتھ قیام پذیر ہے تو وہ چہک کر بولیں، آپ کو کیا اعتراض ہے تو میں نے کہا، مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے، اگر ہو گا تو گدھے کو ہو گا۔۔۔ اس پر وہ مزید خفا ہو گئیں۔۔۔ کہنے لگیں، آپ گدھے کی اہمیت سے واقف نہیں، ہمیں گدھوں سے بھی محبت کرنی چاہیے تو میں نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہا، ہاں خاتون، گدھا یوں بھی نہایت کار آمد جانور ہے۔ اس کے ہمراہ قیام پذیری میں بہت سے فوائد ہیں جن سے آپ تو بخوبی آگاہ ہوں گی۔ وہ خاتون آج تک میری دشمن جاں چلی آتی ہیں۔
میں نے یہ سلسلہ ہائے کالم نویسی کا آغاز اس لیے کیا تھا کہ میں الگ الگ مختلف حیوانات اور پرندہ جات کے بارے میں کالم باندھوں، اُن کے خصائل اور فضیلت کے حوالے سے اُن کے شخصی خاکے تحریر کروں کہ آج تک سوائے پطرس کے کتوں اور کرشن چندر کے گدھے نے کسی نے، بھی ادب عالیہ میں اُن کی ترجمانی نہیں کی۔۔۔ اور ہاں میں رفیق حسین کو بھولتا تھا جنہوں نے صرف جانوروں کے بارے میں حیرت بھرے افسانے لکھے۔۔۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ میں سب سے پہلے کس جانور کے خصائل بیان کروں، ایک مگرمچھ، شیر، گدھے، کتے، شتر مرغ، گدھ ، اودھ بلاؤ، مینڈک، ہاتھی، اونٹ، الو، بلی، دھک مکوڑے، مچھلی، بھینس یا بیل۔۔۔ کہاں سے آغاز کروں۔۔۔
ویسے ان سب میں سے کام کا اور فعال جانور گدھا ہے۔۔۔ تو بارے گدھوں کے کچھ بیان ہو جائے

گدھے ہمارے بھائی ہیں
مستنصر حسین تارڑ
28-05-2014
تو بارے گدھوں کے کچھ بیاں ہو جائے کہ گدھا سب جانوروں سے کام کا اور فعال جانور ہے۔۔۔ شاید میں پہلا خودساختہ دانشور ہوں جس نے یہ حقیقت دریافت کی ہے کہ بیشتر امریکی گدھے ہیں بلکہ بصد ادب عرض کرتا ہوں کہ فی زمانہ صدر اوباما سب سے بڑے گدھے ہیں کہ ڈیموکریٹ پارٹی کا امتیازی نشان گدھا ہے۔۔۔ اور پچھلے دو الیکشنوں میں امریکی عوام نے ڈیموکریٹس کو ووٹ دیا ہے یعنی گدھے کو پسند کیا ہے۔۔۔ اوباما ظاہر ہے اس پارٹی کے سربراہ ہونے کے ناتے بجا طور پر سب سے بڑھے گدھے کہلائے جانے کے حقدار ہیں۔۔۔ ادھر ہماری حکمران پارٹی کا نشان شیر ہے۔۔۔ یعنی شیروں کی حکومت ہے لیکن یہ عجیب سے شیر ہیں کہ اپنے ملک کے معاملات چلانے کے لئے گدھوں سے نہ صرف مشورہ لیتے ہیں، ان کے احکامات کے سامنے دُم ہلانے لگتے ہیں بلکہ امداد کی بھیک والا کشکول بھی گدھوں کے سامنے دراز کرتے ہیں۔۔۔ گدھے مہربانی کرتے ہیں اور شیروں کے کشکول میں کچھ ڈالر ڈال دیتے ہیں جس سے گلشن کا کاروبار چلتا رہتا ہے۔ یاد رہے کہ یہ گلشن فیض صاحب والا یا والی نہیں ہے۔۔۔ شنید ہے کہ ایک عمر رسیدہ طوائف گلشن نام کی تھی جس کے ہاں نہ کوئی آتا تھا اور نہ کوئی جاتا تھا، اگر کوئی بھولا بھٹکا آتا تھا تو دوبارہ نہ آتا تھا تو اس نے بیکاری سے تنگ آ کر اپنے کوٹھے کے باہر ایک تختی آویزاں کر دی جس پر لکھا تھا، چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے۔۔۔ چنانچہ کاروبار چل نکلا۔۔۔ ویسے آپ نے بھی غور کیا ہو گا کہ حکمران پارٹی کا نشان ایک چیتا ہے، شیر نہیں۔۔۔ بہرطور یہ محکمہ انسداد بے رحمی برائے حیوانات کا کام ہے کہ وہ ہمارے حکمرانوں کو سمجھاتے کہ حضور آپ نے اپنی رہائش گاہ کے باہر ببرشیروں کے مجسمے سجا رکھے

ہیں جبکہ بیلٹ پیپر پر تصویر ایک چیتے کی ہوتی ہے۔۔ بہرطور بیان گدھوں کا ہو رہا تھا جو ان دنوں ہمارے ان داتا ہیں اور بیچ میں شیر دُم ہلانے لگے۔۔ میں گدھوں کی فضیلت کے بارے بہت سے تاریخی اور مذہبی حوالے دے سکتا ہوں۔۔ اور ان میں سب سے افضل خر عیسیٰ ہے جس کے بارے میں ایک فضول سی روایت ہے کہ خر عیسیٰ اگر مکہ بھی گیا اور لوٹا تو ایک خر یا گدھا ہی رہا۔۔ اب آپ ہی انصاف فرمایئے کہ مکہ سے لوٹنے پر وہ غریب کیا ہو جاتا، اونٹ ہو جاتا، زرافہ ہو جاتا، گدھا گیا تھا تو گدھا ہی واپس آنا تھا ناں۔۔ جیسے لاکھوں لوگ مکہ جاتے ہیں تو واپسی پر انسان ہی رہتے ہیں ناں۔۔ گدھے بے چارے کو کیوں موردالزام ٹھہرایا جاتا ہے۔

حیوانات کی تعداد کے حوالے سے ایک بین الاقوامی سروے کے مطابق پاکستان میں آبادی کے تناسب سے دنیا بھر میں سب سے زیادہ گدھے پائے جاتے ہیں۔۔ اور سب کے سب گدھے نہیں ہوتے ان میں یقیناًگدھیاں بھی شامل ہیں ورنہ اتنے گدھے کہاں سے آ جاتے۔۔ دیگر پاکستانیوں کی مانند گدھے بھی خاندانی منصوبہ بندی پر یقین نہیں رکھتے۔۔ ان میں ان کی کچھ بدنی مجبوریوں کا بھی عمل اور بہت سارا دخل ہے۔ خر عیسیٰ کے علاوہ تاریخ عالم میں سب سے مشہور ملّا نصرالدین کا گدھا ہے۔۔ حکایت ہے کہ ایک پڑوسی ملّا سے اس کا گدھا مانگنے کے لئے آیا تو ملّا نصرالدین نے کہا کہ افسوس اسے تو میرا ایک دوست ابھی ابھی مانگ کر لے گیا ہے۔ اس دوران گھر کے اندر بندھے گدھے نے ڈھینچوں ڈھینچوں کا الاپ شروع کر دیا تو پڑوسی نے کہا، ملاّ جھوٹ بولتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی، گدھا بول رہا ہے اور تم کہتے ہو کہ اسے تمہارا کوئی دوست لے گیا ہے تو ملاّ نصرالدین نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔۔ شرم تو تمہیں آنی چاہئے۔۔ میری زبان کا اعتبار نہیں کرتے گدھے کی زبان پر اعتبار کرتے ہو۔۔ صرف ہم پاکستانی ہیں جو امریکی گدھے کی زبان کا ہی اعتبار کرتے ہیں اور پچھلے چھیاسٹھ برس سے کرتے چلے آئے ہیں۔۔ اگر نصف شب کے قریب وہ فون کر کے کہتا ہے کہ تم ہمارے ساتھ ہو یا نہیں، ہاں یا نہ میں جواب دو تو ہمارے کمانڈو جنرل کھڑے ہو کر سلیوٹ کر کے کہتے ہیں، قبول ہے، قبول ہے، قبول ہے۔۔ اور ہم افغانستان سے بیاہے جاتے ہیں۔

ہم نے اپنے گدھوں کی قدر اس لئے بھی نہیں کی کہ ہم اکثر نہایت لاڈ سے اپنے بیٹوں کو ”کھوتے دا پُتر“ کہتے ہیں یہ سوچے بغیر کہ اگر وہ پُتر ہیں تو آپ کے ہیں۔۔ چنانچہ میں نے کبھی بھی اپنے بیٹوں کے ساتھ اس نوعیت کا لاڈ نہیں کیا۔۔ البتہ پچھلے دنوں جب میرا پوتا یاشار منہ بسور رہا تھا اور دنیا کا سب سے پیارا بچہ لگ رہا تھا تو میں نے کہا ”اوئے کھوتے“ تو وہ ایک انگریزی میڈیم، پنجابی تو کیا اردو بھی نہ جانے کہنے لگا ”دادا یہ کھوتا کیا ہوتا ہے؟ تو میں نے کہا، بیٹے کھوتا کا مطلب ہے ڈنکی۔۔ تو وہ بے حد خوش ہوا۔۔ کہ دادا آئی لَو ڈنکیز۔۔ کیا بابا بھی ایک ڈنکی ہیں۔۔ تب میں نے اسے ڈانٹ دیا کہ خبردار جو میرے بیٹے کو ڈنکی کہا تو۔۔ کیونکہ ازاں بعد مجھے بھی ڈنکی ہو جانا تھا۔

لاہور کی سڑکوں پر اکثر ایک دلچسپ منظر نظر آتا ہے اور میری مراد جاوید نظر سے نہیں ہے۔۔ یعنی ایک گدھا گاڑی پر اتنا بوجھ لاد دیا جاتا ہے کہ یکدم اس کے آگے بندھا گدھا فضا میں معلق ہو جاتا ہے۔۔ اور ہوا میں ٹانگیں چلانے لگتا ہے۔ گاڑی بان اسے گردن سے پکڑ کر نیچے لاتا ہے اور جونہی چھوڑتا ہے وہ سامان کے بوجھ سے پھر سے فضا میں اٹھ جاتا ہے۔۔ بے شک گدھے کی اس معلق حالت میں ایک بے چارگی ہوتی ہے لیکن جس طور وہ ٹانگیں چلاتا ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ خلا میں رقص کر رہا ہے اور تب آپ پر کھلتا ہے کہ رقص کو اعضاء کی شاعری کیوں کہا جاتا ہے، تھوڑے لکھے کو بُہتا سمجھیں کہ گدھے کے اعضاء ہی تو اس کا سب سے قیمتی اور قابل رشک اثاثہ ہوتے ہیں۔۔ شاید اس لئے کہ بقول غالب، گدھے آم نہیں کھاتے۔ اگر اس بین الاقوامی سروے کے مطابق پاکستان میں آبادی کے لحاظ سے سب سے زیادہ گدھے پائے جاتے ہیں تو وہ کیا جانتے کہاں کہاں پائے جاتے ہیں۔

شیر بن شیر

مستنصر حسین تارڑ

02-06-2014

یہ ایک طے شدہ تاریخی حقیقت ہے کہ ازمنہ قدیم سے حضرت انسان کا سب سے فیورٹ جانور شیر چلا آتا ہے۔۔ شہر بابل کے دروازے ہوں یا ایران دارالسلطنت پرس پالسے کے درو دیوار سُمیرین، اسیرین تہذیبوں کے آثار ہوں سب پر شیر ہی شیر نقش ہیں۔۔ ایتھوپیا کا سرکاری نشان بھی شیر ہوا کرتا تھا اور منحنی سے شہنشاہ ہیل سلاسی کے محل کے باہر دو سچ مچ کے شیر بندھے ہوتے تھے۔۔ کہا جاتا ہے کہ جب ان میں سے کوئی شیر رات کے وقت دھاڑتا تھا تو شہنشاہ پریشان ہوجاتا تھا چنانچہ اس نے حکم دیا کہ سرشام شیروں کی بوتھیوں پر بانسی چھکو چڑھا دیئے جائیں تاکہ وہ دھاڑ نہ سکیں۔۔ شیر کا جاہ و جلال اور تمکنت رو بہ زوال ہوئی اور وہ ذلت کے عمیق گڑھوں میں یوں گرا کہ پاکستان پہنچ گیا اور یہاں برنتھو خیرا شیر پنجاب، شیر پاکستان، شیر بھائی پھیرو وغیرہ ہو گیا۔ ان دنوں بھی شنید ہے کہ رائے ونڈ پیلس کے باہر

شیروں کے مجسمے نصب ہیں۔ مگر صد شکر کہ وہاں سچ مچ کے دو شیر لکی ایرانی سرکس سے مستعار شدہ ہی سہی نہ باندھے گئے کہ اگر گئی رات وہ دھاڑنے لگتے تو پیلس کے مکینوں کا کیا ہوتا۔ شیروں کی اس تنزلی پر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ لاہور کے تاریخی شیر انوالا گیٹ کے باہر شیروں کے دو مجسمے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد سے چلے آتے تھے جنہیں کراؤن پرنس کی معاونت سے شاید اس لیے مسمار کر دیا گیا کہ ایک شہر میں دو شیر نہیں رہ سکتے۔ یا تو رنجیت سنگھ کے شیر رہیں گے اور یا پھر رائے ونڈ کے شیر۔۔ اگرچہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی۔۔ کہ اصل میں دونوں ایک ہیں۔
ہماری ٹریجڈی یہ ہے کہ ہم تخصیص نہیں کر سکتے۔ ہم ایک چھیتے، ایک دھاریدار بنگال ٹائیگر اور ایک باگڑ بلے کو بھی شیر کہتے ہیں جب کہ اوریجنل اور جینوئن شیر دراصل افریقی شیر ہوتا ہے جسے عرف عام میں ببر شیر کہا جاتا ہے۔
ببر شیر تمام جنگلی جانوروں کی نسبت بے ڈھب اور غیر متوازن بدن کا جانور ہوتا ہے۔ اس کے سر اور رخساروں پر بے تحاشا گھنے بال ہوتے ہیں اور بقیہ بدن گنجا اور فحش ہوتا ہے۔ اور اس کی شکل کے انسان ان دنوں پاکستان میں بہ کثرت پائے جاتے ہیں جن کے چہرے گھنے بالوں اور سر دراز زلفوں میں پوشیدہ ہوتے ہیں اور وہ ایسی حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں، سکول کی بچیوں کی ویگن کو جلا ڈالتے ہیں، درجنوں فوجیوں کے گلے کاٹ کاٹ کر انہیں ڈھیر کرتے ہیں کہ سچ مچ کے شیر بھی منہ چھپاتے پھرتے ہیں کہ بے شک ہم بھوک مٹانے کے لیے جانوروں کا شکار کرتے ہیں لیکن ہم ہرگز ایسے تو نہیں کہ اپنے بچوں کو آگ لگا دیں، اپنے بھائی بندوں کے گلے کاٹیں، اُن کے قتل کی ویڈیو جاری کر کے بھنگڑا ناچ پیش کریں۔ ہم شیر ہیں، صد شکر کہ انسان نہیں ہیں۔
تاریخ عالم کے ہر دور میں انسان نے شیر کا استحصال کیا۔ اسے اپنی حیوانی خصلت کے لیے استعمال کیا۔ ایک زمانے میں سلطنت روم کے اکھاڑوں میں دیوتاؤں کے پجاری رومنوں نے ایک نئے مذہب کے پیروکاروں کو۔۔ حضرت عیسیٰ ؑ کے ماننے والوں کو بھوکے شیروں کے آگے ڈال کر، اُن یقین کر لینے والے لوگوں کو شیروں کے جبڑوں میں منتقل ہوتے دیکھ کر دیوتاؤں کی سر بلندی کے نعرے لگائے۔ ویسے منظر اب بھی نہیں بدلا۔۔ پاکستانی عوام اب بھی سیاست اور مذہبی تعصب کے اکھاڑے میں دھکیلے گئے، غاروں میں رہنے والے بھوکے اور بے مراد شیروں کے آگے ڈال دیئے گئے ہیں اور لطف یہ ہے کہ ہم میں سے بہت سے قلمکار اور صحافی، یقیناًجنت کے حقدار لوگ ان شیروں کو بلاشیری دے رہے ہیں کہ انہیں چیر پھاڑ ڈالو۔۔کھا جاؤ۔۔ اور تالیاں بجاتے ہیں۔ قاتل وہ اجڈ غاروں سے برآمد ہونے والے شیر نہیں ہیں، یہ تالیاں بجانے والے مقدس دانشور اور صحافی ہیں۔ خنجر ان کے ہاتھ میں ہے لیکن ذبح کرتے ہوئے ”بسم اللہ“ یہ پڑھتے ہیں۔ معاف کیجیے یہ بات شیروں والی بہت دور تلک پہنچ گئی تو اسے واپس لاتے ہیں۔۔ جان کی امان چاہتے ہیں۔۔
شیر کے بارے میں یہ مشہور کر دیا گیا ہے کہ وہ اپنا شکار خود کرتا ہے اور دوسرے جانوروں کا مارا ہوا شکار بھی رغبت سے کھاتا ہے۔ یعنی شیر ایک مکمل طور پر پاکستانی جانور ہے۔ بے شک پاکستان کے طول و عرض میں برفانی چیتے اور باگڑ بلے تو ملتے ہیں لیکن ببر شیر مفقود ہے اور اس کے باوجود یہ ایک پاکستانی جانور ہے۔ جو چاہے آپ کاحسن شیر کرے۔
آخر میں میں بوڑھے شیر کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہوں گا۔ ظاہر ہے کہ اگر ایک شیر ہو گا تو وہ کبھی نہ کبھی تو عمر رسیدہ ہو کر ایک بوڑھا شیر ہو جائے گا۔۔ اور ایسا بابا شیر ایک قابل رحم شیر ہوتا ہے، قوت شیری سے محروم ہو کر وہ قطعی طور پر ناشیر ہو جاتا ہے اور شیرنیاں بوجوہ اسے گھاس نہیں ڈالتیں اور اس سے بڑھ کر کسی بھی شیر کی عزت نفس کی بے عزتی کیا خراب ہو گی کہ اسے گوشت کیا گھاس جو وہ نہیں کھاتا وہ بھی نہ ڈالی جائے۔۔ مجھ ایسے ناکارہ ہو چکے بوڑھے خاوند اس صورت حال کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔۔ چنانچہ بوڑھا شیر اپنے ذہن میں گئے زمانوں کی بلیو فلمیں چلاتا کسی غار کے باہر اونگھتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی کوئی نوخیز اور چلبلی شیرنی بابا شیر کو تنگ کرنے کے لیے اس کی دم سے کھیلنے لگتی ہے لیکن شیر آخر شیر ہوتا ہے، اس چھیڑ چھاڑ سے اس کی حسیات بیدار ہو جاتی ہیں اور وہ معصوم شیرنی پر جھپٹ پڑتا ہے، جھپٹ کر وہ پلٹتا ہے معصوم شیرنی ذہنی طور پر اپنی دوشیزگی سے ہاتھ دھو بیٹھنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے تو بوڑھا شیر پنجے جوڑ کر کہتا ہے کسی نوخیز شیر سے رجوع کرو اور پلیز کسی اور کو نہ بتانا کہ میں بس اتنے جوگا ہی رہ گیا ہوں“ ثابت یہ ہوا کہ اگر آپ ایک بالی عمر یا کی شیرنی ہیں تو کسی بوڑھے شیر کی دم سے مت کھیلئے۔ بعد ازاں آپ کو بے حد مایوسی ہو گی۔۔ اگر یقین نہ آئے تو مشہور زمانہ فلم ”بڈھا شیر“ ملاحظہ کیجیے۔۔ اور آخر میں ایک خاصا فرسودہ ہو چکا لطیفہ سنانے کی جسارت کرتا ہوں کہ بہت سے لوگ ایسے ہی لطیفے سنا سنا کر بامِ وزارت و سفارت تک پہنچے۔۔ اور پہنچے ہوئے لوگ کہلائے۔۔ یاجوج نے ماجوج سے پوچھا کہ فرض کرو ایک بھوکا شیر تمہارے پیچھے لگ جائے تو تم کیا کرو گے۔۔ ماجوج نے کہا کہ میں اپنی شلوار اُڑسا کر اس کی لنگوٹی بنا کر سر پٹ بھاگنے لگوں گا۔
“اور اگر شیر بھی سرپٹ بھاگنے لگے تو پھر کیا کرو گے ماجوج”

"میں دریا میں چھلانگ لگا کر تیرتا ہوا دوسرے کنارے کے پار چلا جاؤں گا"
"اور اگر شیر بھی دریا پار کر جائے تو"
"میں ایک بلند درخت پر چڑھ جاؤں گا"
"فرض کرو شیر بھی درخت پر چڑھ جائے تو پھر کیا کرو گے"
"ماجوج نے یاجوج سے شکایت آمیز لہجے میں کہا "تم پہلے یہ بتاؤ کہ تم شیر کے ساتھ ہو یا میرے ساتھ ہو
قارئین مجھ سے پوچھتے تو میں شیر کے ساتھ ہوں بے شک وہ لاہور کے قریب کے شیر ہی کیوں نہ ہوں کہ ان دنوں اس جنگل پر انہی کا راج ہے۔

پروین شاکر کی مردہ اُنگلیاں
مستنصر حسین تارڑ
08-06-014
شہر اسلام آباد کی سویر، وقت تقریباً ساڑھے نو بجے، میں حسب معمول ہر صبح کی مانند ٹیلی ویژن سٹیشن پر صبح کی نشریات کی میزبانی سے فارغ ہو کر ٹیلی ویژن کی ویگن میں سوار اپنی رہائش کی جانب لوٹ رہا تھا۔۔ بلیو ایریا ابھی ویران پڑا تھا اور شاہراہ پر ٹریفک بہت کم تھی، بلیو ایریا کے خاتمے پر اس چوراہے کے نزدیک جہاں سے بائیں جانب زیرو پوائنٹ تھا اور دائیں جانب فیصل مسجد کے مینار نظر آتے تھے وہاں کچھ لوگ جمع تھے، حادثے سے تباہ ہو چکی ایک کار نظر آ رہی تھی۔۔ میرے ڈرائیور نے ویگن روکی اور کہنے لگا "تارڑ صاحب میں دیکھ کر آتا ہوں کہ کیا ہوا ہے۔۔" تھوڑی دیر بعد واپس آ گیا اور کہنے لگا "بہت بڑا حادثہ ہوا ہے حالانکہ ٹریفک بھی زیادہ نہ تھی، لگتا ہے ڈرائیور کی غلطی تھی، کوئی خاتون بھی تھیں، اللہ رحم کرے"۔۔ ظاہر ہے میرا دل اُس اجنبی خاتون کے لیے دُکھی ہوا جو صبح سویرے حادثے کا شکار ہو گئی تھی،کیا جانے کس حال میں ہو، زندہ بچتی ہے یا نہیں، اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے کچھ دیر آرام کیا، پھر دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر پڑھنے لکھنے میں مشغول ہو گیا۔۔ پچھلے پہر شاید یہ اظہار الحق تھا یا مرحوم احمد داؤد، اُن کا فون آیا "تارڑ ایک بہت افسوسناک خبر ہے۔۔ پروین شاکر مر گئی ہے"۔
"کیسے؟" یقین نہ آیا کہ کیا کہا جا رہا ہے"
آج صبح وہ اپنے ڈرائیور کے ساتھ جا رہی تھی اور بلیو ایریا کے قریب اُس کی کار حادثے کا شکار ہو گئی۔۔ "
"اتنے بجے جنازہ قبرستان پہنچے گا
اس دوران کشور ناہید کا بھی فون آ گیا "میں اس وقت پروین کے گھر سے بول رہی ہوں مستنصر"۔۔وہ روئے چلی جا رہی تھی "بہت برا حال ہوا ہے پروین کے چہرے کا۔۔ اُسے ٹھیک کیا جا رہا ہے۔۔ وہ بدنصیب ہی رہی۔۔ اتنے برے اور بیکار لوگ زندہ رہتے ہیں اور پروین ایسے خوشیاں بانٹنے والے لوگ چلے جاتے ہیں۔۔ میں تو قبرستان نہیں آسکتی، یہیں سے رخصت کر دوں گی"۔۔
پروین شاکر سے میری دوستی یا قربت نہ تھی۔۔ کبھی کسی ادبی محفل یا دعوت میں آمنا سامنا ہو جاتا تو وہ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام میں پہل کرتی، کیا لکھ رہے ہیں، کیا پڑھ رہے ہیں اور خدا حاف*۔۔ کبھی کبھار ادب کے حوالے سے کوئی ایک آدھ خط۔۔ "خوشبو" سے اُس کی شہرت کا آغاز ہوا جسے "التحریر" کے خالد سیف اللہ نے احمد ندیم قاسمی کے کہنے پر شائع کیا اور یہ ایک عجیب اتفاق تھا کہ اس اشاعتی ادارے نے اپنے آغاز میں جتنی بھی کتابیں نئی یا پرانی شائع کیں وہ سب بے حد مقبول ہوئیں،میرزا ادیب کے "صحرا نورد کے خطوط"، ممتاز مفتی کی "لبیک"، میرے دو سفر نامے "نکلے تری تلاش میں" اور "اُندلس میں اجنبی" اور پروین شاکر کی "خوشبو"۔۔
اسلام آباد کے قبرستان میں پروین کو رخصت کرنے والے بہت کم لوگ تھے، اُس کی عزیز داری کراچی میں تھی اور وہاں سے یہاں آج ہی کے دن پہنچنا مشکل تھا، کچھ ادیب تھے اور اُس کے محکمے کے کچھ لوگ۔۔ آخری لمحوں میں اُس کے ایک بھائی بھی پہنچ گئے۔۔ لیکن اس سے پیشتر یہی مسئلہ در پیش تھا کہ اُسے لحد میں کون اتارے گا کیونکہ کوئی نامحرم ایسا نہیں کر سکتا۔۔ ہم چار پانچ لوگ قبر کی مٹی کے ڈھیر پر کھڑے تھے اور میرے برابر میں افتخار عارف اپنے آپ کو بمشکل سنبھالتے تھے۔ جنازہ تو ہو چکا تھا جو اہل تشیع کے عقیدے کی نمائندگی کرتا تھا۔۔ ہم نے کچھ دیر انتظار کیا اس اُلجھن کا شکار رہے کہ اگر اُن کا کوئی نزدیکی عزیز بروقت نہ پہنچا تو پروین کو لحد میں کیسے اتارا جائے گا۔۔ مجھے مکمل تفصیل تو یاد نہیں رہی کہ اس کے بھائی کب پہنچے لیکن یہ یاد ہے کہ کسی نے سفید کفن میں لپٹی پروین شاکر کو افتخار عارف کے بڑھے ہوئے ہاتھوں میں دے دیا۔۔ افتخار اُسے تھامے ہوئے قبر میں اترنے کو تھے کہ یکدم اُن کا رنگ زرد پڑ گیا، ہاتھ لرزنے لگے۔۔ شاید انہیں انجائنا کا درد شروع ہو گیا تھا، انہوں نے یکدم مجھ سے کہا "تارڑ ، پروین کو سنبھال لو۔۔" میں نے بازو واکیے اور پروین کے جسد خاکی کو تھام لیا۔۔ اور تب میں زندگی کے ایک ناقابل بیان تجربے سے دو چار ہوا جس کے بارے میں اب بھی سوچتا ہوں تو سناٹے میں آجاتا ہوں۔۔

پروین دھان پان سی لڑکی تھی، موت کے باوجود وہ بہت بھاری نہ تھی، میں جان بوجھ کر اُس جانب نہ دیکھتا تھا جدھر اُس کا چہرہ کفن میں بندھا تھا اور پھر میں نے محسوس کیا کہ میرے دائیں ہاتھ کی اُنگلیاں کفن میں روپوش پروین کی مردہ اُنگلیوں پر ہیں، اُنہیں چھو رہی ہیں، انہیں تھام رکھا ہے۔۔۔ میں اُن کی بناوٹ محسوس کر رہا تھا اور اُس لمحے مجھے خیال آیا کہ یہ پروین کا لکھنے والا ہاتھ ہے۔۔۔ انہی اُنگلیوں سے اُس نے وہ سب شعر لکھے جو ایک ز مانے کے دل پسند ہوئے، ایک داستان ہوئے۔ اور پھر مجھے وہ شعر یاد آیا جو ایک خاتون نے لکھ کر مجھے رسوا اور شرمندہ کر دیا تھا، وہ شعر بھی تو انہی انگلیوں نے لکھا تھا۔ اور آج میں انہیں بے جان حالت میں اپنی انگلیوں سے تھامے ہوئے ہوں۔۔۔ یہ لمحہ، یہ کیفیت آج تک میرے بدن پر ثبت ہے، میں آج بھی پروین کی اُنگلیوں کی موت کو محسوس کرتا ہوں۔۔۔ اس دوران پروین کے بھائی کراچی سے آ چکے تھے، مجھ سے لحد میں اترا نہ جاتا تھا، کسی اور شخص نے میری مدد کی اور ہم نے اس کے مردہ بدن کو قبر میں کھڑے اُس کے بھائی یا عزیز کے سپرد کر دیا۔۔۔

یہ عجیب بات ہے کہ زندگی میں ہم ایک دوسرے کو زیادہ نہ جانتے تھے، یہ موت تھی جو مجھے اُس کے قریب لے آئی۔۔۔ میں آج بھی کہیں پروین شاکر کا نام دیکھتا ہوں تو اس کی موت کے عذاب مجھ پر نازل ہونے لگتے ہیں۔۔۔ پروین کی جواں سال موت نے پوری ادبی دنیا کو رنجیدہ کر دیا۔۔۔ لوگ اُس کے شعر پڑھتے، اُس کے لیے روتے رہے اور اُن میں پروین قادر آغا بھی تھیں اُن کی سب سے عزیز دوست، ایک ”گُوڑی سہیلی“ جنہوں نے پروین کے ایک اور دوست مظہر الاسلام کے تعاون سے ”پروین شاکر ٹرسٹ“ قائم کیا جس کے زیر انتظام ہر برس پروین اور اُس کی شاعری کے چرچے ہوتے، شاعری کی نئی کتابوں پر ایوارڈ دیئے جاتے، گلوکار اور شاعر اُسے نذرانۂ عقیدت پیش کرتے۔۔۔ میں ان میں سے کسی محفل میں شریک نہ ہو سکا کہ میں شاعر نہ تھا اور پھر پروین قادر آغا اور مظہر الاسلام نے فیصلہ کیا کہ اس برس ”پروین شاکر اردو لٹریچر فیسٹیول“ کا انعقاد کیا جائے۔ مجھے اور مسعود اشعر کو فکشن کی نمائندگی کرنے کے لیے بلاوا آ گیا۔۔۔ (میں کیسے نہ جاتا۔۔۔ پروین کی مردہ انگلیاں مجھے بلاتی تھیں۔ (جاری ہے

مظہر الاسلام کا میلہ اور۔۔۔ زندگی سے ڈرتے ہو؟

مستنصر حسین تارڑ

11-06-014

دنیا کے کسی بھی ایئرپورٹ پر جب کسی پرواز میں غیرمعمولی تاخیر ہوتی چلی جاتی ہے تواس کے مسافروں کے درمیان بیزاری اور بوریت کا ایک رشتہ جنم لیتا ہے اور وہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک خاندان ہو جاتے ہیں جن کا دُکھ سانجھا ہوتا ہے۔۔۔ پروین شاکر لٹریری فیسٹیول میں شمولیت کے لئے میں پورے ساڑھے پانچ بجے شام لاہور ایئرپورٹ کے لاؤنج میں تھا، اگرچہ اسلام آباد کی پرواز نے سات بجے اڑان کرنی تھی لیکن میری خصلت میں سے دیہاتی پن رخصت نہ ہوتا تھا۔ جیسے کم سفر کرنے والے دیہاتی اگر گاڑی صبح سات بجے روانہ ہونی ہے تو وہ پچھلی شام کو ہی ریلوے سٹیشن پر جا بیٹھتے ہیں کہ کہیں گاڑی چھوٹ نہ جائے۔ مجھے بھی دھڑکا سا لگا رہتا ہے کہ کہیں فلائٹ مِس نہ ہو جائے اور میں کم از کم دو گھنٹے پہلے ایئرپورٹ پر جا بیٹھتا ہوں۔۔۔ اسلام آباد جانے والوں میں اپنے ہی لوگ تھے۔۔۔ مسعود اشعر، امجد اسلام امجد، اصغر ندیم سید، ٹیپو اور پھر عاصمہ جہانگیر بھی چلی آئیں جو کسی مقدمے کے سلسلے میں اسلام آباد جا رہی تھیں۔ معلوم ہوا کہ اسلام آباد اس وقت شدید آندھی کی لپیٹ میں ہے اور وہاں سے پنکھوں والا وہ جہاز اُڑ نہیں سکتا تھا جس نے لاہور آنا تھا اور پھر ہمیں لے کر واپس جانا تھا۔۔۔ چنانچہ۔۔۔ کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر۔۔۔ صد شکر کہ ایئرپورٹ پر مظہرالاسلام کے زمانوں کا نیشنل بک فاؤنڈیشن کا ایک ریڈنگ روم اور بک شاپ تھی اور گئے زمانوں میں ہمیں بک ایمبسڈر کے طو رپر نامزد کیا گیا تھا اس لئے ہم سب اس کے آرام دہ صوفوں پر جا بیٹھے۔۔۔ ہم یقیناًمظہر کے شکرگزار ہوئے کہ یہ اسی کے دماغ کا بچّہ تھا کہ پاکستان کے تمام ایئرپورٹس پر بک شاپس قائم کی جائیں تاکہ عوام میں کتب بینی کا رجحان جڑیں پکڑے۔۔۔ تاخیر ہوتی چلی گئی اور ہم ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ دیکھ کر بیزار ہو گئے۔۔۔ امجد کے پرانے لطیفے بھی کام نہ آئے، عاصمہ جہانگیر انکشافات کرتی چلی گئیں، اصغر مونچھوں پر ہاتھ پھیرتا تھک گیا، مسعود اشعر بھی چپ ہو گئے، قصہ مختصر ہم رات ایک بجے اڑے۔۔۔ اسلام آباد ہوٹل کے بستروں میں دراز ہوئے تو تین بج رہے تھے۔

پہلا دن شاعری کے لئے وقف تھا۔۔۔ غالب، اقبال، ن م راشد، فیض، منیر نیازی، مجید امجد اور ظاہر ہے پروین شاکر کے لئے وقف تھا۔۔۔ تمام سیشن مختصر دورانیے کے تھے۔ علاوہ ازیں اردو کے اہم ترین شعرا کے بھی مختصر مشاعرے تھے، نذیر قیصر، توصیف تبسم، جلیل عالی، وحید احمد، آفتاب اقبال شمیم، انوار فطرت، حمیدہ شاہین، روشن ندیم، یوسف حسن کا کلام لطف دے گیا۔۔۔ اس فیسٹیول کی سب سے اہم اور قابل ستائش بات یہ تھی کہ پاکستان کے دیگر شہروں سے بھی ایسے بے شمار شاعروں کو مدعو کیا گیا تھا

جن کی شاعری کا معیار کسی طور ”مشہور“ شاعروں سے کم نہ تھا بلکہ ان میں سے کچھ تو فوقیت رکھتے تھے۔۔۔ ان دنوں جو ادبی میلے ٹھیلے ہو رہے ہیں ان میں یا تو انگریزی میں لکھنے والوں کو اہمیت دی جاتی ہے اور یا پھر صرف بڑے اور بزرگ ادیبوں کو مدعو کیا جاتا ہے۔۔۔ چھوٹے شہروں اور مضافات کے قلم کاروں کو یکسر فراموش کر دیا جاتا ہے۔۔۔ آپ صرف فیصل آباد، ملتان یا بورے والا کا ادبی منظر دیکھئے جو اپنی تخلیقی قوت سے لاہور اور کراچی وغیرہ سے کہیں بلند مقام پر ہے۔۔۔ وحید احمد نہ صرف میرے دوست ہیں بلکہ پسندیدہ نظم نگار بھی ہیں، ان کے سوا مجھے حمیدہ شاہین نے بے حد متاثر کیا، بلاشبہ وہ ایک بڑی شاعرہ ہیں، درویش سی ہیں اس لئے ناموری گریز کرتی ہیں، ان کے ساتھ اپنی طاہرہ اقبال بھی جڑواں چلی آتی تھیں، اور وہ بھی میری پسندیدہ نثرنگار ہیں، حمیدہ شاہین اور طاہرہ شاعری اور نثر کا کیسا حسین امتزاج تھا۔۔۔ شاعری کی ان محفلوں میں حاضرین کو بھی اپنی شاعری سنانے کی دعوت دی گئی جو ایک عمدہ روایت ہے، اسے جاری رہنا چاہئے۔۔۔ انور جہانگیر جیسے ہمدم دیرینہ سے ملنا ہوتا ہے تو اس کا اخلاص، محبت اور روشن چہرہ مجھے زندگی کے کئی دکھ بھلا دیتا ہے اور اس کی اہلیہ بھی خوش لباس اور خوش اطوار خاتون انور کی سجاوٹ میں اضافہ کرتی ہے۔۔۔ اس فیسٹیول میں میری ہمہ وقت رفاقت قوی خان تھا۔۔۔ جو لوگ قوی سے نہیں ملے وہ دراصل زندگی سے نہیں ملے۔۔۔ وہ صرف ایک بڑا اداکار ہی نہیں بلکہ ایک بہت بڑا انسان بھی ہے۔۔۔ میں نہ صرف اس کا مداح ہوں بلکہ اس کی شخصیت سے بھی متاثر ہوں۔۔۔ ایک شب ایسی تھی جب ڈاکٹر وحید احمد اور میں تھے اور ہمارے سامنے قوی خان تھے جس نے اپنی اداکاری، لطیفہ گوئی، غالب اور فیض کی شاعری سے ہمیں باندھ کے رکھا دیا۔۔۔ میں نے مدتوں اس شب کو یاد رکھنا ہے جیسے وہ شبیں بھی میری یادوں کے خزانے میں روشن ہوتی ہیں جو میں نے اِک تنہائی میں فیض صاحب کے ساتھ بسر کیں اور وہ شب بھر اپنا کلام سناتے رہے۔ طلعت حسین کے ساتھ ایک مدت بعد ملاقات ہوئی، وہ پچھلے دنوں قدرے علیل تھے، صد شکر کہ اب سنبھل چکے ہیں، ان کی اہلیہ بھی ہمراہ تھیں، ایک روز کہنے لگیں، تارڑ بھائی طلعت بے حد بے ترتیب ہیں، میں کمرے کو سمیٹتی رہتی ہوں اور اس کے ساتھ طلعت کو بھی۔۔۔ تو میں نے کہا کہ بھابھی کیا یہ سمٹ گئے تو کہنے لگیں کہ نہیں۔۔۔ اس پر میرا ردعمل یہ تھا کہ اگر وہ سمٹ جاتے تو طلعت حسین نہ ہوتے، اتنے بڑے فنکار سمیٹے نہیں جا سکتے۔ اس شب طلعت حسین نے ایک ستار کے سُروں کے پس منظر میں ن۔م۔راشد کی شاعری کو اپنی بے بدل آواز میں ڈھالا کہ پورے ہال کو مسحور کر دیا۔۔۔ اگرچہ پرفارمنس دیکھنے اور سننے کے لئے میں اور قوی ایک کونے میں پوشیدہ تھے لیکن طلعت کی عقابی نگاہوں نے ہمیں تلاش کر لیا اور کہنے لگے۔۔۔ یہاں قوی خان اور تارڑ صاحب جیسے فن اور ادب کے اساتذہ تشریف رکھتے ہیں تو ان کے سامنے پرفارم کرتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی ہے۔۔۔ اجازت ہے۔۔۔ اور میں اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ طلعت کا اشارہ صرف قوی کی جانب ہے، چونکہ میں اس کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا اس لئے اس نے اخلاقاً مجھے بھی شمار کر لیا۔۔۔ ورنہ جہاں تک آواز کا تعلق ہے اس کی سلطنت کا بادشاہ تو طلعت حسین ہے، اگر کوئی اور ہے تو مجھے بھی خبر کر دیجئے۔۔۔ یہ عجیب سی بات ہے کہ میں ایک عرصہ ن م راشد سے کنی کتراتا رہا۔۔۔ گوجرانوالہ کے نذر محمد کی فارسی آمیز شاعری میرے سر پر سے گزر جاتی تھی، میں نے اپنے آپ کو غالب، امیر مینائی، میر، اقبال، فیض، مجید امجد، شاہ حسین اور بلّھے شاہ تک ہی محدود رکھا اور پھر پچھلے پانچ دس برسوں میں یہ راشدتھا جس کی شاعری نے مجھے مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیا۔۔۔ میں پرانے کاشغر کے ایک کوزہ گر کے گھر میں تھا تو راشدکے حسن کوزہ گر کے مصرعے میرے ذہن میں ابھرتے تھے۔۔۔ یہاں تک کہ میں نے اپنے آخری ناول ”اے غزال شب“ کا نام بھی راشد کی ایک نظم سے مستعار لیا کہ اے غزالِ شب تیری پیاس کیسے بجھاؤں میں۔ اور اس شب یہ طلعت حسین تھا جو راشد کے ہر مصرعے کو میرے دل میں اتار رہا تھا، نئے معانی سے آشنا کر رہا تھا۔

زندگی سے ڈرتے ہو؟
زندگی سے ڈرتے ہو؟
زندگی تو تم بھی ہو، زندگی تو ہم بھی ہیں۔۔۔
آدمی سے ڈرتے ہو؟
آدمی تو تم بھی ہو، آدمی تو ہم بھی ہے!
آدمی زبان بھی ہے، آدمی بیاں بھی ہے!
اس سے تم نہیں ڈرتے۔۔۔
(جاری)

سائیں بودی کی بیر اور میرا گمشدہ اسلام آباد
مستنصر حسین تارڑ

15-06-2014

پروین شاکر اردو فیسٹیول کی شام میں طلعت حسین اپنی بے مثل پرتاثیر آواز میں ن م راشد کی شاعری کی تشکیل کر کے جب سٹیج پر سے اترے تو حاضرین پر جیسے جادو ہو چکا تھا۔۔ فوری طور پر اعلان ہوا کہ اب وارث شاہ کی جائے پیدائش جنڈیالا شیر خان کے چار گلو کار اُس کی لازوال تصنیف ”ہیررانجھا“ سے اقتباس سنائیں گے۔ بیشتر لوگوں نے قدرے حیرت کا اظہار کیا کہ کیا راشد کے فوراً بعد وارث شاہ کا بلند آہنگ کلام مناسب رہے گا۔۔ فارسی آمیز اردو کے بعد ٹھیٹھ کلاسیکی پنجابی کے بول اپنا مقام بنا سکیں گے۔ سادہ سے چار گلوکار جنہیں کچھ زعم نہ تھا سٹیج پر آبیٹھے۔۔ تیمور افغانی، محمد عرفان انصاری، سائیں بودی اور ایک نوجوان لڑکی حجاب میں۔۔ ان سب نے باری باری اپنے انداز میں ہیر پڑھنی تھی۔ بانسری کی مدھر لَے ہال میں گونجی اور تیمور افغانی نے نہایت انہماک سے ہیر کا الاپ شروع کر دیا۔ اُس کی آواز کا بلند اور سریلا آہنگ حیرت انگیز تھا۔۔ میں اُس کے نام سے بھی واقف نہ تھا اور وہ کئی بڑے گلو کاروں کی نسبت سرتال اور ادائیگی میں بہتر تھا۔ ہیر کی لے میں ایک خاص سحر ہے، عین ممکن ہے کہ وہ صرف پنجاب کے باسیوں پر ہی یوں اثر انداز ہوتا ہو کہ آپ کے بدن میں ایک عجیب سنسنی جنم لینے لگتی ہے۔ لمحوں میں راشد پس منظر میں جا چکا تھا اور وارث شاہ کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ تیمور کے بعد نوجوان محمد عرفان انصاری کی باری آئی اور وہ بھی کمال کا گانے والا تھا، تیمور اپنے آپ میں ڈوب کر گاتا تھا جب کہ عرفان چہرے اور ہاتھوں کے اظہار سے ہیر کی ترجمانی کرتا تھا۔ کبھی مسکرانے لگتا تھا اور کبھی رنجیدہ ہو جاتا تھا۔ ازاں بعد جانے اس کا اصل نام کیا تھا لیکن اس کے سر سے بالوں کی لٹ یعنی ”بودی“ لٹکتی تھی اور اس لیے سائیں بودی کہلاتا تھا۔ پہلے تو وہ تیمور اور عرفان کے بعد جم نہ سکا لیکن کچھ تانیں لگا کر ایک جھرجھری سی لی اور ایک مجذوب کی مانند سر جھٹکتا ہیر الاپنے لگا۔ اس کا اپنا ہی درویشانہ انداز تھا، سنا ہے کہ یوٹیوب پر سائیں بودی کے بہت سے انداز محفوظ ہیں۔ اب یہ جو لڑکی تھی شبانہ عباس نام کی تو میرا خیال تھا کہ وہ یونہی سر جھکا کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھنے کے لیے آئی ہے لیکن جب اس نے نہایت سنجیدگی سے، ایک گہرے استغراق کے عالم میں ”ڈولی چڑھدیاں ماریاں ہیر چیکاں“ گانا شروع کیا تو اپنی شاندار اور پر درد آواز سے محفل کو لوٹ لیا۔ یوں بھی جب ہیر اپنے باپ سے فریاد کرتی ہے کہ میں نئیں جانا کھیڑیاں دے نال۔۔ تو یہ فریاد ایک لڑکی کی زبان سے ہی پرتاثیر ہوتی ہے۔ یہ یقیناًایک یادگار محفل تھی۔ مظہر الاسلام کے بہت سے روپ ہیں، کہانی کار، داستان گو ، ڈیزائنر، ایڈمنسٹریٹر اور ایک لوک ورثے کا ماہر محقق۔۔ یہ گلو کار اُس نے دریافت کیے تھے۔ میں نے مظہر سے کہا کہ اگر یہ ممکن ہو سکے کہ یہ چاروں گلو کار ہندوستان میں جا کر پرفارم کر سکیں تو یہ وہاں دھوم مچا دیں ڈُھوم۔۔ یہاں یہ ڈُھول میں ہیں۔ اس شب کے آخر میں ان دنوں نہایت دل پسند خوش شکل گلوکارہ سارہ رضا نے کلاسیک شعرا کی غزلیں گائیں، اُن کی گائیکی کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ گانے کے دوران بلاوجہ ہنستی رہتی ہیں۔ دیگر گانے والے کی مانند منہ نہیں بسورتی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ محفل کی گائک ہے۔ پرفارمنس کے دوران وہ سامعین سے باتیں کرتی ہے اور ہنستی ہے بلکہ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ اس کی ہنسی گائکی سے بہتر ہے۔ مسعود اشعر بھی کن رس رکھتے ہیں، اُن کا خیال ہے کہ جب وہ بڑے گلو کاروں کی گائی ہوئی غزلیں گاتی ہے تو اُنہیں جوں کا توں گانا بہتر ہوتا ہے۔ سارہ ذرا ادھر اُدھر نکل کر اپنے کمال دکھانے کی کوشش کرتی ہے اور ابھی اُس کے پاس وہ کسب کمال مفقود ہے جو اُسے ”عزیز جہاں شوی“ کی سٹیج پر لے جائے۔ ٹرسٹ ہر برس پروین شاکر کے بارے میں لکھی گئی کتابوں کے لیے ایک انعامی تقریب بھی منعقد کرتا ہے۔ اس برس ڈاکٹر فرحت جبیں ورک کی کتاب ”نسبت مجھے اُس خاک سے ہے جس میں پروین کے سیاسی اور عصری شعور کے حوالے سے ایک پر مغز بحث ہے اور محترمہ رفاقت جاوید کی ”پروین شاکر، جیسا میں نے دیکھا“ کو خصوصی انعامات کا حق دار ٹھہرایا گیا۔ ایک اور انعامی تقریب نسبتاً نئی شاعرات کے حوالے سے ترتیب دی گئی۔ عکس خوشبو ایوارڈ عنبریں حسیب انور کی ”دل کے افق پر“ اور سیما غزل کی ”میں سائے خود بناتی ہوں“ کے حصے میں آیا۔ عنبریں میرے عزیز دوست باکمال شاعر اور نقاد سحر انصاری کی باکمال بیٹی ہیں اور انہوں نے ایک نہایت جاندار ادبی مجلہ ”اسالیب“ بھی ترتیب دیا ہے۔ سیما غزل ڈرامے کے حوالے سے ایک پہچان والا نام ہے اور مجھے اس کی شاعری سن کر اور پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی کہ وہ ایک غیر معمولی شاعرہ ہیں۔ ڈرامہ نگاری اُن کی تخلیقی شخصیت کا مکمل تعارف نہیں ہے۔ یوں جان لیجیے کہ اگر امجد عورت ہوتا تو سیما غزل ہوتا۔ ان کے سوا حلیمہ بشریٰ کی ”خوابوں میں لکھی گئی تحریریں“ کو سپیشل ایوارڈ دیا گیا اور ہنگو کی پہلی جماعت سے لے کر ایم اے تک ہمیشہ اول رہنے والی حنا حبیب کو ایک گولڈ میڈل سے نوازا گیا۔ پہلے دن شاعری کے چرچے رہے اور دوسرا روز ”اردو ناول، کہانی، اردو فکشن فیسٹیول“ کے حوالے سے پہچانا گیا جس میں درجنوں ایسی محافل کا اہتمام کیا گیا جن میں اردو نال اور کہانی کو زیر بحث لایا گیا۔ ”اردو ادب زوال پذیر ہے یا وقت پیچھے رہ گیا ہے یا کسی سوچے سمجھے منصوبے کا شکار ہے“ میزبان تھے مرزا حامد بیگ اور کلیدی خطبہ مختار آزاد کا تھا۔ اور اُن کے

خطبے کی کلید کہیں گم ہو گئی، چنانچہ وہ بھٹکتے پھرے۔۔ اردو کہانی کی صورت حال کے بارے میں طاہرہ اقبال نے کلیدی مقالہ پڑھا اور طاہرہ وہ خاتون ہیں جنہوں نے تخلیق کی کلید یا کنجی دریافت کر لی ہے اور وہ اس کی مدد سے ادب کا ہر مقفل دروازہ کھولتی چلی جاتی ہیں۔ ایک سیشن کہانی کہنے والوں کے لیے مخصوص تھا۔ مجھے ایک عجیب اداس بھری مسرت ہوئی جب میں نے منشا یاد کے بیٹے کو وہاں موجود پایا جو اپنے باپ کی کہانی پڑھنے کے لیے آیا تھا۔ آغاز پروین عاطف کی کہانی سے ہوا اور وہ پڑھتے ہی چلی گئیں، ایک بار جب اُن سے درخواست کی گئی کہ ابھی درجن بھر مزید افسانہ گر بھی منتظر ہیں تو پروین نے کہا ”خبردار اگر کسی نے مجھے روکا تو۔۔“ اور پھر سے رواں ہو گئیں۔
کم از کم یہ ادبی فیسٹیول ادبی تھا۔ یہاں جتنے لوگ تھے وہ سب کے سب صرف ادب کے ناتے سے پہچانے جا رہے تھے اور کسی سے یہ دریافت کرنے کی حاجت نہ تھی کہ قبلہ آپ کون ہیں ؟ اسلام آباد میرے لیے ایک زمانے میں احمد داؤد، اعجاز راہی، احمد فراز، سرفراز اقبال، منشا یاد، ممتاز مفتی، ضیاء جالندھری ہوا کرتا تھا۔ اُن کے بغیر میں یہاں بے آسرا محسوس کرتا تھا۔ رشید امجد سے بھی ملاقات نہ ہوتی تھی اور یہ صرف مظہر الاسلام اور انور جہانگیر تھے جو اب میرے لیے اسلام آباد تھے۔ (جاری ہے

جب حسن تھا تو آئینے نہیں تھے۔۔ سعادت حسن منٹو
مستنصر حسین تارڑ
18-06-014
پروین شاکر ادبی میلے کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ یہاں خوش آثار خواتین کثرت میں تھیں، جانے اس کا خصوصی اہتمام کیا گیا تھا یا قدرتی طور پر یہ انتظام ہو گیا تھا۔۔ اسی لیے شاعر حضرات اور خاص طور پر نوجوان شاعر بھٹکتے پھرتے تھے، ہر گام یہ ٹھوکر کھاتے تھے، فیصل آباد کے ایک شاعر مجھے نہایت احترام سے ملے اور ہاتھ ملاتے ہوئے ذرا سے جھک گئے، جھک گئے تو تادیر جھکے رہے کہ اُس لحظہ شاعر کو ترنم سے پڑھنے والی ایک عفیفہ میر سے عقب سے گزر رہی تھیں۔
جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں میلے کا دوسرا دن نثر کے لیے وقف تھا۔۔ مسعود اشعر کی صدارت میں عاصم بٹ کے نئے ناول ”ناتمام“ کا افتتاح ہوا۔۔ مسعود کو ناول قدرے تاخیر سے ملا تھا چنانچہ انہوں نے میرے برابر میں بیٹھے بیٹھے ناول پڑھ ڈالا۔ اب ایسا صدر کسے نصیب ہو گا جس نے کرسئ صدارت پر بیٹھنے سے ایک منٹ پہلے وہ ناول ختم کیا ہو۔۔ عرفان عرضی نے ”ناتمام“ کے حوالے سے ایک نہایت فکر انگیز مقالہ پڑھا۔۔ عاصم بٹ بلاشبہ ہمارے بعد آنے والے نثر نگاروں میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں اگرچہ بٹ ہیں۔۔ ڈاکٹر وحید احمد کے ناول ”زینو“ پر بات کرنے والوں میں مرزا حامد بیگ، محمد الیاس، طاہرہ اقبال اور پر جوش اختر رضا سلیمی شامل تھے۔۔ وحید کا ناول ”مندری والا“ بھی اردو کے اہم ناولوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔
مصنف سے ملے“ میں میرا ناول ” خس و خاشاک زمانے“ زیر بحث آیا۔ میرے ہم عصر لکھنے والوں نے ناول ” کو سراہتے ہوئے مجھ پر بہت عنایت کی۔ ان میں ڈاکٹر صفیہ عباد، ڈاکٹر نجیبہ عارف، ڈاکٹر روش ندیم ، ڈاکٹر وحید احمد اور طاہرہ اقبال شامل تھے۔۔ ڈاکٹر سفیر اعوان خصوصی طور پر ناول پر بات کرنے کے لیے تشریف لائے تھے لیکن تقریب تاخیر سے شروع ہوئی اور اُنہیں اسلام آباد سے باہر کا سفر در پیش تھا اس لیے وہ شامل نہ ہو سکے۔۔ ڈاکٹر اعوان کچھ مدت پیشتر مجھے ملنے کے لیے لاہور آئے، اُن کا کہنا تھا کہ انگریزی ادب میں ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد اور یونیورسٹی میں بھی وہ یہی موضوع پڑھاتے ہیں اُن کو اُردو ناول وغیرہ سے زیادہ لگاؤنہ تھا، وہ انگریزی ادب کے شیدائی تھے پھر اُن کے کسی کو لیگ نے انہیں میرا ناول ”بہاؤ“ پڑھنے کا مشورہ دیا جس نے بقول اُن کے اُن کا نظریۂ ادب بدل کر رکھ دیا۔۔ وہ اب تک میرے چار مختلف ناولوں پر انگریزی زبان میں نہایت طویل اور فلسفیانہ نوعیت کے مضامین تحریر کر چکے ہیں جو غیر ملکی ادبی جریدوں میں شائع ہوئے۔۔ وہ میرے ناولوں کے حوالے سے انگریزی زبان میں ایک تنقیدی کتاب ترتیب دے رہے ہیں۔۔ ایسے غیر جانب دار اور اجنبی نقاد ہی آپ کو پرکھ سکتے ہیں اور آپ محسوس کرتے ہیں کہ یہ تخلیقی زندگی رائیگاں نہیں گئی۔۔ ورنہ اردو ادب میں تو بڑا بڑا زہریلا، جانب دار اور زائد المیعاد نقاد بھرا پڑا ہے جن کا مقصد حیات ہی تخلیقی ادب کا قلع قمع کرنا ہے۔ اور ہاں میں بھولنے لگا تھا کہ اس میلے میں روزی دستگیر کے انگریزی ناول ”اے سمال فار چون“ کو بھی بہترین فکشن کے سلسلے میں انعام سے نوازا گیا۔ روزی کے والد پاکستانی تھے ایک لوہار خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ لاہور میں روزی سے ایک مفصل ملاقات ہو چکی تھی۔ اس ادبی میلے کی سب سے اہم اور پر وقار تقریب اردو ادب کے اطالوی زبان میں تراجم کے حوالے سے منعقد کی گئی۔ تین کتابوں کا تعارف تفصیل سے کروایا گیا، یعنی سعادت حسن منٹو کی کہانیوں کا اطالوی ترجمہ اور مظہر الاسلام اور پروین شاکر کی تخلیقات کا اطالوی روپ۔۔ اس تقریب کی

صدارت اطالیہ کے سفیر سیان فارانی نے کی اور پروین آغا قادر۔ نصرت جلال اور نگہت پٹیل مہمانان خصوصی تھیں۔ ایک پاکستانی نوجوان نے اطالوی ترجمے پڑھ کر سنائے اور سناتے ہی رہے حالانکہ ہمیں یقین تھا کہ وہ اطالوی ہی بول رہے ہیں۔ سعادت حسن منٹو کے بارے میں گفتگو کے لیے مجھے دعوت دی گئی۔۔۔ سٹیج پر براجمان منٹو صاحب کی بیٹیوں نگہت اور نصرت کو دیکھ کر میں ایک عجیب اداسی کا شکار ہو گیا۔۔۔ وہ بھی میری طرح عمر رسیدہ ہو چکی تھیں اور یہ ابھی کل کی بات ہے جب ہم لوگ لکشمی فیشن کی گراؤنڈ میں کھیلا کرتے تھے، شرارتیں کیا کرتے تھے، وہ میرے بچپن کی یادگاریں تھیں، میری چھوٹی بہنوں جیسی تھیں اور آج وقت کے پلوں تلے سے کتنا پانی بہہ چکا تھا اور کوئی دم جاتا تھا جب ہم سب نے بھی بہہ جانا تھا۔۔۔ اور اس کے باوجود مجھے محسوس ہوتا تھا جیسے منٹو صاحب اب بھی ہمارے آس پاس ہیں۔ وہ جب کبھی مجھ سے خوش ہوتے تو کہتے ”مستنصر ایک اچھا بچہ ہے“۔۔۔ میں نے پرانی یادوں کو کریدنا مناسب نہ جانا کہ شاید میں زیادہ جذباتی ہو جاتا، میں نے صرف لکشمی فیشن کی ٹریڈر مافیا کے ہاتھوں بربادی اور پائمال پر گہرے دکھ کا اظہار کیا جنہوں نے نگہت پٹیل کو منٹو صاحب کا آبائی گھر فروخت کر دینے پر مجبور کر دیا۔ انہیں اپنے باپ کے گھر سے مجبوراً بچھڑنا پڑا کہ اب گھر کے آگے موٹر سائیکل سٹینڈ بن چکے تھے، پکوڑوں کے کھوکھے وجود میں آ چکے تھے اور اُس گھر تک رسائی بھی مشکل ہو رہی تھی، جس لکشمی فیشن میں کسی زمانے میں مولانا تاجور نجیب آبادی، پروفیسر جی ایم اثر، سلمیٰ اثر، مولانا آزاد کے پوتے محمد باقر، سعادت حسن منٹو، حامد جلال، مصور شاہد جلال، تاریخ داں عائشہ جلال، ملک معراج خالد، خورشید شاہد، سلمان شاہد جیسے نابغۂ روزگار لوگ مقیم تھے اُس کے فلیٹوں اور گھروں کو گرا کر پلازا بن رہے تھے اگرچہ میں تو کسی شمار میں نہیں لیکن 17لکشمی فیشن جہاں میرا بچپن گزرا، جوانی بیتی، میری شادی ہوئی، میرے بچے پیدا ہوئے اس کا بھی نام و نشان مٹ چکا تھا اور وہاں اب گودام وجود میں آ چکا تھا۔۔۔ میں نے اپنی تقریر میں دنیا کے ایسے بڑے تخلیق کاروں کے حوالے دیئے جن کے آبائی گھر جواب محفوظ کیے جا چکے تھے اور جنہیں ایک عجائب گھر کے طور پر مجھے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔۔۔ انگلستان میں ولیم واڈز ورتھ کا ”ڈوکاٹج“ شیکسپیئر کے آثار، فلارنس میں ڈیوائن کامیڈی کے شاعر دانتے کا گھر۔ مائیکل انجلو کا گھر۔ ڈنمارک میں اینڈرسن کا جھونپڑا۔ نیو یارک میں وہ فارم ہاؤس جہاں شاعر والٹ وہٹ مین پیدا ہوا تھا۔ ”الحمرا کی کہانیاں“ کے مصنف واشنگٹن ارونگ کا دریائے ہڈسن کے کنارے گھر۔۔۔ارنسٹ ہیمنگوے کا فلوریڈا کے شہر کی ویسٹ میں واقع وہ مینشن جہاں وہ صرف بارہ برس مقیم رہا۔ یہاں تک کہ اُس کی بلیوں کی قبریں بھی محفوظ کر لی گئی ہیں تو کیا ہم اتنے ہے حس اور ذوق جمال سے عاری لوگ ہیں کہ اردو زبان کے سب سے بڑے افسانہ نگار کا گھر بھی محفوظ نہیں کر سکے۔ صرف اس لیے کہ ٹریڈر مافیا کو اہل اقتدار کی پشت پناہی حاصل ہے۔ اگر ہر برس ادبی جمگھٹوں پر کروڑوں روپے ڈبو دیئے جاتے ہیں تو کیا ایسا ممکن نہیں کسی ایک ادبی کانفرنس پر صرف کی جانے والی رقم کے نصف سے منٹو صاحب کا گھر حکومت خرید لے اور وہاں ”منٹو عجائب گھر“ قائم کر دے۔ اس طرح اُن کی ذاتی مشہوری زیادہ ہو گی، گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔ اور ہاں ہندوستان میں قرۃ العین حیدر کی قیام گاہ محفوظ کر کے اُسے ایک میوزیم کی شکل دے دی گئی ہے۔۔۔ یعنی ہندو انڈیا میں ایک مسلمان ادیبہ کا گھر ایک عجائب گھر ہو گیا ہے۔

میری آٹو گراف بک کا ایک ورق۔۔۔

“جب حسن تھا تو آئینے نہیں تھے، اب آئینے ہیں پر حسن کہاں”

سعادت حسن منٹو

خالد اقبال: ایک درویش مصور کی موت

مستنصر حسین تارڑ

22-06-014

یہ اُن زمانوں کا قصہ ہے جب میں لکشمی مینشن کے ایک فلیٹ میں رہائش پذیر تھا۔ جگہ کی تنگی تھی چنانچہ ہر اتوارمیں اپنے بال بچوں کو اپنے سرخ ہونڈا 175پر لاد کر بازار سے سینڈ وچ، چپس، شامی کباب اور مشروبات حاصل کر کے پکنک منانے کے لیے لاہور کی نہر کے کناروں پر رواں ہو جاتا۔ تب وہاں مکمل ویرانی اور کھیت کھلیان اور باغ تھے۔۔۔ سردیوں کی ایک سویر میں ہم نہر میں سے نکلنے والے ایک نالے کے کچے راستے پر دور تک اندر چلے گئے تا کہ پکنک منانے کے لیے کوئی پر فضا سر سبز مقام تلاش کیا جائے۔ ہم نے دیکھا کہ صبح کی دھند میں اس ویرانے میں ایک مونچھوں والا شخص، گھٹے بدن والا، ایزل سامنے رکھے کینوس پر اُس نالے کے کچے راستے، لہراتے پانی، کیکر کے درختوں اور کھیتوں پر اُترتی سرمائی دھند کو پینٹ کر رہا ہے۔۔۔ اُس کے قریب ایک پھٹیچر سا موٹر سائیکل کھڑا تھا۔ سمیر کوشروع سے ہی ڈرائنگ کا شوق تھا، وہ کہنے لگا ”ابو یہ بندہ کیا کر رہا ہے؟“ میں نے کہا ”تم خود اُس کے پاس جا کر پوچھ لو کہ انکل آپ کیا کر رہے ہیں“۔ وہ نہایت اعتماد سے اس مونچھوں والے شخص کے پاس چلا گیا۔ وہ اس وقت

پانچ برس کا ہو گا۔ سمیر کا کہنا تھا کہ ابو جب میں اس بندے کے پاس گیا تو مجھے دیکھ کر مسکرانے لگا اور پھر مجھے اپنی تصویر دکھائی جو وہ کینوس پر بنا رہا تھا۔ میں نے پوچھا انکل کیا میں بھی پینٹ کر سکتا ہوں تو اُس نے کہا، ہاں ہاں کیوں نہیں۔ یہ لو برش اور میرے ساتھ تصویر بناؤ۔ میں نے برش تھام کر کینوس پر یونہی ایک دھبہ سا لگا دیا۔۔۔ بہت اچھے انکل تھے۔۔۔ یہ وہی علاقہ ہے جہاں ان دنوں جوہر ٹاؤن آباد ہے۔ ازاں بعد کبھی کبار وہ مصور موٹر سائیکل کے کیرئر پر ایزل اور کینوس باندھے کھیتوں اور ویرانوں میں پھٹ پھٹ کرتانظر آ جاتا۔ کبھی کسی اینٹوں کے بھٹے کو پینٹ کر رہا ہوتا لیکن اکثر وہ کسی ایک کیکر کی تصویر کشی کر رہا ہوتا، آس پاس سے بے خبر جیسے وہ اپنے کینوس پر ایک سچ مچ کا کیکر تخلیق کر رہا ہوتا۔۔۔ میں اُس کے نام سے ناواقف تھا۔

آج بتیس برس بعد میرے بیڈ روم کی دیوار پر وہی ماسٹر پیس تصویر آویزاں ہے جو وہ اس دھند آلود سویر میں پینٹ کر رہا تھا

اور آج وہ مر گیا ہے۔۔۔ اُس کا نام خالد اقبال تھا۔

میں اپنے موجودہ گھر میں منتقل ہوا تو در و دیوار ویران تھے اور پھر میرے مصور دوستوں نے انہیں اپنی تصویروں سے سجا دیا، نئے گھر کی خوشی میں مجھے یہ لازوال تحفے عنایت کیے۔ سعید اختر، غلام رسول، عسکری میاں ایرانی، صادقین، نذیر احمد بادلوں کے بادشاہ پیرزادہ نجم الحسن، اُستاد بشیر احمد اور بہت سے دوسرے۔ ایک روز نذیر احمد کہنے لگا، تارڑ صاحب۔۔۔ آپ نے خالد اقبال کا کام دیکھا ہے؟ میں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو کہنے لگا، پھر آپ نے مصوری ہی نہیں دیکھی۔۔۔ اُن جیسا لینڈ سکیپ مصور پاکستان میں تو کیا پوری دنیا میں نہیں، وہ اُستادوں کے اُستاد ہیں۔۔۔ میں نے کہا، نذیر تم مبالغے سے کام لے رہے ہو تو نذیر نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا، آپ یقین نہیں کرتے تو آئیے اُن کے گھر چلتے ہیں۔ میں نے آپ کا ذکر کیا تھا تو وہ آپ کے مداح نکلے۔ جوانی میں کوہ نورد رہے ہیں۔ پاکستانی شمال کے بارے میں آپ کے سفرناموں کے شیدائی ہیں۔ جب میں اور نذیر احمد ماڈل ٹاؤن کے ایف بلاک میں واقع اُن کے وسیع گھر میں داخل ہورہے تھے تو نذیر کہنے لگا۔۔۔ پاکستان بھر میں ان دنوں جتنے بھی بڑے لینڈ سکیپ مصور ہیں، غلام رسول، ذوالقرنین حیدر، شاہد جلال، اقبال حسین، گلام مصطفی اور مجھے بھی شامل کر لیجیے ان سب کو برش تھام کر قدرتی مناظر کو کینوس پر تخلیق کر دینے کا ہنر خالد صاحب نے سکھایا ہے۔

میں نے پوچھا کہ نذیر اُن میں وصف کیا ہے، کمال کیا ہے تو وہ کہنے لگا۔ تارڑ صاحب وہ رنگوں کے تابع نہیں، رنگ اُن کی مرضی سے اپنے آپ کو بدل دیتے ہیں۔

یہ مصوری کا کوئی بہت گہرا فلسفیانہ نکتہ تھا جو میری سمجھ میں نہ آیا۔ رنگ تو رنگ ہوتے ہیں وہ کیسے ایک انسان کی خواہش کے مطابق بدل سکتے ہیں۔ سرخ کیسے نیلا ہو سکتا ہے، زرد رنگ جامنی تو نہیں ہو سکتا۔ سبز رنگ تو سفید ہونے سے رہا۔

سر۔۔۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ خالد صاحب تصویر پر اپنے برش کی سٹروک لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تو ” نے پانی ہو جانا ہے اور وہ پانی ہو جاتا ہے۔ پھر اسی برش کو اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے کینوس پر لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تو نے آسمان ہو جاناہے اور یقین کریں وہ ہو جاتا ہے“ مصوروں کی باتیں مصور ہی جانیں، ہم !کیا جانیں

خالد اقبال سے ملاقات ہوئی تو یکدم مجھے دھچکا سا لگا۔ یہ وہی شخص تھا جسے میں نے اس دھند آلود سویر میں ایک بڑی تنہائی میں پینٹ کرتے ہوئے دیکھا تھا اور سمیر نے اچک کر اس کے کینوس پر اس کے عطا کردہ برش سے ایک سٹروک لگایا تھا۔۔۔ خالد صاحب سے میں نے اس اولین ملاقات کا تذکرہ کیا تو وہ مونچھوں تلے مسکرانے لگے، انہیں یاد تھا۔۔۔ اور پھر آنا جانا شروع ہو گیا، جی ہاں وہ کم از کم دو مرتبہ میرے پاس بھی تشریف لائے۔ اس سے پیشتر کہ میں اس عظیم مصور کی یادوں میں کھو کر کچھ حقائق فراموش کر دوں میں ایک عرض کرنا چاہتا ہوں جو شاید بہت سوں کے طبع نازک پر گراں گزرے گی۔۔۔ ان دنوں ہر جانب صوفی اور درویش بہ کثرت نمودار ہو رہے ہیں اور اُن میں سے کچھ کے بارے میں تو میں جانتا ہوں کہ وہ کیسے صوفی اور کتنے درویش ہیں۔۔۔ لیکن تخلیق کی کائنات میں خاص طور پر مصوری کے جہان میں اگر کوئی صوفی یا درویش تھا تو وہ خالد اقبال تھا۔ آپ میں سے بیشتر افراد نے اُس کا نام بھی نہیں سنا ہو گا کہ درویش ہمیشہ روپوش رہتے ہیں، چرچانہیں کرتے، ٹیلی ویژن چینلز پر اولیا اور قطب نہیں ہوتے، روپوش رہتے ہیں۔۔۔ کم گو اور جھکے جھکے سے رہتے ہیں اور انہیں خود بھی علم نہیں ہوتا کہ وہ صوفی یا درویش ہیں، صرف اُن کے پاس حاضری دینے والے آگاہ ہوتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے چنیدہ بندوں میں سے ہیں۔

وقت کے پلوں تلے سے بہت سے پانی بہہ چکے تھے اور میں بھی بوڑھا ہو چکا تھا۔ سمیر میرے ہمراہ تھا، اُس شخص کے جنازے میں شریک ہونے جا رہا تھا میں نے آج سے بتیس برس پیشتر اُس کے ننھے منے ہاتھوں میں ایک برش تھما دیا تھا۔

آج اُس گھر کا وہ دروازہ بند تھا جسے میری آمد پر خالد اقبال کھول دیا کرتے تھے۔ اُس ڈرائنگ روم میں جہاں

میں کبھی تنہا اور کبھی فون کے ساتھ خالد صاحب کے ساتھ تو بیٹھا کرتا تھا، وہاں ایک چارپائی پر وہ مردہ پڑے تھے۔ (جاری ہے

خالد اقبال۔۔۔ مصوری کے منظر غروب ہوتے ہیں
مستنصر حسین تارڑ
25-06-014

خالد اقبال کی موت پاکستان میں مصوری کے ایک پورے عہد کی موت ہے۔۔ ایف بلاک کے گھر کے لان میں ان کے وہ شاگرد جو اب بہت بوڑھے ہو رہے تھے، جنہوں نے مصوری کے آداب اور رنگ لگانے کے طریقے ان سے سیکھے، آج پاکستان کے مایہ ناز مصوروں میں شمار ہوتے ہیں۔ سب کے سب کچھ تو رنجیدہ بیٹھے تھے لیکن ان میں سے بیشتر اپنے استاد کی رخصتی پر بہت سوگوار نہ تھے۔۔۔ جیسے ہندوؤں میں اگر کوئی شخص طویل عمر پا کر، معاشرے میں اپنا نام پیدا کر کے رخصت ہو تو خوشی منائی جاتی ہے کہ وہ کامران زندگی بسر کر گیا۔

خالد اقبال صاحب کی زندگی کے بہت سے پہلو روپوش ہیں، انہوں نے زندگی بھر شادی نہ کی، اپنی ہمشیرہ کے ساتھ، ان کے بچوں کے ساتھ عمر بسر کر دی۔۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک انتہائی تخلیقی مصورہ سے شادی کرنا چاہتے تھے، جو حسن اور کمال فن میں یکتا تھیں اور حسب آرزو ایسا نہ ہو سکا تو پھر انہوں نے ایک مجرد زندگی بسر کرنے کو ترجیح دی۔۔ خالد اقبال وہ پہلے مصور تھے جن کی تصویر حاصل کرنے کے لئے میں نے نامساعد حالات کے باوجود کچھ رقم پیش کی۔۔۔ اور بہت بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ قلیل سی رقم تو کینوس اور رنگوں کے لئے بھی ناکافی تھی، انہیں اس سے کئی گنا زیادہ رقم کی پیشکش کی گئی تھی جسے انہوں نے ٹھکرا دیا کہ یہ تصویر تارڑ صاحب کے لئے ہے۔

یہ تصویر، ایک دھندلی سرمائی سویر کی، پانیوں کے بہاؤ اور دھند میں سے نمودار ہوتے کیکر کے درختوں کی جو آج میرے بیڈروم کی دیوار پر آویزاں ہے ایک کلاسیک کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ خالد صاحب نے جب اپنی زندگی کی بہترین تصاویر پر مبنی ایک فولیو شائع کرنے کی اجازت دی تو اس میں سرفہرست یہ تصویر تھی۔ جنازے پر ممتاز انگریزی شاعر اور بیوروکریٹ اطہر طاہر نے مجھے بتایا کہ مجھے خالد صاحب کے انتقال کی خبر ملی تو میں فوراً چلا آیا۔۔۔ ڈرائنگ روم میں ان کا جسد خاکی پڑا تھا اور ایک دیوار پر آپ والی تصویر کا ایک پرنٹ آویزاں تھا۔ وہ ان کی محبوب ترین تصویر تھی۔ ایک بار میں نے ان سے پوچھا کہ خالد صاحب۔۔ آپ بار بار کیکر کے درخت کو ہی کیوں پینٹ کرتے ہیں تو کہنے لگے، تارڑ صاحب دنیا بھر میں جتنے بھی درخت ہیں ان کی ایک واضح اور مخصوص شکل ہوتی ہے لیکن پنجاب میں جتنے بھی کیکر کے درخت ہیں اور لاکھوں، وہ سب کے سب ایک دوسرے سے جدا ہیں، کوئی ٹھگنا اور پھیلا ہوا ہے، کوئی کبڑا ہے تو کوئی سربلند اور کوئی ایک جھاڑی کی مانند زمین پر بچھا ہوا ہے۔۔۔ کیکر کے درخت میں مصوری کے جتنے امکانات ہیں میں انہیں اس زندگی میں تو دریافت نہیں کر سکتا۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ لاہور سے اسلام آباد تک موٹروے پر سفر کرتے ہوئے جب میں پنجاب کی وسیع لینڈ سکیپ کو دیکھتا تھا تو گویا خالد اقبال کی ایک تصویر کو دیکھتا تھا۔ میں نے خالد صاحب کی نظروں سے پنجاب کی لینڈ سکیپ کی پہچان کی۔

خالد صاحب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی ہر تصویر سے پرکھ کی جا سکتی ہے کہ یہ کن موسموں کی ہے اور وقت کا پیمانہ کیا ہے۔ ابھی ابھی بارش ہو کر رُکی ہے تو تالاب گدلے ہو رہے ہیں، غروب کا منظر ہے تو ایک ٹیلے کی مٹی سُرخ ہوئی جاتی ہے۔ اور میں نے ایک ایسی ہی تصویر دیکھ کر کہا تھا کہ اگر اس تصویر میں سے ڈاک کے ٹکٹ جتنا ایک حصہ کاٹ کر مجھے دکھایا جائے تو میں بتا سکتا ہوں کہ غروب کا یہ کون سا لمحہ ہے۔

میں جب کبھی ان کے ڈرائنگ روم میں ان کے ساتھ ایک طویل ملاقات کے بعد اٹھتا تو دروازے کے عین اوپر آویزاں سفیدے کے درختوں کی ایک تصویر پر نظر ڈال کر باہر جاتا۔۔۔ اور ہاں ان دنوں مجھ پر گندھارا کے قدیم مجسموں کا خبط سوار تھا اور میں کبھی کبھی ان کے لئے کوئی ٹوٹا پھوٹا گندھارا مجسمہ لے جاتا۔۔۔ جنازے پر ان کی مداح شہلا سہگل بھی آئی ہوئی تھیں وہ کہنے لگیں ”تارڑ صاحب۔۔۔ میں جب کبھی خالد صاحب سے ملنے اس گھر میں آتی تھی تو وہ ہمیشہ کارنس پر سجے گندھارا کے مجسموں کی جانب اشارہ کر کے کہتے تھے، یہ مجھے تارڑ صاحب نے دیئے ہیں“۔ مجھے تو یاد بھی نہ تھا، شہلا نے مجھے یاد دلایا۔
ایک روز جب میں ڈرائنگ روم سے باہر نکلتے ہوئے حسب عادت سفیدے کے درختوں پر ایک نظر ڈال کر باہر جانے کو تھا تو خالد صاحب کہنے لگے، آپ ہمیشہ اس تصویر پر رُکتے ہیں، ایک گہری نظر ڈال کر باہر جاتے ہیں تو کیوں؟۔

اس سوال کا جواب بہت مشکل تھا۔۔۔ مجھے مصوری ، موسیقی کے بارے میں کچھ پتہ نہ تھا، بس ایک عالم شوق کا تھا تو میں نے کہا ’’خالد صاحب، سفیدے کے گھنے درختوں کے آگے آپ نے جو ایک ڈھلوان پینٹ کی ہے، جس کا عکس پانیوں میں ہے، میں اُسے ٹھہر کر دیکھتا ہوں‘‘۔

اگلی ملاقات پر۔۔۔ جب میں رخصت ہونے کو تھا تو خالد صاحب نے وہ پینٹنگ اتار کر ایک جھجک کے ساتھ مجھے پیش کر دی۔ ’’تارڑ صاحب کسی اور نے۔۔۔ کسی مصور نے بھی غور نہیں کیا کہ میں نے یہ تصویر صرف اس ڈھلوان کو پینٹ کرنے کی خاطر بنائی تھی۔ یہ آپ کے لئے ہے‘‘۔میرا خیال ہے کہ میں اُن معدودے چند افراد میں شامل ہوں جنہیں خالد اقبال نے اپنی ایک قیمتی تصویر تحفے کے طور پر پیش کر دی۔

اور ہاں جب کبھی کوئی مصوری کانقاد انہیں پنجاب کی لینڈ سکیپ کا مصور ٹھہراتا تو وہ اس محدودیت کو پسند نہ کرتے ’’میں ایک مصور ہوں۔۔۔ اور جہاں میں ہوتا ہوں وہاں کی لینڈ سکیپ پینٹ کرتا ہوں، اگر میں سری لنکا یا سوڈان میں ہوتا تو وہاں کی لینڈ سکیپ پینٹ کرتا کہ ادب، موسیقی اور مصوری کی کوئی سرحد نہیں ہوتی۔

اور جب ہم نے ماڈل ٹاؤن کے ایک قبرستان میں خالد اقبال کو دفن کیا تو گویا پاکستانی مصوری کے ایک دور کو دفن کیا۔

وہ جو کینوس پر سٹروک لگا کر کہتا تھا کہ تو پانی ہو جا اوروہ پانی ہو جاتا تھا، اُسی برش کی سٹروک لگا کر کہتا تھا کہ آسمان ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔۔۔ وہ رنگوں کانہیں، رنگ اُس کے تابع تھے۔

روش روش پہ ہیں نکہت فشاں گلاب کے پھول
حسیں گلاب کے پھول، ارغواں گلاب کے پھول
کٹی ہے عمر بہاروں کے سوگ میں امجدؔ
مری لحد پہ کھلیں جاوداں گلاب کے پھول
(مجید امجد)

‘‘ابن طفیل کا ناول ’’حیٔ ابن یقزان

مستنصر حسین تارڑ

29-06-014

یہ وہ زمانے تھے، تقریباً بیالیس برس پیشتر جب میں اپنا پہلا سفرنامہ ’’نکلے تری تلاش میں‘‘ مکمل کر چکا تھا اور اُندلس میں اپنی طویل آوارہ گردیوں کی داستان ’’اندلس میں اجنبی‘‘ کے نام سے قلمبند کرنا چاہتا تھا۔۔۔ میرے نزدیک اگر ایک سفرنامہ محض ایک بیان ہو، روزمرہ کے واقعات کا اندراج ہو، صرف مشاہدات پر مبنی ہو تو وہ ایک بے جان تحریر ہے۔۔۔ جب تک اُس میں شب و روز کی تحقیق اور علمی جستجو کا نچوڑ نہ شامل کیا جائے۔ اُس تحریر کے بدن میں زندگی کا خون گردش نہیں کرتا چنانچہ میں ان دنوں اُندلس کے مسلمان عہد کے بارے میں تحقیق میں مگن ہو گیا۔ بے شمار سرچشموں سے سیراب ہوا لیکن حیرت انگیزطور پر پنجاب پبلک لائبریری کے تہ خانے میں اُندلس کے بارے میں قدیم کتابوں کا ایک بڑا خیرہ موجود تھا، میں پورا دن اس تہ خانے میں بیٹھا پرانی کتابوں کی ورق گردانی کرتا رہا، پھر کچھ ماہ کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں نے ان کتابوں کی مدد سے اُندلس کی تاریخ، رہن سہن، ادب، طرز تعمیر اور فلسفیوں کے بارے میں جو نوٹس تیار کیے تھے صرف اُن کی اشاعت سے ایک ضخیم تحقیقی کتاب وجود میں آ سکتی تھی اور میں نے اس امکان پر ایک مدت غور کیا کہ منظرنامہ لکھنے کی بجائے اندلس پر یہ تحقیق مرتب کر دوں۔۔۔ لیکن مجھ میں ایک خامی تھی، میں ایک تخلیقی اور جذبات کی رو میں بہہ جانے والا شخص تھا، میرا تصور بعض اوقات مجھے حقائق سے دور لے جاتا تھا اور خود اپنے حقائق تخلیق کرنے لگتا تھا جب کہ ایک محقق ایک تاریخ دان کے لیے یہ ایک بنیادی شرط ہے کہ وہ قطعی طور پر جذباتی نہ ہو، ہر شے کو حقائق کی روشنی میں پرکھے، بالکل غیر جانب دار اور متوزن ہو جو کہ میں نہ تھا اس لیے میں نے اندلس کا سفرنامہ ہی تحریر کیا اور اس میں اپنی کچھ تحقیق سمو دی۔۔۔

تب مجھے بار بار اپنے ذہن کی محدودیت سے فرسٹریشن ہوتی تھی اور یہ خامی اب بھی مجھ میں موجود ہے کہ میں صرف سطحی علم رکھتا ہوں۔ مجھ میں اتنا دم نہیں کہ میں گہرے سمندروں کی تہ میں اتر کر وہاں دانش اور حکمت کے جو موتی ہیں اُن سے استفادہ کر سکوں۔۔۔ میں نے اُن زمانوں میں ابن ماجہ، ابن رُشد اور ابن طفیل تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔۔۔ ابن العربی کی ’’فتوحات مکیہ‘‘ کے کچھ حصے کسی حد تک میری فہم میں آ گئے۔۔۔ امریکی آئل کمپنی آرا مکو کی جانب سے ایک تحقیقی مجلہ ’’سعودی آرامکو ورلڈ‘‘ نام کا شائع ہوتا ہے جس میں دنیا بھر کے اسلامی محققین کے نہایت نایاب مضامین شائع ہوتے ہیں، فوکس مسلمان تہذیب پر ہے اور کسی طرح یہ باقی دنیا پر اثر انداز ہوئی، اس کا ہر مضمون اس لائق ہوتا ہے کہ اسے نصاب میں شامل کیا جائے تا کہ ہماری نئی نسل جان سکے کہ مذہبی

تعصب سے بالاتر اسلام کی ایک ایسی روشن خیال تہذیب اور علمی وراثت ہے جس نے پوری دنیا کے اذہان کو متاثر کیا ہے۔۔ موجودہ شمارے میں ایک مضمون صرف اُن پھولوں کے بارے میں ہے جو مسلمان ملکوں میں مدتوں سے اگائے جاتے تھے اور پھر انہیں یورپ میں رائج کیا گیا۔ افریقی مسلمان ملک چڈ کے صحراؤں میں تازہ پانیوں کی جھیلوں کی حیرت انگیز تصاویر ہیں۔۔ پولینڈ میں صدیوں سے آباد تاتار مسلمانوں کے بارے میں ایک دلچسپ رپورٹ ہے لیکن اس شمارے کا سب سے اہم مضمون بارہویں صدی عیسوی میں لکھے گئے ایک ساٹھ صفحے کے عربی ناول ”حیٔ ابن یقزان“ کے بارے میں ہے جسے اندلس کے عظیم فلسفی ابن طفیل نے لکھا اور یاد رہے کہ ابن طفیل کی یہ واحد تحریر ہے جو مکمل حالت میں ہم تک پہنچی ہے۔ مغربی محقق ٹام ورد کے بقول یورپ کا کوئی ایسا فلسفی یا ادیب نہیں ہے جس پر بلاواسطہ یا براہ راست نوسو برس پیشتر لکھے گئے ابن طفیل کے اس ناول کا اثر نہ ہوا ہو اور وہ اس طویل فہرست میں ملٹن، والٹیئر، روسو اور سپائی نوزا کو بھی شامل کرتا ہے، بلکہ سپائی نوزا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُس نے بھی ”حیٔ ابن یقزان“ کا ایک ترجمہ کیا۔ سولہویں صدی میں اس ناول کا ترجمہ ڈچ زبان میں ہوا۔۔ آخر تقریباً آٹھ سو برس پیشتر لکھے گئے اس ناول میں وہ کونسا ایسا طلسم ہے جس نے پورے یورپ کے فلسفیوں اور ادیبوں کو متاثر کیا۔۔ اصل میں ابن طفیل اور اس کے عہد کے بیشتر مفکر اس فلسفے کے قائل تھے کہ انسان کو حقائق یا سچ تک پہنچنے کے لیے صرف اپنے غور و فکر اور مشاہدے پر انحصار کرنا چاہیے، اس سلسلے میں اسے کسی مرشد یا تحریر کا سہارا نہیں لینا چاہیے اور یہ ناول اسی فکر کی نمائندگی کرتا ہے۔۔ ابن طفیل ایک ایسے جزیرے کا تذکرہ کرتا ہے جو ہندوستان کے ساحل کے قریب ہے اور عام طور پر خیال ہے کہ اس کے ذہن میں سری لنکا تھا۔۔ اس جزیرے میں موسموں، سورج کی روشنی، حدت اور نمی کا ایک ایسا آمیزہ ہے جس کی وجہ سے انسان کا ظہور ہو جاتا ہے ماں باپ کے بغیر۔۔ ابن طفیل چاہتا تھا کہ اس کا ہیرو کسی جینیاتی تسلسل کا نمائندہ نہ ہو، سراسر ایک آزاد وجود ہو لیکن اُسے خدشہ تھا کہ کہیں اس پیدائش پر مذہبی طبقہ اعتراض نہ کرے چنانچہ ناول میں حیٔ کا ایک پس منظر تخلیق کیا گیا یعنی ایک نزدیکی جزیرے میں بادشاہ کی بہن ایک بچے کو جنم دیتی ہے اور پھر اس کی جان بچانے کی خاطر جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بیان ہوا اُس بچے کو بانس کی ایک ٹوکری میں محفوظ کر کے پانیوں میں بہا دیتی ہے، یہ ٹوکری بہتی ہوئی اس پر اسرار جزیرے کے ساحل کے ساتھ جا لگتی ہے جہاں ایک غزال ایک ہرنی اُسے ٹوکری سے نکال کر اپنے بچے کے طور پر پالتی ہے، اپنا دودھ پلاتی ہے۔۔ یہ بچہ حیٔ جنگل کے جانوروں کی طرح بدن کے ساتھ پر جوڑ لیتا ہے اور سر پر لکڑی کے سینگ لگا کر جانور ہو جاتا ہے۔ جب وہ سات برس کا ہوتا ہے تو ہرنی مر جاتی ہے۔ اُسے تجسس ہوتا ہے کہ یہ موت کیا ہے، یہ مر کیوں گئی ہے، وہ اُسے زندہ کرنے کے لیے اُس کے بدن کو کاٹ کر اناٹومی کا علم حاصل کرتا ہے۔ واقف ہوتا ہے کہ نظام تنفس کیا ہوتا ہے۔۔ دل کی شکل کیا ہے۔۔ اور جب وہ مشاہدہ کرتا ہے کہ اس کے دل کے ایک خانے میں خون کے لوتھڑے ہیں جب کہ دوسرا خانہ بالکل خالی ہے تو وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ یہاں کوئی چیز تھی جو اسے زندہ رکھتی تھی جو رخصت ہو گئی ہے یعنی روح کی نمائندگی۔۔ پھر وہ فزکس کی سائنس سیکھنے کے لیے مشاہدہ کرتا ہے کہ کیسے پانی بھاپ میں بدلتا ہے، اشیاء زمین پر گرتی ہیں، آگ کی روشنی اوپر آسمانوں کی جانب سفر کرتی ہے جس کا مطلب ہے کہ ان کا تخلیق کرنے والا وہاں ہے۔۔ وہ ستاروں کی گردش کا حساب کرتا ہے۔۔ ایک غار میں بیٹھ کر غور کرتا ہے کہ ”کیا یہ سب کچھ یکدم بے وجہ وجود میں آ گیا یا یہ ہمیشہ سے یہاں موجود تھا“۔ حیٔ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ایک ایسی شے ہے جو کائنات اور زمانوں سے مبرا ہے، وہ انسانی ذہن کی گرفت میں نہیں آ سکتا اور یہ خدا ہے۔

ابن طفیل کے اس ناول کو ڈینئل ڈیفونے ”رابنسن کروزو“ کے روپ میں پیش کیا۔۔ آج کا بچوں کا کردار ٹارزن بھی ابن طفیل کے حیٔ سے مستعار شدہ ہے۔۔اُندلس کی سیاحت کے دوران مجھے ابن العربی کی جائے پیدائش مرسیہ میں قیام کرنے کا اتفاق ہوا لیکن میں خواہش کے باوجود گاڈیکس نہ جا سکا جہاں ابن طفیل پیدا ہوا تھا۔

ابن طفیل اپنے ناول ”حیٔ ابن یقزان“ میں لکھتا ہے۔۔

یہ سمندر اور زمین کیا ہیں جنہیں میں اپنے آس پاس دیکھتا ہوں۔۔ یہ کیسے وجود میں آئے اور میں کیا ہوں ” اور میرے علاوہ تمام جنگلی جانور، ہم سب کہاں سے آئے ہیں؟ یقیناًہمیں کسی خفیہ طاقت نے تخلیق کیا ہے جس نے سمندر ، زمین، آسمان اور موسم بنائے، تو وہ کون ہے ؟۔۔ یہ خدا ہے جس نے یہ کچھ تخلیق کیا“۔

کردار باغی ہوجائیں تو کہانی عظیم ہوجاتی ہے، مستنصر حسین تارڑ
غلام محی الدین
جمعرات 3 جولائی 2014

اردو کے معروف لکھاری مستنصر حسین تارڑ کے سفر زیست کی ایک جھلک۔
یکم مارچ 1939 کو لاہور میں مقیم گجرات کے کاشت کار رحمت خان تارڑ صاحب کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جسے مستنصر حسین نام دیا گیا، یہ بچہ جو اب مستنصر حسین تارڑ کے نام سے انتہائی ہردل عزیز ہے، آئندہ پچیس برس میں انشاء اللہ ہنستے کھیلتے صدی بھر کا ہوجائے گا۔
بچپن، لاہور کے بیڈن روڈ پر واقع لکشمی مینشن میں سعادت حسن منٹو کے پڑوس میں گزرا۔ تحصیل علم کے لیے پہلے مسجد، پھر مشن ہائی اسکول رنگ محل اور پھر مسلم ماڈل ہائی اسکول سے میٹرک کرکے گورنمنٹ کالج میں پہنچے۔ ایف اے کیا اور فلم، تھیئٹر اور ادب کے نئے جہاں دریافت کرنے برطانیہ چلے گئے، یہ شریفانہ "چھانڑے بازی" پانچ چھے برس کیاکی۔ من موجی اور آوارہ مزاج تو تھے ہی، 1957 میں ماسکو کے یوتھ فیسٹول جا نکلے۔ قلم یہیں کسی رات ہتھے چڑھا تھا اوریوں کہ پھر زندگی بھر اترکر ہی نہ دیا۔
پاکستان واپس آئے تو اداکاری کا شوق چرایا، پی ٹی وی جا دھمکے، شکیل تو تھے ہی، زیادہ تردد نہ کرنا پڑا "پرانی باتیں" میں پہلی بار کام ملا، ایکٹنگ کی، غالباً مطمئن نہ ہوئے، جی میں آئی ڈراما خود لکھا جائے تو "آدھی رات کا سورج" طلوع کیا۔ یہ 1974 کا سال تھا جب یہ کھیل نشر ہوا۔ پھر چل سو چل، برسوں ٹی وی سے وابستہ رہے، کبھی اِس عہدے پر، کبھی اُس پر، کئی یادگار ڈرامے لکھے، جی بھر اداکاری کی۔ صبح کی نشریات میں شامل ہوئے تو بچوں کے آئیڈیل "چاچا جی" بن گئے۔
1969 میں یورپی ممالک کی سیاحت پر روانہ ہوئے، واپس (1971) آئے تو قارئین کے لیے "نکلے تری تلاش میں" کی سوغات لائے، یہ ایک بے خطا تیر تھا کہ قاری اور ناقد دونوں کو بہ یک وار شکار کیا۔ محمد خالد اختر جیسے سفر نگار نے تحسین کی "تارڑ نے مروجہ ترکیب کے تار و پود بکھیر ڈالے ہیں"۔
اس کتاب کی پذیرائی کا طوفان تھا کہ تھم نہیں پا رہاتھا۔ فطرت میں بے نیازی کا عنصر کچھ زیادہ ہی ہے سو یہ ہوائی اڑائی گئی کہ جناب کی گردن میں کچھ سریا وریا سا آگیا ہے لیکن انہوں نے ایسی آوازوں پر کان بند کرلیے، خدشہ تھا کہ پلٹ کر دیکھا تو "پتھر کا ہو جاؤں گا"۔ اگلا سفر نامہ ان کا "اندلس میں اجنبی" تھا۔
صاحبِ طرز مزاح نگار شفیق الرحمٰن نے کہا "تارڑ کے سفرنامے قدیم اور جدید سفرناموں کا سنگم ہیں"۔
بیالیس برس سیارے کو چھانتے پھرے، تیس سفرنامے لکھے(پاکستان کے شمالی علاقوں کے بارہ سفروں سمیت)۔ بیش تر سفر نامے اور ناول لاہور میناپنی بیچوں کی دکان کے شور شرابے اور دُھول مٹی میں بیٹھ کر لکھے۔ کے ٹو پر ان کا سفرنامہ ایسا مقبول ہوا کہ دو ہفتے بعد ہی دوسرے ایڈیشن کی ضرورت پڑگئی تھی، نہ صرف یہ بل کہ کے ٹو پر کہیں واقع ایک جھیل کا نام ہی "تارڑ جھیل" پڑگیا۔ خانہ بدوش، نانگا پربت، نیپال نگری، سفر شمال کے، سنو لیک، کالاش، پتلی پیکنگ کی، ماسکو کی سفید راتیں، یاک سرائے، ہیلو ہالینڈ اور الاسکا ہائی وے، ان کے چند نمایاں سفرنامے ہیں۔
سفرنامے کے میدان میں سکہ رائج کروا لیے تو ناول نگری فتح کرنے پر تل گئے۔ "پیار کا پہلا شہر" تخلیق کیا تو سیل کے ریکارڈ ٹوٹ گئے، اِس ناول کے پچاس سے زیادہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ یوں تو ان کا ہر ناول مقبول ٹھہرا مگر "راکھ" اور "بہاؤ" کی بات ہی کچھ اور ہے۔ یہ اردو ادب کے چند کشید ناولوں میں شمار ہوتے ہیں۔
" راکھ" پر انہیں 1999 میں بہترین ناول کا پرائیم منسٹر لٹریری ایوارڈ پیش کیا گیا، اس کا بنیادی موضوع سقوط ڈھاکا اور بعد کے برسوں میں کراچی میں جنم لینے والے حالات ہیں۔ "قلعۂ جنگی" نائن الیون کے بعد افغانستان پر امریکی حملے کے پس منظر میں لکھا، پنجابی میں بھی ناول نگاری کا کام یاب تجربہ کیا، کالم لکھنا شروع کیا تو یہاں بھی اپنا اسلوب جداگانہ رکھا، حجاز مقدس گئے تو "غار حرا میں ایک رات" اور "منہ وَل کعبہ شریف" کے زیرعنوان دو سفر نامے لکھے۔
قرۃ العین حیدر پسندیدہ لکھاری اور ان کا ناول "آخرشب کے ہم سفر" پسندیدہ ہے۔ ٹالسٹائی اور دستائفسکی کے مداح ہیں۔ "برادرز کرامازوف" کو دنیا کا سب سے اعلٰے ناول خیال کرتے ہیں۔ شفیق الرحمٰن کی "برساتی کوے" کو اپنے سفرنامے "نکلے تری تلاش میں" کی ماں قرار دیتے ہیں، کرنل محمد خان کی "بجنگ آمد" کو اردو کا سرمایہ قرار دیتے ہیں، رسول حمزہ توف کی "میرا داغستان" اور آندرے ژید کی خودنوشت اچھی لگتی ہیں، کافکا اور سارتر بھی پسند ہیں، ترک ادیب یاشر کمال اور اورحان پامک کے مداح ہیں، مارکیز اور بوسے سارا ماگو کو بھی ڈوب کر پڑھا، محمد سلیم الرحمٰن کی تنقیدی بصیرت کے قائل ہیں، اپنی تخلیقات پران سے ضرور مکالمہ کرتے ہیں۔ نوبل انعام یافتگاں کی تخلیقات توجہ سے پڑھتے ہیں۔ کہتے ہیں "جو پسند آتا ہے، اس سے اثر بھی لیتا ہوں"
لکھتے ہیں "برصغیر اور خصوصی طور پر پنجاب کے باسیوں کی خصلت میں داستان گوئی شامل ہے"۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ قرہ العین حیدر کے سوا اردو ادب کے عظیم داستان گو، ناول نگار اور کہانیاں لکھنے والے زیادہ تر پنجابی ہی ہیں۔ کوئی تیس پینتیس برس اُدھر کا قصہ ہے کہ ایک امریکی اردو دان لِنڈا ونیٹک، برکلے یونی ورسٹی سے جدید اردو افسانے پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھنے پاکستان آئیں۔ انہوں نے

برصغیر کے چالیس افسانہ نگاروں کو منتخب کیا تھا۔
اْن ہی دنوں میرا افسانوی مجموعہ ”سیاہ آنکھ میں تصویر“ شائع ہوا تھا چناں چہ مجھ پر بھی آنکھ رکھی، میری رہائش پر تشریف لائیں اور ایک تفصیلی انٹرویو کیا۔ پہلا سوال یہ تھا کہ آپ فکشن یا نثر ہی کیوں لکھتے ہیں؟ میرا جواب تھا ”اس لیے کہ میں پنجابی ہوں“۔ لِنڈا کو اس عجیب سے جواز کی توقع نہ تھی، تب میں نے قرۃ العین حیدر کے ذکر کے بعد فکشن کے ٹھیٹھ پنجابی رائٹرز کے نام گنوانے شروع کر دیے۔
کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ، سعادت حسن منٹو، کنہیا لال کپور، پطرس بخاری، اوپندر ناتھ اشک، رام لعل، عبداللہ حسین، فکر تونسوی، ممتاز مفتی، شفیق الرحمٰن، اے حمید، سریندر پرکاش، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، نثار عزیز بٹ، جمیلہ ہاشمی، ۔۔۔ درجنوں نام اور سب پنجابی۔۔۔ محترمہ نے ٹیپ ریکارڈر بند کردیا اور پریشان سی ہو کر پوچھا ”یہ تو مجھے اپنا مقالہ دوبارہ لکھنا پڑے گا، عجیب بات ہے کہ اردو زبان کے ان عظیم لکھاریوں کی مادری زبان اردو نہیں پنجابی ہے“۔
تارڑ کہتے ہیں، عجیب بات یہ بھی ہے کہ انگریزی کے پاکستانی ناول نگار مثلاً محمد حنیف، ندیم اسلم، محسن حامد، بَپسی سدھوا، عظمیٰ ، اسلم خان، سیالکوٹ کے غوث، عمر شاہد حامد پنجابی ہی تو ہیں، داستان گوئی پنجاب کی سرشت میں ہے“۔
تارڑ ربع صدی سے بیسٹ سیلر چلے آرہے، ہمارے یہ داستان گو بتاتے ہیں ”داستان گوئی مجھے ماں اور بڑی خالہ سے ملی، دونوں نے لکھنے اور بولنے کا اسم اعظم عطا کیا اور اس اسم اعظم کی حفاظت کا وظیفہ پیر و مرشد والد صاحب نے سکھایا، یہ میرے اللہ کی مجھ پر بہت خصوصی عنایت ہے۔
داستان گوئی تال سے تال ملانے کا فن ہے، سننے والا قصہ گوکے سحر سے باہر نہیں نکل سکتا، جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ میں اپنے قاری کو اپنی مرضی کا منظر دکھاتا اور منواتا ہوں تو میں نے جان بوجھ کر ایسانہیں کیا، ہاں یہ ہے کہ داستان کو سنتے یا پڑھتے ہوئے، آپ کہیں درمیان سے چھوڑ کر آگے نہیں جاسکتے، اُسی طرح میں بھی جزئیات کو چھوڑنے کا قائل نہیں، شاید اسی لیے میرا قاری ایک دائرے میں بندھا رہتا ہے، وہ کتاب کا کوئی ورق چھوڑ کر آگے جانے کی جلدی میں نہیں ہوتا، اس میں میری خانہ بدوشی کا عمل دخل ہے، آوارگی مجھے منفرد کرتی ہے۔
قاری کو مسمرائیز کرنے والی بات بالکل اُلٹ لگتی ہے، میں جب بولتا یا رات کو لکھتا ہوں تو مجھ پر ایک نیم مدہوشی سی طاری ہوجاتی ہے، اپنے ہی لفظوں میں جکڑا جاتا ہوں، رات کے لکھے کو دن میں درست بھی کر لوں تو بھی اس کیفیت سے نکل نہیں پاتا، جس رات یہ مدہوشی نہیں ہوتی، تو نہیں لکھتا۔ شاید یہ ہی کیفیت میرے قاری میں منتقل ہو جاتی ہے حالانکہ میں کبھی کسی کو متاثر کرنے کے لیے نہیں لکھتا۔
مطالعے کے علاوہ خلق خدا کو مختلف جہتوں اور مظاہر فطرت کو قریب سے دیکھنے کا جو موقع مجھے ملا، اُس سے بھی لکھنے میں بہت مدد ملی۔ دنیا کو دیکھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچاکہ میرا سچ ہی سچ ہے البتہ یہ حرف آخر نہیں، دنیا میں اور بھی سچ ہیں، میری ثقافت اور میرے عقیدے کے علاوہ بھی ثقافتیں اور عقیدے محترم ہیں، یہ سچائی ہاتھ آجائے تو تنگ نظری آپ کے اندر سے ختم ہوجاتی ہے۔ اب جو میں پچھتر برس کی عمر میں اپنے قاری کا محبوب بنا بیٹھا ہوں تو اس کی وجہ دوسروں کو اور اُن کے سچ کو تسلیم کرنا ہی ہے۔ صدق دل سے لکھتا ہوں اور لکھے بغیر رہ نہیں سکتا، میرے قاری اور تنقید نگار مجھے بہت زیادہ پڑھاکو سمجھتے ہیں لیکن ایسا ہے نہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ لکھنے پر پڑھنے کو ترجیح دیتا ہوں“۔
لکھاری کہتے ہیں کہ لکھتے ہوئے، لفظ، اگر بوتل سے نکلے جن کی طرح بے قابو ہوجائیں، توگڑبڑ ہوجاتی ہے مگرمستنصر کہتے ہیں ”لفظوں کو قابو میں رکھنے کا منتر میں نے سیکھ لیا ہے، اب میں ان کے برتاؤ سے مسئلہ حل کرلیتا ہوں، صراط مستقیم لکھنے کے بجائے سیدھا راستہ لکھ کر آگے بڑھ جاتا ہوں، اس طرح جعلی دانش وری کے عذاب سے بھی بچ جاتا ہوں البتہ کہانی کے کردار اکثر باغی ہو کر آزاد زندگی گزارنے پر اُتر آتے ہیں اور سمجھ لیجے کہ جب کردار بغاوت کردے تو لکھنے والے کے پاس دو ہی راستے رہ جاتے ہیں، وہ بہادر بن کر اُس کردار کی اخلاقیات یا آفاقیات کو مان لے یا پھر لکھنا بند کردے، مجھ سے اکثر کہا جاتا ہے کہ آپ کا لکھا ہوا فلاں کردار یہ کہتا ہے، وہ کہتا ہے، تو میں لاچارگی سے کہ دیتا ہوں کہ ضروری تو نہیں کہ میرا لکھا ہوا کردار میری طرح ہی سوچتا ہو“۔
بہاؤ“ لکھتے ہو ئے مستنصر نے جب پنجابی، دراوڑی اور دیگر زبانوں کے الفاظ اپنی تحریر میں شامل کیے ” توسوال اُٹھا کہ ابلاغ کیسے ہوگا؟ ان کا جواب ہے”بہاؤ میں 1930 کا عہد ہے، اُس پس منظرکے ابلاغ کے لیے دراوڑی اور پنجابی الفاظ ضروری تھے، جس پنجاب کی کہانی ہے، اُس میں آج بھی ان لفظوں کا ورتارا موجود ہے ”جس طرح ”کُھرے“ کا اردو میں ترجمہ ممکن نہیں، اسی طرح ”ویہڑے“ اور”چاٹی“ کی اردو آپ کو نہیں ملے گی۔ یہ لفظ جان بوجھ کر نہیں لائے گئے، اصل میں ان سے بہتر لفظ مجھے ملے ہی نہیں اور یقین کرینکہ قارئین کو کہیں بھی ابلاغ کا مسئلہ پیش نہیں آیا، میرے اور قاری کے درمیان ایک ایسی فریکوئینسی ہے، جس سے ہم ایک دوسرے کو سمجھ لیتے ہیں“۔

طلسماتی حقیقت پسندی) کے حوالے سے کہتے ہیں ”میری بود و (Magical Realism اپنی تحریروں میں باش جس ماحول میں ہوئی، یہ عنصر اسی کا حصہ ہے۔ وارث شاہ کی ”ہیر وارث شاہ“ اور مولانا غلام رسول کا شہ کار ہیں، میرا پنجابی Magical Realism “عالم پوری کی ”احسن القصص المعروف قصہ یوسف زلیخا ناول ”پکھیرو“ اسی تیکنیک میںہے، ہماری لوک داستانیں اور بچوں کی کہانیاں تک، اس عنصر سے خالی “نہیں، مجھے کیا پڑی تھی کہ میں یہ عنصر غیروں سے لیتا، یہ ہمارے خمیر میںہے۔

تارڑ نے جسمانی سفر کیے تو سفر نامے مکمل ہوئے لیکن وہ کہانیاں کیسے مکمل ہوئیں جن کا جسمانی طور پر سفر ممکن نہیں تھا؟ ”مجھے ملامتی صوفی بنانے اور ثابت کرنے کی بہت سی کوششیں ناکام ہو چکی ہیں، یہ ایک دل چسپ داستان ہے، کبھی پھر سہی لیکن میں اس بات کا قائل ہوں کہ جہاں سے عقیدت شروع ہوتی ہے، وہیں سے جہالت بھی آغازہوتی ہے، میں علم والا نہ سہی مگر جاہل بننا مجھے پسند نہیں، مجھ میں عقیدت کی کمی ہے، اس لیے صوفی بننا بھی مجھے پسند نہیں، ہاں اپنی طبع خانہ بہ دوش کے باعث اُس دنیا کا سفر بھی کر لیتا ہوں جس کا وجود نہیں اور وہاں جسمانی طور پر جانا ممکن نہیں، مثلاً میرے لیے میرے مرحوم والد صاحب دنیا کی نہایت قابل احترام ہستی ہیں، جب میں اُن کا جسد خاکی لحد میں اتار کے اُن کے کفن کے بند کھول رہا تھا تو تمام تر غم اور دکھ کے باوجود میں نے ان کی ادھ کھلی آنکھوں میں نیلی روشنی دیکھی اور یک بہ یک اُن کا دایاں ہا تھ اپنے ہا تھ میں لے کر اُس بچپن میں چلا گیا جب میں یہ ہاتھ تھام کر چلا کرتا تھا، عزیز ترین ہستی کو لحد میں اتارتے ہوئے اس طرح کی حرکت ممکن نہیں مگر مجھ سے ایسا ہوا اور یہ تمام تر جزئیات کے ساتھ مجھے یاد ہے“۔

اپنے باپ اوراپنے بچپن کی یادیں تازہ کرتے ہوئے بولے”میری پہلی درس گاہ مسجد تھی لیکن اُس مسجد کے متشدد مولانا صاحب نے مجھے مذہب سے خاصا دور کردیا تھا،جب وہ حج پر گئے توتشدد سے جان چھٹی۔ ایک دن مولانا نے ہم بچوں کو بتایا کہ دنیا کے تمام مسلمان جنت میں اور تمام کافر جہنم میں جائیں گے، میں پریشان ہو گیا کہ کافر تو مسلمانوں سے زیادہ ہیں، اتنے کافروں کی خاطر تو اللہ پاک کو جہنم بنانے کے لیے بہت زیادہ اینٹیں، سیمنٹ اور سریا درکار ہوگا۔ والد صاحب ہم بچوں کی پریشانی فوراً بھانپ لیتے تھے۔

پوچھا تو میں نے بتایا، انہوں نے نصیحت کی کہ آج کے بعد جنت اور جہنم کے بارے میں نہیں سوچنا، بس یہ سوچنا ہے کہ تمہارے ہاتھ سے خلق خدا کو کوئی دکھ نہ پہنچے، میں اس نصیحت پر اس لیے پورا نہیں اترا کہ میں اپنے والد کی طرح غصے پر قابو پانے کی صلاحیت نہیں رکھتا، میری بیوی میرے بارے میں کہتی ہیں کہ اگر مجھ میں میرے والد صاحب کی عادات کا دس فی صد بھی آجاتا تو بڑے آدمیوں میں شامل ہو سکتا تھا“۔

تارڑ کے بہ قول ”تخلیقی واردات کو قلم بند کرنے کے لیے ماحول بنانے کی ضرورت نہیں، میں نے اپنی دکان میں پڑی بیچوں کی بوریوں پر بیٹھ کر بھی لکھا، اگر آپ میںلکھنے کی تڑپ ہے تو کوئی مشکل نہیں ورنہ آپ نتھیا گلی میں بھی نہیں لکھ سکتے۔ اب میں 75 برس کا ہو چلا ہوں، اب جا کر میں تھوڑا سا ماحول بنا کر لکھنے کا تکلف کرلیتا ہوں، موبائل فون نہیں سنتا، کمرے میں چائے، سگریٹ رکھ لیتا ہوں، موسم، غذا، رنگ، ماحول میرے لکھنے پڑھنے پر اثرنداز نہیں ہوتے، کبھی موسیقی مدد دے لیتی تھی لیکن اب وہ بھی بے اثرہوگئی“۔

انسان کو اپنی حیثیت کا علم ہو جائے تو وہ پاگل ہو جائے یا فوراً مرجائے، یہ تو شیطان ہی ہے جوسمجھتا ” ہے کہ اس سا پھنے خان کوئی دوسرا نہیں، انسان تو مٹی کے ذرے سے بھی بے وقعت ہے، یونسوچتا ہوں تومحسوس ہوتا ہے کہ میں سر پر قصے کہانیوں کا پٹارا رکھے انہیں بیچتا پھرتا ہوں اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ پٹارا بھی میرا نہیں ۔ جب میں ایسا کہتا ہوں تو لوگ سمجھتے ہیں میں کوئی باباجی ہوں، میں بابوں کو مانتا ہی نہیں، میں سمجھتا ہوں کہ ”میتھوں ہورکون سیانا“(مجھ سے زیادہ عقل مند کون)۔ میں خود کو انتہائی خوش نصیب سمجھتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے مجھے میری اوقات سے زیادہ عطا کیا ہے۔ سال 2002 میں مجھے دوحہ قطر میں لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ دیا گیا، مجھ سے پہلے یہ ایوارڈناصرکاظمی، اشفاق احمد، قرۃالعین اور شوکت صدیقی کو ملا تھا، ایوارڈ ملنے کے بعد مجھ سے میرا نظریۂ فن پوچھا گیا تو میں نے برملا کہا تھا کہ اوپر والے نے جج کر لیا تھا کہ اس پڑھاکو، خواب دیکھنے والے، آوارہ کو یہ نہ دیا تو بھوکوں مرے گا، نہ اس کے پاس جائداد ہے، نہ تعلیم اور نہ ہی کوئی معاشی اور معاشرتی مقام، اس نے سوچا ہوگا، چلو اس بے چارے کو تھوڑی سی عزت دے دیتا ہوں، میرے پاس بس یہ ہی سرمایا ہے۔

دیوار برلن اور دیوار فلسطین
مستنصر حسین تارڑ
10-08-014
تو جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے فلسطین میرے دل میں پناہ گزیں ہے اور میں عرب ملکوں کی مانند کبھی بھی مرتے دم تک اسے اپنے دل سے نہ نکالوں گا۔۔۔
1956ء میں انگلستان میں ایک اطالوی یہودی جس کا نام ڈیوڈ کہہ لیجیے میرا ہم جماعت اور دوست تھا۔۔۔ وہ تقریباً آٹھ زبانیں جانتا تھا اور نو عمری کے باوجود اس کے علم کی وسعت حیران کن تھی اور ہمارا پاکستانیوں اور دیگر مسلمان طالب علموں کا علم بہت محدود تھا، ہم اُس سے بحث میں جیت نہیں سکتے تھے اور میں ہمیشہ فلسطین کے بارے میں اس سے بحث کرتا تھا اور میں نے اپنے ناول ”راکھ“ میں اس کا حوالہ دیا ہے اور وہ کہا کرتا تھا کہ مستنصر یاد رکھنا ایک دن آئے گا جب ہم نہ صرف بیت المقدس کو اپنا صدر مقام بنائیں گے بلکہ اسرائیل کی سرحدیں تمہارے مقدس مقامات تک چلی جائیں گی۔ جب جون کی جنگ میں موشے دیان نے پوری عرب دنیا کو صرف چند روز کے اندر شکست دے کر بیت المقدس، صحرائے سینا۔۔۔ غزہ، گولان پہاڑیاں اور اُردن کے وسیع حصے فتح کر لیے تو مجھے ڈیود کی پیش گوئی یاد آ گئی۔۔۔ اس تباہ کن جنگ کے بارے میں تفصیل سے پھر کبھی لکھوں گا لیکن پاکستانی وزیراعظم حسین شہید سہروردی کا یہ بیان کہ عرب کیا ہیں، زیرو پلس زیرو پلس زیرو۔۔۔ برابر ہے زیرو کے۔۔۔ آج بھی عرب نہیں بھولے اگرچہ بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی۔ علامہ محمد اسد نے جو مسلمان ہونے سے پیشتر یہودی تھے اور اُن کا جرمن نام لیو پولڈ تھا جس کا مطلب شیر ہوتا ہے اور اسی مناسبت سے انہوں نے اپنا اسلامی نام اسد رکھا اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ”روڈ ٹو مکہ“ میں لکھتے ہیں اور ابھی اسرائیل عربوں کے سینے پر ثبت نہیں کیا گیا تھا کہ یہودی زمینیں خرید رہے ہیں، اُنہیں آباد کر رہے ہیں اور عرب۔۔۔ صرف نمازیں پڑھتے ہیں اور بکریاں چراتے ہیں۔ مجھے شام میں گولان کی پہاڑیوں کے دامن میں جانے کا اتفاق ہوا ہے اور جب ہم ایک ٹیلے کی بلندی پر پہنچے تو دوسری جانب اسرائیل اور اردن کی سر زمین تھی۔۔۔ ان دونوں کے درمیان سرحد بہت واضح تھی یعنی اسرائیل کی جانب دور دور تک سر سبز کھیت اور پھلوں کے باغ تھے۔ مصنوعی طریقے سے فواروں کی مدد سے آب پاشی کی جا رہی تھی اور جہاں سے اردن کا علاقہ شروع ہوتا تھا وہ صرف صحرا تھا، بیابان تھا۔۔۔آبادی کے لحاظ سے اور اسرائیل کی آبادی لاہور سے بھی کم ہے دنیا میں سب سے زیادہ نوبل پرائز اسرائیلی سائنس دانوں کے حصے آتے ہیں۔۔۔سفاکی، درندگی اور دہشت گردی اگرچہ اُن کے بنیادی ہتھیار ہیں یہاں تک کہ یورپ میں بھی ایک طبقہ پکار اٹھا ہے کہ غزہ کے بعد ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ ہٹلر نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔۔۔ لیکن اس کے سوا یہ اسرائیل کی سائنسی ترقی اور برتری ہے جس کے سامنے عرب نہیں ٹھہر سکتے۔۔۔ جب تک کہ وہ دنیاوی علوم اور مائنسی ترقی میں اسرائیل کی ہم سری نہیں کرتے اور کم از کم میری زندگی میں تو یہ ممکن نہیں ہے۔ محض گڑ گڑا کر دعائیں مانگنے سے تو اسرائیل نابود ہونے سے رہا۔۔۔ ان دنوں ایک پیغام موبائل فونوں پر گردش کر رہا ہے کہ اسرائیل کے فوجیوں نے مسجد اقصیٰ کے گرد گھیرا ڈال لیا ہے ۔ آپ سے درخواست ہے کہ فوری طور پر فلاں آیت کا ورد شروع کر دیں۔۔۔ تا کہ اسرائیلی نیست و نابود ہو جائیں۔ تاریخ کیسے اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ شنید ہے کہ جب روسی فوجیں بخارا پر یلغار کر رہی تھیں تو علماء کرام نے بخارا کے عوام سے کہا تھا کہ وہ ختم خواجگان کا بندوبست کریں، انشاء اللہ روسیوں کی توپوں میں کیڑے پڑ جائیں گے۔۔۔ بے شک روسیوں کی توپوں میں کیڑے پڑے لیکن ڈیڑھ دو سو برس بعد۔۔۔ تاریخ اپنے آپ کو کیسے دہراتی ہے۔
امریکہ اور مغرب پر یہودیوں کا مکمل تسلط ہے۔ میڈیا اور فلم میں اُن کی حکمرانی ہے۔ مغرب اپنے اس احساس جرم میں دبا ہوا ہے کہ اس نے لاکھوں یہودیوں کو ہلاک کیا اور اب اگر یہودی فلسطینیوں کو ہلاک کر رہے ہیں تو وہ خاموشی اختیار کرتا ہے۔۔۔ اور یاد رہے نہ صرف امریکہ بلکہ یورپ اور خاص طور پر فرانس میں یہودیوں کے خلاف شدید تاریخی تعصب پایا جاتا ہے لیکن معاشیات، ادب، میڈیا اور سائنس میں یہودی چونکہ برتری رکھتے ہیں اس لیے اُنہیں برداشت کیا جاتا ہے۔ اور یہودیوں کی دماغی برتری کے سبب کسی اور کالم میں بیان کروں گا۔ چند برس پیشتر ”لٹریٹر ورک سٹاف“ نامی ایک سرکاری ادبی تنظیم کی جانب سے مجھے برلن میں مدعو کیا گیا۔۔۔ اُس برس ایشیائی ادب کی نمائندگی کے لیے میرا چناؤ ہوا۔۔۔ میرے اعزاز میں جو تقریب ہوئی اس میں بنیادی طور پر میرے ناول ”راکھ“ پر گفتگو ہوئی اور ہائیڈل برگ سے مشہور اردو سکالر ڈاکٹر کرسٹینا آسٹن بیلٹ ”راکھ“ پر ایک تنقیدی مقالہ پڑھنے کے لیے تشریف لائیں، ڈاکٹر کرسٹینا نے جرمن زبان میں قرۃ العین حیدر کے ناولوں پر پی ایچ ڈی کی تھی۔ اس محفل میں ”راکھ“ کے کچھ ابواب کا جرمن زبان میں ترجمہ کر کے ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا۔ تقریب کے آخر میں میں نے برلن کے ساتھ اپنی قدیم رفاقت کا تذکرہ کیا۔۔۔ کہ پہلی بار سوویت یونین سے واپسی پر میں ایسٹ جرمنی کی حکومت کے مہمان کے طور پر ایسٹ برلن میں ٹھہرا تھا اور میں نے برلن کو ایک کھنڈر شہر کی صورت دیکھا تھا۔۔۔ پھر 1960ء اور

آخری بار 1969ء میں آیا تھا اور تب مشرقی اور مغربی برلن کے درمیان ایک دیوار تعمیر کر دی گئی تھی اور وہ پورے مغرب میں اور امریکہ میں آزادی اور غلامی کا ایک استعارہ بن گئی تھی، جیک کینیڈی نے دیوار برلن کے سائے میں کھڑے ہو کر اعلان کیا تھا کہ میں بھی برلن کا ایک شہری ہوں۔۔۔ برلن کی دیوار زیادہ اونچی نہ تھی، بیس کلو میٹر لمبی تھی اور وہ ڈھے چکی اور آج ایک اور خطے میں سینکڑوں کلو میٹر طویل، ایک بلند فصیل دیوار تعمیر کر دی گئی ہے جو قصبوں، زیتون کے باغوں اور محبت کرنے والے دلوں کے درمیان حائل ہو چکی ہے تو یورپ اور امریکہ اس نئی دیوار کے بارے میں احتجاج کیوں نہیں کرتے۔ دیوار یورپ میں ہو تو وہ آزادی اور غلامی کا استعارہ بن جاتی ہے اور اگر کسی اور خطے میں ہو تو سب چپ ہو جاتے ہیں۔ اپنی خاموشی میں اُسے جائز قرار دیتے ہیں۔ دیوار برلن کی مانند۔۔۔ اس دیوار کو بھی تو ڈھا دینا چاہیے۔ یہ بھی تو انسانوں کو تقسیم کرتی ہے یا پھر یہ انسان نہیں ہیں۔ میں نے دیکھا کہ اس تقریب کی انچارج خاتون کے چہرے پر تشویش ابھر آئی ہے

ہم دنیا کے سب سے بڑے ”نوحہ گر“ ہیں

مستنصر حسین تارڑ

برلن کی اس تقریب میں جہاں میرے ناول ”راکھ“ پر ایک سیمینار کا اہتمام کیا گیا تھا جب میں نے دیوار برلن کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک اور خطے میں تعمیر شدہ سینکڑوں کلومیٹر طویل بلند دیوار کا حوالہ دیا تو میں نے دیکھا کہ تقریب کی انچارج خاتون کے چہرے پر تشویش ابھر آئی ہے۔

اس شب ایک ہندوستانی ریسٹورنٹ میں میرے اعزاز میں جو ڈنر دیا گیا اور اس میں ہندوستان سے آئے ہوئے شاعر ندا فاضلی اور صحافی ایم۔جے۔اکبر کے علاوہ اپنے افتخار عارف بھی شامل تھے ، اُن خاتون نے زیرلب سرگوشی کی ”تارڑ صاحب۔۔۔ آپ نے اپنی تقریر میں یہ کیا کہہ دیا۔۔۔ یہاں جرمنی میں اسرائیل کے خلاف کوئی بات کرنا ایک جرم ہے۔۔۔ شکر ہے آپ نے صرف یہ کہا کہ دنیا کے ایک اور خطے میں بھی ایک دیوار برلن تعمیر کی گئی ہے۔۔۔ یہ نہیں کہا کہ فلسطین میں تعمیر کی گئی ہے، ورنہ آپ کو گرفتار کیا جا سکتا تھا“۔

لیکن میں نے تو نہ خطے کا اور نہ ہی اس دیوار کو تعمیر کرنے والوں کا نام لیا ہے۔۔۔ ایک حقیقت بیان کی ہے“۔ ”

آپ سمجھ نہیں رہے۔۔۔ خاص طور پر آسٹریا اور جرمنی میں آپ کسی محفل میں یا تحریری طور پر یہ بھی ” نہیں کہہ سکتے کہ ہولوکاسٹ کے دوران اتنے یہودی ہلاک نہیں کئے گئے جتنا کہ وہ دعویٰ کرتے ہیں۔ آپ اُن میں سے ایک یہودی بھی کم کریں گے تو قانون حرکت میں آ جائے گا“۔

یہ کیسی تاریخی کامیڈی ہے۔۔۔ جرمنی اور آسٹریا جو بے دریغ نہ صرف یہودیوں بلکہ خانہ بدوشوں کوبھی لاکھوں کی تعداد میں ہلاک کرتے ہیں، انہیں گیس چیمبرز میں ان کے بچوں سمیت قتل کرتے ہیں آج ان کے اتنے ہمدرد ہو گئے ہیں کہ غزہ کے سینکڑوں بچوں کی ہلاکت سے بھی چشم پوشی کرتے ہیں، صرف اس لئے کہ وہ اپنے تاریخی جرم سے نجات حاصل کرنے کے لئے غزہ کے بچوں کے قتل کو جائز سمجھتے ہیں۔

ویسے میں درپردہ خواہش کرتا تھا کہ مجھے اس ”جرم“ میں گرفتار کرلیا جائے، سزا سنا دی جائے۔

تو اُن زمانوں میں۔۔۔ ہماری ہیروئن لیلیٰ خالد تھی جس نے تاریخ میں پہلی بار ”ہائی جیکنگ“ کی، درجنوں امریکی اور یورپی جہازوں کو ”فلسطین زندہ باد“ کے نعرے لگاتے ہوئے بموں سے اڑا دیا اور کُل دنیا متوجہ ہوئی کہ فلسطین کے لوگ بھی وجود رکھتے ہیں۔ لیلیٰ خالد پاکستان بھی آئی لیکن چاہت کے باوجود اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ زندہ ہے یا نہیں، اگر زندہ ہے تو کس حال میں ہے۔۔۔ اور پھر جارج حباش جیسا فلسطینی انقلابی تھا، اسے یاسر عرفات کی پالیسی سے اختلاف تھا، وہ مذاکرات پر نہیں، انقلابی جدوجہد پر یقین رکھتا تھا۔۔۔ وہ بغداد میں مر گیا۔

اُن زمانوں میں فلسطینیوں کے درمیان مذہب کی دراڑیں نہ تھیں۔۔۔ اگر لیلیٰ خالد اور حباش عیسائی تھے تو یاسر عرفات کی اہلیہ سوہا بھی مسلمان نہ تھیں، عیسائی تھیں۔ وہ سب فلسطینی تھے۔۔۔ ابھی دیروحرم کے جھگڑے شروع نہ ہوئے تھے۔

ہم لوگ شاید دنیا بھر میں سب سے بڑے ”نوحہ گر“ ہیں۔ ہم انتظار کرتے ہیں کہ کب ہم مسلمانوں پر کوئی اذیت مسلط کر دیجائے، کوئی شکست ہو تو ہم نوحے لکھنے شروع کر دیں، کربلا سے لے کر آج تک ہم نوحے لکھتے چلے آئے ہیں۔۔۔ اُندلس کے، مشرقی پاکستان کے، بغداد کے اور غزہ کے نوحے لکھنے میں ہم کمال کرتے ہیں۔۔۔ آپ دیکھئے گا کہ آئندہ دنوں میں پاکستانی شعراء غزہ کی بربادی اور بچوں کی ہلاکت پر کیسے کیسے درد انگیز اور پُرتاثیر نوحے قلمبند کرتے ہیں کہ نوحے، ایک نامرد ہو چکی قوم کی شعری علامت ہوتے ہیں۔

صد شکر کہ میں ایک نوحہ گر نہیں ہوں۔ ایک پاکستانی شاعر نہیں ہوں۔ ورنہ ایک آدھ جذباتی نوحہ لکھ کر اسے کسی مشاعرے یا ٹیلی ویژن پر آبدیدہ ہو کر پڑھ کر اپنے ضمیر کو مطمئن کر لیتا۔

میرے لِونگ روم میں غزہ کے بچوں کے لاشے ٹیلی ویژن سکرین میں سے اترتے چلے آتے ہیں۔۔۔ یہ جرم ضعیفی کی سزا ہے جوہمیں مل رہی ہے۔
سی این این ٹیلی ویژن پر ایک امریکی سیاح شکایت کر رہا ہے ”میں اپنے خاندان کے ہمراہ کچھ عزیزوں سے ملاقات کرنے کے لئے اسرائیل آیا تھا، میرا خیال تھا کہ ہم لوگ نیلے سمندر میں تیریں گے اور شام کو کسی بہترین ریستوران میں شراب پئیں گے، کھانا کھائیں گے اور زندگی سے لطف اندوز ہوں گے لیکن۔۔۔ ان فلسطینیوں نے ہماری چھٹیاں غارت کر دی ہیں، ہم پر راکٹ برساتے ہیں جو امریکہ کی مہیا کردہ ”آہنی شیلڈ“ روک لیتی ہے لیکن کیا پتہ کون سا راکٹ نہ روکا جائے۔۔۔ وہ ہمیں اطمینان سے کسی قہوہ خانے میں کافی کا ایک پیالہ بھی نہیں پینے دیتے۔۔۔ اگر ان کے بچے مرتے ہیں تو اسرائیل کو اپنے دفاع کا حق حاصل ہے چاہے حملے کے دوران بچے مر جائیں۔ اور فلسطینی یوں بھی بہت سے بچے پیدا کرتے ہیں اور اگر ان میں سے کچھ مر جاتے ہیں تو یہ ”کولیٹرل ڈیمج“ ہوتا ہے۔
ایک اور خاتون بیت المقدس سے بات کرتی ہیں ”تل ابیب کے باشندے بہت اپ سیٹ ہیں اور نوّے فیصد سے زیادہ لوگ غزہ پر حملے کی حمایت کرتے ہیں چنانچہ جمہوریت کا یہی اصول ہے۔ اگر عورتیں اوربچے مرتے ہیں تو یہ حماس کا قصور ہے۔
میرے لِونگ روم میں گڑیا شکل کے بچوں کے لاشے بھرے پڑے ہیں، اُن کے رخسار سیبوں کی مانند سرخ ہیں۔۔۔ وہ اپنی ماؤں کی گود میں مر گئے تھے

جلیاں والا باغ اور تخت لاہور



ہزار داستان
مستنصر حسین تارڑ
tarar@naibaat.com

یہ انسانیت سوز، دل کو دُکھ سے بھرنے والے، انسانی وقار کی تذلیل کرنے والے، یہ منظر میں نے پہلے بھی کیا دیکھے تھے، یہ ذلت آمیز تصویریں میری یادداشت میں کہیں محفوظ تھیں۔

ایک ناتواں بوڑھا ایک کنٹینر کے نیچے ایک جانور کی مانند رینگ رہا ہے۔ جیسے ایک کتا رینگتا ہو...... اور اُس کے چہرے پر ایک بے بسی اور لاچارگی ہے، وہ ایک ایسے غلام کی مانند زمین پر رینگتا ہے جس کا مالک اُس کے بوڑھے بدن کو ایک چابک سے ادھیڑتا ہے...... ایک برقع پوش عورت، گود میں بچہ اٹھائے، کبھی اپنا برقع سنبھالتی ہے اور کبھی اپنے بچے کے سر پر ہاتھ رکھتی ہے کہ کہیں وہ کنٹینر کی چھت سے نہ ٹکرا جائے اور وہ بھی ایک جانور کی مانند ہولے ہولے کھسکتی، اپنے آپ کو گھسیٹتی دکھائی دے رہی ہے...... اور جب وہ یہ رکاوٹ عبور کر کے کنٹینر کے نیچے سے برآمد ہوتی ہے تو اُس کا برقع اتر چکا ہے اور بچہ روئے چلے جا رہا ہے۔ شاید اُس کے دودھ پینے کا وقت تھا لیکن ایک کنٹینر تلے رینگتی اُس کی ماں اُسے کیسے دودھ پلا سکتی تھی کہ باہر جن کے پاس اقتدار ہے اور جن کے پاس نہیں ہے اُن کے درمیان جنگ جاری ہے اور اُن کے لیے ایک بوڑھے، ایک برقع پوش عورت اور اُس کے بلکتے بچے کی کچھ وقعت نہیں ہے۔ وہ اس جنگ کا چارا ہیں جنہیں کترا جا رہا ہے۔ ٹریلروں کے نیچے سے گزرنے والے، چار پائے ہو چکے انسانوں میں نوجوان اور ادھیڑ عمر لوگ بھی ہیں اور وہ سب جانور ہو جانے پر مجبور نہ صرف شریفوں کو بلکہ قادریوں کو بھی آپ کا کیا خیال ہے کن القابات سے نوازتے ہوں گے۔

یقیناً یہ سب حفاظتی اقدامات جیسا کہ ہمیں میڈیا میں، اخباروں اور ٹیلی ویژن پر یقین دلایا جا رہا ہے صرف عوام الناس کے تحفظ کے لیے اختیار کیے گئے ہیں...... اگر باراتیں دربدر ہو رہی ہیں اور نئی نویلی دلہنیں گھونگھٹ نکالے ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہیں، مریض جاں بلب ہیں بلکہ ایک میت کو بھی روک لیا گیا ہے اور مر چکے شخص کے عزیز واویلا کر رہے ہیں کہ ہمیں تو گزرنے دو ہم نے اسے دفن کرنا ہے لیکن وہ مُردوں کا بھی تحفظ کر رہے ہیں...... اور اگر آپ کان رکھتے ہیں تو سنیں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں...... وہ کہہ رہے ہیں کہ اگر شریفوں اور قادریوں کی بہو بیٹیوں کو بھی ان کنٹینروں کے نیچے سے رینگ کر دوسری جانب لے جایا جائے تو وہ کیا محسوس کریں گے...... کیسے بھولے بادشاہ ہیں کہ بھلا بادشاہوں اور پر تقدیس ارب پتی انقلابیوں کی بہو بیٹیاں بھی کبھی ایسی ذلت سے دوچار کی جا سکتی ہیں...... وہ تو اپنے محلات میں ٹیلی ویژن پر یہ مناظر دیکھتی ہیں اور یقین کیجیے بے حد رنجیدہ ہوتی ہیں بلکہ کچھ بعید نہیں کہ انہوں نے کچھ آنسو بھی بہائے ہوں...... اُن کے دل میں عوام کے لیے بے حد محبت ہے۔

آخر یہ سب مناظر تذلیل کے، اخباروں کی تصویروں میں اور ٹیلی ویژن سکرین پر دیکھتے ہوئے مجھے کیوں واہمہ ہوا کہ یہ مناظر تو میں نے دیکھے ہوئے ہیں۔

دراصل یہ جلیاں والا باغ کے قتل عام کے بعد امرتسر کی ایک گلی کے منظر ہیں۔ بہت مدت پہلے میں نے پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے پاکستان کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر دو اقساط پر مبنی ایک ''ڈرامہ'' جلیاں والا باغ'' تحریر کیا جس میں مرکزی کردار ریشم، جمیل فخری اور خیام سرحدی نے ادا کیے۔ ظاہر ہے اس کھیل کو تحریر کرنے سے پیشتر میں نے جلیاں والا باغ کے سانحے کے بارے میں جتنے بھی تاریخی حقائق تھے اُن کا مطالعہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ کسی انگریز عورت کو امرتسر کی ایک گلی میں بے آبرو کر کے...... اور یہ انگریز تاریخ دان کہتے ہیں، ''قتل کر دیا گیا۔ چنانچہ قتل عام کے بعد انگریز سرکار نے حکم صادر کیا کہ جب تک دوسرا حکم نہ آئے اس گلی میں رہنے والے جتنے لوگ ہیں، بچے، بوڑھے، عورتیں وہ سب چل نہیں سکتے، چار پائے ہو کر گلی کے پتھروں پر گھسٹتے رینگ رینگ کر دوسری جانب جا سکتے ہیں اور جو کوئی بھی سر اٹھا کر چلنے کی کوشش کرے گا اُسے گولی مار دی جائے گی۔ میں نے ''جلیاں والا باغ'' میں یہ منظر بھی شامل کیا اور پھر آخری لمحوں میں میں نے اسے سکرپٹ سے خارج کر دیا کہ نہیں...... انسان کی اتنی تذلیل نہیں دکھائی جا سکتی کہ اُسے چار پایہ ہو جانے پر مجبور کر دیا جائے، رینگنے پر مجبور کر دیا جائے۔ یوں میری اپنی توہین ہوتی تھی، برصغیر کی توہین ہوتی تھی چنانچہ میں نے وہ منظر سکرپٹ سے خارج کر دیا۔

یہ کیا ہے کہ وہی منظر جسے میں نے خارج کر دیا تھا، شاید نوے برس پیشتر ایک منظر ہوا تھا وہ آج کے پاکستان میں مجھے دکھائی دے رہا ہے۔ ان کی سکرپٹ میں کچھ تبدیلی نہیں ہوئی۔ بوڑھے رینگ رہے ہیں، عورتیں رینگ رہی ہیں۔ انہوں نے تو کسی کو قتل نہیں کیا تو انہیں کس جرم کی سزا مل رہی ہے، وہ کیوں ذلیل کیے جا رہے ہیں، جانور بنا دیے گئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ کچھ پالتو دانشور متحرک ہو جائیں گے، مجھ ایسے بے سہارا کالم نگاروں کو معتوب کریں گے لیکن اس سے پیشتر کیا وہ اپنے پھولے ہوئے پیٹ اور ڈھلکے ہوئے چہرے کے ساتھ کسی کنٹینر کے نیچے سے رینگ کر پار جانے کا مظاہرہ کریں گے تا کہ ثابت ہو سکے کہ یہ اقدامات عوام کے تحفظ کی خاطر کیے گئے ہیں۔

ہمیں تو مہنگائی چین نہیں لینے دیتی۔ بجلی کے بل دیوالیہ کرتے ہیں، نہ ٹماٹر خرید سکتے ہیں اور کیلے دو سو روپے درجن ہو رہے ہیں، عرصۂ حیات تنگ ہو رہا ہے اور پھر ہم جو ڈوب رہے ہیں ان کو مزید ڈبونے کے لیے کینیڈا سے انقلاب نازل ہو جاتا ہے اور وہ انقلاب انگریزی میں بولتا ہے اور پھر واپس چلا جاتا ہے۔ اور انگریزی کا ہی ایک محاورہ ہے کہ ''شیطان اور گہرے سمندروں کے درمیان'' بیروت سے اطالیہ جانے والا سمندری جہاز جب سسلی کے جزیرے اور اطالیہ کے ساحل کے درمیان میں سے ایک تنگ آبنائے میں سے گزر رہا تھا تو کپتان نے ہمیں بتایا کہ یونانی دیو مالا میں آیا ہے کہ سسلی کی چٹانوں میں ایک چڑیل رہائش پذیر تھی جو یہاں سے گزرنے والے ملاحوں کو اچک لیتی تھی، کھا جاتی تھی اور جب وہ اپنی جان بچانے کی خاطر اطالیہ کے ساحل کے قریب ہوتے تھے تو وہاں سمندر میں ایک بھنور اُن کو نگل جاتا تھا تو اس محاورے کی ''شیطان اور گہرے سمندروں کے درمیان'' کی ابتدا یہاں سے ہوئی۔ تو ہم لوگ، بھٹکتے ہوئے لوگ کہاں جائیں۔ شیطان کی جانب یا گہرے سمندروں کے بھنور کی جانب...... کہاں جائیں؟

اے آلِ اسرائیل اتنا اترانا بھی کیا
مستنصر حسین تارڑ
20-08-014

جون 67ء کی شکست عربوں کی تاریخ میں سب سے شرمناک اور بزدلانہ شکست تھی جب انہوں نے نہ صرف اپنے وسیع علاقے کھو دیئے بلکہ بیت المقدس کو بھی اسرائیل نے فتح کر لیا۔۔ اُن کی ایئر فورس اور فوج مکمل طور پر تباہ ہو گئی۔۔ اسرائیل کا جینئس جنرل موشے دایان اپنی ایک آنکھ کے ساتھ بیت المقدس میں داخل ہوا اور سیدھا ہیکل سلیمانی کی دیوار پر پہنچ کر اس دیوار گریہ سے لپٹ کر رویا اور کہا آج اسرائیل مکمل ہو گیا ہے۔۔ ہزاروں برسوں سے ہر یہودی گھرانے میں سونے سے پیشتر دعا مانگی جاتی تھی کہ اے خدا اپنا وعدہ پورا کر اور ہمیں ایک مرتبہ پھر بیت المقدس میں داخل کر۔۔ یہ صرف دعائیں نہ تھیں بلکہ اسرائیل کی جدید ترین فوج اور منصوبہ بندی کے کمال تھے جنہوں نے اسے پھر سے بیت المقدس میں داخل کر دیا۔۔ جون 67 کی شکست ”حُزیران“ کہلاتی ہے۔۔ اس ہزیمت کے دکھ کو عرب شاعروں نے اپنی شاعری میں سمویا۔۔ نوحے نہیں لکھے۔۔ اس شکست کے اسباب کو بیان کیا اور نفسیاتی طور پر ریزہ ریزہ ہو چکے عوام کو ڈھارس دی، اُن کی ہمت بندھائی۔۔ اسے مزاحمتی شاعری نہیں کہا جا سکتا، ہاں شاید اسے شرمندگی اور دکھ کی شاعری کہا جا سکتا ہے۔

عظیم شامی شاعر اڈونس جو کئی بار ادب کے نوبل انعام کے لیے زیر غور آیا۔۔ اپنے دیوان ”گلاب اور خاکستر کے درمیان ایک لمحہ“ میں لکھتا ہے۔۔

”ہمیں نہ آسمان نے جنم دیا، نہ اس خاک نے
ہم نیستی ہیں، ہم ایک وجودِ ناپید ہیں
ہم لفظوں کے دریا سے اٹھتا ہوا جھاگ ہیں
ہم آسمان اور اس کی کہکشاؤں سے جھاڑی ہوئی گرد ہیں
ہم زندگی کی اُترن ہیں۔۔ اس کی دھات کا زنگ ہیں“

نزار قبانی ایک حیرت انگیز شاعر ہے جو دل میں اتر کر اسے رُلا دینے والا طرز بیان رکھتا ہے۔ بیروت سے شائع ہونے والے رسالے ”الآداب“ میں نزار قبانی کی نظم ”کتاب ہزیمت کے حاشیے پر “ شائع ہوئی اور پوری عرب دنیا میں اس پر پابندی لگا دی گئی لیکن لوگوں نے اسے زبانی یاد کر لیا۔ اس نے ”محبت اور پٹرول“ نام کی نظم تخلیق کی تو تہلکہ مچ گیا۔۔ اس نظم میں شاعر ایک محب وطن عرب لڑکی کو زبان دیتا ہے اور وہ پٹرول کے چشموں کے مالک اپنے عرب خاوند سے مخاطب ہوتی ہے۔

تم کب سمجھو گے اے میرے سردار
کہ میں تمہاری داشتاؤں کی طرح ایک داشتہ نہیں
اور نہ تمہاری عروسی فتوحات میں ایک اور فتح ہوں
نہ میں ایک ہندسہ ہوں تمہاری شادی کے رجسٹر کا
(جو ہر سال اس میں درج ہوتا ہے)
اے پٹرول کے حاکم اتر جا، اپنی ہوس رانی کی دلدل میں اتر جا
تُو نے پیرس کی شبانہ کلبوں میں اپنی رجولیت کا گلا گھونٹا
اور اپنا جذبۂ غیرت اُن طوائفوں کی بانہوں میں سلا دیا
تم نے قُدس کو بیچا، خدا کو بیچا
اپنے پیاروں کی مٹّی تک بیچی
جیسے اسرائیل کے نیزے تمہاری بہنوں کے خون میں نہیں رنگے تھے
جیسے ہمارے گھر، ہمارے درودیوار نہیں ڈھائے گئے تھے
اور ہمارے مقدس صحیفے آگ کا ایندھن نہ بنے تھے
تم تو یُوں سو رہے تھے جیسے یہ قیامت۔۔ تم پر نہیں گزری ہے۔
!تم کب سمجھو گے، اے میرے سردار
!اے صحرا کے اونٹ
تمہارے اندر کا وہ ”انسان“ کب بیدار ہو گا؟

جون 67ء کی شکست نے پاکستانی ادیبوں اور شاعروں کو بھی گہرے رنج و غم میں مبتلا کیا۔ فلسطینی شاعری کے ترجمے کئے اور اُنہیں پاکستانی عوام سے روشناس کروایا۔۔ ان میں اولیت میرے مرحوم دوست محمد کاظم کی تھی جو عربی زبان کے سکالر تھے اور جنہوں نے قرآن پاک کا ایک بے مثال اُردو ترجمہ کیا ہے۔ منو بھائی اور کشور ناہید نے بھی فلسطینی شاعری کے ترجمے کئے۔۔ میں نہ صرف نزار قبانی، عراقی شعراء نازک الملائکہ، بدر شاکر السیاب، توفان، سمیع القاسم، توفیق زیاد کا بے حد مداح تھا اور ایک بین

الاقوامی ادبی کانفرنس کے موقع پر اسلام آباد میں توفیق زیاد سے ملاقات ہوئی اور ہم نے کچھ شامیں اکٹھے بسر کیں جن میں صرف توفیق کی شاعری تھی۔۔ ان کے سوا محمود درویش میرا ازحد پسندیدہ شاعر تھا چنانچہ 75ء میں جب بیروت گیا تو محمد کاظم نے بیروت کے ادبی جریدے ”الآداب“ کے ایڈیٹر سہیل ال ادریس کے نام مجھے ایک خط دیا۔۔ میرا تعارف کروایا اور سفارش کی کہ مجھے محمود درویش سے ملوا دیا جائے۔۔ درویش نہ صرف ”الآداب“ میں باقاعدگی سے چھپتے تھے بلکہ ال ادریس کے ذاتی دوست بھی تھے۔۔ بدقسمتی سے محمود درویش اُن دنوں بیروت میں نہ تھے اس لئے ملاقات ممکن نہ ہو سکی۔۔ اپنے گمشدہ وطن کی چاہت میں شاعری کرنے والے محمود درویش کچھ عرصہ پہلے فوت ہوئے تو اسرائیل نے اجازت دی کہ اُنہیں اُن کے آبائی گاؤں جہاں سے یہودیوں نے اُنہیں نکال دیا تھا اور اُن کے ذہن میں وہ بچپن اب بھی محفوظ تھا، میں دفنا دیا جائے۔۔ اسرائیل کے شدید مخالف ہونے کے باوجود اُن کی کچھ نظمیں اسرائیل کے تعلیمی اداروں کے نصاب میں شامل ہیں۔۔ اُن کی نظم ”ثقافتی کارڈ“ آج بھی عربوں کے دلوں پر ثبت ہے۔

”لِکھو
کہ میں ایک عرب ہوں
اور میرے کارڈ کا نمبر (پناہ گزیں کیمپ میں) پچاس ہزار ہے
میرے آٹھ بچے ہیں
اور نواں۔۔ اس گرما کے بعد آنے والا ہے
کیا تمہیں یہ بات اچھی نہیں لگی!
لِکھو
کہ میں ایک عرب ہوں
تم نے میرے اسلاف کی انگور کی بیلیں چھین لیں
اور وہ قطۂ اراضی بھی جو ہم جوتتے تھے
اور تم نے کچھ بھی نہ چھوڑا میرے لئے
اور میرے ان بیٹوں اور پوتوں کے لئے
سوائے ان چٹانوں کے
کیا ان کو بھی تمہارے یہ حاکم سلب کر لیں گے
اگر ایسا ہے۔۔ تو پھر صفحۂ اول کی پیشانی پر لکھ لو
کہ میں، جو انسانوں سے نفرت نہیں کرتا
نہ کسی پر غلبہ و سطوت چاہتا ہوں
میں جب فاقوں مرتا ہوں
تو اپنے غاصب کا گوشت نوچ کر کھا جاتا ہوں
ڈرو اور حذرکرو!
میرے فاقوں سے
اور میرے طیش و غضب سے

نزار قبانی کی ایک اور نظم ”اسرائیل کی دیواروں پر فدائین کے اشتہارات“ میں سے محض چند مصرعے:

اے آل اسرائیل، ایسا اِترانا بھی کیا۔گھڑی کی سوئیاں اگر آج رُک گئی ہیں۔۔
تو کل یہ پھر سے چل پڑیں گی
زمین کے چھن جانے کا غم نہیں ہے
باز کے پَر بھی تو جھڑ جایا کرتے ہیں
اور اس طویل تشنگی کا بھی خوف نہیں
پانی ہمیشہ نیچے چٹانوں کی تہ میں ہوتا ہے
تم نے فوجوں کو ہرا دیا۔۔ لیکن تم نے
شعور کو ہزیمت نہیں دی
تم نے درختوں کی چوٹیاں کاٹ ڈالیں
مگر۔۔ جڑیں باقی رہ گئی ہیں

ٹیلی ویژن کی سکرین میں سے غزہ کے بچوں کے لاشے چلے آ رہے ہیں اور میرا لِونگ روم بھر گیا ہے، کسی ایک اور بچے کی لاش کی گنجائش نہیں رہی، انہیں کس پھول کا کفن میں دوں کہ یہ جُدا ایسے موسموں میں ہوئے جب درختوں کے ہاتھ خالی ہیں۔ لیکن جڑیں باقی رہ گئی ہیں۔

اسلامی نوادرات اور مُہر رسالتؐ
مستنصر حسین تارڑ
Posted Date : Aug 24, 2014

ایسے نوادرات جو کسی نہ کسی طور آپ کے عقیدے اور مذہب سے منسلک کیے جاتے ہوں اُن کے بارے میں کوئی حتمی رائے دینا اس لیے ممکن نہیں ہے کہ بہت سے پر عقیدت آبگینوں کو ٹھیس لگنے کا خدشہ ہوتا ہے۔ اس لیے جب مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا فلاں فلاں نوادرات واقعی اُن مقدس ہستیوں سے وابستہ ہیں جن کی تعظیم ہمارے لیے ایک مقدس فریضہ ہے تو میں کوئی بھی رائے دینے سے گریز کرتا ہوں۔۔ بہت سے نوادرات ایسے ہوتے ہیں جنہیں ”تخلیق“ کیا جاتا ہے اور جب اگلی نسل تک وہ منتقل ہوتے ہیں تو یقین مستحکم ہونے لگتا ہے اور پھر چار پانچ نسلوں کے بعد اُن تخلیق کردہ نوادرات پر کسی بھی اعتراض کو برداشت نہیں کیا جاتا۔۔ چنانچہ میں اُن چند ایک نوادرات کا تذکرہ کروں گا جنہیں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے لیکن اُن کے اصلی ہونے کے بارے میں اپنی رائے محفوظ رکھوں گا۔۔ ہمارے ہاں بادشاہی مسجد میں کچھ برگزیدہ ہستیوں سے منسوب نوادرات نمائش پر ہیں اور کچھ عرصہ پیشتر اُن میں سے ”نعلین مبارک“ کا ایک جوڑا غائب ہو گیا تھا تو خاصا احتجاج ہوا تھا۔۔ ان نوادرات کی تاریخ پر گمنامی کا پردہ پڑا ہوا ہے، صرف عقیدت ہے جو ان کے آگے سرتسلیم خم کرتی ہے۔

جن زمانوں میں میرے دوست اور ہم قلم طارق محمود جن کے ناول ”اللہ میگھ دے“ نے دھوم مچا رکھی تھی بہاولپور کے کمشنر تھے تو انہوں نے بہاولپور آرٹ کونسل کے خالد اقبال کے توسط سے مجھے اور ”اداس نسلیں“ کے خالق عبداللہ حسین کو ادبی تقریبات کے حوالے سے مدعو کیا۔۔ اس قیام کے دوران ہمیں اُچ شریف جانے کا اتفاق بھی ہوا جس کے بارے بلھے شاہ نے اپنے مرشد کے حوالے سے لکھا
تُسی اُچے، تہاڈی ذات اُچی، تُسی اُچ شریف وچ رہندے،
اَساں قصوری، ساڈھی ذات قصوری، اَسی وچ قصور دے رہندے

وہاں مائی جیوندی کے شاندار نیلے تاج محل مزار پر حاضری کے بعد ہمیں وہاں کے قریشی اور گیلانی حضرات کے خاندانی نوادرات کو بھی دیکھنے کا موقع ملا۔۔ بلکہ گیلانیوں نے ہمیں اپنی شاہانہ رہائش گاہ میں دوپہر کے کھانے کے لیے بھی مدعو کیا اور ہم خوب جانتے تھے کہ یہ توقیر ہم دونوں یعنی میری اور عبداللہ حسین کی نہیں ہو رہی بلکہ کمشنر صاحب بہادر کی ہو رہی ہے۔ اگر ہم دونوں کبھی ذاتی حیثیت میں اُچ آتے تو قریشیوں یا گیلانیوں نے ہمیں پر تکلف کھانا تو کیا کھلانا تھا انہوں نے ہمیں اپنے گھروں کے اندر بھی نہیں آنے دینا تھا۔۔ قریشی حضرات کی سب سے قیمتی متاع خاتون جنت فاطمۃ الظہرا کی چادر ہے جو نہایت شان شوکت سے ایک ڈولی میں پوشیدہ لائی گئی جسے کہار اٹھائے چلے آ رہے تھے۔ چونکہ میں نے کچھ عرصہ انگلستان میں ٹیکسٹائل کے مضمون میں بھی سر کھپایا تھا اس لیے میں کسی حد تک آگاہ تھا کہ کپڑا کیسے بنا جاتا ہے۔ کسی چادر میں نقش و نگار یا حروف نقش کرنے کی مشینیں کب ایجاد ہوئی تھیں اس لیے۔۔ بہر طور اُن کا کہنا تھا کہ یہ چادر خاتون جنت کی ہے تو میں کیسے اُن کے دعوے سے انحراف کر سکتا تھا۔۔ علاوہ ازیں ایک تسبیح کی زیارت کروائی گئی جو اُس مچھلی کی ہڈیوں سے تراشی گئی تھی جس نے حضرت یونس علیہ السلام کو نگل لیا تھا۔ گیلانیوں کے ہاں بھی بہت سارے نہایت دلچسپ نوادرات تھے جن میں کچھ نادر مخطوطے اور اُن میں شامل مختصر مصوری کے نمونے یقیناًقدیم زمانوں کے تھے۔۔ البتہ مسجد نبوی کا ایک اولین جھاڑو دکھایا گیا جو قدرے نیا اور جدید لگتا تھا۔۔ ایک عالی شان تلوار جو بہت بھاری تھی حضرت علیؓ سے منسوب تھی۔ اسے تو اٹھانا بھی دشوار تھا جانے کیسے اسے گھمایا جاتا ہو گا۔۔ میں چونکہ بے حد بھوکا ہو رہا تھا اس لیے میں نے ان ”حقائق“ کو تسلیم کر لیا کہ کہیں مجھے کھانے سے محروم نہ کر دیا جائے۔۔ مجھ میں عقیدت کی جو شدید کمی تھی میں اُس روز بے حد شرمندہ ہوا۔

دمشق کی جامع اُمیّہ جسے مسجد نبوی کے بعد سب سے پُر توقیر اور قابل تعظیم مسجد کہا جاتا ہے، جو ایک زمانے میں کلیسا ہوا کرتی تھی اور اب بھی اُس کے در و دیوار پر کہیں کہیں آپ کو مصوری کے نمونے ملتے ہیں وہاں شیشے کے ایک شوکیس میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کے ہاتھ کی ہڈیا، اُن کا پنجہ۔۔ اور یہ ہڈیاں سونے کے تاروں سے جوڑی گئی ہیں نمائش پر ہے۔ میں نے اس شوکیس پر جھک کر بہت دیر تک اللہ تعالیٰ کے اس برگزیدہ پیغمبر کا پنجہ نظر میں اُتارا۔۔ جنہیں عیسائی جان دی بپٹسٹ کے نام سے پکارتے ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد کی نوید دیتے ہوئے لوگوں کو دریائے اُردن کے پانیوں میں غسل دے کر پوتر کرتے تھے اور عیسائیوں کے ہاں نومولود بچے کو بپتسمہ دینے کا جو تصور ہے وہ حضرت یحییٰ علیہ السلام سے ہی منسوب ہے چونکہ جامع امیّہ ایک زمانے میں شام کا سب سے قدیم کلیسا تھی اور فاروق اعظمؓ نے شام کو مفتوح کرنے کے بعد عیسائیوں سے درخواست کی تھی کہ وہ اس کلیسا کا نصف

حصہ مسلمانوں کو عبادت کرنے کے لیے عطا کر دیں اور ایک مدت ایک ہی عمارت کلیسا بھی تھی اور مسجد بھی۔ مسلمان اور عیسائی ایک ہی چھت تلے عبادت کرتے رہے اور بعد ازاں فاروق اعظم نے زمین کی قیمت ادا کر کے یہاں مسجد کی تعمیر کی تو میرا گمان ہے کہ کم از کم حضرت یحییٰ علیہ السلام کا وہ پنجہ واقعی جنیوئن ہو سکتا ہے ورنہ اتنی مدت سے وہ شام کے سب سے قدیم کلیسا میں محفوظ نہ ہوتا۔ سری نگر کے حضرت بل کے بارے میں بھی کسی حد تک تیقن سے کہا جا سکتا ہے کہ وہاں رسول اللہؐ کا موئے مبارک محفوظ ہے۔
میں نہایت آسانی سے ڈیڑھ دو سو صفحات پر مشتمل مذہبی نوادرات کے بارے میں ایک کتاب لکھ سکتا ہوں لیکن جان کی امان پانے کے لیے مختصراً عرض کرتا ہوں کہ آبگینوں کو بے وجہ گھر بیٹھے ٹھیس لگ جاتی ہے۔ صرف یہ عرض کرتا ہوں کہ اگر دنیا بھر میں اسلام اور اسلامی تاریخ کے حوالے سے جو نوادرات محفوظ ہیں، جو جینوئن ہو سکتے ہیں وہ استنبول کے ٹوپ کاپی عجائب گھر میں نمائش پر ہیں۔۔۔ اور وہاں کیا کیا نہیں ہے۔۔۔ اگر مُہر رسالت محفوظ ہے جو ثبت ہوئی رسول اللہؐ کے روانہ کردہ ہر خط پر ۔۔۔ جس کا نقش ہمارے دلوں پر کُھدا ہوا ہے تو۔۔۔ (جاری ہے)

مستنصر حسین تارڑ
« کالم
مہنگائی اور گھوڑے
By DAILY AAJ
- Sun Aug 24, 2:05 pm

میں ایک ایسی محفل میں شریک تھا جہاں پہلے تو دنیا جہان کے موضوع زیر بحث آئے... کہ کار کا فلاں ماڈل خریدا ہے تو اسکے ڈیش بورڈ پر ایک سکرین ہے' اگر آپ کار کو بیک کر رہے ہیں تو ایک کیمرہ آن ہوجاتا ہے اور آپ کو عقب کا وہ منظر دکھانے لگتا ہے جس میں آپ کار کو بیک کر رہے ہیں چنانچہ حادثے کا امکان کم ہو جاتا ہے...اس بیان کے بعد وہاں بیٹھے ہوئے سات آٹھ لوگ شدید احساس کمتری میں مبتلا ہوگئے کہ ان کی کاروں میں یہ سہولت موجود نہیں اور وہ سوچنے لگے کہ وہ اپنی پہلی فرصت میں ایک ایسی کار حاصل کرلیں گے جسکے ڈیش بورڈ پر ایک سکرین پر عقب کا منظر دیکھا جا سکتا ہو...اس کے بعد ایک کاروباری دوست کہنے لگے...یار اس مرتبہ تو لندن میں بھی گرمی نے پیچھا نہیں چھوڑا...وہاں بھی پنکھے چل رہے تھے' وہاں سے سوئٹزر لینڈ اس خیال سے چلا گیا کہ وہاں موسم بہتر ہوگا..شام تو خوشگوار ہو جاتی تھی ...لیکن دن کے وقت دھوپ تیز ہو جاتی تھی اور پسینے چھوٹ جاتے تھے
اس پر ایک اور صاحب جن کا پٹرول پمپ ہے کہنے لگے" یہ لندن اور یورپ وغیرہ تو کسی کام کے نہیں...بھئی امریکہ جاؤ وہاں موسم مینبہت وارئٹی ہے...فلوریڈا پسند نہ آئے تو کیلے فورنیا چلے جاؤ..شکاگو میں موسم بہت خوشگوار رہتا ہے... ان بیانات کے بعد محفل میں شریک وہ لوگ جو اتنے قدامت پسند تھے کہ گرمیوں میں ہمیشہ یورپ جاتے تھے اگلے برس امریکہ جانے کے بارے میں سوچنے لگے اور ظاہر ہے انہیں بھی احساس کمتری ہوگیا...گفتگو نے ایک نیا رخ اختیار کیا اورلاہور کی ٹریفک زیر بحث آگئی...یار یہ جو کلمہ چوک ہے یہاں ہمیشہ ٹریفک بلاک ہوتی ہے...آج میں نے ڈیک پر انگریزی گانوں کی پوری کیسٹ سن لی تب جاکر ٹریفک نے حرکت کی اور میں ڈیڑھ گھنٹے میں شہر پہنچا...وہاں پر پارکنگ کا مسئلہ درپیش تھا...بڑی مشکل سے کار کے لئے جگہ ملی...آپ کا ڈرائیور چھٹی پر تھا...
ان دنوں ڈرائیوروں کا یہی فائدہ ہے کہ آپ کار سے نکل کر چلے جاتے ہو اور وہ پارکنگ تلاش کرتا رہتا ہے...ڈرائیور چھٹی پر نہیں...بیٹی نے اپنی ایک دوست کے ہاں جانا تھا تو ڈرائیور کو وہ لے گئی' اس کا مطلب ہے کہ آپ کے پاس دو ڈرائیور نہیں ہیں...یار ان دنوں ایک ڈرائیور سے تو کام نہیں چلتا...ایک ڈرائیور تو بچونکو درکار ہوتا ہے اسلئے یہ صرف دوسرا ڈرائیور ہے جو آپکے کام آتا ہے...لیکن یہ ڈرائیور لوگ چھٹیاں بہت کرتے ہیں' کبھی ماں بیمار ہو جاتی ہے تو کبھی بھائی کا حادثہ ہو جاتا ہے...پتہ نہیں ان لوگوں کی مائیں ہمیشہ

کیوں بیمار رہتی ہیں اور بھائیوں کے حادثے کیوں ہوتے رہتے ہیں...میرا خیال ہے کہ ایک تیسرا ڈرائیور رکھ لوں اگرچہ میں افورڈ نہیں کر سکتا...لیکن کیا کریں مجبوری ہے...اب جن حضرات کے پاس صرف ایک ڈرائیور تھا وہ بغلیں جھانکنے لگے اور ذرا شرمندہ نظر آنے لگے..." ٹریفک کا مسئلہ تو اتنا خوفناک ہو چکاہے کہ میں سوچ رہا ہوں کہ ایک سائیکل خرید لوں...

کار کی نسبت تو سائیکل زیادہ بہتر ہے...نہ پارکنگ کا مسئلہ او نہ پٹرول کا...آپ جانتے ہیں کہ یہ ہالینڈ اور ڈنمارک وغیرہ میں تو بیشتر بلکہ بڑے بڑے لوگ بھی سائیکل پر دفتر آتے جاتے ہیں"۔"چھوڑیئے جناب وہ تو مہذب معاشرے ہیں ہم ان کی ہمسری نہیں کر سکتے...میں سائیکل پر گھر سے نکلوں تو محلے والے کہیں گے کہ شیخ صاحب شاید دیوالیہ ہوگئے ہیں...اور پھر سائیکل چلانی بھی تو بھول گئی ہے اس کیلئے بھی ایک ڈرائیور رکھنا پڑے گا..." اس پر حاضرین نہایت احتیاط سے ہنستے ہیں...بہتر یہ ہے کہ آپ ایک چھوٹی کار خرید لیں... ٹریفک کے ہجوم میں سے آسانی سے نکل جاتی ہے اور پارکنگ کامسئلہ بھی نہیں ہوتا۔چھوٹی کاریں تو ہیں دو تین...لیکن انہیں بچے استعمال کرتے ہیں یا پھر ملازم سودا سلف لانے کیلئے لے جاتے ہیں" آپ کے ملازم کارپر سودا سلف لینے جاتے ہیں"۔" جی ہاں اس میں میری بہت بچت ہوتی ہے ۔

سائیکل پر جاتے ہیں تو سارا دن ضائع کر کے آجاتے ہیں...کار پر جاتے ہیں تو ایک دو گھنٹے میں لوٹ آتے ہیں...پھل فروٹ کی خریداری کیلئے ذرا دور جانا پڑتا ہے...اور ہاں میراخیال ہے کہ پھل بہت مہنگا ہوگیا ہے...ملازم بزار کا نوٹ لے کر جاتا ہے اور چند لفافے اٹھائے واپس آجاتا ہے ... اب انسان کیا کرے ... "اب جن حضرات کی صرف دو دو کاریں تھیں وہ بہت آزردہ ہوگئے...اور جو اپنے ملازم کو کار پر سودا سلف لانے کی بجائے سائیکل پر بھیجتے تھے انہیں احساس کمتری ہوگیا...چنانچہ انہوں نے فوری طور پر تائید کی کہ انہیں بھی خدشہ ہے کہ پھل بہت مہنگا ہوگیا ہے۔

"...مہنگائی نے تو جینا حرام کر دیا ہے "

ہاں جی...اور گھوڑے بھی بہت مہنگے ہوگئے ہیں..." ایک باہر کے پڑھے ہوئے بزنس مین نے نہایت " افسردگی سے کہا...

"گھوڑے؟... آپ گھوڑوں کا کیا کرتے ہیں؟ "

وہ بزنس مین ہنسنے لگے" میں ریڑھا چلاتا ہوں اس کیلئے گھوڑا تو چاہئے...اور چونکہ میرے پاس ریڑھونکی ایک فلیٹ ہے اسلئے مجھے بہت سے گھوڑے درکار ہوتے ہیں... سب لوگ بہت محظوظ ہوئے سوائے اس شخص کے جس نے پوچھا تھا کہ آپ گھوڑوں کا کیا کرتے ہیں تو اس نے محبت کر کے دوبارہ پوچھا کہ واقعی آپ گھوڑوں کا کیا کرتے ہیں...

بھئی میرے دو بچے ایچی سن کالج میں زیر تعلیم ہیں اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ کالج کے سکینڈ ہینڈ " گھوڑوں پر سواری کریں...مجبوری تھی ان کیلئے دو گھوڑے خریدنے پڑے اور وہ بہت مہنگے تھے حالانکہ کوئی عربی گھوڑے نہیں تھے مقامی گوجرانوالہ کے گھوڑے تھے...مہنگائی اتنی ہوگئی ہے کہ گزارہ مشکل سے ہوتا ہے...ہم جیسے مڈل کلاس لوگ کیا کرینگے..."

اس پر ایک صاحب جوبڑی دیر سے چپ بیٹھے تھے اور اس لئے بھی احساس کمتری کاشکار ہوگئے تھے کہ ان کے پاس اپنے ذاتی گھوڑے نہ تھے...انہوں نے کہا" میں نے اخباروں میں پڑھا ہے کہ آٹا بہت مہنگا ہوگیا ہے"

وہی گھوڑوں والے صاحب کہنے لگے...آپ آٹے کی بات کرتے ہیں' پیزا بھی بہت مہنگا ہوگیا ہے...

جناب ہمیں اس مسئلے کو سنجیدگی سے لینا چاہئے... اگر آٹا مہنگا ہوگیا ہے تو یہ ہم سب کیلئے لمحۂ فکریہ ہے کہ اس ملک کے غریب عوام کا کیا بنے گا...وہ تو بھوکے مر جائینگے...ہم سب کو سر جوڑ کراس مسئلے کاحل سوچنا چاہئے...

سوچ لیا" گھوڑوں والے صاحب کہنے لگے" آخر ہم نے بھی تو قیامت کے روز جوابدہ ہونا ہے...ہم سے پوچھا جائے گا کہ آٹا مہنگا ہوگیا تو تم نے کیا کیا...چنانچہ آج ہم سب آٹے کا ایک ایک تھیلا خریدتے ہیں اور کسی

کچی آبادی میں جا کر کسی مستحق کو تلاش کر کے اسے پیش کر دیتے ہیں... صرف ایک ایک تھیلا... ہاں... صرف ایک ہی کافی ہے' اب غریبوں کو چوڑ بھی تو نہیں کرنا

30/08/14

س بوتل میں میرے پیغمبرؐ کی خوشبو تھی
مستنصر حسین تارڑ
عثمان تر دیا امام۔۔ یارقند کے سلطان عبدالرحمن کے نیلے تاج محل مقبرے کے رکھوالے۔۔ یہ وہی سفید چوغے

اور سفید ڈاڑھی والے امام تھے جن کے ہاں اس متروک شدہ شاندار مقبرے کی چابی تھی جو اُن کے خاندان میں سینکڑوں برسوں سے محفوظ چلی آتی تھی جنہوں نے اُس یار قندی دوپہر میں ایک سرگوشی کی جس میں فاطمہ کا نام بار بار آتا تھا اور وہ ایغور زبان بولتے تھے اور تب میری چینی ترجمان جوائے نے مجھ سے پوچھا کہ۔۔ کیا تم کسی فاطمہ کو جانتے ہو۔ یہ بوڑھا ایغور مسلمان کہتا ہے کہ میرے پاس کچھ نوادرات ہیں جو میں نے پچھلے کئی برسوں سے کسی کو نہیں دکھائے لیکن آپ ایک پاکستانی ہیں، ایک مسلمان ہیں اور آج تک کوئی پاکستانی سلطان عبدالرحمن کے مقبرے تک نہیں پہنچا تو کیا آپ وہ نوادرات دیکھنا پسند کریں گے۔ اُن میں بی بی فاطمہ کا شادی کا لباس اور ایک پیراہن بھی شامل ہے۔
اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مجھ ایسے رسول اللہؐ کے دیوانے پر کیا گزری ہو گی۔ وہ ایک قدیم ثقافتی یارقندی گھر تھا۔ عثمان تردیا امام نے میرے ہمراہ جو میرے چینی میزبان تھے اُنہیں روک دیا۔ آپ نہیں آ سکتے۔ میں نے خصوصی طور پر چینی مترجم جوائے کی سفارش کی کہ حضرت اس چپٹی ناک والی کے بغیر میں آپ کی گفتگو کو کیسے سمجھ پاؤں گا۔ چنانچہ امام صاحب نے بجھے دل سے اُسے اجازت دے دی۔
امام کے گھر کی منڈیروں پر کبوتروں کے غول غٹر غوں غٹر غوں کرتے تھے۔ میں تفصیل میں جانے سے گریز کرتا ہوں۔ وہ ایک سبز رنگ میں رنگا کمرہ تھا جس کی دیواروں پر قرآن پاک کی آیتیں نقش تھیں، خانہ کعبہ اور روضۂ رسول کی تصویریں آویزاں تھیں۔
عثمان تردیا امام نے ایک گٹھڑی کھولی۔۔ اُس میں ایک شوخ رنگوں کا قدیم پیراہن تھا۔ یہ خاتون جنت کی شادی کا جوڑا ہے اور یہ وہ لبادہ ہے جو وہ اکثر پہنتی تھیں۔۔ اور یہ کمر کے گرد باندھنے والا وہ پہناوا ہے جس میں حضرت امام حسن اور امام حسین جب بچے تھے خاتون جنت اُنہیں اپنی کمر کے گرد باندھے رکھتی تھیں۔ چاندی کے ایک مرصع صندوق میں حضرت عبدالقادر جیلانی کی ٹوپی تھی اور آخر میں جب کہ وہاں موجود سب لوگ زیر لب درود پڑھتے تھے عثمان امام نے خالص سونے سے ڈھکے ہوئے ایک صندوقچے میں سے ایک خالی بوتل برآمد کی۔۔ آج سے بیس برس پیشتر تک اس بوتل میں رسول اللہؐ کی ریش مبارک کے نوبال محفوظ تھے۔۔ اور پھر وہ چوری ہو گئے۔۔ پر اس بوتل میں کبھی ہمارے پیغمبر کی ریش کے نوبال محفوظ تھے۔
ہمارے یار قندی میزبان طور سم نے اُس خالی بوتل کا ڈھکنا کھول کر اُسے سونگھا اور درود شریف پڑھنے لگا۔
میں نے بھی اُس کی پیروی کی۔ اُس خالی بوتل کے منہ پر ناک رکھ کر ایک گہرا سانس لیا۔ اس میں میرے پیغمبرؐ کی خوشبو تھی۔ میں شاید ”غار حرا میں ایک رات“ یا حج کے سفر نامے ”منہ وَل کعبے شریف“ میں تذکرہ کر چکا ہوں کہ جبل اُحد کی اُس غار یا کھوہ کی جانب چڑھتے ہوئے میرا سامنا ایک ایسے شخص سے ہوا تھا جو اُس کھوہ سے نیچے آ رہا تھا اور میں نے اُس سے پوچھا تھا کہ ۔۔ اوپر کیا ہے؟
تو اُس نے ایک سپاٹ چہرے سے کہا تھا ”اوپر ۔۔ میرے پیغمبر کی خوشبو ہے“ تو یہاں چینی ترکستان میں، صحرائے تکلا مکان کے اس صحرائی شہر یارقند کے ایک قدیم گھر میں۔۔ اُس خالی بوتل میں۔۔ میرے پیغمبر کی خوشبو تھی۔ اور یہ خوشبو اس لیے بھی دُھومیں مچاتی تھی کہ ابھی چند روز پیشتر میں ترکستان کے سب سے قدیم گاؤں میں مقامی لوگوں کے عقیدے کے مطابق اصحاب کہف کی غار میں تھا جہاں چین میں تبلیغ کے لیے داخل ہونے والے رسول اللہؐ کے ساتھی دفن تھے۔۔ اور اُن کے ہمراہ چین کا پہلا مسلمان ایک چرواہا دفن تھا اور اُس کے پہلو میں اُس کا کُتا دفن تھا۔ ایک پتھر کی صورت میں۔۔ سنکیانگ کا یہ سفر میرے لیے غیر متوقع حیرتوں کا ایک ایسا جہان ثابت ہوا جس کے وجود کا مجھے گمان بھی نہ تھا۔ کیا میں تصور کر سکتا تھا کہ ترپان انگوروں کے شہر سے کچھ مسافت پر سلگتی سرخ چٹانوں کی اوٹ میں ترکستان کا سب سے قدیم گاؤں ٹویو موجود ہے جو ٹویو ضرار اس لیے کہلاتا ہے کہ وہاں روایت کے مطابق رسول اللہؐ کے

اُن صحابہ کرام کی قبریں ایک غار میں ہیں جو چین میں داخل ہونے والے اولین مبلغین تھے اور جن کے ہاتھوں چین کا ایک چرواہا پہلا مسلمان ہوا تھا۔۔ بے شک میں غار میں داخل ہوا اور دم گھٹنے کے خوف سے تب واپس ہوا جب مجھے غار کے آخر میں روشن چراغ نظر آئے اور دو قبروں کے ہیولے دکھائی دیے اور اُس غار میں بھی میرے پیغمبرؐ کی خوشبو تھی۔۔ اور ہاں ٹویو گاؤں کو بھی میں نے اتفاقاً دریافت کیا۔ سنکیانگ کے ایک کتابچے میں اس کا مختصر حوالہ تھا جس پر میری نظر ٹھہر گئی کہ یہ گاؤں ”لِٹل مکہ“ بھی کہلاتا تھا۔۔ جب کہ عثمان تردیا امام کے آبائی گھر میں جو نوادرات نظر نواز ہوئے اُن کا تو کسی کتاب یا سیاحتی کتابچے میں حوالہ بھی نہ تھا۔ یہ محض اتفاق تھا، نصیب تھا کہ میں ایسے نوادرات دیکھنے کی سعادت حاصل کر رہا تھا جنہیں آج تک کسی اور پاکستانی نے نہیں دیکھا۔ میں ان نوادرات کو بھی حقائق کی کسی کسوٹی پر پرکھوں گا نہیں۔۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ اُس ٹھگنی سی شیشے کی بوتل میں رسول اللہؐ کی ریش مبارک کے بال تھے۔ اُس کے اندر کی خوشبو خبر کرتی تھی۔۔ ویسے بھی جب کبھی رسول اللہؐ اپنے بالوں یا ڈاڑھی میں کنگھی کرتے تو صحابہ کرام اُس کنگھی کے دندانوں میں اٹکے بالوں کو سنبھال لیتے۔ حضرت فاطمہ کی شادی کا جوڑا اور ایک پیراہن قدیم یقیناًتھے پر اتنے قدیم لگتے نہ تھے اگرچہ پیراہن پر آیات قرآنی، تعویذ اور مختلف ہندسے ہاتھ سے لکھے ہوئے تھے۔۔ ان کی زیارت کے بعد جب ان پیراہنوں کو جنہیں پھیلا کر ہمیں دکھایا گیا تھا اور میں نے ان کے ساتھ بصد ادب تصویریں اتروائیں پھر سے تہ کرنے کا وقت آیا تو میمونہ نے سر پر دوپٹہ درست کر کے کہا، میرا خیال ہے کسی غیر محرم کو ان لبادوں کو تہ نہیں کرنا چاہیے۔۔ میں ان کو درست طریقے سے سنبھال کر تہ کرتی ہوں کہ وہی جانتی تھی کہ ایک خاتون کے لبادے کو کس طور تہ در تہ کر کے سنبھالا جاتا ہے۔۔ اور تب بی بی فاطمہ کے پیراہن کو اُس گٹھڑی میں رکھنے سے پیشتر میں نے آخری بار اُس پر ہاتھ رکھا، اُس کی بنت اور کپڑے کو محسوس کیا تو یکدم میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میرے تن بدن میں ایک سنسنی دوڑ گئی، وہی سنسنی جو غار حرا میں ایک رات بسر کرنے کے دوران میں نے تب محسوس کی تھی جب ایک پتھر سے ٹیک لگاتے ہوئے مجھے احساس ہوا تھا کہ رسول اللہؐ نے بھی عین اسی پتھر سے ٹیک لگائی تھی اور اُن کے شانے اس میں ثبت ہوتے تھے۔۔ اور وہ اکیسا خیال تھا۔۔ میں عرض کرتا ہوں۔ (جاری ہے

3/9/14

وہ کون جو لاہا تھا جو میرے پیغمبر کا پیراہن بُنتا تھا

مستنصر حسین تارڑ

تو وہ کیا خیال تھا۔۔ بی بی فاطمہ کے پیراہن پر جب میں نے ہاتھ رکھا، اُس کی بُنّت اور کپڑے کو اپنی ہتھیلی سے مس کرتے ہوئے وہ کیا خیال تھا جو میرے ذہن میں آیا اورمیرے تن بدن میں ایک سنسنی دوڑ گئی۔۔ غار حرا میں بسر کی گئی وہ رات یاد آ گئی کہ تب بھی ایک لمحہ ایسا ہی، ایک وجدان کا، عشق کے جنون کا مجھ پر اترا تھا تو وہ کیا خیال تھا۔۔ میں عرض کرتا ہوں۔

میں نے اپنی ذات اور علم کی کم مائیگی میں، اپنے آپ کو حقیر اور ایک گدا جان کر بس یہی کھوج کی ہے، کہ میرے رسول اللہؐ کے شب و روز کیسے گزرتے تھے، وہ کہاں بیٹھتے تھے، قیام کہاں کرتے تھے، اُن کی مسکراہٹ کیسی تھی، زیب تن کیا کرتے تھے، کون سی خوراک مرغوب تھی اور اُن مقامات کا تعین جہاں اُنہوں نے قیام کیا۔۔ اور اس کھوج کی کچھ تفصیل میں ”غار حرا میں ایک رات“ اور ”مُنہ وَل کعبے شریف“ میں بیان کر چکا ہوں۔۔ طائف کا وہ مقام جہاں دونوں جہانوں کے والی پر بدبختوں نے پتھر برسائے یہاں تک کہ اُن کے پاؤں خون آلود ہو گئے اور وہ وہاں سے ایک ڈھلوان پر سے اتر کر باغ عداس میں انگور کی ایک بیل کے نیچے آ بیٹھے۔۔ میں اُسی راستے پر چلا لیکن میں نے احتیاط کی کہ راستے کے کناروں پر چلا کہ اُس کے درمیان میں میرے رسولؐ کے قدموں کے خون آلود نشان تھے۔ اور جب پراچہ صاحب نے مسجد عداس کے صحن میں اُس مقام کی نشاندہی کی جہاں حضورؐ بیٹھے تھے تو میں نے کیسے اپنے آپ کو اُس مقام پر اپنی پیشانی رکھ دینے سے روکا کہ عشق کی نمائش کرنا مجھے پسند نہیں۔ وہ کنواں جہاں رسول اللہؐ مدینے سے قبا جاتے ہوئے کچھ دیر آرام کرتے تھے اور اُس کنوئیں کے پانیوں سے اُن کی وصیت کے مطابق نہلایا گیا۔ میں نے اُس کنوئیں میں جھانکا۔۔ غرض کہ قیام یار کا جو بھی نشان ملا وہ عشق آتش میں سلگتے ہوئے کے لئے ایک اور کعبہ ہو گیا۔

تو شہر یارقند میں بی بی فاطمہؓ کے پیراہن پر جب میں نے اپنا ہاتھ رکھا، اُس کی بُنّت اور کپڑے کو محسوس کیا تو مجھے ایک خیال آیا۔۔ اُن زمانوں میں مدینہ منورہ میں کچھ جولاہے تو ہوں گے اور اُن میں سے کوئی

ایک جولاہا ہو گا جس نے بی بی فاطمہ کا یہ پیراہن اپنی کھڈّی پر بُنا ہو گا۔۔ اور یقیناًیہ وہی جولاہا ہو گا جو میرے رسول اللہؐ کے لئے بھی کھدّر کا ایک کھردرا لبادہ بُنتا ہو گا۔۔ اگر وہ بیٹی کے لئے پیراہن بناتا تھا تو یقیناًباپ کے لئے بھی تو کوئی لبادہ، کھردرا، کھدّر کا بُنتا ہو گا۔۔ خانوادۂ رسولؐ کا کوئی ایک جولاہا تو ہو گا اور وہ اپنی کھڈّی پر رسول اللہؐ کے لئے بھی تو ایک چوغہ، کُرتہ یا لبادہ تیار کرتا ہو گا تو خیال یہ آیا کہ آخر وہ کون جولاہا تھا۔۔ مدینے کی کسی ویران گلی میں اپنی کھڈّی پر بیٹھا سب زمانوں کے آخری پیغمبر کے لئے۔۔ وہ کون جولاہا تھا جو میرے پیغمبر کے لئے ایسے کُرتے بُنتا تھا جنہوں نے اُس کے ملائم ریشمی بدن کی حیا کو ڈھکنا تھا۔

تو اُس جولاہے کی شکل کیسی تھی۔۔ اور جب وہ میرے رسول اللہؐ کے لئے کوئی پیراہن اپنی کھڈّی پر تیار کرتا تھا تو وہ کیا محسوس کرتا تھا۔۔ اُس کے باطن میں کیسی روشنی تھی۔۔ کیا وہ اس پیراہن کو عرش سے اترنے والی سنہری تاروں سے مزین کرتا تھا۔

اور اُس کی انگلیاں کیسی تھیں۔۔ رسول اللہؐ کا لبادہ بُنتے ہوئے اُس کی انگلیوں کے پپوٹوں میں بھی تو نُور بھر جاتا ہو گا اور وہ جہاں کہیں بھی جاتا ہو گا، مدینے کی گلیوں میں نکلتا ہو گا تو دور سے پہچانا جاتا ہو گا کہ یہ کون جولاہا چلا آتا ہے جس کی انگلیوں کے پپوٹے روشن ہو رہے ہیں، اگر شام میں نکلتا ہے تو اُسے اس روشنی میں راستہ دکھائی دیتا ہے اور اگر رات ہے تو اُس کی انگلیوں کے پپوٹے چراغوں کی مانند روشن ہو رہے ہیں۔ کوئی بھی اُس رات میں نہ بھٹک سکتا ہے اور نہ راستہ گُم کر سکتا ہے کہ ایک جولاہے کی اُنگلیوں کے پپوٹوں میں نُور کے دیئے روشن ہو رہے ہیں۔ تو خیال یہ بھی آیا کہ جیسے درزی کوئی لباس تیار کر کے اُسے گاہک کو پہنا کر ناپ درست کرتے ہیں، آستینوں کی لمبائی ماپتے ہیں، کبھی کم کرتے اور کبھی بڑھاتے ہیں، اگر وہ لباس بدن پر کھلا ہے یا تنگ ہے تو اُسے دوبارہ تھوڑا سا ادھیڑ کر خوش بدن کرتے ہیں تو کیا وہ ایک جولاہا بھی کھدر کا پیراہن کھردرا اپنی کھڈّی پر تیار کر کے رسول اللہؐ کی خدمت میں پیش ہوتا ہو گا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں یہ لباس آپ کے معطّر بدن کے گرد لپیٹ کر یہ دیکھوں تو سہی کہ یہ کیسے آپ پر سجتا ہے اور جب وہ نور بدن اُسے اوڑھتے ہوں گے تو وہ جولاہا اپنی اُنگلیوں سے شِکنوں کو درست کرتا ہو گا۔۔ اور یوں رسول اللہؐ کے بدن پر ہاتھ پھیرتا سلوٹیں درست کرتا ہو گا۔۔ اور اُن کی انگلیوں کے پپوٹوں میں روشن چراغ اُس طاہر بدن سے چھو کر بھڑک اُٹھتے ہوں گے۔

وہ کون جولاہا ہے۔

کہیں وہ شاہ حسین جولاہا تو نہیں تھا۔۔ ’اَساں اندر باہر لال ہے۔۔ سانہوں مُرشد نال پیار ہے۔

جیسے میں اپنے محبوب کی اونٹنی قصویٰ پر قربان ہوتا تھا، اُس کے سوار پر قربان ہونا تو میرے نصیب میں کہاں۔۔ اسی طور میں اس جولاہے پر قربان ہوتا تھا جو مدینے کی کسی گلی میں کھڈّی پر بیٹھا۔۔ کھٹ کھٹ۔۔ ایک تانا بانا بُنتا تھا، ایک پیراہن تیار کرتا تھا اور جس کی اُنگلیوں کے پپوٹوں میں چراغ روشن ہوتے تھے۔ یارقند میں، بی بی فاطمہ سے منسوب اُس لبادے کو جب میں نے چھوا تو مجھے یہی خیال آیا کہ۔۔ جس جولاہے نے میری بی بی فاطمہ کا لباس تیار کیا تھا، اُسی نے میرے رسول اللہؐ کے کھدّر کے کھردرے کُرتے کو اپنی کھڈی پر بُنا ہو گا، تو اے جولاہے۔۔ کبھی تو میرے خوابوں میں آ۔۔ میں تمہاری وہ اُنگلیاں چوم لوں، آنکھوں سے لگاؤں جن سے تم میرے محبوب کا پیراہن بُنا کرتے تھے۔۔ کبھی تو میرے خوابوں میں آ۔۔ اے جولاہے!

سعید بٹ اور گمشدہ اُلّو

مستنصر حسین تارڑ

Posted Date : 07/09/2014In

صبح کی سیر میں جو میرے بہت سے ساتھی ہیں وہ سب کے سب نہایت دلچسپ اور متنوع کردار ہیں۔ اُن کی خصلتیں، ذوق جمال، مذہبی نظریات، کاروبار اور اخلاقیات کے پیمانے الگ الگ ہیں۔ ایک ادیب کی حیثیت سے وہ میرے مشاہدے کا سامان بن کر مجھے تخلیق پر ابھارتے ہیں۔ میں ابھی صرف سعید بٹ کے حوالے سے بات کروں گا اگرچہ وہ ان دنوں نہایت ملال کی کیفیت میں ہے کہ سیاست کے منظر پر گلو بٹ، بلو بٹ اور پومی بٹ کے درخشندہ اور پرامن ظہور کے بعد وہ نہایت سنجیدگی سے اپنے بٹ ہونے سے منحرف ہو جانے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ بقول اُس کے مصیبت یہ ہے کہ وہ اپنا نام تبدیل کر کے چودھری بھی نہیں ہو سکتا کہ گجرات کے چودھری ذہن میں آجاتے ہیں۔۔ ارائیں ہو جانے پر اُسے ضیاء الحق کی مونچھیں تنگ کرنے لگتی ہیں۔ میاں ہو جائے تو شریفوں کے پلّے پڑ جاتا ہے۔ سیدہو جانے سے بھی اُسے ملتان کے خدشات کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ غریب کیا کرے۔ ویسے اُس کا کہنا ہے کہ گلو بٹ پوری قوم کا محسن ہے۔

اُس نے آسانی یہ پیدا کر دی ہے کہ بجائے کسی سیاست دان کو برا بھلا کہنے کے، نامناسب زبان استعمال کرنے کے آپ صرف یہ کہہ دیتے ہیں کہ وہ تو گلو بٹ ہے تو گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیتے ہیں۔ سعید بٹ چھ روز تک مسلسل ناقابل برداشت رہتا ہے کہ اُسے مسلسل ، بے وجہ اور بے بہا لا یعنی باتیں کرنے کا عارضہ لاحق ہے لیکن ساتویں روز وہ کوئی ایسی بات کر دیتا ہے کہ ہم اُس کی حس مزاح اور باکمال طنز کے مداح ہو کر اُسے برداشت کر لیتے ہیں۔۔۔ اُس کے قریبی دوستوں کا ایک ٹولہ ہے جو اُس کی زبان دانی، چرب زبانی اور مزاح کا دلدادہ ہے۔ ایک بار اُن میں سے چوہدری مدد علی نے اُس پر پھبتی کسی کہ یہ جو تم ہمہ وقت تارڑ صاحب کے ساتھ نتھی ہوتے ہو، اُن کے بے دام غلام ہو چکے ہو اور ہم جانتے ہیں کہ وہ ہمہ وقت تمہاری بے عزتی کرتے ہیں اور اس کے باوجود اُن کے ساتھ ہی سیر کرتے ہو تو سعید بٹ نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔۔۔ تم ایسے کم پڑھے لکھے لوگ بھی تو میری بے عزتی کرتے ہو تو کیا اس سے بہتر نہیں کہ میں تارڑ صاحب سے بے عزتی کروا لوں کہ وہ کم از کم معیاری بے عزتی کرتے ہیں۔ جب کہ تمہاری بے عزتی کا تو کوئی معیار ہی نہیں ہوتا ۔ وہ دن اور آج کا دن سعید بٹ کا یہ سنہری قول زبان زد عام ہے کہ انسان نے بے عزتی کروانی ہو تو کم از کم معیاری بے عزتی کروائے۔

سعید بٹ پاکستان ریلوے میں اچھا بھلا افسر ہے اور اگر کسی دوست نے یکدم کراچی یا پشاور جانا ہو تو نہ صرف اُس کے ٹکٹ کے پیسے خود ادا کرتا ہے بلکہ اکثر اُس کے ہمراہ گاڑی میں سوار ہو کر کراچی یا پشاور چلا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ پھولوں، درختوں، پرندوں اور جانوروں کا عاشق ہے۔ اُس نے متعدد بار معصوم چڑیوں اور بلبلوں کو کووں سے بچایا ہے بلکہ اُس نے ایک زخمی کوے کو گھر لے جا کر اُس کی مرہم پٹی کی اور صحت مند ہونے پر اُسے پارک میں لا کر آزاد کر دیا۔ اسی لیے سیر کے بعد جب ہم ایک مقام پر بیٹھ کر لایعنی گفتگو کرتے ہیں، نہایت غیر اخلاقی لطیفوں کا تبادلہ کرتے ہیں تو سعید بٹ کی کرسی کے گرد شکر گزار کووں کا ایک ہجوم ہوتا ہے۔ ہم ٹریک پر چلتے جا رہے ہیں اور ڈاکٹر انیس اپنے خوبصورت شعر سنا رہے ہیں یا میں اسلامی تاریخ میں سے کوئی داستان بیان کر رہا ہوں تو یکدم سعید بٹ گھاس پر لوٹنیاں لگاتی ایک بلی کی جانب اشارہ کر کے کہے گا۔۔۔ تارڑ صاحب آپ کو پتہ ہے کہ یہ بلی کیوں لوٹنیاں لگا رہی ہے۔ اس کا ابھی ابھی کسی بلے کے ساتھ وصال ہوا ہے۔ کچھ عرصہ بعد پھر اشارہ کرے گا۔۔۔ ذرا دیکھیے اُسی بلی نے کتنے ڈھیر سارے بلونگڑوں کو جنم دیا ہے۔ اگر کسی بوٹے کی ٹہنی ٹوٹ گئی ہے تو سعید بٹ نہایت انہماک سے اُس ٹہنی کے گرد ایک پٹی باندھ دے گا تا کہ وہ پھر سے شجر سے پیوستہ ہو جائے۔ لیکن ایک ”اُلّو اپپی سوڈ“ نے اُسے مزید بدنام کر دیا۔ ماڈل ٹاؤن پارک کے ٹریک کے کنارے ایک قدیم درخت ہے اور یہ سعید بٹ تھا جس نے دریافت کیا کہ اس میں اُلّو بسیرا کرتے ہیں۔ اکثر ہم اُن اُلّوؤں کو اس کی شاخوں میں پوشیدہ دیکھتے تھے اور اُنہیں دیکھ کر جی خوش ہو جاتا تھا۔۔۔ وہ آنکھیں گھماتے گردن کو حرکت دیتے ہمیں دیکھتے اور ہم اُن کو دیکھتے۔۔۔اور یقین کیجیے جس دن کا آغاز ایک اُلّو دیکھنے سے ہو وہ دن بے حد اچھا گزرتا ہے۔

ایک صبح میں اور میری بیگم میمونہ پارک میں داخل ہو رہے تھے کہ اُس نے مجھے پکار کر کہا ”اُلّو“۔۔۔ مجھے بے حد بے عزتی محسوس ہوئی کہ چلو گھر میں تو ٹھیک ہے لیکن بیگم برسرعام مجھے اُلّو کہہ رہی ہے تو میں نے نہایت خشمگیں ہو کر کہا ”بیگم۔۔۔ کچھ تو لحاظ کرو۔۔۔ مجھے کیا کہہ رہی ہو“ تو اُس نے مجھ سے زیادہ خشمگیں ہو کر کہا ”تمہیں نہیں کہہ رہی۔۔۔ دیکھ تو سہی گلاب کی ان جھاڑیوں میں ایک اُلّو بیٹھا ہے، بیمار لگتا ہے“ اور واقعی اُن جھاڑیوں میں سچ مچ کا ایک اُلّو تھا اور زخمی حالت میں تھا اور ایک بہت بڑی چیل کچھ فاصلے پر بیٹھی اُس پر جھپٹنے کو تھی۔ میں نے اُس چیل کو بہت شُوشُو کیا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اُلّو کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ میں نے فوری طور پر فون پر سعید بٹ سے رابطہ کیا اور وہ اڑتا ہوا چلا آیا۔ اُس نے اُس زخمی اُلّو کو اتنے پیار سے گود میں لیا جیسے وہ اُس کا پہلا بچہ ہو۔۔۔ چیل کے حملے میں اُس کا ایک پر ناکارہ ہو چکا تھا اور اُس کی آنکھیں نقاہت سے بند ہو رہی تھیں۔ سعید بٹ نے پہلے تو اس کی چونچ کھول کر پانی کے کچھ قطرے اُس کے حلق میں ٹپکائے، اُسے گھر لے گیا۔۔۔ اپنے قصائی سے قیمہ لا کر اُسے کھلایا اور پھر اُسے وٹیرنری ڈاکٹر کے پاس لے گیا جس نے اُس کے زخمی پر کی مرہم پٹی کی اور پھر ایک سانحہ ہو گیا۔۔۔ وہاں ایک نوجوان تھا جو اپنی بلی کے علاج کے لیے ڈاکٹر سے مشورہ کر رہا تھا۔ بلی کو نیند نہیں آتی تھی۔۔۔ اُلّو کو دیکھ کر وہ نوجوان اُس پر فدا ہو گیا اور کہنے لگا ”انکل۔۔۔ کیا میں اسے چھو لوں۔۔۔ آپ اجازت دیں تو صرف ایک دو روز کے لیے اپنے گھر لے جاؤں۔۔۔ میں اسے خوب کھلاؤں پلاؤں گا، اس کی بلائیں لوں گا، پھر واپس کر دوں گا، میں ماڈل ٹاؤن کے جے بلاک میں کوٹھی نمبر فلاں میں رہتا ہوں“۔

سعید بٹ کا کہنا تھا کہ وہ نوجوان بے حد کیوٹ تھا۔

ہمیں جب اطلاع ملی تو ہم نے کہا ”اُلّو گیا۔۔۔ اگر اُلّو جاتا ہے تو واپس نہیں آتا۔۔“ سعید بٹ اُس کیوٹ نوجوان کے بتائے ہوئے ایڈریس پر گیا تو معلوم ہوا کہ وہاں اُس نام کا کوئی نوجوان نہیں رہتا۔ ہمارا اُلّو چوری ہو گیا تھا۔

سعید بٹ ہم سے منہ چھپائے پھرتا ہے بار بار کہتا ہے کہ تارڑ صاحب وہ نوجوان بے حد کیوٹ تھا، مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ اُلّو چور ہے۔۔۔ اُس نے کسی جادو ٹونے کرنے والے کے ہاتھوں وہ اُلّو لاکھوں میں فروخت کر دیا ہو کہ ایسے ٹونوں میں اُلّو کا خون، اُس کی آنکھیں اور خاص طور پر اُس کا دل استعمال کیا جاتا ہے۔
اُدھر اس اُلّو کی دریافت پر میں اپنے پوتے یاشار سے وعدہ کر بیٹھا کہ بیٹے تم ہمیشہ پوچھتے ہو کہ دادا آپ مجھے اُلّو کہتے ہو تو کیوں کہتے ہو تو میں تمہیں دکھاؤں گا کہ ایک اُلّو کیا ہوتا ہے اور وہ مجھ سے روزانہ پوچھتا ہے کہ دادا۔۔ اُلّو کہاں ہے۔
ہم سب سیر کرنے کے بعد جب ایک مقام پر آرام کرنے کے لیے بیٹھتے ہیں تو ایک سوگواری کی فضا ہوتی ہے۔ ہمیں اپنا اُلّو بہت یاد آتا ہے۔ اگروہ کیوٹ نوجوان یہ کالم پڑھے تو اُس سے درخواست ہے کہ پلیز ہمارا تو ہمیں واپس کر دے۔۔۔ ہم بے حد اداس ہیں۔
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے۔۔۔’
ایک اُلّو کا سوال ہے!

آپ کون سی زبان میں خواب دیکھتے ہیں؟
مستنصر حسین تارڑ
Posted Date : 10/09/2014
مجھ سے اکثر سوال کیا جاتا ہے کہ میں نے اپنے حج کے سفرنامے کا پنجابی ”عنوان“ مُنہ وَل کعبے شریف“ کیوں رکھا جبکہ یہ اردو زبان میں ہے تو میری ایک سادہ سی توجیہہ ہے کہ جب میری نانی جان میرے لئے نماز دوہراتی تھیں تو اسی طور پنجابی میں نیت کرتی تھیں کہ فلاں نماز، اتنی رکعتیں اور مُنہ وَل کعبے شریف۔۔۔ میں صدق دل سے یہ سمجھتا ہوں کہ نیت ہمیشہ مادری زبان میں ہی نیت ہوتی ہے۔۔۔ یوں بھی ہمارے بدن کی حسیات اور دماغی ردعمل صرف مادری زبان کے ساتھ ٹیون ہوتے ہیں اور یہ ایک قدرتی امر ہے۔۔۔ کہا جاتا ہے کہ ایک لکھنوی صاحب کی دوستی ایک ایسے شخص کے ساتھ تھی جس کو اردو پر اتنا عبور تھا کہ اہل زبان کو بھی کیا ہو گا لیکن لکھنوی صاحب کو شک تھا کہ موصوف ٹھیٹھ پنجابی ہیں لیکن اپنے زبان و بیاں اور لہجے سے کہیں پکڑے نہیں جاتے تھے تو ایک روز لکھنوی میاں نے اُن کے جوتے میں ایک بھڑ پوشیدہ کر دی، اُنہوں نے جوتے پہنے اور یکدم بھڑ نے کاٹ لیا تو پکار اٹھے ”اوئے تیری میں۔۔۔“ پکڑے گئے۔ میرے ایک سیالکوٹی دوست ہوا کرتے تھے پروفیسر ملک زمرد۔۔۔ کتابیں پڑھنے کا جنون تھا، مال روڈ کے انٹرنیشنل بک ڈپو میں حسب معمول کوئی کتاب انتخاب کر کے پڑھ رہے تھے کہ دل کا دورہ پڑ گیا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ ملک صاحب کو جب ایمبولینس میں ڈالا جا رہا تھا اور وہ سانسوں کی کشمکش میں نڈھال ہوتے تھے تو سر اٹھا کر کہنے لگے ”بھئی وہ کتاب تو میرے ساتھ رکھ دو جو میں پڑھ رہا تھا“۔۔۔ ملک صاحب انگریزی میں نہایت شاندار شاعری کرتے تھے پھر یکدم پنجابی میں شاعری کرنے لگے، میں نے سبب پوچھا تو کہنے لگے ”شاعری اُسی زبان میں کرنی چاہئے جس میں آپ خواب دیکھتے ہیں۔۔۔ میں نے غور کیا کہ میں نے کبھی انگریزی میں کوئی خواب نہیں دیکھا اس لئے اب پنجابی میں شاعری کرتا ہوں“۔
فیض صاحب سے جب پوچھا گیا کہ آپ ایک پنجابی ہیں اور پھر سونے پر سہاگا، ایک جاٹ ہیں تو آپ نے پنجابی میں شاعری کیوں نہیں کی تو انہوں نے کہا کہ ایک تو چلن اردو کا تھا اور اس زبان میں ہمیں سہولت بھی بہت ہے، پوری بند مسلم تہذیب دائرے میں آ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ عین ممکن ہے کہ کوئی ایک مصرع غالب یا میر ایسا سرزد ہو جائے لیکن پنجابی میں بُلّھے شاہ ایسا کوئی مصرعہ تخلیق کرنا تو ناممکن ہے۔۔۔ ویسے انہوں نے چند پنجابی نظمیں بھی لکھیں جو بے حد مقبول ہوئیں۔۔۔ اور مجھے یاد ہے جب انہوں نے اپنے ایک خط میں مجھے لکھا (اور انہوں نے مجھے ایک ہی خط لکھا) کہ آپ کو اپنے ہم عصر ادیب حضرات کی بے جا مخالفت کی شکایت ہے تو ایک جاٹ ہونے کے ناتے سے آپ کو ”شریکوں“ سے نہیں ڈرنا چاہئے۔۔۔
ایک زمانے میں ہمارے بہت سے زعماء فخر کرتے تھے کہ پنجابی ہونے کے باوجود وہ صرف اردو بولتے ہیں اور ہم ان کو دوش نہیں دے سکتے کہ ان کے زمانوں میں اردو برصغیر کے مسلمانوں کا ایک مشترک بندھن تھا، ایک تہذیبی ورثہ تھا۔۔۔ مثلاً اپنے گجرات کے ڈاکٹر سید عبداللہ اور مختار مسعود صاحب، پنجابی کے پاس نہیں پھٹکتے تھے بلکہ جماعت اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد ایک خالص ارائیں پنجابی تو اس حد تک مادری زبان سے گریز کرتے تھے کہ جانے کس آن میں بیان دے دیا کہ پنجابی تو گالیوں کی زبان ہے۔۔۔ اگرچہ میاں صاحب کا اردو لہجہ سراسر پنجابی میں رنگا ہوا تھا۔
ویسے صفِ دشمناں کو خبر ہو کہ ہم بھی کبھی کبھی نماز پڑھ لیتے ہیں تو آخر میں جو دُعا کرتے ہیں، التجا کرتے ہیں، پنجابی میں ہی کرتے ہیں۔
تقریباً پچیس برس پیشتر میں فیئری میڈو سے نانگا پربت کے بیس کیمپ تک گیا اور میرے ہمراہ ایک جرمن

جوڑا تھا، شاید مائیکل اور مشائلہ۔۔ واپسی پر برفباری ہونے لگی اور یکدم ایک پُرخطر پگڈنڈی پر میں پھسلا
اور اگلے لمحے میں ایک گہری برفانی کھائی کے اوپر یوں لٹک رہا تھا کہ مائیکل نے میرا ایک ہاتھ قابو کیا ہوا
تھا اور چیخ رہا تھا ”کِک ود یور رائٹ لیگ اینڈ گریب ود یور لیفٹ ہینڈ“ یعنی اپنی دائیں ٹانگ کی ضرب سے
چٹان میں آسرے کی جگہ بناؤ اور اپنے بائیں ہاتھ سے جو کچھ۔۔ کوئی جھاڑی کوئی پتھر اسے پکڑ لو۔۔ پہلے
تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، برف گرتی تھی اور میں مرنے کی تیاری کر رہا تھا۔۔ پھر میں
نے لیفٹ اور رائٹ کا اردو ترجمہ کیا کہ بائیں اور دائیں اور پھر بہت دیر بعد اس ہدایت پر عمل کیا اور بالآخر اس
نے مجھے اوپر کھینچ لیا اور میں نانگا پربت کے دامن میں جب برف گرتی تھی اس پگڈنڈی پر اپنا سانس
بحال کرتا، جیب میں سے اپنے بچوں کی تصویریں نکال کر دیکھتا کہ شک ہے اب میں انہیں دوبارہ دیکھوں گا
تو میرے ذہن میں ایک خیال آیا کہ اگر مائیکل پنجابی میں مجھ سے کہتا کہ مستنصر۔۔ پہلے سجے تے فیر
کھبے۔۔ تو فوری طور پر میرا بدن اس ہدایت پر عمل کرتا۔۔ مجھے ترجمے کی حاجت نہ ہوتی۔۔ داغستان کے
ملک الشعراء رسول حمزہ توف جو کہ فیض صاحب کے قریبی دوست تھے اُن کا کہنا ہے۔۔ ”میرا داغستان“
میں کہنا ہے کہ میری مادری زبان آوار ہے اگرچہ میں روسی میں شاعری کرتا ہوں اور ہمارے ہاں ایک گالی
ایسی ہے جس پر قتل ہو جاتے ہیں کہ۔۔ جا تواپنی مادری زبان بھول جائے۔۔ اور یاد رہے بقول رسول صرف
ستر ہزار افراد آوار زبان بولتے ہیں۔ رسول حمزہ توف ایک مرتبہ پیرس کے کسی ادبی میلے میں شریک ہوئے
اور ان کی آمد کی خبر پا کر ایک مصور اُن سے ملنے آیا اور کہنے لگا کہ میں بھی داغستان کا ہوں، میری
مادری زبان آوار ہے اور اب ایک مدت سے پیرس میں رہائش رکھتا ہوں۔۔ ایک فرانسیسی خاتون سے شادی کر
کے یہیں کا ہو چکا ہوں۔۔ میں داغستان کے فلاں گاؤں کا رہنے والا ہوں لیکن شاید تیس برس ہو گئے میں
یہاں فرانس میں ہوں۔۔ جانے میری ماں زندہ ہے یا مر چکی ہے۔۔ رسول حمزہ توف نے داغستان واپسی پر
اس کی ماں کو تلاش کر لیا اور اس بڑھیا کو علم ہی نہ تھا کہ اس کا بیٹا ابھی تک زندہ اور فرانس میں خوش
و خرم ہے تو اس نے رو رو کر برا حال کر لیا، رسول سے پوچھتی رہی کہ مجھے بتاؤ کہ اس کے بالوں کی
رنگت کیسی ہے۔۔ اس کے رخسار پر جو تِل تھا کیا اب بھی ہے، اس کے بچے کتنے ہیں اور پھر یکدم اس
“بڑھیا نے پوچھا ”رسول تم نے میرے بیٹے کے ساتھ کتنا وقت گزارا؟
ہم صبح سے شام تک بیٹھے کھاتے پیتے رہے اور داغستان کی باتیں کرتے رہے، رسول نے جواب دیا“۔”
“اورکیا تم یہ تمام عرصہ آوار زبان میں باتیں کرتے رہے؟”
نہیں“ رسول نے کہا ”ہم فرانسیسی میں باتیں کرتے رہے۔۔ وہ آوار زبان بھول چکا ہے“۔”
داغستانی بڑھیا نے اپنے سر پر بندھا رومال کھول کر اپنے چہرے پر کھینچ کر اسے روپوش کر لیا کہ وہاں
روایت ہے کہ جب کسی ماں کو اپنے بیٹے کی موت کی خبر ملتی ہے تو وہ اپنا چہرہ ڈھانپ لیتی ہے۔
رسول۔۔ اگر وہ اپنی مادری زبان بھول چکا ہے تو میرے لئے وہ زندہ نہیں، مر چکا ہے”

ترکی ہی ترکی
مستنصر حسین تارڑ
Posted Date : 17/09/2014
آج کل میں ترکی سے بہت تنگ آیا ہوا ہوں۔۔ ترکی نے مجھ پر یلغار کی ہوئی ہے۔ اب ساری عرب دنیا خاموش
ہے بلکہ خوش ہے کہ اسرائیل غزہ کے بچوں کو ہلاک کر رہا ہے۔ سینکڑوں کی تعداد میں مار رہا ہے اور مجھے
وہ زمانے یاد آ رہے ہیں جب فرعون کے نجومیوں نے اسے اطلاع کی کہ تمہاری رعایا بنی اسرائیل میں ایک
پہلا بچہ پیدا ہونے کو ہے جو کل تمہاری سلطنت کو ملیامیٹ کر دے گا تو فرعون حکم دیتا ہے کہ بنی
اسرائیل کے ہر خاندان کے بڑے بچے کو ہلاک کر دیا جائے اور پھر گلیوں، بازاروں میں معصوم بچوں کے لاشے
تڑپنے لگے اس لئے حضرت موسیٰؑ کی والدہ نے انہیں ایک پالنے میں لٹا کر نیل کی لہروں کے حوالے کر دیا
تھا اور آج ذرا ملاحظہ کیجئے کہ یہ بنو اسرائیل ہیں جو فرعون کے جانشین ہو کر غزہ کے بچوں کو ہلاک کر
رہے ہیں۔ شاید انہیں بھی کسی نجومی نے بتایا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بچہ ہو گا جو بڑا ہو کر تمہاری
باسٹرڈ ایمپائر کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا اور وہ بے شک سب کو قتل کر دیں لیکن ان میں سے جس نے
ایک اور موسیٰؑ ہونا ہے اور ایسا لکھا جا چکا ہے کہ ہونا ہے تو وہ ایک بچہ اللہ کی عافیت میں رہے گا، ان کے
جہازوں اور ٹینکوں کی یلغار سے بچ نکلے گا ار ایک روز ان جدید فرعونوں سے ٹکر لے گا اور ان کی سلطنت
کو پاش پاش کر دے گا۔۔ تو جب ساری دنیا خاموش ہے، عرب دنیا خوش ہے تو یہ صرف ترکی کا طیب اردگان
ہے جو غزہ کے قتل عام پر احتجاج کر رہا ہے اس کے باوجود کہ وہ امریکہ کا حلیف ہے۔ اور یہ ترکی تھا دنیا کا
پہلا ملک تھا جس نے اسرائیلی ریاست کو تسلیم کیا کہ یہ عرب تھے جنہوں نے انگریزوں کی مدد سے
سلطنت عثمانیہ کو زوال آشنا کیا اور اس کے باوجود یہ ترکی ہے جو غزہ کے محصور مجبور لوگوں کے لئے

خوراک، دوائیوں اور رضاکاروں سے لدا ایک بحری جہاز روانہ کرتا ہے جس پر اسرائیلی حملہ آور ہو کر متعدد ترکوں کو ہلاک کر دیتے ہیں اور اسرائیل تاریخ میں پہلی بار ترکی سے معافیاں مانگتا پھرتا ہے۔۔ ایک پہلو تو یہ ہے ترکی کی تصویر کا اور میں جو تنگ آیا ہوں ہوں ترکی سے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میرا چھوٹا بیٹا سمیر اپنے خاندان سمیت دو ہفتوں کے لئے ترکی کے طول و عرض میں آوارگی میں مبتلا رہا، اس لئے بھی کہ میرے سفرناموں ”نکلے تری تلاش میں“ اور ”خانہ بدوش“ میں ترکی بہت ہے اور وہ ابّا جی کے نقش قدم پر سفر کرنا چاہتا تھا اور اس لئے بھی کہ اس کے بڑے بیٹے کا نام یاشار ہے جو ایک ترک نام ہے اور یہ کارستانی بھی میری ہے کہ میں نے اپنے پہلے پوتے کا نام اپنے پسندیدہ ترک ناول نگار یاشار کمال کے نام پر رکھا۔۔ سمیر نے ایک دو روزے ترکی میں رکھے اور سلطان احمد چوک میں براجمان سینکڑوں ترک خاندانوں کے ساتھ افطار کئے اور پھر عید کی نماز نیلی مسجد میں ادا کی، حضرت ایوب انصاری کے مزار پر حاضری دی تو ان دنوں میرا پوتا طلحہ مجھ سے پوچھتا ہے۔۔ دادا آپ نے نیلی مسجد میں نماز پڑھی تھی، میں نے پڑھی تھی۔ دادا، آپ انطالیہ گئے تھے سمندر میں نہائے تھے۔۔ میں گیا تھا۔۔ دادا آپ نے۔۔ چنانچہ میں ان دنوں ترکی سے بہت تنگ آیا ہوا ہوں۔۔ گھر میں ہر جانب ترکی ترکی ہو رہی ہے اور تازہ ترین افتاد یہ آن پڑی ہے کہ میری بیگم میمونہ نے بھی اعلان کر دیا ہے کہ میں اگلے مہینے خواتین کے ایک گروپ کے ساتھ ترکی جا رہی ہوں۔ بیگم ایک زمانے میں نہایت گھریلو نوعیت کی پیسے پیسے کا حساب رکھنے والی، بچوں کی بہتری کی خاطر اپنی ضرورتوں کو کم کرنے والی خاتون ہوا کرتی تھی۔۔ اور پھر جب بچے برسرروزگار ہو گئے، بیاہے گئے، اپنے اپنے گھروں میں ماشاءاللہ خوش اور آسودہ زندگی گزارنے لگے تو بیگم نے یکدم علم بغاوت بلند کر دیا کہ اب میں دنیا دیکھوں گی۔۔ تم تو دیکھ چکے اب میں دیکھوں گی چنانچہ وہ ان دنوں پاکستان میں کم ہوتی ہے۔۔ چین سوئٹزرلینڈ، آسٹریلیا وغیرہ میں زیادہ ہوتی ہے اور اب وہ ترکی جا رہی ہے تو میں اگر ترکی سے تنگ نہ آؤں تو اور کیا کروں۔۔ اور پھر وہ کیا محاورہ ہے کہ مرے کو مارے شاہ مدار۔۔ اس دوران فرخ سہیل گوئندی کے ترکی کے بارے میں لکھے گئے ”نئی بات“ میں شائع ہون والے کالموں کا مجموعہ ”ترکی ہی ترکی“ ظہور میں آ گیا۔۔ گوئندی گویا میرے لئے ایک شاہ مدار ثابت ہوا، مجھے مار ڈالا۔۔ میں اس کا شکرگزار ہوں کہ وہ ان سفری کالموں میں میرا تذکرہ بھی ایک خاص محبوبیت سے کرتا ہے، اقرار کرتا ہے کہ ”نکلے تری تلاش میں“ نے اسے ترکی کا سفر اختیار کرنے پر مجبور کیا اور اس نے ترک ناول نگار یاشار کمال کو میرے ذریعے دریافت کیا اور اس کا شہرہ آفاق ناول اردو میں ترجمہ کر کے جو کہ ”محمت مائی باک“ تھا یعنی ”محمد میرا عقاب“ شائع کیا اور گوئندی نے مجھے پہلی بار اس حقیقت سے آشنا کیا کہ ترک محمد رسول اللہؐ سے اتنی عقیدت رکھتے ہیں کہ اپنے بچوں کے نام محمدؐ نہیں رکھتے بلکہ محمت رکھتے ہیں تاکہ بے ادبی نہ ہو اور نہ ہی احمد رکھتے ہیں بلکہ احمت پکارتے ہیں۔

گوئندی کا یہ کالمی ترک سفرنامہ ایک تاریخی دستاویز ہے۔۔ بے شک پاکستان میں کوئی اور ایسا ادبی اور سیاسی دانشور نہیں ہے جو ترکی کی سیاسی، نفسیاتی، تاریخی روح میں گوئندی کی مانند اترا ہو۔۔ اس کی نشست و برخواست۔۔ شب و روز اور زندگی کا ہر سانس ترکی میں ہی سانس لیتا ہے۔۔ مجھے گمان ہے کہ کسی پچھلی حیات میں وہ ایک ترک تھا۔۔ اتاترک کے ہریاول دستے میں تھا، گیلی پولی کے معرکے میں انگریزوں کو شکست دینے والی سپاہ میں وہ بھی شامل تھا۔۔ توپوں کے گولوں سے بہرے ہو چکے غازی عصمت انونو کے کانوں میں گوئندی سرگوشیاں کیا کرتا تھا۔۔ ویسے ان دنوں وہ اپنی پُروپار اور پُرکشش لبنانی بیگم ریما کے کانوں میں ہی سرگوشیاں کرتا ہے۔ یہ صرف ریما ہے جس نے گوئندی کے اندر جو خوبصورت اور بے چین روح ہے اسے دریافت کر لیا ہے۔

فرخ سہیل گوئندی میرے ان دوستوں میں سے ہیں جن کے ساتھ سیاسی موضوعات پر گفتگو کرنے پر ” لطف آتا ہے۔۔ ترکی کے بارے میں وہ کسی ترک دانشور سے کم نہیں۔۔ وہ ترکی کی تاریخ، سیاست، ثقافت پر حیرت انگیز گرفت رکھتے ہیں“۔

“بلند ایجوت، سابق وزیراعظم ترکی”

اگر بلند ایجوت ایسا عظیم ترک گوئندی کو اپنا ذاتی دوست قرار دیتا ہے بلکہ کہتا ہے کہ گوئندی میں تمہاری شادی کروں گا اور اسے ایک ترک دانشور قرار دیتا ہے تو اگر ان دنوں میں ترکی سے تنگ آیا ہوا ہوں

خدا نے شجر تخلیق کئے اور انسان نے پنجرے

مستنصر حسین تارڑ

Posted Date : 24/09/2014

ہم پرندوں کی باتیں کر رہے تھے۔۔ حضرت فرید الدین عطار کی کتاب ”منطق الطائر“ یا ”منطق الطیر“ کا تذکر ہ کر رہے تھے اور کامران سلیم کی ”برڈز آف سیالکوٹ“ کے پرندوں کی باتیں کر رہے تھے اور ۔۔آسمانی کتابوں

میں ان پرندوں کے جتنے تذکرے ہیں، دنیا کے مختلف خطوں میں جو حکایتیں، داستانیں اور روایتیں ہیں ان کے حوالوں میں آپ کو شریک کرنا چاہتے تھے۔۔ اور اوّل ذکر آخری کتاب کا، آخری حکم اور آخری نازل شدہ مقدس حروف کا۔
"النمل۔۔ سورہ 16"
کیا وہ پرندوں کو نہیں دیکھتے، فضا میں، آسمانوں کے درمیان توازن قائم رکھے۔۔ انہیں صرف اللہ ہی وہاں " سہارا دیتا ہے"۔
ایک مدت سے بلا سوچے سمجھے ہم "روح کا قفس عنصری سے پرواز کر جانا" بیان کرتے آئے ہیں اور مجھے حیرت ہوئی کہ اس کا منبہ "بھگوت گیتا" ہے جس میں درج ہے کہ۔۔ ہماری روح، ایک پنجرے میں بند پرندے کی مانند پھڑپھڑاتی اور خواہش کرتی ہے کہ وہ آزاد ہو کر وسیع فضا میں پرواز کر جائے"۔
بائبل اور تورات میں بھی پرندے بار بار نمودار ہوتے ہیں۔
حضرت آدم اور بی بی حوّا کی جنت میں "اور ان کے ہمراہ جنت کے پرندے بھی قیام کرتے تھے، وہ شاخوں میں پوشیدہ گیت گاتے تھے"۔
اور پھر خدا نے کہا "پانیوں میں آبی حیات کی نمود ہو جائے اور پرندوں کو زمین سے اوپر آسمانوں کی وسعت میں پرواز کرنے کا اذن دیا جاتا ہے"۔
حضرت سلمان کے گیت میں درج ہے "اور دیکھو کہ موسم سرما بیت گیا ہے، بارشیں ختم ہو گئی ہیں، زمین پر پھول نمودار ہونے لگے ہیں اور فاختہ کی آواز ہماری سرزمین پر سنائی دینے لگی ہے"۔
ایک بگلا آسمانوں میں پرواز کرتا ہوا، ایک فاختہ، ایک چڑیا بھی وقت کی پہچان رکھتے ہیں لیکن لوگ اپنے " خالق کے اصولوں کونہیں پہچانتے"۔
کیا یہ تمہاری فہم میں ہے کہ ایک عقاب اپنے پر پھیلا کر جنوب کی جانب پرواز کرتا ہے۔ کیا یہ تمہارے حکم " سے ہے کہ ایک شاہین ہمیشہ اپنا گھونسلا بلند جگہوں پر تعمیر کرتا ہے۔۔ چٹانوں میں وہ قیام کرتا ہے، اپنا گھر بناتا ہے اور وہاں سے اپنے شکار پر نظر رکھتا ہے، اُس کی آنکھیں دور دور تک دیکھتی ہیں، اُس کے بچے خون پیتے ہیں اور جہاں کہیں لوگ قتل کئے جاتے ہیں وہاں وہ ہوتا ہے۔
لیکن۔۔ فاختہ کو کوئی ایسا مقام نہ ملا جہاں وہ اتر سکے اور وہ واپس نوح کے پاس لوٹ آئی کیونکہ پانی " ابھی تک زمین کے چہرے کو ڈھانپے ہوئے تھے۔۔ چنانچہ نوح نے اُسے اپنے ہاتھوں پر اترنے دیا اور اُسے کشتی کے اندر لے آیا"۔
اور یہ تو مقدس کتابوں کے حوالے تھے پرندوں کے بارے میں۔۔ تو ذرا ان کے زمینی حوالے بھی دیکھتے ہیں۔۔ اور میں گریز کروں گا اور اپنی کسی بھی تحریر کے پرندوں کا کچھ ذکر نہ کروں گا۔
ایک پرندہ اس لئے نہیں گاتا کیونکہ اُس کے پاس کسی مسئلے کا حل ہوتا ہے، وہ اس لئے گاتا ہے کہ اُس " (کے پاس ایک گیت ہوتا ہے (چینی کہاوت
خدا پرندوں سے محبت کرتا تھا تو اُس نے اُن کے لئے درخت تخلیق کئے۔۔ انسانوں نے پرندوں سے محبت " (کی تو اُن کے لئے پنجرے بنائے" (جیک ڈیوال
(ہر پرندہ اپنے گلے سے گاتا ہے" (ہنرک اِبسن۔۔ ڈرامہ نگار"
"ایک پرندہ تین چیزوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ پَر، پرواز اور گیت۔۔"
اگر پرندے پرواز کر سکتے ہیں اور ہم نہیں کر سکتے صرف اس لئے کہ وہ پختہ ایمان رکھتے ہیں۔۔ کہ ایمان " رکھنے سے ہی آپ کے پَر نکلتے ہیں"۔
آپ ایک پرندے کو پنجرے میں بند تو کر سکتے ہیں لیکن اُسے گیت گانے پر مجبور نہیں کر سکتے" (ایک " (یہودی کہاوت
(ایک عقاب کو اُڑنے کے لئے تعلیم درکار نہیں" (ایک یونانی محاورہ"
(ایک پرندہ اپنے پروں سے پہچانا جاتا ہے" (ایک یہودی کہاوت"
(ایک پرندہ اپنے پَر اس لئے نہیں تبدیل کرتا کہ موسم تبدیل ہو گیا ہے" (ایک نائیجیرین کہاوت"
(ایک پرندہ اپنی پرواز سے پہچانا جاتا ہے" (روسی کہاوت"
سب سے خوبصورت موسم وہ ہے جس میں پرندے نغمہ سرا ہوتے ہیں"۔"
اگر ایک پرندہ زمین پر چل رہا ہو تو بھی آپ اُس کے پر محسوس کرسکتے ہیں"۔"
بہترین پرندے صرف وہ نہیں ہوتے جن کے بال و پر شاندار ہوتے ہیں"۔"
اس برس کے پرندوں کو پچھلے برس کے گھونسلوں میں سے تلاش نہ کرو"۔"
سروانتس)۔)
یہ کامران سلیم کی "برڈز آف سیالکوٹ" کا کمال ہے کہ آج میرے کالموں میں برنسل اور قومیت کے پرندے

پرواز کرتے ہیں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کبھی وہ زمانہ آئے گا جب وہ سب پرندے جنہیں کامران نے اپنی شاہکار تصویروں میں محفوظ کر کے ہمیشہ کے لئے امر کر دیا ہے وہ سب چلے آئیں گے، اُس کے آس پاس بیٹھ جائیں گے، گیت گائیں گے اوراعلان کریں گے کہ تم ہی ہمارا آخری سچ ہو۔ سیالکوٹ کے علامہ اقبال نے ملت اسلامیہ میں ایک نئی روح پھونکی، فیض نے اٹھو میری دنیا کے مزدوروں کو جگا دو کا نعرہ بلند کیا اور کامران نے سیالکوٹ کے پرندوں کو نئے آسمانوں سے روشناس کروایا۔

بہشتی ہو جانے کے مزے
مستنصر حسین تارڑ
روزنامہ نئی بات
Posted Date : 28/09/2014

اگر کوئی شخص ادھیڑ عمری کے باعث کسی حد تک بہرا ہو جائے، اونچا سننے لگے تو ادھر شہروں میں تو کہا جاتا ہے کہ موصوف کی سماعت میں خلل آ گیا ہے لیکن گاؤں کے لوگ کہا کرتے تھے کہ فلاں بہشتی ہو گیا ہے۔۔۔ تو میں بھی کچھ عرصے سے بہشتی ہو چکا ہوں اور یقین کیجیے یہیں اس دنیا میں بہشتی ہو جانا ایک عظیم نعمت ہے۔ اس لیے بھی کہ کل کیا جانے ہمارے بارے میں کیا فیصلہ ہو، غالب امکان یہی ہے کہ جیسی بے راہ رو زندگی ہم نے گزاری ہے اس کے نتیجے میں فیصلہ شاید بہشت کا نہ ہو۔ ویسے تو زندگی زیادہ بے راہ رو بھی نہیں گزری ہے کہ فوری طور پر جہنم کی جانب ہی دھکیل دیا جائے اور اتنی پاکیزہ بھی بسر نہیں کی کہ بلا روک ٹوک بہشت میں داخل کر دیئے جائیں۔ صبح سویرے پارک میں سیر کرنے والے ایک دوست کے بقول۔۔۔ تارڑ صاحب میری زندگی بین بین ہی گزری ہے چنانچہ اگر جہنم میں چلے گئے تو وہاں آگ تو ہو گی پر کہیں کہیں جلتی ہو گی اور اگر جنت نصیب ہوئی تو شاید اس میں بہتی دودھ اور شہد کی نہروں کی روانی ذرا کم کم ہو۔ چنانچہ اگر ہم اسی دنیا میں بہشتی ہو گئے ہیں تو اس سے بڑی خوش بختی کیا ہو گی۔۔۔ دراصل بڑھاپے کی وجہ سے مختلف اعضاء کی کارکردگی میں فرق آنے لگتا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ نوجوانی میں سیڑھیاں دکھائی ہی نہیں دیتیں، درمیانی عمر میں سیڑھیاں دکھائی دیتی ہیں اور جب آپ اُن پر چڑھتے ہیں تو سانس پھول جاتا ہے اور بڑھاپے میں سیڑھیوں کو صرف دیکھنے سے انسان ہانپنے لگتاہے۔۔۔ اس بہشتی ہو جانے کا قصہ کچھ یوں ہے کہ پچھلے برس مجھے محسوس ہوا کہ اگر کوئی فون آتا ہے تو بائیں کان سے سنتا ہوں تو آواز دور سے آتی ہے اور درمیان میں کچھ چڑیاں سی چہکتی ہیں اور جب دائیں کان سے لگاتا ہوں تو آواز قریب آجاتی ہے اور چڑیاں غائب ہو جاتی ہیں۔ بیگم سے تذکرہ کیا تو وہ کہنے لگی تم فوری طور پرکسی کان اور آنکھ کے ماہر ڈاکٹر سے مشورہ کرو عین ممکن ہے کہ تم بہرے ہو رہے ہو۔ میں نے کہا بیگم میں کیسے بہرا ہو سکتا ہوں تم جب بھی مجھے ڈانٹ ڈپٹ کرتی ہو اور اکثر کرتی ہو تو مجھے صاف سنائی دیتا ہے تو اس نے مزید ڈانٹتے ہوئے کہا، مسخریاں مت کرو کان چیک کراؤ۔۔۔ چنانچہ ایک ماہر سے رجوع کیا جنہوں نے میرے کانوں میں ٹوٹیاں گھسیڑ کر اُن پر طبلا سا بجایا اور سامنے رکھے کمپیوٹر پر ابھرتی لہروں کو دیکھ کر مجھے اطلاع کی کہ تارڑ صاحب آپ کا بایاں کان تو بالکل فارغ ہو چکا ہے، پاکستان کے بائیں بازو کی سیاست کی مانند دم توڑ چکا ہے البتہ دایاں کان صرف تیس فیصد ناکار ہوا ہے۔ یہ کان کچھ نہ کچھ کام کا ہے تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے بائیں کان میں ایک عدد آلۂ سماعت فٹ کر دیا جائے تا کہ آپ ٹھیک طرح سے سن سکیں۔ میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے یعنی میں بھی ”بولا“ ہو گیا ہوں۔ آئندہ زندگی میں کسی کی بات سننے کے لیے اپنے کان پر ہتھیلی کا چھجہ جما کر مسکراؤں گا۔ مجھے اپنے ماموں جان یاد آ گئے۔۔۔ آخری عمر میں موصوف مسکراتے رہتے تھے۔ اور جب اُن کی چوتھی بیگم اُن سے کچھ کہنا چاہتی تھی تو سرہانے تلے رکھے ایک بھونپو کو کان سے لگا کر رکھتے تھے ”اِک بار پھر کہو ذرا۔۔“ چنانچہ میں نے براساں ہو کر ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ حضور اگر میں یہ آلۂ سماعت کان میں فٹ نہ کروانا چاہوں تو کیا پھر بھی گزراہ ہو سکتاہے۔۔۔تو وہ کہنے لگے۔۔۔ ہاں تھوڑا بہت گزارہ ہو جائے گا۔ ایک تو یہ ہے کہ جہاں بیٹھیے دوستوں کو دائیں جانب بٹھائیے۔۔۔ زیادہ دشواری نہ ہو گی البتہ جہاں کہیں ہجوم ہو گا، زیادہ لوگ ہوں گے وہاں آپ کو سننے کا مسئلہ ہو گا تو ہجوم میں جانے سے گریز کیجیے ۔۔۔ اور ہاں ہمہ وقت مسکراتے رہیے کہ بہشتی لوگوں کی یہی نشانیاں ہیں۔ چنانچہ میں ابھی تک گزارہ کر رہا ہوں۔۔۔ کیسے کر رہا ہوں یہ تو جی جانتا ہے۔۔۔محفلوں میں مجھے انسانوں کی آوازیں کم سنائی دیتی ہیں اور چڑیوں، کوّوں اور دیگر پرندوں کی آوازیں زیادہ سنائی دیتی ہیں اگرچہ وہاں اُن کا وجود نہیں ہوتا۔۔۔ اور میں یہ قصہ شاید بیان کر چکا ہوں کہ کراچی آرٹس کونسل کے ہال میں جب ”اعزاز کمال“ کی تقریب میرے اعزاز میں منعقد ہوئی تو سوال جواب کے سیشن کے دوران میں نے اقرار کیا کہ معاف کیجیے گا میں ایک کان سے مکمل طور پر بہرا ہوں اس لیے سوال ذرا بلند آواز میں دھیرے دھیرے کیجیے گا تو ایک صاحب نے پُرتفنن ہونے کا فیصلہ کر لیا

اور کہنے لگے ”پہلے آپ ہمیں یہ بتائیں کہ آپ کونسے کان سے بہرے ہیں، حاضرین اس سوال سے بے حد محظوظ ہوئے اور جب انہوں نے بہت اصرار کیا کہ نہیں صاحب پہلے یہ بتائیے کہ آپ کونسے کان سے بہرے ہیں تو پھر سوال کریں گے تو میں نے کہا ”یہ میری صوابدید پر منحصر ہے کہ میں کس وقت کونسے کان سے بہرا ہو جاؤں تو آپ جس جانب کھڑے ہیں میں اب اسی کان سے بہرا ہوں“۔

میرے کچھ دوستوں کا خیال ہے کہ میں بڑھاپے کے ان عارضوں سے لطف اندوز ہوتا ہوں اور بے وجہ اُن کی پبلسٹی کرتا رہتا ہوں جبکہ اس گلشن ادب میں میرے ہمنوا اور بھی ہیں۔۔ لیکن وہ اقرار نہیں کرتے۔ عبداللہ حسین، انتظار حسین، اسد محمد خان یہاں تک کہ کشور ناہید بھی بہشتی ہو چکے ہیں لیکن مجال ہے اس کا اقرار کریں۔۔ بہت سے لوگوں کو انتظار حسین کے بہشتی ہوجانے پر کوئی اعتراض نہیں۔

ویسے اس بہرا ہو جانے میں سوسُکھ ہیں۔ نہ آپ ان دنوں مروّج بیکار اور بیہودہ شاعری سن سکتے ہیں۔۔ نہ حکومت وقت کی شان میں قصیدے پڑھنے والے وزیر سفیر بننے والے کالم نگاروں کے بچپن کے دنوں کی یادیں سُن سکتے ہیں۔۔ نہ سیاست دانوں کی یاوہ گوئی آپ کے کانوں کے پردوں کو زخمی کرتی ہے۔۔ نہ بوکو حرام، داعش اور اسرائیلیوں کے بیان آپ کو سنائی دیتے ہیں اور نہ ہی آپ کو انقلاب کی وہ نوید سنائی دیتی ہے جو کبھی کبھار کینیڈا سے دندناتا آتا ہے اور پھر واپس چلا جاتا ہے۔ آپ کے بیکار ہو چکے کانوں میں صرف چڑیاں چہچہاتی ہیں اور آپ ہمہ وقت مسکراتے رہتے ہیں۔ اس بہرا ہو جانے میں کتنے سُکھ ہیں۔

اور یوں بہرے کے بہرے رہے اور ہاتھ سے جنت نہ گئی۔ یعنی اسی زمین پر بہشتی بھی ہو گئے تو ہم جیسا خوش نصیب اور کون ہو گا۔ آپ کچھ بھی کہتے رہیں لیکن ہم تو مسکراتے رہیں گے۔ کیا آپ نے کچھ کہا؟

مراکو کا محمد اچاری اور نائیجیریا کی اڈیچی

Posted Date : 01/10/2014

مستنصر حسین تارڑ

جونہی میں نے وہ خط پڑھا، صرف ایک سطر جسے کسی کپکپاتے ہاتھ نے لکھا تھا، ایک سرد تھرتھراہٹ میرے بدن میں اتر گئی۔ میں اپنے آپ میں اتنا سمٹ گیا کہ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں اس صدمے میں سے باہر کیسے آؤں۔۔ بالآخر میں نے اپنے آپ پر قابو پا لیا اور میں بالکل خالی تھا۔۔ میں ایک مختلف شخص ہو چکا تھا اور پہلی بار ایک ویرانے میں، میں نے قدم رکھا۔۔ اس بے آباد نئی دنیا میں ، میں نے کسی بھی احساس کے بغیر چیزوں کا تجزیہ شروع کردیا۔ نہ میں نے کوئی درد محسوس کیا، نہ خوشی نہ خوبصورتی۔۔ میں گھر سے نکلنے کے لئے تیار ہو رہا تھا جب میں نے وہ خط دیکھا جو کسی نے دروازے کے نیچے سے کھسکا دیا تھا۔۔ اس پر یہ پیغام درج تھا۔۔ ”اے ابویاسین خوشی کے شادیانے بجاؤ۔۔ اللہ نے تمہیں تمہارے بیٹے کی شہادت کا اعزاز بخشا ہے“۔

یہ مراکو کے شاعر، ناول نگار، افسانہ نگار محمد اچاری کے ناول ”دی آرچ اینڈ دی بٹر فلائی“ یا ”محراب اور تتلی“ کا آغاز ہے۔۔ محمد اچاری 2011ء میں عربی نثر کا بین الاقوامی انعام حاصل کر چکے ہیں اور مراکو کے وزیر ثقافت کے عہدے پر بھی فائز رہے ہیں۔

میں آج اپنے معمول سے ہٹ کر نثر کی اُن بین الاقوامی کتابوں کا تذکرہ کروں گا جو میرے زیرمطالعہ رہی ہیں کہ کچھ دوستوں نے جو میرے کالموں کو اپنی توجہ کے لائق سمجھتے ہیں مجھ سے فرمائش کی تھی کہ میں جن کتابوں کو پڑھتا ہوں اُن میں سے کچھ کا حوالہ اپنے کالموں میں درج کرتا رہوں تاکہ وہ بھی بین الاقوامی سطح پر جو کچھ لکھا جا رہا ہے اُس سے آگاہی حاصل کر سکیں۔ ان میں سے بہت سے دوست ایسے ہیں جو مجھے اپنی زیرمطالعہ کتابوں کے ادبی تجربوں میں شریک کرتے ہیں اور میں اُن سے بہت کچھ سیکھتا ہوں۔۔ ایک نثر نگار کی حیثیت سے، دنیا بھر کے نثری ادب کے تازہ ترین شاہکاروں سے اگر میں واقفیت رکھتا ہوں تو یقیناًمیں اپنے تخلیقی مزاج کو بہتری کی جانب گامزن کر سکتا ہوں۔۔ بے شک اپنے پاکستانی کنویں میں پڑا رہنا، یہی طے کر لینا کہ بس یہی دنیا ہے اور ٹَر ٹَر کرتے رہنا کہ مجھ ایسا اور کوئی نہیں، بے حد پُرلطف زندگی ہے لیکن۔۔ کچھ حرج نہیں کہ اس کنویں سے باہر آ کر ہم دیکھیں تو سہی کہ دنیا بھر میں کیا کیا اور کس بلند معیار کا لکھا جا رہا ہے۔۔ بے شک ہم ایک احساس کمتری میں مبتلا ہو جائیں

لیکن آگاہ تو ہونا چاہئے۔۔۔ صرف اس لئے میں کبھی کبھار اُن کتابوں کا تذکرہ اپنے کالم میں نمایاں کر دیا کروں گا جنہیں میں نے پڑھا اور اُن سے کچھ سیکھا۔۔۔ محمد اچاری کا یہ ناول ”محراب اور تتلی“ بھی ایک ایسی ہی کتاب ہے۔ اس ناول کا پس منظر مراکش کا دل نشیں شہر ہے جہاں اس کے مرکزی کردار یوسف کو ایک صبح وہ خط ملتا ہے جس میں اُسے خبر کی جاتی ہے کہ تمہارا اکلوتا بیٹا جو کہ پیرس میں انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہا تھا، تمہاری بے خبری میں افغانستان جہاد کرنے کے لئے چلا گیا اور ایک معرکے میں کام آ گیا۔ بیٹے کی موت سے یوسف ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔۔۔ اپنے غم میں اپنے دوستوں احمد اور ابراہیم کو شریک کرتا ہے لیکن وہ ایک کرپٹ معاشرے میں ناجائز دولت جمع کرنے میں مشغول ہے۔۔۔ مراکش کے دو حصوں کو ملانے کے لئے ایک شاندار محراب تعمیر کرنے کے منصوبے بنتے ہیں اور ان میں جرم اور بے ایمانی کو جائز سمجھا جاتا ہے۔۔۔ یوسف کی بیوی اپنے بیٹے کی موت کے غم میں اُسے چھوڑ دیتی ہے کہ یہ صرف وہ تھا جس نے اُن دونوں کو نہ چاہتے ہوئے بھی ایک رشتے میں باندھ رکھا تھا۔۔۔ محمد اچاری کا یہ ناول پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ پاکستانی ناول نگار ایک عرصے سے ایک دلدل میں پھنس چکے ہیں، وہ ابھی تک 1947ء اور 1971ء کے سانحوں میں سے باہر نہیں آ سکے اور یقیناًمیں بھی اُن میں شامل ہوں۔۔۔ اپنی ذات اور تصوف کی بھول بھلیوں میں اُلجھے ہوئے ہیں۔۔۔ محمد اچاری کا یہ ناول اُنہیں آج کی دنیا کے حقائق کی تیز روشنی میں لے آتا ہے۔

چما مانڈا اڈیچی ایک نوجوان چھتیس برس کی نائیجیرین ناول نگار ہے جس کا ناول ”پرپل ہبسکس“ ایک بیسٹ سیلر تھا۔ اُس کا تازہ ترین ناول ”ہاف آف اے ییلو سن“ یعنی ”ایک نصف زرد سورج“ بھی کردار نگاری اور انسانی احساسات کی نمائندگی میں بے مثال ہے۔ اُس نے پرنسٹن یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی اور نائیجیریا میں قیام پذیر ہے۔ بہت کم لوگوں کی یادداشت میں ہو گا کہ 1960ء کے لگ بھگ نائیجیریا کی عیسائی آبادی نے مسلمانوں سے الگ ہو کر ”بیافرا“ کی خودمختار ریاست کا اعلان کر دیا تھا اور ایک طویل خانہ جنگی کے بعد شکست سے دوچار ہو گئی تھی۔ یہ دراصل ”بیافرا“ کے نقطۂ نظر سے لکھا ہوا ایک ناول ہے کیونکہ اڈیچی ایک نائیجیرین عیسائی ہے۔۔۔ خودمختاری کا اعلان کرنے کے بعد بیافرا کے علاقوں میں لوگوں پر کیا گزری اور اُنہوں نے کیسے مسلمان فوج کا مقابلہ کیا، یہ اُس کی داستان ہے۔۔۔ قابل فہم طور پر اڈیچی کے دل میں مسلمانوں کے خلاف ایک بغض ہے اگرچہ وہ تب پیدا بھی نہیں ہوئی تھی جب بیافرا کی سول وار کا آغاز ہوا تھا۔۔۔ اوراس کے باوجود ناول کی ایک مرکزی کردار اولانا جو کہ ایک عیسائی ہے اُس کے دل میں دراز قامت خوش شکل محمد نام کے ایک شخص کے لئے ایک نرم گوشہ ہے جو ہمیشہ مددگار ثابت ہوتا ہے۔ ہم کیا کر سکتے ہیں کہ آج کی دنیا میڈیا، ادب اور پروپیگنڈے کی دنیا ہے جس میں اگر یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ اسرائیلی فوج نے غزہ کے خلاف حملوں کے دوران اتنے ضبط اور انسانی ہمدردی کا مظاہرہ کیا ہے کہ اُسے اس برس امن کے نوبل انعام سے نوازنا چاہئے تو لوگ یقین کر لیتے ہیں۔ اس میں لوگوں کا کچھ قصور نہیں، اُن تک جو نقطۂ نظر پہنچے گا وہ اُس سے متاثر ہوں گے چنانچہ اگر اڈیچی بیافرا کی داستان لکھتی ہے اور دوسری جانب کوئی مسلمان ادیب اپنے مؤقف کے حق میں کچھ نہیں لکھتا تو لوگ اڈیچی کے لکھے ہوئے کو ہی سچ مان لیں گے۔۔۔ لیکن ہمیں ابھی اتنی فرصت نہیں ہے کہ ہم اپنے مؤقف کے حق میں ناول وغیرہ لکھیں۔۔۔ ہم پہلے یہ تو طے کر لیں کہ ہم میں مسلمان کون ہے۔۔۔ سُنّی، شیعہ، وہابی، دیوبندی، اہلحدیث۔۔۔ ازاں بعد یہ ناول لکھنے کے فضول کام کریں گے۔۔۔ جیسے ابن انشاء نے لکھا تھا کہ ایک زمانے میں ہم لوگوں کو دائرۂ اسلام میں داخل کرتے تھے اور اب اُنہیں باہر نکالتے ہیں

ہو سے سراماگو کا ”آخری“ ناول

مستنصر حسین تارڑ

Posted Date : 11/10/2014

پرتگال کا ہوسے سراماگو، نوبل انعام یافتہ مصنف میرے پسندیدہ ترین تخلیق کاروں میں سے ہے۔۔۔ اور میں نے اُس سے سیکھا کہ ایک تخلیقی ناول نگار کے لیے زبان کی حدود کے کچھ معانی نہیں ہیں، وہ زبان کو

اپنی مرضی سے توڑ پھوڑ سکتا ہے، یہاں تک کہ گرائمر کو بھی تبدیل کر سکتا ہے۔ وہ بیس تیس صفحے بغیر کسی رکاوٹ کے مسلسل لکھ سکتا ہے اگر وہ ایک تخلیقی ناول نگار ہے تو۔۔ مجھے یاد ہے جب میں نے اس کا ناول ”بلائنڈ نیس“ یا ”اندھا پن“ پڑھا تو میں نے اپنی بیگم سے کہا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنی تمام کتابوں کو صحن میں ڈھیر کر کے انہیں آگ لگا دوں کہ بوسے سراما گو کے مقابلے میں میں تو ادب نہیں لکھتا رہا، جھک مارتا رہا ہوں تو اُس نے کہا تھا کہ ”بہاؤ“ ، ”راکھ“، ”فاختہ“، ”قربت مرگ میں محبت“ اور ”پیار کا پہلا شہر“ بھی؟ تو میں نے کہا تھا، ہاں، بے شک۔۔ ان ناولوں کی کچھ حیثیت نہیں ہے۔ انہیں اردو زبان میں لکھے گئے دیگر ناولوں کے موازنے میں شہرت مل گئی ہے ورنہ ”اندھا پن“ جیسا ناول میرے گمان میں نہیں آ سکتا۔ ازاں بعد میں نے سراماگو کے دیگر ناول پڑھے اور اُس کا گرویدہ ہوتا چلا گیا۔۔ اور ہاں میرا خیال تھا کہ ”بلائنڈنیس“ ایک ایسا ناول ہے جس کی تصویر کشی، جس کی فلم بنانا ناممکن ہے۔ لیکن مجھے اس ہدایت کار کا نام یاد نہیں آ رہا اس نے اسے ایک چیلنج کے طور پر قبول کیا اور ”اندھا پن“ کو ایک لازوال روپ میں فلمبند کر دیا۔۔ اور ہاں ایک شاعر احمد مشتاق نام کے۔۔ میرے دوست تو نہیں بہت واقف ہیں، ان دنوں گمنامی کی اور بڑھاپے کی زندگی گزار رہے ہیں۔ جب کبھی امریکہ جانا ہوتا ہے فون پر بات ہو جاتی ہے اور وہ ہمیشہ محمد سلیم الرحمن اور انتظار حسین کو سلام بھیجتے ہیں۔ ہندوستان کے بہت بڑے نقاد شمس الرحمن فاروقی، احمد مشتاق کو اس عہد کا سب سے بڑا شاعر قرار دیتے ہیں یہاں تک کہ فاروقی نے اپنے ضخیم ناول کا عنوان ”کئی چاند تھے سر آسماں“ بھی احمد مشتاق کے ایک مصرعے سے مستعار لیا تو اسی احمد مشتاق نے پچھلے دنوں سراماگو کے ناول ”بلائنڈنیس “ کا اردو ترجمہ کر ڈالا اور یہ کمال کا ترجمہ ہے۔ لیکن آج میں ”اندھا پن“ کے حوالے سے نہیں بلکہ سراماگو کے ”آخری“ ناول ”سکائی لائٹ“ کے حوالے سے بات کرنا چاہوں گا جو اس کی موت کے بعد انہی دنوں انگریزی ترجمے میں شائع ہوا ہے۔ دراصل یہ ناول سراماگو کا پہلاناول ہے جو اُس نے بتیس برس کی عمر میں لکھا اور یہ اُس کا ”آخری“ ناول ہے جو شائع ہوا۔۔ اس کی اشاعت کی داستان بے حد دلچسپ ہے۔۔ ایک نوجوان سراماگو نے شب و روز کی تخلیقی مشقت کے بعد یہ ناول تخلیق کیا اور ناشر کو روانہ کر دیا۔ وہ منتظر رہا کہ ناشر کی جانب سے کوئی ردعمل آئے چاہے وہ معذرت کر لے کہ ہم یہ ناول شائع نہیں کر سکتے لیکن متعدد بار رابطہ کرنے کے باوجود ناشر کی جانب سے ایک لمبی خاموشی تھی۔ وہ اتنا دل برداشتہ ہوا کہ اس نے آئندہ ناول نہ لکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے خاندان میں کوئی بھی پڑھا لکھا نہ تھا، اس کی تعلیم بھی معمولی تھی اور پیشے کے حوالے سے وہ ایک مستری یا مکینک تھا جو اپنی لیاقت کے بل بوتے پر صحافت کی وادی میں چلا آیا۔۔ ”سکائی لائٹ“ کی ناکامی کے بارہ برس بعد اُس نے پھر سے ناول نگاری کی جانب رجوع کیا جو اسے ادب کے نوبل انعام کی بلندیوں پر لے گئی۔ بہت سے لوگ اُسے گارسیا مارکیز سے بڑا ناول نگار مانتے ہیں اور میں بھی اُسے گارسیا سے کمتر درجہ دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ جب وہ بین الاقوامی سطح پر ایک عظیم ناول نگار مان لیا گیا تو ایک صبح۔۔ وہ شیو کر رہا تھا جب فون کی گھنٹی بجی اور اس نے نہایت اطمینان سے کہا ”نہیں آپ تردد نہ کیجیے۔ میں خود آدھ گھنٹے میں آپ کے پاس پہنچ رہا ہوں“۔ وہ واپس آیا تو اس کے بیگ میں اس کے اولین ناول ”سکائی لائٹ“ کا اورجنل مسودہ تھا۔۔ ناشر نے اُسے فون کیا تھا کہ سر۔۔ آپ کے لیے ایک خوشخبری ہے۔۔ آپ کے گمشدہ ناول کا مسودہ مل گیا ہے اور ہم اسے شائع کرنا چاہتے ہیں۔ سراماگو نے انکار کر دیا۔۔ یہ ناول میری زندگی میں شائع نہیں ہو گا۔ بیالیس برس پیشتر لکھے ہوئے اس ناول کو اس نے شائع کروانے سے انکار کر دیا اور اس کے جواز میں اس نے کہا ”کسی انسان پر یہ لازم نہیں قرار دیا جا سکتا کہ وہ کسی سے محبت کرے لیکن ہم پر لازم ہے کہ ہم ایک دوسرے کی عزت کریں۔ اسی طور ہم کسی ناشر سے یہ توقع نہیں کرتے کہ وہ آپ کا ناول شائع کر دے کہ شاید یہ ایک برا ناول ہو لیکن ہم یہ توقع تو کر سکتے ہیں کہ وہ منتظر ناول نگار کو، جو ہر روز ہر ہفتے یہاں تک کہ مہینوں ناشر کے جواب کا انتظار کر رہا ہے۔۔ کوئی نہ کوئی جواب تو دے۔ ایک مصنف جب اپنی تخلیق ایک ناشر کو روانہ کرتا ہے تو وہ محض حرف اور فقرے نہیں ہوتے، اُن کے اندر ایک انسان کی پوری شخصیت پنہاں ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر ناشر جواب تک نہیں دیتا تو وہ ایک انسان کی تذلیل کرتاہے۔

چنانچہ سراماگو نے اس ناول کے مسودے کو دوبارہ پڑھا بھی نہیں اور اپنی کتابوں کے ڈھیر میں پھینک دیا کہ یہ ناول اُسے اپنی ذلت کی یاد دلاتا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد اُس کا ”آخری“ ناول ”سکائی لائٹ“ شائع ہوا تودنیا بھر کے نقاد حیران رہ گئے کہ ایک ایسا شخص جس کے باپ دادا ان پڑھ تھے اور اُس نے کسی بھی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل نہ کی تھی بتیس برس کی عمر میں اتنا شاندار اور فلسفیانہ گہرائی والا ناول کیسے لکھ سکتا ہے۔ اس ناول میں ہمیں اس کی آئندہ ادبی زندگی کے پر تو نظر آتے ہیں۔

اُس نے موت کے بارے میں لکھا ”مر جانے کا مطلب یہ ہے کہ کبھی ہم تھے اور اب نہیں ہیں“۔

سکائی لائٹ“ کا پلاٹ بہت سادہ ہے۔ ایک بلند عمارت میں مختلف فلیٹ ہیں جن کے باسیوں کی حیات ”

اگرچہ دشوار ہے لیکن وہ پامردی سے اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ ان میں سلوسٹر نام کا ایک موچی ہے جو دراصل ایک صوفی منش انسان ہے اور ہمیں اشفاق احمد کے کرداروں کی یاد دلاتا ہے۔ ایک خوش بدن طوائف ہے۔ دو بوڑھی ہوتی غیر شادی شدہ بہنیں ہیں۔ ایک جوڑا ہے جس کی بیٹی مر چکی ہے۔ ایک آوارہ گرد شخص ہے جو موچی کے گھر کے ایک کمرے میں کرائے دار ہے۔۔۔ بہت مدت پیشتر اے حمید نے ”ڈربے“ نام کا ایک بڑا ناول تحریر کیا تھا جو اُن کی رومانوی تحریروں کی دھند میں روپوش ہو گیا اور اُس میں بھی ایک عمارت ہے جس کے مختلف فلیٹوں میں لوگ رہتے ہیں اور زندگی اُن سے اچھا سلوک نہیں کررہی۔۔۔ اگر کبھی فرصت ہو تو یہ ناول تلاش کیجیے اور پڑھ لیجیے۔۔۔ کہ اے حمید صرف ”زرد گلاب“ اور چائے کی مہک اور امر تسر کے شب و روز اور سیلون کی کنول ناریوں اور ”عینک والا جن“ ہی نہیں ہے، ایک بلند مرتبت ناول نگار بھی ہے۔ آخری مرتبہ گورنمنٹ کالج کے بخاری آڈیٹوریم میں اشفاق احمد کی یاد میں جو ریفرنس ہوا تھا جہاں میں نے اُن کے حوالے سے ایک انگریزی مضمون پڑھا تھا، وہاں میرے علاوہ اے حمید نے بھی اپنے دوست اشفاق کو یاد کیا اور اُن کی حالت اچھی نہ تھی، مجھے کہنے لگے ”یار مستنصر۔۔۔ ملتے رہا کرو۔۔۔ آخری وقت ہے۔۔۔ ملتے رہا کرو“ ذرا دیکھئے کہ عظیم ادب کیسے پرتگال کے سراماگو اور پاکستان کے اشفاق احمد اور اے حمید کو ایک ہی ڈوری میں باندھ دیتا ہے۔
اگر آپ بڑے ادب کے پجاری ہیں تو بہرطور آپ کو سراماگو کے پہلے اور ”آخری“ ناول ”سکائی لائٹ“ کے سامنے سر جھکانا ہو گا۔
”مر جانے کا مطلب یہ ہے کہ کبھی ہم تھے اور اب نہیں ہیں“

اسماعیل قادارے کا ”خوابوں کا محل“
مستنصر حسین تارڑ
Posted Date : 15/10/2014
خوابوں کے محل کوہمارے موجودہ سلطان نے برا راست قائم کیا۔۔۔ اوراس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ سلطنت میں جتنے بھی خواب دیکھے جاتے ہیں اُن کی درجہ بندی کی جائے، اُن کی تعبیر کی جائے۔ تعبیر کا محکمہ ہر شہری کے خواب کا جائزہ لیتا ہے۔ اورپھر اُس خواب میں پنہاں اشاروں کودریافت کرتا ہے۔۔۔ سلطان کا یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ اس طور ہمیں خوابوں کے ذریعے خبردار کرتا ہے جیسے وہ ایک طوفان تخلیق کرتا ہے، ایک قوس قزح نمودار کرتا ہے یا کسی سیارے کو ہم سے قریب لے آتا ہے۔ خواب کے ذریعے وہ ہمیں ایک اشارہ بھیجتا ہے جوکسی بھی مقام پر نازل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم لاکھوں خوابوں کی چھان بین کر کے اُن میں سے اُس ایک خواب کی تلاش کریں جس میں ہمارے لئے ایک اشارہ ہے۔۔۔ اور اپنے سلطان کوبربادی سے بچا لیں۔
دی پیلس آف ڈریمز“ یا ”خوابوں کا محل“ البانیہ کے سب سے مشہورناول نگار اسماعیل قادارے کا ایک ” حیرت ناک ناول ہے۔۔۔ آپ کسی بھی شک میں مبتلا ہوئے بغیر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ”خوابوں کا محل“ کسی طور سراماگو کے ناول ”اندھے پن“ سے کم نہیں اوراس کے باوجود اسماعیل قادارے کو ابھی تک ادب کا نوبل انعام نہیں دیا گیا۔ نجیب محفوظ اور اُرحان پاموک کے بعد اسماعیل قادارے اب بھی تیسرا ایسا مسلمان ادیب ہوسکتا ہے جسے شاید نوبل انعام کا حقدار ٹھہرایا جائے۔
اسماعیل قادارے البانیہ کے ایک چھوٹے سے پہاڑی قصبے میں پیدا ہوا جس کی سرحد یونان سے ملتی ہے اور وہ البانیہ کا سب سے زیادہ پڑھے جانے والا اور مقبول ترین مصنف ہے۔۔۔ میں نے جب اُس کا ناول ”ایک مر چکی فوج کا جنرل“ پڑھا تو اُس کی تخلیقی عظمت کا معترف ہوگیا۔۔۔ ایک دشمن ملک سے جنگ کے کئی برس بعد حکومت کوخیال آتا ہے کہ اُس جنگ کے دوران جو ہزاروں فوجی اُس ملک میں مارے گئے اور بے نام قبروں میں دفن کر دیئے گئے اُن کا سراغ لگانا چاہئے اور اُن کے ڈھانچوں کووطن واپس لا کر اعزاز سے دفنانا چاہئے کہ ابھی تک ہزاروں مائیں اور بہنیں اور بیویاں منتظر ہیں کہ اُن کے پیاروں کی ہڈیاں تلاش کر کے اُنہیں واپس لا کر اُنہیں وہ اپنے ہاتھوں سے دفن کریں۔۔۔ اُس مر چکی فوج کے ایک بوڑھے جنرل کو یہ فریضہ سونپا جاتا ہے اور وہ کیسے ایک زمانے کے دشمن ملک میں جا کر بے نام قبروں کو تلاش کر کے فوجیوں کی لاشوں کی شناخت کرتا ہے اور اُنہیں تابوتوں میں بند کر کے وطن لے کر آتا ہے یہ اُس ناول کا مرکزی خیال ہے۔ کیا کسی پاکستانی مصنف کے ذہن میں ایک ایسا ناول تخلیق کرنے کاخیال آ سکتا ہے کہ مشرقی پاکستان میں ہمارے جوہزاروں فوجی شہید ہوئے اور گمنام ڈھیروں میں دفن ہوئے اُن کی ہڈیاں واپس لا کر اُنہیں خراج تحسین پیش کر کے وطن میں ایک اعزاز کے ساتھ دفن کیا جا سکے۔
اسماعیل نے درجنوں ناول اور کہانیاں لکھیں جو نہ صرف البانیہ کی تاریخ کی گواہ ہیں بلکہ آمریت جس طور

ایک انسان کی تذلیل کر کے اُسے انسانیت کی سطح سے گرا دیتی ہے اس المیے کی داستانیں ہیں۔ ظاہر ہے اسماعیل قادارے پر آمریت کا عذاب نازل ہوتا رہا۔ جیسے پاکستان میں ضیاء الحق کے دور میں، مصر میں ان دنوں السیسی کی حکومت میں، شام میں اورسعودی عرب میں اورایران میں باضمیر ادیبوں کوبرداشت نہیں کیا جاتا۔۔ بالآخر اسماعیل قادارے نے فرانس میں سیاسی پناہ لی لیکن اب ان نئے زمانوں میں البانیہ نے اُسے دل وجان سے قبول کر لیا ہے اور وہ پیرس میں رہائش رکھنے کے باوجود اپنے وطن آتا جاتا رہتا ہے۔
پیلس آف ڈریمز" عثمانیہ سلطنت کے زوال کے آخری دنوں کی کہانی ہے۔ ایسی بھول بھلیاں پیلس کے " اندر سینکڑوں پوشیدہ کمرے اور راہداریاں ہیں جہاں پوری سلطنت سے جمع کئے جانے والے خوابوں کی تعبیرکی جاتی ہے اور اسے "تعبیر سرائے" بھی کہا جاتا ہے اور پھر لاکھوں خوابوں کی چھان پھٹک کے بعد اہم ترین "ماسٹر ڈریم" کا چناؤ کر کے اُسے تعبیر کے ساتھ سلطان کی خدمت میں روانہ کیا جاتا ہے اور وہ سلطنت کے استحکام کی خاطر باغیوں اور سرکشی کرنے والوں کو تلف کر دیتا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار مارک عالم ایک ایسے مشہورخاندان سے تعلق رکھتا ہے جس نے سلطنت کو کئی وزیراعظم اورگورنر دیئے لیکن وہ اکثر سلطان کے عتاب کا شکار بھی ہوئے۔ اس تعبیر سرائے میں ایک ایساکمرہ ہے جس میں سلطان مُراد اوّل، سلطان بایزید، سلطان محمد دوئم اور سلمان عالی شان کے خواب بھی محفوظ ہیں اور اُن کا نگہبان مارک عالم کو کہتا ہے "اِن خوابوں کے مسودوں کودیکھنے کی اجازت نہیں۔ انہیں صرف موجودہ سلطان کی اجازت سے کھولا جا سکتا ہے اور جب کبھی اس حکم کی خلاف ورزی ہوئی بہت سے سر قلم کر دیئے گئے۔۔ کیاتم چاہو گے کہ تم قتل کر دیئے جاؤ۔
یوں تو اس مختصر ناول کی ہر سطر دل میں دہشت اور خوف بھرتی ہے لیکن اس میں ایک عجیب سے منظر کا بیان ہے۔ مارک عالم خوابوں کے محل میں مختلف خوابوں کی چھان بین کرتا ہے اور پھر کسی ایک خواب کے سحرمیں مبتلا ہوکر اُسے دیر ہو جاتی ہے۔ خوابوں کا محل خالی ہوچکا ہے اور وہ گئی رات اس محل کی راہداریوں میں بھٹکتا بالآخر ایک دروازہ دیکھتا ہے اور جب وہ اُس دروازے سے باہر آتا ہے تووہاں بگھیاں ہیں،گھماگھمی اور شور ہے۔ لوگ بھاگتے پھرتے ہیں، گھوڑے ہنہناتے ہیں، گھڑ سوار آ رہے ہیں اور روانہ ہو رہے ہیں اور مارک عالم ایک شخص سے دریافت کرتا ہے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے تو وہ کہتا ہے کہ۔۔ کیا تم نہیں جانتے کے سلطنت کے پچاس کے قریب صوبوں سے جہاں چالیس سے زیادہ قومیتیںآباد ہیں۔۔ شرقی یورپ سے، وی آنا کی سرحدوں اور شام اور مصر سے خواب لائے جا رہے ہیں۔یہ بگھیاں خواب لا رہی ہیں، گھڑ سواروں کے تھیلوں میں خواب ہیں اور کچھ لوگ سلطنت کے دورافتادہ حصوں سے خواب جمع کر کے طویل مسافتیں طے کرتے پیدل چلے آ رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسے ہیں جنہوں نے راستے میں خوابوں کو گُم کر دیا اور اب شاید وہ قتل کر دیئے جائیں۔ خوابوں کو گُم کردینا بہت بڑا جرم ہے۔ تم نے تو کوئی خواب گُم نہیں کیا۔
اسماعیل قادارے کایہ ناول شائع ہوتے ہی البانیہ میں ضبط کر لیا گیا۔
اس ناول کو پڑھنے کے بعد انسان خواب دیکھنے سے گریز کرتا ہے۔ کیا پتہ کون اور کیسی زہرناک بظاہرپاکیزگی اس کی کیا تعبیر کر لے اور آپ کو مصلوب کردے۔۔ ن م راشد نے کہا تھا کہ خواب لے لوخواب۔۔ شاید اس لئے کہ خواب آپ کو مقتل تک لے جا سکتے ہیں۔
ان زمانوں میں، بہتر یہی ہے کہ ایک بے خواب زندگی گزاری جائے

ملالہ کو معاف کر دیجیے۔۔ اور بابا ایدھی
مستنصر حسین تارڑ
Posted Date : 19/10/2014
کچھ عرصہ پہلے جب ملالہ یوسفزئی کی شامت آئی ہوئی تھی، اُسے نہ صرف برا بھلا کہا جا رہا تھا بلکہ اُس کے بارے میں ایسے بازاری الفاظ استعمال کیے جا رہے تھے اور اخباروں میں کیے جا رہے تھے کہ کم از کم میں اُنہیں دوہرا نہیں سکتا۔ کیا کسی بھی بیٹی یا لڑکی کے بارے میں اتنی گندی زبان استعمال کرناجائز ہے خاص طور پر جب آپ اپنے تئیں پاکیزگی کے سنگھاسن پر براجمان ہیں۔۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ میں اس سلسلے میں کوئی ردعمل ظاہر نہیں کروں گا کہ اس کا چنداں فائدہ نہ تھا، یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بشمول میرے ہم سب ایک "ٹنل ویژن" یعنی غار میں سے دکھائی دینے والے محدود منظر کے اسیر ہیں چنانچہ بحث یا اختلاف کی کوئی گنجائش نہ تھی البتہ میں نے صرف اتنا کہا تھا کہ ملالہ کا بنیادی قصور صرف یہ ہے کہ آخر وہ مرکیوں نہیں گئی، زندہ کیوں بچ گئی، بہت سی سکول طالبات کی مانند وہ بھی ہلاک کیوں نہیں ہو گئی یا نذر آتش کیوں نہیں ہو گئی۔۔ اُنہی دنوں برادرم عارف نظامی نے ایک کالم "ملالہ کو

معاف کر دیجیے" لکھ کر میرے خیالات کی ترجمانی کر دی اور میں اُن کا شکر گزار ہوں کہ اگر میں کوئی ایسا کالم لکھتا تو میری طرف توپوں کے منہ کھل جاتے تھے کہ میں ایک معمولی ادیب تھا جب کہ نظامی صاحب کے خلاف لکھنے کے لیے کہ وہ صحافت میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں، بہت مضبوط اور زمین نہ چھوڑنے والے شخص ہیں اس لیے۔۔ ہم چپ رہے۔۔ ویسے ملالہ کو اب بھی معاف نہیں کیا گیا۔۔ اور جہاں تک ایدھی صاحب کی ذات کا سوال ہے تو میں اُنہیں بلاشرکت غیرے قائداعظم کے بعد سب سے عظیم پاکستانی دل و جان سے سمجھتا ہوں اور اُن کا ملالہ سے موازنہ ہو ہی نہیں سکتا۔ بے شک ایک ہزار ملالائیں ہوں وہ ایدھی صاحب کی عظمت کے صحرا کی ریت کے ایک ذرے کے برابر بھی نہیں ہیں۔۔ میرے متعدد کالم گواہ ہیں اور وہ کتابی شکل میں محفوظ ہیں کہ میں نے حکومتوں اور اداروں کی باقاعدہ منت سماجت کی تھی کہ خدا کے لیے ایدھی صاحب کے لیے نوبل انعام کے حوالے سے باقاعدہ ایک مہم چلائیے۔ اُنہیں نامزد کر کے نوبل کمیٹی کو اُن کی انسانیت پر جو انہوں نے کرم کیے ہیں اُن سے آگاہ کیجیے لیکن ہوا کیا؟ پیپلزپارٹی نے نوبل امن انعام کے لیے جے سالک ایسے حواس باختہ اور شعبدے باز کو نامزد کر دیا۔ میں پورے یقین سے آپ کو بتاتا ہوں کہ ایدھی صاحب کو کبھی بھی نوبل انعام سے نہیں نوازا جائے گا کہ اس ملک کے سب سیاست دان، وہ زرداری ہوں، نواز شریف ہوں یا عمران خان ہوں اُن کے جانی دشمن ہیں۔۔ عمران خان کا اُن کے ساتھ شاید کھالیں جمع کرنے پر اختلاف رہا ہے۔ ایم کیو ایم اُن کی ایمبولینس جلا دیتی ہے اور زرداری اور نواز شریف یہ برداشت ہی نہیں کر سکتے کہ ایک ایماندار اور خلق خدا کے لیے ایک مسیحا شخص کو یہ انعام ملے اور وہ اُن کے رتبے سے زیادہ بلند ہو جائے۔۔ اگرچہ اب بھی ان لوگوں کے ساتھ ایدھی صاحب کا نام لینا میرے نزدیک گناہ ہے۔۔ کہ ایدھی کا بلند مرتبہ طے ہو چکا، وہ ان بونوں کی نسبت کہیں سر بلند ہے۔۔ اگر وہ نوبل امن انعام کے لیے کسی کو نامزد کریں گے تو وہ جے سالک ہو گا یا گلو بٹ! مجھے یاد ہے جب مدرر تھریسا کو جائز طور پر نوبل انعام سے نوازا گیا تھا تو میں نے اپنے ایک کالم میں لکھا تھا کہ ایدھی اُن کی نسبت زیادہ بڑے انسان ہیں کہ مدر تھریسا کی خدمت میں بہرطور ایک خواہش کار فرما ہے کہ جس کی خدمت کی جا رہی ہے وہ اُن کے حسن سلوک سے متاثر ہو کر عیسائی ہو جائے جب کہ ایدھی صاحب صرف اور صرف انسانیت کی خدمت پر یقین رکھتے ہیں، اُن کے اندر کسی انسان کے عقیدے کو بدل ڈالنے کا لالچ نہیں ہے۔ میری خواہش ہے کہ کبھی زرداری، نواز شریف یا الطاف بھائی لاہور کی لبرٹی مارکیٹ میں جھولی پھیلا کر کھڑے ہوجائیں، اپنے تئیں کسی نیک مقصد کے لیے خلق خدا سے پیسے مانگیں تو پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے۔۔ اُن کی جھولیوں میں لوگ اپنے زرق حلال کے سوا بہت کچھ ڈال دیں گے، کیا ڈالیں گے آپ سیانے ہیں، سمجھ جائیں گے۔ البتہ الطاف بھائی کی جھولی بوجوہ بھر سکتی ہے۔ میرے ایک واقف کار ایک روز ایدھی صاحب کو بہت برا بھلا کہہ رہے تھے، شدید غصے میں تھے، کہنے لگے، تارڑ بھائی، بیٹی کی شادی کے سلسلے میں میری بیگم لبرٹی مارکیٹ سے کچھ زیور فرید نے کے لیے گئی۔۔ اور وہاں فٹ پاتھ پر وہ کمبخت بابا ایدھی جھولی پھیلائے بیٹھا تھا، بیگم نے زیورات کی ساری رقم اُس کی جھولی میں ڈال دی اور خوش خوش گھر آ گئی۔ اُس سے اگلے روز میں خود لبرٹی مارکیٹ گیا زیورات خریدنے کے لیے اور وہ نابنجار بابا وہیں بیٹھا، فٹ پاتھ پر جھولی پھیلائے بھیک مانگ رہا تھا۔ میں نے بے اختیار ساری رقم اُس کی جھولی میں ڈال دی۔ تارڑ صاحب۔۔ یہ بابا ہمیں برباد کر دے گا۔ اس پر پابندی لگنی چاہیے۔ کسی بہت بڑے اخبار کی جانب سے ملک کی چند شخصیتوں کو "لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ" دینے کا اعلان ہوا اور بدقسمتی سے اُن میں میرا نام بھی شامل تھا۔۔ چونکہ میں ان انعامی شعبدوں پر یقین نہیں رکھتا چنانچہ میں نے معذرت کر لی اور تب مجھے بتایا گیا کہ یہ ایوارڈ ایدھی صاحب پیش کریں گے تو میں سر کے بل گیا اور سٹیج پر جا کر ایدھی صاحب کہا کہ بابا جی، اگر آپ اس ایوارڈ کی بجائے مٹھی بھر مٹی میرے چہرے پر بکھیر دیتے تو بھی یہ ایک اعزاز ہوتا۔

تو کہنا میں یہ چاہتا ہوں کہ کہاں ایدھی بابا اور کہاں ملالہ یوسف زئی۔۔ چہ نسبت۔۔ ایدھی صاحب نوبل انعام کی محدودیت سے بلند ہو کر ایک ایسے مقام پر فائز ہو چکے ہیں جو نوبل کمیٹی کے تصور میں بھی نہیں آ سکتا۔ اب اگر ملالہ کو نوبل انعام مل ہی گیا ہے تو ذرا صبر شکر کر یں، مرے ہوئے سانپ کی مانند زہر گھولنے سے فائدہ، اور یہ وارث شاہ نے کہا تھا۔ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ نہ صرف وزیراعظم پاکستان نے بلکہ ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں نے ملالہ کے نوبل انعام پر اُسے مبارکباد دیتے ہوئے اُسے دختر پاکستان کہا ہے۔ سوائے مولانا فضل الرحمن کے وہ تو خود امید وار تھے بلکہ اُن کے پالے ہوئے لوگ بھی وہی بم دھماکوں والے وہ بھی ہمارے اُمیدوار تھے۔

میں جانتا ہوں کہ اگر عارف نظامی نے کہا کہ ملالہ کو معاف کر دیجیے۔۔ تو ملالہ کو کبھی معاف نہیں کیا جائے گا۔۔ وہ بوکوحرام کی اغوا شدہ دوسو بچیوں کی بازیابی کی وکالت کرنے والی بچی کو کیسے معاف کر سکتے ہیں۔۔ اگر ایک پاکستانی سفارت کار امریکہ میں یہ کہتا ہے کہ ہم پہلی بار دہشت گردی کے حوالے

سے نہیں امن کے حوالے سے پہنچانے جا رہے ہیں اور یہ تازہ ہوا کا ایک جھونکا ہے اور ایک پاکستانی نژاد کینیڈا میں آباد خاتون یہ کہتی ہے کہ میں جہاں جاتی ہوں مجھ سے لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا تم ملالہ کے ملک سے آئی ہو اور وہ میری توقیر کرتے ہیں۔ تو اس میں کچھ حرج ہے۔۔۔؟ تو ملالہ کو پلیز معاف کر دیجیے۔

اسلامی طرز تعمیر۔۔۔ مسجد قرطبہ سے مسجد نیوجیہ تک
مستنصر حسین تارڑ
Posted Date : 22/10/2014

آرکیالوجی اور فن تعمیر میرے شروع سے ہی بے حد پسندیدہ موضوع رہے ہیں اور یہ دلچسپی کسی حد تک خاندانی اس لئے ہو گئی کہ میرے دونوں بیٹوں نے آرکی ٹیکچر یا فن تعمیر میں ڈگریاں حاصل کیں بلکہ چھوٹے بیٹے سمیر کو نیشنل کالج آ�آرٹس کی جانب سے ”بھائی رام سنگھ ایوارڈ“ دیا گیا جو اس شعبے کے طلبا کے لئے بلند ترین ایوارڈ ہے۔۔۔ یاد رہے کہ بھائی رام سنگھ نے لاہور کی بیشتر تاریخی عمارتوں۔۔۔ ایچی سن کالج، جی پی او، عجائب گھر وغیرہ کو ڈیزائن کیا بلکہ ملکہ وکٹوریہ کے لئے انگلستان کے شہر برائٹن میں ایک پیولین تعمیر کیا۔۔۔ کبھی کبھار کسی سرکاری یا مذہبی عمارت کی تعمیر کے دوران بحث چھڑ جاتی ہے کہ آیا اس کا فن تعمیر اسلامی ہے یا نہیں۔۔۔ فن تعمیر کے بارے میں میرا علم خاصا محدود ہے لیکن ذاتی مشاہدہ میرا مددگار ثابت ہو کر مجھے ایک نتیجے پر پہنچاتا ہے۔۔۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ کل عالم کے لئے اسلام موزوں ترین مذہب ہے، یہ محدود نہیں لامحدود ہے اسی طور اس کا فن تعمیر بھی محدود نہیں لامحدود ہے۔۔۔ دیگر مذاہب اور تہذیبوں پر کسی ایک خطے کی آب و ہوا اور ثقافت کی چھاپ ہے اور ان کا فن تعمیر بھی اس کی نمائندگی کرتا ہے جب کہ اسلامی طرز تعمیر دنیاکے ہر خطے میں اُس کی آب و ہوا، طرز زندگی اور ثقافت کی بھرپور نمائندگی کرتے ہوئے رہائش اور عبادت کے لئے آسانیاں پیدا کرتا ہے چنانچہ کسی ایک طرز تعمیر پر چھاپ نہیں لگائی جا سکتی کہ صرف یہی اسلام کی نمائندگی کرتا ہے، علاوہ ازیں وقت گزرنے سے اس میں مختلف جمالیاتی تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں۔۔۔ مثلاً اسلام کی ابتدائی تاریخ میں مسجد کے ساتھ مینار کا کوئی تصور نہ تھا۔۔۔ مسجد نبوی کا کوئی مینار نہ تھا، پھر ایک سو برس بعد خلیفہ مالک نے اس کی عمارت میں میناروں کا اضافہ کیا۔۔۔ میناروں کی تعداد بھی مسجد کے ڈیزائن اور مقامی رواج کے مطابق ایک سے لے کر سات تک ہو سکتی ہے جو کہ مسجد الحرام کے میناروں کی تعداد ہے۔۔۔ یہ پہلے چھ تھے لیکن ترکوں نے ایک اور مینار کا اضافہ کیوں کیا، اس کی تفصیل کسی اور کالم میں بیان کروں گا۔ ترکی کی مساجد کی خوش نظری اور زیبائش کا دنیا بھر میں کوئی اور ثانی نہیں ہے لیکن یہ طرز تعمیر بھی آیا صوفیہ کے عظیم کلیسا سے مستعار لیا گیا سوائے اس فرق کے کہ ان کے ہمراہ مینار تعمیر کر دیئے گئے۔ اس لئے کہ یہ طرز تعمیر ہی ترکی کے موسموں اور قدیم ثقافتی رویوں کے لئے موزوں ترین تھا۔۔۔ یعنی جہاں جہاں اسلام کا پیغام پہنچا وہاں کے طرز تعمیر کو معمولی ردوبدل کے ساتھ اپنا لیا گیا۔ مثلاً چین کی سب سے قدیم ساڑھے چھ سو برس پرانی بیجنگ کی مسجد نوجیہ ہماری آنکھوں کو ایک بدھ مندر کی عمارت نظر آتی ہے، یہاں تک کہ اس کی ڈھلوان سُرخ چھت کے چاروں کناروں پر اژدھوں، عفریتوں اور جانوروں کے مجسمے نصب ہیں۔۔۔ مسجد کے اندرون میں دیواروں پر جو آیات قرآنی نقش ہیں وہ چینی خطاطی کے شاہکار ہیں، اس مسجد کا کوئی مینار نہیں، صرف صحن میں ایک پستہ قد چوکور تعمیر ہے جہاں اذان دی جاتی ہے۔۔۔ بلکہ وہاں چینی مترجم سے ایک دلچسپ گفتگو ہوئی، ادیبوں کا وفد تھا تو کسی باریش ادیب نے اعتراض کیا کہ آپ نے ایک مسجد کی چھت کے کناروں پر عجیب و غریب مجسمے کیوں نصب کر رکھے ہیں تو مترجم نے کہا کہ ہمیشہ پاکستانی دوست یہ اعتراض کرتے ہیں، ایک تو یہ مجسمے آج سے ساڑھے چھ سو برس پیشتر یہاں ایستادہ کئے گئے تھے اور ہمارے ہاں رواج ہے کہ ہم کسی عمارت کو بلاؤں اور آفتوں سے محفوظ کرنے کے لئے ایسے مجسمے نصب کرتے ہیں۔ اس پر میں نے کہا کہ درست لیکن بھئی یہ تو ایک مسجد ہے تو مترجم کہنے لگا کہ ایک مسجد کو تو ہر صورت بلاؤں سے بچاناچاہئے۔۔۔ ویسے یہ مسجد ہمارا مذہب ہے اور یہ مجسمے ہماری ثقافت ہیں۔۔۔ اب چینیوں سے کون بحث کرتا۔ اس نوعیت کا ایک تجربہ مجھے نانگا پربت کے دامن میں واقع گاؤں ترشنگ میں ہوا جہاں ہرے بھرے کھیتوں کے درمیان میں ہمیں ایک پگوڈا نما عمارت نظر آئی، معلوم ہوا کہ مسجد ہے۔۔۔ یہ لداخ کی قربت کے آثار تھے اور وہاں میں نے اور سمیر نے جو نفل ادا کئے ان کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ میں کسی کالم میں مسجد نبوی کے بعد عالم اسلام کی سب سے بڑی مسجد جامع اُمیہ دمشق کا تذکرہ کر چکا ہوں جو عیسائی دنیا کا ایک اہم کلیسا ہوا کرتی تھی اور جب حضرت عمر فاروقؓ نے ادائیگی کر کے اسے حاصل کیا تو اسے دوبارہ تعمیر نہیں کیا۔ کلیسا کی اُس عمارت کو مسجد میں تبدیل کر دیا۔۔۔ اور ہاں جامع اُمیہ میں ایک اور کانوں

کوبھلی لگنے والی روایت کا تجربہ ہوا۔۔ ایک تو مؤذن کسی ایک مقام پر کھڑے ہو کر اذان نہیں دیتے۔۔ پوزیشن بدل کر چلتے ہوئے چاروں سمتوں میں اذان بلند کرتے ہیں، علاوہ ازیں وہاں کورس میں اذان دی جاتی ہے۔۔ یعنی مؤذن کے پیچھے چوغے پہنے کچھ لوگ ہاتھ باندھے کھڑے ہیں اور وہ اذان دوہراتے چلے جاتے ہیں۔

مسجد قرطبہ کے بارے میں نہایت تفصیل سے اس کی تاریخ اور فن تعمیر کے حوالے سے میں اپنے سفرنامے ”اُندلس میں اجنبی“ میں آج سے چالیس برس پیشتر لکھ چکا ہوں۔۔ شام کے صحراؤں میں ایک بجوم نخیل۔۔ یہ مسجد سینکڑوں قدیم ستونوں پر قائم ہے۔۔ اور یہ سب ستون ایک ہی قامت کے اس لئے نہیں ہیں کہ انہیں قدیم کھنڈر ہو چکے رومی اور یونانی معبدوں سے لایا گیا۔۔ چنانچہ انہیں توازن میں رکھنے کے لئے ان کے اوپر قوس دار محرابیں تشکیل دی گئیں۔۔ ان محرابوں کی تشکیل نو آپ مسجد نبوی میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اس مسجد کا بھی کوئی مینار نہیں۔ جسے علامہ اقبال نے حضرت جبرائیل کے مینار بلند کے طور پر اپنی شہرہ آفاق نظم میں بیان کیا ہے وہ دراصل اس مسجد کے داخلے کا مینار ہے جس کے بعد آپ ”صحن نارنجستان“ میں داخل ہوتے ہیں اور پھر اُسے پار کر کے مسجد قرطبہ کے پُرفسوں سکوت میں اترتے ہیں۔

ہمارے ہاں برصغیر میں جتنی مساجد تعمیر کی گئیں وہ سب کھلے اور وسیع صحنوں والی تھیں تاکہ نمازی کھلی فضا میں نماز ادا کر سکیں اور یہاں بھی آپ دیکھئے کہ بادشاہی مسجد کے گنبدوں پر جو سنہری آرائش ہے اُس کی صورت ایک کلس کی سی ہے بلکہ ایک سٹوپا کی جو سات منزلیں ہوتی ہیں اُس سے مشابہ ہے۔۔ مقامی ثقافت اگر وہ آپ کے عقیدے سے متصادم نہیں ہوتی اُسے طرز تعمیر میں اپنا لینے میں کچھ حرج نہیں سمجھا گیا۔ جب کہ ایران کے گنبدوں پر اس نوعیت کی کوئی سنہری کلغی نہیں ہے۔
امریکہ، کینیڈا اور خاص طور پر انگلستان میں مسلمانوں نے کئی کلیسا حاصل کئے اور انہیں مسجد میں بدل دیا بغیر کسی ردوبدل کے۔
غرض کہ اسلام ایک آفاقی دین ہے اور اس میں طرز تعمیر اور عبادت گاہ کی شکل کی کوئی قید نہیں، آپ کی جبین نیاز میں مسجد کی تڑپ ہو تو آپ جہاں جھک جائیں، جہاں سجدہ ریز ہو جائیں بس وہی مسجد ہے، بس وہی لامحدود آفاق ہے جو کہ اسلام ہے۔

ہمارے بھی تھے ماسٹر کیسے کیسے
مستنصر حسین تارڑ
Posted Date : 26/10/2014
سب کے سب کب کے خاک میں خاک ہو چکے، ہو سکتا ہے اُن میں سے کوئی ایک ابھی تک اپنی آخری سانسوں میں ہو اگرچہ امکان کم ہے اور میں اُن سب کو یاد کرتا ہوں، جن کے نام سے بدن میں خوف اور دہشت بھر جاتی تھی اُنہیں بھی یاد کرتا ہوں اور وہ سب اب کتنے پیارے لگتے ہیں، مسلم ماڈل ہائی سکول کے وہ سب ماسٹر جو مجھے پڑھانے کی کوشش کیا کرتے تھے، آج تقریباً ساٹھ برس بعد مجھے اُن کی یاد آتی چلی جاتی ہے۔ سنٹرل ماڈل سکول کے مقابلے میں بہتر نتائج دینے والا یہ سکول محبوب الحق کے والد بین الاقوامی شہرت یافتہ سرجن خالد محمود بٹ کے سسر عزیز صاحب نے قائم کیا۔ دراصل جموں میں اُن کا ایک سکول تھا اور جب انہوں نے ہجرت کر کے لاہور کو گھر بنایا تو اپنے پرانے رفقاء کے ساتھ یہاں ایک اور سکول کی داغ بیل ڈالی جو کہ مسلم ماڈل ہائی سکول کہلایا۔
معروف اکانومسٹ اور مرکزی وزیر معاشیات محبوب الحق مجھ سے دو برس سینئر تھے اور میں عرض کر چکا ہوں کہ ہیڈ ماسٹر عزیز صاحب کے بیٹے تھے۔ ویسے مولانا مودودیؒ کے بیٹے فاروق مودودی بھی میرے ہم جماعت تھے اور بزم ادب کے صدر کے الیکشن میں وہ بدقسمتی سے میرے مقابلے میں ہار گئے تھے۔ بہرطور میں آج اپنے ہم جماعتوں کا تذکرہ نہیں کروں گا صرف اپنے ماسٹروں کو یاد کروں گا۔
اُن میں ظاہر ہے ہیڈ ماسٹر عزیز سرفہرست تھے جو ہمیں انگریزی پڑھایا کرتے تھے۔ چھوٹا سا قد، ہمیشہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس، متعنک اور ہاتھ میں چمڑے میں مڑا ہوا ایک چھوٹا سا بید جس کی ضرب کی شدت سے ہتھیلیوں اور بدن میں سے درد کا دھواں سا اٹھنے لگتا تھا۔ دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے یہ دھواں کہاں سے اٹھتا ہے۔۔ اور مجھ ناچیز کو متعدد بار یہ نایاب دھواں اور تجربہ حاصل ہوتا رہا تھا ۔۔ لیکن انگریزی پڑھانے اور سمجھانے میں اُن کا کوئی ثانی نہ تھا۔ وہ جب کبھی طالب علموں سے خطاب کرتے تو ”عزیز طلباء'' سے آغاز کرتے اور ہم نعرے لگاتے عزیز صاحب۔۔ عزیز صاحب۔۔
ہیڈماسٹر صاحب ہفتے میں صرف ایک بار انگریزی کی کلاس لیتے جب کہ شفیق صاحب اور فیض الحسن

صاحب انگریزی کے باقاعدہ ٹیچر تھے۔ شفیق صاحب واقعی ایک شفیق انسان تھے اور ہمیں ہمیشہ ”آپ“ سے مخاطب کرتے جب کہ کچھ دیگر ماسٹر حضرات ہمیں ”اوئے نالائقو۔۔ اوئے بیوقوفو“ وغیرہ کہہ کر متوجہ کرتے۔۔ ماسٹر فیض الحسن بھی ماسٹر عزیز کی مانند نہایت عمدہ لباس پہنتے، ہمیشہ سوٹ میں ملبوس ہوتے، ناک نقشہ تیکھا اور خوش شکل، اگرچہ قدرے ناتواں اور لم ڈھنیگ سے۔۔ انگریزی اُن کی بھی آج کے وائس چانسلر حضرات سے کہیں بہتر اور برطانوی تھی، شنید تھی کہ وہ ”پاکستان ٹزئمز“ میں مضمون بھی لکھتے ہیں۔ ایک روز ہمیں انگریزی محاورے پڑھا رہے تھے یعنی۔ مَنی میکس دے میئر گو۔۔ اے برڈ اِن بینڈ۔۔ وغیرہ تو میں نے نہایت معصومیت سے پوچھا کہ ماسٹر صاحب۔۔ ایک کریلا دوسرا نیم چڑھا۔۔ کی انگریزی کیا ہوتی ہے۔ ماسٹر فیض الحسن نے نہایت خشمگیں نگاہوں سے مجھے دیکھا اور ڈانٹ کر کہا ”انگریزی میں کریلے نہیں ہوتے“ اور یہ وقوعہ یادداشت کے سہارے بیان کر رہا ہوں اور اس میں کچھ لغزش بھی ہو سکتی ہے۔ اگلے روز جب ماسٹر صاحب کلاس میں داخل ہوئے تو اُن کی میز پر تین کریلے رکھے ہوئے تھے، مجھے یاد نہیں کہ یہ خاور کی کارستانی تھی جو بعد میں آئی جی سندھ ہوا، آسٹریلیا میں پاکستانی سفیر ہوا یا اس شیطانی کا میں مرتکب ہوا تھا۔۔ ماسٹر فیض الحسن نے ظاہر ہے اُن تین کریلوں کو دیکھا اور خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ اگلے روز اُن کی میز پر کریلوں کا ایک ڈھیر تھا اور ستم یہ کہ کہیں سے کسی نے سرگوشی کی کہ۔۔ ماسٹر صاحب ایک کریلا دوسرا نیم چڑھا۔۔ کی انگریزی کیا ہوتی ہے تو ازاں بعد فیض الحسن صاحب نے پوری کلاس کا جو حال کیا، جس طور وہ طیش میں آئے وہ مسلم ماڈل کی تاریخ کا ایک سنہری باب ہے۔ اور ازاں بعد مجھے شرمندگی ہوتی ہے کہ اُنہیں فیض الحسن کریلا کے نام سے پکارا جانے لگا۔ ہم بچے بھی کتنے کمینے اور سنگدل ہوتے تھے۔۔ لیکن اس ”کریلا اپپی سوڈ“ کا ڈراپ سنیں لنڈن میں ہوا۔۔ لنڈن میں ہمارے ایک ہمسائے سلیم صاحب مقیم تھے جن کے ہاں میں نے دو روز قیام کیا۔ ایک شب کہنے لگے، مستنصر یہاں میرے ایک نہایت جگری دوست ہیں میں اُن کے ساتھ ایک عمدہ شب گزارنے جا رہا ہوں تم بھی چل سکتے ہو۔ ان دنوں یہاں ایک برطانوی سکول میں گوروں کو انگریزی پڑھاتے ہیں، پہلے لاہور کے کسی سکول میں ٹیچر تھے، اُن کا نام فیض الحسن ہے۔۔ اور میں ابھی تک ایک نادان کچا ٹین ایجر بے اختیار کہہ اٹھا ”فیض الحسن کریلا“۔۔ سلیم صاحب حیران ہو کر کہنے لگے، تم اُسے جانتے ہو۔۔ میں نے کہا کیوں نہیں، وہ مجھے انگریزی پڑھایا کرتے تھے۔۔ اور جب اُس شام ماسٹر صاحب سے ایک خمار آلود مقام پر ملاقات ہوئی اور سلیم نے چھوٹتے ہی کہا ”یار فیض الحسن۔۔ یہ لڑکا مستنصر مجھے بتا رہا تھا کہ تم دراصل ایک کریلے ہو“ تو میرا رنگ فق ہو گیا اور ماسٹر صاحب کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔۔ مجھے یقین تھا کہ ماسٹر صاحب مجھے لنڈن میں خوب زدو کوب کریں گے اور ماسٹر صاحب بھی ضبط کر گئے کہ میں اس شب اُن کا طالب علم نہ تھا اور وہ مجھ پر ہاتھ اٹھاتے تو پولیس حرکت میں آ سکتی تھی چنانچہ انہوں نے ایک زہر آلود مسکراہٹ اپنے چہرے پر سجا کر کہا ”مستنصر اگرچہ بڑا ذہین بچہ تھا، بس ذرا شرارتی تھا“ اور انہوں نے میرا گال تھپک کر کہا ”ناٹی چائلڈ“۔۔ یہ ماسٹر فیض الحسن کے ساتھ آج سے تقریباً ساٹھ برس پیشتر میری آخری ملاقات تھی اور میں آج اُنہیں کیسی محبت اور اُلفت سے یاد کرتا ہوں۔

اور پھر ماسٹر رحمت خان تھے، دراز قامت، گھنی ڈاڑھی، گرجدار آواز میں سن کر آدھی کلاس کا سب کچھ خطا ہو جاتا تھا، میرے ابا جی کے ہم نام بھی اور قریبی دوست بھی، حساب پڑھاتے تھے، اور اُن کا تکیہ کلام تھا ”تو ہی بول دے“۔۔ اور جب مخاطب شدہ طالب علم منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھا رہتا تو کہتے ”تو نہیں تو تیرا ساتھی ہی بول دے“۔ حساب کے نصاب کی متعدد کتابوں کے مصنف تھے، اُن میں صرف ایک خامی تھی، گھر کا کام نہ کرنے پر جب کسی طالب علم کا کان پکڑ کر اُسے کھینچتے تھے تو اِک عالم جذب میں کھینچتے ہی چلے جاتے تھے، غریب طالب علم کی فریادیں کُل جہان سنتا تھا پر وہ نہ سنتے تھے۔ بے شک وہ کان جڑ سے اکھڑ جائے۔۔ اُن دنوں ہمیں یقین تھا کہ ماسٹر صاحب کے گھر میں کانوں کی ایک کولیکشن جمع ہے۔ جس کا کان ہو، وہ آ کر لے جائے۔۔ (جاری ہے)

دنیا گول ہے اور ماسٹر نادر خان

مستنصر حسین تارڑ

Posted Date : 29/10/2014

یہ جو عمر کے آخری برس ہوتے ہیں، ویسے تو پل کی خبر نہیں لیکن کہہ لیجئے کہ آخری برس ہوتے ہیں۔ ان میں تمام رنجشیں اور دشمنیاں بے معنی لگنے لگتی ہیں اور جن کے ہاتھوں کبھی دکھ پہنچے آپ ان لوگوں کوبھی محبت سے یاد کرنے لگتے ہیں۔۔ ہر سکول کے ماسٹر حضرات مختلف مزاجوں کے حامل ہوتے ہیں، ان میں کرخت اور ظالم بھی ہوتے ہیں اور ایک باپ کی مانند شفیق اور مہربان بھی لیکن ان برسوں میں کوئی

تخصیص باقی نہیں رہتی، آپ سبھی کورنجیدگی سے بے پناہ یاد کرتے ہیں۔۔ مسلم ماڈل سکول میں اُن دنوں دو ڈرائنگ ماسٹر ہوتے تھے اور ان میں ایک سہیل صاحب تھے جو ایک پہلوان کی مانند تنومند تھے۔۔ وہ کلاس کے مشترکہ فنڈ سے پھل فروٹ خرید کر لاتے اور اُسے ایک میز پر ترتیب دے کر ہمیں بتاتے کہ اب آپ سِٹل لائف کی ڈرائنگ کریں گے۔۔ یعنی سیبوں اور کیلوں وغیرہ کو غور سے دیکھ کر اپنی ڈرائنگ بُک میں انہیں تصویر کیجئے۔۔ ہم ڈرائنگ کرنے میں مگن ہو جاتے۔۔ اس دوران سہیل صاحب گاہے گاہے میز پر ترتیب شدہ پھلوں میں سے کوئی ایک کیلا اٹھا کر اُسے نہایت رغبت سے کھانے لگتے اور پھر سیب بھی اُنہیں ازحد پسند تھے۔۔ جوں جوں ڈرائنگ کا پیریڈ اختتام کو پہنچتا، میز پر ترتیب شدہ پھلوں کی تعداد میں کمی واقع ہوتی جاتی اور بالآخر وہ سب اپنے منطقی انجام تک پہنچ جاتے اور میز خالی ہو جاتی۔ دوسرے ڈرائنگ ماسٹر اسلم صاحب تھے اور یقین کیجئے وہ ہمہ وقت ایک سیاہ سوٹ اور بو ٹائی میں ملبوس رہتے۔۔ وہ خوش شکل شخص تھے اور بالی وڈ کے پرانے ہیرو روڈولف والنٹینو سے مشابہ تھے۔ بعض لڑکے اُنہیں اشوک کمار قرار دیتے۔ اسلم صاحب کی شرافت بے مثال تھی، دھیمے مزاج اور نفیس نشست و برخاست رکھنے والے شخص۔۔ شام کے وقت وہ میکلوڈ روڈ پر واقع مشہور سینما نشاط میں فرائض سرانجام دیتے، گیلری کی ٹکٹوں کا شعبہ وہ سنبھالتے تھے اور ہمیں ہمیشہ نوازتے تھے۔۔ ٹیلی ویژن کا باصلاحیت اداکار محمود اسلم اُن کا بیٹا ہے۔

اورپھر ماسٹر محی الدین تھے جواتنے ضعیف تھے کہ کمر میں خم آ چکا تھا، سفید ریش ماسٹر صاحب جغرافیہ پڑھانے کے علاوہ بچوں سے ماہانہ فیس وصول کرنے کی ذمہ داری بھی اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھاتے تھے اور میری پہلی فیس کتنی تھی؟ شایدہ بارہ آنے پورے مہینے کی۔۔ ماسٹر صاحب جھکے جھکے کلاس میں مٹرگشت کرتے دونوں ہاتھوں سے ایک دائرہ سا بناتے کہا کرتے تھے "بچو دنیا گول ہے"۔۔ اور بچے یہ سمجھتے کہ ماسٹر صاحب اپنے آپ میں مگن ہیں، نظر بھی کمزور ہے ہمیں کہاں دیکھتے ہوں گے وہ بھی اُن کی نقل اتارتے کہتے "دنیا گول ہے"۔ ایک روز کلاس میں آئے اور کہنے لگے "بچو آپ میں سے کس کس کو پتہ ہے کہ دنیا گول ہے تو کم از کم ایک درجن بچوں نے اُنہی کی طرح ہاتھوں سے دائرہ بنا کر اُن کی نقل کی کہ ہمیں پتہ ہے کہ دنیا گول ہے۔۔ اُنہوں نے جانے کہاں سے ایک بے لچک بید برآمد کیا اور اُن بچوں کی اتنی مرمت کی کہ اُن کی گول دنیا ہائے ہائے کرنے لگی بلکہ چپٹی ہو گئی اور بید برساتے ہوئے کہتے جاتے "بچو، دنیا گول ہے"۔ اس سانحے کے بعد مجال ہے کسی نے بھی اُن کی نقل اتارنے کی جرأت کی البتہ کبھی کبھار جب سکول کے احاطے میں جھکے ہوتے چلے جا رہے ہوتے، کوئی بچہ "بچو، دنیا گول ہے" کا نعرہ لگا کر دُڑکی لگا دیتا۔۔ مجھے ان دنوں فارسی زبان پر جو مکمل "عبور" ہے اور میں جانتا ہوں کہ بُود کے معنی "تھا" اور "است" کا مطلب "ہے" ہوتا ہے۔ یہ ماسٹر۔۔ اور میں اصلی نام سے گریز کرتا ہوں۔۔ ماسٹر شین شاہ قصائی کا کمال ہے، وہ ابتدائی دنوں میں اتنے حلیم الطبع اور شفیق ماسٹر صاحب تھے کہ ہمیں حیرت ہوتی کہ آخر ایسے مہربان انسان کو شین شاہ قصائی کیوں کہا جاتا ہے۔۔ وہ اتنے مہربان تھے کہ اُن کی فارسی کی کلاس میں ہمیشہ دھماچوکڑی مچی رہتی، نہ کوئی سبق یاد کرتا اور نہ کوئی ماسٹر صاحب کو درخور اعتنا سمجھتا۔۔ ایک روز انہوں نے ہم سے درخواست کی کہ آپ کل شیخ سعدی کی فلاں حکایت کو یاد کر کے آیئے گا آپ کی مہربانی ہو گی۔۔ اگلے روز انہوں نے نہایت محبت سے درخواست کی کہ۔۔ جی حکایت سنایئے۔۔ اُنہیں سنجیدگی سے کون لیتا تھا چنانچہ پچیس تیس لڑکوں کی کلاس میں سے صرف چھ سات لڑکے ایسے تھے جنہوں نے وہ حکایت یاد کی تھی اور اُن میں سے ایک میں بھی تھا اور میں نے حکایت یاد کہاں کی تھی، بس یونہی تُکا لگ گیا۔۔ ماسٹر صاحب نے اُن بچوں کو دائیں جانب کے بنچوں پر بیٹھنے کو کہا جنہیں حکایت یاد تھی اور بقیہ کو بائیں جانب تشریف رکھنے کے لئے گزارش کی۔۔ ازاں بعد اُنہوں نے کلاس روم کے دروازے کی چٹخنی چڑھائی اور مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔۔ دائیں جانب والے لڑکے جنہوں نے سبق یاد کیا تھا وہ جنتی ہیں اور بائیں جانب بیٹھے ہوئے جنہیں سبق یاد نہ تھا وہ جہنمی ہیں اور آپ کو پتہ ہے کہ جہنم میں کیا سزا ملتی ہے۔ انہوں نے تیل میں چُپڑے ہوئے ایک بید کو ایک تلوار کی مانند نکالا اور کوئی نعرہ لگا کر جہنمی حضرات پر پل پڑے۔ اتنا زدوکوب کیا کہ ہر جانب سے آہ و فغاں کے سلسلے بلند ہونے لگے۔۔ بچوں کی ہر شے خطا ہو گئی اور جب پیریڈ ختم ہوا توکلاس روم کالنگا کے میدان جنگ کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔۔ یہاں تک کہ ہم جو جنت والے تھے وہ بھی تھر تھر کانپ رہے تھے۔
اگلے روز شین شاہ قصائی کمرے میں داخل ہوئے اور گرج کر کہنے لگے "اوئے یہ جنتی اور جہنمی اکٹھے کیوں بیٹھے ہوئے ہیں۔۔ چلو جنتی دائیں جانب اور جہنمی بائیں جانب کے بنچوں پر۔۔ جہنم رسیدہ حضرات نے دُہائی دی کہ ماسٹر صاحب ہم وہ حکایت یاد کر کے آئے ہیں، سُن لیجئے۔ پر ماسٹر صاحب نے ایک نہ سُنی، کہنے لگے۔۔ بھئی جو ایک بار جہنم میں گیا تو بس گیا۔۔ واپس نہیں آ سکتا۔۔ اُنہوں نے پھر بید بلند کیا اور جہنم کے باسیوں پر پِل پڑے۔۔ اور کل کی مانند کلاس روم کے دروازے کی چٹخنی چڑھائی تاکہ بچوں

کی آہ و زاری سُن کر باہر سے کوئی کمک نہ پہنچ جائے۔ غرض کہ یہ سلسلہ کچھ روز جاری رہا اور اس کے بعد۔۔ بچوں کو پوری گلستان بوستان وغیرہ ازبر ہو گئی۔۔ یقین کیجئے میں آج شین شاہ قصائی کو سب ماسٹروں سے زیادہ یاد کرتا ہوں۔۔ عجب آزاد مرد تھا۔

قصے تو اور بھی بہت ہیں لیکن زندگانی کی مانند کالم بھی مختصر ہے تو ذرا آخر میں ماسٹر نادر خان کو یاد کر لیتا ہوں۔۔ وہ حساب کے اُستاد تھے، گورے چٹّے، نیلی آنکھیں، گھنی مونچھیں اور نادر شاہ جیسی گونجدار آواز۔۔ اور میں الجبرے میں صفر جمع صفر۔۔ اور وہ ہمیشہ بلیک بورڈ پر الجبرے کا کوئی سوال لکھ کر کہتے ”ہاں بھئی مستنصر۔۔ آ ذرا یہ سوال تو حل کر“۔۔ سوال کہاں سے مجھ سے حل ہوتا البتہ وہ اپنے بید سے مجھے حل کر دیتے۔۔ سالانہ امتحان سے پیشتر یہ شدید سردیوں کے زمانے تھے جب ماسٹر نادر خان نے حکم دیا کہ کل سے تمام طالب علم امتحان کی تیاری کے لئے رات کو بھی سکول آیا کریں گے اور میں پڑھاؤں گا۔ یہ نہیں کہ اس کے لئے کوئی ٹیوشن فیس وغیرہ تھی بلکہ اُن زمانے کے ماسٹروں کا جنون تھا کہ میرے طالب علم امتحان میں نمایاں رہیں اور میں اُن پر فخر کر سکوں۔۔ میں نے یونہی کھڑے ہو کر کہا ”ماسٹر صاحب۔۔ رات کو توسردی بہت ہوتی ہے تو کیا میں ایک کمبل لا سکتا ہوں“ نادر خان نے ہنّا کر کہا ”اوئے تو کمبل کیا رضائی لے آنا“ اور اگلی شب میں ایک نہایت وسیع اور وزنی رضائی سائیکل کے کیریئر پر باندھ کر لے آیا۔۔ کلاس روم میں فرش پر بچھا کر اُس کے اندر ملفوف ہو گیا۔۔ ماسٹر صاحب دانت پیس کر رہ گئے لیکن چُپ رہے کہ انہوں نے خود ہی کہا تھا کہ کمبل چھوڑ رضائی لے آنا۔۔ اور جب انہوں نے بلیک بورڈ پر الجبرے کا ایک سوال لکھا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ مستنصر ذرا یہاں آ کر اسے حل تو کر تو میرے اشارے پر نوازش نے کلاس روم کے واحد بلب کا سوئچ آف کر دیا اور تاریکی کا فائدہ اٹھا کر رضائی کو ایک ڈھال بنا کر جبکہ ماسٹر نادر خان اندھیرے میں بید برساتے تھے ہم سب نکل گئے اور اگلی صبح۔۔ ہم پہ جو گزری سو گزری۔

ایک مدت کے بعد میری بیجوں کی دکان پر ایک بہت بوڑھا نابینا ہونے کو آیا شخص داخل ہوا، اُس کی مونچھیں ڈھلکی ہوئی تھیں، اُس نے مجھے پیار دیا اور کہنے لگا ”مستنصر۔۔ تو نے مجھے پہچانا نہیں۔۔ میں ماسٹر نادر خان ہوں۔۔ میں لوگوں کو بڑے فخر سے بتاتا ہوں کہ مستنصر میرا شاگرد تھا۔۔ اُن کی بجھتی ہوئی آنکھوں میں نمی اتر رہی تھی اور میری آنکھوں کو بھی اختیار نہ رہا۔۔ اُن میں بھی جھرنے بہہ نکلے

عالمی اردو کانفرنس : جہاں ہم سب چپ رہے

مستنصر حسین تارڑ

Posted Date : 09/11/2014

منیر نیازی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا تھا کہ ایک زمانے میں نقادوں نے مجھے اپنی بے توجہی سے مارا اور اب اس عمر میں آ کر توجہ سے مار رہے ہیں۔ یعنی انسان جب بوڑھا ہونے لگے، ذرا سینئر ہو جائے بھلے ایک بیکار ادیب مجھ ایسا ہو تو بھی نقاد، ریسرچ ، سکالر اور ادبی میلے کرانے والے اُس کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ جاتے ہیں کہ موصوف کا کیا پتہ کب داغ مفارقت دے جائیں تو ذرا ان کی پذیرائی کر لو۔۔ مثلاً ایک مداح کا خط آتا ہے کہ مجھے زندگی میں صرف تین ادیبوں سے ملنے کا اشتیاق تھا، اشفاق احمد، ممتاز مفتی اور آپ۔۔ اشفاق صاحب اور مفتی صاحب تو اللہ کو پیارے ہو گئے اس لیے میں آپ سے جلد از جلد ملنا چاہتا ہوں۔ میں کبھی بھی سراسر بے توجہی کا شکار تو نہیں ہوا لیکن یہ حقیقت ہے کہ پچھلے ایک دو برس سے کچھ زیادہ ہی توجہ نچھاور ہو رہی ہے۔ معذرت کرتا ہوں کہ حضور میں بہت تھک جاتا ہوں، سفر کرنے کے خیال سے وحشت ہوتی ہے چاہے بزنس کلاس کا ہو، لوگوں سے میل ملاقات سے ہول آتا ہے۔۔ پچھلے برس کینیڈا سے ایک دعوت نامہ آیا تو صرف اس خیال سے کہ تقریباً اٹھارہ گھنٹے کا ہوائی سفر در پیش ہو گا۔ نہایت نامعقول بہانے کر کے مدعو کرنے والوں کو ناراض کر لیا۔ آسٹریلیا گیا تو بجھے دل سے گیا اور اس لیے گیا کہ وہاں میرا یار سکھ دیپ سنگھ رانگی میرا انتظار کر رہا ہے۔ قصہ مختصر آرٹس کونسل کراچی کے احمد شاہ نے مجھے گھیر لیا کہ تارڑ بھائی آپ اور عبداللہ حسین ساتویں عالمی اردو کانفرنس میں نہ آے تو میں لاہور آ کر آپ کے گھروں کے سامنے دھرنا دے دوں گا یا دھرنا ماروں گا وغیرہ۔۔ عبداللہ حسین کہنے لگا تارڑ یہ پاگل شخص ہے اس کا کچھ پتہ نہیں کہ سچ مچ لاہور آکر ہمارے گھروں کے سامنے نعرے لگانے لگے تو

چلے چلتے ہیں۔
وہاں جا کر کھلا کہ احمد شاہ واقعی جنونی شخص ہے کہ اُس نے دنیا بھر کے ادیبوں کو اسی نوعیت کی دھمکیاں دے کر کراچی بلا لیا تھا۔ ادیبوں کا ایک جم غفیر تھا جہاں شاعروں سے اپنے شعر نہ سنبھلتے تھے۔ افتتاحی تقریب میں اتنے بے شمار اور پر شوق لوگ آئے کہ اس پر عمران خان کے کسی جلسے کا گمان ہونے لگا۔۔ ہم جو پانچ سات بزرگ ادیب تھے ہمیں سٹیج پر جلوہ افروز کر دیا گیا کہ آج انہیں دیکھ لو۔ کل ہو نہ ہو۔۔ مشتاق احمد یوسفی کی نئی کتاب "شامِ شہرِ یاراں" کی افتتاحی تقریب میں بھی مسند صدارت پر اس خاکسار کو بٹھایا گیا، میرے علاوہ نصف درجن کے قریب اور خاکسار بھی تھے جنہیں بٹھایا گیا تا کہ میں تنہا محسوس نہ کروں۔۔ یوسفی صاحب اگرچہ صرف بانوے برس کے ہیں لیکن اُنہیں بار بار چھیانوے برس کا قرار دیا گیا۔۔ میرا گمان ہے کہ وہ کسی کو پہچان نہیں رہے تھے محض اپنے خیالوں میں گم مسکراتے جاتے تھے۔ وہ مجھ پر بہت مہربان رہے۔ میرے پہلے سفرنامے "نکلے تری تلاش میں" کے بارے میں لندن سے مجھے خط لکھا کہ "تارڑ نے سفرنامہ نگاری کے بادبانوں سے ہوا پلٹا لی ہے، اپنی جانب اُس کا رُخ کر لیا ہے اور آئندہ جوشخص بھی سفرنامہ لکھے گا وہ تارڑ کے نقش قدم پر چلے گا۔۔ مجھے "راکھ" ہر سال کے بہترین ناول کا وزیراعظم انعام ملا تو یوسفی صاحب نے ہی مصنفین کی کمیٹی کے سربراہ کی حیثیت میں میرے حق میں فیصلہ دیا اور شوکت صدیقی نے اُن کی تائید کی۔ اگر مجھے دوہا قطر کا لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ 2003ء میں اشفاق احمد، احمد ندیم قاسمی، مختار مسعود اور شوکت صدیقی کے بعد عطا ہوا تو وہاں بھی یوسفی صاحب نے ہی میری وکالت کی۔۔ افتخار عارف کا کہنا ہے کہ جب میں نے پاکستان میں اردو فکشن کے بارے میں یوسفی صاحب سے استفسار کیا تو انہوں نے صرف آپ کا نام لیا۔۔ تو میں یوسفی صاحب کی بے جا محبتوں کے بوجھ سے دبا ہوا ہوں۔۔ وہ میرے محسن ہیں جنہوں نے ایک ذرے کو محض محبت میں آفتاب بنا دیا۔۔ اس محفل میں اگرچہ مقررین نے یوسفی صاحب کی عظمت کے بہت گن گائے لیکن ایک فقرہ اُن سب پر بھاری تھا کہ۔۔ جب یوسفی صاحب نہ ہوں گے تو لوگ زندہ کیسے رہیں گے۔
یہ ایک ایسی ادبی کانفرنس تھی جس میں افتتاحی تقریب میں یوسفی صاحب کی کتاب کی رونمائی میں اور اگلے روز "اردو کا جدید ناول اور افسانہ" کے سیشن میں مجھے پورے ساڑھے چھ گھنٹے تک سٹیج پر دیگر حضرات کے ہمراہ صدارت کے لیے بٹھائے رکھا گیا اور ۔۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ میں بس بیٹھا ہی رہا۔۔ ایک لمحے کے لیے بھی مائیک پر نہ آیا۔ چپ رہا۔۔ ایک ڈیکوریشن پیس کی مانند سٹیج پر سجا رہا۔۔ یقیناًاس میں کچھ حکمت تھی۔ صرف میں نہیں عبداللہ حسین، انتظار حسین اور اسد محمد خان بھی چپ بیٹھے رہے۔
میرے لیے اس کانفرنس کا سب سے قیمتی لمحہ وہ تھا جب ایک نوجوان اپنی وہیل چیئر کو دھکیلتا میرے پاس آیا۔ وہ کسی یونیورسٹی میں پڑھاتا تھا اور اس کی گو د میں میری کچھ کتابیں تھیں اور اس نے کہا ۔۔ آپ کی تحریروں نے مجھے قوت دی ہے اور میں ان کے سہارے زندگی گزارتا ہوں، میں اپنا اپاہج پن بھول گیا ہوں"۔۔ صرف آپ سے ملاقات کے لیے بمشکل یہاں آیا ہوں۔۔ نقاد حضرات کی تنقیدی بصیرت سے انکار تو نہیں لیکن وہ مجھے اس سے بڑا کامپلی منٹ تو نہیں دے سکتے۔۔
جمیل عباسی اور اس کی بیگم عظمیٰ حسب معمول میری دیکھ بھال کرنے کی خاطر ایک طویل سفر کر کے اپنے گاؤں سے کراچی پہنچ چکے تھے۔ یہ دونوں میرے بہت لاڈلے تھے، میرے احتجاج کے باوجود میرے پاؤں کو ہاتھ لگانے اور انگلیوں پر بوسہ دینے سے باز نہ آتے تھے، میں اُن کی محبت سے بہت بیزار ہو چکا تھا۔
راتوں کو بیچ لگژری ہوٹل کی کھلی کھڑکی میں سے گھنے مین گردو جنگلوں میں سے جو سمندر میں ڈوبے ہوتے تھے وہاں سے سفید سمندری بگلے اڑتے اور مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ اڑان کرتے میرے کمرے میں چلے آئیں گے۔ ویسے اس بار مجھے کراچی پسند نہ آ رہا تھا۔ ہر جانب بلاول زرداری کے بورڈ آپ پر یلغار کرتے تھے۔ کروڑوں نہیں اربوں روپے صرف ایک جلسے کی خاطر بے دریغ بہائے جا رہے تھے۔ سینکڑوں کی تعداد میں پارٹی کے جیالوں کے خیمے لگے تھے اور اس کے باوجود جب جلسہ ہوا تو کسی نے کہا کہ

ہاں ایک بڑا ہجوم جمع کر لیا گیا لیکن۔۔۔ نہ ہجوم میں، اور نہ ہی مقرر میں وہ کرنٹ تھا جو عمران کے جلسوں میں دوڑتا ہے۔

شور ناہید، ریڈرز ورلڈ، اورسمندروں کے درمیان شام
مستنصر حسین تارڑ
Posted Date : 12/11/2014

کراچی آرٹس کونسل کی جانب سے منعقد کردہ ساتویں عالمی اردو کانفرنس کا ہنگامہ پورے چار روز بپا رہا اور اس دوران بہت سے ایسے ادیب ملے جن سے مل کر ذرہ برابر خوشی نہ ہوئی اور بہت سارے ایسے ادیب ملے کہ میرا دل مسرت سے بھر گیا۔۔زاہدہ حنا، اخلاق احمد، مشتاق احمد یوسفی، انور مقصود، کمال احمد رضوی، زہرا نگاہ، سحر انصاری، نجیبہ عارف، آصف فرخی، قاضی افضال حسین، طلعت حسین، سب کے سب کیسے پیارے راج دلارے لوگ تھے۔۔۔ کینیڈا سے میرے ازحد عزیز اشفاق حسین چلے آئے تھے اور بہت حیرت ہوئی جب میں نے ڈنمارک میں پاکستان کی ادبی اورثقافتی پہچان نصر ملک کو کانفرنس میں اپنے سامنے پایا۔۔۔ اُن سے میری آخری ملاقات کوپن ہیگن میں صدف مرزا کی جانب سے میرے اعزاز میں ترتیب دی گئی محفل میں ہوئی تھی اورانہوں نے مجھے ڈنمارک کا پہلا پاکستانی اور اس ملک کے بارے میں ”نکلے تری تلاش میں“ لکھنے والا پہلا ادیب قرار دیا تھا۔ اسد محمد خان میرے سب سے فیورٹ فکشن رائٹر ہیں، اُن سے بہتر افسانہ لکھنے والا پاکستان میں اور کوئی نہیں۔ وہ خصوصی طور پر مجھے ملنے کے لئے چلے آئے اور اُن کے ہمراہ اُن کے داماد اور بیٹی چلے آئے اور میری کچھ کتابیں آٹوگراف حاصل کرنے کی خاطر لے کر چلے آئے اور میں نے اُن کی بیٹی سے کہا کہ تمہیں اپنے باپ پر فخر ہونا چاہئے، وہ ایک بڑا نثرنگار اور کمال کا گیت نگار ہے جس نے ”انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے چاند رے“ جیسا سحر انگیز گیت تخلیق کیا۔۔۔ ایک سویر ناشتے پر کشور ناہید سے ملاقات ہو گئی اور ہم دونوں وقت کے سمندروں میں اپنی کشتیاں کھیتے اب بوڑھے ہو رہے تھے، وہ مجھ سے پورے چھ ماہ چھوٹی ہے اس لئے میں اُسے کبھی کبھار ”چھوٹی“ کہہ لیتا ہوں تو وہ چھوٹے ہونے پر بے حد خوش ہوتی ہے۔ کہنے لگی کہ ایک محفل میں اُسے چند خواتین نے گھیر لیا اور کہنے لگیں ، تارڑ صاحب نے اپنے کسی کالم میں لکھا ہے کہ آپ کمال کے کھانے پکاتی تھیں تو کبھی ہمیں بھی کھلایئے تو تارڑ یہ تم کیا لکھتے رہتے ہومیرے بارے میں تو میں نے کہا کہ کشور۔۔۔ یاد کرو اپنے کرشن نگر والے گھر کو جس کے صحن میں تم آلتی پالتی مارے ایک دیگچے کو اپنی ٹانگوں سے جکڑے حلیم گھوٹ رہی ہوتی تھیں اور تب آتش جوان تھا اور تم ایک خوش رنگ پھول جھڑی تھی جس کے سارے شرارے میرے دوست اور تمہارے خاوند یوسف کامران پر برستے تھے اور صوفی غلام مصطفی تبسم تمہاری حلیم کے شیدائی تھے اور میرے بیٹے سلجوق کو گود میں بٹھا کر ”ایک تھا لڑکا ٹوٹ بٹوٹ“ سنایا کرتے تھے۔ کشور یکدم اُداس ہو گئی۔۔۔ میں نے ماضی کی راکھ کُرید کر اُسے اُداس کر دیا تھا تو اس اُداسی سے باہر لانے کے لئے میں نے پوچھا۔۔۔ کشور۔۔۔ کہاں سے آ رہی ہو اور کہاں جا رہی ہو تو آنے کا نہ بتایا جانے کا بتایا کہ میں آذر بائی جان جا رہی ہوں تو میں نے کہا ”واللہ کشور، یہ زندگی میں پہلی مرتبہ ہے کہ تم آذر نام کے کسی غیر مرد کو بھائی جان کہہ رہی ہو“۔

میں اس سے پیشتر تذکرہ شاید کر چکا ہوں اُن چند ہزار جنونی لوگوں کا جنہوں نے ”مستنصر حسین تارڑ، ریڈرز ورلڈ“ کے نام سے ایک تنظیم قائم کر رکھی ہے۔۔۔ کمپیوٹر پر وہ میرے بارے میں مسلسل باتیں کرتے ہیں، میری تحریروں کوپڑھتے محفلیں سجاتے ہیں۔۔۔ اور انہوں نے ”تکیہ تارڑ“ کے نام سے ایک ایسی ادبی تنظیم کی داغ بیل ڈالی ہے جس کے اجلاس نہ صرف پاکستان کے مختلف شہروں میں باقاعدگی سے منعقد ہوتے ہیں بلکہ کبھی پاکستان کی بلند ترین چوٹیوں اور برفانی وسعتوں میں بھی اس کے اراکین مختصر محفلیں سجا کر میری تحریریں نہایت اُلفت سے پڑھتے ہیں۔ میں اپنے ہی کالم میں اگر قدرے خود توصیفی کا مرتکب ہوا ہوں تو صرف یہ ثابت کرنے کے لئے کہ لوگ ایک ادیب کی قدر کرتے ہیں، اُس کی تحریروں کی توقیر کرتے ہیں۔۔۔ یہ مفروضہ باطل ہے کہ پاکستان میں ادیب کی کچھ قدر نہیں ہے۔۔۔ صرف یہ ہے کہ ادیب اپنی ذات اور انا کے مینار پر ایک بنجر حالت میں بیٹھا نہ رہے، اپنے دل کی دھڑکن لوگوں کی محبتوں، نارسائیوں، دکھوں اور ناآسودگیوں سے ہم آہنگ کرتا رہے۔ اسی ریڈرز ورلڈ کی جانب سے کراچی کے ایک ہوٹل میں میری آمد کی خوشی میں اور میرے تازہ ترین سفرنامے ”لاہور سے یارقند“ کے حوالے سے میرے اُن محسن لوگوں نے ایک محفل کا اہتمام کیا جہاں نہ صرف کراچی بلکہ اندرون سندھ سے بھی بہت لوگ آئے اور انہوں نے میرے سفرنامے کے اپنے اپنے پسندیدہ حصے پڑھے اور مجھ سے گفتگو کی۔۔۔ امریکہ سے عاتف اور ساہیوال سے سمیرا انجم اس تقریب کے لئے نسرین غوری کو ہدایات دیتے رہے۔۔۔ نہ صرف

نسرین غوری بلکہ ڈاکٹر نازش، باجرہ ریحان، تہمینہ صابر جو مشہور نثرنگار ڈاکٹر حسن منظر کی ہمشیرہ اور منور حسن کی قریبی عزیزہ ہیں، عمارہ خان اور بہت سے دوسرے میرے لئے باؤلے ہوئے پھرتے تھے اور وہ محض میرے ریڈرز نہیں، نازش انگریزی کی زبردست شاعرہ ہے، باجرہ کی نثر میں بہت قوت ہے۔ تہمینہ اور عمارہ بھی بہت عمدہ لکھتی ہیں۔۔۔ میرے لئے کراچی کا وہ دن سب سے یادگار تھا۔۔۔ جہاں سب چہروں پر میری تحریر کی چاہت نقش تھی، مجھے نقاد نہیں، بس ایسے چاہنے والے چہرے درکار تھے۔۔۔ میں ان سب کی محبتوں کا مقروض ہوں۔

بوم ہوائے" ایسے بین الاقوامی شہرت یافتہ مصنف ایچ ایم نقوی نے ایک شام خصوصی طور پر اپنے گھر " میرے نام کی۔ جہاں نہ صرف فلم "زندہ بھاگ" کے نوجوان ہدایتکار اور اُس کی پیاری ہندو بیوی سے ملاقات ہوئی بلکہ مجھے بہت عزیز اور میرے دل پسند ناول نگار محمد حنیف بھی اپنی سانولی سلونی بیگم نمرہ بُچہّ کے ہمراہ موجود تھے اور اپنا نومولود بچہ چنگیز حنیف بھی اٹھائے پھرتے تھے۔۔۔ نمرہ کو مجھ سے بہت شکایت تھی کہ میں اُس کی دعوت کے باوجود الحمرا میں اُس کا کھیل دیکھنے نہیں آیا۔۔۔ نمرہ بہت کمال کی سٹیج اداکارہ ہے۔

ہم سب اُس شب سمندر میں تھے۔ جمیل عباسی نے میرے لئے ایک لانچ کا بندوبست کر رکھا تھا اور ہم نے سمندروں کی سیر کے دوران کھلی فضا میں رات اور نمکین ہوا سے لطف اندوز ہوتے ہوئے لانچ میں ڈنر کرنا تھا۔۔۔ عبداللہ حسین کو اب بہت سے درد لاحق ہیں اور وہ ایک آزار میں مبتلا رہتا ہے لیکن ہم اُسے سہارا دے کر لانچ میں لے آئے، جمیل عباسی کے علاوہ ایچ ایم نقوی اور عرفان جاوید اس لانچ کے عرشے پر بیٹھے سمندر کی وہ بُو تھی جوکہ خوشبو تھی، اُس میں سانس لیتے تھے۔۔۔ سمندر میں سے نمودار ہوتے گھرے سبز رنگت کے مین گروو جنگلوں میں سے کچھ سمندری پرندے اُڑے اور وہ رات کی سیاہی میں برف سفید ہوتے تھے۔۔۔ ہمارے برابر میں سے ایک تیزرفتار کشتی گزر گئی جس میں بلند موسیقی پر لوگ رقص کررہے تھے۔ یہ کراچی تھا، کہیں ٹارگٹ کلنگ، بھتہ خوری اور ایدھی ایسے فرشتے کو لوٹ لینا اور کیا۔۔۔ ایک تیزرفتار کشتی، جس میں بے خود لوگ رقص کرتے تھے

شام پئی بن شام محمد

مستنصر حسین تارڑ

Posted Date : 16/11/2014

زندگی کے ان گنت شب و روز گزر چکے لیکن یہ کیا ہے کہ ہم شب و روز کا حساب تو رکھتے ہیں لیکن اُن کے درمیان جو شامیں اتری ہیں اُن کا تذکرہ نہیں کرتے البتہ وہ جو آخری بلاوے کے دن ہوتے ہیں اُنہیں ہم زندگی کی شام کا نام دے دیتے ہیں، بہرطور جہاں میں نے شب و روز کا حساب رکھا وہاں شاموں کو بھی فراموش نہیں کیا اور جب شاموں کے بارے میں ایک عجیب سے نتیجے پر پہنچا ہوں۔ قدرت کے قبضے میں مظاہر ہمارے وجود میں آس پاس ظاہر ہوتے ہیں، وہاں اگر ایک شام اترتی ہے تو وہ آپ کو مسرت سے بھر دیتی ہے۔ کوئی بھی ایسی شام جو آبادیوں سے دور کسی عظیم تنہائی میں وارد ہو آپ کی زندگی کو خوشی سے دو چار کرتی ہے۔۔۔ اور مجھ پر ایسی بے حساب شامیں اتریں۔۔۔ کرو مبر جھیل کے کنارے، نانگا پربت اور کے ٹو کے دامن میں، جرمنی کے بلیک فارسٹ میں یا فیئری میڈو کے جنگل میں۔۔۔ اور ان سب نے میرے بدن کو تشکر سے سرشار کیا کہ خالق نے میرے لیے ایسے انعام بھی مخصوص کر رکھے تھے لیکن بیشتر شامیں جو آباد یوں میں اتریں وہ ہمیشہ دل کو اداسی سے بھر دینے والی تھیں۔ کسی بھی شہر کی شام، چاہے وہ لاہور ہو، یارقند یا قرطبہ ہو، ہمیشہ اپنے اندر ایک الم ناک سیاہی کو روپوش کرتی اداسی میں اترتی ہے۔۔۔ شہروں میں تو کبھی کبھار شام رنگین بھی ہو جاتی ہے لیکن یہ گاؤں کی شام ہے جو ہمیشہ آپ کے اندر ایک ہول بھرتی ہے۔ خاص طور پر سردیوں کی شاموں میں گاؤں کے گھروندے اور گلیاں اداسی کے بسیرے ہو جاتے ہیں۔ گاؤں کے لوگ دن بھر کی مشقت کے بعد سرشام کھانا کھا کر نیند میں چلے جاتے ہیں کہ انہوں نے اگلی سویر فجر سے بہت پہلے اپنے مویشیوں کو نہلانا دھلانا اور چارا کھلانا ہوتا ہے۔ سورج نکلنے سے پیشتر ہل جوت کر کھیتوں کی مٹی کو اتھل پتھل کرنا ہوتا ہے۔۔۔ اُن میں بیج بکھیرنا ہوتا ہے۔۔۔ چونکہ میرے والد صاحب اکلوتے بیٹے تھے اس لیے ہمارے آبائی گاؤں جو کالیاں جو کہ دریائے چناب کے کناروں پر واقع ہے وہاں

برادری میں کوئی ہمارا سگا نہ تھا۔ اُن کے بھائی ہوتے تو ہمارے لیے وہاں کچھ کشش ہوتی۔۔۔ چنانچہ ادھر جانا کم ہوتا۔۔۔ جب تک دادا اور دادی حیات رہے ہم لوگ باقاعدگی سے جو کالیاں جاتے رہے اور مجھے تو اُن کی شکلیں بھی یاد نہیں کہ میں جب چار پانچ برس کا تھا تو وہ چلے گئے۔۔۔ میرا گاؤں کا تجربہ میری نانی جان کا گھر تھا جو گکھڑ منڈی کے جاٹوں کے محلے میں جو محلہ مغربی کہلاتا تھا وہاں واقع تھا۔۔۔ تب وہ ایک کچا گھر تھا اگرچہ میرے نانا جان گاؤں کے نمبر دار تھے، مناسب زمین رکھتے تھے لیکن گھر کچا تھا۔۔۔ البتہ برابر میں امی جان کے چاچا جہان خان کی اجڑی ہوئی پکی حویلی تھی۔۔۔ نانی جان سرشام مٹی کا ایک چراغ روشن کر کے طاقچے میں رکھ دیتیں، لالٹین صرف تب روشن کرتیں جب ہم لاہور سے آتے، ہم روشنیوں کے عادی گاؤں پہنچ کر اُس کی شاموں میں اندھے ہو جاتے۔ لالٹین کی روشنی بھی ہماری چکا چوند کی عادی آنکھوں کے لیے ناکافی ثابت ہوتی اور ہم بھٹکتے پھرتے۔ دن کے وقت تو ہم خوب لطف اندوز ہوتے، کنویں پر چلے جاتے، بیلوں کو ہانکتے اور کنویں میں سے برآمد ہونے والی آبشار میں خوب نہاتے۔ لیکن یہ وہاں کی شام ہوتی تھی جو ہمیں ایک تاریک خوف سے بھر دیتی تھی۔۔۔ ہمارے شہری دلوں کو اپنی سیاہ مُٹھی میں بھینچ کر ہمیں اداسی کے اتھاہ سمندروں میں ڈبو دیتی۔۔۔ شام اترتی تو ”ڈنر“ سرو کر دیا جاتا۔ لالٹین کی روشنی میں کچے صحن میں دھریک کے ایک درخت کے قریب ہم سب گندم کی موٹی تندوری روٹیوں سے بھری چنگیر کے گرد بیٹھ جاتے اور یہ روٹیاں نانی جان نے اپنے ہاتھوں سے صحن کے ایک کونے میں واقع تندوری میں لگائی ہوتی تھیں۔ وہ کچی رکابیوں میں سالن ڈال کر ہمارے آگے رکھتیں اور ہم دیسی گندم کی گھنی خوش مہلک روٹی کے ساتھ اُسے کھانے لگتے۔ اُن گزر چکی گاؤں کی شاموں میں کُتّے بھی ہمارے ساتھ ”ڈنر“ میں شریک ہوتے۔ نانی جان کو علم تھا کہ ہر شام کتنے کُتّے اپنے رزق کے لیے ہمارے صحن میں داخل ہوتے ہیں اور وہ اُس حساب سے اُن کے لیے الگ روٹیاں، ذرا موٹی اور دبیز تندوری میں لاتیں اور پھر بڑے اہتمام سے اُنہیں توڑ کر اُن کے ”چپّے“ کرتیں۔ اور چنگیر کے دستر خوان میں الگ سے رکھ دیتیں۔ ہم کھانا کھا رہے ہوتے جب گھر کی چوکھٹ پار کر کے دُم ہلاتا تھوتھنی جھکائے صحن میں پہلا کتا داخل ہوتا، وہ آگے ہو کر ہمارے قریب نہ آتا۔ چوکھٹ کے قریب بیٹھ جاتا اور نانی جان اُس کی جانب روٹی کا ایک چپہ پھینک دیتیں اور وہ اُسے منہ میں دبوچ کر نہایت شکر گزاری سے پچھلے قدموں واپس چلا جاتا۔ محلے کے ہر گھر میں اُن کے لیے الگ سے پکائی ہوئی روٹیوں کے چپّے اُن کے لیے منتظر ہوتے۔ اُن کے رزق میں کمی نہ آتی۔ کبھی کبھار ایسے ہوتا کہ سالن بہت مزیدار ہوتا۔ مثلاً ہرے چنوں کا شوربہ اور ہم اپنے حصے کی روٹی کھا کر خواہش کرتے کہ کُتّوں کے لیے مخصوص چپّوں میں سے ایک چپہ ہمیں بھی مل جائے تو نانی جان سختی سے ڈانٹ دیتیں کہ خبردار۔۔۔ یہ کُتّوں کا رزق ہے۔ تمہارے لیے نہیں ہے۔۔۔ بسا اوقات ایسا ہو اکہ چنگیر روٹیوں سے بھری ہے، سالن کی ہانڈی چولہے پر دھری ہے اور نانی جان کسی کام کے لیے گھر کے اندر پسار میں گئی ہیں اور ایک کتّا صحن میں داخل ہوا ہے، مجال ہے کہ وہ کتّاروٹیوں کے قریب آئے، ہانڈی کو سونگھے، وہ چوکھٹ کے قریب بیٹھا رہتا جب تک نانی جان باہر آ کر اُس کے حصے کی روٹی اُس کے آگے نہ ڈال دیتیں۔ وہ بیت چکی گاؤں کی شامیں ہمیشہ اداس ہوتی تھیں، زندگی کی اس شام میں، میں اُن شاموں کو یاد کرتا ہوں۔

لوئے لوئے بھر لے کُڑیے، جے تُدھ بھانڈا بھرناں
شام پئی بِن شام محمد، گھر جاندی نیں ڈرناں

ہر جانب یار یار۔۔۔ اوراللہ حافظ
مستنصر حسین تارڑ
Posted Date : 19/11/2014

ویسے تو اگر گردش ایام کو پیچھے لوٹایا جائے تو آٹھ برس کی عمر میں، میں نے بچوں کے رسالوں میں لکھنا شروع کیا اور ان میں ”ہدایت“ جو نظرزیدی کے زیرادارت شائع ہوتا تھا ”تعلیم و تربیت“ اور ”کھلونا“ دہلی وغیرہ شامل تھے۔۔۔ لکھتا کیا تھا یونہی کہانیاں جوڑ جاڑ کر اور لطیفے کچھ خود بنا کر اورکچھ ادھر اُدھر سے کھینچا مار کے رسالوں میں بھیج دیا کرتاتھا، مجھے یاد ہے جب پہلی بار کسی

رسالے میں میرانام شائع ہوا تھا تو اُسے دیکھ کر جو نشہ طاری ہوا تھا، کیسے میں نے اپنے آپ کو بقیہ بچوں سے برتر سمجھا تھا تو وہ سر خوشی پھر کبھی نصیب نہ ہوئی ۔۔ اور ہاں میں یہ سوچ سوچ کر خوش ہوتا تھا کہ اگر یہ رسالہ پانچ ہزار کی تعداد میں شائع ہوا ہے تو پانچ ہزار رسالوں میں میرانام چھپا ہو گا بلکہ بک سٹالوں پر جا کر اس رسالے کی ورق گردانی کرکے اپنا نام تلاش کرتا کہ کیا بات ہے اس میں بھی میرا نام موجود ہے۔۔ دنیا کے بہت سے ملکوں میں اللہ تعالیٰ نے مجھے توقیر بخشی۔۔ اشتہاروں اور خوش آمدیدی بینرز پر اپنا نام جلی حروف میں دیکھا۔۔ سنکیانگ کے صدر مقام اُرمچی کی یونیورسٹی کی عمارت کے ماتھے پر ایک متحرک نیون سائن کی صورت ”ویلکم پاکستانی رائٹر مستنصر حسین تاڑ“ حرکت کرتے دیکھا۔۔ لیکن وہ سرخوشی اور روح پرور مسرت پھر بھی محسوس نہ ہوئی۔۔ بہرطور 1958ء میں پہلی بار میری بالغ اور سنجیدہ تحریروں کا آغاز ہوا اور ان زمانوں کے مؤقر ہفتہ وار ”قندیل“ میں میرا پہلا سفرنامہ ”لندن سے ماسکو تک“قسطوں کی صورت میں شائع ہوا۔۔ پھر گیارہ برس غفلت میں گزر گئے اور 1969ء میں دوبارہ میں سفرنامہ نویسی کی جانب لوٹا اور”نکلے تری تلاش میں“ کی اشاعت ممکن ہوئی۔۔ یہ ابتدائیہ قدرے طویل ہو گیا ہے، میں اپنی ادبی زندگی کی روئداد بیان نہیں کرنا چاہتا صرف یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ پچھلے تقریباً ساٹھ برس سے ہمارے معاشرے میں جو تبدیلیاں غیرمحسوس طریقے سے رونما ہوئی ہیں میں اُن کا چشم دید گواہ ہوں اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تقریباً ہر پچاس برس کے دوران ن صرف اخلاقی اقدار، زبان کا برتاؤ، لباس، گالیاں، محبت کا اظہار بدل جاتا ہے بلکہ جھوٹ اور سچ کے پیمانے بھی بدل جاتے ہیں بلکہ مذہب میں تبدیلی آ جاتی ہے۔ یہ موضوع دراصل اتنا گھمبیر ہے کہ ایک پوری کتاب کا تقاضا کرتا ہے تو اسے صرف ایک کالم میں قید کر کے مختصر کرتا ہوں۔

دیہات کے علاوہ شہروں میں ایک بے پردہ عورت کے کردار کے بارے میں شک کیا جاتا تھا۔۔ خواتین، مڈل کلاس خواتین سب کی سب برقعہ پوش ہوتی تھیں۔۔ میری والدہ اور خالائیں بھی برقع پہنتی تھیں۔۔ پھر برقع متروک ہوا اور اس کی جگہ چادر آ گئی اور پھر صرف دوپٹہ رائج ہوا۔۔ اور اب وہ بھی مفقود ہو رہا ہے۔۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اخلاقی گراوٹ کا چلن ہو گیا ہے بلکہ یہ زمانے کا بہاؤ ہے۔۔ اور پھر کچھ عرصہ پہلے خمینی کے انقلاب کے بعد یکدم حجاب پسندیدہ ہونے لگا تو یہ بدلتے زمانوں کا ایک اور رنگ ہے۔

ان زمانوں میں ریڈیو کی ”لعنت“ عام نہیں ہوئی تھی اور ہفتے میں دو بار آزاد کشمیر ریڈیو پر آدھ گھنٹے کے لئے فلمی گانے سنائے جاتے تھے اور میں اور میری چھوٹی خالہ جان چھپ کر یہ گانے سنتے تھے کہ کہیں ماموں جان کو خبر نہ ہو جائے اور یقین کیجئے اُن دنوں اگر کسی لڑکی کے لئے رشتہ آتا تھا اور انہیں کوئی محلے دار خبر کر دیتا تھا کہ لڑکی تو فلمی گانے سنتی ہے تو رشتہ اکثر منسوخ ہو جاتا تھا۔۔ اور اگر کہیں یہ راز افشا ہو جاتا تھا کہ لڑکی نے سینما جا کر ایک فلم دیکھی ہے تو وہ کنواری ہی مر جاتی تھی۔۔ اور ان دنوں شادیوں میں انڈین گانوں کی دھنوں پر میں نے ایسی ادھیڑ عمر خواتین کوبھی ناچتے دیکھا ہے جو نہایت باقاعدگی سے نماز پڑھتی ہیں۔

اب یہ جو لفظ ”یار“ ہے۔۔ یہ شرفاء کی زبان پر کبھی نہیں آتا تھا۔۔ یہ لفظ صریحاً بے راہروی اور غیراخلاقی رویوں کی ترجمانی کرتا تھا۔۔ بے شک فارسی میں آپ ویار من بیا بیا۔۔ الاپ سکتے تھے لیکن اردو مینیار کا مطلب یہی تھا کہ لڑکی اپنے یار کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ اور اب یہ ہے کہ ہر جانب ”یار یار“ ہو رہی ہے۔۔ لڑکیاں اسے بے دریغ استعمال کرتی ہیں بلکہ ”یار ابّو“ کہنے سے بھی گریز نہیں کرتیں بلکہ میرے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جب میرا پوتا یاشار میرے کندھے پر دھپ مار کر کہتا ہے ”یار دادا، آئس کریم تو کھلا دو“ اور میں پھر عرض کرتا ہوں کہ یہ اخلاقی گراوٹ کی نشانیاں نہیں ہیں۔۔ وقت کے ساتھ اظہار اور الفاظ کے معنی بدل گئے ہیں اور انہوں نے بدلنا ہی تھا۔۔ یوں نصف صدی کے دوران مذہب کے اظہار میں بھی تبدیلی آتی ہے۔ اُس کی بنیادی اقدار تو قیامت تک مستحکم ہیں لیکن ان میں ردوبدل اظہار کی صورت بدلتا رہتا ہے۔ مثلاً اُن زمانوں میں نکاح کی تقریب بے حد سادہ ہوتی تھی، صرف ایجاب و قبول کے معاملات طے پاتے تھے اور اب نکاح بھی نہایت پیچیدہ ہو چکا ہے۔ نکاح خواں ازاں بعد۔۔ کھڑے ہو کر ایک طویل تقریر کرتے ہیں بلکہ باقاعدہ خطبہ دیتے ہیں یہاں تک کہ کھانا ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ شادی کے علاوہ مرگ پر بھی اسی نوعیت کی انقلابی تبدیلیاں، جن کا مولانا انقلاب سے کچھ واسطہ نہیں، رونما ہو چکی ہیں۔۔ تب ہم بچھڑ جانے والے کو سپردخاک کر کے خاموشی سے قبرستان سے باہر آ جاتے تھے، باہر آ کر ایک مرتبہ پھر فاتحہ پڑھتے تھے اور رنجیدگی میں گھر لوٹ جاتے تھے۔۔ اور اب یہ ہے کہ تدفین بھی جدید ہو چکی ہے۔۔ یعنی یہ رواج بھی زمانوں کے تغیر کے ساتھ تبدیل ہوا ہے اور گھڑوں کی بجائے سیمنٹ کی سِلیں قبر میں آراستہ کی جاتی ہیں اس اہتمام کے ساتھ کہ ہر سِل پر کلمہ شریف مارکر یا چاک سے لکھا جاتا ہے۔

اور بدلتے زمانوں میں ”خدا“ کی بجائے ”اللہ“ مستعمل ہو گیا ہے۔۔ ہم تو پوری زندگی ”خدا حافظ“ کہتے چلے آئے تھے اور یکدم انکشاف ہوا کہ یہ تو سب رائیگاں گیا۔۔ ہم نے جن ہزاروں عزیزوں دوستوں کو خدا کے سپرد

کیا تھا تو ہم کیسے ناداں تھے کہ خدا تو اور قوموں کے بھی ہوتے ہیں تو ہم نے اپنوں کو صرف اللہ کے سپرد کر کے ”اللہ حافظ“ کہنا ہے۔ میں نے اپنی نادانی میں ایک بار لمحۂ موجود تک سب سے مستند مولانا فتح محمد جالندھری کے قرآن پاک کے اردو ترجمے کا حوالہ دیا کہ انہوں نے آغاز میں ”شروع کرتا ہوں خدا کے نام سے“ لکھا ہے تو بھی میری کچھ شنوائی نہ ہوئی کہ زمانے کے ساتھ مذہب کا اظہار بھی بدل چکا تھا۔ خدا کو رخصت کر دیا گیا تھا اس لئے میری عافیت اسی میں ہے کہ میں اس کالم کے آخر میں ”خدا حافظ“ کا مرتکب نہ ہوں۔۔۔ اس لئے۔۔۔ اللہ حافظ!

جھاڑو چور اور۔۔۔ ایک ہری شاخ

مستنصر حسین تارڑ

Posted Date : 23/11/2014

میں روزانہ وہاں سے گزرتا تھا۔۔۔ ہر سویر ماڈل ٹاؤن پارک کے ڈھائی کلو میٹر طویل ٹریک پر چلتا روزانہ پارک کے چھوٹے گیٹ کے قریب سے گزرتا تھا اور میں نے کبھی غور نہ کیا کہ وہاں ہم پاکستانیوں کی ”ایمانداری“ کا ایک چھوٹا سا یادگاری نمونہ ہے اور پھر شاید یہ ڈاکٹر انیس تھے جنہوں نے اُس کی نشاندہی کی اور کہا ”میں روزانہ یہاں سے گزرتا ہوں اور یہ یادگاری نمونہ دیکھ کر شرم سے سر جھکا لیتا ہوں کہ کیا ہم من حیثیت القوم اتنے بے ایمان ہو چکے ہیں۔۔۔ چھوٹے گیٹ کی دیوار کے ساتھ کوئی پائپ تھا اور وہاں پارک کے خاکروب کا جھاڑو پڑا تھا اور اُس جھاڑو کو چوری ہو جانے سے بچانے کے لیے اُس کے گرد ایک زنجیر پڑی تھی اور زنجیر کو ایک قُفل سے بند کیا گیا تھا اور یہ معمولی نہیں ایک خاصا بڑا اور مضبوط قُفل تھا۔ کیا ان دنوں جھاڑو بھی محفوظ نہیں، اُنہیں بھی چوری کر لیا جاتا ہے۔۔۔ جب خاکروب سے اس معاملے کے بارے میں گفتگو ہوئی تو وہ کہنے لگا ”صاحب جی۔۔۔ پارک والے مجھے صفائی کرنے کی تنخواہ دیتے ہیں، جھاڑو مجھے اپنے پلے سے خریدنا ہوتا ہے۔۔۔ میں اپنے جھاڑو کو ڈیوٹی کے بعد گھر نہیں لے جا سکتا تھا کہ بہت دور رہتا ہوں۔۔۔ یوں بھی جھاڑو کے ساتھ مجھے کون ویگن میں بیٹھنے دے گا چنانچہ میں اپنا جھاڑو کسی جھاڑی میں یا درخت کی کھول میں پوشیدہ کر کے چلا جاتا ہوں اور پھر بھی وہ ہر دو چار روز بعد چوری ہو جاتا تھا۔۔۔ اور یقین جانئے ہم خاکروب ایک دوسرے کے جھاڑو چوری نہیں کرتے کہ یہ ہمارے رزق روزگار کا ذریعہ ہیں، ہمارے لیے ایک احترام کے قابل شے ہیں۔ ہمارے جھاڑو آپ جیسے لوگ چوری کرتے ہیں۔۔۔ چنانچہ میں نے تنگ آ کر یہ مہنگا تالا اور لوہے کی زنجیر خریدی اور اس پائپ کے ساتھ باندھ کر جھاڑو کو تالا لگا دیا۔۔۔ اور صاحب جی اس کے باوجود مہینے میں ایک آدھ بار میرا جھاڑو پھر بھی چوری ہو جاتا ہے۔ لوگ کسی نہ کسی طرح تالا کھول لیتے ہیں۔ اور کچھ نہ ہو تو جھاڑو کی تیلیاں کھینچ کر لے جاتے ہیں۔۔۔ اب میں اور کیا کروں۔۔۔ اب یہ مقفل جھاڑو روزانہ مجھے شرمندگی سے دوچار کرتا ہے، میں اُدھر نظر ڈالنے سے گریز کرتا ہوں پھر بھی آنکھیں ادھر چلی جاتی ہیں۔۔۔ اس سے پیشتر سبیلوں اور کولروں کے زنجیروں سے بندھے سلور کے دو چار روپے مالیت کے گلاس مجھے شرمندہ کرتے تھے لیکن میں کبھی تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ ہم جھاڑو چور بھی ہو چکے ہیں۔۔۔ جمہوریت، آئین اور مینڈیٹ وغیرہ تو اکثر چوری ہوتے رہتے تھے، جھاڑو تو کبھی چوری نہ ہوئے تھے۔۔۔ پارک کے کناروں پر ایک نہایت شاندار مسجد کا پروقار مینار بلند ہوتا ہے۔ اس مسجد کی تعمیر میں ایک نہایت پڑھے لکھے مفتی صاحب کی ان تھک کوششوں کا حصہ ہے، وہ مشرف کے زمانوں میں ایک مختصر عرصے کے لیے پنجاب کے مذہبی امور کے وزیر بھی رہے۔ اکثر وہ جو گنگ سوٹ میں ملبوس ہمارے ساتھ سیر کیا کرتے تھے۔ ایک روز کہنے لگے، میں نے تبلیغ کی خاطر ایک مغربی ملک کا قصد کیا اور ویزے کی درخواست دی۔۔۔ ویزا افسر نے پوچھا کہ آپ کس سلسلے میں ہمارے ملک جانا چاہتے ہیں تو میں نے یونہی ہنس کر کہا۔۔۔ آپ لوگوں کو کفر کی تاریکیوں سے آزاد کرنے کے لیے، ویزا تو اُن نے منظور کر لیا لیکن مسکرا کر کہنے لگا ”آپ پہلے اپنے زنجیروں سے بندھے گلاسوں کو تو آزاد کر لیجیے“۔۔۔ گلاسوں کے بعد اب ہمیں جھاڑوؤں کو بھی آزاد کرنا پڑے گا۔

آخر ہم میں جو اُس ہستی کے نام لیوا ہیں جو امین تھا، صدیق تھا، بے ایمانی اور کرپشن کیسے سرایت کر گئی ہے۔۔۔ کسی کا قول ہے کہ ہم خدا کو تو مانتے ہیں لیکن خداکی نہیں مانتے۔۔۔ ایسا کیوں ہو گیا ہے۔

پچھلے دنوں ایک کالم میں پڑھا کہ بین الاقوامی کاروباری امور کے طالب علموں سے نیویارک کی کولمبیا یونیورسٹی میں دنیا کے ایک عظیم ترین کاروباری ادارے، راک فیلر فاؤنڈیشن کے ایک چیف ایگزکٹو نے لیکچر دیا تو ایک پاکستانی نے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ آپ کا ادارہ دنیا بھر میں کاروبار کرتا ہے لیکن۔۔۔ آپ پاکستان کو در خور اعتنا نہیں سمجھتے تو اس نے کہا تھا۔۔۔ ہم چاہتے ہیں کہ ایسا ہو لیکن ہم یہ نہیں کر سکتے کہ اپنے شراکت داروں کا پیسہ پاکستان میں کاروبار پر لگائیں اور آپ کے حکمرانوں کو کمیشن بھی ادا کریں۔

ہمیں ’حکم ہے کہ برائی دیکھ تو اُس کے خلاف جدوجہد کرو۔۔ نہ کر سکو تو زبانی احتجاج کرو اور یہ بھی نہ کر سکو تو کم از کم دل میں اُسے برا سمجھو۔۔ لیکن آج۔۔ ہم اُسے دل میں بھی برا نہیں سمجھتے۔ اُسے قبول کر چکے ہیں۔ ایک وزیر قانون کی ویڈیو آن ایئر جاتی ہے۔ بے شک وہ پرانی ہے لیکن لین دین ہو رہا ہے۔۔ چیک وصول کیے جا رہے ہیں اور ایک بدنام زمانہ شخص ہے جسے انٹر پول تلاش کرتی پھرتی ہے اُس کے وارنٹ جاری ہو چکے ہیں اور پھر بھی ایک میڈیا پر ایک صاحب اُس کا دفاع کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں، بھئی یہ تو ہوتا رہتا ہے۔ یعنی ۔۔ ہم برائی صدق دل سے قبول کر چکے ہیں۔

ایک زمانے میں اور پاکستان کی تاریخ کے تاریک ترین زمانے میں یوم آزادی پر میں نے اسلام آباد ٹیلی ویژن کے لیے ایک خصوصی کھیل ”ہری شاخ“ تحریر کیا تھا۔ جس کے نتیجے میں میں معتوب ہوا۔۔ اس ڈرامے کو اقبال انصاری جیسے ذہین پروڈیوسر نے پروڈیوس کیا۔۔ سرمد صہبائی جو اُن دنوں سکرپٹ ایڈیٹر تھا اُس کی طلبی ہو گئی اور اُس نے اپنی چرب زبان سے یہ ثابت کر دیا کہ دراصل یہ کھیل موجودہ حکومت کے حق میں لکھا گیا ہے تو ہماری جان عذاب سے چھوٹی۔

ڈرامے کا نام ”ہری شاخ“ تھا جو میں نے سراج اورنگ آبادی کی اُس غزل سے مستعار لیا تھا جسے بہت سے لوگ اردو کی سب سے بڑی غزل قرار دیتے ہیں۔ نہ جنوں رہا، نہ پری رہی۔۔ وہی غزل۔۔ اور وہ شعر تھا۔

چلی سمت غیب سے اِک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہال جسے غم کہیں وہ ہری رہی

ایک نہایت جدید خیالات کا روشن طبع، اعلیٰ ترین تعلیمی قابلیت کا سول سروس کا امتحان دیتا ہے اور فیصلہ کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو پاکستان کے لیے وقف کر دے گا۔۔ کبھی اپنے وطن سے بے وفائی نہ کرے گا۔۔ رزق حلال پر گزر اوقات کرے گا، فروخت نہ ہو گا۔۔ اور جب اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتا ہے ایک بیورو کریٹ ہو جاتا ہے تو کسی وزیر، صنعت کار یا سیاست دان کی سفارش نہیں مانتا۔۔ اس دوران اُسے ایک نفسیاتی عارضہ لاحق ہو جاتا ہے۔ اُسے ہر جانب۔۔ دفتروں، بنگلوں، وزراء کی رہائش گاہوں، اپنے ساتھیوں کے گھروں میں دُھول نظر آتی ہے، وہ جہاں بیٹھا ہے اُسے شک ہوتا ہے کہ کرسی پر دھول کی تہہ ہے، میز پر دھول جمی ہے اور وہ ہمیشہ اپنی انگلی اس کی سطح پر پھیر کر دیکھتا ہے کہ کیا واقعی وہاں دھول ہے یا یہ اُس کا واہمہ ہے۔ جیسے پاکستانی معاشرے میں کسی بھی غیر معمولی ٹیلنٹ کو برداشت نہیں کیا جانا چاہیے وہ سیاست میں ہو یا ادب میں یا تو اُسے پھانسی چڑھا دیا جاتا ہے اور یا اُسے غیر محب الوطن قرار دے کر معتوب کر دیا جاتا ہے اس نوجوان بیورو کریٹ پر کرپشن کے مقدمات اس لیے قائم کر دیئے جاتے ہیں کہ وہ کرپٹ نہیں ہے۔ وہ انصاف کے حصول کی خاطر ملک کی سب سے اعلیٰ عدالت میں اپنا کیس پیش کرتا ہے اور وہاں بھی جب وہ چیف جسٹس کی میز پر اپنی انگلی پھیرتا ہے تو وہاں دھول ہوتی ہے۔ اُسے انصاف نہیں ملتا تو وہ ایک سی ایس پی کی حیثیت سے اپنی آخری اپیل ملک کے سب سے اعلیٰ حکمران کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔۔ وہ حکمران جس کے پس منظر میں پاکستانی پرچم ہے ایک وزیراعظم ہے۔۔ وہ اس کی خدمت میں پیش ہو چکا ہے اور حسب عادت اس کی میز کو اُنگلی سے چھوتا ہے تو وہاں بھی دھول ہے۔۔ اور یہاں ”ہر ی شاخ“ کا اختتام ہو جاتا ہے۔

میں تو اب بھی اُمید کا دامن نہیں چھوڑ رہا۔۔ مجھے یقین ہے کہ بے شک چمن سرور کا جل گیا ہے لیکن۔۔ ایک شاخ نہال جسے کہیں وہ ہری رہے گی۔۔ اس کے باوجود کہ ہم جھاڑو چور ہو چکے ہیں

بڑے شاعر اور ادیب کنوارے کیوں مر گئے

مستنصر حسین تارڑ

Posted Date : 30/11/2014

پنجابی صوفی شاعری میرے بدن اورروح میں ان پرتشدد زمانوں میں جب کہ بچوں، عورتوں اور معصوم لوگوں کو اور ہمارے جوانوں کو ہلاک کر کے اُن کے سر کھمبوں پر آویزاں کرنے والوں کو شہید قرار دیا جاتا ہے۔ بے وجہ قتال اور اپنی دھرتی کے خلاف ”جہاد“ کرنے کو جائز ٹھہرایا جاتا ہے۔ یہ صرف پنجاب کے صوفی شعراء کا کلام ہے جو مجھے ڈھارس دیتا ہے۔۔ کہ نہیں، بے شک یہ کشت ویراں ہے، اس میں بارود اور خون کی بو ہے۔۔ ایک بھٹے میں زندہ جلائے جانے والے بے قصور جوڑے کے جلتے ہوئے گوشت کی بو ہے لیکن یہ ہم نہیں، ہمارا دین یہ نہیں۔۔ میرے پیارے رسول ﷺ کا یہ پیغام تو نہیں اور یہ صرف پنجابی صوفی شاعر ہیں جو امن اور سلامتی کے اس پیغام کو عام کرتے ہیں۔ میاں محمد صاحب کہتے ہیں۔

بال چراغ عشق دا تے کر دے روشن سینہ
دل دے دیوے دی رُشنائی جاوے وِچ زمیناں

ہم تو عشق کا چراغ روشن کرنے والے ہیں اور ہمارے دل میں عشق رسول اللہؐ کا دیا جلتا ہے اُس کی روشنی تو زمینوں کے اندر تک چلی جاتی ہے۔ ہم نے یہ دِیا کبھی بجھنے نہیں دینا۔ بس یہی ہماری فلاح ہے اور یہی شفاعت کا واحد راستہ ہے۔

میں نے پچھلے کالم میں شیخ منظور الٰہی مرحوم کو یاد کرتے ہوئے اُن کی رہائش گاہ میں جو یادگار محفلیں ہوا کرتی تھیں اُن کا تذکرہ کیا تھا تو ایک بار مشتاق احمد یوسفی نے مختار مسعود صاحب سے پوچھا۔۔ اور یاد رہے کہ ”آواز دوست“ کے مصنف مختار مسعود صاحب سوہنی کے شہر گجرات کے باسی ہونے کے باوجود پنجابی میں کلام کرنے سے گریز کرتے ہیں اور نہایت نستعلیق اردو میں حاضرین محفل سے گفتگو کرتے ہیں، علی گڑھ کے تہذیبی حصار سے باہر نہیں آتے اور تانگے کو ہمیشہ ٹم ٹم ہی کہا کرتے تھے تو یوسف صاحب نے پوچھا ”مختار صاحب۔۔ ان دنوں آپ کی تخلیقی مصروفیات کیا ہیں“ تو مختار مسعود کہنے لگے ”ان دنوں میں صوفیا کرام کی عائلی زندگی کے بارے میں تحقیق کر رہا ہوں۔۔ کہ وہ کیسی تھی، ”بری ہی ہو گی“ یوسفی صاحب نے نہایت سنجیدگی سے کہا ،تبھی تو وہ صوفی ہو گئے، پچھلے دنوں میرے دوست مشتاق صوفی نے، اور وہ عجیب سے صوفی ہیں، انہوں نے ایک انکشاف کیا کہ جتنے بھی بڑے صوفی شعراء ہو گزرے ہیں اُن میں سے بیشتر غیر منکوحہ رہے، انہوں نے عمر بھر شادی نہ کی۔۔ بے شک وارث شاہ اپنی بھاگ بھری کے عشق میں مبتلا رہے لیکن ایک مجرد زندگی گزار دی۔ نہ ہی بلھے شاہ نے شادی کی اور نہ ہی شاہ حسین نے۔۔ یہاں تک کہ میاں محمد بخش بھی کنوارے ہی رہے۔۔ تو کیا اُن کی عظیم شاعری صرف اس لیے وجود میں آئی کہ وہ کبھی شادی کے بندھن میں نہ بندھے۔۔

اب میں اپنے قیاس کے گھوڑے دوڑاتا ہوں کہ انہوں نے عمر بھر عورت کی قربت سے، ایک بیوی کی رفاقت سے کیوں گریز کیا۔ شاید اس لیے کہ وہ دنیاوی رشتوں سے ماورا ہو کر اُس ایک عشق میں مبتلا ہو گئے تھے جس کے بعد کسی انسانی عشق کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔۔ وہ انسانی رشتوں سے اس لیے گریز کرتے تھے کہ وہ معاشرے کے بندھنوں سے بندھ کر محدود ہو سکتے تھے وہ لامحدود کی جستجو میں تھے۔۔ اگرچہ یہ کوئی حتمی کلیہ تو نہیں ہے، بہت سے بڑے تخلیق کار شادی شدہ تھے اور اس کے باوجود انہوں نے بڑی شاعری اور عظیم ادب تخلیق کیا لیکن ذرا دیکھئے کہ۔۔ نہ ہمیں عظیم شاعر ہومر اور نہ ہی شیکسپیئر کی بیوی کا سراغ ملتا ہے۔۔ غالب اگرچہ شادی شدہ تھے اُن کی اہلیہ نے اُن پر کیسے کیسے ستم ڈھائے، ٹالسٹائی اپنی بیوی سے فرار ہو کر کسی نامعلوم ریلوے سٹیشن پر جا کر مر گیا۔

دوستووسکی کے بارے میں بھی کیا کہہ سکتے ہیں کہ اُس کے شادی شدہ ہونے کا کہیں تذکرہ نہیں۔ لارڈ بائرن تو ویسے ہی ایک کھلنڈرا شخص تھا، میر تقی میر کے بارے میں بس کوئی تحقیق کرے کہ کیا وہ اُسی عطار کے لونڈے سے ہی دوا لیتے تھے یا کبھی منکوحہ بھی ہو گئے۔۔ اپنے شیخ سعدی نے بھی ”بوستان“ میں نہایت حسین لونڈوں کا تذکرہ کیا ہے، کیا کسی کو معلوم ہے کہ انہوں نے کبھی شادی بھی کی۔۔ عمر خیام بھی اگرچہ رنگ رنگیلے تھے لیکن اُن کی بیگم کا بھی سراغ نہیں ملتا۔

چند برس پیشتر نیویارک سے کچھ فاصلے پر ٹیری ٹاؤن قصبے میں مشہور امریکی مصنف ارونگ واشنگٹن کا پرانا گھر دیکھنے کا اتفاق ہوا جو دریائے ہڈسن کے کنارے واقع ہے۔ مجھے ارونگ سے لگاؤ اس لیے تھا کہ اس نے ”الحمرا کی کہانیاں“ نام کی کتاب لکھی جس نے یورپ بھر کو احساس دلایا کہ اُندلس کے شہر غرناطہ کی ایک پہاڑی پر مسلمانوں کے تعمیر کردہ ایک شاہکار قصر کے کھنڈر بکھرے پڑے ہیں اور اس عجوبے کو فنا نہیں ہونا چاہیے چنانچہ اسے بحال کر کے اس کی عظمت کو محفوظ کر لیا گیا۔ ارونگ ایک امریکی سفارت کار کی حیثیت سے غرناطہ تعینات ہوا اور اُس نے الحمرا کے اجڑے ہوئے قصر میں قیام کے دوران1829ء میں ”الحمرا کی کہانیاں“ اپنے تصور کے کرشمے سے تخلیق کیں ۔۔ ”میں نے ٹیری ٹاؤن کے قبرستان سیپسی ہالو میں اس کی قبر بھی دیکھی اور اس کا پرانا مکان بھی دیکھا اور وہاں گائیڈ نے ہمیں بتایا کہ واشنگٹن ارونگ نے بھی کبھی شادی نہ کی اور اس کی بھتیجیاں اس کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ اب یہ محققین کا کام ہے کہ وہ کھوج لگائیں کہ دنیا کے بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں نے آخر شادی سے کیوں گریز کیا۔ تمام عمر تنہائی میں کیوں بسر کی۔ شاید میں آج تک بڑا مصنف نہیں بن سکا کہ میری تو شادی ہو گئی تھی بلکہ کسی حد تک کر دی گئی تھی

یونہی شیخ منظور الٰہی یاد آ گئے

Posted Date : 03/12/2014

مستنصر حسین تارڑ

شیخ منظور الٰہی کیسے باکمال اور خوشگوار شخص تھے، بے شک ایک بیورو کریٹ تھے، کچھ مدت پنجاب

کے عبوری وزیراعلیٰ بھی رہے لیکن کیسے سادہ طبیعت اور خوشگوار شخص تھے اس لئے کہ وہ جسے انگریزی میں کہتے ہیں ناں "ایٹ ہارٹ" تو وہ دل سے ایک ادیب تھے۔ اُنہوں نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں جن میں "در دل کشا" کے علاوہ اُندلس کا ایک لاجواب سفرنامہ بھی تھا لیکن اُنہوں نے کچھ اور بیوروکریٹس کی مانند اپنی کتابوں کی تشہیر کے لئے اپنی سرکاری حیثیت کو بے دریغ استعمال نہ کیا اگرچہ اُن کے گرد بھی ادب کے "شکاری"منڈلاتے رہتے تھے، یہ شکاری کسی بھی صاحب اختیار کو جوکہ کسی حد تک ایک لکھاری یا شاعر ہو اُسے یقین دلا دیتے تھے، اُس کی تحریروں کی توصیف میں زمین آسمان کے علاوہ جتنے بھی قلابے ہوتے تھے اُنہیں ملا دیتے تھے، کہ بس سَر، آپ جیسا ادیب یا شاعر نہ کبھی پیدا ہوا اور نہ ہی مستقبل میں کچھ امکان ہے اور وہ صاحبِ اختیار اکثر فوراً بانس پر چڑھ جاتا تھا اور اُس پر چڑھنے سے پیشتر کسی نہ کسی طریقے سے "شکار" ادیبوں کو فیض یاب کر جاتا تھا۔۔۔ اور پھر جب بے اختیار ہوجاتا تھا، اقتدار میں نہ رہتا تھا تو بانس پر ہی بیٹھا رہتا تھا اور جب نیچے نظر کرتا تھا تو شکاری حضرات دور دور تک نظر نہ آتے تھے، وہ کسی اور شکار کی جانب چلے گئے ہوتے تھے۔ میں ایسے بیوروکریٹس کو جانتا ہوں جو ایک حکم نامہ زبانی جاری کر دیتے تھے کہ محکمے کے تمام افراد میری فلاں لازوال تصنیف خرید کر پڑھیں اور بے چارے ماتحت اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے تو وہ تصنیف اُن کی بغل میں ہوتی تھی تو پھر وہ بیوروکریٹ نہایت تکبر سے دعویٰ کرتے تھے کہ جناب پہلا ایڈیشن تو ایک ماہ کے اندر اندر فروخت ہوگیا۔ ایک اور صاحب اپنے ماتحت عملے کو اپنی کتاب خریدنے کا مفت مشورہ دیتے تھے اور پھر ناشر کے پاس جا کر اُن کتابوں کی کمشن وصول کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ضیاء الحق کی دائیں یا بائیں مونچھ کا بال تھے، فوج سے تعلق تھا اور ضیاء الحق کی قربت کے باوجود ایک نہایت نفیس انسان تھے اور سی ون تھرٹی کے حادثے میں مجھے اُن کے ہلاک ہونے کا ہی افسوس ہوا، اُنہیں بھی شکاری ادیبوں نے یقین دلا دیا کہ وہ ایک عظیم ادیب اور عظیم ناول نگار ہیں، مجھے یاد ہے کہ اُن کے ایک ناول کے بارے میں ایک مؤقر روزنامے کا پورا صفحہ وقف کر دیا گیا تھا جس میں اُنہیں شاید اس صدی کا سب سے بڑا ناول نگار قرار دیا تھا، آج اُس ناول کا نام بھی کسی کو یاد نہیں۔۔۔ اسی طور ایک بار کسی صحرائی شہر میں جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں کے ڈپٹی کمشنر نے مجھے اور عبداللہ حسین کو اپنے ہاں رات کے کھانے پر مدعو کیا تو وہاں کچھ ادیب بھی جھکے جھکے پھرتے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ "ڈی سی جی" گروپ کے ادیب ہیں یعنی۔۔۔ ڈپٹی کمشنر گھیرو۔۔۔ گروپ کے۔ تمہید قدرے طولانی ہو گئی لیکن میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ شیخ منظور الٰہی نہ کسی کو گھیرتے تھے اور نہ ہی شکاریوں کے گھیرے میں آتے تھے، وہ صرف اپنی تخلیقی صلاحیت کے بل بوتے پر ادب کی دنیا میں نمایاں ہوئے۔۔۔ جب اُنہوں نے اُندلس کے بارے میں کتاب لکھی تو ہمیشہ کہتے تھے کہ میں یہ کتاب آپ کے "اُندلس میں اجنبی" کے تتبع میں لکھ رہا ہوں۔۔۔ مجھے آج شیخ منظور الٰہی بے پناہ یاد آ رہے ہیں شاید اس لئے بھی کہ میری بیگم ابھی ایک روز پہلے اُندلس کے سفر سے لوٹی ہے، میڈرڈ، قرطبہ، غرناطہ اور بارسلونا کے سفر سے لوٹی ہے اور اُس نے بھی شیخ صاحب کی کتاب کے بہت حوالے دیئے۔۔۔ شیخ منظور الٰہی اور اُن کی بیگم زہرہ کیسا شاندار جوڑا ہوا کرتے تھے اور عمرکے اس حصے میں جو شام ہو رہی ہے اُس میں بہت سے دوست اور ادیب بچھڑتے جاتے ہیں لیکن قلق اس بات کا ہوتا ہے کہ کچھ مثالی اور سوہنے جوڑے بھی بچھڑ جاتے ہیں۔ اشفاق صاحب چلے گئے تو بانو آپا کے سفید بالوں کی اُداسی دیکھی نہیں جاتی۔۔۔ اصغر بٹ رخصت ہوئے تو نثار عزیز بٹ ایسی بڑی ناول نگار ایک قید تنہائی کاٹ رہی ہیں۔۔۔ انتظار حسین کی بیگم نے ساتھ چھوڑ دیا تو وہ بھی بھٹکتے پھرتے ہیں، مشتاق احمد یوسفی میں عمر کے باوجود بہت دم خم تھا، اُن کی اہلیہ کینسر کا شکار ہوئیں تو اُن کا بھی دم نکل گیا۔ وہ اتنے کھو گئے ہیں کہ کراچی آرٹ کونسل کی تقریب میں انہوں نے خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھا اور پہچانا نہیں۔ اسی طور شیخ منظور الٰہی چلے گئے تو ان کی بیگم زہرہ بھی اُجڑ کر رہ گئیں ، لیکن اُنہوں نے اپنے آپ کو فلاحی اداروں سے منسلک کر کے اپنے آپ کو مصروف کر رکھا ہے، وہ آنکھوں کے ایک مشہور ہسپتال میں رضاکارانہ طور پر سری لنکا کی عنایت کردہ "آنکھوں" سے نابینا ہوتے لوگوں کو بینائی عطا کرتی ہیں۔

شیخ صاحب کے گھر میں ہم اکثر رات کے کھانے پر مدعو رہتے، کسی نہ کسی بہانے وہ ہمیں مہمان کرتے رہتے، خاص طور پر جب یوسفی صاحب کراچی سے تشریف لاتے تو وہ ایک پُرتکلف دعوت کا اہتمام کرتے۔ بیگم زہرہ ہمیشہ میری ایک من پسند ڈش خصوصی طور پر تیار کرتیں۔ وہاں بہرطور مختار مسعود ہوتے، انتظار حسین بھی موجود ہوتے یہاں تک کہ ایک دعوت میں روحی بانو بھی بوکھلائی بوکھلائی پھرتی تھیں۔۔۔ یہ اُن دنوں کا قصہ ہے جب امجد اور عطا لازم و ملزوم تھے، ابھی آپس میں اَٹ خدا دا ویر۔۔۔ نہ ہوا تھا اور کھانے کے اختتام پر ایک بار زہرہ نے کہا کہ۔۔۔ اب آپ دونوں شروع ہو جائیں، اس محفل کو کشتِ زعفران کردیں اور اُن دونوں نے ہماری توقع کے مطابق لطیفے سُنا سُنا کر سب کو۔۔۔ تقریباً سب کو۔۔۔ ہنسا ہنسا دیا، کہ یہ دونوں فنِ لطیفہ گوئی میں بے مثل تھے۔

شیخ منظور الٰہی کے جنازے پر میں نے مختار مسعود کو دیکھا تو وہ اُن کے بچھڑ جانے کے بوجھ سے ڈھے چکے تھے۔ اُنہوں نے مجھے گلے سے لگا لیا اور کہنے لگے، یار چلا گیا ہے۔
سب کچھ فراموش ہو جائے گا۔ شیخ منظور الٰہی کہاں کہاں ڈپٹی کمشنر رہے، کہاں کمشنر رہے یا کبھی چیف منسٹر رہے کسی کویاد نہ رہے گا البتہ ”در دل کشا“ اور اُندلس کا سفرنامہ کبھی فراموش نہ ہو گا۔

اندھیر نگری اور چوپٹ راجہ
مستنصر حسین تارڑ
Posted Date : 07/12/2014
شاعر مچاڈو نے غرناطہ کا حسن بیان کرنے کے لیے کہا کہ۔۔۔
اے عورت، اس اندھے گداگر کو بھیک دو کہ غرناطہ ایسے شہر میں ہونا اور اندھا ہونا اس سے بڑی ” بدقسمتی اور کوئی نہیں ہے“ یعنی غرناطہ کا حزن آمیز حسن ہو اور انسان آنکھوں سے محروم ہو، اُسے دیکھ نہ سکے اس سے بڑھ کر بدنصیبی اور کیا ہو سکتی ہے۔ کوئی پاکستانی شاعر کہے نہ کہے لیکن میں مچاڈو کے شعر میں تھوڑی سی ترمیم کر کے کہے دیتا ہوں کہ۔۔۔
اے عورت، اس اندھے گداگر کو بھیک دو کہ لاہور ایسے شہر میں ہونا اور اندھا ہونا اس سے بڑی بدقسمتی ” اور کوئی نہیں ہے“ اس لیے نہیں کہ لاہور اتنا خوبصورت ہے کہ ایک اندھا اُسے دیکھ نہیں سکتا بلکہ اس لیے کہ لاہور خود اندھا ہو چکا ہے، ایک اندھیر نگری ہے جس کے چوپٹ راجے اپنے نابیناؤں پر لاٹھی چارج کرتے ہیں، اُنہیں جانوروں کی مانند دھکے دے کر فٹ پاتھوں پر گراتے ہیں اور مسکراتے ہیں۔ میں ہو سے سراماگو کے ناول ”بلائنڈ نیس“ یا ”نابینائی“ کا اکثر حوالہ دیتا ہوں کہ یہ میرے پسندیدہ ترین ناولوں میں سے ہے جسے پڑھ کر مجھے اپنی کم مائیگی کا شدت سے احساس ہوا تھا اور میرا جی چاہا تھا کہ میں اپنے تحریر کروہ تمام ناولوں کو جلا ڈالوں کہ ناول تو ”نابینائی“ جیسا ہوتا ہے۔۔۔ جنوبی امریکہ کے ایک پر رونق بڑے شہر کی صبح ہے۔ لوگ اپنے کاروباروں اور ملازمتوں پر پہنچنے کے لیے شاہراہوں پر ہجوم کرتے ہیں۔۔۔ ایک چوراہے پر ٹریفک سگنل سرخ ہے اور کاروں کی ایک بے چین قطار اُس کے سبز ہونے کے انتظار میں متحرک ہونے کے لیے تیار ہے۔ سگنل سبز ہوتا ہے، کاریں چل پڑتی ہیں، ایک کار ڈرائیور کے آگے جو کار ہے وہ حرکت نہیں کرتی، وہ اُسے غصے میں ہارن دیتا ہے، مسلسل دیتا ہے اور پھر بھی وہ کار کھڑی رہتی ہے تو ڈرائیور طیش میں آ کر اپنی کار سے اتر کر ساکت کار کی جانب لپکتا ہے، سٹیرنگ پر بیٹھے شخص سے کہتا ہے۔۔۔ سگنل سبز ہو چکا ہے، تم اپنی کار کو حرکت کیوں نہیں دیتے؟ وہ شخص اُس کی جانب دیکھے بغیر کہتا ہے ”اس لیے کہ میں اندھا ہو گیا ہوں“۔۔۔ اُس شخص کو لوگ ہسپتال لے جاتے ہیں اور ڈاکٹر اُس کی آنکھوں کا معائنہ کر کے کہتے ہیں ”اس کی آنکھوں میں کچھ خرابی نہیں ہے۔۔۔ حیرت ہے کہ بقول اس کے وہ اندھا ہو گیا ہے۔۔۔ دیکھ نہیں سکتا“ اُسی روز ایک اور شخص فٹ پاتھ پر چلتے چلتے ٹھوکر کھا کر گرتا ہے اور جو لوگ اس کی مدد کو آتے ہیں وہ اُنہیں کہتا ہے ”میں اندھا ہو گیا ہوں“ یوں اُس شہر میں لوگ بغیر کسی بیماری کے اندھے ہونے لگتے ہیں یہاں تک کہ اکثریت نابینا ہو کر بھٹکنے لگتی ہے اور شہر ویران ہونے لگتا ہے۔
شہر لاہور بھی اُس جنوبی امریکہ کے کسی شہر کی مانند اندھا ہونے لگا ہے۔۔۔ ٹیلی ویژن چینلز پر مسلسل جھلکیاں عکس ہو رہی ہیں۔ آج معذوروں کا عالمی دن تھا، میری بیوی میمونہ ابھی معذوروں کے ایک ادارے میں اس خصوصی دن کے حوالے سے منعقد کردہ ایک تقریب میں شرکت کر کے لوٹی ہے جہاں معذور بچوں نے جن میں نابینا بچے بھی شامل تھے لہک لہک کر ”دل دل پاکستان“ گایا ہے۔۔۔ اگرچہ وطن کا یہ گیت گانے والا شخص جو قومی ترانے سے بھی زیادہ مقبول ہے وہ بھی ایک مصیبت میں مبتلا ہے، معافیاں مانگ رہا ہے۔۔۔ میری بیگم رضا کارانہ طور پر اس ادارے میں پڑھاتی ہے اور اس کے لیے فنڈ جمع کرتی ہے۔۔۔ چنانچہ معذوروں کے اس عالمی دن کے حوالے سے لاہور کے نابینا افراد نے جمع ہو کر پاکستان کے آئین کے مطابق اپنے لیے دو فیصد ملازمتوں کا مطالبہ کیا ہے اور اُن میں سے بیشتر افراد اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ ہماری نابینا کرکٹ ٹیم کے کپتان تھے جو متعدد عالمی مقابلے جیت چکے ہیں، گورنمنٹ کالج لاہور سے فارغ التحصیل ایک نوجوان تھے جنہوں امتیازی حیثیت سے ڈگری حاصل کی اور وہ اندھے، بھٹکتے، ٹٹولتے، اندھیرے میں گم، وقت کے راجوں کے خلاف نہیں، حق میں نعرے لگاتے ہوئے جمع ہوئے تو اندھیر نگری کے چوپٹوں نے اُن پر ایسا تشدد کیا جسے دیکھ کر میری آنکھوں کے سامنے بھی اندھیرا چھا گیا۔۔۔ اور وہ جھلکیاں ابھی تک ایک ڈراؤنے خواب کی مانند مجھے اندھا کرتی ہیں۔۔۔
ایک باریش اندھا، ہاتھ آگے بڑھائے نہیں جانتا کہ وہ کدھر جائے اور دو موٹے حرام خور اُسے دھکا دیتے ہیں اور وہ فٹ پاتھ پر گر جاتا ہے، اٹھنے لگتا ہے تو ایک اور ٹھوکر لگتی ہے اور وہ اوندھا ہو کر پھر گر جاتا ہے اور یہ

حرام خور تو قرآن پاک کی تعلیمات سے بھی بے خبر ہیں، کہ کیسی ہستی کو صرف اس لیے سرزنش کی گئی کہ وہ ایک نابینا کی جانب دھیان نہ کر سکے۔۔۔ اور وہ نابینا بعد میں مدینہ منورہ کے گورنر مقرر کیے گئے۔
ایک اور اندھے کو جس کی سفید آنکھوں میں صرف تاریکی ہے، دونوں جانب سے پولیس کے موٹے اہلکاروں نے دبوچ رکھا ہے اور اُسے سمجھ نہیں آتی کہ وہ کیا کرے۔۔۔ لاہور پولیس نابیناؤں پر یلغار کر رہی ہے۔۔۔ اب اُن اندھوں کو کچھ نہیں سوجھتا کہ وہ اپنے آپ کو اُن کی لاٹھیوں سے کیسے بچائیں۔۔۔ لاٹھی آتی ہوئی کو دیکھ سکیں تو اپنا دفاع کر سکیں چنانچہ وہ اپنے ہاتھ کھڑے کر کے کسی اور جانب ”دیکھ“ رہے ہیں اور لاٹھی کسی اور جانب سے اُن کے بدن کو ادھیڑ دیتی ہے۔ اور وہ حکومت کا تختہ الٹنے نہیں آئے، عمران خان کی مانند ”گو نواز گو“ کے نعرے لگانے نہیں آئے کہ اُن کے تاریک جہان میں سیاست نہیں صرف پاکستانی آئین کی ایک شق کی شمع روشن ہے کہ معذور افراد کو دو فیصد ملازمتیں اُن کی تعلیمی اہلیت کے مطابق دی جائیں گی، اُن کا یہ حق تسلیم شدہ ہے لیکن اس کے باوجود گلو بٹ اُن پر یلغار کر دیتے ہیں۔۔۔ یہ شہر لاہور جس نے اپنے آپ کو زندہ دلان کا شہر قرار دے رکھا ہے اس میں تو صرف مردہ دل ہیں اور وہ بھی اندھے اور بے شرم۔۔۔ ابھی ابھی مجھے ٹیلی ویژن کے نامور پروڈیوسر اور ادیب بختیار احمد کا ایک پیغام موصول ہوا ہے جو سراسر اُن کی رائے ہے۔۔۔ ’نابینا افراد پر تشدد! لعنت ہے ایسی پولیس اور گورنمنٹ پر۔۔۔ اللہ ان ظالموں کو غارت کرے۔۔۔ کہئے آمین!‘
ایک باریش نابینا مارکھانے کے بعد اپنی سفید چھڑی کو زمین پر پٹخ رہا ہے۔ یہ بے حسی اور حیوانیت آہستہ آہستہ معاشرے میں سرایت کرتی جاتی ہے۔۔۔ جب بستیاں اور عبادت گاہیں نذر آتش کی جاتی ہیں، ایک حافظ قرآن کو گلیوں میں گھسیٹا جاتا ہے۔۔۔ جب لوگوں کو زندہ جلایا جاتا ہے اور کوئی احتجاج نہیں کرتا تب نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ معذوروں اور اندھوں کو جانور جان کر اُنہیں تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔۔۔ نہ اپنے سلامتی اور امن کے دین کی پروا کی جاتی ہے اور نہ ہی اپنے رسولؐ کے حسن اخلاق سے سبق لیا جاتا ہے جو یہ بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ایک چڑیا کے بچوں کو اُن کی ماں سے جدا کیا جائے۔ جی چاہتا ہے کہ میں بھی ہوسے سراماگو کی مانند ایک اور ناول ”بلائنڈنیس“ لکھوں کہ کیسے ایک شہر لاہور نام کا نابینا ہو گیا یہاں تک کہ نابینا ؤں پر ہی ظلم کی لاٹھیاں برسانے لگا۔
نابینا وہ نہیں جو اپنے آئینی حق کی مانگ کرتے تھے، نابینا دراصل ہم سب ہیں جو احتجاج نہیں کرتے۔
بلھے شاہ نے کہا تھا۔۔۔ چل بلیا اوتھے چلیے، جتھے سارے انّھیں ۔۔۔
تو یہ وہی نگری ہے جس میں سارے اندھے ہیں
اندھیر نگری ہے اور چوپٹ راجے ہیں

زرعی یونیورسٹی فیصل آباد کی مہک آور سلطنت
مستنصر حسین تارڑ
Posted Date : 10/12/2014
لائل پور یعنی حال کے فیصل آباد سے سندیسے چلے آ رہے تھے۔۔۔ چلے آئیے کہ سندیسے چلے آ رہے تھے۔۔۔ برصغیر کی پہلی اور سب سے وسیع زرعی یونیورسٹی جہاں صرف زراعت میں ہی نہیں تمام علوم میں انیس ہزار طلباء زیرتعلیم تھے اُن کی جانب سے پچھلے کئی ماہ سے سندیسے چلے آ رہے تھے یہاں تک کہ بھاری بھرکم پروفیسر اسلم پرویز اور اُن کے رفقاء میرے گھر چلے آئے اور رشوت کے طور پر میرے لئے دو شاندار بوٹاجات بھی لے آئے کہ چلے آیئے۔۔۔ اُدھر سے سارہ حیات کے فون چلے آ رہے ہیں کہ تارڑ صاحب آپ کو اصغر ندیم سید نے اطلاع کر دی ہو گی کہ ہم فیصل آباد میں پہلے لٹریری فیسٹیول کا اہتمام کر رہے ہیں اور ادیبوں کا پورا ریوڑ جمع نہیں کر رہے صرف آٹھ دس لوگوں کو مدعو کر رہے ہیں، پلیز آپ چلے آیئے۔۔۔ یا وحشت اب اُس ڈھول بھرے شہر کے جولاہوں یعنی ٹیکسٹائل والوں اور دیگر برآمد کنندگان اور کاروباریوں کے دماغ میں کیا خلل آ گیا ہے کہ یکدم ادیبوں کی پذیرائی کرنے پر تُل گئے ہیں۔ اگرچہ لائل پور کبھی اتنا بنجر نہ ہوا کرتا تھا۔۔۔ یہاں ساحر لدھیانوی کا قیام رہا یہاں تک کہ اُن کی والدہ یہاں دفن ہوئیں، حبیب جالب ایک عرصہ یہاں رہے۔۔۔ اُدھر برصغیر کے سب سے بڑے انقلابی اور مارکس دانشور کا گاؤں یہاں سے قریب تر، اور اُس کا گھر ابھی تک محفوظ تھا، پرتھوی راج کپور کے والد بھی لائل پور کے آس پاس ہوا کرتے تھے اور پھر پشاور کو کوچ کر گئے۔۔۔ اردو کا باکمال کہانی کار بھی اسی شہر کا باسی تھا۔۔۔ بلکہ فیضؔ ایک عرصہ یہاں مقیم رہے اگرچہ جیل میں مقیم رہے۔۔۔ اور ہاں سریندر پرکاش بمبئی سے جب کبھی مجھے خط لکھتا، آخر میں ہمیشہ یہ فقرہ لکھتا ”میرے لیل پور کا کیا حال ہے؟“۔
تب میں نے سوچا کہ ایک تیر میں دو شکار کر لئے جائیں۔۔۔ یونیورسٹی آف ایگری کلچر اور لٹریری فیسٹیول کا

ایک ہی سفر میں شکار کر لیا جائے۔
ایک دھندلی سویر میں میرے سیاہ گیٹ کے سامنے ایک سفید گاڑی کھڑی تھی، اور ایک بارعب ڈرائیور باجوہ صاحب مونچھوں کو تاؤدے رہے تھے۔ اُن کے ہمراہ نوجوان منان گھبرایا ہوا کھڑا تھا، وہ مجھے لینے آئے تھے۔۔ اس دوران جانے کہاں سے کامران سلیم سیالکوٹی عرف ”برڈز آف سیالکوٹ“ نمودار ہو گیا۔ ”سر جی میں نے آپ کے ساتھ چلنا ہے، آپ ایک بابا جی ہو، میں نے آپ کا خیال رکھنا ہے، اورآپ کی تصویریں اُتارنی ہیں، میری ڈیوٹی لگ گئی ہے“۔
“اور یہ ڈیوٹی کس نے لگائی ہے؟”
میں نے خود ہی لگائی ہے سر۔۔ اور ڈاکٹر احسن نے لگائی ہے“۔”
تو اُس دھند آلود سویر میں ہم لیل پور جاتے تھے۔۔ باجوہ صاحب کار اتنی نزاکت سے چلاتے تھے جیسے ہم کسی کار پر نہیں تتلی پر سوار ہوں۔
ہم زرعی یونیورسٹی کی وسیع، مہک آور اور خوشبو والی سلطنت میں داخل ہو گئے۔ منان مجھے یونیورسٹی کی تخلیقی سرگرمیوں سے آگاہ کرتا چلا جاتا تھا۔۔ سر۔۔ ہم ڈرامے کرتے ہیں، گیت گاتے ہیں یہاں تک کہ ہمارے قوال بھی جو طالب علم ہیں کمال کے قوال ہیں۔۔ یونیورسٹی اتنے وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی تھی کہ اس کے اندر سفر کرتے کار کا پٹرول کم ہونے لگا۔۔ میں نے ایک گہرا سکھ بھرا سانس بھرا اور اُس میں میری مٹی کی مہک تھی، سب گُل بوٹے، شجر اور فصلیں تھیں اور یہاں جو لوگ تھے وہ سب مٹی کی محبت میں مبتلا لوگ تھے، میرے قبیلے کے لئے۔
وائس چانسلر اقرار احمد خان نے اقرار کیا کہ وہ ایک مدت سے میری آمد کے منتظر تھے۔ اُن کے ہمراہ مجھے خوش آمدید کہنے والے پروفیسر حضرات کی ایک فوج ظفر موج تھی۔ آڈیٹوریم بھرا پڑا تھا، وہاں اگرچہ ہزاروں لوگ تھے لیکن اتنا شور کرتے تھے مجھے دیکھ کر کہ لاکھوں سنائی دیتے تھے۔ میں نے اُن سب سے باتیں کیں، صرف زراعت کے حوالے سے باتیں کیں۔۔ اُنہیں اپنے ابّا جی چودھری رحمت خان تارڑ کے بارے میں بتایا جو مٹی کی محبت میں فنا تھے۔۔ اُنہوں نے اردو میں فن زراعت کے بارے میں دودرجن کتابیں لکھیں۔ تیس برس تک ایک زراعتی جریدہ ”کاشت کار جدید“ شائع کرتے رہے۔۔ اور بتایا کہ میرے دادا ایک کسان تھے، ہل چلا کر زمین سے رزق حاصل کرتے تھے چنانچہ یہ میرے دادا کا ہل ہے جسے میں اب تخلیق کی زمینوں میں چلاتا ہوں۔ اپنے ناول ”خس و خاشاک زمانے“ کا تذکرہ کیا جو پنجاب کی مٹی کا ایک رزمیہ ہے اور خالد اقبال کو یاد کیا جن کا کہنا تھا کہ دنیا بھرمیں سب سے آرٹسٹک درخت کیکر ہے، اور ہر کیکر کی اپنی جداگانہ ثقافت ہوتی ہے، کوئی ایک کیکر کسی دوسرے کیکر سے مشابہ نہیں ہوتا۔۔ ازاں بعد وائس چانسلر صاحب نے بجاطور پر نہایت فخر سے بتایا کہ اس یونیورسٹی کی ایک لڑکی اُس تقریب میں شامل ہونے کے لئے منتخب ہوئی ہے جہاں ملالہ یوسف زئی کو نوبل انعام سے نوازا جائے گا۔۔ اُنہوں نے ملالہ کی توصیف کی اور مجھے یاد آیا کہ یہ مطعون لڑکی جس کا واحد جرم یہ تھا کہ وہ بہادر طالبان کی بوچھاڑوں سے ہلاک نہ ہوئی۔ اُس نے نوبل انعام کی تقریب میں اپنی دوست کائنات، وہ لڑکی جو اُس کے ہمراہ اُس ویگن میں سوار تھی جس پر جی دار طالبان نے حملہ کیا تھا اور بچ گئی تھی، اُسے بھی مدعو کیا ہے۔
زرعی یونیورسٹی کی اُس تقریب میں مجھ سے بہت سوال ہوئے اور وہ سب کے سب زرخیز ذہنوں میں سے پھوٹتے تھے۔ کامران سلیم نے میری ایک پورٹریٹ، نگر کے قدیم حکمرانوں کے چوغے میں ملبوس وائس چانسلر صاحب کو پیش کی اور اُنہوں نے اسے یونیورسٹی کی آرٹ گیلری میں آویزاں کرنے کا اعلان کیا۔ میں جس مٹی کا بیٹا تھا مجھے اُس مٹی سے محبت کرنے والوں نے اپنی چاہتوں سے سرفراز کر دیا۔۔ بہت شکریہ، یونیورسٹی آف ایگری کلچر فیصل آباد، وائس چانسلر صاحب، منان اور اسلم پرویز صاحب۔۔ آپ نے (مجھے میری اوقات سے بڑھ کر مجھے نواز دیا۔ (جاری

ڈاکٹر احسن کے کوہ نورد اور فیصل آباد لٹریری فیسٹیول کا افتتاح
مستنصر حسین تارڑ
Posted Date : 14/12/2014
فیصل آباد زرعی یونیورسٹی کی محبتوں نے مجھے تھکا دیا تھا۔ یہ تھکن عمر کی تھی جس میں سکت کم ہوتی جاتی ہے۔ میں سرینا ہوٹل پہنچ کر لٹریری فیسٹیول کی متحرک اور مہربان روح سارہ حیات کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ میں واقعی فیصل آباد پہنچ گیا ہوں کہ اُن کے فون پہ فون چلے آ رہے تھے۔ اب وہاں پہنچے ہیں تو ہوٹل کا پورا عملہ جن میں کچھ شکل ”عملیاں“ بھی تھیں پھولوں کے گلدستے ہاتھوں میں لیے استقبال کے لیے باہرکھڑا تھا۔۔ پہلے تو میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ وہ کونسا وی آئی پی ہے جس کے لیے اتنا تردد کیا جا رہا ہے اور پھر جب وہ سب میرا نام پکارتے خوش آمدید کہنے لگے تو ہم تو خوش ہو گئے۔ اس سے قطع

نظر کہ فیسٹیول میں شمولیت کے لیے آنے والے تمام مہمانوں کا اسی طور استقبال کیا گیا یہاں تک کہ عطاء الحق قاسمی کا بھی لیکن اس کے باوجود ہم تو خوش ہو گئے۔ ازاں بعد یہ تمام خواتین اور حضرات مجھے اپنے کمرے تک لے گئے اور ایک ایک سہولت کے بارے میں آگاہ کیا کہ سر۔۔۔ یہ ٹیلی ویژن ہے۔۔۔ ادھر سے بٹن دبائیں تو تمام روشنیاں گل ہو جاتی ہیں، اور یہ واش روم ہے اور یہ۔۔۔ کموڈ ہے۔۔۔ بڑی مشکل سے وہ سب پیارے لوگ رخصت ہوئے۔ وہ رخصت ہوئے تو میں کمر سیدھی کرنے کی خاطر بستر پر دراز ہوا تو ڈاکٹر احسن نازل ہو گئے۔ اکیلے نہیں دور دراز کے شہروں سے آنے والے کم از کم پچاس ساٹھ کوہ نوردوں کے ساتھ نازل ہو گئے جو اُن کے بقول پاکستانی شمال کے میرے درجن بھر سفرنامے پڑھ کر آوارہ ہو گئے تھے۔ شمال کی کوہ نوردیوں کے جنون میں مبتلا ہو گئے تھے۔ سرینا کے ایک ہال میں اُن سب سے ملاقاتیں ہوئیں۔ دراصل میرے سفرنامے محض بہانہ تھے۔ یہ ڈاکٹر احسن کی کرشمہ ساز شخصیت تھی جس نے اُنہیں آداب کوہ پیمائی سکھائے۔۔۔ اور وہاں کیسے کیسے لوگ تھے۔۔۔ آوارہ گرد، بلند پہاڑوں کے عشق میں مبتلا۔۔۔ اللہ تعالیٰ کے جمال کی قربت میں جانے والے۔ ڈاکٹر چاولہ کے نوجوان بیٹے سے لے کر ستر برس کے بزرگ حضرات تک۔۔۔ وہ مجھے اپنی کوہ نوردیوں کی داستانیں سناتے رہے اور میں حیرت سے سنتا رہا۔ ان میں نہایت باریش لوگ بھی تھے اور قدرے نٹ کھٹ حضرات بھی۔۔۔ اور کم از کم ایک صاحب ہری پگڑی باندھے ہمیں پہاڑوں کے قصے سناتے تھے۔ وہ سب بہادر اور بڑے دل والے لوگ تھے اور اُن میں ایک نوجوان اظہر علی نام کا ایسا تھا جو ایک ٹانگ سے معذور بیساکھیوں کے سہارے مجھے ملنے چلا آیا تھا۔ آپ یقین نہیں کریں گے کہ یہ نوجوان اظہر علی ایک ستر سی سی کے موٹر سائیکل پر سوار جڑانوالہ سے تن تنہا نہ صرف گلگت اور سکردو تک گیا بلکہ درہ خنجراب تک جا پہنچا۔۔۔ اپنی بیساکھیاں موٹر سائیکل کے ساتھ باندھے اُس نے ایسے پر صعوبت پہاڑی سفر کیے۔ میں اُس کی عظمت کو سلام کرتا ہوں کہ وہ نہ نواز شریف، نہ زرداری اور نہ ہی فضل الرحمن، یہ وہ ہے جو پاکستان کی ناقابل شکست روح اور نظریے کی ترجمانی کرتا ہے، اور یہ روح ڈاکٹر احسن نے پھونکی تھی جنہوں نے شاید پاکستان بھر میں سب سے زیادہ کوہ نوردی کی ہے، اس کے باوجود کہ پولیو کی بیماری کی وجہ سے اُن کی ایک ٹانگ میں خم آ گیا ہے اور اُن سے پیار کرنے والے اُنہیں لارڈ بائرن کے نام سے پکارتے ہیں۔

ہم جب فیصل آباد میں داخل ہوئے تھے تو ادیب حضرات ہر کھمبے پر ٹنگے تھے، یعنی ہماری تصویروں کے پوسٹر اُن پر آویزاں تھے۔۔۔یہاں تک کہ

میں نے جانے کہاں کہاں کے لٹریری فیسٹیول دیکھ رکھے ہیں، دلّی، برلن، کراچی، اسلام آباد وغیرہ کے لیکن۔۔۔ فیصل آباد کا یہ ایک روزہ فیسٹیول ذوق جمال اور آرائش کے حوالے سے اُن پر حاوی ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ جتنی بھی انتظام کرنے والیاں تھیں وہ سب کی سب خوش لباس، خوش گفتار اور خوش شکل تھیں۔ نصرت فتح علی خان آڈیٹوریم میں اس فیسٹیول کا افتتاحی اجلاس پر ہجوم ہوا۔۔۔ اور وہ سٹیج بھی ایک خوابناک انداز میں سجی ہوئی تھی، ہر سو چراغ جلتے تھے۔ سلیمہ ہاشمی نے اپنے ابا جی کو یاد کیا جنہیں ملنے کے لیے وہ اپنی امی کے ہمراہ فیصل آباد جیل آئی تھیں۔ کشور ناہید، وہ ڈھلتی عمر کی میری دوست عورت مائیک پر آئی تو اُس نے اپنی تقریر سے اہل فیصل آباد کو مسخر کر لیا۔ اُس کے انقلابی جذبے ابھی تک جوان تھے۔ عبداللہ حسین نے اٹکتے ہوئے فیصل آباد میں اپنے قیام کے شب و روز کو یاد کیا اور احتجاج کیا کہ آخر اس کا نام ایک شہنشاہ کے نام پر کیوں رکھ دیا گیا مجھے شاید خبر بھی نہ ہو گی کہ پاکستان میں کہیں کوئی شہر ہے۔ جس شخص نے اسے آباد کیا، یونین جیک کے نقشے کے مطابق ترتیب دیا۔ اُس لائل صاحب کو کیوں بے وجہ رخصت کر دیا گیا۔ صرف اس لیے کہ ہم ہمیشہ شاہوں کے غلام ہونے پر ہی فخر کرتے ہیں۔۔۔ اس ۔۔۔ افتتاحی تقریب کی میزبانی پر جوش، کسی زمانے میں میرے دوست اصغر ندیم سید نے کی جو ملتان سے اٹھا تو سیدھا میری دکان پر آیا تھا اور اُس نے ایک بڑے کا لروں والا چیک کوٹ پہن رکھا تھا۔

آڈیٹوریم لبریز تھا اور سارہ حیات بھاگتی پھرتی تھیں کہ اب گنجائش باقی نہیں رہی۔۔۔ چنانچہ وہ سینکڑوں لوگ جو نہ صرف فیصل آباد بلکہ آس پاس کے شہروں اور قصبوں سے اس تقریب میں شمولیت کے لیے آئے تھے باہر کھڑے رہ گئے کہ دروازے بند کر دیے گئے تھے، گنجائش نہ تھی۔

افتتاحی تقریب کے فوراً بعد مجھے پکارا گیا۔۔۔ اب جگر تھام کے بیٹھو میری باری آئی، مجھے اپنے ناول ’’اے غزال شب‘‘ کے حوالے سے کچھ کلام کرنا تھا۔۔۔ اس یادگار نشست کی تفصیل بیان کرنے کے لیے ایک کالم کا دامن تنگ ہے۔ یوں کہہ لیجیے کہ یہ نشست فیصل آباد کے اہل ذوق نے مجھ سے میرے اس ناول اور دیگر ناولوں کے بارے میں جو سوال کیے ایسے سوال جو آج تک کسی نے مجھ سے نہ پوچھے تھے اُن کی وجہ سے یہ نشست یادگار ہوئی۔

بہت سے لوگ ایک صدمے میں چلے گئے جب مجھ سے سوال ہوا کہ آپ کے ناولوں کے بیشتر یادگار کردار

عورتوں کے ہیں جن میں، پاسکل، بارونی، سکلا۔۔ شاہ، ماگرٹیا، صاحبان وغیرہ شامل ہیں تو ایسا کیوں ہے تو (میں نے اقرار کیا کہ میرے اندر صرف ایک مرد نہیں، ایک عورت بھی ہے۔ (جاری ہے

گوپیاں اور۔۔ شکریہ فیصل آباد
مستنصر حسین تارڑ
Posted Date : 17/12/2014

جی ہاں، فیصل آباد لٹریری فیسٹیول کے پہلے سیشن میں جب مجھ سے سوال کیا گیا کہ آخر میرے ناولوں کے بیشتر یادگار کردار عورتوں کے ہیں، یعنی پاروشنی اور پاسکل وغیرہ اور میں نے اس کے جواب میں اقرار کیا کہ میرے اندر صرف ایک مرد نہیں، ایک عورت بھی ہے تو بہت سے لوگ صدمے میں چلے گئے۔۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ فنون لطیفہ کے جتنے بھی شعبے ہیں، ان کے تخلیق کار اگر مرد ہیں تو ان کے اندر ایک عورت کی حسیات بھی موجود ہوتی ہیں اور اگر وہ خواتین ہیں تو اُن کی شخصیت میں ایک مردانہ پن بھی ہوتا ہے۔۔ ویسے تو ڈریس ڈیزائننگ اور موسیقی کے شعبوں میں بعض اوقات پتہ ہی نہیں چلتا کہ صنف کون سی ہے۔۔ ظاہر ہے ادب میں شاعری اور نثر میں صرف مرد کا کے جذبات کی ہی نہیں ایک عورت کی حسیات کی بھی ترجمانی ہوتی ہے تو اگر آپ کے اندر صرف ایک مرد ہو تو آپ صرف مرد کردار ہی تخلیق کر سکتے ہیں یوں آپ کی تحریر صرف نصف انسانیت پر محیط ہوتی ہے۔ اور یہ زندگی کی تصویر کو مکمل نہیں کر سکتی۔ عورتوں کے کردار تبھی جاندار ہو سکتے ہیں اگر آپ کے اندر بھی ایک عورت کے جذبات محسوس کرنے کی ایک حِس موجود ہو۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ ”بہاؤ“ میں پاروشنی ایک بچے کو جنم دیتی ہے تو آپ ایک مرد ہونے کے ناتے کیسے جان گئے کہ وہ کن اذیتوں سے دوچار ہوتی ہے تو میں نے ازراہ تفنن کہا کہ وہ حصہ تحریر کرتے ہوئے میں نے تصور کیا کہ میں حاملہ ہو چکا ہوں، جیسے میں نے ”قلعہ جنگی“ میں ایک طالبان کی موت کی تفصیل بیان کی تو میں نے تصور کیا کہ میں خود مر رہا ہوں۔ ظاہر ہے میں اتفاقاً آج تک نہ حاملہ ہوا ہوں اور نہ ہی فی الحال مرا ہوں تو یہ محض تصور اور مشاہدے کی آمیزش ہے۔۔ اسی طور خواتین نثر نگاروں کے اندر بھی کہیں نہ کہیں ایک مرد ہوتا ہے، اور وہ جو صرف سراسر خواتین ہوتی ہیں وہ صرف خواتین کے ناول لکھتی ہیں، بڑے ناول ان کی رسائی میں اس لئے نہیں ہوتے کہ وہ مرد محسوس نہیں کر سکتیں۔۔ آخر خواتین ناول نگاروں میں قرۃ العین حیدر، الطاف فاطمہ، بانو قدسیہ، نثار عزیز بٹ، جمیلہ ہاشمی اگر ممتاز ہوئیں تو صرف اس لئے کہ ان کے ناولوں میں صرف عورتوں کے جذبات کی ہی نہیں بلکہ برابر کی سطح پر مردوں کی نفسیات اور اُلجھنوں کو بھی بیان کیا گیا ہے۔۔ چونکہ یہ سیشن صرف میرے ناول ”اے غزالِ شب“ کے حوالے سے ترتیب دیا گیا تھا اس لئے میں نے اس میں سے کچھ اقتباس پڑھے اس معذرت کے ساتھ کہ ناول کا کوئی ایک حصہ اس کے کُل کی ترجمانی نہیں کر سکتا۔

ایک حجاب پوش خاتون نے سوال کیا کہ آپ کے ناولوں کے بیشتر کردار ابنارمل ہوتے ہیں، تو ایسا کیوں ہے تو میں نے عرض کیا کہ بنیادی طور پر ادب ہوتا ہی ابنارمل ہے، نارمل تحریر صرف منشی حضرات لکھ سکتے ہیں یا پھر صحافی۔۔ ویسے میں خود بھی ایک ابنارمل شخص ہوں اور میری جانب اکثر ابنارمل لوگ کھنچے چلے آتے ہیں تو میں ان کو بیان کرتا ہوں۔۔ جیسے میں نے بہت برس پہلے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ کوئی بھی شریف شخص بڑا ادیب نہیں ہو سکتا تو اشفاق احمد نے اپنے گھر میں ایک دعوت کے دوران میری بیگم میمونہ سے اپنے مخصوص کھچرے پن کے طنزیہ لہجے میں شکایت کی تھی کہ دیکھو تمہارا خاوند مجھے ایک بڑا ادیب نہیں مانتا۔۔چونکہ میمونہ کی والدہ اشفاق صاحب کے آبائی علاقے سے تھیں اور ان کے خاندان سے ان کی قربت تھی یہاں تک کہ انہوں نے اپنے بیٹے آفتاب کا نام ان کے بڑے بھائی سے متاثر ہو کر رکھا تھا تو اشفاق صاحب، میری بیگم کو ایک عزیزہ جانتے ہوئے اس نوعیت کی چھیڑ چھاڑ کرتے ہی رہتے تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے کہا کہ میمونہ، دیکھو تمہارے خاوند نے بیان دیا ہے کہ کوئی بھی شریف شخص بڑا ادیب نہیں ہو سکتا، یعنی وہ مجھے ایک بڑا ادیب نہیں مانتا تو میں نے بصد ادب کہا تھا کہ وہ میرے پسندیدہ نثرنگار تھے یہاں تک کہ انہوں نے میرے پہلے سفر نامے ”نکلے تری تلاش میں“ کی افتتاحی تقریب کی صدارت کی تھی تو میں نے بصد ادب کہا تھا۔۔ اشفاق صاحب میں آپ کو ایک بڑا ادیب مانتا ہوں لیکن۔۔ شریف شخص نہیں مانتا، اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کی تحریروں میں سے خاص طور پر ”سفر در سفر“ کے کچھ حوالے پیش کروں تو خان صاحب اپنی مسکراہٹ پر قابو نہ رکھ سکے اور کہنے لگے، وہ ادھر تمہاری بانو آپا کباب بنا رہی ہیں، جاؤ وہ کباب کھاؤ۔۔ سیشن کے اختتام پر مجھے ایک سٹینڈنگ اوویشن سے نوازا گیا۔

تھیک یو لیل پور۔۔ نصرت فتح علی خان آڈیٹوریم کی سٹیج پر بیٹھے ہوئے مجھے نصرت بہت یاد آئے کہ میں نے اپنے موسیقی کے شو ”تیرے نام“ میں ان کی زندگی کے آخری مدھر نغمے، غزلیں اور قوالیاں ریکارڈ کی تھیں۔ اور ان کی وفات کے بعد جب ان کے ماڈل ٹا ؤن والے گھر کے سامنے گراؤنڈ میں ایستادہ سٹیج پر

راحت فتح علی خان کو ان کا وارث قرار دیا گیا تھا تو شبانہ اعظمی والے جاوید اختر اور میں اس الوادعی محفل کے میزبان تھے۔۔۔ اگرچہ میں تب تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ نصرت کے پہلو میں بیٹھا یہ بھتیجا جو کبھی کبھار قدرے دل خراش آواز میں صدائیں بلند کرتا ہے کبھی اتنا بڑا گلوکار بن جائے گا کہ اسے نوبل انعام کی تقریب میں گانے کے لئے مدعو کیا جائے گا۔۔۔ یہ بڑے نصیب کی بات ہے۔

میں اپنے سیشن سے فارغ ہو کر اس کمرے میں آ بیٹھا جو ادیبوں کے لئے مخصوص تھا اور وہاں عبداللہ حسین اور انتظار حسین اپنی لاٹھیوں کو سنبھالتے تھے۔ اس دوران کچھ خواتین کچھ نوخیز اور زیادہ تر ادھیڑ عمر چلی آئیں تو عبداللہ حسین کہنے لگے ''لوجی تارڑ کی گوپیاں آ گئی ہیں'' تو ان میں سے ایک موٹی گوپی کہنے لگی ''سر۔۔۔ ہم ذرا تارڑ صاحب کی کتابوں پر دستخط کروا لیں پھر آپ کے بھی آٹوگراف لیں گے۔۔۔ ہمارے ہاں آپ کی کہانیوں کا مجموعہ ''فریب'' بھی ہے۔

انتظامیہ کی جانب سے مجھے اطلاع کی گئی کہ ''باہر بہت سے لوگ آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں، کتابوں پر آٹوگراف لینا چاہتے ہیں اور۔۔۔ وہ بہت ہیں، آپ باہر آ جایئے''۔

باہر آڈیٹوریم کے برآمدوں میں وہ لوگ ہجوم کرتے تھے جن کی محبتوں سے میں باعث توقیر ہوا۔۔۔ میں ایک حقیر تھا جسے ان لوگوں نے سرفراز کیا۔۔۔ اور وہاں اتنے لوگ تھے کہ انتظامیہ کو سکیورٹی کے ارکان کو طلب کرنا پڑا۔۔۔ کون کہتا ہے کہ پاکستان میں ادیب کی توقیر نہیں ہوتی، اسے اس کی تخلیقی کاوشوں کا صلہ نہیں ملتا، وہ بے مراد رہتا ہے۔۔۔ اگر وہ مسلسل کاوش کرے، بے شک مجھ ایسا حقیر ہو لیکن لوگوں کی محبتوں، دکھوں، آزاروں، تاریخ کے جبر اور ظلم کو اپنے بیان میں لے آوے تو وہ بے مراد نہیں رہتا۔۔۔ اگر کسی کو شک ہو تو کبھی فیصل آباد آ جاوے۔

سٹیج پر فیسٹیول میں شریک ادیبوں کو یادگاری شیلڈز اور تصویریں پیش کی جا رہی تھیں اور اپنی کرسیوں پر کھڑے لوگ بلند آواز میں پکار رہے تھے ''آپ نے اگلے برس بھی فیصل آباد آنا ہے''۔

کون جانے کل ہو نہ ہو۔۔۔ لیکن اگر کل نصیب میں ہوئی، بہ شرط زندگی تو میں اگلے برس سر کے بل فیصل آباد پہنچوں گا۔۔۔ شکریہ لائل پور اور شکریہ سارہ حیات!

تابوتوں میں لڑھکتے ہوئے نبیؐ کے لاڈلے

مستنصر حسین تارڑ

Posted Date : 21/12/2014

بڑھتی جاتی دھند تھی اور اس کے پیچھے شہر تھا، پشاور تھا، میں سارا برس اس دھند کا منتظر رہتا ہوں '' جو ہر شے کو ملفوف کر دیتی ہے، ہمارے گناہوں کو، ہماری محبتوں کو اور ہماری عبادتوں کو، لیکن اس سویر جب بڑھتی جاتی دھند تھی تو اس میں سے میرے اپنے بچوں کے سینکڑوں تابوت ظاہر ہو رہے تھے۔ وہ بھٹکتے پھرتے تھے کہ انہیں قبرستان تک کا راستہ نہ ملتا تھا۔ ان تابوتوں کے اندر جو لاشے تھے وہ لڑھکتے جاتے تھے کہ وہ تابوت بالغ مردوں کے لئے بنائے گئے تھے اور وہ بہت چھوٹے تھے۔ اس لئے لڑھکتے پھرتے تھے۔ اگر دو چار درجن بچے ہوتے تو بھی فوری طور پر ان کے سائز کے تابوت ٹھونک ٹھانک کر تیار کر لیے جاتے، پر وہ تو سینکڑوں کی تعداد میں تھے۔ اور انہوں نے کچھ خیال نہ کیا کہ فوری طور پر ان کے سائز کے تابوت تو مارکیٹ میں دستیاب نہ ہوں گے، بس مر گئے اور کچھ خیال نہ کیا۔ اور انہیں کس نے مارا، ہم سب نے مل کر انہیں ہلاک کیا، مجھ ایسے ادیبوں نے، سیاست دانوں، صحافیوں اور مقدس ہستیوں نے، جیسے آگاتھاکرسٹی کے ناول ''مرڈر آن اے اورینٹ ایکسپریس'' میں ایک شخص کو ٹرین میں سوار سب مسافر مشترکہ طور پر خنجر مار کر ہلاک کر دیتے ہیں۔ ایسے ہی تابوتوں میں لڑھکتے بچوں پر ہم سب نے وار کیا۔ ہم نے تو اپنا مقدس فریضہ سرانجام دیا، زیادتی تو ان کی تھی کہ انہوں نے کچھ خیال نہ کیا کہ ان کے سائز کے تابوت بازاروں میں نہیں بکتے۔ ''ایہہ پتر ہٹاں تے نئیں وکدے۔۔۔ توں لبھدی پھریں بازار کُڑے'' انہیں کیا خبر تھی کہ ہم فرعون کے زمانوں میں نہیں ہیں جس نے بنواسرائیل میں پیدا ہونے والے ہر بچے کو ہلاک کرڈالا۔ انہیں خبر ہی نہ تھی کہ ہر زمانے میں کچھ مقدس فرعون ہوتے ہیں۔

یہ جو سینکڑوں تابوت تھے جو ان کے سائز کے نہ تھے۔ جن میں وہ مردہ حالت میں اپنی سکول کی وردیوں میں، کاندھا دینے والوں کے جھٹکے سے لڑھکتے پھرتے تھے اور اس دھند میں ظاہر ہو رہے تھے اور انہیں قبرستان تک کا راستہ نہ ملتا تھا۔ انہوں نے تو دھند کے رومان کو غارت کردیا تھا۔ میں پورا برس موسموں کی شدت سہتا تھا صرف اس آس میں کہ دسمبر کہ مہینے میں دھند اپنے پوتّر سفید لبادوں میں ملبوس ، لہر در لہر، اٹکھیلیاں کرتی چلی آئے گی اور ہر شے کو ، مکانوں، شاہراہوں، جھاڑیوں اور شجروں پر اپنا سفید جادو پھونک کر انہیں اوجھل کردے گی۔ میں انہی ہیڈلائٹس اور خدشے کی بار بار آنکھیں جھپکتی زرد روشنیاں جلا کر دھیرے دھیرے اپنی کار پر ماڈل ٹاؤن پارک پہنچوں گا اور وہاں اتری ہوئی دھند میں پوشیدہ

ہوتے ، کبھی ظاہر کبھی اوجھل ہوتے درختوں اور ہرے بھرے میدانوں کے اندر میں بھی گم ہو جاؤں گا۔ اس رومان میں مبتلا ہو جاؤں گا کہ ابھی گھنی دھند میں سے کوئی بچھڑ چکا عشق خاص نمودار ہوگا اور میں پھر سے اس کے عشق میں مبتلا ہو جاؤں گا کیونکہ اس سویر دھند میں سے کچھ چہرے تو ابھرتے تھے پر وہ خون آلود تھے۔ ان کے ننھے منے سروں میں سوراخ تھے جن میں سے ابھی تک خون رس رہا تھا اور وہ ان تابوتوں میں سے جھانکتے تھے جو دھند میں سے ظاہر ہو رہے تھے۔ ان کی مائیں گھروں میں ان کی واپسی کی منتظر چوکھٹوں پر بیٹھی تھیں اور وہ گھر جانے کی بجائے اپنے بستے گلے میں ڈالے اپنی سکول یونیفارم سمیت جنت میں چلے گئے تھے اور وہاں شاید ننھا علی اصغر شہید انہیں خوش آمدید کہتا ہوگا۔ کربلا کے شہید اُن کے استقبال کرتے چلے آتے ہوں گے اور ان سے پوچھتے ہوں گے اور حیرت سے پوچھتے ہوں گے کہ ہمارا تو خیال تھا کہ ہم نے اپنی قربانیوں سے اسے آخری کربلا کردیا ہے تو یہ ایک اور کربلا کہاں ٹوٹ پڑی ہے۔ کیا یزید ابھی تک زندہ چلا آتا ہے لیکن ہماری کربلا میں تو چند معصوم شہید ہوئے تھے اور تم سینکڑوں کی تعداد میں چلے آتے ہو تو تمہیں ہلاک کرنے والا صرف ایک یزید تو نہیں ہوسکتا، تم اتنے ڈھیر سارے ہو کہ تمہارا تو سوگ بھی نہیں منایا جاسکتا، نہ اتنا رویا جاسکتا ہے اور نہ ہی اتنا ماتم کیا جاسکتا ہے۔ ایک ایک دو دو کرکے شہید ہوتے تو کوئی بات بھی تھی،ہم تمہارا غم کرتے، سینہ کوبی کرتے، سر پر راکھ ڈال کر آہ و زاریاں کرتے، پر تم تو اتنے ہو کہ اتنا تو غم بھی نہیں ہے، نہ ہی اتنے سینے ہیں اور نہ ہی اتنے سر ہیں، اور نہ ہی اتنی راکھ ہے۔ اور وہاں بی بی زینب بھی انہیں دیکھ کر اپنے دکھ بھولتی ہوں گی اور وہ بھی کہتی ہوں گی کہ آؤ میرے گلے لگ جاؤ، اپنی خون آلود یونیفارموں اور لہو سے بھری کتابوں کے ساتھ جن میں اسلامیات کے سبق ہیں، قرآن کی آیتیں ہیں اور تم میں سے کچھ کے پاؤں میں جوتے نہیں ہیں تو کیا انہیں کربلا میں چھوڑ آئے اور تم میں سے کچھ کی انگلیاں کٹی ہوئی ہیں۔ یزید نے ہمارے بچوں کو ہلاک کیا تھا پر ان کی انگلیاں تو نہیں کاٹی تھیں۔ اور باری باری میرے گلے لگنا کہ تم تو سینکڑوں کی تعداد میں ہو اور میرا گلا تو گھٹ جائے گا پر چلے آؤ۔۔۔ آؤ میں تمہیں علی اصغر کے برابر میں بستر بچھا کر دیتی ہوں کہ تم وہاں آرام کر سکو۔۔۔ لیکن ذرا ٹھہرو یہاں اتنے بستر کہاں ہوں گے۔تم تو بہت سارے آگئے ہو، یہاں جنت میں اتنے بستر تو نہیں ہوتے، بچوں کے تو نہیں ہوتے، آؤ میرے گلے لگ جاؤ اور بی بی زینب نے اپنے شہید بھائی کو بھی پکارا ہوگا کہ آؤ حسین ان سینکڑوں بچوں سے ملو۔۔۔ ان میں اپنا بچپن دیکھو، جب تم اپنے نانا حضورؐ کے کندھوں پر سوار ہو جاتے تھے، نماز کے دوران ان سے لاڈ کرتے تھے بلکہ وہ تمہیں ڈھیلے ڈھالے لبادے میں چلتے دیکھ کر منبر سے اتر آتے تھے کہ کہیں وہ لبادے تمہیں پاؤں میں آکر تمہیں اوندھے منہ گرا نہ دیں، جیسے تم ان کے لاڈلے تھے یہ بھی تو اپنے اپنے نانا جان کے لاڈلے ہوں گے، اگرچہ ہمارے نانا حضورؐ نے تمہاری شادت کا دکھ نہ دیکھا، اگرچہ انہیں خبر ہوگئی تھی کہ مٹی سرخ ہو گئی ہے لیکن ان کے نانا جان جو ہیں انہوں نے اپنے نواسوں کے دکھ اور موت کو دیکھا۔۔۔ اے میرے بھائی جان ان کی انگلیاں پکڑ کر انہیں جنت کے ان محلوں میں لے جاؤ جہاں تمہارا بسیرا ہے اور ان میں سے کچھ کی انگلیاں یزیدوں نے کاٹ ڈالی ہیں تو انہیں اپنی آغوش میں لے لو۔۔۔ کہ ان بچوں کے چھلنی ہو چکے بدنوں میں سے وہی خون رستا ہے جو تمہارے شاندار نانا حضورؐ کے چومے ہوئے بدن میں سے کربلا کے تیروں سے پھوٹ نکلا تھا۔۔۔ وہی خون ہے۔

بڑھتی جاتی دھند تھی اور اس دھند میں سے سینکڑوں تابوت ظاہر ہوتے تھے، تابوت بڑے تھے اور لاشے چھوٹے اور وہ لڑھکتے جاتے تھے۔

وزیراعظم کے میڈیا منیجرز ۔۔۔؟

مستنصر حسین تارڑ

Posted Date : 24/12/2014

میڈیا اس عہد کا سب سے مہلک ہتھیار ہے، شرط یہ ہے کہ اسے استعمال کرنے والے تجربہ کار اور معاملہ فہم لوگ ہوں، یہ یوں جانئے کہ بندر کے ہاتھ میں ایک استرا بھی ہے جس سے خود اپنا گلا بھی کاٹا جاسکتا ہے اور اس کی سب سے بڑی مثال موجودہ حکومت کی عمران خان کے خلاف ایک ناکام میڈیا یلغار ہے،۔۔۔ میڈیا ایسی طاقت ہے جس کے استعمال سے ظالم کو مظلوم اور مظلوم کو ظالم ثابت کیا جا سکتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ہندوستان سے آئے ہوئے ایک سردار صاحب نے شکایت کی تھی کہ پی ٹی وی پر جو اذان نشر ہوتی ہے اس کا اثر میرے سکھ بچے پر بھی ہو گیا ہے اور اذانیں دینے لگا ہے اور ہمارے ہاں آپ کے ہاں کے نیوز کاسٹرز اور میزبانوں کی اردو کی نقل کرتے ہوئے لوگ اپنی دھرم پتنی کو بیگم صاحبہ کہنے لگے ہیں اور انشاء اللہ بھی رائج ہونے لگا ہے۔ میں نے بھی سردار صاحب سے شکایت کی کہ آپ کے بیہودہ ٹیلی ویژن ڈرامے دیکھنے سے ہمارے ہاں ساس بہو کے جھگڑے زیادہ ہو گئے ہیں اور لڑکیاں فیشن کے طور پر تلک

لگانے لگی ہیں بلکہ معاشرے کا ایک طبقہ نہایت ذوق و شوق سے ہولی کا تہوار بھی مناتا ہے۔
ان زمانوں میں جب سید مشاہد حسین وزیر اطلاعات ہوا کرتے تھے پی ٹی وی ہیڈکوارٹر میں ایک پالیسی ساز میٹنگ ہوئی جس میں متعدد میڈیا سے متعلق لوگوں کے علاوہ میں بھی شامل تھا اور جب مشاہد صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ تارڑ صاحب آپ کے خیال میں میڈیا کی کیا تعریف ہے تو میں نے کہا تھا کہ شاہ جی، میڈیا کا مطلب ہے لوگوں کو بیوقوف بنانا، اسی لئے تو ٹیلی ویژن کو ”ایڈیٹ بوکس“ یعنی ”احمقوں کا ڈبہ“ کہا جاتا ہے ۔ میٹنگ میں تشریف فرما ان کے بیوروکریٹ میری اس تعریف پر بے حد خفا ہوئے اور مجھے خوب خوب گھورا۔۔ اس پر مشاہد صاحب جن سے مجھے دوستی کا ایک قدیم دعویٰ بھی ہے مسکرا کر کہنے لگے، تارڑ صاب ہم آپ سے میڈیا کے وسیع تجربے اور ادیب ہونے کے ناتے ایک دانش ورانہ تعریف کی توقع کرتے ، تب میں نے میڈیا کی عالمی تاریخ کھنگالی، ارسطو سے لے کر شیکسپیئر وغیرہ کے سٹیج ڈراموں کے حوالے دیئے اور جب بیوروکریٹ حضرات شدید متاثر ہو رہے تھے میں نے کہا کہ مختصراً میڈیا کا مطلب ہے لوگوں کو بے وقوف بنانا۔
یہودیوں نے میڈیا کے زور پر، ٹیلی ویژن، اخباروں اور فلموں میں ہٹلر کے ہاتھوں ہلاک ہونے والے لاکھوں یہودیوں کو ”ہولوکاسٹ“ کے حوالے سے ابھی تک زندہ رکھا ہوا ہے۔ ہٹلر نے اپنے زیرنگیں ملکوں میں جو لاکھوں آزادی پسند، کمیونسٹ اور خانہ بدوش ہلاک کئے ان کا کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا، ہالینڈ کی ایک یہودی لڑکی این فرینک کی ڈائری ہر امریکی اور یورپی کوخون کے آنسو رلاتی ہے جب کہ فلسطین کی درجنوں لڑکیوں نے اسرائیلی یلغار میں ہلاک ہونے سے پیشتر ڈائریاں لکھیں اور وہ گمنام رہیں صرف اس لئے کہ عربوں یا فلسطینیوں کے پاس ان کی اپنی کوتاہی کے باعث میڈیا کا ہتھیار نہ تھا۔۔ ایک بوڑھا فلسطینی وزیر اسرائیلی فوجیوں کے تشدد سے ہلاک ہو جاتا ہے تو کیا ہوتا ہے، ایک دو تصویریں اور محمود عباس کا احتجاجی بیان، ذرا تصور کیجئے کہ اگر فلسطینیوں کے ہاتھوں ایک اسرائیلی وزیر مارا جاتا ہے تو میڈیا میں کیسا طوفان اٹھے گا بلکہ اوباما امریکہ بھر میں اس کی موت پر پرچم سرنگوں کرتے بلکہ بہ نفس نفیس اس کے جنازے میں شریک ہو کر کچھ آنسو بہاتے۔
میں ان مؤقر کالم نگاروں کی مؤقر صف میں شامل نہیں ہوں جو وزیراعظم یا صدر پاکستان کو اکثر اپنے مؤقر مشوروں سے نوازتے رہتے ہیں، ان کی رہنمائی کرتے رہتے ہیں کیونکہ مجھ میں وہ سیاسی بصیرت اور معاملہ فہمی مفقود ہے جو ان مؤقر حضرات میں کثرت سے پائی جاتی ہے لیکن میں شومیٔ قسمت سے روزگار اور شوق کے ملے جلے سلسلوں میں میڈیا سے متعلق رہا ہوں،۔۔ خاص طور پر ٹیلی ویژن، اخبار اور ادب کے حوالے سے تو مجھ میں کچھ سوجھ بوجھ آگئی ہے تو میں میاں نوازشریف سے ایک گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ حضور۔۔ آپ نے جن لوگوں کو اپنی کامیابیوں کی تشہیر کرنے کے لئے اور خاص طور پر عمران خان کو برا بھلا کہنے کے لئے تعینات کر رکھا ہے میڈیا کے اصولوں کے مطابق وہ مناسب نہیں، وہ آپ کی قبر کھود رہے ہیں، کوئی بھی شخص جو اپنا نقطہ نظر بیان کرنے کے لئے ، کسی جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لئے ٹیلی ویژن پر نمودار ہوتا ہے، پہلی شرط یہ ہے کہ اس کی شخصیت اور شکل میں کچھ ایسی متانت ہو کہ وہ قابل قبول ہو،۔۔ اور وہ جو بھی بات کرے کسی ٹھوس دلیل کے ساتھ اپنے حواس کو قابو میں رکھتے ہوئے کہے۔ لوگ اس کی بات کا اعتبار کرسکیں، ۔۔بے شک خواجہ سعد رفیق سے میں جب بھی ملا وہ بزرگوں کا ادب کرنے والے ایک سرگرم سیاست دان ہیں لیکن بصد ادب نہ ان کی شخصیت اور نہ ہی ان کی آواز میڈیا پر مؤثر ہوتی ہے، رانا ثناء اللہ کی گھنی مونچھیں اور خشونت آمیز چہرہ بے شک فیصل آباد میں دھاک بٹھاتا ہوگا ، ان کے ڈیرے پر بیٹھے ہوئے لوگوں کے اوسان خطا ہو جاتے ہوں گے لیکن ٹیلی ویژن کیلئے بغیر معذرت کے ان کا دبنگ چہرہ مناسب نہیں، عابد شیر علی کا تو ذکر ہی آیا، وہ ہمہ وقت کھولتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یوں برستے ہیں جیسے عوام الناس ان کی بسوں میں ٹکٹ کے بغیر سفر کر رہے ہیں، البتہ پروفیسر رشید صاحب ان کے پڑھے لکھے اور متانت بھرے چہرے سے مجھے کچھ اختلاف نہیں، ان کی شخصیت اور دانش متاثر کرتی ہے لیکن یہ کیا کہ وہ بھی اکثر ہتھے سے اکھڑتے جاتے ہیں، ان کی نسبت خواجہ آصف کی شخصیت اور دلائل میں ایک ٹھہراؤ ہے، آپا نثار فاطمہ کے قابل فرزند احسن اقبال شاید میڈیا پر عمران خان کے خلاف زیادہ مؤثر ہوتے، آخر میاں صاحب نے ان لوگوں کو اپنے دفاع کے لئے کیوں منتخب نہ کیا۔ انہوں نے اپنے شیخ رشید آگے کردیئے،۔۔ مجھے نہیں معلوم کہ میاں صاحب کے میڈیا ایڈوائزر کون ہیں، اگر ہیں تو نہایت بودے اور احمق ہیں، حکومت پاکستان کی جانب سے اور ظاہر ہے اس کے خزانے خالی کرتی عمران خان کے خلاف جو تحریک ٹیلی ویژن پر چلائی جا رہی ہے، میں بہت احتیاط کروں تو بھی بھونڈی اور غیرمؤثر ہے بلکہ اس کے نتیجے میں اس کی تشہیر کی جا رہی ہے۔
اگرچہ میاں نوازشریف ضیاء الحق کے لگائے ہوئے بوٹے ہیں اور اس مرد مومن نے دعا کی تھی کہ میری بقیہ عمر اس نوجوان کو لگ جائے لیکن اس کے باوجود چونکہ پاکستان کے عوام نے انہیں تین بار بھاری اکثریت

سے اپنا وزیراعظم منتخب کیا، بے شک تیسری بار کچھ نہ کچھ ہو گیا جس کی پردہ داری ہے، میں چاہتا ہوں کہ وہ اپنے پانچ سال پورے کریں۔ جمہوریت کا بول بالا ہو، مجھے نہ عمران خان سے غرض ہے اور نہ نوازشریف سے، مجھے صرف جمہوریت اور پاکستان سے غرض ہے۔ میں مشورہ نہیں دے رہا صرف عرض کر رہا ہوں کہ اپنے میڈیا منیجر تبدیل کردیں ورنہ وہ آپ کے گوڈے گٹوں میں بیٹھ جائیں گے۔ (جاری)

گلزار اور رات پشمینے کی
مستنصر حسین تارڑ
Posted Date : 28/12/2014

ان دنوں ایک ہندوستانی فلم کا بہت چرچا ہو رہا ہے، میں اس کا نام درج کرنے سے گریز کروں گا کہ اس کی تشہیر مقصود نہیں بلکہ جس موضوع پر یہ بنائی گئی ہے اُس کی اہمیت اجاگر کرنا چاہوں گا۔ اسے ”اکبر“ کا فرضی نام دے لیجیے۔۔۔ یہ فلم مقبوضہ کشمیر میں مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم، اُن کے قتل عام اور ہندوستانی فوج کی سفاکانہ کارروائیوں پر مشتمل ہے اور اس کے ہدایت کار، پروڈیوسر اور بیشتر اداکار ہندو ہیں۔۔۔ یہ اکبر نامی ایک کشمیری نوجوان کی کہانی ہے جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تعلیم حاصل کر کے وطن واپس آتا ہے۔۔۔ اس کا بڑا بھائی ایک نامور ڈاکٹر ہے جس کے لیے ایک مریض کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، وہ محض ایک انسان ہوتا ہے چنانچہ وہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں کچھ تخصیص نہیں کرتا بلکہ اس کے بیشتر مریض ہندو پنڈت وغیرہ ہیں جو اس کی بے حد تعظیم کرتے ہیں۔۔۔ اسے سیاست وغیرہ سے بھی کوئی سرو کار نہیں، اس کے پاس جن موت کے قریب ہوتے زخمیوں کو لایا جاتا ہے وہ اُن کا علاج کرتا ہے اور اُن میں وہ مجاہد بھی شامل ہوتے ہیں جو ہندوستانی فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے زخمی ہو کر زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہوتے ہیں اور ڈاکٹر اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ وہ شاید ایک جرم کا ارتکاب کر رہا ہے کہ یہ لوگ ریاست کے باغی ہیں لیکن وہ ان کا علاج کرنے سے انکار نہیں کرتا کہ وہ اس کے ہم مذہب ہیں اور ایک ابتلا میں ہیں۔ چنانچہ اس ”جرم“ کی پاداش میں اس کے خوبصورت کشمیری گھر کو راکٹ پھینک کر جلا دیا جاتا ہے۔۔۔ اور ڈاکٹر کو غائب کر دیا جاتا ہے۔۔۔ اس کی بیوی کا کردار تبو نے کیسی درد انگیزی سے ادا کیا ہے اس کا بیان ممکن نہیں۔۔۔ چنانچہ جب اکبر وطن واپس آتا ہے تو اس کا گھر۔۔۔ ڈاکٹر نے اسے ایک بیٹے کی مانند پالا ہے اور اُس کی بیوی جب وہ چھوٹا تھا تو اسے ساتھ سلا کر لوریاں سنایا کرتی تھی۔۔۔ اس کا گھر ایک کھنڈر بن چکا ہے۔ اسے اپنی منہ بولی ماں اور بھابھی تو مل جاتی ہے لیکن وہ اُس سے بدگمان ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو اپنے بڑے بھائی کی تلاش کے لیے وقف کر دیتا ہے۔ اس کی تصویریں لوگوں کو دکھاتا ہے، ہندوستانی فوج کے افسروں کے سامنے کرتا ہے کہ یہ میرا بڑا بھائی ہے، کیا آپ اسے جانتے ہیں، یہ وہ زمانہ ہے جب جہلم کے پانیوں میں فوج کی جانب سے ڈبوئی گئی مجاہدین اور کشمیریوں کی لاشیں ڈوبتی ابھرتی ہیں تو وہ دریائے جہلم کے پانیوں کو بھی کھنگالتا ہے۔ اُن لوگوں سے رجوع کرتا ہے جو لمبے بانسوں کے ذریعے دریا کے پانیوں کو ٹٹولتے ہیں، اُن میں سے لاشیں برآمد کرتے ہیں اور بالآخر ایک برف آلود قبرستان ہے جہاں اُس کی قبر کا کتبہ دریافت ہو جاتا ہے۔۔۔ کہانی آگے بڑھتی ہے لیکن طوالت کے خدشے کے باعث میں آگے نہیں بڑھ سکتا۔ یہ فلم ایک ایسے ہدایت کار نے بنائی ہے جو اپنا مرکزی خیال شیکسپیئر کے کسی ڈرامے سے اخذ کرتا ہے اور اُسے ہندوستانی روپ رنگ میں ڈھال دیتا ہے۔ اُس کی بہت مشہور فلم ”اوم کارہ“ بھی ہے اور فلم ”اکبر“ شیکسپیئر کے ڈرامے ”ہیملٹ“ سے اخذ کی گئی ہے اور کشمیری ہیملٹ کا کردار شاہدکپور نے نہایت مؤثر انداز میں ادا کیا ہے۔۔۔ اس فلم میں قبرستان کا ایک برف پوش منظر ہے جس میں کشمیری مسلمان اگرچہ زندہ ہیں مگر قبروں میں لیٹے ہوئے ہیں۔ فلم کے گیت گلزار صاحب کے لکھے ہوئے ہیں اور ایسے گیت صرف گلزار ہی لکھ سکتے تھے کہ اُن کا آبائی وطن دنیا کا وہ قصبہ ہے جو دریائے جہلم کے قریب ہے، وہی جہلم جو کشمیر سے آتا ہے۔۔۔ مجھے فخر ہے کہ گلزار صاحب میرے دوست ہیں، انہوں نے میرے افسانے ”بابا بگلوس“ سے متاثر ہو کر دو نظمیں لکھیں جو ان کے شعری مجموعے ”رات پشیمنے کی“ میں شامل ہیں اور انہوں نے میری 75 ویں سالگرہ کے موقع پر خصوصی مبارک کا پیغام بھجوایا۔۔۔

اس سے پیشتر ہندوستانی ہندو ہدایت کاروں نے احمد آباد کے مودی مسلم کش فسادات کے بارے میں فلمیں بنائیں، مسلمانوں کے قتل عام کی عکاسی کی اور اُن سینکڑوں ہلاک کیے جانے والے مسلمانوں کے خون کی ترجمانی کرتے ہوئے ہندو بنیاد پرستوں کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ بہت سے لوگوں کو شاہ رخ خان اور منیشہ کوئرالہ کی فلم ”دل سے“ یاد ہو گی جو ہندوستان کے خلاف بغاوت کرنے والے قبیلوں کے بارے میں تھی اور اُس میں نہ صرف ہندوستانی فوج کے مظالم دکھائے گئے بلکہ مقامی عورتوں کی ان کے ہاتھوں آبرو

ریزی کی جھلکیاں بھی عکس کر گئیں۔ یہ وہ ہدایت کار تھے جن کا ضمیر اُنہیں کچوکے دیتا تھا کہ نہ صرف حکومت بلکہ ہندوستانی فوج آزادی کی تحریکوں کو بیدردی سے کچل رہی ہے تو ہم چپ نہیں رہ سکتے، ہمیں احتجاج کرنا ہے اور اس کے باوجود ان فلموں کے بنانے والوں کو نہ تو غدار کہا گیا اور نہ ہی اُن پر لعن طعن کی برسات ہوئی کہ وہ اپنا جمہوری حق استعمال کر رہے تھے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ایسی فلمیں جو ریاست کے جبر اور تشدد کو نمایاں کرتی ہیں دراصل ریاست کو مستحکم کرتی ہیں، محکوم اور ستم رسیدہ لوگ جب انہیں دیکھتے ہیں تو اُنہیں ایک طمانیت حاصل ہوتی ہے کہ ہم پر جو ظلم ہوئے یا ہو رہے ہیں کم از کم اُن کی عکاسی ہو رہی ہے۔۔۔ ہم گمنام نہیں مرتے جاتے، ہمارا تذکرہ ہو رہا ہے اور یوں اُن کی بھڑاس نکلتی ہے اور اُن کے اندر ریاست کے خلاف جو نفرت اور غصہ کھولتا ہے اُس میں کچھ کمی آتی ہے کہ ہم گمنام نہیں مرتے، ہماری جدوجہد کا چرچا ہو رہا ہے، اُن کا طیش کسی حد تک مدھم پڑ جاتا ہے۔۔۔ اور یوں ریاست کی گرفت مزید مضبوط ہو جاتی ہے، وہ ایک سراب میں مبتلا ہو کر اپنی جدوجہد میں دھیمے پڑ جاتے ہیں۔

کیا کبھی ایسا ہو گا کہ جو کچھ مشرقی پاکستان میں ہوا اور بہت کچھ ہوا یا پھر جو کچھ ان زمانوں میں بلوچستان میں ہو رہا ہے ہمارے ہاں کوئی ہدایت کار اُن مظالم کی عکاسی کرے اور یہ تو کبھی نہ ہو گا کہ ہم وہ شتر مرغ ہو چکے ہیں جو ریت میں سر دفن کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ سب اچھا ہے، سب اچھا ہے، ہم میں سے اگر کوئی شخص یہ جرأت کر بھی لے تو کیسے میڈیا اور اخبار اُس پر پل پڑیں گے۔ کم از کم الزام غداری کا لگے گا، محب الوطنی کے خلاف وہ شمار ہو گا۔

پاکستان کے قیام کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر پی ٹی وی نے تحریک پاکستان اور پاکستان کی تاریخ کے بارے میں ڈراموں کے ایک سلسلے کا آغاز کیا چونکہ اُن دنوں ایک ڈرامہ نگار کے طور پر کچھ اہمیت رکھتا تھا چنانچہ مجھ سے بھی رابطہ کیا گیا۔

میں نے لاہور کے سول سیکرٹریٹ کی عمارت پر یونین جیک کو نوچ کر اُس پر مسلم لیگ کا پرچم لہرانے والی بہادر لڑکیوں کے بارے میں ”پرچم“ نام کا ڈرامہ تحریر کیا اور ”جلیاں والا باغ“ کے قتل عام کے حوالے سے ایک طویل دورانئے کا کھیل لکھا جو بے حد مقبول ہوا لیکن جب میں نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بارے میں ایک ڈارمہ تحریر کرنے کی خواہش کا اظہار کیا اور یہ یقین دلایا کہ اُس میں صرف رنج اور اداسی کا اظہار ہو گا کہ ہمارے ملک کا ایک حصہ ہم سے کٹ گیا تو ٹیلی ویژن ہیڈ کوارٹر کی جانب سے انکار ہو گیا۔ پاکستان کی تاریخ مشرقی پاکستان کے بچھڑ جانے کے تذکرے کے بغیر کیسے مکمل ہو سکتی ہے یہ میری سمجھ میں نہ آیا، ایسی فلمیں اور ڈرامے جو ریاست کے جبر اور تشدد کو نمایاں کرتے ہیں دراصل ریاست کو مستحکم کرتے ہیں، میری سمجھ میں تو صرف یہ آتا ہے۔

“فیض گھر میں ایک کملی۔۔۔’

مستنصر حسین تارڑ

Posted Date : 31/12/2014

میں سنکیانگ یا چینی ترکستان کی لیاقت اور وہاں کے مسلمانوں کی تہذیب اور روایات اور وہاں کے شہروں، یارقند اور کاشغر وغیرہ کے بارے میں ایک لیکچر دینے کے لئے جب ماڈل ٹاؤن کے 26 ایف بلاک میں واقع ”فیض گھر“ میں داخل ہوا تو فیض صاحب کی یادوں نے یوں ہجوم کیا ہے جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے باد نسیم۔۔۔

وہ جو بچپن سے نوجوانی میں داخل ہونے کے پہلے موسم تھے جب ہر درخت سرسبز لگنے لگتا ہے اور ہر بطخ، راج ہنس دکھائی دینے لگتی ہے، سکول کے زمانے تھے جب کسی ادبی جریدے میں فیض صاحب کا ’ رات یوں دل میں تیری کھوئی ہوئی یاد آئی، والا قطعہ نظر سے گزرا تو ہم تو رومان کے اک جہان سے گزر گئے۔۔۔ آٹو گراف بک سنبھالی، ’پاکستان ٹائمز‘ کے دفتر کے باہر ایک دوپہر تعینات ہو گئے۔ ایک مدت کے بعد جب ہم دھوپ میں جل کر خاک ہونے کو تھے فیض صاحب سگریٹ پھونکتے پھاٹک سے باہر آئے اور میں اپنی ڈھیلی خاکی رنگ کی پتلون سنبھالتا ان کے سامنے جا کھڑا ہوا، آٹو گراف بک کا کشکول آگے کیا اور کہا ”آٹو گراف پلیز“ انہوں نے ایک مصرع لکھا، ’ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے‘ اور دستخط کر دیئے، اب میں پرورش سے تو واقف تھا کہ بچوں وغیرہ کی عام طور پر کی جاتی ہے لیکن یہ لوح و قلم کس بلا کو کہتے ہیں نہیں جانتا تھا چنانچہ میں نے کہا ’ سر۔۔۔ آپ مجھے وہ شعر لکھ دیں، ’ رات یوں دل میں تیری کھوئی ہوئی یاد آئی‘۔ انہوں نے اپنے چھدرے بالوں میں انگلیاں چلا کر کچھ غور کیا اور کہنے لگے ”بھئی وہ تو ہم کچھ بھول رہے ہیں“ تو میں نے فوراً پیشکش کی کہ سر ، مجھے یاد ہے، میں لکھا دیتا ہوں، لکھئے۔۔۔ وہ آٹو گراف بک

ابھی تک میرے پاس موجود ہے جس کے ایک صفحہ پر ”لوح و قلم“ ہے اور سامنے کے صفحے پر ’رات یوں‘ درج ہے۔ ایک مدت کے بعد پاکستان نیشنل سنٹر کی کسی تقریب میں فیض صاحب صدارت کر رہے تھے اور میں یکے از مقررین تھا جب میں نے تقریر کا آغاز کرتے ہوئے کہا تھا کہ خواتین و حضرات یہ میں ہوں جو فیض صاحب کو شعر لکھوایا کرتا تھا۔

میں فیض صاحب کے کبھی قریب نہ رہا، لیکن ہمارے درمیان بہرطور جاٹ ہونے کا ایک رشتہ تھا چنانچہ ایک خط میں مجھے لکھتے ہیں کہ ادب کے میدان میں اگر آپ کی مخالفت ہوتی ہے تو یوں جانئے کہ یہ ’شریک ‘ ہیں جنہوں نے دشمنی تو کرنی ہے اور جاٹ شریکوں سے گھبرایا نہیں کرتے۔ یعنی درپردہ وہ اشارہ کر رہے تھے کہ مجھے دیکھو کیا میں کبھی غوغا رقیباں سے براساں ہوا، شریکوں کی بدزبانی اور ملامت سے دل گرفتہ ہوا، کبھی کسی کو جواب نہ دیا، خاموشی اختیار کی، پچھلے دنوں اردو زبان کے حوالے سے میرے کسی بیان پر نہایت نستعلیق بزرگ مشتعل ہو گئے اور اپنے کالم میں مجھ پر یلغار کردی بلکہ متعدد ’جید‘ کالم نگار بھی ہمنوا ہو گئے اور مجھ سے کسی نے نہ پوچھا کہ میں نے کس حوالے سے اس انگریزی زبان کے انٹرویو میں کیا بیان دیا ہے، بہت سے لوگوں نے ان ’جید‘ حضرات اور نستعلیق بزرگ کے کالم کے جواب میں مجھ سے بھی اصرار کیا کہ میں بھی ان ’مدلّل‘ اعتراضات کا جواب دوں کہ میں بھی تو ایک مؤقر روزنامے میں اور دنیا میں سب سے زیادہ چھپنے والے اردو کے ایک ہفت روزہ میں باقاعدہ کالم نگار ہوں۔۔۔ تو میں نے کہا تھا کہ اگر میں چاہوں تو جواب لکھ کر انہیں شرمندہ کر سکتا ہوں لیکن میں فیض صاحب کے نقش قدم پر چلتا ان کی خاموشی اور بے پروائی اختیار کرتا ہوں۔۔۔

”فیض گھر“ ایک ایسا گھر ہے جسے ان کے ایک چاہنے والے نے ان کی یاد میں اپنے گھر کو وقف کردیا۔۔ اور ان کے اندر فیض صاحب ابھی تک سانس لیتے ہیں، ان کی تصاویر، میڈل، مسودے، ذاتی استعمال کی اشیاء سبھی ہیں۔ ان کی ذاتی لائبریری محفوظ ہے جہاں کبھی کبھار روسی لڈمیلا واسولوا آتی ہے اور ان کی یاد میں آنسو بہاتی ہے۔ لڈمیلا کو اس کے دوست ”مِیلا“ کہتے ہیں۔ جب میں ماسکو سٹیٹ یونیورسٹی کی سرکاری دعوت پر وہاں لیکچر دینے کے لئے گیا تو ”مِیلا“ نے میری بہت پذیرائی کی۔ مجھے اور میری بیگم کو ایک شب اپنے فلیٹ پر کھانے کے لئے مدعو کیا اور اس فلیٹ میں بھی فیض صاحب کی تصویریں آویزاں تھیں۔ اس نے میرے ناول ”راکھ“ کے بارے میں مجھ سے تبادلہ خیال کیا۔۔ اگرچہ وہ ابھی تک اسے مکمل طور پر نہیں پڑھ سکی تھی۔ وہ پاکستان آئی تو میں اسے فیض صاحب کی ماڈل ٹاؤن قبرستان میں واقع ان کے سنگ مرمر کے مدفن تک لے گیا اور وہ اشک بار ہوتی بلند آواز میں، آئے تھے سوگوار چاہے،پڑھتی قبرستان میں داخل ہوئی تھی اور پھر میرے ہمراہ فاتح کے لئے ہاتھ بلند کر دیئے تھے۔۔۔ مجھے یہ اعزاز بھی حاصل ہوا کہ میرے لئے منعقد کردہ ایک تقریب میں جب ماسکو سٹیٹ یونیورسٹی کی جانب سے اس کے اردو نصاب میں پچھلے تیس برسوں سے شامل ہونے کے اعتراف میں ایک گولڈ میڈل عطا کیا گیا تو پروفیسر گالین ڈشنکو کے علاوہ یہ لڈ میلا تھیں جنہوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہم روس میں پاکستان کو فیض کی شاعری اور تارڑ کی نثر کے حوالے سے جانتے ہیں۔ کیا میں ان زمانوں میں جب میں ایک سکول بوائے تھا، فیض صاحب کو درخواست کر رہا تھا کہ ”آٹو گراف پلیز“ تو کیا میں تصور بھی کر سکتا تھا کہ آئندہ زمانوں میں کبھی سرزمین روس پر میرا نام ان کے نام کے ساتھ لیا جائے گا۔ وہ جسے چاہے ذلّت دے اور جسے چاہے بے وجہ عزت دے۔۔۔

”فیض گھر“ کا مختصر ہال بھرا پڑا تھا۔۔ ان کی قابل فخر بیٹی منیزہ ہاشمی نے سٹیج پر کھڑے ہو کر میرے بارے میں کچھ باتیں کیں اور پھر میں نے وہاں موجود لوگوں سے اپنے سفر سنکیانگ کے بارے میں بہت سی باتیں کیں۔ بہت سے سوال جواب ہوئے، لیکن ہمہ وقت۔۔۔ تم آئے ہو نہ شب انتظار گزری ہے۔۔۔ کی سی کیفیت گزرتی رہی۔ تلاش میں ہے سحر بار بار گزرتی رہی، فیض صاحب یاد آتے رہے اور وہاں موجود لوگوں نے جس طور مجھے اپنی محبتوں سے سرشار کیا مجھے اپنی کم مائیگی یاد آتی رہی۔

کتھے میں کملی، کتھے شان تیری
میں کی ساں مینوں کی بنا دتّا ای

مجھ ’کملی‘ کو ’فیض گھر‘ میں مدعو کرکے مجھے کیا سے کیا بنا دیا تھا۔

دیوار برلن اور دیوار فلسطین

مستنصر حسین تارڑ

Posted Date : 07/01/2015

”دیوار“ ایک عجیب و غریب استعارہ ہے، اسے انسانی زندگی کے دکھوں، مسرتوں، نارسائیوں اور نا آسودگیوں پر یکساں طور پر منطبق کیا جا سکتا ہے۔۔۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ دیواروں سے باتیں کرنا اچھا

لگتا ہے اور ہم بھی پاگل ہو جائیں گے ایسا لگتا ہے۔۔۔ اور کبھی یہ جستجو ہوتی ہے کہ دیوار کے پار کیا ہے، کونسی دنیا ہے جس سے ہم آشنا نہیں ہیں، اور ہمارے ایسے معاشرے میں تو ہر خیال، ہر خواہش اور ہر تمنا کے آگے ایک دیوار ہوتی ہے جس سے ہم سر تو پھوڑ سکتے ہیں اس کے پار نہیں جا سکتے۔ ایک وہ کچی دیوار بھی ہوتی ہے جو گر جائے تو لوگ آپ کے صحن میں راستے بنا لیتے ہیں۔۔۔ لیکن ایک اور دیوار بھی ایسی ہوتی ہے جسے انسان خود تعمیر کرتے ہیں تا کہ انسانوں اور تہذیبوں کو تقسیم کیا جا سکے۔ اُن کے درمیان دیوار کی دراڑ ڈال دی جائے۔

اگر کبھی صرف ایک دیوار کا نام آئے تو ہمیشہ ایک ہی دیوار ذہن میں ابھرتی ہے کہ ہم سب مغرب کے میڈیا اور سوچ کے غلام ہوتے ہیں اور وہ ہمیشہ دیوار برلن ہوتی ہے۔

ہم کبھی یہ نہیں سوچتے کہ دنیا میں ایک اور دیوار بھی ہے اور میری مراد دیوار چین سے نہیں ہے، دیوار فلسطین سے ہے۔۔۔ غزہ کے گرد سینکڑوں کلو میٹر طویل، بہت بلند، کہیں خار دار تاروں کی بھرمار، کہیں اُن تاروں میں کرنٹ چھوڑا ہوا۔۔۔ پورے فلسطینی علاقے کو ایک جیل کی صورت دی گئی اور اُس کے اندر لاکھوں لوگ قید ہیں، جو اس دیوار کو عبور کرکے اپنے عزیزوں کے پاس جانا چاہیں وہ جانوروں کی طرح شکار کر لئے جاتے ہیں اور کوئی احتجاج نہیں کرتے، کسی کو آزادی یا جمہوریت کا خیال نہیں آتا۔۔۔ اور ادھر جو چند کلومیٹر طویل اور مختصر بلندی کی دیوار برلن تھی جسے خود جرمنوں نے تعمیر کیا کہ وہ کمیونسٹ نظام پر یقین رکھتے تھے، یہ دیوار پوری دنیا کے لئے یعنی مغربی اور امریکی دنیا کے لئے آزادی اور جمہوریت کا ایک استعارہ بن گئی۔۔۔ اس کے سائے میں میوزیکل کنسرٹ منعقد ہوتے جن میں اس دیوار کو ظلم اور غلامی کی ایک علامت قرار دے کر اسے ڈھا دیئے جانے کے گیت گائے جاتے۔ اگر مشرقی جرمنی سے فرار ہونے والا کوئی جرمن اس دیوار کو عبور کرنے کی کوشش میں ہلاک ہو جاتا تو کہرام مچ جاتا اگرچہ مرنے والا بھی جرمن اور مارنے والے بھی جرمن۔۔۔ یہاں تک کہ امریکی صدر جیک کینیڈی نے اس کے سائے میں تقریر کرتے ہوئے اسے انسانیت کے خلاف ایک بہیمانہ جرم قرار دیا اور نعرہ لگایا کہ ”میں بھی برلن کا باشندہ ہوں“۔

اور ادھر وہ دیوار جسے اسرائیلیوں نے فلسطینیوں کی سرزمین کے سینے پر تعمیر کیا، بستیاں برباد کیں، انہیں دیوار سے یوں تقسیم کیا کہ فلسطینی کاشتکار کا گھر ادھر ہے اور اس کے زیتون کے باغ ادھر ہیں اور وہ اجڑ گئے اور ان پر یہودیوں کی نئی بستیاں تعمیر کی گئیں۔ امریکہ اور مغرب کے بیشتر ملکوں نے اس دیوار کو تو ظلم اور غلامی کی ایک علامت قرار دے کر ڈھا دینے کا بھی اعلان نہ کیا، نہ کبھی اس کے سائے میں ظلم کے خلاف گیت گائے اور نہ ہی کسی امریکی صدر نے اس کے سائے تلے کھڑے ہو کر یہ نعرہ لگایا کہ ۔۔۔” میں بھی فلسطین کا باشندہ ہوں“۔

کچھ برس پیشتر جب ”لٹریری ورک سٹارٹ“ نامی جرمنی کی سرکاری ادبی تنظیم نے مجھے پاکستان کے ایک نمائندہ ادیب کے طور پر میرے ناول ”راکھ“ کی پذیرائی کے لئے برلن مدعو کیا تو اس تقریب میں پہلے تو بائیڈل برگ یونیورسٹی کی پروفیسر ڈاکٹر کرسٹینا آسٹن بلڈ نے خصوصی طور پر ”راکھ“ کے حوالے سے میری ناول نگاری کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی۔ پھر ایک جرمن شاعرہ نے ”راکھ“ کے ایک باب کا جرمن ترجمہ ڈرامائی انداز میں پیش کیا اور اس دوران جب حاضرین ناول کے کسی حصے سے متاثر ہو کر تالیاں بجاتے تو میں نہایت بیوقوف محسوس کرتے مسکرانے لگتا کہ زبان یار جرمن تھی اگرچہ میری ہی تحریر تھی لیکن میں جرمنی نہیں جانتا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ میری تحریر کا کون سا حصہ جرمن لوگوں کو پسند آیا ہے۔۔۔تقریب کے آخر میں ڈاکٹر کرسٹینا اور اس جرمنی شاعرہ نے ”راکھ“ کے بارے میں مجھ سے مکالمہ کیا اور پھر مجھے اختتامی کلمات کے لئے درخواست کی گئی۔۔۔ میں نے کچھ گفتگو پاکستان کی ادبی صورت حال کے بارے میں کی، اردو میں لکھے گئے ناولوں کا تذکرہ کیا اور پھر میں نے عرض کیا کہ یہ برلن سے میری پہلی ملاقات نہیں ہے۔ پہلی بار میں برطانوی وفد کے ساتھ ماسکو میں منعقد کردہ عالمی یوتھ فیسٹیول میں حصہ لینے کے بعد 1958ء میں مشرقی برلن میں ٹھہرا تھا اور روزانہ ٹرین کے ذریعے مغربی برلن آیا جاتا کرتا تھا۔۔۔ تب کوئی دیوار نہ تھی، برلن ان دنوں ابھی نوتعمیر ہو رہا تھا اور ہر جانب کھنڈرات نظر آتے تھے۔۔۔ پھر مجھے ایک پاگل شخص مائک ملر کے ہمراہ چار آسٹریلین خواتین کے ساتھ 1969ء میں برلن آنے کا اتفاق ہوا اور تب برلن کے مغربی اور مشرقی حصے کے درمیان ایک دیوار تعمیر ہو چکی تھی اور آج آپ کی مہربانی سے میں ایک مرتبہ پھر برلن میں ہوں اور اب وہ دیوار جو برلن کو اور جرمنی کو تقسیم کرتی ہے ڈھے چکی ہے۔۔۔ کیا آپ لوگ آگاہ ہیں کہ دنیا کے ایک اور خطے میں دیوار برلن سے ایک طویل اور بہت بلند، تقریباً ناقابل عبوردیوار تعمیر ہو چکی ہے جس نے لاکھوں معصوم لوگوں کو ایک زنداں میں ڈال دیا ہے۔ ان کے زیتون کے باغ اجڑ گئے اور ان کے گاؤں کے گاؤں اس دیوار کی زد میں آکر تباہ ہو گئے۔ آخر اس دیوار کے خلاف کسی کا ضمیر کیوں نہیں جاگتا، ان کا تذکرہ کیوں نہیں ہوتا۔۔۔ صرف اس لئے کہ وہ دیوار مغرب کے ایک ملک میں نہیں، دنیا کے ایک اور خطے میں ہے، کیا اسے ظلم اور بربریت کا استعارہ قرار دے

کر ڈھا دینے کا نعرہ بلند نہیں ہوگا۔۔ کیا آپ اس الجھن کو سلجھا سکتے ہیں۔۔ تقریب کے بعد ایک ہندوستانی ریستوران میں ڈنر کرتے ہوئے جبکہ وہاں افتخار عارف اور انڈیا سے آئے ہوئے معروف شاعر ندا فاضلی بھی موجود تھے ”لٹریری ورک سٹارٹ“ کی انچارج خاتون نے مجھ سے شکایت کی۔۔ آپ نے نہایت ناروا باتیں کیں، ہم مشکل میں پڑ سکتے ہیں اور آپ کے خلاف اگرچہ نہ ہو گی پر کارروائی ہو سکتی ہے کہ جرمنی میں یہودیوں اور اسرائیل کے خلاف اظہار کرنا ایک جرم ہے۔۔ تو میں نے ان سے کہا کہ خاتون میں نے صرف ایک دیوار کا حوالہ دیا ہے، نہ اسرائیل کا اور نہ ہی یہودیوں کے خلاف کچھ کہا ہے تو انہوں نے کہا ۔۔ آپ نے زیتون کے باغوں کا حوالہ تو دیا ہے تو یہی کافی ہے۔

عجیب بات ہے کہ میری پکڑدھکڑ جاری رہتی ہے، پاکستان میں نہیں، جرمنی میں بھی۔۔ صرف اس لئے کہ میں زہربلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند۔۔

دیوار فلسطین جیسے ابھی تک میرے بدن میں چلی جاتی ہے، اسے تقسیم کرتی ہے اور نہ صرف مغرب کا بلکہ مشرق وسطیٰ کے شاہوں کا ضمیر بھی مردہ ہو چکا ہے۔

یاشار کے لیے، یاشار کی جانب سے

مستنصر حسین تارڑ

Posted Date : 11/01/2015

یاشار کمال سے میرا تعارف آج سے تقریباً پینتیس برس پیشتر ہوا جواب تک ایک دائمی محبت میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اُن زمانوں میں امریکہ اتنا بدنام اور برا نہ تھا، اچھے کام بھی کیا کرتا تھا اور ان میں سے ایک ”مکتبہ فرینکلن“ کاقیام تھا۔ ایک ایسا اشاعتی ادارہ جو امریکی ادب کے ترجموں کے علاوہ بین الاقوامی ادب بھی شائع کرتا تھا اور اسی سلسلے کی ایک کڑی یاشار کمال کے ترکی ناول ”ونڈز فرام دے پلینز“ یا ”میدانوں سے آنے والی ہوائیں“ کا انگریزی ترجمہ تھا۔۔ اس سے پیشتر میں صرف روسی اور مغربی ادب سے شناسا تھا اور وہاں کے ناولوں کا اسیر تھا لیکن یاشار کمال کے اس مختصر ناول نے مجھے مسخر کر لیا۔ حیران کر دیا کہ کیا ترکی میں بھی اس پائے کا ناول لکھا گیا ہے۔۔ یہ ایک ایسے افلاس زدہ پہاڑی گاؤں کی کہانی ہے جس کے باشندے سارا سال انتظار کرتے ہیں کہ کب نیچے میدانوں میں کپاس کی فصل تیار ہو اور وہ سب میدانوں تک کا دشوار سفر اختیار کر کے کپاس کی چنائی سے سال بھر کی روٹی کے لیے کچھ رقم کما سکیں۔۔ اور اس ناول میں ایک سے ایک بڑھ کر شاندار اور دل پر اثر کرنے والا کردار تھا۔۔ اور جب وہ ایک طویل سفر کے بعد میدانوں میں پہنچتے ہیں تو دیر ہو چکی ہوتی ہے اور دوسرے لوگ ان سے پہلے پہنچ کر کپاس کی چنائی پر مامور ہو چکے ہوتے ہیں۔۔ میں نے کوشش کی کہ اس ناول کو ہی ٹی وی کے لیے ٓ ڈرامائی شکل دوں لیکن وہاں سے انکار ہو گیا کہ پہلے تو کپاس کی فصل تیار ہونے کا انتظار کیا جائے اور پھر سب اداکاروں کو اُن کھیتوں میں لے جایا جائے تو یہ ذرا مشکل ہے۔۔ ہمیں کوئی ایسا ڈرامہ لکھ کر دیں جو بس ٹیلی ویژن سٹوڈیوز کے اندر ہی تیار کیا جا سکے۔۔ ازاں بعد میں نے یاشار کمال کی تمام تحریریں پڑھ ڈالیں اور ان میں اس کا شہرۂ آفاق ناول ”محمت مائی باک“ بھی تھا۔۔ مجھے اب معلوم ہوا کہ رسول اللہؐ سے ترکوں کی الفت کی معراج یہ ہے کہ وہ برداشت ہی نہیں کر سکتے کہ کسی اور عام انسان کو محمدؐ کے نام سے پکارا جائے چنانچہ وہ محمت کو محمدؐ کے مترادف کے طور پر پکارتے ہیں۔۔ اسی طور وہ کسی کا نام احمد نہیں رکھتے، اُسے احمت کہتے ہیں۔ اُن زمانوں میں ایک نوجوان عطّار، فرخ سہیل گوئندی نام کا، میرے سفر ناموں کا شیدائی، میرے محسن اور دوست تلمیذ حقانی کے ہمراہ میری بیجوں کی دکان ”کسان اینڈ کمپنی“ پر آنے جانے لگا۔۔ نہایت بھڑکتا ہوا، آتش نوا انقلابی نوجوان جو دلّی جا کر وہاں بھی امریکہ کے خلاف جلوس ترتیب دیتا تھا۔ وہ سراسر ایک انقلابی سیاسی روح تھا اور میں ترقی پسند ہونے کے باوجود آج کے زمانوں میں ایک دشنام روشن خیال شخص تھا اور اب بھی ہوں لیکن مجھے سیاست سے کچھ سروکار نہ تھا۔۔ اس لیے میں کسی بھی سیاسی یا مذہبی جماعت کا ”نیلی آنکھوں والا لڑکا“ نہ بن سکا۔

گوئندی نے سیاست سے توبہ تو نہ کی، پر اپنے انقلاب کا رخ بدل لیا اور پبلشنگ کا پیشہ اختیار کر کے کتابوں کی اشاعت میں ایک فلسفیانہ انقلاب لے آیا۔ اُس نے پہلے تو یاشار کمال کے ناول ”میدانوں سے آنے والی ہوائیں“ کا اردو ترجمہ شائع کیا اور اس اقرار کے ساتھ کہ میں نے اُسے اس ناول اور یاشار کمال سے متعارف کروایا اور اب یاشار کا کلاسیک ناول ”محمت مائی باک“ ، ”اناطولیہ کہانی“ کے نام سے اشاعت کر دیا ہے۔۔ اس ناول کی افتتاحی تقریب نیرنگ آرٹ گیلری میں منعقد ہوئی۔۔ میں صرف گوئندی کی محبت میں یا صدارت کے چاؤ میں وہاں نہ گیا بلکہ اپنی حیات کی ایک انوکھی مسرت سے ہمکنار ہونے کے لیے گیا۔

میں نے اپنے کراؤن پرنس یعنی بڑے بیٹے کا ترک نام سلجوق رکھا اور جب سمیر کے ہاں میرا پہلا پوتا پیدا ہوا تو میں نے یاشار کمال کی الفت میں اسے یاشار کا نام دیا۔۔ اس سے پیشتر جب سلجوق اپنے کالج کے

ساتھ ترکی گیا تو میں نے اپنی ایک کتاب اس کے حوالے کی اور کہا کہ استنبول میں ترکی کے سب سے بڑے ناول نگار کو تلاش کرنا اور اسے میرا سلام کہنا، بے شک وہ اردو سے نابلد ہو گا لیکن میرے لیے یہی اعزاز کافی ہو گا کہ اس کے بک شیلف میں میری ایک کتاب جگہ پا جائے گی۔۔۔ سلجوق ترکی سے واپس آیا تو کہنے لگا: "ابا آپ تو مجھے مروانے لگے تھے۔ ترکی میں اگرچہ وہ ہر ترک کا پسندیدہ ناول نگار ہے لیکن وہ ایک کرد ہے اور اس کا نام لینا، اس کا اتہ پتہ پوچھنا خطرے سے خالی نہیں ہے"۔ اس تقریب میں گوئندی نے کہا کہ یاشار کمال کے تین جرم ہیں، ایک یہ کہ اس نے ایک یہودی خاتون سے شادی کی، دوسرا جرم اس کا کمیونسٹ ہونا ہے اور تیسرا ناقابل معافی جرم اس کا ایک کرد ہونا ہے۔۔۔ اسی لیے جب اسے نوبل انعام برائے ادب کے لیے منتخب کیا گیا تو ترک حکومت نے اعتراض کر دیا۔۔۔ مجھے یہاں حال ہی میں شاید سور گباش ہونے والے سندھی انقلابی دانشور یاد آ گئے جنہوں نے کہا تھا کہ مجھے تین سروں والا ایک عفریت قرار دیا جاتا رہا ہے، میرے تین جرم ہیں، ایک تو میں سندھی ہوں اور پھر ہندو ہوں اور کمیونسٹ ہوں۔۔۔ مجھے کون معاف کرے گا۔۔۔ میں جہاں کہیں بھی تکنیکی اور کمپیوٹر زدہ معاملات ہوتے ہیں، قطعی طور پر ایک جاہل اور بیہودہ شخص ہوں۔۔۔ میرے چھوٹے بھائی کرنل مبشر کی مہربانی ہے کہ وہ میری "فیس بک" کو آپریٹ کرتا ہے جس کے ممبران کی تعداد چالیس ہزار سے تجاوز کر چکی ہے۔۔۔ اس کے علاوہ کم از کم نصف درجن مجھ سے متعلق میرے نامعلوم پڑھنے والوں نے "ویب سائٹس" قائم کر رکھی ہیں اور ان میں ایک جسے میں دیکھ تو نہیں سکا ، "ادب کے تین حسین" نام کی ہے۔ اور اس کے آغاز میں درج ہے کہ ترکی تین "کمال" کے حوالے سے جانا جاتا ہے۔۔۔ یاشار کمال۔ ارہان کمال اور کمال اتاترک۔۔۔ اور پاکستان۔۔۔ کے تین حسین اس کی پہچان ہیں۔ عبداللہ حسین، انتظار حسین اور ۔۔۔عبداللہ حسین میرے دیرینہ تقریباً چالیس برس سے واحد ادبی دوست ہیں۔ اُن کے ساتھ بریکٹ ہونا میرے لیے ایک اعزاز ہے۔۔۔ صرف عبداللہ حسین کے ساتھ۔۔۔ اور ترکی کے ان نامور ادیبوں اور ترکوں کے باپ کے ساتھ اگر میرا حوالہ آتا ہے تو اس سے بڑھ کر خوش بختی اور کیا ہو گی۔

لیکن اس تقریب کا سب سے پر فخر لمحہ وہ تھا جب میرے پوتے یاشار کو اس کی وہ تصویر پیش کی گئی "جس پر بوڑھے یاشار کمال نے دستخط کرتے ہوئے لکھا تھا "یاشار کے لیے، یاشار کی جانب سے میں تو اس تک رسائی حاصل نہ کر سکا۔۔۔ میرا پوتا یاشار کمال کا محبوب ہو گیا۔
تھینک یو، فرخ سہیل گوئندی



"شاہ بلوط، برگد اور مجید امجد"

مستنصر حسین تارڑ

Posted Date : 14/01/2015

یہ جو گزر چکا دسمبر ہے بس یہی دن تھے، کرسمس کی چھٹیاں ہو چکی تھیں اور میں ساؤتھ اینڈ آن سی کے ساحلی قصبے میں نہیں جانتا تھا کہ آخر میں تنہائی اور یکسانیت کے یہ دن کیسے کاٹوں تو میں نے اپنا رُک سیک کاندھے پر بوجھ کیا اور کرسمس منانے کے لئے اپنے تئیں سوئٹزرلینڈ کے غیربرفانی قصبے زرماٹ تک جانے کا قصد کیا اور ظاہر ہے میں اپنے پلے سے سفر کے اخراجات کہاں ادا کرتا، بچ ہائکنگ یا لفٹوں کے ذریعے وہاں پہنچنے کا ارادہ کیا۔ میں کنٹر بری کے شہر تک تو آسانی سے پہنچ گیااور مجھے کچھ خواہش نہ تھی کہ میں آرچ بشپ آف کنٹر بری کی انگوٹھیوں کو بوسہ دوں کہ ایک زمانے میں انگلستان کے بادشاہ یہاں کے آرچ بشپ کی مرضی کے بغیرسلطنت کے امور نہیں چلا سکتے تھے اور وہ جو "کلیسا میں قتل " کا قصہ ہے۔ جب ایک بادشاہ ہنری نے اپنے عزیزاز جان عیاش دوست "بیکٹ" کو آرچ بشپ آف کنٹربری مقرر کردیا تھا اور پھر اسے قتل کروادیا تھا تو وہ بھی اس شہر کی تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ بہرحال کنٹربری نے مجھ سے کچھ اچھا سلوک نہ کیا میں لفٹ کے انتظار میں سڑک کے کنارے ایک مدت کھڑا رہا اور میری ٹانگیں اکڑ گئیں لیکن میرے ساتھ ایک اور المیہ ہوگیا، فٹ پاتھ پر چلتا، جو بھی شخص میرے قریب آتا، مجھے غیرملکی پہچان کر ایک ہی سوال کرتا"کیا آپ نے ہمارا ڈیڑھ سو برس قدیم شاہ بلوط کا درخت دیکھا ہے۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ وہ واقعی ڈیڑھ سو برس پرانا ہے۔ ہمیں اپنے کیتھڈرل پر اتنا فخر نہیں جتنا ہم اس شاہ بلوط پر نازاں ہیں، یہاں سے قریب ہی ہے۔"

ایک بوڑھی اماں جان لاٹھی ٹیکتی آتی ہیں، ایک سکول کا بچہ، ایک مخمور نوجوان، ایک لڑکی اٹھلاتی مور کی چال چلتی اور سبھی کا ایک ہی سوال ہے، کیا آپ نے ہمارا ڈیڑھ سو برس پرانا شاہ بلوط کا درخت دیکھا ہے۔

ازاں بعد یہ ایک الگ داستان ہے بالآخر لنڈن کے ایک ہیئرڈریسر یعنی نائی نے ... اگرچہ گورے نائی نے جو اپنی تین عدد نائب نائنوں کے ہمراہ ایک فوکس ویگن میں سوار مجھے بھی کار میں ٹھونس لیا اور ایک جزیزے میں لے گیا جو گھونگھوں یا سیپوں کا جزیرہ کہلاتا تھا اور میں نے اس نائی اور تین نائنوں کے ساتھ ایک ساحلی چوبی جھونپڑے میں ایک شب بسر کی لیکن... وہ شاہ بلوط کا درخت میرے حواس پر سوار ہوگیا کہ یہ لوگ اپنے ایک قدیم درخت سے اس قدر الفت رکھتے ہیں، تب آتش جوان تھا اور جب یہ آتش سرد ہو رہی تھی تو ان زمانوں میں پاکستان ٹیلی ویژن کے پہلے "مارننگ شو" کے میزبان کے طور پر لاہور سے اسلام آباد تک کا آنا اور جانا بھی ہوتا رہتا تھا جو تقریباً آٹھ برس تک چلتا رہا۔ تب روات کے نواح میں پرانی سڑک کو ایک شاہراہ میں بدلا جا رہا تھا اور میں نے دیکھا کہ پرانی جی ٹی روڈ کے کنارے جو قدیم برگد کھڑے تھے ان میں سے کچھ شاہراہ کو چوڑا کرنے کی خاطر مشینوں کی زد میں آکر زمین بوس ہو چکے ہیں، سینکڑوں برس قدیم برگد کے شجر، کنٹر بری شہر کے شاہ بلوط سے بھی بڑھ کر قدیم درخت کاٹے جا رہے ہیں اور مجھے محسوس ہوا کہ جیسے ہر برگد تلے ایک مہاتما بدھ گیان دھیان میں تھا اور اس کپل وستو کے شہزادے کو بھی بے دخل کردیا گیا ہے کہ جاؤ کہیں اور جا کر دھونی رماؤ، یہاں کیا کر رہے ہو...

آپ کے علم میں ہوگا کہ ماہر نفسیات کسی شخص کی ذات کا کھوج لگانے کے لئے اس کے سامنے کچھ تصویریں رکھتے ہیں یا کوئی لفظ یا نام لیتے ہیں کہ فوری طور پر اس تصویر، نام یا لفظ کے حوالے سے آپ کے ذہن میں جو کچھ آتا ہے اسے بیان کر دیجئے تو اسی نفسیاتی منطق کے حوالے سے اگر آپ ایک ہندو سے کہیں کہ "بانسری" تو وہ فوراً کرشن کا نام لے گا... اگر "آگ" کا نام لیں گے تو ایک آتش پرست کے ذہن میں بلخ کے آتش کدے آئیں گے۔ صرف "دیوار" کہیں گے تو یہودی کے لئے ایک ہی دیوار گریہ ہے۔ "صلیب" پکاریں گے تو اس پر مصلوب عیسیٰ ہی کا نقش ہوگا... اور اگر وہ ماہر نفسیات "غار" کہے گا تو ہمارے لئے وہ صرف حرا کی غار ہوگی... رنگوں کا ذکر چھیڑے گا اور "سبزرنگ" کے نام لے گا تو ہمارے دل کے نہاں خانوں میں

صرف سبز گنبد ہی تو جلوہ گر ہوگا۔۔تو اسی طور جہاں کہیں برگد کا کوئی بھی قدیم گھنا شجر ہوگا تو اس کے سائے میں بھلا مہاتما بدھ کے سوا اور کون ہوسکتا ہے۔
چنانچہ جس روز میں نے برگدزمیں بوس دیکھے اس سے اگلی سویر میں نے صبح کی نشریات کا آغاز ہی ان ابھی تک قائم برگدوں کے لئے آہ و زاری اور درخواستوں سے کیا اور اگلے کئی سویریں میں نے ان کے تذکرے کے لئے وقف کردیں۔ میرا گمان ہے کہ آج اگر رواٹ کے قریب کچھ برگد اب بھی موجود ہیں تو کسی حد تک ان کی موجودگی میری آہ و زاری کی مرہون منت بھی ہے۔ اگر آپ کبھی رواٹ سے گزریں تو آپ دیکھیں گے کہ وہاں شاہراہ ذرا بل کھاتی ہے تاکہ اس کے راستے میں آتے وہ شجر قائم رہیں۔۔ مہاتما بدھ بے دخل نہیں ہوئے۔
توسیع شہر“ ہے اور مجید امجد ہے۔”

بیس برس سے کھڑے تھے جو اس گاتی نہر کے دوار’
جھومتے کھیتوں کی سرحد پر، بانکے پہرے دار
گھنے، سہانے، چھاؤں چھڑکتے، بُور لدے چھتنار
بیس ہزار میں بک گئے سارے ہرے بھرے اشجار
جن کی سانس کا ہر جھونکا تھا ایک عجیب طلسم
قاتل تیشے چیر گئے ان ساونتوں کے جسم
گری دھڑام سے گھائل پیڑوں کی نیلی دیوار
کٹتے ہیکل، جھڑتے پنجر، چھٹتے برگ و بار
سہمی دھوپ کے زرد کفن میں لاشوں کے انبار
آج کھڑا میں سوچتا ہوں اس گاتی نہر کے دوار
اس مقتل میں صرف اِک میری سوچ، مہکتی ڈال
مجھ پر بھی اب کاری ضرب اِک، اے آدم کی آل

ٹوبہ ٹیک سنگھ سے واں رادھا رام تک

مستنصر حسین تارڑ

Posted Date : 18/01/2015

ایک روایت ہے کہ وہ قومیں جو اہل نظر نہیں ہوتیں اور تازہ بستیاں آباد نہیں کر سکتیں، وہ پرانی بستیوں کے نام تبدیل کر کے اُنہیں اپنی پسند کے نام دے کر یہ سمجھ لیتی ہیں کہ اس بستی کو ہم نے آباد کیا ہے۔
میں فیصل آباد میں منعقد کردہ پہلے لٹریری فیسٹیول کے بارے میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں تو وہاں مجھے ایک بار پھر یہ روایت یاد آ گئی کہ وہ کبھی لائل پور ہوا کرتا تھا اور ہم نے شاہوں کو خوش کرنے کی خاطر اُسے فیصل آباد قرار دے دیا۔۔ اگرچہ آج تک جتنے بھی سعودی فرمانروا گزر چکے ہیں اُن میں شاہ عبدالعزیز کے بعد یہ شہید شاہ فیصل تھے جن کی دانش، معاملہ فہمی اور درویشی نے ایک دنیا کو اُن کا گرویدہ بنا دیا۔۔ مجھے آج تک اُن کا وہ یادگار انٹرویو یاد ہے جس میں ایک مغربی صحافی نے اُن سے پوچھا تھا کہ آپ مغرب کے خلاف تیل کا ہتھیار استعمال کرنے کی دھمکی سنجیدگی سے دیتے ہیں تو اگر تیل کی ترسیل نہ ہو تو آپ کی سلطنت کا کیا ہو گا جو تیل کی آمدنی پر ہی انحصار کرتی ہے تو شاہ فیصل نے کہا تھا ”ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا ہم اپنے اونٹ لے کر صحرا کو نکل جائیں گے اور اپنے آباء و اجداد کی مانند ایک صحرائی زندگی بسر کر لیں گے لیکن آپ کا کیا ہو گا کہ آپ کی معیشت برباد ہو جائے گی، آپ کی کاریں اور پٹرول سے چلنے والی ہر مشینری رُک جائے گی۔۔ آپ کا کیا ہو گا“۔۔ کسے ذوالفقار علی بھٹو کی وہ اسلامک

سمٹ یاد نہیں جب شاہ فیصل جن کے پہلو میں کرنل قذافی ااور یاسر عرفات بیٹھے تھے، بادشاہی مسجد میں نماز ادا کرتے ہوئے انہوں نے آبدیدہ ہو کر اُمت کے لیے دعائیں کی تھیں۔۔ لیکن اس کے باوجود لائل پور کو فیصل آباد کر دینا تو میری سمجھ میں نہیں آیا اور مجھے شک ہے کہ شاہ شہید شاید اس نام کے شہر سے بھی واقف نہ تھے۔
بے شک چوہڑ کانہ کو فاروق آباد کر دیا گیا اور منٹگمری کو ساہیوال بنا دیا گیا لیکن جہاں تک میری مختصر معلومات ہے۔۔ ہری سنگھ نلوہ کے نام کا ہری پور اب بھی ہری پور ہے اگرچہ فیلڈ مارشل صاحب کے لواحقین نے بھرپور کوشش کی کہ اسے ایوب آباد وغیرہ بنا دیا جائے۔۔ ہری سنگھ نلوہ نے نہ صرف اس شہر کو آباد کیا بلکہ وہاں آب پاشی کا ایک ایسا نظام قائم کیا جو آج بھی کھیتوں کو سیراب کرتا ہے۔۔ شیخوپورہ کے ضلع میں واقع لاہور کے سب سے بڑے محسن سرگنگا رام کا گاؤں گنگا پور ہے جس کا نام تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی تو وہاں کے باسیوں نے اس کی مخالفت کی۔۔ اور سب سے دلچسپ قصہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کا ہے۔ ٹیک سنگھ ایک گاؤں گاؤں پھرتا مجذوب درویش تھا اور وہ اپنے جذب میں آباد بستیوں سے دور ایک صحرا کے درمیان میں آ بیٹھا جہاں دور دور تک پانی نہ تھا، اُس نے ریت کھود کر ایک تالاب تشکیل دیا اور پھر جانے کہاں سے پانی کے مٹکے بھر بھر کر وہاں لا کر اس میں انڈیلتا رہا۔۔ پیاسے مسافر وہاں قیام کرتے اور پانی پیتے۔۔ پھر اُس کے کچھ چاہنے والے اس تالاب کے گرد آباد ہو گئے اور وہ بھی پانی ڈھونے لگے۔۔ یوں وہاں ایک بستی ظہور میں آ گئی، اُس تالاب یا ٹوبے کی نسبت سے اس بستی کا نام ٹوبہ۔۔ ٹیک سنگھ پڑ گیا۔ وہ سنت سادھو صوفی نہ ہوتا تو وہاں ابھی تک صحرا ہوتا۔ جب اس شہر کا نام تبدیل کرنے کا قصد ہوا تو اس شہر کے باسیوں نے اس کی مخالفت کی۔ یوں بھی سعادت حسن منٹو نے ”ٹوبہ ٹیک سنگھ“ افسانہ لکھ کر اس شہر کو امر کر دیا تھا۔ ایبٹ آباد کا نام تبدیل کرنے کے بارے میں بھی کچھ پیش رفت ہوئی لیکن ایبٹ صاحب کا آباد کیا ہوا شاید پاکستان کا سب سے خوش نظر شہر اپنا نام بدلنے سے انکاری ہو گیا۔ ایسا تو نہیں ہے کہ 14 اگست 1947ء سے پیشتر ہماری تاریخ ایک صحرا تھی، ہر جانب پانی ہی پانی تھا۔ یہ خطہ پاکستان کا، ہزاروں برسوں سے اپنی تاریخ اور ثقافت کی توانائی سے آباد تھا۔۔ یہاں جتنے بھی شہروں، قصبوں اور آبادیوں کے نام ہیں وہ تاریخ کے تسلسل کی نشانیاں ہیں۔۔ بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ وادئ سوات کے جتنے قصبوں کے نام ہیں ”گرام“ آتا ہے۔ اور اُن میں بٹ گرام بھی شامل ہے یہ بدھ عہد کے نام ہیں۔ بے شک ان بستیوں کے نام ہم پر یلغار کرنے والوں اور ہمیں محکوم کرنے والوں کے نام پر ہیں پر یہ تاریخ کا ایک تسلسل ہیں اور یہ پاکستان کی سر زمین کی قدامت کی گواہی دیتے ہیں۔
چلئے ہم آج کے پاک پتن پر نگاہ ڈالتے ہیں جو کبھی ایودھیا کہلاتا تھا لیکن جب کفر کے اندھیروں میں بابا فرید الدین گنج شکر نے اپنے حسن کردار اور انسانیت سے محبت کی شمع روشن کی تو اس دیار کا نام پاک پتن ہو گیا۔ ایودھیا کا نام بدلا نہیں گیا، بابا فرید کے کلام اور پیام کے معجزے سے خود بخود بدلا گیا۔
اگر نام بدلنے سے ہمیں کچھ افاقہ ہوتا ہے تو کبھی مانسہرہ کی جانب بھی دھیان کر لیں جو دراصل مان سنگھ کا شہر ہے۔۔ مانسہرہ ہے۔۔ شاہینوں کا شہر سرگودھا بھی زد میں آجاتا ہے کہ یہ بھی تو گودھا نام کے ایک درویش کے ”سر“ یعنی تالاب کی نسبت سے وجود میں آیا۔
اور دور کیا جانا۔۔ یہ جو اپنا لاہور، لاہور ہے۔۔ اس کے بارے میں بھی ایک شاید ضعیف روایت یہی ہے کہ اسے شاید مہاراج کشن یا رام کے بیٹے لوہو نے بسایا تھا۔ شاہی قلعہ کے عالمگیری دروازے میں داخل ہوتے ہی لوہو کے مندر کے آثار اب بھی موجود ہیں تو اسے اب کسی نام سے پکاریں، آپ ہی کوئی نام تجویز کر دیں اور اس کے ساتھ ہی ”میرا سوہنا شہر قصور نیں“ بھی زد میں آجاتا ہے کہ وہ بھی روایت کے لوہو کے سگے بھائی ”قصو“ نے آباد کیا تھا۔ ہم دیپال پور کا کیا کریں، ایمن آباد اور واں رادھارام کو کس نام سے پکاریں۔
اگرچہ وہاں ایک نوجوان جوڑا زندہ حالت میں بھٹے کی بھڑکتی آگ میں دھکیل کر ”بار بے کیو“ کر دیا گیا۔۔ راکھ کر دیا گیا۔
ناموں کے بدلنے سے تاریخ نہیں بدلتی۔ تاریخ کا ایک اپنا بہاؤ ہوتا ہے جو سرحدوں، عقائد اور تعصب سے ماورا ہو کر زمانوں کے خس و خاشاک کو سمیٹتا بہتا چلا جاتا ہے، اُس پر ہمارا اختیار نہیں ہوتا!

آمش عیسائی اور باوا محی الدین کا مزار

مستنصر حسین تارڑ

Posted Date : 21/01/2015

امریکہ نے آدھی دنیا کو صرف اس لئے تباہ کر دیا کہ اس کے سپرپاور ہونے کی دھاک بیٹھ جائے اور اس کے باوجودامریکہ کا ایک کسی حد تک مثبت روپ بھی ہے۔۔ اس نے دوسری جنگ عظیم کے بعد مارشل پلین کے تحت اربوں ڈالر امداد کے طور پر یورپ کو عطا کیا تاکہ وہ دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔۔ اگرچہ عوام تک اس کے اثرات نہ پہنچ سکے لیکن امریکہ نے بے شک اپنے مفادات کی خاطر پاکستان کو بھی امداد سے نوازا، ان دنوں پاکستان کے شمال میں امریکی مدد کے تحت بے شمار فلاحی اور تعمیراتی منصوبے جاری ہیں۔۔ اگرچہ امریکی بیڑا 1971ء میں ہماری مدد کو نہ پہنچے، یہ بیڑا جانے کہاں غرق ہو گیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر امریکہ کی وارننگ نہ ہوتی تو ان زمانوں میں مغربی پاکستان بھی خطرے میں پڑ جاتا۔

امریکہ کا کردار بقیہ دنیا میں نہایت گھناؤنا ہے لیکن امریکی آئین کے تحت یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر مذہب کے پیروکار اپنے عقیدے کے مطابق زندگی گزارنے کے لئے آزاد ہیں۔۔ یہاں تک کہ جڑواں ٹاورز کے ملبے کے نواح میں قرطبہ ہاؤس تعمیر کرنے کی اجازت نیویارک کے یہودی میئر نے منظور کی اور جب اس کے خلاف احتجاج ہوا کہ جڑواں ٹاورز کو مسلمانوں نے ڈھایا تھا اور اس کے قریب مسلمانوں کا ایک سنٹر تعمیر کرنا ہمارے زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف ہے تو اس کی حمایت میں نکلنے والے جلوس نسبتاً بڑے تھے اور یہ عام امریکی تھے جن کا کہنا تھا کہ امریکی آئین کے تحت یہ اُن کا حق ہے۔۔ چند مسلمانوں نے اگر دہشت گردی کی تو اس میں امریکہ میں قیام پذیر مسلمانوں کا کچھ قصور نہیں۔ نیویارک کے ہلٹن ہوٹل کے فٹ پاتھ کے کنارے ایک امریکی مصری کے دو کنٹینر یا کھوکھے ہیں جہاں چند ڈالرز میں آپ کو نیویارک کی نفیس ترین خوراک ملتی ہے۔۔ مٹن پلاؤ، چکن، سلاد، نان اور پکوڑے وغیرہ اور اس فٹ پاتھی ریستوران کا نام ہے ”حلال گائز“ سرشام یہاں خوراک خریدنے والے سیاحوں اور امریکیوں کی قطاریں لگ جاتی ہیں اور ان میں ہالی وڈ کے اداکار اور گائیک بھی نظر آ جاتے ہیں یہاں تک کہ سابق صدر کلنٹن بھی۔۔ اس ریستوران سے ہمہ وقت تلاوت قرآن پاک کی روح پرور صدا گونجتی رہتی ہے۔۔ نماز کا وقت ہوتا ہے تو وہاں کا عملہ فٹ پاتھ پر نماز ادا کرنے لگتا ہے اور امریکی ان کی تعظیم کرتے ہیں اور ہاں مصری مالک اور ان کے بیٹے وغیرہ باریش ہیں او رعبادت گزار ہیں۔۔ آج تک نہ کسی نے تلاوت قرآن پاک پر اعتراض کیا ہے اور نہ ہی فٹ پاتھ پر ادا کی جانے والی نمازوں پر۔۔ اس ریستوران کی پسندیدگی کی وجہ سے بے شمار غیرمسلموں نے بھی حلال خوراک کے کھوکھے سجا لئے ہیں۔

امریکہ کے شہر فلاڈیلفیا کے قریب لنکاسٹر کاؤنٹی کا وسیع زرعی علاقہ ہے جہاں آمش لوگ ابھی تک پرانے زمانوں کی بودوباش اختیار کئے ہوئے ہیں، ہر جدید شے اور ایجاد سے پرہیز کرتے ہوئے، کاروں کی بجائے بگھیوں میں سفر کرتے، ٹریکٹر کے استعمال کی بجائے گھوڑوں کو جوت کر ہل چلاتے ہوئے، ٹیلی ویژن، رقص، شراب، شادی کے بغیر میل جول ممنوع، سیاہ حیا دار لباسوں میں، مرد سب کے سب باریش۔۔ اپنے کھیتوں میں کھاد تک استعمال نہیں کرتے اور ایک قدرتی زندگی گزارتے ہیں اور بہت مطمئن اور آسودہ ہیں۔۔ امریکی آئین کے تحت وہ اپنے عقیدے اور قدیم رہن سہن کے مطابق زندگی گزارتے ہیں۔ اس لنکاسٹر کاؤنٹی کی ایک خاموش اور ہری بھری پہاڑی پر شمالی امریکہ کا واحد مسلمان صوفی باوا محی الدین دفن ہے۔۔ باوا جی سری لنکا کے رہنے والے تھے اور ان کے ایک امریکی مرید نے انہیں فلاڈیلفیا یونیورسٹی میں اسلام کے بارے میں لیکچر دینے کے لئے مدعو کیا تو وہ آنے جانے لگے، یہاں فوت ہوئے تو ان کے ایک گورے مرید نے یہ پہاڑی خرید کر انہیں یہاں دفن کیا۔ قریب ہی گھاس کا ایک قطعہ ہے جہاں جگہ جگہ ان کے امریکی مریدوں کی قبریں ہیں اور کتبے نصب ہیں۔ باوا کے سادہ اور سفید مزار کی قربت میں لنگرخانہ ہے، جو بھی آتا ہے کچھ نہ کچھ لے کر آتا ہے، صرف گوشت اور پھل نہیں لاتا کہ باوا صرف سبزیاں کھاتے تھے البتہ یہاں چاول ہوں

گے، بہت سبزیاں اور دالیں ہوں گی، روٹیاں ہوں گی۔۔۔ جو بھی آتا ہے باوا کا لنگر کھلا ہے۔۔۔ قریب ہی ایک سادہ سی لکڑی کی بنی مسجد ہے جہاں سے پانچوں وقت اذان بلند ہوتی ہے۔۔۔ امریکہ کی بھگدڑ اور چکاچوند کے درمیان باوا کا مزار سکون، عافیت اور ٹھہراؤ کا ایک ہرا بھرا جزیرہ ہے اور میں بیان نہیں کر سکتا کہ وہاں پہنچ کر کیسے آپ کا بدن ایک روحانی کیفیت میں سرشار ہو کر شانت اور مطمئن ہو جاتا ہے۔ میرا بیٹا سلجوق مزار پرست نہیں ہے، اسے جب بھی یو این اے کے بکھیڑوں سے فرصت ملتی ہے تو وہ اپنے بال بچوں سمیت باوا جی کی پہاڑی پر چلا جاتا ہے کہ وہاں وہ ایک سکون سے آشنا ہوتا ہے۔

میں وہاں باوا جی کے بہت سے مریدوں سے ملا اور ان سے پوچھا کہ باوا محی الدین کی ذات میں وہ کون سا کرشمہ تھا کہ آپ اپنا آبائی مذہب ترک کر کے ان کے شیدائی ہو گئے۔۔۔ ”میں باوا جی سے تب ملا تھا جب وہ سری لنکا میں مقیم تھے۔۔۔ جب وہ باتیں کرتے تھے تو مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ آج کے زمانوں میں نہیں، حضرت عیسیٰؑ کی قربت میں ہیں۔۔۔ اُنہی زمانوں میں زندہ ہیں“ ۔ایک سوئٹزرلینڈ کا بوڑھا اشکبار ہوتا مجھ سے بیان کرتا تھا۔ایک امریکی بڑھیا باوا کے مزار کے پہلو میں سبزیوں کے مختصر کھیت میں گوڈی کر رہی تھی ”میں جب کسی ٹرین یا بس میں سفر کرتی ہوں تو دیگر مسافروں کو متوجہ کر کے کہتی ہوں۔۔۔ دیکھو میں ایک مسلمان ہوں، اگر آپ کے ذہن میں اسلام کے بارے میں شکوک ہیں تو اظہار کیجئے، میں حاضر ہوں اور میرے مرشد کا نام باوا محی الدین ہے“۔

ایک اور گورے مرید کا کہنا تھا کہ باوا بہت کم گو تھے، جو لوگ اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے وہ اُن کے دل کا حال جان جاتے تھے۔ وہ مجھے اسلام کے قریب لے آئے۔ بہت دور سے آئے ہوئے ایک امریکی کا کہنا تھا کہ میں بہت مصیبت میں مبتلا تھا، خودکشی پر آمادہ تھا کہ ایک رات میں نے خواب میں باوا کا مزار دیکھا، میں کھوج کرتا یہاں تک پہنچ گیا اور حیران ہوا کہ میں نے جو کچھ خواب میں دیکھا وہ ایک حقیقت تھا، میری خواہش ہے کہ مرنے کے بعد میں باوا کے قبرستان میں دفن ہوں۔

تب میں نے بھی خواہش کی کہ کاش میں چند برس پیشتر باوا کی موجودگی سے باخبر ہوتا، شاید وہ میرے دل کا حال جان کر شک شبہے کے جالے صاف کر دیتے۔ اور اگر نہ کر پاتے تو پھر کیا ہوتا۔

بے شک امریکہ کو بجا طور پر مطعون کیجئے کہ اس کا کردار بہت گھناؤنا ہے لیکن اس کی بربادی کی دعائیں مانگتے ہوئے تھوڑی سی رعایت کر دیجئے کہ نہ صرف میٹروپولیٹن میوزیم نیویارک کی اسلامک گیلری میں اسلامی تہذیب اور ثقافت کے انمول شاہکار نمائش پر ہیں، قرآن پاک کے نادر نسخے آنکھوں کو روشنی دیتے ہیں بلکہ وہاں لاکھوں مسلمان بھی آباد ہیں، ہزاروں مساجد ہیں اور باوا محی الدین کا مزار ہے جنہوں نے اپنے حسن اخلاق اور سادگی سے ہزاروں امریکیوں کو اسلام سے روشناس کروایا۔۔۔ بس یہ رعایت کر دیجئے کہ بے شک پورا امریکہ تباہ ہو جائے پر یہ تباہ نہ ہوں۔۔۔ بس اتنی سی رعایت کر دیجئے۔ کم از کم باوا جی تو محفوظ رہیں۔

امریکہ نے ایک جہاں برباد کیا

مستنصر حسین تارڑ

Posted Date : 28/01/2015

امریکہ کی بین الاقوامی ”حرکتوں“ کی کسی کو بھی کچھ سمجھ نہیں آتی۔ وہ کمیونسٹ دشمنی میں ماؤزے تنگ کے چین کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ اپنے حمایتی چیانگ کائی شیک کے چھوٹے سے جزیرے پر دل و جان سے فدا ہو کر اسے اصلی چین کے طور پر تسلیم کرتا ہے۔ ویت نام کے عظیم انقلابی لیڈر ہوچی منہہ کی کمیونسٹ ریاست کے مقابلے میں اپنے ایک پٹھو جنرل کے جنوبی ویت نام کے دفاع میں کمربستہ ہو کر شمالی ویت نام پر نیپام کی آگ برساتا اسے برباد کردیتا ہے اور پھر بدترین شکست سے یوں دوچار ہوتا ہے کہ سائیگان سے اس کے پٹھو ، اس کے فوجی اورسفارت کار ہیلی کاپٹروں میں سوار ہو کر فرار ہو جاتے ہیں او ر ویت کانگ گوریلے نہایت شان و شوکت سے سائیگان میں داخل ہو کر اسے ہوچی منہہ سٹی کا نام دے دیتے ہیں۔ وہ کیوبک مظالم اور کرپٹ ڈکٹیٹر باتستہ کی پیٹھ ٹھونکتا ہے۔ کیوبا کے اس عہد میں کہا جاتا ہے کہ

وہاں عام عورتوں کی نسبت طوائفوں کی تعداد زیادہ تھی جو صرف نوے میل کے فاصلے پر واقع امریکی سرزمین سے آنے والے اوباشوں اور سیاحوں کی راتیں رنگین کرتی تھیں۔سکولوں اور ہسپتالوں کی نسبت قحبہ خانے اور جوا خانے زیادہ تھے اور کیوبا کو طوائفوں کا جزیرہ کہا جاتا تھا۔ اور جب وہ ابھی تک سانس لیتا عظیم گوریلا لیڈر فیڈل کاسترو ہوانا میں داخل ہوتا ہے تو کیوبا کی کل آبادی پھولوں کے ساتھ اس کا استقبال کرتی ہے اور اس کے پہلو میں اب ایک داستانوی ہیرو کا روپ دھار چکا عظیم چے گویرا ہے۔ باتستہ اپنا مال و دولت جہازوں میں لاد کر اپنے محسن امریکہ کی جانب پرواز کر جاتا ہے۔ سی آئی اے نے سرکاری طور پر تسلیم کیا ہے کہ اس نے کاسترو کو ہلاک کرنے کے لئے پچاس سے زیادہ سازشیں کیں اور کاسترو اب بھی زندہ ہے۔ ایک ٹریک سوٹ میں ملبوس اگرچہ بہت ناتواں اور بوڑھا ہے لیکن امریکہ کے خلاف گرجتا رہتا ہے۔ اس نے بھی ہوچی منہہ کے ویت نام کی طرح اپنی سرزمین پر حملہ آور ہونے والے امریکیوں کو ایک ذلت آمیز شکست دی تھی۔ آج کیوبا میں سرمایہ داری نظام کی چکاچوند تو نہیں ہے لیکن اس کا میڈیکل نظام دنیا میں سب سے زیادہ منظم اور اعلیٰ ہے یہاں تک کہ پچھلے برس برطانیہ نے اسے ایک ماڈل تسلیم کرکے اپنا لیا۔ دنیا میں آبادی کے تناسب سے سب سے زیادہ ڈاکٹر ہیں۔ جب پاکستان میں زلزلے کی قیامت نے ہمارا شمال برباد کردیا تو سب سے پہلے کیوبا کے ڈاکٹر اور نرسیں ہماری امداد کو پہنچے ۔۔اور زلزلے کے متاثرین دیگر یورپی ڈاکٹروں کی نسبت کیوبن پر زیادہ انحصار کرتے تھے کہ وہ بہت مخلص اور محبت کرنے والے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کیوبن میڈیکل ٹیم کے کچھ رکن فرائض کی ادائیگی کے دوران ہلاک بھی ہوئے۔ جب کسی صحافی نے کاسترو سے دریافت کیا کہ پاکستان تو امریکہ کا حلیف ملک ہے اس نے کبھی آپ کو توجہ کے قابل نہیں سمجھا تو پھر آپ نے کیوں فوری طور پر اتنا بڑا میڈیکل مشن ان کی امداد کے لئے روانہ کردیا تو فیڈل کاسترو کہنے لگا۔۔ جب میں نے ٹیلی ویژن پر پاکستان میں زلزلے کی تباہ کاریاں دیکھیں تو متاثرین کی حالت زار مجھ سے دیکھی نہ گئی، میرا دل بھر آیا۔۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ پاکستانی حکومت امریکہ کی قرضدار ہے۔۔ وہاں کے عوام تو انسان ہیں اور میں نے انسانوں کی مدد کو اپنا فریضہ سمجھا۔۔ اور پر لطف حقیقت یہ ہے کہ بہت سے لوگوں کی آنکھ کے تارے کسی حد تک راج دلارے ضیاء الحق صاحب ہمیشہ فیڈل کاسترو کو فیڈرل کاسترو کہا کرتے تھے اور ہم نے کبھی بھی کیوبا کے اس احسان کے لئے شکرگزاری نہیں کی۔ کیا میرے کبھی کے نہایت عزیز دوست، شاعر اور ٹیلی ویژن میزبان نجم الثاقب اس وقوعے پر روشنی ڈال سکتے ہیں کہ انہوں نے کیوبا میں پاکستانی سفیر کے طور پر کچھ عرصہ قیام کیا۔

اگر ہم ماضی سے ہٹ کر حال میں قدم دھرتے ہیں اور امریکن خارجہ پالیسی کی مزید ”حرکتوں“ کو دھیان میں لاتے ہیں تو کھلتا ہے کہ ہمارے خطے میں جتنی بھی بدامنی، خانہ جنگی اور ہلاکتیں ظہور پذیر ہو رہی ہیں ان سب میں چچام سام ہے، جس نے ان کے آغاز کے لئے نہایت ”مثبت“ کردار ادا کیا۔ صدام حسین بھلے ایک آمر تھا، ایک ظالم تھا، کردوں کو گیس سے ہلاک کرتا تھا، مخالفوں کو تہ تیغ کر دیتا تھا لیکن اس نے عراق کو سنبھالا ہوا تھا۔۔ وہ ایک مستحکم اور ترقی کرتا ہوا عراق تھا، مشرق وسطیٰ میں ایک رول ماڈل تھا، اگرچہ اس نے امریکہ کی ہلاشیری پر ایران کے ساتھ جنگ چھیڑ دی لیکن اس نے عراق کو سنبھالا ہوا تھا۔ وہ صرف اس لئے قصوروار ٹھہرا کہ تمام عرب ملکوں کی نسبت وہ اسرائیل کے لئے سب سے بڑا خطرہ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب ایک جنگ کے دوران صدام نے اسرائیل پر راکٹ پھینکے تو فلسطین کے لوگ انہیں دیکھ کر ”صدام تو زندہ رہو“ کے نعرے لگاتے تھے اور دوسرا جرم یہ تھا کہ اس کے محل کے صدر دروازے میں جو کوئی بھی داخل ہوتا تھا اس کے قدموں تلے امریکی پرچم فرش پر نقش ہوتا تھا جس پر پاؤں رکھ کر وہ اندر داخل ہوتا تھا۔

ایک دو کالم امریکی کرتوتوں کی تفصیل بیان کرنے سے قاصر ہیں البتہ میں ایک تاریخی سچائی بیان کر دینا چاہتا ہوں اس اعتراف کے ساتھ کہ میں کبھی بھی صدام حسین کو پسند نہ کرسکا۔۔ جیسے میں بہت سے عرب حکمرانوں اور شاہوں کو پسند نہیں کرتا۔ لیکن نہ صرف صدام حسین بلکہ اس کے قریبی ساتھیوں میں جو عزت نفس اور عراقی ہونے کا جو فخر تھا میں اس کا مداح ہوں۔۔ امریکی حملے سے صرف تین چار روز پیشتر روسی سفیر نے صدام حسین سے ملاقات کی اور کہا ”امریکہ کی فوجیں اور پوری جنگی قوت حرکت میں آچکی ہے، وہ شاید کل ہی عراق پر یلغار کردیں اور آپ ان کا مقابلہ نہیں کر پائیں گے۔ اور وہ آپ کو ہلاک کر ڈالیں گے تو میں پیشکش کرتا ہوں کہ آپ فوری طور پر عرق چھوڑ دیجئے، ہم روس میں آپ کا سرکاری طور پر استقبال کریں گے اور آپ کو پناہ دیں گے۔اور صدام نے کہا تھا ”محترم سفیر میں آپ کی فراخدلانہ پیشکش کا شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن میں کبھی فرار نہیں ہوں گا، میں ایک عرب ہوں، جیوں گا تو عراق میں اور اگر موت آجائے تو میں عراق میں مروں گا۔ میں بھاگ جانے والوں کے قبیلے میں سے نہیں ہوں“۔ (جاری ہے)

اپنے محسنوں کو یاد کرتے رہنا چاہیے
مستنصر حسین تارڑ
Posted Date : 01/02/2015

چنانچہ تلمیذ حقانی مجھے ”سیارہ ڈائجسٹ“ کے نوائے وقت بلڈنگ میں واقع دفتر لے گیا جہاں ایک پستہ قد نپولین ایڈیٹر کی میز پر بیٹھا تھا اور یہ ایک چھوٹا سا فرشتہ تھا جو شکار کی کہانیاں لکھتا تھا۔ زبان ایسی لکھتا تھا کہ آزاد اور ابو الکلام کی نثر کے لطف آتے تھے اور وہ بے دریغ سموسے کھا رہا تھا اور اُس کا نام مقبول جہانگیر تھا۔۔ اُس نے میرے سفرنامے کی پہلی قسط وصول کی، اُسے ایک نظر بھی نہ دیکھا، دراز میں رکھ دیا اور کہنے لگا ”سموسے کھائیے“۔۔ میں نے پوچھا کہ چھپ جائے گی تو کہنے لگا، سموسے کھائیے۔۔ آپ تلمیذ صاحب کے ساتھ آئے ہیں تو اچھا ہی لکھتے ہوں گے۔ مقبول جہانگیر میرا ایک محسن تھا، نہ صرف اُس نے میرا سفرنامہ جس کا عنوان ابتدائی طور پر ”جائیو بدیس“ تھا اور پھر تلمیذ کے مشورے پر میں نے اسے ”نکلے تری تلاش میں“ کے نام سے پسند کیا۔ قسط وار ”سیارہ ڈائجسٹ“ میں شائع کیا بلکہ بالآخر اپنے ادارے کی جانب سے کتابی شکل میں، نہایت شاندار گیٹ اپ کے ساتھ شائع کر دیا۔ مقبول جہانگیر نے اپنے ذاتی تعلقات بروئے کار لا کر مصور مشرق عبدالرحمن چغتائی سے اس کے لیے سرورق بھی بنوایا۔۔ میں تو چغتائی صاحب کو جانتا تک نہ تھا، گمان غالب ہے کہ اگر میں اُن کے سٹوڈیو تک رسائی حاصل کر بھی لیتا تو شاید وہ ایک گمنام نووادر ادیب سے ملنا بھی پسند نہ کرتے۔

چنانچہ تلمیذ حقانی اور مقبول جہانگیر کی مہربانیوں اور عنایتوں نے مجھے یوں سرفراز کیا کہ مجھ پر ادبی شہرت کے دروازے کھل گئے۔۔ ماسکو یونیورسٹی کی پروفیسر گالنیا ڈشکونے ”نکلے تری تلاش میں“ کے ایک باب کو شعبۂ اردو کے نصاب میں شامل کر لیا اور پھر ایک زمانہ آیا کہ اسی ماسکو یونیورسٹی نے مجھے اور میری اہلیہ کو سرکاری طور پر اپنے ہاں مدعو کیا تا کہ میں وہاں اردو اور روسی ادب کے حوالے سے لیکچر دے سکوں۔۔ تو یہ سب کمال میری تحریر کے نہیں، تلمیذ حقانی اور مقبول جہانگیر کی محتوں کے کرشمے تھے ورنہ میں آج بھی بے شک ایک ٹیکسٹائل انجینئر ہوتا۔ شاید کسی بڑے کاروبار یا کارخانے کا مالک ہوتا لیکن گمنام ہوتا۔ وہ دو لکیر دار رجسٹر جن پر میں نے ”نکلے تری تلاش میں“ تحریر کیا تھا کب کے ردی میں فروخت ہوئے خاک ہو چکے ہوتے۔۔ اور ہاں میں بھولنے لگا تھا۔ مقبول جہانگیر کی سفارش پر ”سیارہ ڈائجسٹ“ کے مالکان نے مجھے اپنی پہلی کتاب پر دس فیصد رائلٹی بھی ادا کی۔ اس سے بڑھ کر خوش بختی بھلا اور کیا ہو سکتی ہے۔ ”سیارہ ڈائجسٹ“ کے دفتر میں ہی حفیظ جالندھری سے کچھ ملاقاتیں ہوئیں جن کی تفصیل پھر کبھی سہی، البتہ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے میری فرمائش کے بغیر مجھے لہک لہک کر ”ابھی تومیں جوان ہوں ”گاکر سنایا اور کہنے لگے“ ملکہ پکھراج نے تو میری نظم کا ستیا ناس کر دیا۔ اُسے اس دھن میں گانا چاہیے تھا جو میں نے آپ کو سنائی ہے“ اب چونکہ میں ان دنوں بھی اجڈ جاٹ ہوا کرتا تھاتو میں نے ہنس کر کہا ”حفیظ صاحب۔۔ صد شکر کہ ملکہ نے اسے آپ کی دھن میں نہیں گایا۔۔“ حفیظ صاحب ذرا سے خفا ہوئے اور کہنے لگے ”اوئے منڈیا توں کون ایں۔۔ وڈھا ملکہ پکھراج دا حمایتی۔۔“ اور یہ حقیقت ہے کہ بے شک ہم نے سنا تھا کہ کسی زمانے میں اُن کا ترنم ہندوستان بھر میں راج کرتا تھا لیکن اُن زمانوں میں وہ خاصے بے سرے ہو چکے تھے۔۔ مقبول جہانگیر ہی مجھے ایک روز کئی سوناولوں کے مصنف ایم اسلم کے بارود خانے والے گھر میں لے گئے اور اس کی تفصیل بھی پھر کبھی سہی۔ اگر کبھی کوئی کبھی آیا۔۔ مقبول جہانگیر اکثر ’سیارہ ڈائجسٹ“ کے دفتر سے اٹھ کر میری بیجوں کی دکان پر آ بیٹھتا اور سامنے والے قصائی کی دکان پر آویزاں بکرے کی رانوں کو بصد حسرت دیر تک دیکھتا اور پھر کہتا ”تارڑ صاحب اپنے ملازم سے کہیے کہ وہ جو تیسری فربہ ران ہے کار میں لٹک رہی ہے، اُسے تلوا کر لے آئے، بھون کر کھائیں گے“۔۔ مقبول جہانگیر شدید شوگر کامریض تھا اس کے باوجود کسی بھی نوعیت کی پرہیز سے گریز کرتا تھا۔ گوشت اور سموسے اس کی کمزوری تھے۔ وہ مر گیا تو میں سمن آباد میں اس کے مکان پر گیا جہاں اس کی بیوی امینہ عنبریں اجاڑ بیٹھی تھی اور ہم دونوں نے اُسے بہت یاد کیا۔

البتہ تلمیذ حقانی کچھ دن اور جیا۔۔ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی خواہش پر بیوی سمیت کینیڈا منتقل ہو گیا جہاں وہ لاہور کی یاد میں مسلسل سوگوار اور تنہا رہا۔۔ جب وہ ایک روسی ایئر لائن کے جیٹ پر وطن واپس آ رہا تھا تو پرواز کے دوران اس کے دل نے بغاوت کر دی، اس کی حالت غیر ہو گئی اور روسی پائلٹ نے اسے بچانے کی خاطر الاسکا کے صدر مقام اینکر ایج میں اپنا جہاز اُتار لیا۔۔ اور جب وہ واپس لاہور آیا اگرچہ وہ تندرست نہ تھا تو مجھے کہتا تھا ”مستنصر صاحب اینکر ایج کے ہسپتال میں سب کے سب فرشتے تھے، ڈاکٹر، نرسیں، ہسپتال کا سٹاف، جس طور انہوں نے میرا خیال رکھا، میری تیمار داری کی، میرے اپنے سگے

بھی نہ کرتے تو کیا وہ سب اس لیے جنت میں نہ جائیں گے کہ وہ مسلمان نہ تھے"۔ ہم نے تلمیذ حقانی کو اس کے آبائی قبرستان میں دفن کیا۔ وہ سونے کا بنا ہوا ایک بندہ تھا، اس کی قبر کی مٹی بھی سنہری ہوئی جاتی تھی۔۔۔

مجھے یاد ہے کہ میرے اعزاز میں منعقد کردہ ایک ادبی محفل میں جب مجھ سے گفتگو کا آغاز ہوا تو میں نے یہی کہا کہ یہ تلمیذ حقانی اور مقبول جہانگیر تھے جنہوں نے گمنامی میں میرا ہاتھ تھاما اور ناموری کی چکا چوند روشنیوں میں لے

آئے تو تقریب کے بعد ایک ادیب نے مجھے نہایت سنجیدگی سے مشورہ دیا کہ آپ احمد ندیم قاسمی کا حوالہ دیا کیجیے جنہوں نے آپ کے سفر ناموں اور افسانوں کو "فنون" میں جگہ دی، وزیر آغاز کا نام لیا کیجیے جن کے "اوراق" میں آپ کی "جشن کی رات" شائع ہوئی۔ اور پھر اُن کے مشورے سے آپ نے اس باب کو ایک ناولٹ "فاختہ" کی شکل دی۔۔۔ آپ کیوں اتنے غیر معروف سے لوگوں کے نام لیتے ہیں۔ آپ کا ادبی تشخص قدرے مجروح ہوتا ہے تو میں نے اس ادیب سے کہا تھا کہ ۔۔سنو۔۔ جب مجھے احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا نے درخور اعتنا سمجھا تو مجھے کچھ لوگ جان چکے تھے، اگر تلمیذ حقانی اور مقبول جہانگیر نہ ہوتے تو مجھے کوئی بھی نہ جانتا۔۔ ندیم اور آغاز بھی نہ جانتے۔

میں ایک اجڈ اور گنوار جاٹ آج بھی اپنے محسنوں کو یاد رکھتا ہوں۔۔ اور پچھلے دنوں اُن دنوں کی یاد بہت آئی کہ پشاور یونیورسٹی کی ایک لیکچرر سلمیٰ کاشمیری جس نے پچھلے دو برس سے اپنی نوخیز حیات کو میرے سفرناموں میں غرق کر رکھا تھا، مجھ پر ایک ڈاکٹریٹ کا تھیس لکھ رہی تھی اور گمان غالب ہے کہ کسی بھی حیات ادیب پر پشاور یونیورسٹی کا یہ پہلا پی ایچ ڈی تھیس ہو گا۔ تو مجھے اپنے دوست اور محسن، تلمیذ حقانی اور مقبول جہانگیر بہت یاد آئے۔ بہت یاد آئے۔

اے وطن پیارے وطن

مستنصر حسین تارڑ

Posted Date : 08/02/2015

میرے ساتھ مسئلہ ہے کہ بے شک میں نغموں، گیتوں، غزلوں اور سریلی آوازوں کا شیدائی ہوں، یہ مجھ پر اثر کرتے ہیں لیکن یہ کیا ہے کہ وطن کی شان میں گائے ہوئے گیت ہی میری روح کے نہاں خانوں میں اتر کر مجھے عجیب کیفیتوں سے سرشار کرتے ہیں۔۔۔ مہدی حسن کا 'اپنی جاں نذر کروں اپنی وفا پیش کروں'، نور جہاں کے 'اے پتر ہٹاں تے نئیں ملدے' ، 'میرا سوہنا شہر قصور نیں' نسیم بیگم کا 'اے راہ حق کے شہیدو' نیرہ نور کا "وطن کی مٹی گواہ رہنا' وغیرہ لیکن ان میں ایک گیت ایسا ہے جسے میں جب بھی سنتا ہوں تو آنکھوں میں نمی اتر آتی ہے، میرے بدن کا ہر مسام ایک تتلی کی مانند پھڑپھڑانے لگتا ہے اور وہ امانت علی خان کا "اے وطن پیارے وطن پاک وطن'۔۔۔ بہت عرصہ پہلے میں نے یوم آزادی کے موقع پر ٹیلی ویژن کے لیے ایک خصوصی کھیل "مہک" لکھا۔۔ جس میں محمد قوی خان اور فردوس جمال نے مرکزی کردار ادا کیے اور مرحوم قنبر علی شاہ نے اسے پروڈیوس کیا۔۔ وہ ایک معمولی سا ڈرامہ تھا جسے "اے وطن پیارے وطن" نے غیر معمولی کر دیا۔۔ ڈرامے کے آخر میں فردوس جمال اپنے کھیت کی مٹی مٹھی میں بھرتا ہے۔۔۔ اپنی مٹھی فضا میں بلند کرتا ہے اور اُس لمحے سورج ابھرتا ہے، وہ اپنی مٹھی کھولتا ہے تو اُس میں سے وطن کی مٹی گرنے لگتی ہے اور عین اُس لمحے امانت علی خان کا 'اے وطن پیارے وطن' شروع ہو جاتا ہے۔۔۔ وہ پورا گیت گونجتا رہتا ہے اور سورج کی پہلی شعاعوں کے پس منظر میں مٹی گرتی رہتی ہے اور ڈرامے کا انجام ہو جاتا ہے جیسا کہ میں عرض کر چکا ہو کہ "مہک" کوئی ایسا شاہکار ڈرامہ تو نہ تھا لیکن امانت علی خان کی پر درد آواز نے لوگوں کو رُلا دیا۔۔ ڈرامے کا اختتام ہوا تو مجھے پاکستان بھر سے ٹیلی فون آنے لگے۔۔۔ ان میں جہاں عام ناظر تھے وہاں ٹیلی ویژن کا ایک منجھا ہوا اداکار بھی تھا اور وہ رو رہا تھا۔۔۔ اُس کی ہچکی بندھی ہوئی تھی، ایک دو ادیب اور کچھ سیاستدان بھی تھے جو مجھے مبارکباد دے رہے تھے۔۔۔ یقین کیجیے اور میں کسر نفسی سے ہرگز کام نہیں لے رہا، میں پھر دوہراتا ہوں کہ وہ ایک عام سا ڈرامہ تھا، یہ امانت علی خان کی پُر سوز روح میں اتر جانے والی آواز تھی اور وطن کی مٹی سے عشق کی پکار تھی جس نے لوگوں پر اتنا گہرا اثر کیا۔

تو سوال یہ ہے کہ آخر یہ وطن کیا ہے۔ یہ مٹی سے محبت کیا ہے۔ ابر کیا ہے، ہوا کیا ہے، ویسے تو بلھے شاہ نے بھی کہا تھا کہ ہم سب ماٹی ہیں، ماٹی ہی سواری ہے اور اُس پر سوار بھی ماٹی کا ہے۔

سب لوگ آگاہ ہیں کہ دنیا کے سب سے خوبصورت ملک پاکستان کا کیا حشر ہو گیا ہے۔ اس کی تفصیل میں کیا جانا، کیسے ہر شے ہر ادارہ بکھرتا جا رہا ہے، کیسے تنگ نظری اور تعصب کی چڑیلیں ہمارے بدن سے

چمٹ کر ہمارا خون چوس رہی ہیں تو مجھ سے بہت پریشان حال ملک کے مستقبل کے بارے میں خدشوں سے دوچار لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ۔۔۔ ایسا کیوں ہو گیا ہے تو میں صرف یہ کہتا ہوں کہ۔۔۔ اس لیے کہ ہم نے پاکستان سے محبت نہیں کی۔۔۔ اس سے پیار نہیں کیا، کبھی اپنی مٹی کو آنکھوں کا سرمہ نہیں بنایا۔ اسے نہ بوسہ دیا نہ ماتھے پر لگایا کہ ہم تو آگاہ ہی نہیں کہ اس ملک کا جغرافیہ کیا ہے۔ بلوچستان کہاں ہے، کیوں ہے اور وہاں جو لوگ ہیں اُن کا رہن سہن کیا ہے، بلکہ ہم تو اپنے وزیرستان، کوہاٹ، بنوں اور پارا چنار کو بھی نہیں جانتے۔ پارا چنار جو ایک ارضی جنت ہے جس کے مناظر میں برف آلود پہاڑ اور بریاول کی وسیع القلب سر زمینیں ہیں۔ اور نہ ہی ہم اندرون سندھ کے صوفی مزاج سے واقف ہیں۔ ہم نے اس دھرتی کی قدر نہیں کی، اس سے کبھی پیار نہیں کیا۔ مجھے ایک صحافی نے سوال کیا کہ آپ نے پاکستان کے شمال کے بارے میں ایک درجن سے زیادہ سفرنامے تحریر کیے ہیں تو آپ کیوں اُس علاقے کی بلندیوں اور ویرانوں کے اسیر ہو گئے ہیں تو میں نے جواب میں کہا تھا کہ میں وہاں بار بار اللہ تعالیٰ کی قربت کی چاہت میں جاتا ہوں کہ وہاں نہ صرف جمال ہے بلکہ اُس کی ویرانیوں اور برفانی بلندیوں میں اُس کا جلال بھی کمال کرتا ہے۔ آپ جب تک اپنے محبوب کے نقش و نگار نہ دیکھیں، اُس کے حسن بے مثال کے پرتو نہ دیکھیں تو آپ کیسے اُس کے ساتھ عشق کر سکتے ہیں۔ تو ہم نے اپنے وطن کے محبوب کے نقش و نگار نہ دیکھے۔ اُس کے جلال اور جمال کی گواہی نہ دی، اس لیے ہم زوال آشنا ہوتے جا رہے ہیں۔

سوال کا ابھی تک میں جواب نہیں دے سکا کہ وطن کیا ہے؟

شیریں پاشا جس نے پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے چند نہایت شاہکار دستاویزی فلمیں پروڈیوس کیں، وہ بلوچستان کے بارے میں ایک ڈاکومنٹری بنانے کے لیے اس کی ویرانیوں اور وسعتوں میں ایک مدت بھٹکتی پھریں۔ شیریں نے ایک گرم دن کی تپش میں ایک بے انت ویرانے میں اپنی جانب آتے ایک تنہا شخص کو دیکھا۔۔۔ وہ ایک بلوچ بوڑھا تھا، اُس کے گلے میں ایک سارنگی نما بلوچ ساز تھا، وہ قریب آیا تو شیریں نے پوچھا "بابا آپ کہاں سے آئے ہو؟" تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ وہاں سے۔۔۔ اور کدھر جا رہے ہو، تو اس نے مسکرا کر کہا، وہاں۔۔۔ شیریں نے سوال کیا کہ بابا جی آپ کا وطن کونسا ہے تو بلوچ نے دونوں ہاتھ بلند کرکے آس پاس لہراتے ہوئے کہا۔۔۔ یہ سب میرا وطن ہے۔

شیریں پاشا نے پوچھا۔۔۔ بابا جی آپ کو اس ویرانے میں تنہا سفر کرتے ہوئے ڈر نہیں لگتا تو بابا بلوچ اس کی نادانی پر مسکراتے ہوئے، اپنے ساز کو جھٹکتے ہوئے بولا "میں تنہا تو نہیں ہوں۔ میرا ساز میرے ساتھ ہے اور میرا وطن میرے ساتھ ہے"۔ (جاری ہے)

وطن کی مٹی گواہ رہنا

Posted Date : 11/02/2015

مستنصر حسین تارڑ

وہ بلوچ بوڑھا جو ایک بے انت ویرانے میں اکیلا چلا آرہا ہے۔ جب اس سے پوچھا جاتا ہے کہ آپ کو اس ویرانے میں تنہاسفر کرتے ہوئے ڈر نہیں لگتا تو وہ اپنے گلے میں ڈالے ہوئے ساز کو تھپک کر کہتا ہے "میں تنہا نہیں ہوں، میرا ساز میرے ساتھ ہے اور میرا وطن میرے ساتھ ہے"۔

تو وطن کی ایک تعریف یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہاں آپ تنہا محسوس نہیں کرتے، ایک ویرانے میں ہوں تو بھی آپ کے پاؤں تلے آنے والے کنکر آپ کو پہنچانتے ہیں، ریت کا ہر ذرہ آپ کے لمس سے آشنا ہے، نہ صرف آپ کے بلک آپ کے بزرگوں کے لمس کو بھی اپنے اندر محفوظ رکھے ہوئے ہے، ہر خاردار جھاڑی جس کے ساتھ آپ کا دامن الجھتا ہے اس کا ہر کانٹا آپ سے واقف ہے، اگر، چبھے گا تو اس کی چبھن قابل برداشت ہوگی، بے شک آپ پرکھ لیجئے کہ اگر آپ وطن سے دور ذرا بیمار پڑتے ہیں تو بے بس اور لاچار محسوس کرتے ہیں۔ بیماری دوچند محسوس ہوتی ہے اور اپنے وطن میں ہونے کی ہوک اٹھتی ہے۔ اگرچہ ہمارے ہاں وطن پرستی کو اپنے عقائد کے متصادم جانا جاتا ہے۔ شاعری میں اسے ایک بدعت قرار دیا جاتا ہے لیکن آپ اپنے وطن سے محبت کرنے کے باوجود ایک عالمی بھائی چارے اور مذہبی کے بندھنوں میں بندھ سکتے ہیں۔۔۔ آپ دیکھتے کہ ماسوائے ہمارے دنیا کے سب مسلمان اپنی قومیت اور وطن پر فخر کرتے ہیں۔۔۔ آپ کسی ترک یا عرب سے بات کرکے تو دیکھئے، ترک ہونے کا فخر اور عرب ہونے کی پہچان سے وہ کبھی دستبردار نہیں ہوتے بلکہ ایک عرصے تک جب سلطنت عثمانیہ نصف یورپ اور دنیا کے سمندروں پر راج کرتی تھی۔ یورپ کے ادب میں مسلمان کا مطلب ترک ہوا کرتا تھا چاہے وہ عرب ہو یا ہندوستان کا ہو۔۔۔ ترک یورپ کے حواس پر اس قدر چھائے ہوئے تھے کہ "آرلینڈو" کے ناول میں انگریز ہیرو نے اپنے تہہ خانے میں کسی مسلمان کا سر چھت سے لٹکایا ہوتا ہے اور وہ اسے ایک ریکٹ سے ضربیں لگا کر کھیلتا ہے اور کہتا ہے "یہ ایک ترک کا سر ہے"۔

قبیلے اور وطن کا فخر کبھی معیوب نہیں سمجھا گیا اور بات بہت دور تک جا سکتی ہے۔ خالد بن ولید بھی جنگ میں اترتے تھے تو رجز پڑھتے ہوئے اللہ کی تلوار ہونے پر فخر کرتے اپنے قبیلے کا بھی ذکر کرے تھے، ہمارے رسول اللہؐ کی زبان کی حلاوت اور معجزہ آرائی کے بارے میں بات ہوتی تھی تو میرے حضورؐ بھی فرمایا کرتے تھے کہ میں قریش میں سے ہوں اور میں نے بنو سعد کی مائی حلیمہ کا دودھ پیا ہے۔۔ اپنے وطن میں انسان تنہا محسوس نہیں کرتا اس کی ایک ذاتی مثال پیش کرتا ہوں۔۔ جب میں دنیا کے طویل ترین برفانی راستوں پر بھٹکتا، سنو لیک کے راستے بیافو اور ہسپر کے برفزاروں میں اپنی آشفقہ مری کے ہاتھوں مجبور پیدا سفر کرتا تھا اور وہاں اس برفانی تنہائی میں اگر میں بیمار پڑ جاتا، کسی حادثے کا شکار ہو کر زخمی ہو جاتا تو وہاں میری مدد کو نہ کوئی ہیلی کاپٹر آسکتا تھا اور نہ ہی میں کسی جیپ پر سوار ہو کر سکردو پہنچ سکتا ہے، صرف یہ امکان تھا کہ میرے ساتھی کوہ نورد مجھے اٹھا کر، اپنے کندھوں پر سوار کرکے کم از کم سات روز دشوار ترین پہاڑوں اور گھاٹیوں میں سفر کرتے مجھے سکردو کے ہسپتال تک لے جاتے، ادھر جب مجھے ہسپتال جانے کا تفاق ہوا کھٹمنڈو سے نہایت آسانی سے کسی ایمرجنسی کی صورت میں دو گھنٹے کے ہوائی سفر کے ذریعے کراچی پہنچ سکتا تھا لیکن اس کے باوجود میں وہاں تنہا محسوس کرتا تھا، لاچار اور بے یارومددگار محسوس کرتا تھا اور وہاں سفولیک کی برفانی ساختوں کے دوران جہاں سے نزدیک ترین آبادی اشکولے کئی روز کی پیدل مسافت پر واقع تھی میں وہاں تنہا محسوس نہیں کرتا تھا کہ میں اپنے وطن میں تھا، اے وطن، پیارے وطن۔

بابا خشونت سنگھ ہمیشہ کہتا تھا کہ میرا وطن پاکستان ہے، خوشاب کا قصبہ ہڈیالی ہے جہاں میں پیدا ہوا اور لاہور میں جہاں میں پلا بڑھا اور ہائیکورٹ میں وکالت کرتا رہا، البتہ میری نیشنلٹی ہندوستانی ہے، اور اس پر وہاں کے بنیاد پرستوں نے بہت لعن طعن کی اور ان کے بارے میں کہا گیا کہ وہ اگرچہ ہندوستان میں ہے لیکن اس کا دل پاکستان میں ہے۔۔ اس کی وصیت کے مطابق فقیر اعجازالدین اس کی راکھ پاکستان لائے اور ہڈیالی کے اس سکول کی دیوار میں دفن کی جہاں وہ پڑھتا رہا تھا۔ میرے بہت عزیز اور محترم ہندوستانی ہدایتکار اور شاعر جنہیں ان کی ساعری پر اکیڈمی ایوارڈ سے نوازا گیا تھا گلزار صاحب۔۔ آج بھی اپنا وطن پاکستان قرار دیتے ہیں کہ وہ جہلم کے قریب دینہ کے قصبے میں پیدا ہوئے تھے ، ان کی شاعری میں صرف دینے کی چاندنی راتیں ہیں اور پکھراج کا چاند ہے۔۔ اور جب ان کی اکلوتی بیٹی ان سے پوچھتی ہے کہ بابا کیا واقعی دینہ دنیا کا سب سے خوبصورت شہر ہے تو گلزار کہتے ہیں کہ ہاں بیٹے میں وہاں سمپورن سنگھ ہوں جو دینہ میں پیدا ہوا، میرے لئے یہ ممبئی کی شہرتیں اور اکیڈمی ایوارڈ سب کے سب دینہ کی چاندنی کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔۔ وہی میرا وطن ہے۔

منیر نیازی کبھی اپنے ہوشیار پور سے باہر نہ آسکے، انتظار حسین اب بھی اپنے قصبے ڈبائیوں کے لئے آہیں بھرتے ہیں، اے حمید اپنے امرتسر کی یادوں سے کبھی باہر نہ آئے، اداکار پران، اوم پرکاش، کامنی کونسل اور دیوآنند اپنے لاہور کی یادوں میں تڑپتے رہے۔ پران نول جن کی لاہور کے بارے میں کتاب ایک شاہکار ہے، اب اس بڑھاپے میں اپنے بیٹے کو لاہور لے کر آتے ہیں کہ بیٹے میں نسبت روڈ میں پیدا ہوا تھا، تمہا وطن ہندوستان نہیں، پاکستان ہے۔

میری صبح کی سیر کے ایک ساتھی عاشق صاحب۔۔ ہر شام گھرگل کے معجزے سے مشرقی پنجاب کے ضلع نکودر میں واقع اپنے گاؤں کمہاری والا کا دیدار کرتے ہیں، اپنے گھر کو دیکھتے ہیں، پیپل کے ان درختوں کو دیکھتے ہیں جن کے سائے تلے ان کے دادا جان حقہ پیتے تھے۔۔ ہر شام!

میں یقیناًپہلے بھی بیان کر چکا ہوں کہ آوارگی کے بیت چکے زمانوں میں، جب کبھی یورپ اور ایشیا کی طویل ساختوں کے بعد بے شک ترکی اور ایران اور افغانستان کے برادر مسلمان ملکوں میں سفر کرتے طورخم کے راستے پاکستان میں داخل ہوا تو وہاں لہراتے سبز پرچم کو دیکھ کر میں ہمیشہ آبدیدہ ہوا اور پاک سرزمین پر سجدہ ریز ہو کر اس کی مٹی کو چوما۔۔

مجھ سے تو یہ عقدل حل نہ ہوگا کہ آخر وطن ہے کیا۔۔ سیانے لوگ میری مدد کریں، اے وطن، پیارے وطن

یاشار کمال، اسماعیل قدارے اور یاسمین کھدرا کے ناول

مستنصر حسین تارڑ

Posted Date : 18/02/2015

ہم جب عالمی ادب کے منظر نامے پر نظر کرتے ہیں تو ایک عجیب مغالطے میں مبتلا رہتے ہیں اور میں اپنے آپ کو بھی ایسے مغالطوں کا شکار سمجھتا ہوں کہ ہم صرف یورپ اور امریکہ کے ناول نگاروں پر ہی نظر کرتے ہیں کہ صرف وہ ہیں جن میں تخلیق کا جوہر ہے اور اپنی کم عملی کے باعث آگاہ ہی نہیں ہوتے کہ ہمارے اپنے سلمان ادیب ایسے ہیں جو بین الاقوامی معیار کے شاہکار ناول تخلیق کر رہے ہیں یا کر چکے ہیں، میں

نے اپنے ایک گزشتہ کالم میں شمالی افریقہ کے ناول نگار محمد اچاری کا حوالہ دیا تھا لیکن اس کے سوا تین مسلمان ناول نگار ایسے ہیں جن کی جانب ہم نے توجہ نہیں کی۔۔ یعنی ترکی کا یاشار کمال، جسے صرف اس لیے نوبل انعام نہ مل سکا کہ وہ ایک کُرد ہے اور ترکی کی حکومت نے اسے نوبل انعام دینے کی مخالفت کی۔۔ اگرچہ ارحان پاموک نے یہ انعام حاصل کرلیا اور وہ اس کا حق دار بھی تھا لیکن یہ یاشار کمال ہے جو ترکی کے جدید ناول کا بانی ہے یہاں تک کہ ایک مرتبہ جب اسے صرف اس جرم کی پاداش میں جیل میں ڈال دیا گیا کہ اس نے کُرد زبان کے حق میں ایک بیان دیا تھا اور جب کچھ صحافیوں نے ترکی کے وزیراعظم سے دریافت کیا اور شاید وہ سلمان ڈیمرل تھے کہ آپ نے ترکی کے سب سے عظیم ادیب کو پابندسلاسل کیوں کردیا ہے تو انہوں نے کہا تھا کہ میں یاشار کمال کی تخلیقی عظمت کا معترف ہوں، آج بھی میرے سرہانے اس کے ناول رکھے ہوتے ہیں لیکن ۔۔ اس نے ترکی کے قانون کی خلاف ورزی کی ہے، میں پہلے بھی تذکرہ کر چکا ہوں کہ میں یاشار کا اتنا بڑا چاہنے والا ہوں کہ میں نے اپنے پہلے پوتے کا نام یاشار رکھا۔۔ پچھلے دنوں برادرم گوئندی کے توسط سے کہ اس نے اپنے اشاعتی ادارے کی جانب سے یاشار کے ایک ناول کا اردو ترجمہ شائع کیا ہے، میں نے اپنے پوتے یاشار کی ایک تصویر یاشار کمال کو روانہ کی تاکہ وہ اس پر اپنے دستخط کردے۔ گوئندی نے اطلاع کی ہے کہ یاشار کمال نے بے حد پرمسرت ہو کر کہ پاکستان میں اس کے چاہنے والے ایسے ہیں جو اپنے بچوں کے نام اس پر رکھتے ہیں اس نے میرے پوتے کی تصویر پر لکھا ”یاشار کیلئے، یاشار کی جانب سے“ ۔

یاشار کمال کے بعد البانیہ کا اسماعیل قادر یا قدار ے ہے جس نے ”جنرل آف اے ڈیڈ آرمی“ ایسا بڑا ناول لکھا۔۔ وہ بہت بوڑھا ہو چکا ہے لیکن نوبل ایوارڈ کی کمیٹی نے ابھی تک اس کی جانب نظر التفات نہیں کی حالانکہ وہ اس برس کے نوبل انعام یافتہ فرانسیسی ناول نگار سے ایک برتر اور بے مثال ہے۔ اس فرانسیسی ناول نگار کو صرف اس لئے نوبل انعام سے نوازا گیا کہ اس نے ایک نوجوان یہودی لڑکی کی داستان اگرچہ کمال کی لکھی جو نازیوں کے ظلم کا شکار ہوئی۔ اگر یہ ناول کسی فلسطینی لڑکی کے بارے میں لکھا جاتا جسے اسرائیلیوں نے ہلاک کیا تو کیا نوبل انعام تو کیا اس ناول نگار کو ایک مجرم قرار دیا جاتا۔

اور تیسرا ابھی تک فراموش کردہ مسلمان ناول نگار یاسمین کھدرا ہے اور وہ ایک الجیرین مرد ہے عورت نہیں ہے اگرچہ اس کا نام یاسمین ہے، تو آج میں اس کی ناول نگاری کا تذکرہ کروں گا کہ وہ کسی بھی گارسیا مارکینر یا سراماگو سے کم درجے پر فائز نہیں۔۔ البتہ ایک الجھن کو ایسا سلجھائے دیتا ہوں کہ اگر وہ ایک مرد ہے تو یاسمین یا یاسمین کھدرا کیوں کہلاتا ہے، وہ الجیریا کی فوج میں ایک میجر کے عہدے پر فائز تھا اور کوئی یقین کرے یا نہ کرے فوج کی تنظیم میں ڈھلے کچھ روبوٹ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے اندر تخلیق کی بے پناہ قوت انہیں اظہار کرنے پر مجبور کرتی ہے اور اس سلسلے میں ہم اپنی فوج میں شامل کچھ افسروں کے حوالے فخر سے پیش کرسکتے ہیں جن کے بغیر اردو ادب کی تاریخ نامکمل رہ جاتی ہے یعنی جنرل شفیق الرحمن، کرنل محمد خان اور میجر ضمیر جعفری۔۔لیکن یہ نہ بھولئے کہ یہ تینوں بنیادی طور پر مزاح نگار تھے اور مزاح کو قبول کرنے میں کچھ حرج نہیں ہوتا کہ اس کے نتیجے میں کسی انقلاب یا تبدیلی کا کچھ خدشہ نہیں ہوتا جبکہ سنجیدہ تحریریں خطرناک ہوتی ہیں۔ اگرچہ فیض صاحب مکمل نہیں ایک پارٹ ٹائم فوجی رہے تھے لیکن انہیں زنداں میں ڈال دیا گیا، اسی طور محمد مُسلحال ایک میجر تھا اور اسے معلوم تھا کہ فوجی کمان اسے ہرگز اجازت نہیں دے گی کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز پر دھیان دے کر ناولوں میں اپنا ذاتی نقطۂ نظر پیش کر سکے چنانچہ اس نے یہ ناول اپنی بیوی یاسمین کے نام سے چھپوائے۔۔ اور جب فوج سے فارغ ہوا تو وہ اپنی بیوی کے نام سے اتنا نامور ہو چکا تھا کہ اس نے اسی نام کو اختیار کرلیا۔۔ ان دنوں وہ فرانس میں مقیم ہے اور اس کی اظہار کی زبان بھی عربی نہیں فرانسیسی ہے۔ میں نے اوپر تلے اس کے تین ناول مسلسل پڑھے اور مجھے بہت تاسف ہوا کہ آخر میں اس عظیم مصنف سے آج تک کیوں بے خبر رہا۔

یاسمین خدرا کا پہلا ناول جس سے میں متعارف ہوا ”سائرنز آف بغداد“ ہے۔۔ بغداد سے بہت دور صحرا میں بدوؤں کی ایک قدیم، نادار اور پسماندہ بستی ہے جہاں سینکڑوں برسوں سے کوئی تبدیلی نہیں آئی۔۔ یہاں تک کہ قبیلے کے ساتھ وابستگی، بزرگوں کا احترام، اپنے حال پر قناعت کرنا اور غربت میں بھی مطمئن رہنا ان کی اخلاقی اقدار میں شامل ہے۔ وہ لاتعلق رہتے ہیں اس امریکی حملے سے جس نے ان کے پُرامن ملک کو ادھیڑ کر رکھ دیا ہے ،جس نے بغداد کو برباد کردیا ہے، وہ اپنے لمحہ موجود میں مست رہتے ہیں اور پھر ایک روز گاؤں کی ایک شادی کے شادیانوں پر ایک میزائل اترتا ہے اور باراتی اور شادی کے خیمے اور روشنیاں پل بھر میں سب کچھ ہلاک ہو جاتا ہے۔۔ کچھ روز بعد امریکی فوجی اس قدیم امن کے گہوارے میں دندناتے آتے ہیں اور ایک نوجوان کے تقریباً اپاہج اور بوڑھے باپ کو بے عزت کرتے ہیں ، اسے برہنہ کر دیتے ہیں۔ وہ نوجوان اپنے باپ کی عریانی پر شرمندہ ہوتا ہے ، اس کی بے حرمتی اسے پاگل کردیتی ہے اور وہ اس کا

بدلہ لینے کے لئے بغداد چلا جاتا ہے اور ایک ”دہشت گرد“ ہو جاتا وہے۔۔ یاسمین کھدرا کا یہ ناول رلا دیتا ہے (اور بلاشبہ یہ ایک بڑا ناول ہے جو عراق کی امریکہ کے ہاتھوں تباہی کی ایک دستاویز ہے۔ (جاری

یاسمین خدرا اور چرواہے کی بانسری

مستنصر حسین تارڑ

Posted Date : 22/02/2015

سائرنز آف بغداد“ کے بعد مجھے یاسمین خدرا کے ناولوں کی لَت لگ گئی۔۔ میں اُن کے حصول کے لیے ” سرگرداں ہو گیا۔۔ اور ہمیشہ کی طرح ”ریڈنگز“ کے ڈاکٹر ناصر میری مدد کو آئے اور یاسمین کے ناول مہیا کر دیئے۔

سپیروز آف کابل“ یا ”کابل کی ابابیلیں“ یاسمین خدرا کا ایک اور حیرت انگیز ناول ہے۔۔ یہ طالبان کے زمانوں ” کا کابل ہے اور میں قطعی طور پر اس قابل نہیں ہوں کہ طالبان کے دور حکومت کو پرکھ سکوں، وہ بے شک بے ایمان نہ تھے، اپنے عقیدے کے مطابق کھرے تھے اور اُن کے زمانوں میں پوست کی کاشت کا قلع قمع ہوا، ایک امن برقرار رہا۔۔ اگرچہ میرے جیسے لوگ بامیان کے عظیم بدھ مجسموں کو ایئر فورس کی قوت سے تباہ کرنے پر آزردہ ہوئے، وہ مجسمے جنہیں بت شکن محمود غزنوی نے بھی نہ ڈھایا وہ ڈھائے گئے اور اس کے باوجود اُن کی ذاتی نیک نیتی پر شک نہ کیا جا سکتا تھا۔۔ بلکہ جب میں نے ”قلعہ جنگی“ نام کا ناول لکھا جس میں امریکی طیاروں نے اس قلعے میں محصور طالبان کو ہلاک کیا اور وہ ایک تہ خانے میں ایک گھوڑے کے گوشت پر زندہ رہے اور انہوں نے آخری دم تک ہتھیار نہ ڈالے تو مجھ پر طالبان سے ہمدری رکھنے کے بہت الزام لگے جب کہ میں نے صرف ایک انسانی المیے کی ترجمانی کی تھی، اس ناول کا فارسی اور پشتو ترجمہ افغانستان میں شائع ہو چکا ہے۔

کابل کی ابابیلیں“ طالبان کے دور حکومت کے دوران ایک ایسے جیلر کی کہانی ہے جس کی بیوی اپاہج ہو ” چکی ہے اور وہ نہایت خوش اسلوبی سے اس جیل میں بندھے حکومت مخالف عناصر کو تختۂ دار تک لے جاتا ہے کہ یہ اُس کی ڈیوٹی ہے جسے سر انجام دینے میں اُسے کچھ قلق نہیں ہوتا. کابل کے سٹیڈیم میں جن لوگوں کو پھانسی پر چڑھایا جاتا ہے یا جن فاحشہ عورتوں کو بر سر عام سنگسار کیا جاتا ہے، وہ شخص ان سزاؤں میں معاون ثابت ہوتا ہے اور پھر وہ جیل میں بند ایک ایسی خوبصورت عورت کے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے جسے اگلی سویر سنگسار کر دیا جاتا ہے۔۔ ”کابل کی ابابیلیں“ اسی عجیب سی محبت کی ایک دل سوز داستان ہے۔

یہ دونوں ناول ”سائرنز آف بغداد“ اور ”کابل کی ابابیلیں“ اپنی جگہ لیکن یاسمین خدرا کا ناول جس نے مجھے مبہوت کر دیا جس نے مجھے مسخر کر لیا اور میں اُس کی تخلیقی قوت کے سحر میں آ کر اُس کا بے دام غلام یا مداح ہو گیا وہ ”وہاٹ دے ڈے روز دے نائٹ “ تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کا ترجمہ کیا ہو گا، شاید ”دن مقروض ہے ایک رات کا“۔۔ میں اس ناول کو پڑھتے ہوئے کبھی ہیجان میں آیا اور کبھی رومان کے گہرے سمندروں میں ایک بادبانی کشتی کی مانند تیرنے لگا۔ اور اکثر آبدیدہ ہو گیا کہ یہ کیسی محبت کی داستان ہے۔

اس ناول کا مرکزی کردار الجیریا کا یونس ہے، جس کا باپ غربت سے لاچار ہو کر اُسے اپنے چھوٹے بھائی کے سپر د کر دیتا ہے جو ایک متمول کیمسٹ ہے اور جس کی بیوی یورپی ہے، وہ الجیریا کے خوبصورت شہر ”اوران“ سے کچھ فاصلے پر واقع انگور کے باغوں میں گھرے ایک پر سکون اور دیدہ زیب قصبے ”ریوسلاڈو“ میں رہتے ہیں جہاں فرانسیسی گورے آباد کار سینکڑوں برسوں سے مقیم ہیں، اُن کے دادے پڑدادے اسی دھرتی میں پیدا ہوئے، اس کے لیے محنت اور مشقت کی، اسے بنایا سنوارا، اسے اپنا گھر بنایا اور یونس اُن سب کا دوست ہو جاتا ہے۔ اپنی الجیرین شناخت اور عرب ہونے کے فخر کو بھول جاتا ہے۔ یہ ناول دراصل یونس اور ایک فرانسیسی لڑکی ایملی کی محبت کی اثر انگیز داستان ہے اور میں پورے ناول کی کہانی نہیں بیان کر سکتا، اس ناول کے کچھ اقتباس درج کرتا ہوں۔

اگر ایک مرد یہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنی منزل کو ایک عورت کے بغیر پا لے گا تو وہ ایک احمق ہے۔ یقیناًعورت ” ہر شے نہیں ہے لیکن ہر شے کا انحصار اُس پر ہے۔۔۔ جب ایک عورت ایک مرد کا سب سے بڑا جذبہ نہیں ہے، جب وہ اُس کی آخری منزل نہیں ہے تو زندگی میں نہ کوئی غم ہے اور نہ کوئی خوشی۔ عورت کے بغیر تو جنت بھی ایک ساکت تصویر ہو گی۔۔۔ غروب آفتاب، موسم بہار، سمندروں کی نیلاہٹ اور سارے ستارے صرف اُس کے مدار کے گرد گھوم کر خوبصورت ہوتے ہیں۔۔۔ حسن صرف عورت ہے، کائنات میں جو کچھ ہے صرف اُس کی زیبائش ہے“۔

بارش بہت آہستگی سے برستی تھی، کھڑکی کے شیشے آنسو بہا رہے تھے۔۔۔ جو کچھ ستاروں میں لکھا ” جا چکا ہے تم اُسے تبدیل نہیں کر سکتے۔۔۔ اور یہ ایک بہت بڑا جھوٹ تھا مجھے احساس ہوا کہ۔۔۔ لکھا کچھ بھی نہیں گیا۔۔۔ ہم اپنے ہاتھوں سے اپنی ناکامیاں تخلیق کرتے ہیں۔۔۔ ہم اپنی ناخوشی کی عمارت خود ہی تعمیر کرتے ہیں اور جہاں تک نصیب کا تعلق ہے، یہ صرف اپنی کمزوریوں کو قبول نہ کرنے کا بہانہ ہے“۔

اس ناول میں ایک کردار کریم نام کا ہے، وہ الجیرین ہے لیکن فرانسیسیوں سے ہمدردی رکھتا ہے، تحریک آزادی کا ساتھ نہیں دیتا اور جب الجیریا کب کا آزاد ہو چکا ہے وہ یونس کو جو کہ اسی برس کا ہو چکا ہے ایک قبرستان کے باہر ملتا ہے اور کہتا ہے، تم مجھے غدار قرار دیتے تھے۔۔۔ اب جو آزاد الجیریا میں قتل عام ہو رہے ہیں، بم دھماکے ہو رہے ہیں تو کیوں ہو رہے ہیں۔ تم آزادی چاہتے تھے جو تمہیں مل گئی اور اس کے بدلے میں تمہیں کیا ملا، خانہ جنگی، دہشت گردی، مسلح مذہبی گروپ۔۔۔ تم لوگ صرف بربادی اور ہلاکت کے ایکسپرٹ ہو“۔ بہت مدت پہلے جب یونس جوان تھا تو ایک فرانسیسی آباد کار اُس سے کہتا ہے ”یہ سب جب ہم آئے تو ایک ویرانہ تھا، اسے آباد ہم نے کیا، اب یہاں انگوروں کے باغ ہیں، لہلہاتی فصلیں اور خوبصورت قصبے ہیں، الجیریا کو آباد ہم نے کیا، میرے باپ داداد اور اُن کے دادا نے۔۔۔ ہم اس دھرتی کے وارث ہیں اور تم کہتے ہو اس پر ہمارا کوئی حق نہیں “ تو یونس اُسے کہتا ہے ”بے شک تمہارے آنے سے پیشتر یہ ایک ویرانہ تھا، لیکن اس ویرانے میں ایک گڈریا تھا جس کی ایک بانسری تھی، اُسے دنیا کا کوئی غم نہ تھا، وہ اپنے حال پر قانع تھا، بانسری بجاتا تھا اور اپنی بھیڑوں کی رکھوالی کرتا تھا۔۔۔ اور وہ ہزاروں برسوں سے اس سرزمین پر آباد تھا۔۔۔ آپ لوگوں نے فرانسیسی آبادکاروں نے اُس کی بانسری چھین لی اور اُس کی بھیڑوں کو ہلاک کر دیا۔ ایک دن آئے گا جب وہ گڈریا واپس آئے گا اور آپ سے اپنی بانسری چھین لے گا“۔

ایک ماں محض ایک وجود نہیں ہے، اور نہ ہی کوئی منفرد شخصیت اور نہ ہی کوئی رزمیہ۔۔۔ ماں ایک ایسی ” موجودگی ہے جسے نہ تو وقت اور نہ ہی بھولتی ہوئی یادداشت تبدیل کر سکتی ہے، بھلا سکتی ہے۔۔۔ اور “ہر شب جب میں بستر کی چادر اوڑھتا ہوں تو میں جانتا ہوں کہ وہ وہاں موجود ہو گی۔۔۔

میں مڑ کر دیکھتا ہوں تو وہاں میرے سب دوست جو مر چکے ہیں یا زندہ ہیں ایک کھڑکی میں سے جھانکتے ” مجھے الوداع کہتے ہیں“۔

ایک ناول نگار کی حیثیت سے یہ میں جانتا ہوں کہ فکشن، بے یقینی کو ایک یقین میں معلق کر دینے کا نام ہے۔ یہ سب قصے کہانیاں، وارداتیں اور محبتیں ہم خود تخلیق کرتے ہیں لیکن وہ سب تصور کے کرشمے تو نہیں ہوتے اُن میں ناول نگار کی حیات کے پر تو جھلکتے ہیں، اُس کا مشاہدہ اور تجربات اُس میں شامل ہو کر ایک بے یقینی کو یقین میں بدلتے ہیں۔ یاسمین خدرا کے اس ناول نے مجھے کبھی آزردہ اور کبھی آبدیدہ کیا اور کبھی میں بے پایاں مسرتوں سے ہمکنار ہوا۔ وہ کسی مارکیز یا سراماگو سے کم نہیں لیکن اُسے کبھی نوبل انعام نہیں ملے گا کہ وہ مفاہمت نہیں کر سکتا۔ اُس نوعیت کے ناول نہیں لکھ سکتا جس نوعیت کے ناولوں پر نوبل انعام دیا جاتا ہے لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ نوبل نہ سہی اُس نے میرے دل کا انعام جیت لیا ہے

بابا نذیر۔۔ ایک یاد گار شخص
مستنصر حسین تارڑ
Posted Date : 25/02/2015
میں نے اپنے سفر نامے ”نیویارک کے سو رنگ“ کے آغاز میں ایک متنازع نوعیت کا بیان تحریر کیا تھا کہ میری اس آوارہ گرد، بیکار اور سرمست حیات کا خشور ایک طوائف نے اپنے ایک شعر میں سمو دیا تھا کہ
کس کو سنائیں حالِ دل زار اے ادا
آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی
تو لکھنؤ کی امراؤ جان ادا نے جو کہا وہ میرے بارے میں کہا کہ ہم نے بھی آوارگی میں زمانے کی سیر کی۔۔ اور اس زمانے کی آوارگی کے دوران، ان 75 برسوں کی حیات کے دوران کیسے کیسے نابغۂ روزگار لوگوں سے قربتیں ٹھہریں، ان کی تفصیل میں کیا جانا لیکن۔۔ ان میں سے ایک شخص جو نہ کوئی نابغہ روزگار تھا، نہ کوئی پہچان تھی، نہ پڑھا لکھا تھا اور نہ ہی کوئی ادیب شاعر یا مفکر تھا، کسی حد تک ایک مزدور ایک گدھے کی مانند کام میں جتا رہنے والا شخص بابا نذیر تھا جو میرے والد صاحب اور میری ملازمت میں آیا اور پوری حیات ہمارے لیے وقف کر دی، وہ مجھے بھلائے نہیں بھولتا کہ وہ میری جان پہچان والے تمام علماء، ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں سے کہیں افضل تھا۔
بابا نذیر تب ایک نوخیز البیلا نوجوان تھا جب وہ مشرقی پنجاب سے اجڑ پجڑ کر آیا اور ابا جی نے اسے پناہ دی اور ملازم رکھ لیا۔ وہ ہم سے تب بچھڑا جب میں اس کے جنازے کو کاندھا دے کر میانی صاحب کے قبرستان تک لے گیا۔ اُس کے لیے میں تو ایک بار ہوا لیکن میرے بچے بھی بہت روئے کہ بابا نذیر اُنہیں ہر صبح سائیکل پر بٹھا کر کتھیڈرل سکول چھوڑنے جاتا اور اس دوران سلجوق اور سمیر اس کے گنجے سر پر ٹھونگے مارتے کھکھلاتے شور مچاتے رہتے کہ بابا سائیکل تیز چلاؤ اور بابا نذیر ان ٹھونگوں سے لطف اندوز ہوتا اُنہیں دعائیں دیتا رہتا۔
“میں نے ایک بار اس سے پوچھا ”بابا نذیر تمہاری عمر کتنی ہو گی
“تو وہ اپنی چندیا کھجا کر بولا ”چوہدری صاحب۔۔ یہی کوئی پچاس برس۔۔
اور میں ہنس کر کہتا ”بابا تیرا بیڑہ غرق ہو۔۔ پچاس کا تو میں بھی ہونے کو ہوں۔۔ اور تم مجھے کھلاتے رہے تھے، تو وہ شرمندہ سا ہو کر کہتا ”تو پھر شاید میری عمر ستر برس ہو گی، چوہدری صاحب غریبوں کی عمر کا کچھ صاب کتاب نہیں ہوتا، بابا نذیر کی کوئی باقاعدہ تنخواہ متعین نہ تھی، جب بھی اُسے حاجت ہوتی وہ اُسے پوری کرنے کے لیے رقم مانگ لیتا۔
وہ بیکار نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ بازار میں اگر کسی ریڑھے پر سے بوریاں اُتر رہی ہیں تو وہ بن بلائے وہاں پہنچ کر اپنے کاندھوں پر بوریاں لاد کر مدد کرنے لگتا، اُس کا ایک ہی بیٹا تھا جو کسی حد تک ناکارہ تھا۔۔ اُس کا بیاہ ہوا تو ہم بارات کے ساتھ چوہڑ کانے گئے جسے معزز کرنے کی خاطر شاید ان دنوں فاروق آباد کہا جاتا ہے، بابا نذیر کی خوشی دیدنی تھی وہ اپنے گلے میں ڈالے گئے گیندے کے ہار اُتار کر میرے گلے میں ڈالتا تھا، اگرچہ بابا نذیر نے اپنے تئیں اپنے اکلوتے بیٹے کا رشتہ ایک معزز خاندان میں کیا تھا لیکن بعد ازاں کھلا کہ لڑکے کے سسر صاحب کو گداگری کی علت لاحق ہے۔ وہ بابا نذیر کو ملنے کے لیے ہماری دکان ”کسان اینڈ کمپنی “ پر آتے۔ خاطر مدارت کرواتے اور پھر باہر نکل کر گوالمنڈی چوک میں بھیک مانگنے لگتے۔ ایک بار بابا نذیر اُنہیں بہ نفس نفیس براہ راست ایک چوہڑ کانے جانے والی بس پر بٹھا کر آیا تا کہ وہ راستے میں بھیک نہ مانگنے لگیں۔۔ بعد ازاں کھلا کہ موصوف نے بس میں سوار ہوتے ہی ”اللہ بھلا کرے“ کی صدا بلند کر دی۔
مجھے یاد ہے جب امی جان کو ہم دفن کر آئے اور تعزیت کے لیے آنے والے لوگوں کے لیے حسب روایت پلاؤ اور زردے کی دیگیں چڑھائی گئیں اور وہ جو نہایت ہی قریبی عزیز، دوست اور رشتے دار تھے، نہایت ذووق و شوق سے تناول فرماتے، گوشت کے خواہاں ہوتے تھے تو بابا نذیر ایک کونے میں بھوکا بیٹھا تھا اور جب میں نے اس سے کہا کہ ”بابا نذیر۔۔ تم بھی کچھ کھا لو“ تو وہ کہنے لگا ”چوہدری صاحب۔۔ میری بی بی چلی گئی، مجھ سے تو کھایا نہیں جاتا۔۔ میں اُن کی موت کے چاول نہیں کھا سکتا“ اور پھر وہ رونے لگا۔۔ وہ صرف ہمارا مددگار اور ہمارا بابا نہ تھا، پورے بازار اور پورے محلے کا مددگار اور بابا تھا۔۔ اُس نے آخری عمر میں گوالمنڈی میں واقع ہمارے خستہ حال ایک مکان میں رہائش اختیار کی اور پھر مر گیا۔
کیا آپ یقین کریں گے کہ اس کے جنازے پر کتنا ہجوم تھا۔۔ بازار کے سب لوگ خوانچوں، ریڑھیوں والے، دکاندار اور گوالمنڈی چوک کے فالودہ اور مچھلی فروخت کرنے والے سب کے سب اُس کی میت پر ہار ڈالتے ، اُس کے لیے روتے تھے اور ہم اُسے اپنے کاندھوں پر اٹھا کر میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کر آئے۔ اور اتنے

برسوں بعد جب کبھی میں وہاں سے گزرتا ہوں تو میانی صاحب کی سب قبروں میں سے نمایاں بابا نذیر کی قبر ہوتی ہے اور میں اس کی بخشش کے لیے فاتحہ پڑھتا ہوں۔
ہم بہت رشتہ داروں اور عزیزوں کو جو بچھڑ چکے ہیں، بھلا بیٹھے ہیں لیکن بابا نذیر کو نہیں بھولے۔۔ اور نہ ہی میرے بچے بھولے ہیں، جن دنوں سلجوق جدہ کے پاکستانی سفارت خانے میں سفارتی فرائض انجام دیتا تھا، اس نے میرے لیے نہیں خصوصی طور پر بابا نذیر کے لیے ایک عمرہ ادا کیا کہ وہ اسے سکول چھوڑنے جایا کرتا تھا ، اور سلجوق اس کے گنجے سر پر ٹھونگیں مارا کرتا تھا

بائے! پُت پینڈو
مستنصر حسین تارڑ
Posted Date : 01/03/2015
میں آپ کو ایک ”بائے پُت پینڈو“ اور ایک ”سونے کی چڑیا“ کا قصہ سنانا چاہتا ہوں جو اصل میں دونوں ایک ہیں، میری حیات کے سکے کے دو رُخ ہیں، اسی لئے یہ سکہ دنیا کے بازار میں نہ چل سکا۔۔ صورت حال کو واضح کرنے کے لئے میں فلم کی تکنیک کا سہارا لیتے ہوئے آپ کے سامنے دو منظر پیش کروں گا۔۔ میری تحریروں اور مجھ سے واقفیت رکھنے والے آگاہ ہوں گے کہ اگرچہ میری جم پل خالص شہر لاہور میں ہوئی لیکن میرے والد صاحب گجرات کے ایک پسماندہ گاؤں جوکالیاں سے اٹھ کر تلاش روزگار کے لئے لاہور چلے آئے، وہ کم از کم جاٹ برادری میں اس علاقے میں پہلے نوجوان تھے جنہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کرلیا۔۔ لاہور میں رزق روزگار کی جدوجہد کی پرمشقت اور جان لیوا داستان میں نے اپنے ناول ”خس و خاشاک زمانے“ کے کردار امیر بخش کی صورت میں رقم کردی ہے۔۔ وہ ان زمانوں کے لاہور کے متمول ترین افراد میں شمار ہوئے۔ زراعت پر درجنوں کتابیں تصنیف کیں۔ ”کاشتکار جدید“ کے نام سے ایک ادبی اور زراعتی جریدہ تیس برس تک باقاعدگی سے شائع کیا۔۔ بے شک میں نے لاہور میں آنکھ کھولی، اسی شہر کے ماحول اور موسموں کا پروردہ ہوا لیکن ہمارے گھر کا ماحول، رہن سہن، ادب آداب، خوراک اور زبان کا لہجہ گاؤں کی ثقافت سے جڑا رہا۔۔ میں ان دنوں رنگ محل مشن ہائی سکول میں شاید تیسری جماعت کا طالب علم تھا جہاں کا نظام تعلیم کولونیئل ورثے کا ترجمان تھا۔ ہماری ایک دو استانیاں انگریز تھیں اور بقیہ ہماری رنگت سے بھی زیادہ سیاہی مائل تھیں۔۔ وہ ہم بچوں کو ان زمانوں کے رواج کے مطابق زدوکوب نہیں کرتی تھیں، بلکہ اکثر رنگین چاک تحفے میں دیتی تھیں، صبح کا آغاز ’لب پہ آتی ہے دعا بن کر تمنا میری‘ سے ہوتا اور پھر ایک پادری صاحب جو بہت ہی بوڑھے تھے ہمیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزوں کے بارے میں بتاتے اور یقین کیجئے کہ مجھے ابھی تک۔۔ یعنی تقریباً سڑ سٹھ برس بعد بھی ایک قصہ یاد ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے کچے حجرے میں تشریف رکھتے ہیں اور بیماروں اور لاچاروں کا ایک ہجوم ہے جو شفا کا طالب ہے۔۔ حجرے کے باہر بھی اتنے بیمار ہیں کہ ان میں سے راستہ ملنا دشوار ہے۔۔ اور پھر چارپائی پر ایک مریض ہے جو آخری دموں پر ہے اور اس کے لواحقین اسے اٹھا کر ابن مریم کے پاس لے آتے ہیں تاکہ اس کے دکھ کی دوا کرے کوئی۔۔ چونکہ ان تک پہنچنا ایک دشوار امر ہے چنانچہ اس مریض کو اٹھا کر کچے کوٹھے کی چھت پر لے جایا جاتا ہے اور پھر اس چھت میں شگاف کرکے اس کی چارپائی کو عیسیٰ ابن مریمؑ کے سامنے اتار دیا جاتا ہے۔۔ حضرت عیسیٰ ؑ اس کے بدن پر ہاتھ پھیرتے ہیں تو وہ مریض صحت یاب ہو جاتا ہے۔ یہ قصہ بعدازاں کبھی نہ سنا اور نہ ہی میرے محدود مطالعہ میں آیا۔۔ میں اپنے مسیحی دوستوں سے درخواست کرتا ہوں کہ اگر وہ ابن مریمؑ کے اس معجزے سے آگاہ ہیں تو براہ کرم اس کی تفصیل سے سرفراز فرمائیں۔۔ رنگ محل مشن ہائی سکول کے وہ پیارے سے پادری صاحب نے اگر یہ قصہ بیان کیا تھا تو کسی مصدقہ حوالے سے ہی اخذ کیا ہوگا۔۔ ویسے کچھ مضائقہ نہیں کہ اگر میری یادداشت کی خود سے توصیف کردیں۔
تو اب میں ”بائے پُت پینڈو“ کا پہلا منظر پیش کرتا ہوں۔۔
ہمیشہ نہیں لیکن کبھی کبھار میں بچوں کے غول میں چھٹی کے بعد سکول سے باہر آتا تو چند بچے میرے پیچھے چلے آتے، آوازے کستے، میرا تمسخر اڑاتے بلند آواز میں، ”بائے پُت پینڈو“ کے نعرے لگاتے چلے آتے۔۔ اگرچہ میں بہت صاف ستھرا ہوتا، میرے سیاہ بوٹ کیوی بوٹ پالش سے دمک رہے ہوتے، ان میں سے بیشتر کی نسبت خوش لباس ہوتا لیکن میرے لہجے میں گاؤں کا ایک اکھڑ پن تھا۔۔ میری پنجابی ٹھیٹھ اور اوریجنل تھی اور میں لاہوری لہجے کی پنجابی بولنے سے قاصر تھا کہ میرے گھر میں اس لہجے کی پنجابی بولی جاتی تھی، میں لاہوریوں کی مانند ”چڑیا“ کو ”چریا“ نہ کہتا تھا اورنہ ہی ”گھڑے“ کو ”گھرا“ کہہ سکتا تھا۔۔ چنانچہ میں ایک ”پُت پینڈو“ تھا۔۔ بچوں کی اس یلغار کا سرغنہ ایک گورا چٹا خالص لاہوری بچہ نذیر نام کا ہوا

کرتا تھا، ایک روز جب نہ صرف ”ہائے پُت پینڈو“ کے نعرے لگائے گئے بلکہ مجھے دھکے بھی دیے گئے، میرے گالوں پر چٹکیاں بھری گئیں تو میرا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا اور میں اس سرغنہ بچے نذیر پر پل پڑا۔۔ چونکہ میں بڈپیر کا مضبوط تھا چنانچہ میں نے اس نذیر کی خوب ہی ٹھکائی کی۔۔ وہ گورا چٹا اور قدرے نازک بچہ تھا، میرے گاؤں کے جاٹ وحشی پن کی تاب نہ لا سکا اور ڈھیر ہوگیا۔۔ ازاں بعد راوی چین ہی چین لکھتا ہے، ایک مدت بعد جب میں اسلام آباد میں صبح کی نشریات کی میزبانی کے فرائض سرانجام دیا کرتا تھا تو میری ادائیگی کے چیک قدرے تاخیر کے شکار ہو جاتے تھے تو میں پی ٹی وی ہیڈکوارٹر میں بہت طیش میں آیا ہوا ڈائریکٹر فنانس کے کمرے میں داخل ہوا۔۔ میں تو اسے نہ پہچان سکا لیکن مجھے دیکھتے ہی وہ اپنی کرسی سے اٹھ بیٹھا اور نعرہ لگایا ”ہائے پُت پینڈو“ ۔۔ یہ وہی نذیر تھا، اب بھی گورا چٹا اور قدرے نازک سا تھا اگرچہ بوڑھا ہونے کو تھا۔۔ ہم نے پرانے زمانے یاد کئے ۔۔ وہ کہنے لگا ”تارڑ۔۔ ویسے تو اب بھی پُت پینڈو ہے۔۔ کسی کا لحاظ نہیں کرتا یہاں تک کہ امیرالمومنین ضیاء الحق کا بھی لحاظ نہیں کرتا اور میں سب کو فخر سے بتاتا ہوں کہ یہ پُت پینڈو، رنگ محل مشن ہائی سکول میں میرا کلاس فیلو تھا، تب بھی اکھڑ تھا اور اب بھی ہے۔۔ مجھے تمہارے گھونسے اب بھی یاد ہیں۔۔

وہ جو پرانے زمانے تھے ایک اور منظر ان زمانوں کا ہے۔ برصغیر کی تقسیم سے پیشتر سرینگر کے نواح میں میرے والد صاحب نے زمین ٹھیکے پر لے کر وہاں ایک وسیع فارم قائم کیا تھا جہاں پھول کاشت کئے جاتے تھے اور ان کے بیج تیار کئے جاتے تھے اور مجھے یاد ہے کہ اس فارم میں ڈہلیاکے پھولوں کا ایک کھیت ہوا کرتا تھا اور ہر پھول باقاعدہ گوبھی کے پھول کی جسامت کا ہوتا تھا، صرف تین پھولوں سے گلدان بھر جاتا تھا۔

پاکستان کے قیام کے بعد سرینگر جدا ہو گیا تو والد صاحب نے میری نانی جان کے گاؤں گکھڑ منڈی میں ریلوے سٹیشن کے نواح میں سبزیوں اور پھولوں کے بیجوں کی پرورش کے لئے ”اپنا نرسری فارم“ قائم کیا اور وہ ہمیں بھی اپنے ساتھ لے گئے۔۔ میں زندگی میں پہلی بار ایک دیہاتی قصبے کے شب وروز سے آگاہ ہوا۔ رنگ محل مشن ہائی سکول سے اٹھا کر مجھے گکھڑ منڈی کے نارمل سکول کی چوتھی جماعت میں داخل کروا دیا گیا اور یہاں میں ایک ”سونے کی چڑیا“ ہوگیا۔

(جاری ہے)

کلرکہار کی جھیل اور تختِ بابری

مستنصر حسین تارڑ

Posted Date : 08/03/2015

کلرکہار کی سرکنڈوں سے اٹی، گھاس پھونس میں اُلجھی جوہڑ نما وسیع جھیل میں سینکڑوں مرغابیاں اُس دھند بھری سویر میں تیرتی نہ تھیں، ساکت اور بے جان سی لگتی تھیں، البتہ کبھی کبھار اُن میں سے کوئی ایک جب اپنے پر جھاڑتی، اُن پروں پر جو پانی کے قطرے دھند میں دھندلاتے تھے انہیں جھاڑتی، تب گمان ہوتا کہ وہ تصویریں نہیں ہیں، اُن میں جان ہے اور اُس جان میں اُن کے وہ دل دھڑکتے ہیں جن کی دھڑکن اُن کے آبائی وطن کی برفوں کی شدت سے تھم جاتے اگر وہ اُن قہر بھرے موسموں سے فرار ہو کر، طویل اڑانوں کے بعد کلرکہار کی اس آسودہ پانیوں والی جھیل پر نہ اترتیں۔

مہابھارت میں جب ارجن اپنے کرشن سے اس دنیا کے بارے میں کچھ بھید جاننا چاہتا ہے تو کرشن کہتا ہے ”اور یہ بھی جان لو کہ کنول کے پتے اور مرغابی کے پر، پانی میں رہنے کے باوجود خشک رہتے ہیں، دنیا میں رہتے ہیں پر اس کی آلائشوں سے آزاد رہتے ہیں“۔

کلرکہار جھیل میں جتنی بھی مرغابیاں تھیں، پانی میں رہنے کے باوجود اُن کے پر خشک تھے۔

میں نے جھیل کے پانیوں پر موجود ان گنت مرغابیوں کو اپنی نگاہ میں تصویر کیا، یہ جاننے کے لئے کہ کیا ان میں وہ چار مرغابیاں ہیں جن کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں۔

میری نگاہ جس مرغابی پر ٹھہرتی وہ میرے گمان میں اپنے پر پھڑپھڑاتی یہ کہتی کے ہاں میں اُن چاروں میں سے ایک ہوں۔۔ بقیہ تین تم تلاش کر لو۔۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم ناممکن کی جستجو میں ہو۔۔ یہ ضروری تو نہیں کہ خوشی کا تعلق پوری چار مرغابیوں سے ہو۔۔ وہ ایک مرغابی بھی تو ہو سکتی ہے جو کہ وہ، میں ہوں۔۔ میں ہی یکتا، میں ہی احد ہوں۔۔ میں ہی حق ہوں، کیا مجھے بھی حلاّج کی مانند سولی پر چڑھا دو گے؟

ماڈل ٹاؤن پارک میں سویر کی سیر میں میرا ساتھ دینے والے، مجھے اپنا رفیق کرنے والے بیشتر دوست نہایت متنازع، کسی حد تک مخرب الاخلاق، کبھی دانائی کے کوہِ گراں کے کوہ نورد لیکن سب کے سب ایک

تجسس رکھنے والے، کہ یہ دنیا کیا ہے، ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے، یہ جاننے اور بھید کے اندر جو بھید ہے اُس کا راز پانے کی پھونک شاید میری موجودگی سے بھری گئی تھی۔۔ لیکن ہم لاہور شہر کی قدامت میں نکل جاتے، پُرانی حویلیوں اور گلی کوچوں میں بھٹکتے پھرتے۔ لاہور کے قدیم ترین شوالے یعنی شیو مندر کے گمشدہ آثار میں ابھی تک موجود ایک درخت کو چھو کر دیکھتے اور کبھی ہم علامہ اقبال کے اُس مکان میں موجود ہو جاتے جہاں اُنہوں نے ”بانگ درا“ کی ابتدائی شاعری کی تھی اور لمحۂ موجود میں وہاں کے رہائشی بینڈ باجے والوں کی بیٹھک میں بیٹھ کر منیر حسین کی شہنائی پر سر دھنتے۔۔ غرض کہ صبح کی سیر کے میرے جتنے رفیق تھے اُن کے اندر سیمابیت کے جوہر تھرکتے تھے۔

مہم جوئی اور آوارگی کی خصلت اُن کے اندر اُنہیں روٹین کی زندگی سے فرار ہو کر ان دیکھے مناظر اور عجوبوں کی جانب سفر کرنے پر مائل کرتی تھی۔

طے یہ ہوا کہ ہم کسی سحری سرد سویر شہر لاہور سے فرار ہو جائیں گے۔ کلرکہار جھیل کی یاترا کریں گے۔ تختِ بابری پر براجمان ہوں گے، اور پھر اُس آنسو کی جانب سفر کریں گے جو کٹاس راج کے مندروں کے درمیان ابھی تک ٹھہرا ہوا ہے۔ اور اگر ممکن ہوا تو ہم ذرا تردّد کر کے کھیوڑے کی کان کا نمک بھی چکھ آئیں گے۔

موٹروے سے ذرا جدا ہو کر ہم ایک آرام گاہ میں داخل ہو گئے تاکہ وہاں ٹھہر کر ناشتہ کر لیں۔

اور وہاں کیا ہی سہانا دھند میں ڈوبا منظر ہمیں اپنے سفید حسن میں ڈبوتا تھا۔ موٹروے کے کناروں سے پرے کھیتوں کی ہریاول سبز کچور تھی، گندم کے ابھی نوخیز بوٹے دھند میں نابینا ہوتے آئے۔

ایک کچے راستے پر ایک بیل گاڑی چلی جاتی تھی، بیلوں کے سینگ دھند میں چھید کرتے، اور وہ اس دھند میں ملفوف ہو کر ایک سراب ہوئے جاتے تھے۔

ناشتہ کے لئے۔۔ نسیم کی بیٹی کا بنایا پیزا، تنویر کے سینڈوچ، گرم کافی اور کشمیری چائے۔

گندم کے نوخیز ہرے ہرے بوٹوں کے اندر دھند سرایت کرتی تھی۔

کلرکہار کی سروٹوں سے بھری، گھاس میں اٹی جوہڑ نما جھیل میں مرغابیاں تیرتی تھیں ۔

جھیل سے ذرا بلندی پر پی ٹی ڈی سی کا موٹل تھا۔

میں بمشکل اس بلندی پر ہانپتا ہوا پہنچا لیکن وہاں سے جھیل کا نظارہ میری آنکھوں تلے بچھا جاتا تھا۔۔ بے شک یہ ایک جوہڑ تھا پر اس سویر وہ مجھے دنیا کی سب سے دلکش جھیل نظر آئی۔۔ جیسے جوانی میں راج ہنس نظر آتی ہے۔

جب ہم اس بلند نظارے کو آنکھوں میں اتار کر جھیل کنارے آئے تو وہاں سیاحوں کو راغب کرنے کے بہت سامان تھے۔۔ ریستوران، کیفے اور بچوں کے جھولے۔

ان سامانوں میں، رغبت کے ان کارخانوں میں، دو جانور ایسے تھے جنھوں نے اپنی وجاہت اور خوشنمائی سے مجھے گرفتار کر لیا۔

ایک سجا سجایا بھورا اونٹ تھا اور وہ اتنا کیوٹ اور بالوں بھرا تھا کہ ایک کھلونا لگتا تھا، اور تب اُحد کی جنگ میں اپنی کمان کے تیروں سے کفار کو نشانہ کرتے حضرت حمزہؓ یاد آ گئے جن کے بارے میں کہا گیا تھا کہ دور سے وہ ایک بھورے اونٹ کی مانند دکھائی دے رہے تھے جو دلاوری اور شجاعت میں بے مثال تھا۔

اُس اونٹ کے قریب سیاحوں کی توجہ کا طالب ایک گھوڑا اور وہ بھی آراستہ بت بنا کھڑا تھا۔ نہ اتراتا تھا نہ بے لگام اتھرا تھا۔ اُس کی بناوٹ شاہانہ تھی۔ جیسے ابھی ابھی اس کی پشت سے نپولین اترا ہو۔۔ اتھری عورتوں اور گھوڑیوں کے مزاج آشنا مہاراجہ رنجیت سنگھ اترا ہو، وہ ایسا گھوڑا تھا۔

ہم نے کٹاس راج کی جانب سفر کا آغاز کیا تو راستے میں بابر بادشاہ کا تخت آ گیا۔ راستے سے رُخ موڑ کر ایک اور راستہ بلند ہوتا تھا اور وہاں جھاڑیوں اور گھاس میں سے نمودار ہوتا ایک پتھر تھا۔ اور اگر آپ اپنے تصور کو بے لگام کر دیں تو وہ ایک نشست کی صورت ظاہر ہوتا تھا۔

شنید یہی تھا کہ یہ تخت بابری تھا، جس کا تذکرہ تزک بابری میں آیا ہے۔

بابر بادشاہ۔۔ فرغانہ سے فرار ہونے والا ایک مہم جو، یہاں اس پتھر پر بیٹھا تھا اور اس نے اپنی افواج سے خطاب کیا تھا۔

میں اس پتھر تخت پر براجمان ہوا تو شہنشاہ ہند ظہیرالدین بابر حقیر ہو گیا کہ وہ تو کب کا کابل میں دفن ہو چکا تھا اور اس کے مزار کا کتبہ اکھاڑ کر مہنگے داموں فروخت کر دیا گیا تھا اور میں زندہ تھا۔

کوہستان نمک کا سرخ گاؤں اور چؤا سیدن شاہ

مستنصر حسین تارڑ

Posted Date : 15/03/2015

ڈھلتی دوپہر کی دھوپ میں اس سرخ رنگ میں رنگے سرخ چٹانوں کے سائے میں سرخی کا ایک انبار گاؤں، ذرا احتیاط نہ کرو تو اس کا سرخ وجود آس پاس کی سرخ چٹانوں میں مدغم ہو کر گم ہوجاتا تھا۔۔۔ جہاں ہم سفر کرتے تھے اس کے نشیب میں وہ گاؤں جو دوپہر کی ڈھلتی دھوپ میں حیا کی سرخی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایک بے یقین سا منظر جسے یکدم دیکھنے سے دل یکدم ٹھہر جائے کہ یہ کیا ہے۔۔۔ اردن کا گلاب سرخ شہر پیٹرا ہے، اگر ہے تو اس قدیم شہر کے کھنڈر کٹاس راج اور نمک کے شہر کھیوڑہ کے راستے میں کیسے ظاہر ہو گئے۔

میں تنویر سے باتیں کر رہا تھا اور جب میں نے یونہی دائیں جانب نظر ڈالی تو میں جو بات بھی کر رہا تھا وہ ادھوری رہ گئی۔۔۔ نشیب میں ایک شفق رنگ گاؤں، بہت مختصر، ڈھلتی دوپہر کی دھوپ میں۔۔۔ میں نے اپنے ہم سفروں کی جانب دیکھا کہ کہیں وہ سرخ بستی جو میری آنکھوں میں اترتی تھی، میرا ایک گمان، نظر کا دھوکا تو نہ تھی، صرف مجھے ہی دکھائی دے رہی تھی، اس کا کوئی وجود نہ تھا، ایک مدت سے خواہش تھی کہ میں بھی کبھی ’’روز ریڈ سٹی آف پیٹرا‘‘ کو ڈھلتے سورج کی زرد کرنوں میں صحرا میں سے ظاہر ہوتے دیکھوں اور یہ گاؤں اسی خواہش کا ایک سرخ سراب تھا۔۔۔ اور تب فرزند کی آواز آئی ’’تارڑ صاحب۔۔۔ یہ تو الف لیلیٰ کا کوئی جادوئی گاؤں ہے، یہ کیا ہے؟‘‘

تنویر کا دھیان بھی الجھ گیا، یہاں تک کہ وہ سکرین پر دھوم مچاتی کترینہ کیف سے بھی غافل ہو گیا اور کہنے لگا۔۔۔ سر جی یہ آپ ہمیں کہاں لے آئے ہو؟‘‘

’’میں لے آیا ہوں؟ ڈرائیو تم کر رہے ہو، تم لے آئے ہو‘‘

جیسے آسٹریلیا کے ویران صحراؤں میں براجمان نوکلو میٹر طویل اور ایک ہزار میٹر بلند الورو چٹان جب غروب کے منظروں میں ڈھلتی تھی تو میری آنکھوں میں سے جنم لینے والی سرخ بادبانوں کی کشتیاں اس کی جانب روانہ ہو گئیں اور اس کے دامن میں لنگر انداز ہو گئی تھیں کچھ ایسے ہی میری آنکھوں میں سے ایک حیرت کی ناؤ رواں ہوئی اور اس سرخ سیب رخساروں والے چٹانوں میں گھرے گاؤں کی سرخی میں رچ گئی۔ اگرچہ ان بنجر چٹیل ویرانوں میں، بے آب و گیاہ پتھریلی کائنات میں یہ گاؤں یقیناًایک افلاس زدہ بستی ہو کا لیکن میرے تصور میں اس کے سب مکین بے شک پھٹے پرانے کپڑوں میں ہوں گے پر وہ سب سرخ رنگت میں رنگے ہوں گے یہاں تک وہاں جتنی بھی سوہنیاں اور ہیریں ہوں گی اُن کے غربت زدہ رخسار بھی قندھار کے سرخ انار ہوں گے۔ اگر ڈھلتے سورج کی مدھم ہوتی کرنوں میں اس سرخ گاؤں کو کوئی مصور نقش کرے اور وہ تصویر دنیا بھر میں تشہیر کی جائے تو اسے دیکھنے کے لیے سیاحوں کا تانتا بندھ جائے۔۔۔ لیکن یہ پاکستان تھا، جاڑے کی چاندنی اور غریب کی جوانی کی مانند اس عجب سرخ گاؤں کا بھی کچھ مول نہ پڑنا تھا۔

ہم ایک گھاٹی پر گھوم کر جب ایک اوٹ میں آئے تو وہ گاؤں اوجھل ہو گیا۔

اور ہم تو کٹاس راج کا ایک آنسو سنبھالے کھیوڑا کی کان نمک کی جانب سفر کررہے تھے۔۔۔ ہم تو نمک عشق کا چکھنے جا رہے تھے۔ ہم جسے ہمیشہ چوہا سیدن شاہ سمجھتے تھے وہ دراصل سیدن شاہ کا چشمہ تھا، چؤا تھا۔ تنگ بازار جن میں تنگ بدن عورتیں کپڑے کی دکانوں میں بھاؤ تاؤ کرتی تھیں۔ یہ چؤا سیدن شاہی خواتین اگرچہ بہت لپٹی لپٹائی تھیں لیکن وہ سب کی سب اسی طور اترا کر چلتی تھیں، اپنی بدنی بناوٹ کو جان بوجھ کر ظاہر کرتی تھیں جیسے ڈیفنس یا لبرٹی مارکیٹ میں لاہور کی ہرنیاں اٹھلاتی پھرتی ہیں۔۔۔ البتہ ایک فرق تھا کہ لاہور کی مانند اس کے دل کے درمیان ایک نہر نہیں، ایک نہایت وسیع گندا نالا بہتا تھا جس کے کناروں پر جدید حیات کے سب کرشمے بارونق ہو رہے تھے، برگرز کی دکانیں، بیوٹی پارلر، پیزا پارلر، وڈیو پارلر۔۔۔

ویسے اس مقولے میں کتنی بڑی سچائی پنہاں ہے کہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔۔۔ جب کبھی چؤا سیدن شاہ کا تذکرہ آتا تو تصور میں ہمیشہ کوہستان نمک کا ایک ویرانہ آتا تھا جس کی بیابانی میں کوئی اداس اور بے رنگ بستی ہے، گرم موسموں سے جھلستی ہوئی اور اس بستی کے مکین کیسے تہذیب سے کٹے ہوئے ایک بے رنگ سی زندگی کرتے ہوں گے تو یہ تصور بھی باطل ثابت ہوا۔۔۔ اپنی آنکھوں سے یہ شہر دیکھا تو آشکار ہوا کہ لاہور اور چؤا سیدن شاہ کے مکینوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں، سوائے اس کے کہ ہم قدرے بے جھجھک اور بے حجاب ہیں اور وہ اگرچہ حجاب میں ہیں لیکن وہ بھی بے جھجھک ہیں۔ البتہ وہ اس حوالے سے ہم پر برتری رکھتے ہیں کہ کوہستان نمک کے باشندے ہیں اور ان کے ہونٹوں پر نمک عشق کا ہے جب کہ ہمارے ہونٹ بے روح اور بے ذائقہ ہیں۔

چؤا سیدن شاہ سے نکلے تو ایک اور حیرت سے دو چار ہوئے۔ ہم تو اس فریب میں مبتلا تھے کہ کٹاس راج سے کھیوڑا تک کی مسافت صرف پچیس کلو میٹر ہے اور یہ ایک ہموار میدانی سفر ہو گا، پر ہم اس شہر

سے نکلے ہیں تو ایک کوہستانی سفر کا سامنا ہو گیا۔
جیسے امام دین گجراتی نے وہ لازوال شعر کہا تھا کہ:
یہ سڑک
سیدھی جلال پور جٹاں کو جاتی ہے۔
تو ایک مداح نے کہا کہ حضور شکایت نہیں کر رہا لیکن پہلے اور دوسرے مصرعے کے درمیان وزن کا کچھ مسئلہ ہے۔ ایک بہت مختصر اور دوسرا قدرے طویل تو استاد نے کیا ہی شاندار توجیہہ پیش کی تھی کہ سڑک بہت طویل ہوتی ہے تو اس مصرعے کو اتنا طویل کر لیں کہ دوسرے مصرعے کے برابر میں آجائے۔ تو ہم بھی اسی خیال میں تھے کہ کٹاس راج سے یہ جو سڑک سیدھی کھیوڑا جاتی ہے پر یہ سڑک سیدھی نہ تھی، بل کھاتی، لہراتی، بلند ہوتی، اٹھتی جاتی تھی۔۔۔ اور جب ہم اس کی آخری بلندی پر پہنچے تب وہ گاؤں ہمیں ایک نشیب میں نظر آیا جو ایک سرخ پرندے کی مانند چٹانوں کے درمیان سرخی میں ڈوبا اپنے سرخ پر سمیٹے ہوئے آرام کر رہا تھا۔
وہ جو آخری کوہستانی بلندی تھی اس پر جب ہم سرفراز ہوئے تب حیرتوں کا کچھ شمار نہ ہوا کہ بہت گہرائی میں دھندلے موسموں میں ملفوف ایک شہر کے درو بام دکھائی دینے لگے ۔۔۔
اور یہ کھیوڑا شہر تھا

ایک نمک جہان اندر
مستنصر حسین تارڑ
Posted Date : 18/03/2015
ایک مختصر کھلونا ٹرین کھڑکھڑاتی، جُھولتی ایک تاریک غار کے گھپ اندھیر وں میں دفن ہوتی چلی جاتی تھی۔۔۔ ٹرین کے ماتھے پر ایک روشنی آویزاں تھی جو ڈرائیور صاحب کی رہنما ہوتی تھی، غار کی دیواروں میں نصب وقفوں وقفوں سے کچھ روشنیاں بہت مدھم گزرتی جاتی تھیں۔
دنیا کی دوسری بڑی نمک کی کان کے اندر تک سفر بے شک ایک منفرد تجربہ ہوتا ہوگا لیکن میرے لئے یہ ایک ہول تھا، ایک آزمائش تھی، میں اس کے ہیجان سے لطف اندوز ہونے سے قاصر تھا کہ مجھے بند جگہوں کے اندر جانے سے خوف آتا تھا۔ میں تو پہلی بار غار حرا تک پہنچنے والی ایک غار کے اندر نہ جا سکا تھا، میرا وہاں دم گھٹتا تھا، میں تو چین کے چھوٹے کلہ ٹویو کے گاؤں کی بلندی پر وہ غار جسے اصحاب کہف کی غار مقامی لوگ قرار دیتے ہیں اس کے اندر داخل ہو کر گھبراہٹ میں واپس آگیا تھا لیکن یہاں میں مجبورتھا، خود نہ جاتاتھا، یہ بچہ گاڑی لڑکھڑاتی مجھے لئے جاتی تھی۔
اس غار میں اتنی سی گنجائش تھی کہ اس کے فرش پر بچھی آہنی پٹڑی پر ایک بچہ گاڑی چلتی جائے لیکن اس کے باوجود بائیں جانب کچھ سیاح یا تو پیدل اس کے اندر چلے جا رہے تھے اور یاپھر لوٹ رہے تھے اور وہ ٹرین کی کوک سن کر غار کی دیواروں سے لگ کر اپنے آپ کو محفوظ کرتے تھے۔۔۔
اور وہ بیوقوف لوگ تھے،
ان کے ہمراہ چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے۔
اگر یہ نمک کی کان کہیں یورپ اور امریکہ میں ہوتی تو یوں اس کے اندر پیدل جانے کی ہرگزاجازت نہ ہوتی کہ اس میں جان جانے کے امکانات تھے۔ چونکہ یہ پاکستان میں تھی اس لئے اپنی جان گنوانے کے لئے کھلی سرکاری اجازت تھی۔
ویسے تو ہر تاریخی اور دنیامیں شہرت رکھنے والے مقام کے بارے میں سیاحوں کو بیوقوف بنانے کے لئے فرضی داستانیں گھڑی جاتی ہیں اور اس لئے گھڑی جاتی ہیں کہ سیاح حضرات بیوقوف بننا پسند کرتے ہیں اور ان میں ایک داستان اس کھیوڑہ کی نمک کی کان کے بارے میں گھڑی گئی ہے کہ سکندر اعظم کی سپاہ کے گھوڑے باگیں تڑا کر اس سرزمین کے پتھروں کو چاٹنے لگے تھے کہ یہ پتھر نہیں نمک تھا۔ہم کیوں بحث کریں کہ آخر سکندر اعظم کے گھوڑے کوہستانِ نمک میں کہاں چلے آئے۔۔۔ اور ان کے پتھر چاٹنے سے یہ کھلا کہ ادھر نمک کی ایک دنیا نمکین ہوئی جاتی ہے۔ بہرطور یہ ایک سحر انگیز روایت ہے اس پرشک کرکے ایک نمکین رومان کو کیوں غارت کرنا۔
ویسے تو یہ ہماری تاریخی خصلت ہے کہ ہم ہمیشہ حملہ آوروں کے عشق میں مبتلا ہوتے ہیں، اپنوں سے نفرت کرتے ہیں، سکندر نام رکھتے ہیں، پورس سے اجتناب کرتے ہیں، اپنا حسب نسب سکندر اعظم سے ملاتے ہیں، یہ کالاش وادی کے لوگ ہوں، درہ خیبر یا افغانستان کے باسی ہوں سکندر اعظم سے ناتا جوڑتے ہیں تو ایک نمکین رومان کو جو سکندر کے گھوڑوں سے منسوب ہے اسے کیوں غارت کریں۔

سکندر اعظم کے گھوڑوں کے بعدنمک کی یہ کان اکبر اعظم تک چلی آئی کہ اس کے عہد میں مقامی اکابرین نے مغل اعظم کو اطلاع کی کہ ظل الٰہی آپ کے گھوڑے کیا ہوئے، گھوڑے نہ سہی اپنے کچھ ہاتھی ادھر بھجوا دیجئے کہ ہمارا نمک چاٹ سکیں لیکن شاید ہاتھی نمک نہیں چاٹتے، وہ ادھر نہ آئے اور پھر گورے لوگ آگئے۔ داستانیں، رومانی روایتیں اپنی جگہ لیکن یہ وابیات گورے رنگ کے بندر انگریز تھے جنہوں نے باقاعدہ نمک کی اس کان کو دریافت کیا، اس کے اندر غاروں کا ایک جال بچھایا، جدید آلات سے کھدائی کی، سائنسی تحقیق کو بروئے کار لا کرنمک کی اس کان کو ایک حیرت انگیز عجوبے میں بدل دیا۔۔ اور جب لڑکھڑاتی بچہ ٹرین پر ہم اس ہول کے اندرچلے جاتے تھے یہ بھی انگریزوں نے ہی اس نمک خانے کے بھید میں اترنے کے لئے تخلیق کی تھی۔۔۔

ہم نے انگریز کے تخلیق شدہ نظام سے کچھ چھیڑ چھاڑ نہ کی، اسے جوں کا توں رہنے دیا۔۔ اس کے نظام جو قائم ہوئے، ریلوے، نہریں، پٹوار خانے، عدالتی اور معاشی نظام، انصاف کے پیمانے، زمین کی پیمائش، شاہراہیں، تعلیمی ادارے، فوج کی تربیت وغیرہ۔۔ ان سے کچھ چھیڑ نہ کی اور جب انہیں چھیڑا تو انہیں اپنی نالائقی سے برباد کردیا۔

بچہ ٹرین لپکتی، ٹیم اندھیرے میں بھٹکتی چلی جاتی تھی۔

اور ہمارے اوپر سرنگ کی جو چھت سرنگوں تھی اس پر کروڑوں ٹن شفاف نمک کی چٹانوں کا بوجھ تھا، جس کا کچھ اعتبار نہ تھا۔ لیکن اسی لمحے ٹرین کے ڈرائیور نے جو ہماری نظروں سے تو اوجھل تھا، ایک سیٹی بجا دی، بریکیں لگائیں اور ٹرین صد شکر کہ تھم گئی۔ تمام سیاحوں کو درخواست نہیں کی گئی بلکہ حکم دیا گیا کہ نیچے اتر جائیں، مسافر گرتے پڑتے اتر گئے اور یہ ایک کھلا مقام تھا اگرچہ نمک کا تھا۔

یہاں سے ہم پیدل ہو گئے اور ہم بھیڑوں کا چرواہا ایک عمر رسیدہ، کائیاں اور بیوپاری قسم کا سرکاری گائیڈ تھا، مجھے اس کا اسم شریف تو یاد نہیں رہا لیکن کچھ مضائقہ نہیں اگر ا سے اسم شریف ہی کہہ لیا جائے۔ اس نے عمر عزیز کھیوڑے کی کان کی یاترا کرنے والے سیاحوں کو اپنی چرب زبان سے بیوقوف بنانے میں گزاری تھی۔ اس نے فوری طور پر اس نمک کی دنیا کے بارے میں کچھ تاریخی کچھ نیم تاریخی اور کچھ من گھڑت معلومات فر فرِ سنادیں جو اس نے ایک نمک کے طوطے کی مانند رٹ رکھی تھیں۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ ہم نسبتاً ایک کھلے مقام پر آگئے تھے، نمک کی چھت بلند ہو چکی تھی اور دیواریں پرے ہٹ چکی تھیں اور ہمارے قدموں تلے فرش نمک کا تھا۔۔ اور یہ ایسا مقام تھا جو ذرا پُر فضا تھا جہاں سانس آسانی سے آتا تھا کہ ہوا دار تھا، آپ اپنے رخساروں پر کان کی چھت میں پوشیدہ جو روزن تھے ان میں سے اترنے والی خوشگوار ہوا محسوس کرسکتے تھے، اگرچہ یہ ہوا بھی کسی نمکین محبوب کے بدن اسے چھو کر آرہی تھی کہ وہ ہونٹوں کو چھوتی تھی تو نمک عشق کا آپ کے بوسے لیتا تھا۔

کھیوڑا کی کان کا اندرون موسم گرما کی تنور شدت میں بھی ایک نیم خنک خوشگواری کا حامل ہوتا ہے بلکہ شنید ہے کہ ماہ رمضان کے ”مہینے“ میں روزہ دار اس کے اندر آکر اپنے روزے کو نمک سے بہلاتے تھے۔۔۔ روزے کے بہلانے کو غالب یہ نمک اچھا ہے۔

اسم شریف نے ہم بھیڑوں کو پکارا”چلے آئیے، چلے آئیے، آپ کو ایک ایسی مسجد دکھاتے ہیں جو عجوبہ ہے، اس کی تعمیر میں نمک سے تراشیدہ اینٹیں استعمال کی گئی ہیں اورانہیں روشنیاں منور کرتی ہیں جو ان کے آرپار جاتی ہیں۔۔۔ چلے آئیے

نمک عشق کا۔۔۔ تیرے عشق کا

مستنصر حسین تارڑ

Posted Date : 22/03/2015

نمک کی یہ مسجد۔۔۔ بس نمک کی تھی اور۔۔۔ بس نمک کی تھی۔

اس کی تعمیر میں کچھ خوش نمائی نہ تھی۔۔۔ بے شک نمک کی اینٹوں کی ایک کمر تک آتی چار دیواری تھی، فرش نمک کا تھا اور اسے روشن کیا گیا تھا۔۔۔ اسے کسی سرکاری ٹھیکیدار نے تعمیر کیا تھا جس نے بہت سا نمک کھا لیا تھا ۔۔۔ ویسے نمک کی اینٹوں سے دنیا کی دوسری بڑی نمک کی کان کی پنہائیوں میں ذرا سے ذوقِ جمال اور شوقِ کمال سے کیسی کمال کی عجوبہ مسجد تعمیر کی جا سکتی تھی۔ اب یہ جو اسم شریف تھا بار بار سیاحوں کو دھمکیاں دیتا تھا کہ خبردار کسی بھی لمحے لوڈشیڈنگ ہو سکتی ہے، کان کے اندر جتنی روشنیاں ہیں وہ گل ہو جائیں گی اور یہ کان تاریکی میں ڈوب جائے گی۔ آپ نمک کے اندھیروں میں بھٹکتے پھریں گے، ٹامک ٹوئیاں مارتے پھریں گے اور عین ممکن ہے کہ آپ اس کے اندر جو نمکین تالاب ہیں اُن میں جاگریں۔۔۔ اگرچہ آپ اُن میں ڈوبیں گے نہیں کہ بحیرۂ مردار کی مانند اُن کے پانی

نمکین ہیں لیکن ۔۔۔تو ذرا جلدی سے میرے پیچھے پیچھے چلے آئیے میں آپ کو مینار پاکستان دکھاؤں گا۔
اب یہ جو مبینہ طور پر نمک کی اینٹوں سے تعمیر کردہ مینار پاکستان تھا اور اسے بھی روشن کیا گیا تھا یہ مینار پاکستان تو کم لگتا تھا شو مہاراج کا مظہر زیادہ لگتا تھا۔
بے شک وہ مسجد اور یہ مینار نہایت معمولی شکل کے تھے۔ یہ محض عقیدے اور حب الوطنی کے مظاہر تھے لیکن وہاں حیرت اور تعجب کے آنکھوں میں نمک عشق کا بھرنے والے کچھ عجوبے بھی تھے۔
کان کی چھت میں سے بولے بولے، قطرہ قطرہ رستا نمک پانی جو منجمد ہو کر عجیب جادوئی شکلیں اختیار کر رہا تھا، نمک کے شفاف ستون معلق تھے۔ اُن کی بنیادیں ایسی تھیں کہ کبھی دیکھی نہ تھیں، گویا وہ کسی جادو نگری کے سفید سراب تھے۔
اور وہاں جب ہم چلتے جاتے تھے اور نمک پر چلتے جاتے تھے اور محسوس ہوتا تھا کہ ہمارے جوگر بھی نمک کے ہو رہے ہیں اور اُن میں بندھے ہوئے ہمارے پاؤں بھی نمک میں ڈھلتے جاتے ہیں اور پاؤں میں سرایت کرتے جو نمکین ذائقے تھے وہ پورے بدن میں گھلتے لبوں تک آتے تھے اور وہ بھی نمکین ہوتے جاتے تھے۔
نمک عشق کا چکھتے تھے۔ وہ جو بائیں جانب نمک کی اس دنیا میں پوشیدہ اور گھرا ہوا ایک تالاب ذرا نشیب میں نظرآیا، نیم تاریکی میں نمک کی دیواروں میں گھرا ایک ایسا تالاب نظر آیا جس کی دید سے میرا دم رکنے کو آ گیا۔ اُس کے نمک پانیوں نے مجھ پر ایک نمکین سحر طاری کر کے میرے بدن کو بھی نمک کر دیا، میں حنوط ہو گیا۔ یہ کیسی جادوگری تھی نمک بھری جو مجھے تسخیر کرتی تھی۔ ذرا گہرائی میں وہ نمک پانیوں کے تالاب جن پر جھانکتے سیاحوں کی حیرت بھری سرگوشیاں اُن پانیوں کی سطح پر بھٹکتی پھرتیں، اُن کے اندر حلول نہ ہوتیں اور نہ اُن میں ڈوب جاتیں کہ پانی نمک سے بوجھل تھے، اُن میں ڈوب جانا بہت مشکل تھا۔
اور ایسے متعدد تالاب تھے، نمک کی دیواروں سے رستے اور ٹپکتے پانیوں کے خاموش نمک کے ایک جہان اندر غرق نیم تاریک تالاب۔
ان کے نمک سے بوجھل پانی ایک عمیق سکوت میں گم تھے۔ آس پاس بہت قربت میں کہ ہاتھ بڑھاؤ تو نمک کی دیوار چھولو۔ ہمیں محسوس ہوتا تھا کہ اگر یہاں تادیر ٹھہرے تو ہم بھی نمک ہو جائیں گے ایسا لگتا تھا۔۔۔
شاید یہ وہی دیواریں تھیں جن سے باتیں کرنا اچھا لگتا تھا، ہم بھی پاگل ہو جائیں گے ایسا لگتا تھا۔ کچھ سیانے سیاح اپنے ہمراہ ٹارچیں لے کر آئے تھے وہ اُنہیں روشن کر کے اُن کی روشنی دیواروں پر ثبت کرتے تو وہ دمکنے لگتیں، نمک کا ایک ایک ذرہ سبز، نیلے اور سفید رنگ کا ایک ہیرا ہونے لگتا۔
میرے پاس تو کوئی ٹارچ نہ تھی تو میں کیا جلاتا۔
تو نور جہاں نے مدھم سروں میں مجھ سے بات کی، 'دل کا دیا جلایا میں نے دل کا دِیا جلایا'۔۔۔
تو جب دل کا دیا جلایا تو یادوں کے کئی چراغ جل اٹھے اور نمک کی دیواریں ماضی کے منظروں اور چہروں سے دمک اٹھیں۔۔۔ اور سب کے سب منظر نمک کے اور وہ چہرے بھی شفاف نمک سے تراشیدہ۔ اور تب اسم شریف نے ایک ناہموار لیکن شفاف دیوار پر ہاتھ رکھ کر ڈرامائی انداز میں کہا "یہ محبت کی دیوار ہے، خواہشوں کی دیوار ہے۔۔۔ نمک محبت اور خواہشوں کا۔۔۔
یعنی گلزار نے سچ کہا تھا کہ نمک عشق تھا۔
"آپ اس دیوار پر ہاتھ رکھ کر جو بھی خواہش کریں گے وہ پوری ہو گی، جس محبت کا نام لے کر اسے چھوئیں گے وہ حاصل ہو جائے گی" ۔اسم شریف اگرچہ سیاحوں کو راغب کرنے کے لیے ایک جھوٹ کا جال پھیلا رہا تھا لیکن ہر سیاح بخوشی اس جال کا شکار ہو جانا چاہتا تھا۔
مجھے تو اس دیوار کو چھونے کی کچھ حاجت یا چاہت نہ تھی کہ اس عمر میں خواہشیں دم توڑ دیتی ہیں اور محبتیں آخری سانس لینے لگتی ہیں۔
پھر ایک بہت بھولی اور بھری بدن لڑکی نے جو کسی اور ملک کی باشندہ تھی اگرچہ اس کا خمیر اسی دھرتی کے نمک سے اٹھا تھا دیوار پر ہاتھ رکھ کر بیساکھی سے بلند آواز میں کہا "آئی وانٹ یو"
اس نے اپنی چاہت کا نام لے کر اسے رسوا نہ کیا صرف یہ کہا "مجھے تم درکار ہو"۔
ٹور کے اختتام پر ہم نے اسم شریف کو چپکے سے کچھ تھما دیا۔
بچہ ٹرین سیٹیاں بجاتی ہماری منتظر تھی۔
اور حسب خصلت وہ لڑکھڑاتی ، جھولتی، لہراتی، جھومتی چلتی گئی اور ہم یکدم نمک کی غار سے باہر روشنی میں آگئے۔
میں نے ایک گہرا سانس اُس کھلے پن میں آسمان تلے شکر کرتے بھرا کہ بے شک وہ نمکین تھیں پر تاریکیاں تھیں اور ہم باہر آ گئے تھے۔
ہم نے نمک سے تراشیدہ کچھ لیمپ خریدے اور ہمیں معلوم نہ تھا کہ اگر آپ اُنہیں کہیں سجاتے ہیں تو اُن کا

نمک ہوا میں موجود نمی کو چوستا ہے اور پھر اُسے خارج کرتا ہے۔
پنڈ دادن خان کے شہر کی روشنیوں سے ذرا اِدھر ہم للہ جنکشن میں داخل ہو کر اپنے لاہور کی جانب روانہ ہو گئے یہ ایک ہی دن تھا۔۔۔ نمک عشق کا! تیرے عشق

(سفر سندھ ساگر کے۔۔۔(1
مستنصر حسین تارڑ
Posted Date : 25/03/2015
میں آیا مُکھ ویکھن۔۔۔ میں آیا مُکھ ویکھن
میں اس عمر کے زوال میں جبکہ دیئے کی لو مدھم پڑتی جاتی ہے، اور کیا بھروسہ دم کا، دم آوے نہ آوے تو اس دم وہ کون سا محبوب ہے جس کی چاہت سے میرا سینہ روشن ہے اور یہ میں نے کس محبوب کی اُلفت میں ایسا دیا جلایا ہے جس کی روشنائی زمینوں کے اندر جا رہی تھی، میں کس کا مُکھڑا دیکھنے کی خاطر اس خزاں رسیدہ بدن کے ساتھ دربدر ہونے کو نکلا ہوں، وہ کون سی چوکھٹ ہے جس پر سجدہ ریز ہونے کے لئے یہ چراغ آخر شب اپنی مدھم پڑتی لو سے فریاد کرتا ہے کہ مجھے کچھ مہلت عطا کر دے۔۔۔ بھڑک کر ابھی نہ بجھ جانا کہ میں نے ابھی سندھ سائیں کا مکھڑا دیکھنا ہے۔۔۔
میں تو ہوں اسرار، سکھی ری، تو کیا جانے بھید
میں نے ابھی اُس اسرار کے اندر سفر کرنا ہے۔۔۔ اُس بھید کو جاننا ہے جو پوشیدہ ہے سچل، بھٹائی اور عثمان مروندی کے نیلو نیل ابدی گروندوں میں۔۔۔ موہنجوداڑو کی نرتکی کی باہوں میں سجے سفید کنگنوں میں ،عظیم پروہت کے کاندھے پر ڈھلکتی اجرک کے گل بوٹوں میں، اُس شہر ہے مثال کے ڈھے چکے درودیوار کی ہر بُھرتی ہوئی اینٹ میں جو سویر کی کرنوں میں مزید سرخ ہوتی ہے اور غروب کے سمے اُس میں شفق کی سُرخی جذب ہو کر اُس اینٹ کو اِک گزر چکے زمانے کی اِک تصویر کرتی ہے۔۔۔ تو اے دم ابھی ٹھہر جا۔۔۔ ابھی تو میں نے مہرانو کے اپنی قدامت میں سیاہ ہوتے جنگلوں میں اترنا ہے، اُس کے بھیتر میں جو ہزاروں ہرن غروب آفتاب پر چوکڑیاں بھرتے ہیں اُن میں سے کسی ایک کو سورج کی آخری زرد شعاعوں میں ایک سنہری غزال کی صورت دیکھنی ہے۔ شام ڈھلے، جنگلوں میں سے جو صدائیں آتی ہیں اُن کو کانوں میں اتارنا ہے اور اُن سیاہ ہوتے گھنے جنگلوں میں گھری جو ایک جھیل ہے اُس کے پانیوں پر پھڑپھڑاتی، چھینٹے اُڑاتی، ڈبکیاں لگاتی، غُل کرتی ہزاروں مرغابیوں اور دور کے دیسوں سے آنے والے انمول اور آن دیکھے پرندوں کو دیکھنا ہے۔۔۔ اور اُن مرغابیوں میں شاید وہ چار مرغابیاں بھی اپنے پنکھ پھیلائے شام کی سیاہی میں سیاہ ہوتے پانیوں کی سطح پر اِتراتی، راج ہنسوں کی مانند تیرتی ہوں جن کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔۔۔ اور ابھی مجھے تھر کے صحراؤں میں ایک عمر رسیدہ غزال کی مانند بھٹکنا ہے، اس کی ریت پر اپنے نقش قدم ثبت کرنے ہیں تاکہ آنے والے وقتوں کے لوگ جان جائیں کہ کبھی کوئی آبلہ پا اس وادئ پُرخار میں آیا تھا۔۔۔ اور اگر کوئی بھی نشاں باقی نہ رہے، میرے سب نشاں مٹ جائیں تو بھی ننگرپارکر سے پارکاسبو کے قصبے میں وہ ایک مور جو ایک شجر کی ٹُنڈ منڈ ڈال پر بیٹھا تھا اور مجھے دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا اور اُس نے اپنے پَر پھیلا کر فضائے بسیوا میں یوں اڑان کی تھی کہ وہ صحرا کی تیز دھوپ میں رنگوں کے ایک الاؤ کی صورت بھڑکتا، شِو مہاراج کے ایک مندر کی چھاؤں میں یوں اتر گیا تھا کہ جہاں جہاں سے وہ گزرا تھا وہاں اُس کے نشیلے، چمکیلے رنگ ہوا میں تصویر ہو گئے تھے۔۔۔ تو کم از کم اُس مور کی آنکھوں میں تو میرا نقش میرا نشاں ٹھہر گیا ہو گا۔۔۔ وہ مور آئندہ زمانوں میں یہ گواہی دے گا کہ کبھی ایک آبلہ پا یہاں سے گزرا تھا۔
تو اے چراغ آخر شب ابھی کچھ دیر ٹھہر۔۔۔ اپنی لو کونہ بھجنے دے کہ میں نے ابھی اپنے محبوب کا مکھ دیکھنا ہے۔۔۔
رگ وید، اس دھرتی کی رگوں میں دوڑتے دریا کی یوں شان بیان کرتی ہے۔
اے سندھو، تو اپنی روانی میں آگے ہی آگے چلا جاتا ہے، خوشحالی کے دیوتا نے دھرتی پر تیری روانی ” طے کردی“
سندھ، گھوڑوں کی دولت سے مالا مال ہے،”
یہاں زرق برق پوشاکوں کی فراوانی ہے، اس کے گلی کوچوں میں رتھیں شاندار دوڑتی ہیں۔”
بہت زمانے خش و خاشاک ہوئے جب میں پہلی بار اپنے بیٹے سلجوق کے ہمراہ، دل میں ایک ہول لئے،

کسی حد تک خوفزدہ، شمال کے پہلے سفر پر نکلا۔۔ ہنزہ کی وادی کے قصے کہانیاں اور داستانیں مجھے اسیر کر چکے تھے اور میں اس وادی کے طلسم میں گرفتار ایک انجانے سفرپر نکلا۔۔ اور جب شام کے اندھیارے میں راولپنڈی سے سفر کا آغاز کرکے مانسہرہ، شنکیاری، بٹ گرام کی بستیوں میں سے گزرتا میں اس شام تھاکوٹ نام کے ایک قصبے میں داخل ہوا تو۔۔
وہ شام ایک دبے پاؤں کی سرمئی بلی کی صورت میں اترتی تھی اور میں تھکاوٹ سے لاچار ہوا جاتا تھا جب میرے کانوں میں ایک مدھم گونج اترنے لگی۔۔ اور اس گونج میں ایک آبی ترنم تھا، جیسے پانیوں کے سازوں سے ایک گیت جنم لے رہا ہو۔۔ اس گونج میں جہاں ایک ڈر پوشیدہ تھا وہاں اس کی نغمگی میں ایک بلاوا بھی تھا کہ چلے آؤ میں تمہاری منتظر ہوں۔ (جاری ہے)

سفر سندھ ساگر کے۔۔ (2)
مستنصر حسین تارڑ
Posted Date : 29/03/2015
ہم تھاکوٹ کے قصبے میں سے گزر کر جب ذرا قریب ہوئے تو گونج کی صدابلند ہوگئی۔۔ جیسے سانتا صوفیہ کے کلیسا کے عظیم گنبد تھے کوئی صدادے تو وہ صدا گنبد میں گونجنے لگتی ہے، جیسے مسجد قرطبہ میں کوئی اذان دے تو اس کے ستونوں کا ہجوم نخیل گونجنے لگتا ہے اور یہ سندھ کے پانیوں کا بلاوا تھا جو گونجتا مجھے بلاتا تھا، ہم تھاکوٹ کے اب متروک ہو چکے قدیم پل پر سے گزرے تو ان کے نیچے شیر دریا کے پانی بہتے شور کرتے تھے۔
ہم گئی رات بشام کے پی ٹی ڈی سی ہوٹل میں پہنچے تو اس شب سندھ نے ہمیں سونے نہ دیا۔
طالع بیدار نے ۔۔ میں نے یار کو، مجھے یار نے سونے نہ دیا۔
اور اگلی سویر میں نے ہوٹل کے کمرہ نمبر 24 کی بالکونی سے پہلی بار دریائے سندھ کو نشیب میں ایک سلیٹی چادر کی صورت میں جو کروٹیں بدلتی تھی، پہلی بار دیکھا، اور اس کے بہاؤ میں اگرچہ ایک مدھم گونج تھی ہر وہ ایسے بہتا تھا کہ اسے اس کے پانیوں پر تادیر آنکھیں رکھتے تو وہ اس کے آبی طلسم میں گرفتاراس کے پانیوں سے لبریز ہو کر اس منظر کی حیرت میں آبدیدہ ہو جاتی تھیں، شیر دریا سندھ کے ساتھ یہ میری پہلی ملاقات تھی۔
آتش عشق یہیں شاہراہ قراقرم کے آغاز میں بشام میں، پی ٹی ڈی سی ہوٹل کے کمرہ نمبر 24 کی بالکونی میں یوں بھڑکی کہ ابھی تک وہ ایک الاؤ کی صورت میرے تن بدن میں یوں روشن ہے کہ اس کی چنگاریاں میری ہر تحریر پر گرتی اس میں چھید کرکے مجھے مسلسل اسیر کرتی ہیں۔
دریائے سندھ کو میں نے سو روپ میں دیکھا۔
درجنوں بار بشام کی کسی شام میں، اور ہر بار اس کا روپ الگ تھا۔
شاہراہ قراقرم کی بلندیوں پر سفر کرتے ، سکردو روڈ کی ہولناکیوں تلے چٹانوں میں گھرے شور کرتے اور کبھی سکردو کی نیم صحرائی لینڈ سکیپ میں اطمینان سے افق تک پھیلے ہوئے اور کبھی خپلو کی جانب سفر کرتے، اس کے پانیوں میں دریائے شیوک کے پانیوں میں شامل ہوتے اور پھر مجھ سے بچھڑ کر اپنی جائے پیدائش لداخ کی ایک چٹان کی جانب پلٹتے اور اس چٹان کا مہرہ ایک شیر جیسا ہے اور اس کے پانی وہاں سے جنم لیتے ہیں اس لیے یہ شیر دریا کہلایا۔
اور پھر میں نے ایک قدیم کشتی میں اس کے پانیوں پر کچھ دن اور کچھ راتیں گزاریں۔۔ ایسی راتیں جن میں آسمان ایک دوشیزہ کے دوپٹے کی مانند مکیش کے تاروں سے مزین ہوتاتھا۔۔ ستاروں سے سجا ہوتا تھا اور وہ جو دن تھا ان میں کہیں ریتلے ٹاپوؤں پر سُرخاب اترتے تھے اور کبھی اس کے پانیوں میں سے نابینا ڈولفن ظاہر ہوتی تھیں اور ڈوب جاتی تھیں، میرا ناول ”قربت مرگ میں محبت“ وہی سندھ مسافتوں کا ایک بیان ہے۔
سندھ کے ساتھ میری یاریاں پرانیاں ہیں
اور سندھ کے ساتھ سچل، بھٹائی، شہباز قلندر کے علاوہ دنیا بھر میں جتنے بھی سچے لوگ ہیں، قلندراور سرمست میں ان کی یاریاں مجھ سے بھی پرانیاں ہیں۔
بایزید بسطامی کہتے ہیں
“میرے لبادے میں خدا ہے، میں ساقی ہوں، میں ہی پیالہ ہوں اور میں ہی مشروب ہوں”
حضرت سید عثمان لعل شہباز قلندر کا شعر ہے کہ:
”من آں درم کے در بحر اللہ بودستم
بہ کوہ طور با موسیٰ کلیم اللہ بود ستم

"میرے ایک مرشد، منطق الطیروالے فرید الدین عطار ارشاد فرماتے ہیں ”من خدایم، من خدا
اور پھر ہو علی قلندر اپنی سرمستی میں پکارتے ہیں کہ
نماز مے گزارم در خرابات، رکوعے، فی سجودے، فی قیامے" میں بایزید بسطامی، شہباز قلندر، فرید الدین ”
عطار کے ان اشعار کا اردو میں ترجمہ کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔۔
سندھ کے یہ صوفی شاعر جہاں مولانا روم کو مرشد مانتے ہیں وہاں ابن العربی کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔
ابن العربی جن کی جائے پیدائش اندلس کے قصبے مرسید میں کبھی میں بھی تھا اور وہ کہتے ہیں
آج سے پہلے میرا حال یہ تھا کہ جو بھی آدمی میرے دین کو نہیں مانتا تھا، میں اس کا انکار کرتاتھا، اسے ”
غیر سمجھتا تھا۔
لیکن رب میرا دل ہر صورت کو قبول کرلیتا ہے
میرا دل ہرنوں کی چراگاہ ہے۔۔
عیسائی راہبوں کا عبادت خانہ ہے
آتش پرستوں کا آتش کدہ ہے
حاجیوں کا کعبہ، توریت کی الواح، قرآن کا صحیفہ ہے
عشق کا قافلہ مجھے جہاں چاہے لے جائے۔۔
میرا دین بھی عشق اور ایمان بھی عشق ہے
تو سنبھلنے دے اسے ناامیدی کیا قیامت ہے، اسے دم آخر ذرا سنبھل۔۔ کچھ مہلت دے کہ میں سندھ کا
مکھ دیکھ لوں۔
ختم ہوئے دُکھ یار سچل کے۔۔ گھونگھٹ کھولنا، ہنس ہنس بولنا۔ ’
ذرا اپنے محبوب کا گھونگھٹ کھول لوں، ہنس ہنس بول لوں، اس کا مکھ دیکھ لوں۔۔
(بس اتنی سی مہلت درکار ہے، پھر اے چراغ سحری بے شک تاریک ہو جانا ۔ (ختم شد

(خیر پور کا مہرانوں جنگل۔۔ (1
Posted Date : 01/04/2015
مستنصر حسین تارڑ
"مہرانوں؟ وہ کیا ہے سائیں۔۔’
اور مہرانوں وہ تھا جس کی مجھے بقول شخص تبریز خبر نہ تھی، مجھے کیا پورے پاکستان میں کسی کو
بھی نہ تھی۔
ہم نے فیض محل کو اس کی گزر چکے زمانوں کی عظمت کی دُھول میں آخری سانس لیتی چھوڑا جہاں
دربار ہال میں میروں، نظاموں، نوابوں اور انگریزوں کی روحیں بھٹکتی تھیں اور آج کے خیرپور میں سانس لیتے
مہرانوں کی جانب سفر کرنے لگے۔ راستے میں شاہراہ سے ذرا فاصلے پر میروں کے ایک اور پرانے محل کے
آثار اتنے دلکش تھے کہ جی یہی چاہا کہ اس میں مقیم روحوں سے بھی ملاقات کرلی جائے پر دوپہر ڈھل
رہی تھی اور سٹیئرنگ حسب معمول دیدہ دل کے ہاتھوں میں تھا تو نہ رک سکے۔۔
کبھی ویران راستوں پر دُھول اڑاتی اور کبھی سرسبز کھیتوں کی ہر بالی کو چیرتی دیدہ دل کی پراڈو تھی
جو چلی جاتی تھی۔۔
کھیتوں کے پار ان کے گھنے کچور سبزے میں سے اٹھتی ایک کچی فصیل تھی جس میں ایک لکڑی کا عظیم
پھاٹک نصب تھا، جو بند تھا، پر میر ظہیر عباس کے ذرا سے اشارے پر وہ سم سم کھل گیا اور ہم ایک اور
طلسم کدے میں داخل ہوگئے۔۔ گھنے جنگلوں میں داخل ہوگئے۔۔ جہاں ابھی سے شام ہوتی تھی، سروٹوں
جھاڑیوں، آپس میں گتھے ہوئے شجروں اور جانے کب سے اگتی ہوئی قدِ آدم گھاس میں شام ہوتی تھی اور
اس گھناوٹ کے اندر انجانے پرند کوُ کتے تھے، جانوروں کی عجب بولیاں تھیں، سانپوں کی سرسراہٹ تھی۔۔
جیسے اُندلس کے ویرانوں میں ایک شب ثوریا کا گمنام قصبہ نظر آیا تھا اور میں اس میں داخل ہوا تو اس
شب بالکونیوں سے چشم غزال والی اُندلسی حسینائیں ٹونی اور مجھ پر تاک تاک کر اپنے ڈورے ڈالتی تھیں
اور ہم ان میں بندھے جاتے تھے تویوں جانیے کہ مہرانوں میں بھی ایک ایسا ثوریا پنہاں تھا جس کے قدیم
شجر اور ان میں کُوکتے پکھیرواور جانوروں کی آوازیں اور زمین پر رینگنے والے حشرات کی سرسراہٹ، مجھ پر
ڈورے ڈالتی تھی۔
واقعی یہ مہرانوں وہ تھا، جس کی مجھے خبر نہ تھی۔ میروں کی ملکیت ایک وسیع کئی کلومیٹر پر محیط
مہرانوں ایک ایسا جہان تھا جسے تقریباً پچاس برس پیشتر میر علی مراد دوئم نے ایک کچی چار دیواری کے

اندر محفوظ کرلیا۔۔ وہ جو 1790ء سے ایک شکار گاہ تھی جسے میر علی مراد اول نے بنوایا وہاں جانوروں اور پرندوں کا شکار ممنوع قرار دے کر اسے پکھیروؤں اور جنگلی جانوروں کے لئے ایک پناہ گاہ قرار دے دیا گیا۔
سینکڑوں برسوں سے اس جنگل کے کسی شجر کو کاٹا نہیں گیا، خود روگھاس کو بھی اگنے دیا گیا یہاں تک کہ اس گھنے جنگل کے بھید کے اندر جو جنگلی حیات ہے اسے آپ شوٹ کر سکتے ہیں لیکن ذرا پوشیدہ ہو کر ایک کیمرے کے ساتھ! جب ہم مہرانوں کے دل کے اندر ایک کچے راستے پر چلے جاتے تھے اور ہمیں شرمندگی ہوتی تھی کہ ہم تو مُخل ہو رہے ہیں تو میرا دل اس میر کے لئے شکرگزاری سے بھر گیا۔۔
ایک وہ میر تقی میر تھا جس کی شاعری میں دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا تھا، یہ دھواں کہاں سے اٹھتا ہے۔۔ اور ناز کی اس کے لب کی کیا کہیے ، پنکھڑی اِک گلاب کی سی ہے۔۔ کے علاوہ وہ شعر بھی تو کہا تھا جس میں عقیدے اور مذہب کی تمام گتھیاں سلجھا دی تھیں جو بڑے بڑے فلسفیوں اور دانائے روز لوگوں سے نہ سلجھ سکیں۔۔ یہ تو اہم کا کارخانہ ہے۔۔ یاں وہی ہے جس کا اعتبار کیا۔۔تو اس میر کے بعد یہ وہ میر تھا جس نے مہرانوں کو میرے لئے محفوظ کیا تو اس کے لئے میرا دل شکرگزاری سے بھر گیا۔
یاد رہے کہ میر حضرات شکار کے بے حد شوقین تھے بلکہ میر غلام شبیر تالپور کے بقول ان کے آباؤاجداد ان خطّوں کی ویرانی میں صرف اس لئے آباد ہوئے کہ یہاں شکار کی بہتات تھی، آنکھیں بند کرکے بھی بندوق چلاتے تھے تو کوئی نہ کوئی غزال شکار ہو جاتا تھا۔۔ تو پھر کوئی میر تھا ، میر علی مراد تھا جس نے بہت پرند اور جانور ہلاک کئے اور پھر شاید اس نے کسی مرتی ہوئی ہرنی کی آنکھوں میں ایک آخری آنسو دیکھا۔۔ کسی پرندے کی رنگین آنکھ میں موت کی سیاہی اترتی دیکھی تو اس کا دل بھر آیا اوراس نے فیصلہ کیا کہ نہیں۔
میں اس ویرانے میں کسی قلانچیں بھرتے ہرن کی آنکھوں میں آنسو نہ دیکھوں گا۔
کسی پرندے کی مرگ پھڑپھڑاہٹ نہ سنوں گا۔ وہ جو سروٹوں میں بسیرا کرنے والے تیتروں کے غول اٹھتے ہیں تو انہیں کبھی بے بال و پر نہیں کروں گا۔
اس ویرانے میں جو پانی کے خاموش جزیرے ہیں ان میں اترنے والی ہزاروں مرغابیوں اور رنگ رنگ کے پرندوں کو ہلاک نہیں کروں گا۔
یہاں تک کہ سانپوں کو بھی رینگنے دوں گا۔۔
سؤروں کو بھی گزند نہیں پہنچاؤں گا۔۔
میں ان میر صاحب کی بخشش کے لئے دعا کرتا ہوں اگرچہ مہرانوں کی محفوظ پناہ گاہ میں جتنے بھی ہرن چوکڑیاں بھرتے ہیں وہ بھی ان کے لئے دعا کرتے ہوں گے یہاں تک کہ سور بھی اس شخص کے شکرگزار ہوتے ہوں گے جس کے مذہب میں وہ حرام ہیں، مجھے یقین ہے کہ وہ ایک ایسی جنت میں ہوں گے جہاں ان کے چاروں جانب غزال قلانچیں بھرتے ہوں گے اور خوش رنگ طیّور چہکتے ہوں گے۔
سورج کی زرد کرنیں قربت مرگ میں نڈھال ہو کر تاریکی میں اترنے والی تھیں جب ہم جنگل سے ایک کھلے ویرانے میں آنکلے اور یہ ہرنوں کی ایک سلطنت خداداد تھی۔۔ اور میرداد بھی تھی۔
درجنوں، سینکڑوں نہیں ہزاروں کی تعداد میں بلیک بک اور چتکبرے ہرن ڈوبتے سورج کی زردی میں زرد ہوتے تھے۔ کچھ تو یونہی چہل قدمی کرتے تھے، کچھ بیکار کھڑے تھوتھیاں اٹھائے سونگھتے کھڑے تھے اور چند ایک چھیل چھبیلے، نوخیز البیلے ہرن جوانی کے خمار میں بے وجہ قلانچیں بھرتے بدتمیز ہوتے جا رہے تھے۔
(جاری ہے)

خیر پور کا مہرانوں جنگل
Posted Date : 05/04/2015
مستنصر حسین تارڑ
عجب منظر تھا۔
یہ انہیں شام سے پہلے کی خوراک کھلانے کا وقت تھا۔۔ مہرانوں کے رکھوالے پتھر کے کونڈوں میں ان کا چارا انڈیل کر انہیں ”ہوہو“ کرتے متوجہ کرتے تھے، بلند آواز میں پکارتے تھے اور وہ ہماری موجودگی سے ٹھٹکتے، کبھی اکا دکا اور کبھی غول کے غول چلے آتے تھے۔
وہ بہت شوخ اور چنچل ہرن تھے، ان کے نخرے بہت تھے کہ انہیں اطمینان تھا کہ ہم محفوظ ہیں، ہم کبھی شکار نہ ہوں گے۔
وہاں اتنے ہرن تھے ڈوبتے سورج کی زردی میں ڈوبتے کہ وہ ایک تکلا مکان صحراکو بھی بھر سکتے تھے۔
سنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
سو اس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں
یہ بات ہے تو چلو بات کرکے دیکھتے ہیں
سنا ہے حشر ہیں اس کی غزل سی آنکھیں
سنا ہے ہرن دشت بھر کے دیکھتے ہیں
عین ممکن ہے کہ میرا دوست فراز کبھی مہرانوں کے اس دشت میں آیا ہو اور اس نے میری طرح سرشام ہرنوں کو اس دشت کو بھرتے دیکھ کر یہ شعر کہا ہو۔۔ اگر نہیں آیا تو کیسے جان گیا کہ ہرن ایک دشت بھر سکتے ہیں۔
شام ہونے کو تھی اور وہ سب ہزاروں ہرن” غزالِ شب“ ہونے کو تھے۔
اے غزالِ شب
تیری پیاس کیسے بجھاؤں میں
ہم بت بنے کھڑے تھے اور ہماری آنکھوں میں زرد ہوتے بے شمار ہرن تصویر ہوتے تھے۔ اورتب ان میں سے ایک ہرن نے اگلی ٹانگیں سمٹ کر یوں فضا میں ایک زقند بھری کہ وہ میری آنکھوں میں ٹھہر گیا، نقش ہوگیا۔۔ ایک تصویر ہوگیا۔۔ اس کی چاروں ٹانگیں اس کے پیٹ کے ساتھ سمٹی ہوئی تھیں اور وہ فضا میں معلق تھا۔۔ دھوپ کی زردی میں وہ زرد تھا، ایک دیوتا لگتا تھا۔۔ اور مجھے وہ کچھ شناسا لگا۔۔ اس کی صورت پہچان میں آتی تھی۔
شاید وہ میری چاہتوں اور محبتوں کی ایک مصور اور ساکت شکل تھا۔۔
وہ ایک زرد رنگت کا غزال تھا
یا شاید ایک گونج تھا
بہرطور وہ شناسا لگتا تھا، پہچان میں آتاتھا۔
اس حسنِ بیمار کی زردی میں ”ڈھلا وہ ایک ہرن، فضا میں ایک پل کے لئے ساکت ہوا اور پھر زمین پر اتر کر ڈھلتی شب کی زردی میں مزید زرد ہوگیا۔۔
دل وہ بے مہر کہ رونے کے بہانے ڈھونڈے
تو کیا یہ مہرانوں تھا جس نے دل کو بے مہر کیا
یہ مہرانوں تھا جس کی مجھے خبرنہ تھی، میں نے زندگی بھر ایسے پیارے اور سویٹ سوّر تو نہ دیکھے تھے۔
ہمارے ہاں تو کسان لوگ ان کا نام بھی نہ لیتے تھے کہ یوں زبان پلید ہو جاتی تھی اور انہیں ”باہر والے“ پکارتے تھے۔
پریہ جو سوّر تھے، یہ بہت ہی سوّر تھے۔۔
اگر ہم ان سوّروں کے روبہ رو نہ تھے
ایک پوشیدگی میں ان پر نظر رکھتے تھے
ان جنگلوں میں سفر کرتے ہم اپنی پراڈو سے اتر کر ایک مچان پرچلے گئے تھے جہاں ایک مختصر کچے کمرے میں ٹاٹ کا ایک پردہ تنا تھا جس میں چوکور سوراخ وضع کیے گئے تھے اور ہم ان میں سے جھانکتے، ذرا نشیب میں ٹہلتے، اپنی تھوتھنیاں اٹھائے سوّروں کے ایک ریوڑ کا نظارہ کرتے تھے۔۔
بے شک سوّر تھے پر اتنے سوّر نہ تھے کہ ان کو دیکھنا بھی حرام ٹھہرے
پیارے سوّر تھے۔
ان کی دیکھ بھال کرنے والا رکھوالا انہیں ایک خاص انداز میں پکارنے لگا جیسے اپنے بچوں کو پکارتے ہیں تو وہ سوّر حضرات اس کی پکار پر لبیک کہتے کشاں کشاں چلے آئے۔
اُن سروٹوں کے اندر کچھ کچی سیڑھیاں تھیں جو ایک غار کے اندر جاتی تھیں اور ان کے اندر ایک کچا کمرہ پوشیدہ تھا۔ یہاں بھی ایک ٹاٹ کا پردہ تنا ہوا تھا جس میں وہی چوکور سوراخ روزن تھے اور ہم سب نہایت اشتیاق سے لکڑی کے بنچوں پر براجمان ہوئے اور اپنی آنکھیں ان چوکھٹوں پر نصب کر دیں۔۔ جیسے بچپن میں ایک موہوم سی یاد ہے کہ ایک شخص کاندھے پر ٹین سے بنا ہوا ایک عجیب شکل کا ڈبہ اٹھائے ہوئے آتا تھا اور ایک گھنٹی بجا کر محلے کے بچوں کو خبر کرتا تھا کہ آؤ۔۔ بارہ من کی دھوبن دیکھو، آگرے کا تاج محل دیکھو صرف ایک آنے میں۔۔ تو ہم اُس ٹین کے ڈبے کے ساتھ اپنی آنکھیں جما کر اُس کے اندر جھانکتے تھے، تو ایسے ہی ہم نے ٹاٹ کے اُن روزنوں پر اپنی آنکھیں رکھیں اور دیکھا۔۔ اُن میں جھانکا۔
اور یکدم ایک چہکار ایک پکار، بے انت پکھیروؤں کے غُل کا شور سنائی دیا۔۔ پرندوں کی ملی جلی آوازوں کا ایک حشر برپا تھا۔ اور یاد رہے کہ میں تو ایک کان سے مکمل طور پر بہرا ہو چکا تھا تو اگر مجھے اتنا شوروغل، چہکنے، کوکنے اور گیت گانے کا سنائی دے رہا تھا تو جن کے دونوں کان سننے والے ہوں تو انہیں کیاسنائی

دیتا ہو گا۔
وہاں ٹاٹ کی اس کھڑکی کے پار۔۔۔ ایک جھیل تھی، اور اُس کے آس پاس اُسے گھیرے ہوئے سیاہ جنگل تھے جو اُس شب اُسے بھی تاریک کرتے تھے اور اُس کے پانیوں پر ہزاروں مرغابیاں، بطخیں، بھانت بھانت کے پرندے۔۔۔ خوش رنگ پکھیرو تیرتے تھے، پانیوں میں ڈبکی لگا کر روپوش ہو جاتے اور پھر اپنے پَر پھڑپھڑاتے، اُنہیں جھاڑتے اُس تالاب کے پانیوں پر نمودار ہو جاتے۔ کبھی وہ پانیوں کی سطح پر تیرتے چھینٹے اڑاتے غُل کرتے، ایک دوسرے کے ساتھ چونچیں لڑاتے چہلیں کرتے جھیل کی سطح کو بھرتے تھے، جیسے مہرانوں کے برن ایک دشت کو بھرتے تھے۔
اتنے بے انت پرندے تھے۔
یوں محسوس ہوتا تھا جیسے آج تک جتنے بھی پرندے تخلیق ہوئے ہیں، وہ سب کے سب مہرانوں کی اس جھیل پر اتر آئے ہیں۔۔۔ مہرانوں کی شام میں ڈوبتی اس جھیل پر اتر آئے ہیں۔۔۔ وہ بے انت ہی نہیں بے شمار تھے۔ (جاری ہے

"مہرانوں کے جنگل میں جھیل"
مستنصر حسین تارڑ
Posted Date : 08/04/2015
یہ حیرتوں کی بے یقینی سے بھی پرے کا ایک منظر تھا۔۔۔ میں اپنے سفرناموں میں کبھی کبھار، کبھی فیئری میڈو کی سویر میں زرد رنگ میں رنگ جیسے اس نے بسنت کی آمد پر ایک پیلی اوڑھنی میں اپنے آپ کو ڈھانک لیا ہو۔ نانگا پربت کے اس روپ کی حیرت میں حیران ہو کر اظہار کرتا ہوں کہ ایسا منظر میں نے کبھی پہلے نہ دیکھا تھا۔۔۔ اور کبھی سنو لیک کی برفانی جھیل کی برف سطح پر برف میں ضووا تتلیوں کو دیکھ کر اور کبھی صحرائے تکلا مکان ریتلے انباروں کونظر کے سامنے پا کر۔۔۔ کہ ایسا منظر میں نے زندگی بھر کبھی دیکھا تو نہ تھا تو ایسانہیں کہ میں ہر منظر پرمر مٹتا ہوں۔۔۔ نہیں۔۔۔ وہ منظر ہوتا ہی ایسا ہے کہ میں اسے دیکھ کر مٹ جاتا ہوں تو اسی طور ٹاٹ کے پردوں میں سے دکھائی دینے والا یہ منظر تھا جو میں نے کبھی دیکھا نہ تھا۔۔۔ البتہ ایک فرق تھا۔۔۔ وہ سب منظر درجنوں کی تعداد میں خاموش تھے جبکہ یہ منظر چہکتا غل کرتازندہ ہوتاتھا۔
شاید یہ منظر مجھ پر ایک دیوانگی کی صورت اثرانداز اس لئے بھی ہوتاتھا اس ڈھلتی شام میں سرمئی پانیوں پر تیرتے ہوئے اپنے رنگ کھو کر سب سرمئی ہوئے جاتے تھے اور ان میں کچھ پرندے میری تحریروں میں سے نمودار ہو کریہاں اس جھیل میں اتر گئے تھے۔
ان میں یقیناً"راکھ" کی وہ چار مرغیاں بھی تھیں جن کا خوشی سے کوئی تعلق نہ تھا۔۔۔ وہ قادر آباد جھیلوں سے اڑان کرکے ادھر اتر آئی تھیں۔
اور وہاں کہیں پرندوں کے اس غول میں گم ایک "پکھیرو" بھی تو موجود ہوگا۔۔۔ "فاختہ" پانیوں میں کہاں اترتی ہوگی، جھیل کنارے سرکنڈو میں پوشیدہ کُوکتی ہوگی، مگر ہوگی ضرور!
"خش و خاشاک زمانے" کا امیر بخش جو دریائے چناب کے کنارے ایک سدھارتھ کی مانند براجمان ایک پرندے کا روپ دھار گیاتھا۔ شاید اس جھیل پر آ اترا ہو۔۔۔ اور وہ جو فرید الدین عطار کے پرندے تھے جو میری بیشتر تحریروں میں ظاہر ہوتے رہتے تھے شاید انہوں نے سچ کی تلاش میں قاف کے پہاڑوں کی جانب پروازیں کرتے مہرانوں کی اس جھیل کو دیکھ کر اپنا سفر موقوف کردیا ہو کہ اتنی دور کیا جانا، سچ تو یہ سروٹوں میں گھری سحر بھری جھیل ہے تو یہیں ٹھہر جاؤ۔۔۔
یہاں "بہاؤ" کے پہلے باب کو وہ پرندہ بھی تو ہو سکتا ہے جس کے پروں تلے ریت تھی اور وہ اڑان میں تھا اور وہ اس جھیل میں جا گرا تھا جہاں پرندے مرنے کے لئے آجاتے تھے۔۔۔ اگرچہ پا روشنی نے جب اس کے مردہ بدن کو اٹھایا تھا تو وہ مر چکا تھا، پر کیا پتہ پاروشنی نے اسے اپنی بھاری دراوڑی چھاتیوں سے لگالیا ہو اور وہ ان کے الاؤ میں جل کر ایک ققنس کی مانند پھر سے زندہ ہو گیا ہو، مہرانوں چلا آیا ہو۔
مجھے شک ہے کہ وہ سب پرندے جو میری تحریروں میں کُوکتے پھڑپھڑاتے میرے ناولوں کے اوراق کو زندہ کرتے ہیں انہیں بھی الہام ہو گیا تھا کہ جھیل سے ذرا بلندی پر وہ جو ایک پوشیدہ پناہ گاہ ہے جس کے آگے ٹاٹ کا ایک پردہ تنا ہے تو اس کے ایک چوکور روزن میں جو دو بجھتی ہوئی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جن کی پتلیوں کے گرد ایک نیلاہٹ خبر دیتی ہے کہ وہ چوہدری رحمت خان تارڑ کا بیٹا ہے کہ اس کی آنکھوں میں بھی نیلاہٹ کے فسوں تھے۔۔۔ اس شخص کی ہیں جس کی تحریروں میں ہم اڑتے پھرتے ہیں۔
میں ایک گندمی رنگت کا انسان ہوں جس کی آنکھوں میں سیاہ ڈورے تو ہیں پر ان میں بھورے پن کے گمان

زیادہ ہیں اور ان میں کبھی بھی ، نہ مجھے اورنہ کسی عشق خاص کو جو میری آنکھوں میں جھانکتا تھا کبھی یہ شائبہ نہ ہوا کہ ان میں کچھ نیلے پن کے آثار بھی ہیں، میں اپنے ایک بدنام زمانہ شو ”شادی آن لائن“ کی ریکارڈنگ کے لئے دبئی گیا تو وہ جو میک اپ آرٹسٹ خاتون جو جانے کہاں کی تھی میرے چہرے کے قریب آئی اور کہنے لگی ”سر، آپ کی آنکھوں میں ایک نیلاہٹ ہے“ میں نے یقین کرنے سے انکار کردیا تو اس نے اپنے کیمرے کو قریب لا کر میری آنکھوں کا ایک کلوز اتارا۔۔ مجھے دکھایا۔۔ اور واقعی میری پتلیوں کے گرد نیلاہٹ کا ایک ہالہ تھا۔۔ اور میں اب تک بے خبر تھا۔۔ ویسے اب آئینے میں اپنے آپ کو دل پر جبر کرکے دیکھتا ہوں کہ جو کچھ دیکھتا ہوں وہ کچھ ایسا خوش نظرنہیں ہوتا تو مجھے وہ نیلاہٹ کا ہالہ نظر نہیں آتا کہ آنکھیں بے رنگ ہو چکی ہیں۔۔

جو کچھ میں دیکھ رہا تھا اس کا دکھانا مشکل ہے
خواب میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں اُس کا دکھانا مشکل ہے
آئینے میں پھول کھلا ہے، ہاتھ لگانا مشکل ہے

وہ بے شمار پرندے، مہرانوں جھیل کے آئینے میں کھلے تھے۔۔ ان کا لفظوں میں دکھانا مشکل ہے۔
اس اترتی شام میں کوئی سرمئی جادوگری تھی، نظر کے دھوکے تھے یا کیا تھا کہ یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ پرندوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے، جیسے وہ پانیوں میں سے اگ رہے ہوں، ان میں سے پھوٹتے سطح پر آتے اپنے نوزائیدہ پروں کو جھٹکتے تھے تو چھینٹے شبنم کی بوندوں کی مانند ہوا میں دمکنے لگتے تھے۔
اتنے پرندے اس شام میری آنکھوں میں اترے کہ میں انہیں جھپکتا نہ تھا کہ کہیں کوئی پرندہ میری تحریر کا آنکھ کے پنجرے سے آزاد ہو کر گر نہ جائے۔
ہم اس مچان کی پناہ گاہ میں سے نیچے اترے، سرکنڈوں کے ہجوم میں سے سر جھکا کر چلے اور کھلی فضا میں آگئے لیکن وہ سب پرندے بھی میرے ساتھ چلے آئے، وہ سب میرے بدن کے ساتھ ایک لباس کی صورت چسپاں چلے آئے اور اگر کوئی مجھے دور سے دیکھے تو اسے یہی گمان ہو کہ ایک ایسا پھڑپھڑاتا وجود چلا آتاہے جسے ہزاروں پرندوں کے پیوندوں سے تخلیق کیا گیا ہے، جیسے ایک سندھی رَلی چادر بھانت بھانت کی چوکور دھجیوں سے بنائی جاتی ہے، جیسے کسی سچل سرمست ایسے فقیر کی گدڑی میں رنگ رنگ کے چیتھڑوں کے پیوند ہوتے ہیں۔۔ وہ سب پرندے میرے وجود کے ساتھ یوں چسپاں چلے آتے کہ مجھے بھی ایک پرندہ کردیا۔۔
سروٹوں، سرکنڈوں، صحرائی درختوں اور جھاڑیوں کا جنگل بولنے لگا تھا۔ شام گہری ہوئی تو جنگل جاگ اٹھا۔۔ بولنے لگا۔
اس جنگل کے بیچ ایک منگل نہیں بلکہ بدھ جمعرات بھی تھا، میروں کا ایک مہمان خانہ تھا اور وہ بلند ہوتا چلا جاتا تھا اور اس کی چوٹی پرایک مچان تھا جہاں سے آپ مہرانوں کے جنگلوں کا نظارہ کر سکتے تھے، شب گزیدہ جنگل کی وسعت یوں نظر کے سامنے آتی تھی کہ آپ اس کے گھنے بھید کے اندر اتر سکتے تھے۔ (جاری ہے)









سچل سرمست کا سچ سدا حق سدا

مستنصر حسین تارڑ

Posted Date : 12/04/2015

ہماری سماعت کا گلزار اُن ہزاروں پرندوں کی چہکار سے خالی ہوا تو یکدم ایک سناٹا اتر آیا، خاموشی راج کرنے لگی اور پھر یکدم اُس سناٹے میں آتے ہوئے گلزار میں سچ کا ایک پرندہ چہکا۔۔ سچل کے گیت گاتا ہوا ایک مست الست، جذب میں ڈوبا ہوا پرندہ یوں مہکا کہ پورا گلزار و حق صدا، سچ سدا کی سرگوشیوں کی آہٹوں سے زندہ ہو گیا۔۔ حق اور سچ کی بہار آ گئی۔

‛حق صدا، سچ سدا′

سچل سرمست۔۔ سرمستی میں سچ کہنے والا۔۔ شاعر ہفت زبان منصور ملاج کی مانند

اناالحق، خود ہی حق، سچا بھی اور سرمست بھی۔۔

عش سوا سب جھوٹ فتور، سولی پر منصور

نہ کوئی دوزخ، نہ کوئی جنت، نہ ہی حور قصور

دِل مُلّا کی بات نہ مانے، نہ اُس کا مذکور

عہدِ جوانی بیت گیا اب، جسم تھکن سے چُور

دیکھ لیا ہے چشمِ یار کا، ہم نے سارا نُور
دُوجی ساری باتیں پھندے، ان سے رہ تُو دُور
سچو، اب تو جان لے سچ کو، آپ ہی آپ حضور۔۔
یہ اردور ترجمہ کمال کا آغا سلیم کی قادر الکلامی کا اعجاز ہے۔۔ جبکہ سندھی متن کچھ یوں ہے۔۔
عشق دیی باجھون پیاسپ کوٹ، سولی تی منصور نو کوئی دوزخ نہ کوئی جنت ، نا کوئی حور قصور‘
نیشنل ہائی وے پر سفر کرتے ہوئے دائیں جانب ایک آرائشی دروازہ نظر آیا اور یہ آپ کو ایک اجاڑسے گاؤں درازہ تک لے جاتا ہے۔۔ گیمبٹ کی قربت میں درازہ شریف کا گاؤں اگرچہ اجاڑ سا لیکن میرے لیے سندھ بھر میں سب سے آباد کہ وہاں میرا محبوب شاعر یوں سوتا تھا کہ میرے جذبات کی ترجمانی امیر خسرو کرتا تھا کہ۔۔
گوری سوئے سیج پہ منہ پر ڈارے کھیس
تو درازہ کی بستی میں وہ گوری سیج پر سو رہی تھی، اپنے بال اپنے مکھ پہ ڈالے، محو خواب تھی۔
جو دل پی لے عشق کا جام، وہ دل مست و مست مدام
دین مذاہب رہ گئے کس جا، کفر کہاں اسلام
ہماری، بلکہ دیدہ دل کی پراڈو سچل کے مزار کے باہر کیچڑ اور گندگی میں رک گئی۔۔
بائیں جانب سچل کا کنواں تھا اور سامنے سچ کی نیلی سیج نظر آ تی، نیلی آرائشوں سے آراستہ اس کا مدفن نظر آیا، اور جب نظر آیا تو اور کچھ بھی میرے دل میں نہ سمایا۔۔ سوائے حق اور سچ کے۔۔
اور یہ سچل میرے لیے کچھ پرایا نہ تھا، اجنبی تو نہ تھا کہ یہ بلھے شاہ اور شاہ حسین کا ہم پیالی اور ہم رقص تھا۔۔
پچھلی شب کی بارشوں سے سچل کے مزار کے پہلو میں جو اُن کے مریدوں کی قبریں تھیں وہ گیلی ہو چکی تھیں۔
میں نے سوچا کہ مرشد کے در پہ حاضری دینے سے پہلے اس کے مریدوں سے ملاقات کر لی جائے۔
قبریں اتنی گیلی ہو چکی تھیں کہ ان پر آویزاں کتبے ان میں دھنس رہے تھے۔ اور صرف ایک کتبے کی عبارت حق سچ کی ترجمانی کے لیے درج کرتا ہوں۔
"بسم اللہ"
"سندری زوجہ کنیہا لال لالہ‘
بیشتر قبریں ان کے ہندو مریدوں کی تھیں جنہوں نے سچل کے عشق میں اپنے آپ کو اس کے پہلو میں دفن کرنے کی وصیت کی کہ مجھے جلایا نہ جائے، دفن کیا جائے، سچل کے لیے وارفتگی اور عشق کا اندازہ صرف یوں آشکار ہو گا کہ اگر کوئی مسلمان، کسی ہندو بھگت کا ایسا شیدائی اور عاشق ہو جائے کہ وہ وصیت کرے کہ مجھے ہرگز دفن نہ کیاجائے، مجھے جلایا جائے۔ تب اندازہ ہو گا۔
اور یہ جمیل تھا جس نے مجھے ایک اور بھید سے آگاہ کیا۔ ایک قبر پر آویزاں لکڑی سے تراشیدہ ایک آرائش کی معنویت سے آگاہ کیا۔
سر۔۔ ذرا غور کیجیے۔۔ یہ آرائش ہل کے آگے جوتے ہوئے بیل کے گلے میں ڈالی ہوئی ایک پنجالی کی " صورت میں ہے۔۔ یعنی یہ ایک طوق ہے جو بیل کے گلے میں ڈالتے ہیں تا کہ وہ اپنے ہانکنے والے کا مطیع اور فرمانبردار رہے۔۔ تو ان قبروں پر سجی یہ پنجالی، یہ طوق، ایک استعارہ ہے، ایک علامت ہے کہ ہم جو ان کے نبدو خرید ہیں ہم سچل کی پنجالی میں بندھے ہوئے بیل ہیں، وہ جدھر چاہے، ہمیں ہانک دے کہ وہ ہل چلانے والا ہے، ہمارا مالک ہے۔
نہ میں ، نہ میں شیعہ، نہ میں جرم و ثواب‘
نہ میں شرعی، نہ میں داعی، نہ میں رنگ رباب
نہ میں ملّا، نہ میں قاضی، نہ میں شور شراب
‘ذات سچل کی کیا پوچھو ہو، سچل ہے نایاب

ابھی سویر ہوئی تھی۔
بازار سچل ابھی گرم نہ ہوا تھا۔
کم کم لوگ تھے۔
میانہ قد، صاف رنگت، خوبصورت گلابی آنکھیں، لمبے بال، سر پر سفید کپڑے کی ٹوپی جس کو درویشوں کے محاورے میں ”تاج“ کہا جاتا ہے، پیروں میں سندھی جوتی اور ہاتھوں میں عصا، ڈھولک پر تھاپ پڑتی، سارنگی کے سر سسکتے تو بے تاب ہو جاتے، آنکھوں سے جھڑیاں لگ جاتیں۔۔۔
میں تو ہوں اسرار، سکھی ری، تو کیا جانے بھید‘
سچل کا فارسی کلام بھی بے مثل ہے۔
انہوں نے مختلف تخلص اختیار کیے۔۔۔ سچل، سچو اور فارسی کلام کے لیے آشکار، اور خدائی۔۔۔ اُن کا فارسی کلام ”دیوان آشکار“ کے نام سے آشکار ہوا۔
اور جب جذب اور دیوانگی کی حالت میں اُن پر شعر اترتے تو ان کے مرید اُنہیں محفوظ کرتے چلے جاتے اور کبھی پوچھا جاتا کہ اے سچل، اس شعر کی معنویت ہم پر آشکار نہیں ہوئی، اس کا مطلب کیا ہے تو سچل کہتے، کہنے والے نے کہا ہے مجھے کچھ بھی معلوم نہیں۔۔۔ (جاری ہے



سچل سر مست کا سچ سدا حق سدا
مستنصر حسین تارڑ
Posted Date : 15/04/2015
میری سٹڈی ٹیبل پر ”دیوانِ آشکار“ کا جو فوٹوسٹیٹ نسخہ کھلا پڑا ہے یہ بھی جمیل عباسی کی عنایت

ہے۔۔ سچل کے فارسی کلام کا نہایت پُر انداز اردو ترجمہ قاضی علی اکبر درازی کا کمال ہے، اور جن کے نام سے ظاہر ہے کہ وہ سچل کے ہم وطن تھے، اسی قصبہ دراز کے رہنے والے تھے۔ اس میں کچھ مبالغہ نہیں کہ میں نے جب سچل کے سندھی کلام کا آغا سلیم کا اردو ترجمہ جہاں کہیں سے نظر کیا، نظر وہیں ٹھہر گئی، ان کے چند شعروں کو میں منتخب نہ کرسکا کہ وہ سب کے سب ہی قابل انتخاب تھے، یہی مسئلہ "دیوانِ آشکار" کھولا تو درپیش ہوا۔۔ آشکار کا پورا دیوان ہی شاہکار تھااور میں شاید کسی اور صوفی شاعر کے بارے میں یہ بیان دینے کے قابل نہیں ہوں۔۔

سچل مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ دیگر صوفی شعراء کی مانند مولانا روم کی چوکھٹ پر ہی نہیں پڑے رہے بلکہ وہ بایزید بسطامی اور فرید الدین عطار سے عشق اور جذب مستعار لیتے رہے۔۔ اور منصور حلاج تو ان کی آخری منزل ہے۔

اے دل غم و اندوہ میں صبر کر اور محبوب کا ساتھ دے

انا الحق کا نعرہ نہ لگاورنہ تو ہمیں قتل کروادے گا

اور عطار کے عطر سے تو وہ ہر شعر میں عطر بیز ہوتے ہیں، اور سچل اس لئے بھی میرے دل کے قریب ہوئے کہ میں بھی تو نیشا پور کے اس عطار کی خوشبو کا ہی ایک ایسا خریدار ہوں جس کے پلّے میں ایک کھوٹہ سکّہ بھی نہیں ہے۔۔ بس ایک کشکول ہے، پر بھلا عطار کس کس کو اپنے عطر کی بھیک دے۔۔ اور مجھے ہی کیوں دے سچل کے کشکول میں ہی کیوں نہ اپنے سارے عطر انڈیل دے۔

اے دل تو درد کا طلب گار ہے تو نیشا پور جا۔۔ کیونکہ وہ مرد خدا جو صاحبِ درد ہے اور میرا یار :یعنی خواجہ عطار، وہیں رہتا ہے۔

اے صبا! اگر تو میرے محبوب کی گلی سے گزرے۔۔

تو ساری حقیقت حال اس کے حضور بیان کرنا

میں اس کے کلام سے مست ہو کر دنیا سے دستبردار ہوگیا ہوں تو بھی اگر عشق کرنا چاہے تو "وصلت نامہ" اور منطق الطیر" سن لے۔۔

میں عطار کے خمخانہ سے منصور کی طرح بے خود ہوگیا

اس قدر کہ میں نے تسبیح اور مصلےٰ کو گروی رکھ دیا

اسے آشکار، خواجہ عطار کی درگاہ کی غلامی صدق دل کے ساتھ کر بزرگی، پیری اور شیخی تینوں کو ترک کردے۔ فارسی میں یوں آغاز ہوتا ہے۔۔

اے دِلا گر درد جوئی سُوئے نیشا پور برد

یعنی میری تحریروں میں بھی اگر عطار کی "منطق الطیر" کے پرندے اڑتے پھرتے تھے تو سچل کو بھی سر مست اسی کے پرندوں نے کہا کہ وہ پرندے بھی تو سچ کی تلاش میں نکلے تھے گویا سچل بھی عطار کا ہی ایک پرندہ تھاجو سچ کی جستجو میں نکلا تو خود ہی سچ ہو گیا، سچل اور سچّو ہو گیا۔

میں یہاں پھر ارجن کے ساتھ کرشن کے اس مکالمے کا حوالہ دینا چاہوں گا جب کرشن کہتا ہے کہ "مرغابی کے پر پانی میں رہنے سے بھی گیلے نہیں ہوتے، یعنی دنیا میں رہو پر اس کی آلودگی سے پاک رہو۔۔ تو سچل کہتا ہے۔۔ گوشہ نشینی کرنے، تارک الدنیا ہونے اور ممنوعات سے پرہیز کرنے سے کیا فائدہ۔۔ دنیا میں رہ کر دنیا سے بیگانہ ہو جا۔۔ حُجرے میں کیوں بیٹھتا ہے یقین کر کہ تُو ہے دین ہے۔

ویسے تو ایک محقق نے کہا تھا کہ ہندوستان کی دو الہامی کتابیں ہیں "رگ وید" اور "دیوانِ غالب"، اگر وہ محقق "دیوانِ آشکار" پڑھ لیتا تو ۔۔ شاید وہ یہ بیان کرنے پر مجبور ہو جاتا کہ۔۔ دوسری الہامی کتاب "دیوانِ آشکار" ہے۔۔ مجھے بھی اس دیوان کے تفصیلی مطالعہ کے بعد احساس ہوا کہ میں ابھی تک نامکمل تھا اور سچل کے دیوان نے مجھے مکمل کردیا۔

چلئے "دیوانِ آشکار" کے آخری شعروں کو ملاحظہ کیجئے کہ وہ اپنے جذب اور مستی کا اختتام بھی عطار پر کرتا ہے۔

میرا یار لاکھوں میں ایک ہے

عارف اور عاشق ہے اور نام عطّار ہے

میں اپنے سینے کے اندر یار کی خوشبو محسوس کرتا ہوں

میری روح شاہِ عطّار سے معطر ہوتی ہے

ابھی سویر تھی۔۔ سچل کا بازار ابھی گرم نہ ہوا تھا۔۔

کم کم لوگ تھے۔۔ ان ہندو مریدوں کی گیلی قبروں کی مٹی کے ذرّے میرے جوگرز سے جڑ گئے تھے۔۔ گویا وہ مرید اسے بھی اپنی خوش بختی جانتے ہوں گے کہ سچل کے مزار پر حاضری دینے والے لاہوری مرید کے جوتوں کے تلے ہماری قبر کی مٹی سے سج گئے ہیں اور اگر وہ انہی جوتوں سمیت اس کے مزار کے قریب

ہوتا ہے تو ہماری نہ سہی ہماری مٹی کی حاضری تو لگ گئی لیکن ۔۔۔ میں کیسے جوتوں سمیت مزارکے اندر چلا جاتا۔
میں اندر گیا تو وہاں سچل دولہا بنابیٹھا تھا۔
جی ہاں اپنے مکھ پر سہرا ڈالے، جس کی لڑیوں میں چمکیلی تاریں تھیں، سرخ پُھندنے اور کاغذ کے پھول تھے وہ دولہا بنا بیٹھا تھا۔۔ جانے کس سے بیاہ کرنے آیا تھا۔
اس کی قبر پر سندھی روایت کے مطابق ایک سہرا سجا تھا۔۔ ایک بوڑھی عورت۔۔۔ صحن میں چلتی آئی، مزار کے اندر داخل ہونے سے پیشتر اس نے اپنے جوتے اتارے اور چوکھٹ پار کرکے اپنے گھٹنوں کے بل گر گئی۔۔ ایک اپاہج کی مانند سچل کے مرقد کے گرد گھسٹنے لگی۔۔ اس کی کوئی منت پوری ہو گئی تھی۔
اس نے وعدہ کیا تھا کہ تو جو حق ہے سچ ہے اگر میری مراد پوری کردے تو میں تیرے مزار کے گرد چل کرنہیں، گر کر، گھسٹتے ہوئے طواف کردی گی تو اس کی منت پوری ہو گئی تھی۔۔ اور یہ روایت شکر گزاری اور عقیدت کی کچھ نئی اور عجب نہیں۔۔ صدیوں پرانی ہے۔
مہاتما بدھ کا کوئی پیروکار تبت کے کسی دورافتادہ گاؤں سے چلتا نہیں، سجدہ ریز ہوتا ہر گام پہ۔۔ گھسٹتا ہوا، برفانی بلندیوں اور گھاٹیوں پر اپنے آپ کو گھسیٹتا لاہسا کے جادوئی شہر پر حاوی ہوتے پٹولہ کے عظیم بدھ مندر تک کئی ماہ کے سفر کے بعد حاضر ہو جاتا ہے۔
کوہ کیلاش کے دامن میں بھی ہندو یاتری گھٹنوں کے بل اپنے آپ کو گھسیٹتے اس کے گرد طواف کرتے ہیں۔۔ تو یہ روایت شکرگزاری اور عقیدت کی کچھ نئی اور عجب نہیں۔۔ مزار کے نیم تاریک ماحول میں سرگوشیاں، فریادیں، آہیں اور التجائیں گونجتی تھیں اور سچل دولہا بنا بیٹھا تھا۔
اب نیلی محراب سے ٹیک لگائے ایک بوڑھا شخص اور وہ مجھے نابینا لگتا تھا کہ اس کی آنکھیں بند تھیں، نہایت گلوگیر آواز میں، بلند پرسوز آہنگ میں سچل کا کلام پڑھتا تھا۔۔ میں اس کے قریب کھڑا بہت دیر تک اس کی فریاد بھری تانیں سنتا رہا لیکن اس نے اپنی آنکھیں نہ کھولیں، نابینا لگتا تھا۔
اس کی آواز مرقد کے گنبد میں گونجتی سچل کے سہرے پر اترتی تھی اور اس کی پھندنوں اور پھولوں سے گندھی ہوئی لڑیوں میں ایک ارتعاش کو جنم دیتی تھیں، چونکہ اس سہرے میں پوشیدہ دولہے کا جو چہرہ ہے وہ عیاں ہو جائے، وہ جھانک لے کر یہ کون ہے جو مجھے عبدالوہاب کو جس کا نسب حضرت عمر فاروقؓ سے جا ملتا ہے جو 1739ء میں اسی گاؤں دراز میں پیدا ہوا اور 11 اپریل 1827ء میں رزق خاک ہوا تو یہ کون ہے جو اتنی صدیوں بعد میرے کلام سے مجھ سے ہم کلام ہوتا ہے، وہ شخص مجھے نابینا لگتا تھا۔ جھنڈ کھول دیدار کراؤ ۔۔۔ میں آیا سکھ ویکھن۔۔ سچل سندھ سے ہی نہیں پنجاب کے تخت ہزارے اور رانجھے سے بھی پرویا ہوا ہے، اس کے سہرے کی لڑیوں میں بلھے شاہ اور شاہ حسین کے پھُندنے میں سجے ہوئے ہیں۔۔ ’رانجھن، کھیڑا، دونوں میں ہواں، ہیرا ہی پھر یہاں کہاں ۔۔۔ جھنگ سیال اور تخت ہزارہ، دونوں دیکھے میں نے یہاں۔
ابھی کچھ دن گزرے جب میں سندھ کے سفر کے بعد پنجاب کے ایک گمنام قصبے، ہانس قبیلے کے قصبے ملکہ ہانس کی یاترا پر گیا۔ جہاں وارث شاہ اپنے مرشد کی خواہش کے مطابق ایک بہت قدیم مسجد کے امام ہوتے اور اس سے متصل ایک چھوٹے سے حجرے میں پنجاب کا سب سے عظیم رزمیہ، لازوال داستان ”قصہ ہیررانجھا“ تحریر کی اور جب میں نے، اب تو جدید غسل خانے کی ٹائلوں سے مزین ہو چکے حجرے میں کچھ وقت بسر کیا تو میں نے محسوس کیا کہ سچل اپنے سندھ کے دراز گاؤں سے روحانی سفر طے کرتا وارث شاہ کے اس حجرے میں بھی آمقیم ہوا تھا۔
اب جانا تخت ہزارے، اب رہنا ندی کنارے ’
سچو، جان کہ ایک ہے رانجھا، تج دے اور دوارے
سچل دولہا بنا بیٹھا تھا اور اس کی ایک بوڑھی لاچار دلہن اس کے گرد گھٹنوں کے بل گھسٹتی تھی۔
مجھ سے ایسی پریت لگائی، بھول گئی میں بابل بھائی
زہر پیالہ پیتی ہوں
عشق نشہ ایسا چھایا، چھم چھم کرکے ناچ نچایا
پگلی بن کر جیتی ہوں
ہُو ہُو کرتی رہتی ہوں
تو سچل کیسے بلھے شاہ کے ساتھ، تیرے عشق نچایا کر تھیا تھیا، کرتے ہم رقص ہوتا ہے اور پھر سلطان باہو کی آواز میں اپنی آواز شامل کرتے ہوئے کہ۔۔کون دِلادی جانے ہُو۔۔ ہُوہُو کرنے لگتا ہے۔ میرا بہت جی چاہا کہ میں سچل کے سہرے کو الٹ کر دیکھوں تو سہی کہ اندر کون ہے، کس کا چہرہ ہے، سچل ہے یاکوئی اور ہے، لیکن بایزید بسطامی تو اس میں روپوش نہیں، عطار تو پوشیدہ نہیں۔۔ اور کیا پتا کہ اس سہرے کے

پیچھے میرا چہرہ ہو۔۔۔ تو پردے میں رہنے دو، پردہ نہ اٹھاؤ، پردہ اٹھے گا تو بھید کھل جائے گا۔
ہم مزار کے باہر آگئے۔۔۔ مزار کے اندر سچل کی بارات اتری ہوئی تھی پر ہم باراتی نہ تھے، باہر آگئے۔۔۔ مکر، فریب، دھوکے کی دنیا میں آگئے۔
ایک نیلی دیوار کی اوٹ میں سچل کے کچھ فقیر فرش پر بیٹھے اپنے سازوں پر جھکے، سر دھنتے اس کا کلام الاپتے تھے اور ۔۔۔ دیدہ دل ان کے گرد جھومتا ان پر نوٹ نچھاور کرتا تھا۔
اور ان میں بھی ایک اندھا فقیر تھا، وہ اپنے ساز پر جھکا سچل کی سرمستی میں سے بنیائی کشید کرتا، جھومتا تھا۔۔۔
(میں آیا مکھ ویکھن وے" (ختم شد"



موہنجو ڈارو کا سرخ شہر
مستنصر حسین تارڑ
Posted Date : 19/04/2015
ابھی کچھ دھوپ تھی۔۔گرنیڈ پریسٹ کا مجسمہ سفید چونے میں ڈھلا سفید تھا اور اُس سے پرے موہنجو کے ڈھے چکے شہر کے ٹیلوں کے انبار تھے اور وہ سرخ تھے کہ اینٹیں جب پانچ ہزار برس کی بہاروں، خزاؤں اور برساتوں کے موسمی دُکھ سُکھ جھیلتی بُھر بُھری ہونے لگتی ہیں، مسمار ہونے لگتی ہیں تو اُن میں سرخ مٹی جھڑنے لگتی ہیں اور وہ دن کی دُھوپ میں بھی شفق کے رنگ میں ڈوبی ہوتی ہیں۔۔۔میں موہنجو ڈارو میں اجنبی نہ تھا۔۔میں اس کی ایک ایک اینٹ سے شناسا تھا۔ میں نے "بہاؤ" لکھنے سے پیشتر واد�ئ سندھ کی تہذیب کے بارے میں برسوں پُر ثقت اور آنکھیں دُکھا دینے والے تحقیق میں اپنے آپ کو غرق کیا۔ میری مدد کو بہت سے لوگ آئے جن میں علامہ فرید کوٹی، علی عباس جلالپوری، عارف وقار وغیرہ شامل تھے لیکن سرفہرست ملتان کے مرزا ابن حنیف تھے جنہوں نے اپنی عمر بھر کی تحقیقی کمائی میری جھولی میں ڈال دی۔ اس معاونت کے باوجود یہ میری زندگی کے کچھ برس تھے جو میں نے "ضائع" کیے یہاں تک کہ میں عہد موجود سے بیگانہ ہو کر پانچ ہزار برس کے قدیم زمانوں کا باشندہ ہو گیا، پا روشنی، سمرو، پکلی، ورچن، مامن ماسا اور ورچن کی سرسوتی ندی کے کناروں کا باسی ہو گیا۔

میں موہنجو ڈارو میں اجنبی نہ تھا اسی لیے مجھے کسی سے راستہ دریافت کرنے کی حاجت نہ تھی، میں خوب جانتا تھا کہ یہ گلی موہنجو کے عظیم تالاب کی جانب جاتی ہے۔ اس گلی کے آخر میں وہ کنواں موجود ہو گا جہاں سے موہنجو کی ناریاں پانی بھرتی تھیں۔ اور جیسے لاہور کے بارے میں وہ حکایتی سوال جواب ہے کہ مجھے بتاؤ تو سہی کہ لاہور میں کتنے کنویں ہیں اور کن کا پانی کھارا ہے اور کن کا شیریں ہے تو جواب آتا ہے کہ جن کنووں سے محبوب پانی بھرتے ہیں وہ سب میٹھے پانی والے ہیں اور بقیہ کھارے پانی والے ہیں تو اسی طرح موہنجو کے کھنڈروں میں حیرت انگیز طور پر متعدد کنووں کی گولائی کے آثار اب بھی نمایاں ہوتے خبر کرتے ہیں کہ ان کنووں کے پانی میٹھے ہی ہوتے ہوں گے۔۔البتہ جس کنویں سے نرتکی موہنجو ڈارو کی اپنی گاگر بھرتی ہو گی اس کے پانیوں میں مٹھاس کے علاوہ اس کے آبنوسی بدن کے نمک عشق کی بھی گھلاوٹ ہو گی۔۔تو ایک تصور اور تحقیق کی آمیزش سے ”بہاؤ“ اور ”دھند کے پیچھے شہر تھا“ جس میں جو موہنجو ڈارو وجود میں آیا، اُس تصوراتی شہر میں اور اس ڈھلتی دھوپ میں سرخی میں ڈھلتے شہر میں جسے پہلی بار میری آنکھیں دیکھ رہی تھیں کچھ فرق تھا۔۔ نہیں تھا۔۔ وہ ہو بہو وہی تھا جس نے میری برسوں کی تحقیق کے تصور میں سے جنم لیا۔۔ البتہ ایک فرق تھا۔۔ کہ موہنجو ایک سرخی میں ڈوبا سرخ شہر تھا۔۔ سب کھنڈر در و بام سرخ۔۔ گلیوں کے فرش، نالیوں کو ڈھانپتی اینٹیں سرخ۔۔ بھر بھری سرخی ہر اینٹ میں سے بھرتی سرخ۔۔ اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ ان کنووں میں اگر پانی ہوتے تو وہ بھی سرخ ہوتے۔۔اس کے راستوں پر چلتے۔۔ گلیوں میں جھانکتے میرے جو گرز کے تلووں سے چمٹتے مٹی کے ذرے بھی سرخ۔۔ اس شب ہوٹل میں جب میں نے اپنے جوگرز اُتارے تو اُن کے تلووں سے چمٹی مٹی کے ذرے سرخ جگنوؤں کی مانند دمکتے تھے، تو میری تحقیق اور تصور میں بس یہی کمی رہ گئی تھی، مجھے یہ گمان نہ ہو سکا کہ موہنجو ڈارو ایک سرخ شہر ہے۔۔اُردن کے ”روز ریڈ سٹی پیٹرا“ کی مانند ایک گلابی رنگت کا شہر ہے۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔۔کھنڈر ہو چکے ایوانوں، تالابوں، رہائش گاہوں اور گلیوں میں اینٹوں میں سے سرخ سفوف جھڑتا تھا۔۔بس یہی کمی رہ گئی۔۔وہ سٹوپا جو موہنجو ڈارو کی پہچان ہے جو پاکستان کے کرنسی نوٹوں پر بھی ثبت ہے۔۔ بہت سنبھالا گیا تھا، ذرا دوبارہ لیپ کر کے تعمیر کیا گیا تھا، اس شہر کے تاریخی اور تہذیبی تسلسل کی ایک نشانی تھی، اس کے آثار اس حقیقت کی نشاندہی کرتے تھے کہ موہنجو ہندوستان پر آریائی حملہ آوروں کے نتیجے میں برباد نہیں ہو گیا تھا، یہ ہزاروں برسوں تک قدیم دراوڑی تہذیب کا مرکز رہا۔ اجڑا نہیں۔۔ تقریباً دو ہزار برس بعد یہاں بدھ مت کی تہذیب کا غلبہ ہوا اور یہ سٹوپا وجود میں آیا۔ گویا موہنجو ڈارو کم از کم دو ہزار برس تک ایک آباد اور زندہ شہر چلا آیا تھا۔ ہمارے شہروں میں سے لاہور، کراچی، کوئٹہ وغیرہ کے نصیب میں کیا یہ ہے کہ وہ دو ہزار برس تک آباد رہیں گے، نہیں رہیں گے۔۔ دھوپ ڈھلتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ موہنجو ڈارو کے کھنڈر مزید سرخ ہوتے جا رہے تھے، ڈھلتے سورج کی سرخی اس کی ہر اینٹ پر اثر انداز ہوتی اسے خون کے رنگ میں ڈبوتی تھی۔۔اسی شہر میں سر سوتی ندی کے کناروں پر زندگی کرتا ورچن طویل مسافتیں طے کرتا آیا تھا۔۔ہم جب موہنجو ڈارو کے کھنڈروں میں داخل ہو رہے تھے تو دیدہ دل کا ایک چاچا، اپنی ڈاڑھی خضاب کیے ہمارے لیے کینٹکی چکن اور فرنچ فرائز کا من و سلوٰی لیے موجود تھا۔۔ اس ”چاچا“ کے رنگ ڈھنگ نرالے تھے، بیشتر رنگ قانون کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور ڈھنگ جتنے بھی تھے اُن میں ملک ملک کی خواتین کے ساتھ شب بسری کی داستانیں تھیں۔۔ عجب چاچا تھا۔۔عظیم سٹوپا کے گرد ایک گردش کر کے، ایک طواف کرنے کے بعد، کہ ہم بہت بھوکے ہو رہے تھے۔ اور یہ بھوک کچھ نئی نہیں ہے، پانچ ہزار برس سے موہنجو میں چلتی آ رہی ہے ہم نے سٹوپا کے نشیب میں واقع ایک ایسے مختصر کھنڈر کمرے کا انتخاب کیا جس کی صرف بنیادیں باقی تھیں اور اس کے سرخ فرش پر پچھلی شب کی بارشوں کی نمی تھی اور وہ بھی سرخ تھی۔۔ ہم نے اس کمرے میں بیٹھ کر۔۔ ذرا تصور کیجیے۔۔ ارمیکی کینٹکی چکن اور فرنچ فرائز نہایت رغبت سے نوش کیے۔۔کیا اس کمرے کا مکین، آج سے چار پانچ ہزار برس پیشتر یہاں رہائش رکھنے والا یہ تصور کر سکتا تھا کہ کبھی آئندہ زمانوں میں ہم لوگ اس کی خلوت کو مجروح کرتے کینٹکی چکن کی ٹانگوں کو بھنبھوڑتے ہوں گے، تو کیا آج آپ یہ تصور کر سکتے ہیں کہ جن شہروں میں آپ رہتے ہیں، جن مکانوں میں بسیرا کرتے ہیں ان کے کھنڈروں میں آج سے چار پانچ ہزار برس بعد وہ کونسے لوگ ہوں گے جو اپنی بھوک جانے کونسی خوراکوں سے مٹاتے ہوں گے۔۔اور اس دوران جب میں اُس کھنڈر ہو چکے آثار کے ایک ابھار پر براجمان کینٹکی چکن سے لطف اندوز ہو رہا تھا ہمہ وقت یہ خیال آتا رہا کہ آخر وہ کون ہو گا جو اس کوٹھڑی کا مکین ہوا کرتا تھا۔۔ شاید کوئی مُہریں ڈھالنے والا، عظیم پروہت کے گیت گانے والا، یا پھر موہنجو ڈارو کی رقاصہ کا کوئی عاشق۔۔ وہ کون ہو گا۔۔موہنجو ڈارو اس ڈھلتے سورج کی سرخی میں سرخ ہوتا ایک شاہ حسین ہوا جاتا تھا:

آساں اندر باہر لال ہے

ساہنوں مُرشد نال پیار ہے
یا پھر۔۔۔
دُھواں دھنے میرے مُرشد والا
جاں پھولاں تاں لال نیں
اس ڈھل چکی دھوپ میں موہنجو ڈارو کے سرخ کھنڈروں میں جان بوجھ کر بھٹکتا ایک جوڑا تھا۔
لڑکی واجبی شکل کی تھی پر اس کے بالوں پر موہنجو کی اینٹوں میں سے بھرتے سرخ ذرے دمکتے تھے۔
اس کی نیلی جین جس میں وہ پیوست تھی وہ بھی سر خ سفوف سے سرخ ہوتی دکھائی دیتی تھی۔۔۔ اور وہ جو لڑکا تھا معنک اور اچھی شکل والا وہ ایک سجن بے پروا تھا۔۔۔ سورج ڈھلتا جاتا تھا۔۔۔ موہنجو کے کھنڈروں سے میرے ڈھلتے وورج میں زرد ہوتا، دریائے سندھ تھا، یہی میری شہر تمنا تھا۔۔۔شہر آرزو تھا۔۔۔
مجھے کچھ خبر نہ تھی کہ موہنجو ڈارو ایک نہیں، کئی شہر ہوا کرتے تھے۔۔۔وہ ایک دوسرے میں منسلک اور جڑے ہوئے تھے اگرچہ الگ الگ تھے۔ (جاری ہے)

مَین فرام موہنجو ڈارو
مستنصر حسین تارڑ
Posted Date : 22/04/2015
موہنجو ڈارو کی اس مرکزی پہچان سٹوپا کی کھنڈر ہو چکی عظمت رفتہ کے آس پاس تین اور کھنڈر ہو چکے شہر تھے۔۔۔ ایک دوسرے پر انحصار کرتے الگ الگ اور وہ اس شہر بے مثال کو مکمل کرتے تھے۔
میں تو بے خبر تھا، یہ دیدہ دل تھا جو دلوں کے حال جانتا تھا ایسے ہی موہنجو کو بھی خوب جانتا تھا کہ وہ ”موہنجو ڈارو کا شخص“ تھا۔۔۔ لاڑکانہ کا باسی تھا۔
جیسے سندھ کے عظیم دانشور سوبھوگیان چند حصول علم کی خاطر رابندرناتھ ٹیگور کی تاریخی درس گاہ شانتی نکیتن پہنچے تو ٹیگور نے پوچھا، کہاں سے آئے ہو تو انہوں نے کہا کہ سندھ کے شہر لاڑکانے سے تو ٹیگور مسکرا کر بولے ۔۔۔ گویا تم ۔۔۔ مین فرام موہنجو ڈارو “ ہو۔۔۔ اور یوں شانتی نکیتن کے اساتذہ اور طالب علم انہیں اسی خطاب سے پکارتے تھے۔۔۔
سوبھو نے کہا تھا کہ میرے تین جرم ہیں۔۔۔ میں ہندو ہوں، سندھی ہوں اور پھر کمیونسٹ ہوں۔
اور یہ دیدہ دل تھا جس نے کہا تارڑ صاحب ، یہ تو موہنجو ڈارو کے وہ کھنڈر ہیں جو تصویر اور تحریر میں آتے ہیں جو اس بلند سٹوپا کے اردگرد پھیلے ہوئے ہیں لیکن اصل موہنجو ڈارو وہ ہے جو اب ہم دیکھنے جا رہے ہیں۔۔۔
ہم ان مرکزی کھنڈروں سے نیچے اترے، گرینڈپریسٹ کے سفید مجسمے کو سلام کیا بلکہ پرنام کیا اور باہر آگئے۔۔۔
بائیں جانب ان کھنڈروں سے پرے ایک اور شہر تھا جس کی جانب کم لوگ جاتے تھے۔۔۔ یہ کھنڈر دوسرے آثار کہلاتے تھے، یعنی سٹو پاکے گرد سرخ ہوتے بلند کھنڈر نقش اول لئے، اور یہ نقش دوم تھا اور تیسرا نقش یہاں سے کچھ فاصلے پر تھا جہاں ہم وقت کی کمی کے باعث جا نہ سکے۔
اور نقش دوم حیرت انگیز طور پر کہیں زیادہ پُراثر اور مکمل تھا۔۔۔ یہ میرے سامنے آیا، سورج کی آخری کرنوں میں ڈوبتا ہوا وہ شہر میری آنکھوں میں یوں بچھ گیا کہ اس کی گلیاں، راستے، کنویں اور مکان۔۔۔ کھنڈر تو نہ تھے، وہ ایک آباد شہر تھا جس کے مکین شام ڈھلتے ہی اپنے مکانوں میں جا سوتے تھے۔
جیسے آثار قدیمہ کا برطانوی ماہر جب ریت میں دفن چند سیڑھیاں اترا تو ایک مقفل شاہی دروازہ ظاہر ہوا اور جب اس نے اس کے کواڑ دھکیلے اور اندر داخل ہوا تو وہ اپنی آنکھوں پر یقین نہ کرسکا کہ ان آنکھوں میں مصر کی تاریخ میں کسی بھی فرعون کا آج تک پوشیدہ، مکمل حالت میں موجود مدفن تھا، جوں کا توں تھا۔۔۔ سینکڑوں سونے کے ظروف، مجسمے۔۔۔ اور روزمرہ کے استعمال کی اشیاء سب کی سب سونے میں ڈھلی اور ان کے درمیان فرعون ٹوٹن خامن کا سنہری تابوث پڑا تھا جس کے ڈھکن پر اس کا اور وہ بھی سونے سے بنایا ہوا تصویری نقاب آراستہ تھا۔۔۔ میں نے ایک بار نیویارک میں اسی مقبرے سے دریافت ہونے والے نوادر اور آثار کی نمائش دیکھی تھی لیکن وہاں ٹوٹن خامن کے چہرے کا وہ ۔۔۔ فرعون تہذیب کا سب سے نمائندہ شاہکار موجود نہ تھا۔۔۔ میرے استفسار پر بتایا گیا کہ وہ نادر نقاب یا مجسمہ اتنا بیش قیمت ہے کہ اسے مصر سے باہر لے جانے کی اجازت نہیں۔
کارٹر جب اس مقبرے میں داخل ہوا تو اس کا کہنا تھا کہ پانچ ہزار برس کے بعد وہ پہلا شخص تھا جو اس کی تنہائی میں مُخل ہوا۔۔۔ مقبرے کے اندرپانچ ہزار برس قدیم ہوا جو حنوط ہو چکی تھی وہ پہلا شخص تھاجس

نے اس میں سانس لئے۔۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ابھی ابھی فرعون کے خاندان کے افراد، دربار ی اور وزیر اور غلام اس کے تابوت کا طواف کرکے باہر گئے ہیں۔۔ یہاں تک کہ ایک طاقچے میں جو چراغ روشن تھا اسے جاتے ہوئے کسی شخص نے ہتھیلی سے بجھا دیا تھا اور طاقچے کی دھواں آلود محراب میں اس شخص کی انگلیوں کے نشان ابھی تک موجود تھے۔

یہ طویل بیانیہ دراصل میری اس کیفیت کی ترجمانی کرتا ہے جب میں موہنجو ڈارو کے اس دوسرے شہر میں داخل ہوا۔۔ کارٹر کی مانند مجھے بھی محسوس ہوا کہ میں پہلا شخص ہوں جو ۔۔ اور یہ بھی اس مقبرے کی مانند پانچ ہزار برس کی تنہائی میں حنوط تھا۔ اس شہر میں داخل ہونے والا پہلا شخص ہوں۔۔ ابھی کچھ لمحے پہلے یہ آباد تھا۔۔ پُررونق اور پُرشور تھا، اس کے متعدد کنووں سے ناریاں پانی بھرتی تھیں۔۔ گلیاں سونی نہیں تھیں، پُرہجوم تھیں۔۔ ان میں ان زمانوں کے مرزے، رانجھے اور مجنوں پھرتے تھے اور ان کی صاحباں، ہیریں اور لیلائیں انہیں لک چھپ دیکھتی تھیں اور وہ جو ایک عظیم چوڑی شاہراہ تھی جو ان کھنڈروں کے درمیان دور تک چلی جاتی تھی، جس کے کناروں کی شکستہ بھربھری اینٹوں کی دیواروں پر سے خودرو جھاڑیوں اور کیکروں کا ایک جھاڑ جھنکار جھانکتا تھا اور اس شاہراہ پر اب تو ڈوب چکے سورج کی زردی یوں بجھی ہوئی تھی کہ اس کے اینٹوں کے فرش میں پیوست ہر اینٹ زردی کی سوگواری میں ڈوبی ہوئی تھی تو ابھی ابھی اس شاہراہ پر بیل گاڑیوں کے لکڑی کے پہیے کھڑکھڑاتے تھے اور پیدل چلنے والے لوگ ان کی کھڑکھڑاہٹ سن کر اپنے آپ کو بچانے کے لئے دیواروں سے لگ جاتے تھے، بھٹیار خانوں کے تندور گرم تھے، یہ شاہراہ گویا آج کی مال روڈ تھی، پیرس کے شانزے لیزے اور لندن کی ریجنٹ سٹریٹ تھی۔۔ وہاں کیسی کیسی ناریاں بانہوں میں کہنیوں تک کنگن سجائے اٹھلاتی پھرتی تھیں اور کیا پتا ان میں موہنجو (کی ڈانسنگ گرل بھی اپنے دراوڑی مُہاندرے کے ساتھ اٹھلاتی پھرتی ہو۔ (جاری ہے

مَین فرام موہنجو ڈارو

مستنصر حسین تارڑ

Posted Date : 26/04/2015

موہنجو ڈارو کی یہ شاہراہ جس کے ایک جانب جنگل اترتے تھے اور دوسری جانب رہائش گاہوں اورتنگ گلیوں کے سرخ آثار تھے ایک عجوبہ تھی، ابھی تک قائم تھی۔

اور ابھی کچھ دیر پہلے۔۔ وہ سب لوگ اس شہر کو خالی کرگئے، گلیاں ویران کرگئے، جانے کہاں دفن ہو گئے اوراب پانچ ہزار برس بعد میں پہلا شخص تھا جو اس عظیم مقبرے میں داخل ہوا تھا اور رَمی قدیم ہوا میں سانس لیتا تھا جس میں موہنجو کے ہزاروں باسی سانس لیا کرتے تھے۔۔ وہ ہوا ابھی تک حنوط تھی، جوں کی توں میرے انتظار میں ٹھہری ہوئی تھی۔۔

جمیل ، کامران، دیدہ دل میں دیکھ سکتا تھا کہ ان کے چہروں پر میرے لئے فکر مندی اور تشویش پھوٹتی تھی کہ ۔۔ مجھے واقعی کچھ ہو گیا تھا، میں ان سے بچھڑ چکا تھا، میرے خزاں رسیدہ چہرے پرنہ صرف ڈوب چکے سورج کی زردی اترتی تھی بلکہ موہنجو ڈارو کی ہر بھرتی ہوئی اینٹ کے سرخ سفوف کا لیپ ہو رہا تھا، میں اپنی خصلت کے ہاتھوں مجبور ان سب سے الگ ہوگیا اور وہ میرے حال کے محرم تھے، انہوں نے مجھے الگ ہو جانے دیا۔

گلیاں گیلی تھیں، بارش بہت ہوئی تھی، میں ان میں تنہا بھٹکتا پھرا، وہاں قدیم رہائش گاہوں کی محرابیں تھیں، کسی گلی میں پوشیدہ ایک کنواں اپنی گولائی میں بلند ہوتا تھا، میں ان کنووں میں جھانکا کیا، ابھی ابھی تو نرتکیاں ان میں سے پانی بھرتی تھیں، وہ پانی کیا ہوئے۔۔

کبھی کسی سنسان گلی میں چلتے ہوئے مجھ پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی، میں راستہ بھول گیا ہوں۔۔ انسانی تہذیب کے قدیم ترین کھنڈر میں گم ہوگیا ہوں۔۔ پانچ ہزار برس کے پہلے کے کوچوں میں بھٹک گیا ہوں تو شاید انہی زمانوں میں سانس لیتاانہی زمانوں میں چلا گیا ہوں تو میں کیسے اپنے زمانوں میں واپس جاؤں گا۔۔ کبھی کسی گلی کے اختتام پر ایک دیوار حائل ہو جاتی۔

وہ کوئی بہت شاندار حویلی تھی جس کی ایک دیوار بدستور قائم تھی، اگرچہ وہ اپنے ہزاروں برسوں کے بوجھ سے قدرے جھکی ہوئی تھی اور اسے قائم رکھنے کے لئے سہارے دیئے گئے تھے، محکمہ آثار قدیمہ اتنا خوابیدہ بھی نہ تھا، اگر یہ سہارے ایستادہ نہ کئے جاتے تو یہ قدیم دیوار کب کی ڈھے چکی ہوئی۔۔

ویسے یہ کیا بھیدہے کہ میں دنیابھر کے بہت سے تاریخی کھنڈروں میں بھٹکا، میں مرعوب ہوا، ان کی عظمت کے سامنے سرنگوں تو ہوا لیکن یہ کیا بھید ہے کہ صرف موہنجو ڈارو کے کھنڈروں میں جب میں تنہا اس مردوں کے ٹیلے کی گلیوں اور بازاروں میں چلا تو یہ کیوں محسوس ہواکہ میں بھی کبھی اس شہر کا باسی تھا، میں یہیں کا رہنے والا ہوں، یہ میرا اپنا شہر ہے۔ شاید یہ میری جڑیں تھیں جو اس دھرتی کی

گہرائی میں روشن چراغوں میں سے پھوٹتی تھیں، نہ میں ایرانی طورانی، نہ ترک تھا نہ عرب تھا، میں کہیں سے نہ آیا تھا۔ نہ میں غزنوی، قریشی، عباسی، نجاری، بغدادی، شیرازی، تبریزی یا جامی تھا، محض ایک تارڑ تھا جو یہاں کا تھا، کہیں سے نہ آیا تھا اور یہ تہذیب اور تاریخ کا ایک تسلسل تھا جس کے گھومتے چرخے کے تکلے میں سے سوت کے جو دھاگے جنم لیتے تھے میں ان میں بندھا ہوا تھا۔۔ چنانچہ میں اپنے شہر میں واپس آگیا تھا۔

میں بھی ایک ”مین فرام موہنجو ڈارو“ تھا۔

جمیل نے ایک کنویں کے قریب ڈھیر ہو چکی، پرانی اینٹوں میں سے ایک اینٹ اٹھائی اور جھجکتے ہوئے بولا ”سر۔۔ یہ اینٹ ساتھ لے چلیں“؟

آئے ہیں اس گلی میں تو۔۔ ایک اینٹ ہی لے چلیں

دل بہت چاہا کہ اگر میری سٹڈی ٹیبل پر موہنجو ڈارو کی ایک تقریباً پانچ ہزار برس پرانی سرخ رنگت کی اینٹ دھری ہو تو اس پر آنکھیں رکھ کر میں اپنی تحریر میں کیسے کیسے گزر چکے زمانوں کی داستانیں بیان کر سکتاتھا۔۔

” نہیں جمیل۔۔ بے شک یہاں لاکھوں اینٹوں کے سرخ ڈھیر پڑے ہیں لیکن اگر ہم ان میں سے ایک اینٹ اپنے ساتھ لے جائیں گے تو موہنجو ڈارو اجڑ جائے گا۔ جیسے میں غار حرا کا کوئی پتھر نہ لایا تھا، جبل احد کا کوئی کنکر اٹھا کرنہ لایا تھا۔۔ تو اس اینٹ کو پڑارہنے دو کہ اس کے اندر موہنجو ڈارو ابھی تک آباد ہے۔۔ اسے اجاڑنا نہیں۔۔ رہنے دو۔۔“

اگر میرے بس میں ہوتا تو میں الحمرا اور غار حرا کی مانند موہنجو ڈارو میں بھی ایک رات بسر کرتا۔

اگر کرتا تو کون سے مقام پر رات بسر کرتا۔

کسی کنویں کی منڈیر کے قریب۔۔

اس حویلی کی جھکتی ہوئی دیوار تلے جو سہاروں پر قائم تھی، موہنجو ڈارو کی شانزے لیزے کے کناروں پر کسی بھٹیار خانے کے کھنڈر میں۔

عظیم تالاب کے کھنڈر میں اتر کر۔

اگر کرتا تو کہاں رات کرتا۔

جب میں تنہا اس اترچکی شب کے نیم اندھیارے میں ایک گلی کی تاریخی ویرانی میں چلتا تھا تو مجھے دائیں جانب ایک شگاف نظر آیا تھا، میں بمشکل سر جھکا کر اپنے آپ کو سنبھالتا ہوا اس میں داخل ہواتو وہاں ایک کوٹھڑی کے آثار تھے جس کی چاروں دیواریں قائم تھیں، ظاہر ہے چھت نہ تھی لیکن ایک دیوار میں اینٹوں میں سے گرتے سفوف میں ملبوس ایک طاقچہ تھا، میں وہاں رات کرتا، اور اس طاقچے میں دل کا دیا جلاتا جس کی روشنی میں مجھے پا روشنی کی پرچھائیاں نظر آتیں، ورچن میرے ساتھ باتیں کرتا، اپنی ندی سرسوتی سے یہاں تک کے سفر کی حکایتیں بیان کرتا۔۔

یہ بھی ممکن تھا کہ ڈانسنگ گرل سندھیا بھی چلی آتی، انسان اپنے آپ کو فریب دینا چاہے تو اسی نوعیت کے فریب تصور میں تصویر ہوتے ہیں۔۔

اس طاقچے میں میرے دل کا دیا جلتا تھا جب اتر چکی شام میں، میں اپنے آبائی شہر موہنجو ڈارو سے جدا ہوا۔ (ختم شد)





بیسٹ سیلر آئٹم۔۔۔ شہباز قلندر
مستنصر حسین تارڑ
Posted Date : 30/04/2015

میں کبھی بھی کچھ زیادہ پُرشوق نہیں رہا کہ میں درگاہوں، مزاروں، قبروں اور آستانوں پر حاضری دوں، البتہ ان میں مدفون بزرگ اگر شاعر اور صوفی مزاج کے حامل ہیں کہ ان کی جانب ہر مذہب کے لوگ کشاں کشاں چلتے آتے ہیں تو میں بھی وہاں حاضری کا تمنائی ہو جاتا ہوں۔۔۔ جیسے میں نظام الدین اولیاء سے غافل ہو کر امیر خسرو کے مزار پر پڑا رہا۔۔۔ مرزا غالب کی قبر پر حاضر ہوا۔۔۔ بلھے شاہ کے مرقد پر ، شاہ حسین، بابا فرید، سلطان باہو اور میاں محمد کی آرام گاہوں پر میری آنکھیں بھیگیں تو صرف اس لئے کہ وہ سب میری روح کے ترجمان تھے، میرے دل کا حال بیان کرتے تھے ورنہ۔۔۔ مجھے ان سے کچھ سروکار نہ تھا، اور عثمان مروندی بھی ان میں سے ایک تھے جن سے مجھے سروکارتھا، میری ایک ناتمام آرزو حیات کی ہمیشہ سے یہ رہی تھی کہ کبھی میں شہبازقلندر یعنی عثمان مروندی کے سالانہ عرس کے موقع پر سیہون شریف کا سفر اختیار کروں لیکن ان کا عرس ایسے حبس بھرے گرم موسموں میں آتاتھا کہ اس سفر سے ہول آتا تھا، میں بے شک قلندر کے چاہنے والوں میں سے تھا لیکن ایک کاہل اور آرام طلب چاہنے والا تھا، مجھے کوئی ایسا قلندر درکار تھا جس کا عرس موسم بہار کے نکھار میں ہو، موسم خوشگوار اور رنگ رنگیلے ہوں، ورنہ میری جانب سے حاضر نہ ہونے کی معذرت قبول کر لیجئے۔۔۔

ویسے لال شہباز قلندر کی نوبت دم دم اوردھم دھم میرے کانوں میں گونجتی رہتی تھی کہ میراباہاں کان کب کا ناکارہ ہو چکا تھا۔۔۔ آپ بے شک میرے بائیں کان کے برابر میں ڈھول، نقارے اور نوبتیں بجائیں مجھے کچھ خبر نہ ہوگی، بے شک بند سندھ میں تیری نوبت باجے، مجھے سنائی نہ دے گی۔
سندھڑی دا۔۔۔ سیہون دا۔۔۔ شہباز قلندر۔۔۔

اور بیٹھ وگے دریا جھولے لالن۔۔۔
نیچے دریائے سندھ بہتا رہے، مجھے اس کا بہاؤ سنائی نہ دے گا، ویسے شہباز قلندر ایک پاپولر رومانس ہے، ایک بیسٹ سیلر آئٹم ہے، نہ صرف سیاستدانوں اور وڈیروں کا بلکہ تمام فلمی اداکاراؤں ، ناچنے والیوں، گلوکاروں اور بھنگ کے نشے میں آسمانوں کی سیر کرتے ہوئے ملنگوں اور پاپ سنگرز کا پاپولر رومانس ہے۔۔۔ ان کا بیسٹ سیلر آئٹم ہے۔
شہباز قلندر کی دھوم مچا دے دھوم شہرت میں سب سے نمایاں کردار پاکستان بلکہ پنجابی فلم انڈسٹری کے ان موسیقاروں نے ادا کیا ہے جو کسی قدر جاہل تو تھے پر کمال کے باصلاحیت اور موسیقی کی پرکھ رکھنے والے لوگ تھے اور وہ سب شہباز قلندر کے گیت گاتے ان کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ گئے، انہوں نے اپنی عقیدت کی جہالت میں کیسی کیسی یادگار دھنیں تخلیق کیں۔۔۔
سخی شاہباز قلندر
علی دم دم دے اندر
لال میرے پت رکھیو بلا۔۔۔ جھولے لال قلندر
اور یہ کیسامعجزہ ہے کہ جس شخص کا نام عثمان تھا اور یہ نام ایک عقیدے کے پیروکاروں کے لئے ایک دشنام ہے تو وہ بھی اس کے گیت گاتے ہیں اگرچہ وہ عثمان ہے۔ چنانچہ سیہون شریف جوں جوں قریب آتا تھا، سخی شاہباز قلندر کی نوبت کی گونج بلند ہوتی جاتی تھی۔
نقارے بجتے جاتے تھے اور درگاہ کے نشیب میں سندھ بہتا جاتا تھا۔۔۔
مروند سے سندھ میں آنے والا عثمان۔۔۔ ایک پنجرے میں بند تھا۔۔۔ اس پنجرے کے آس پاس اس کے مرید آہ و فغاں کرتے اس سے مرادیں مانگتے تھے، فریادیں کرتے، دعائیں مانگتے تھے۔
پر اسے کوئی بھی اس پنجرے سے رہانہ کرتاتھا۔اسے عقیدت، عشق اور الفت کے پنجرے میں قید کردیا گیا تھا۔
اس کی درگاہ کی چوکھٹ پر لوگ سجدہ ریز ہوتے تھے۔
درودیوار کو چومتے آبدیدہ ہوتے تھے۔
چوکھٹ کا سہارا لئے ایک فقیر بے خود کیفیت میں جھومتا، قلندر، قلندر کے نعرے لگاتا تھا۔
مزار کے اندر ایک گونج تھی،
فریادوں، دعاؤں، درخواستوں کی ایک گونج تھی۔
منقش لکڑی کے درودیوار کے اندر قلندر دفن تھا، اور دیدہ زیب چوبی آرائش میں جالیاں نصب تھیں جن میں جھانکنے والے بہت تھے۔۔۔ سبز چادروں اور پھولوں کے ڈھیر میں پوشیدہ اس کی قبر تھی اور اس کے عین اوپر بہت فاصلوں پر ایک شان و شوکت والا روشن، دمکتا، مرصع اور دیدہ زیب نقاشیوں والا عظیم گنبد تھا جس کے گولائی میں مستطیل شکل کے روشن دان نصب تھے جن میں سے دن کی روشنی داخل ہو کر اس گنبد کی نیلاہٹ کو مزید نیلا کرتی تھی اور اس کے نقرئی رنگوں کو چند ھیاتی تھی۔
عثمان مروندی کے سر پر آکاش کی نیلاہٹ اور چاندی سجی تھی، اور یہ جو مسلسل گونج تھی اس کے مدفن میں ایک زندہ وجود کی مانند گونجتی، جس میں فریادیں اتنی بلند ہوتی تھیں کہ وہاں موجود ہر شخص کے کانوں میں گونجتی تھیں۔۔۔ کوئی دکھوں کا مارا جب ایک سسکی بھرتا تھا تو وہ سسکی گویا پوری فضا میں نشر ہونے لگتی تھی، کوئی آہ بھرتا تھا تو ہر جانب غدر برپا ہو جاتا تھا جیسے کل جہان آہ بھرتا ہو۔۔۔ اور وہاں ایک کونے میں کوئی پنجابی گلوکار کانوں پر ہاتھ دھرے نہایت پرسوز آواز میں قلندر کے قصیدے گاتا تھا تو وہ سوز دل کے اندر گونجتا اترتا جاتا تھا۔۔۔ وہ مجھے دیکھ کر چلا آیا اور میرے گھٹنوں کو چھو کر کہنے لگا۔۔۔ تارڑ صاحب اجازت ہے، آپ ہم لاہوریوں کے سوہنے سرکار ہیں، اور پھر چند درویشوں کے پاس جا بیٹھا، قلندر کے گیت الاپنے لگا۔۔۔ یہ جو دربار ہوتے ہیں رب کے پیارے اور سوہنے لوگوں کے وہاں عقیدت اور جذب کا ایک ایسا ماحول ایسا موسم اترا ہوتا ہے کہ وہاں ہم جیسے سیاہ کار جن کے تن کی سفید چادر کب کی کالی ہو چکی ہوتی ہے وہ بھی برگزیدہ ہو جاتے ہیں۔ لوگ ان کے بڑھاپے اور سراپے سے متاثر ہو کر ان کے گھٹنے چومنے لگتے ہیں۔۔۔ ان سے دعاؤں کے خواستگار ہوتے ہیں۔۔۔ شاید یہ میرے چہرے پر جو مسلسل اداسی کی پرچھائیاں ہیں یا میری ہمہ وقت سرخی میں ڈوبی آنکھیں ہیں جو لوگوں کو متوجہ کر لیتی ہیں، یہاں تک کہ مسجد نبویؐ میں کوئی سوڈانی سفید پوش بھیگی آنکھوں سے مجھ سے التجا کرتا ہے کہ میرے لئے دعا کرو۔۔۔ فجر کے وقت غار حرا میں داخل ہوتے ایرانی زائرین مجھے وہاں براجمان دیکھ کر میرے گھٹنوں کو چھوتے فارسی میں جانے کیا کیا کہتے ہیں اور بوڑھی عورتوں کی آنکھوں سے آنسو بہتے جاتے ہیں، سچل کے مزار پر بھی مجھ رند کو کچھ لوگوں نے جانے کیا خیال کیا اور اب یہاں عثمان مروندی کی درگاہ پر بھی دو تین لوگ آئے، جو مجھے نہ جانتے نہ پہنچانتے تھے، وہ میرے قریب آئے اور مجھ سے دعاؤں کی التجا کرنے

لگے۔۔۔ ابھی کچھ روز پیشتر مجھے بابا فرید شکر گنج کے مزارپر حاضری دینے کاشرف حاصل ہوا، وہاں دو نوجوان آئے اور ان میں سے ایک باقاعدہ میرے پاؤں پڑ گیا۔۔ میری بارش سے بھیگی ہوئی جرابوں کو ایک شاپر میں محفوظ کرکے لے گیا،
تو یہ کیا ہے؟
ظاہر ہے میں تو اب بھی ایک شک شبہے سے بھرا اکثر بے یقین ہو جانے والا شخص ہوں تو میں بے شک پاگل ہوں گا اگرمیں عقیدت اور محبت کے ان مظاہروں کو سنجیدگی سے لے لوں۔۔۔
تو پھر یہ کیا ہے؟

شہباز قلندر۔۔۔ ایک قید میں تھا

مستنصر حسین تارڑ

Posted Date : 03/05/2015

تو پھر یہ کیا ہے؟

ایک تو ماحول ہے۔۔۔

اور پھر شاید ان صوفیا کرام کی چکر بازی ہے کہ وہ اپنے فرض میں داخل ہونے والے کسی ایک سیاہ کار پر کیمرے کی زبان میں زوم اِن کر جاتے ہیں کہ اچھا تو یہ تارڑ ہے۔۔۔ اس نے صرف ایک الف تجھے درکار پر عمل نہیں کیا، دنیا بھر کی کتابیں پڑھتا اب بھٹکتا پھرتا ہے اگر یہ قصویٰ کے سوار کے پیچھے پیچھے چلا جاتا ہے اس احتیاط کے ساتھ کہ اُس کی مینگنیوں پر بھی پاؤں نہ آجائیں تو اسے کچھ عزت عطا کرتے ہیں، ہو سکتا ہے وہ ان لوگوں کی عقیدت سے مغلوب ہو کر راہ راست پر آ جائے۔

تو مجھ ایسے شخص کو اپنی آنکھوں میں نمی لانے والی عقیدت کے اظہار پر کچھ شرمندگی تو ہوتی ہے، اور وہ ہوئی۔۔۔

یہ عثمان مروندی کی مٹی پر بلند ہوتا وہ آسمان ہوتا گنبد تھا جو ہر آہ، ہر سسکی اور ہر فریاد کو ایک گونج میں ڈھالتا تھا، اُس کے مقفل احاطے یا پنجرے کا دربان ایک نہایت بیزار اور لوگوں کی فریادوں سے عاجز آیا ہوا ایک شخص تھا۔۔۔ قلندر خزانے کی کنجی اس کے پاس تھی اور ہر کوئی درخواست کرتا تھا کہ کھول دو۔۔۔ کھول دو اور وہ نہیں کھولتا تھا۔

جہاں بھی نظر جاتی وہاں پنج تن پاک کے نام نقش نظر آتے۔ اماموں کے نام لکھے ہوئے نظر نواز ہوتے۔۔۔ کہیں کوئی سیاہ پرچم نصب دکھائی دیتا۔ مجھے چاروں طرف چاریاروں میں سے صرف ایک کا نام ہی نظر نواز ہوتا یہاں تک کہ اسی عثمان کے عثمان غنی کا نام بھی کہیں نظر نہ آتا۔

عقیدے کی قید کے عجب سلسلے ہیں، اور یہ بجھارتیں کون بوجھ سکتا ہے۔ ایک گندمی رنگت کے جوان، چمڑے کی جیکٹ پہنے اور اُن کے ہمراہ ایک چھوٹی سی گول مٹول گڑیا بچی، نیلے پیراہن میں لپٹی گوری گوری پیاری بچی۔۔۔ بچی کے ہاتھوں میں کچھ پھول تھے۔

"تارڑ صاحب۔۔۔ آپ تو بچوں سے پیار کرتے ہیں، کیا آپ میری بچی کے سر پر پیار دے سکتے ہیں؟"

میں نے اُس کے نیلے حجاب پر اپنا ہاتھ رکھا۔۔۔

میری اس اکلوتی بچی کے دماغ میں ایک ٹیومر ہے۔۔۔ کچھ عرصہ پہلے اس کی آنکھوں کا نور جاتا رہا۔ یہ " اندھی ہو گئی۔۔۔ کوئی علاج کارگر نہ ہوا، کسی دوا سے شفا نہ ہوئی تو میں اسے لے کر قلندر کی درگاہ پر آیا، ان سے التجا کی، فریاد کی کہ میری معصوم بیٹی کی آنکھوں کا نُور واپس آجائے تو تارڑ صاحب۔۔۔ آپ دیکھ لیجیے کہ یہ دیکھ سکتی ہے۔۔۔ شکرانے کے طور پر شہباز قلندر کے حضور پھول پیش کرنے کے لیے آئی ہے۔۔۔ بیٹے یہ تارڑ انکل ہیں، یہ بچوں سے بہت محبت کرتے ہیں، انہیں سلام کرو"۔

اُس گڑیا بچی کے رخسار قدرے پھولے ہوئے تھے جیسے ذہنی طور پر ماؤف ہو جانے والے بچوں کے ہوتے ہیں لیکن وہ دیکھ سکتی تھی، مجھے دیکھ رہی تھی اور اپنے منے سے ہاتھوں سے مجھے سلام کر رہی تھی۔

تو کیا یہ ممکن ہے کہ ایک ایسی بچی جس کے دماغ میں ٹیومر کا سرطان پھیلتا ہو اور وہ اندھی ہو گئی ہو، اُسے شہباز قلندر نے بینائی عطا کر دی ہو۔۔۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا، میں تو ایک غیر وابستہ، صرف

مشاہدہ کرنے والا شخص ہوں، حتمی فیصلہ کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے۔۔۔
بہت برس ہو چکے جب میں ایک اداکار ہوا کرتا تھا، اور میں نے ٹیلی ویژن کی ایک بہت پسند کی جانے والی سیریل ”ایک حقیقت ایک فسانہ“ میں صحافی کا مرکزی کردار ادا کیا تھا، اور اُن میں سے ایک ڈرامہ ایسا تھا جس میں مجھے مختلف بہروپ بھرنے تھے۔ ایک قلی، ایک دکاندار، ایک فقیر وغیرہ کے ، تاکہ میں ان تجربات پر مبنی اپنے اخبار میں فیچر تحریر کر سکوں۔۔۔ ان میں سے ایک بہروپ لاہور شہر کی گلیوں بازاروں میں بھیک مانگتا ایک ایسے فقیر کا تھا جو پیوندوں سے آراستہ لبادہ پہنے کشکول پھیلائے دربدر ہوتا تھا۔
میں ایک نہایت مؤثر اور صورت شکل سے۔۔۔ گھنی ڈاڑھی اور سرخ آنکھوں کے ساتھ ایک خاندانی فقیر ثابت ہوا اور لاہور کی ٹولنگٹن مارکیٹ کے سامنے بھیک مانگتے ہوئے میرا کشکول لمحوں میں لبریز ہو گیا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے پورے ساڑھے بائیس روپے کمائے اور میرے علاوہ ٹیلی ویژن کے کیمرہ مینوں اور دیگر سٹاف نے اس ناگہانی آمدنی سے خوب عیش کی۔۔۔ بوتلیں نوش کیں اور کیپری کے سینڈوچ کھائے۔۔۔ بعد ازاں مجھے داتا دربار کی سیڑھیوں پر بٹھا دیا گیا اور وہاں بھی میرا کشکول سکوں اور نوٹوں سے بھر گیا۔ میں اپنا منظر ریکارڈ کروانے کے بعد، اُس روز گرمی شدت کی تھی، ٹیلی ویژن کی ویگن میں آ بیٹھا۔۔۔ میرے چہرے پر میک آپ کی دبیز تہہ تھی اور رخساروں سے گوند کے ساتھ چپکائی گئی ڈاڑھی ایک اذیت تھی جب۔۔۔ داتا دربار میں حاضری دینے والے کچھ لوگ میری جانب چلے آئے۔
ایک شکل سے بہت آسودہ لگتی، خوش نظر ادھیڑ عمر کی خاتون ویگن کے باہر شدت کی دھوپ میں ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی ”آپ میرے لیے دعا کیجیے۔۔۔ میں بہت مصیبت میں ہوں“۔
“اور میں تو لرز گیا۔ ”خاتون۔۔۔ میں تو ایک بہروپ ہوں۔۔۔ اداکار ہوں۔۔۔
میں جانتی ہوں کہ آپ تارڑ صاحب ہیں لیکن میں بہت مصیبت میں ہوں میرے لیے دعا کر دیجیے“۔”
ایک اور نہایت ہی سوگوار شکل کے صاحب نے میرے قدموں کے پاس دس روپے کا ایک نوٹ رکھ دیا ”میں بہت مشکل میں ہوں۔۔۔ آپ کی مہربانی۔۔۔ دعا کر دیجیے“۔
اور تب مجھے احساس ہوا تھا کہ خلق خدا کے بزار دُکھ ہیں۔۔۔ مجھ ایسا آسودہ اور بہ فضل خدا دکھوں سے دور ایک شخص تصور بھی نہیں کر سکتا کہ لوگ کن کن اذیتوں اور دکھوں میں مبتلا ہیں۔ بابا فرید ایسے بزرگ ہی خلق خدا کی نبض پر ہاتھ رکھ کر جان جاتے تھے کہ دُکھ سبھائے جگ۔۔۔ اور کوٹھے پر چڑھ کر دیکھا تو گھر گھر یہی آگ۔۔۔ اور خلق کے دکھوں کا مداوا بھی تو نہیں ہوتا تو خلق کیا کرے۔۔۔ جس معاشرے میں انصاف نہیں ملتا، مساوات کا کوئی تصور نہیں ہے، دُکھ کا درماں نہیں ہوتا تو خلق خدا کیا کرے تو پھر وہ اُن سے رجوع کرتی ہے جن کی قبریں زندہ ہوتی ہیں، چوکھٹوں کو چومتی فریادیں کرتی ہے، اُسے آسرا درکار ہوتا ہے، اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے کوئی سہارا درکار ہوتا ہے اور یہ آسرے اور سہارے صوفیا کرام کے مرقد ہوتے ہیں، وہاں حاضری دینے سے دُکھ کم ہوں یا نہ ہوں، دل تو ہلکا ہو جاتا ہے۔ آس امید کا ایک چراغ تو روشن ہوجاتا ہے بھلے اس کی روشنی سے حیات کی تاریکی دور ہو نہ ہو۔۔۔ ایک جُگنو تو ٹمٹمانے لگتا ہے۔

شاہ لطیف بھٹائی سندھ ہے
مستنصر حسین تارڑ
Posted Date : 10/05/2015
ہمیں رات سے پہلے بِھٹ شاہ پہنچنا تھا۔۔۔ اس ٹیلے پر پہنچنا تھا، اس بِھٹ پر جہاں آبادی سے دور ایک شاعر نے قیام کر لیا تھا اور اس ویرانے میں اس کی شاعری کی جادوگری سے بہار آ گئی تھی۔۔۔ وہ بِھٹ شاہ ہو گیا تھا۔
سندھ یاترا میں میری جو تین خواہشیں، دیکھ کہ دل کہ جاں سے اٹھتی ہیں۔ اُن میں سے دو پوری ہو چکی تھیں۔۔۔ سچل سرمست اور عثمان مروندی سے میل ہو چکا تھا اور اب شاہ عبداللطیف بھٹائی سے ملاقات ہونے والی تھی۔۔۔ کہاوت ہے کہ بھٹائی سندھ ہے۔۔۔ بھٹائی نہ ہوتا تو سندھ نہ ہوتا تو ہم دراصل سندھ سے ملاقات کرنے کو جا رہے تھے۔۔۔
کاگا سب تن کھائیو، چُن چُن کھائیو ماس

پیا ملن کی آس، دو نیناں مت کھائیو
چنانچہ یہ شاہ لطیف تھا جس کے ڈیرے کی منڈیر پر میں گناہوں کی ایک سیاہ پوٹلی کوّے کی صورت میں
آبیٹھا تھا۔۔ پر میں وہ کاگا تھا جو اپنا ہی ماس کھاتا تھا اور کائیں کائیں کرتا کہتا تھا۔۔ میں آیا مُکھ ویکھن کو۔۔
شاہ لطیف محض ایک شاعر نہ تھا، ایک کائنات تھا جس میں گھومتے سیّاروں اور ستاروں کا کچھ شمار نہیں
ہو سکتا۔۔ وہ ایک گھٹا گھنگھور تھی جو پیاسی سر زمین سندھ پر برسی، ایسے کہ سندھی زبان، ادب اور
یہاں جتنے بھی دل دھڑکتے تھے، آج تک اسی سے سیراب ہو رہے ہیں۔۔ فہمیدہ ریاض جس سے میری
شناسائی بھی ہے اور میں اس کی شاعری کی اثر انگیزی کا شکار بھی ہوں اُس نے کیا عمدہ کہا کہ۔۔ تمام
فنون لطیفہ کی طرح ادب میں بھی ایک الوہی صفت موجود ہے جو ”ناممکن“ میں ”سہل“ کا بیج بوتی ہے۔۔
سوچو تو مشکل اور محسوس کرو تو آسان۔۔ یہی ادب عالیہ کا خاصہ ہے۔۔ روسو ہو کہ شیکسپیئر یا بِھٹ کا
شاہ ،ان کی تخلیقات اسی لیے لازوال ہیں۔
رحیمن دھاگا پریم کا، مت توڑو چھٹکائے
ٹُوٹے تو پھرنا جُڑے، جُڑے گانٹھ پڑ جائے
انگریز محقق ڈاکٹر سورلے کا کہنا ہے کہ جو کچھ رُومی، جامی، حافظ نے کہا ہے شاہ لطیف نے اُسے کہیں
بہتر انداز میں بیان کیا ہے۔۔ اس بیان سے یہ نتیجہ اخذ نہ کیا جائے کہ شاہ اِن عظیم صوفی شعراء سے برتر
ہے۔۔ بلکہ جو کچھ وہ بیان کر چکے شاہ نے وہ سب کچھ بہتر انداز میں تخلیق کیا ہے۔ شاہ نے عوامی
کہانیوں کو اپنے عشق اور معرفت کے چولے پہنا کر ایک نئی معنویت سے آشکار کیا۔ سُورٹھ اور رائے ڈیاچ،
نُوری جام تماچی، سسی پنّوں، مومل رانو، عُمر ماروی یہاں تک کہ پنجاب کا قصہ سوہنی مہینوال، یہ سب
قصے شاہ کے الوہی قلم میں سے نئی داستانوں اور نئی معنویت کی صورت نکلے۔
اب یہاں میں تھوڑا سا بھٹک جانا چاہتا ہوں اور اپنے پڑھنے والوں کو اپنی ایک حیرت میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔
سوہنی گجرات کے ایک کمہار کی بیٹی تھی، وہ اپنے شہزادے عزت بیگ سے ملاقات کرنے، اپنے مہینوال
سے ملنے یہ جاننے کے باوجود کہ اُسے ہر شب چناب کے پار لے جانے والا گھڑا بدل دیا گیا ہے، ایک کچے
گھڑے کے آسرے دریا میں اتر گئی۔۔
سوہنی گھڑے نُوں آکھدی، اَج مینوں پار لنگھا گھڑیا
کچّا گھڑا اس کی منت سماجت کے باوجود اُسے پار نہ لے جا سکا۔۔ چناب کے پانیوں میں گھل گیا اور
سوہنی ڈوب گئی۔ ایک بار میں اور گلوکار شوکت علی اسلام آباد سے لاہور ایک فوکر فرنیڈ شپ جہاز میں آ
رہے تھے اور کھڑکی تلے ہمیں دریائے چناب نظر آیا جسے عاشقوں کا دریا بھی کہا جاتا ہے تو شوکت کہنے
لگا، تاڑ بھائی، لوگ پوچھتے ہیں کہ سوہنی کی قبر کہاں ہے تو چناب کا کُل بھاؤ سوہنی کی قبر ہے۔۔ میں
حیرت کا شکار تب ہوا جب 24 مارچ کے روزنامہ ”ڈان“ میں ریما عباسی کا تحقیق کردہ ایک مقالہ ”دے شرائن
آف ڈیفائنٹ لَو“ کے عنوان سے نظر نواز ہوا۔ سوہنی ہے شک چناب میں ڈوب گئی لیکن جانے کیسے اس کی
قبر شہداد پور کے قصبے سے کچھ فاصلے پر موجود ہے۔ اگرچہ لوک داستان کے مطابق سوہنی اور مہینوال
ایک ہی قبرمیں دفن ہو گئے، لیکن جس مقام پر دریا کی لہروں نے اُن کی لاشوں کو کنارے کے سپرد کیا
انہیں وہیں دفن کر دیا گیا لیکن ایک غیر محرم مرد کے ساتھ ایک عورت کا دفن ہونا کچھ لوگوں کو منظور نہ تھا
چنانچہ۔۔ وہاں صرف سوہنی دفن ہے اگرچہ اُس کے مقبرے پر لکھا ہے ”مائی سُتھی مزار“ سوہنی کو
سندھی میں سُتھی کہا جاتا ہے۔ شہداد پور کے بہت گھنے اور لوگوں کے ہجوم سے ٹھنسے پڑے سنار بازار
کے درمیان میں سوہنی کی قبر ہے۔ اس مزار میں سوہنی کے چاہنے والے فقیروں اور فقیرنیوں کی ڈھیریاں
ہیں جن پر چنریاں سجی ہیں۔ سوہنی کے مزار کا کتبہ کسی ایرانی کاریگر کے ہاتھوں کا تراشا ہوا ہے اور اُس
پر فارسی میں ا یک دُعا نقش ہے۔۔ دُعا پانیوں کی خواہش کی ہے۔۔ کہ سوہنی کے صدقے جو چناب کے
پانیوں میں ڈوب گئی اس دھرتی کو پانیوں سے سیراب کر دے۔
اور سوہنی کی قبر پر کس کا کلام ثبت ہے۔۔ شاہ لطیف کا۔۔ اُس کے ”سُر سوہنی“ کے اشعار درج ہیں۔۔ مزار
پر موجود ایک اجنبی کہتا ہے ”شاہ لطیف اکثر سوہنی کے مزار پر حاضری دینے آیا کرتے تھے اور رات بھر گاتے
رہتے تھے۔۔ اب بھی اُن کی دُعاکا آغاز یہاں سے ہوتا ہے۔ یہ محبت کا مندر ہے، یہاں محبت کے مارے لو گ
آتے ہیں اور سوہنی کی قبر کے پاؤں میں دیئے جلاتے ہیں، اگر بتیاں سلگاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سوہنی
مہینوال سندھ اور پنجاب کی سب سے زیادہ غمناک اور المیہ رومانوی داستان ہے۔ سوہنی کی قبر پر چراغ
روشن کرتی سلطانہ نام کی ایک خاتون نے کہا ”ہم جانتے ہیں کہ سوہنی اُن پانیوں کی حکمران ہے۔ اُن پر
راج کرتی ہے جنہوں نے اُسے ڈبو دیا۔۔ پانی اُس کے تابع ہیں، وہ چاہے تو وہ سیلاب ہو جائیں اور چاہے تو
سمٹ جائیں“۔ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد یہ طے ہے کہ کبھی نہ کبھی میں نے شہداد پور کا سفر اختیار
کرنا ہے۔۔ اُس سے شکایت کرنی ہے کہ میں اور تم چناب کے پانیوں کے پروردہ ہیں تو۔۔ اتنی دور کیوں آ دفن

ہوئی ہو۔۔۔ اپنے گجرات اور چناب کے آس پاس کہیں تمہاری قبر ہوتی تو ہم بھی تم سے التجا کرتے۔۔۔ کہ ہماری سوہنی ہم سے ملا دے۔۔۔ کچھ دیئے جلا دیتے۔ جیسے بلھے شاہ نے مختلف کافیاں کلاسیکی راگوں کے سُرسنگیت کے سُروں میں تخلیق کیں۔۔۔ اور یاد رہے کہ شاہ بھٹائی کی مانند بلھے شاہ بھی کمال کے گلوکار اور موسیقار تھے۔ شہر قصور میں جو اُن کا مزار ہے اس کے پہلو میں ایک ”عجائب گھر“ ہے جس میں اُن کی ٹوپی، لبادے کے علاوہ اُن کا وہ قدیم ستار نما ساز بھی دیکھا جا سکتا ہے جسے وہ بجاتے تھے گاتے تھے۔۔۔ ایسے ہی شاہ لطیف کی ستار بھی ابھی تک ایک شوکیس میں محفوظ ہے۔۔۔ چنانچہ بلھے شاہ کی مانند شاہ لطیف نے بھی مختلف راگوں سے اپنی شاعری کو ہم آہنگ کیا۔۔۔ سُر کلیان، سُر کھنبات، سُر آسا، سُر بلاول، سُر رام کلی، سُر سارنگ اور سُر سوہنی۔۔۔ میں نے شاہ کی شاعری کے صحرائے اعظم میں سے ریت کے چند ذرّے چُن کر نشاندہی کی ہے۔۔۔ ورنہ اس صحرا میں کیسے کیسے مجنوں بھٹکتے ہیں، کیسے کیسے غزال چوکڑیاں بھرتے ہیں، میں ان کا کھوج لگانے سے قاصر ہوں۔

سکھیوں نے کی تیاری۔۔۔ اب دُور دیس ہے جانا
تیرے نینوں میں ہے نندیا
کر لے کچھ یاد سجن کی، جیون ہے رین بسیرا
تیرے نینوں میں ہے نندیا
سُن اس کو کان لگا کر، باجے ہے کُوچ کا ڈنکا
تیرے نینوں میں ہے نندیا
مایا ہے آنی جانی، رکھ دھیان سدا سجن کا
تیرے نینوں میں ہے نندیا
جگ جیون کا ہے سپنا، بہتے پانی پر چھایا
تیرے نینوں میں ہے نندیا

” آں۔۔۔ غاں۔۔۔ غا۔۔۔ آ۔۔۔ آ۔۔۔ ہوں آں“ اُس کے حلق سے عجیب سی آوازیں برآمد ہو رہی تھیں اور وہ اپنے تئیں کبھی دونوں ہاتھ بلند کر کے کبھی سینے پر باندھ کر مجھ سے باتیں کرتا مجھے کچھ سمجھانے کی سعی کر رہا تھا۔

درمیانی عمر کا شخص، ایک پرانی سندھی ٹوپی پہنے جو لگتا تھا کہ اُس نے کہیں جوانی میں پہنی ہو گی اور آج تک اُسے اپنے سر سے جدا نہیں کیا۔ قدرے باؤلا لگتا شاہ لطیف کے مزار کا رکھوالا، غلام حسین مجھ سے لپٹتا جاتا تھا اور ایک گونگے کی مانند جو کہ وہ پیدائشی طور پر تھا۔۔۔ غاں غاں غوں غوں کرتا اپنی مسرت کا اظہار کرتا چلا جاتا تھا۔ اُس نے مجھے پہچان لیا تھا۔

ہٹائی کا رکھوالا میرا گونگا مُرید

مستنصر حسین تارڑ

Posted Date : 13/05/2015

مزار کی جالی کو آنکھوں سے چومتے شخص نے میری حیرت بھانپتے ہوئے کہا ”سائیں، یہ غلام حسین شاہ لطیف کا اتنا شیدائی تھا کہ اپنی مرضی سے بغیر کسی معاوضے کے یہاں جھاڑو دیا کرتا تھا، ان کے عشق میں اتنا فنا تھا کہ اوقاف والوں نے متاثر ہو کر اسے یہاں کا رکھوالا متعین کردیا۔۔۔ یہ جب چاہے جسے چاہے شاہ کا دیدار کروادے اور جسے چاہے دھتکار دے۔۔۔ اس کے موڈ پر منحصر ہے۔

وہ مسرت سے مغلوب ہوتا میرے رخساروں کو چھوتا اور پھرانگلیوں سے فضا میں ایک مستطیل کھینچ کر اپنے تئیں ٹیلی ویژن کی سکرین بناتا کہ میں نے تمہیں اس میں دیکھا ہے۔ کبھی میرے سفید بالوں کو ہاتھ لگا کر منہ بناتا اور غوں غوں کرتا گویا کہتا کہ تم بوڑھے ہو گئے ہو، تب تمہارے بال سیاہ تھے، بہت شکل والے تھے۔۔۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔۔۔

بعد میں محکمہ اوقاف کے ایک اہلکار نے ترجمانی کی کہ یہ آپ کو صبح کی نشریات میں برسوں دیکھتا رہا تھا اور کہتا ہے کہ آج آپ کو دیکھنے سے میرے من کی مراد پوری ہو گئی ہے، یہ آپ سے ملاقات کے لئے شاہ کے حضور روزانہ دعائیں کرتا تھا۔۔۔ اس نے اخباروں میں شائع ہونے والی آپ کی تصویریں کاٹ کر گھر میں سجا رکھی ہیں۔۔۔

میں اس اُلفت کے اظہار پر کیسے متاثر نہ ہوتا۔۔۔ میرا گلا رندھ گیا۔۔۔ ٹیلی ویژن پر نموداری کی جھوٹی اور عارضی شہرت آج شاہ لطیف کے دربار میں میرے کام آگئی تھی۔۔۔ اس کا بس چلتا تو وہ مجھے شاہ لطیف کے مزار کے برابر میں لٹا کر مجھ پر سبز رنگ کی ایک چادر ڈال کر میرے گرد جھومر ناچنے لگتا۔۔۔ میرے ہم

سفر غلام حسین کی گونگی محبت اور میری شکر گزار لاچارگی دیکھ دیکھ مسکراتے تھے۔
غلام حسین نے ذرا سختی سے اشارہ کیا کہ یہیں ٹھہرو۔۔ کہیں مت جانا اور پھر جانے کہاں گیا، واپس آیا ہانپتا ہوا تو اس کے ہاتھ میں چابیوں ا یک گچھا تھا۔ ان میں سے جو سب سے بڑی چابی تھی وہ شاہ کے مزار کے چھوٹے سے کھڑکی نما مقفل دروازے کی تھی۔ اس نے وہ در کھول کے اس کے کواڑ وا کردیئے۔۔ غاں غاں۔۔ اس نے مجھے دھکیلا۔۔ یعنی تم اندر چلے جاؤ، شاہ کے سرہانے بیٹھ کر اپنے دل کی بات کہہ دو۔۔ چلو چلو۔۔ اس لمحے مرقد کے اندرموجودجو شاہ کے شیدائی اور متوالے تھے وہ مجھے حسرت سے دیکھتے تھے۔۔ میں فاتحہ پڑھ کر فارغ ہوا تو اس نے مجھے اشارہ کیا کہ ابھی وہیں ٹھہرے رہو۔۔ میں ابھی آیا اور پھر غائب ہوگیا۔
کچھ دیر بعد نمودار ہوا تو رنگ رنگ کے کپڑوں اور چادروں کا ایک پلندہ اٹھائے ہوئے تھا۔۔ اور ان میں ایک نہایت دبیز گہری بریاول والی چادر تھی جس پر چاندی رنگ تاروں سے گُل بوٹے نقش تھے اور آیات قرآنی کی دل "کش سیاہ رنگ میں خطاطی تھی۔ یہ ۔۔ تم شاہ لطیف کی قبر پر چڑھا دو۔۔
شاہ نے پہلے بھی متعدد چولے پہن رکھے تھے۔۔ ایک دبیز سراسر سُرخ چادر کے اوپر نیلے حاشیے والی ایک اور بیش قیمت چادر بچھی تھی جس پر سنہری آرائشیں جگمگاتی تھیں اور ان کے اوپر میں نے غلام حسین کی عنایت کردہ سبز چادر ایک عجیب دل گرفتہ اور دل فریب سی کیفیت میں یوں پیار سے بچھا دی جیسے اس کے نیچے جو وجودہے وہ زندہ ہے، حق موجود رہتا ہے، سچ زندہ رہتا ہے۔ اس چادر کو تھپک تھپک کر سنوارا جیسے کسی سوتے ہوئے بچے پر کمبل ڈال کر اسے یوں تھپکتے ہیں کہ وہ جان تو جائے کہ یہ کمبل مجھے وہ اوڑھاتا ہے جو مجھ سے بے پناہ الفت رکھتا ہے لیکن اس کی نیند میں خلل بھی نہ آئے، یہ دھیان بھی رکھتے ہیں۔۔ مجھے تو گمان بھی نہ تھا کہ مجھے اتنی قربت نصیب ہو جائے گی۔

روئے زیبا دکھا گیا کوئی
مست و بے خود بنا گیا کوئی
کل سر شام چاندنی کی طرح
بزم گیتی پہ چھا گیا کوئی
یوں نظر میں سما گیا کوئی
محو حیرت بنا گیا کوئی
خرقۂ سبز فام میں آکر
روح میں لہلہا گیا کوئی
اب ابد تک سکوت برلب ہوں
راز ایسا بتا گیا کوئی
(سُرمومل رانو، ترجمہ شیخ ایاز)

بھٹ شاہ میں داخل ہونے پر بائیں جانب ایک جھیل نظر آئی جس کے پار کسی مقبرے کے آثار تھے۔
شیخ ایاز نے وصیت کی تھی کہ انہیں کسی قبرستان میں نہیں، اس جھیل کے کناروں پر دفن کیا جائے۔۔ ” شاعری کی پرکھ رکھنے والے کہتے ہیں کہ شاہ لطیف کے بعد شیخ ایاز سندھ کے سب سے بڑے شاعر ہیں“۔ واپسی پر حاضری دیں گے کہ ۔۔ جمیل بتا رہا تھا۔
اس گونگے دلدار نے صرف اس پر اکتفا نہ کیا۔۔ اس نے ایک سرخ رنگ کی رومال نما چادر میرے گلے میں ڈال دی۔۔ یہ شاہ کی جانب سے تمہارے گلے کا ہار ہے۔۔ نہ صرف مجھے بلکہ اس نے دیدہ دل اور جمیل کو بھی رنگین چادریں اوڑھا دیں۔ میرے سامنے ایک تصویر ہے۔۔
شاہ لطیف کے مقبرے کی پُرپیچ اور نہایت پیچیدہ شکل کی جالی ہے جس میں سے شاہ لطیف کا ابدی گھر پھولوں اور چادروں میں ڈھکا ہوا ہے۔۔ اس کے دروازے میں گلاب کے پھولوں کی کھڑکی میں غلام حسین کا مسکراتا ہوا بے زبان چہرہ ہے اور اس کے آگے ہم تینوں روشنیوں میں آتے ہوتے ہیں۔ ہمارے چہرے روشن۔۔ میرے سفید بال روشن اور گلے میں ڈالی ہوئی چادر سرخ روشن۔۔ درمیان میں باریش مسکراتا ہوا دیدہ دل ایک سبز اور سرخ چادر اوڑھے ہوئے، جیسے موہنجو ڈارو کا گرینڈ پریسٹ ابھی ابھی مسلمان ہوا ہے کہ چادر پر مقدس آیات نقش ہیں اور پھر جمیل۔۔ وہ اگر شاہ لطیف کی اس چادر کو زندگی بھر اوڑھے رکھے تو یہ اس کا سب سے دیدہ زیب پہناوا ہو سکتا ہے۔ وہ اتنا خوش وجاہت لگ رہا تھا۔
ہم تینوں کی دائیں جانب مزار کی جالی کو چھوتا ایک سفید ریش ملنگ دکھائی دے رہا ہے۔ غلام حسین ہم سب کو اپنی محبت سے زیر کرتا، ہمیں ہانکتا ہوا اس حجرے میں لے گیا اور یہ بھی مقفل تھا۔ کسی کسی کے لئے کھلتا تھا، ہمارے لئے کھل گیا۔۔ اس حجرے میں لے گیا جس کی نیلی آرائشیں کمال کی تھیں، دیواریں نقش در نقش نیلاہٹ کے جمال میں دل کش۔۔

اور اس حجرے میں شاہ کا رانگلا پلنگ موجود تھا جس پر رَلی کی سندھی چادر بچھی ہوئی تھی اور اس پر شاہ کا عصا جس کی مٹھی چاندی کی بنی ہوئی تھی۔ ایک عقاب کی صورت میں، وہ عصا اس پلنگ پر رکھا تھا۔۔ چاندی کی مٹھی پر کوئی عربی عبارت ابھرتی تھی۔
یہ گویا معرفت اور جذب کے جنگل بیلے میں، بچھا ہیر کا رانگلا پلنگ تھا جو وصال کی خواہش میں تھا اور وہ عصا گویا عشق کے سمندروں کو دونیم کرتا ان میں ایک ایسا راستہ تخلیق کرتا تھا جو محبوب کے گھر تک جاتا تھا۔ اگرچہ غلام حسین مجھ پرنچھاور ہوا جاتا تھا لیکن جب میں نے اس سے پوچھا کہ کیا میں ایک پل کے لئے شاہ کے پلنگ پر بیٹھ جاؤں تو اس نے غوں غاں کرتے سنجیدگی سے اظہار کیا کہ نہیں۔۔ یہ شاہ کا پلنگ ہے۔۔ اس پر تم نہیں بیٹھ سکتے البتہ اس نے ہمیں شاہ کے عصا کو تھامنے دیا۔۔اب ایک عصا، عام سی لکڑی سے تراشیدہ، بے شک اس کی مٹھی چاندی کی ہو وہ ہم جیسوں کے تھامنے سے تو معجزہ آور نہیں ہو سکتا۔۔ اس کے لئے ایک موسیٰ، ایک شاہ لطیف کا ہاتھ درکار ہوتا ہے۔
اور ہاں شاہ کے حجرے کے باہر جو صحن تھا وہ اس پوری عمارت میں سب سے دل نشیں اور دل کو گرفت میں لے لینے والی خوبصورت نقاشی سے مزین تھا، حجرے سے باہر ایک برآمدے میں شیشے کے شو کیسوں میں شاہ کی نشانیاں محفوظ تھیں۔۔
ایک قدیم قرآن پاک جو ایک روایت کے مطابق شاہ نے اپنے ہاتھوں سے لکھا۔۔ اور یہ بہر طور طے ہے کہ وہ ان کے ہاتھوں کا لکھا ہوا اگر نہیں ہے تو بھی یہ ان کے زیر مطالعہ رہتاتھا۔
اور پھر ایک شو کیس میں ایک متروک شدہ پرانا ساز تھا۔ جس کی نسبت شاہ سے جڑتی تھی۔ جس شخص نے اپنی شاعری کو درجنوں راگوں اور سُروں میں ڈھالا ہو وہ خود بھی تو موسیقی کی نہ صرف پرکھ رکھتا ہو گا بلکہ کسی نہ کسی ساز کی تاروں کو چھیڑ کر اپنی شاعری ترتیب دیتا ہوگا۔ اور خود بھی گاتا ہوگا۔
تمام تو نہیں پر بیشتر صوفی شعراء ساز بجاتے تھے اور ان کی دُھن پر اپنا کلام گاتے تھے۔۔ بابا فرید کے بارے میں بھی یہی روایت ہے۔
بابا گورونانک اپنے مسلمان مرید بھائی مروانہ کے ہمراہ پنجاب کے دیہات میں اپنے شبد گاتے، خلق خداکو وحدانیت کا پرچار کرتے دربدر ہوتے تھے۔ بابا بلھے شاہ کے مزار سے متصل جو اُن کے آثار کا ایک عجائب خانہ ہے اس میں ان کے لبادے اور ٹوپی کے علاوہ انکا ذاتی سازبھی نمائش پر ہے۔
مولانا روم کو بھی بانسری سے شغف تھا۔
امیر خسرو کا کیا ذکر کہ وہ تو خود ایک ساز تھے۔
شاہ لطیف بھی سُروں کی اسی مالا میں پروئے ہوئے ہیں۔ شاعر بھی، سازندے اور گلوکار بھی۔۔ جو سوہنی کے مزار پر رات بھر گاتے تھے:
او پیارے مہینوال بچا لے گہری ہے منجدھار
کوئی نہیں اس گھاٹ پر ساجن میرا کھیون ہار
کچا گھڑا ہے رین اندھیری، کون سنے گا بپتا میری
تاک میں چاروں اور کھڑے ہیں کتنے ہی خونخوار
او پیارے مہینوال بچا لے گہری ہے منجدھار
غلام حسین نے ہمیں اوقاف کے دفتر میں لے جا کر ہمارے سامنے شاہ کا لنگر سجا دیا۔ اور جب رخصت ہونے لگے تو دیدہ دل نے محض شکرگزاری کے جذبے کے اظہار کے طور پر کچھ رقم اس کی خدمت میں پیش کی جو اس نے ٹھکرا دی۔۔ اسے ناگوارگزرا۔۔ اور وہ میری جانب اشارے کرتا گویا کہتاتھا کہ۔۔ اس کے لئے بس اس کے لئے۔۔
شاہ لطیف کے مزار پر مجھے قرار آ گیا، میں بہت آسودہ اور ذہنی طور پر ایک اطمینان اور امن میں آیا۔۔ سچل کے مزار پر بھی اسی کیفیت سے شناسائی ہوئی جبکہ شہباز قلندر کے ہاں ایسانہ ہوا۔۔ بے شک بند سندھ میں اس کی نوبت باجتی تھی پر میرے من میں نہ باجی۔۔
شاید اس لئے کہ شاہ لطیف اور سچل محض درویش نہ تھے، صوفی نہ تھے بلکہ شاعر، گلوکار اور موسیقار بھی تھے۔ تخلیق کارتھے اور مجھے بھی کچھ زعم تھا کہ میں حرف کے معجزے کو زنجیر کر سکتا ہوں۔۔ وہ میرے ہم پیشہ اور ہمسائے تھے۔۔ محض قلندر نہ تھے

تھر کی ہندو لڑکیاں اور مسلمان گڈریے
مستنصر حسین تارڑ
Posted Date : 17/05/2015

مجھے بہت سے وسوسے تھے، کچھ وہم دل گیر ہوتے تھے کہ بالآخر جب ہم ننگر پار کر پہنچیں گے تو شب بسری کا بندوبست جانے کیسا ہو۔۔ شاید کوئی تھری گھاس کا جھونپڑا جسے سندھی میں ”چونرو“ کہا جاتا ہے۔ کوئی بد بو دار کمرہ اور شاید ٹائلٹ کے لیے صحرا میں جا بیٹھنا پڑے۔ اس قدیم جینی گھر میں کھوسہ صاحب نے اپنا ذاتی بیڈ روم میرے لیے مخصوص کر رکھا تھا جہاں کیسی کیسی گھریلو آسائشیں تھیں۔
جی خوش ہو گیا۔۔
ایک مخملی پردوں میں پوشیدہ شاندار پلنگ اور ستھرے بیڈ کور۔۔ صوفے اور ایک وسیع سب سہولتوں والا واش روم۔۔ جی خوش ہو گیا۔
میں ننگر پارکر سے خوش ہو گیا۔
میں سفر کی تھکن اور صحرا کی ریت ایک شاور کے پانیوں میں بہا کر قدرے نوخیز ہو گیا۔۔ بیڈ روم سے متصل لونگ روم میں کھوسہ صاحب میرے منتظر تھے۔۔ اب میں اس خیال میں تھا کہ وہ ایک بڑا سارا پگڑ باندھے، بڑی بڑی خونخوار مونچھوں والے بوڑھے کھوسٹ ہوں گے پر وہ تو ایک خوش وجاہت اور خوش لباس قسم کے کھوسہ صاحب تھے جو کسی پرانی فلم کے ہیرو لگتے تھے۔۔ اُنہیں دیکھ کر پھر جی خوش ہو گیا۔
وہ صحرا کے اندر کسی گاؤں میں کوئی خاندانی جھگڑا نمٹانے کے بعد ایک اور گاؤں میں کسی شادی میں شریک ہونے کے بعد کشاں کشاں ہمارے لیے واپس آ گئے تھے۔۔ چائے کے ساتھ دیگر لوازمات کا دور چلا اور پھر کھوسہ کہنے لگے ”تارڑ صاحب کھانا تیار ہے۔۔ کیا کھانے سے فارغ ہو کر آپ آرام کرنا پسند کریں گے۔۔ آپ یقیناًبے حد تھک گئے ہوں گے“۔
میں غسل فرمانے کے بعد اتنا تازہ دم ہو چکا ہوں کہ آپ کے تھر کے اندر ایک غزال کی مانند چوکڑیاں بھر ” سکتا ہوں۔۔ قدرے عمر رسیدہ غزال کی مانند بس دو چار چوکڑیاں“۔
جیسے میں خوش تھا ایسے کھوسہ بھی میرے اس بیان سے خوش ہو گئے ”میری ایک درخواست ہے، ننگر پارکر سے کچھ دور صحرا کے اندر میرا ایک ڈیرہ ہے۔ ایک سادہ سا مہمان خانہ ہے۔۔ وہاں بھی آپ کے لیے کچھ بدوبست ہیں، مجھے خدمت کا موقع دیں۔ آپ اس ماحول کو پسند فرمائیں گے۔۔“ اب ذرا کھوسہ صاحب کی معصومیت ملاحظہ فرمائیے کہ وہ ایک حافظ جی سے پوچھ رہے ہیں کہ حافظ جی آپ کو حلوہ پسند ہے۔۔ ہم تو حافظ ہی اس لیے ہوئے تھے کہ حلوہ کھانے کو ملے گا۔۔ ننگر پارکر کے صحرا کے اندر، اُس شاندار ریتلے ویرانے کے درمیان کہیں آج کی رات۔۔ کون کافر انکار کر سکتا تھا۔
کھوسہ صاحب کی لینڈ کروزر شب کے سناٹے میں چپ صحرا کے اندر چلی جا رہی تھی اور اُس کے عقب میں جو سرخ روشنیاں بریکوں کے لگنے سے جلتی بجھتی تھیں، دیدہ دل کی پراڈو ان پر آنکھیں رکھتی اس کے تعاقب میں چلی جاتی تھی۔
دیکھا، میں نے اپنے دل سے کہا، تم سے کہا تھا ناں کہ ذرا ہمت کرو۔۔ بے شک تمہاری دھڑکن اب بے ربط ہوتی ہے کسی بھی لمحے رُک سکتی ہے لیکن ذرا ہمت کرو تمہیں انعام ملیں گے۔۔ دیکھا، میں نے اپنے بدن سے کہا، تم کہتے تھے ناں کہ تم میں سکت نہیں رہی، مجھے مت طویل مسافتوں کے لیے مجبور کرو اور میں نے کہا تھا، گھر سے نکلو، چاہے ایک اپاہج کی مانند گھسٹتے ہوئے نکلو، تمہیں انعام ملیں گے۔
اب اے دل کی دھڑکن اور خزاں رسیدہ بدن دیکھ، انعام مل رہا ہے۔۔ صحرائے تھرپار کر کی رات ہے۔۔ آس پاس ویرانیاں دم بخود ہیں، ریت کے ٹیلے چپ ہیں اور خار دار جھاڑیاں ایک سناٹے میں ہیں اور اے دل اور اے بدن یہی تو انعام ہے کہ صحرا کی رات میں ہم کسی اجنبی مقام کی جانب چلے جاتے ہیں۔۔ پراڈو کی ونڈ سکرین میں سے ریت اڑاتے ایک لینڈ کروزر کی عقبی روشنیاں نظر آ رہی ہیں اور ہم اُن کا تعاقب کرتے چلے جا رہے ہیں۔ جانے کہاں چلے جا رہے ہیں۔۔ یہی تو انعام ہے۔۔ معلوم سے نامعلوم تک کا سفر۔۔ جیسے دم نکلے تو رُوح کا معلوم سے نامعلوم تک کا سفر۔۔
بائیں جانب صحراکے گھپ اندھیروں میں کچھ روشنیاں ظاہر ہوئیں۔ ہم ایک چار دیواری کے اندر داخل ہوئے، یہ وہ مہمان خانہ تھا جس کا وعدہ کھوسہ صاحب نے ہم سے کیا تھا اور اس کے آگے چار دیواری کے اندر جو ایک وسیع احاطہ تھا وہاں ایک الاؤ کب کا روشن ہو چکا بھڑکتا تھا اور اُس میں سے جو چنگاریاں پھوٹتی تھیں وہ صحرا کے تاریک آسمان کو اُٹھتی پھل جھڑیوں کی خانہ چھوٹتی تھیں۔
الاؤ کے گرد آرام دہ کرسیاں سجی تھیں اور اُن کے گرد دو تین تاریکی میں روپوش ہیولے منڈلاتے تھے۔۔ جو ہر نوعیت کے کھانے پینے کے بندوبست نہایت خاموشی سے کرتے پھرتے تھے۔
عجب صحراؤں کے بھید میں اترتی شب تھی۔
منیر نیازی نے کہا تھا ناں کہ۔۔ جس کو دیکھا خمار میں دیکھا، یہ کرشمہ بہار میں دیکھا تو میں نے یہ کرشمہ اُس شب ننگر پارکر کے صحرا کے فسوں میں دیکھا کہ سب کو دیکھا خمار میں دیکھا۔

دیدہ دل کی شکل پر الاؤ کی روشنی بھڑکتی تھی اور وہ واقعی موہنجو ڈارو کا ڈاڑھی والا پروہت دکھائی دے رہا تھا، ہم کیسے نصیب والے تھے کہ وہ اپنی نرتکیوں اور دیو داسیوں اور موہنجو کی ناریاں چھوڑ کر پانچ ہزار برس کا سفر طے کر کے ہمارا ڈرائیور ہو گیا تھا۔
جمیل عباسی کا چہرہ چنگاریوں کے چھوٹنے سے انار ہوتا تھا۔ گمان ہوتا تھا کہ وہ بھی دراصل موہنجو کے پروہت کا ایک چیلا ہے جو اُس کے ساتھ چلا آیا ہے۔
کامران ایک ہر کو لیس کی مانند بہتر تصویر کے زاویے کے لیے صحرا میں بھٹکتا تھا۔
اور اس صحرا کے درمیان میں بھڑکتے الاؤ کی روشنی میں، میں کیا دکھائی دیتا تھا۔ یہ میں کیا جانوں، وہ جانیں جو مجھے دیکھتے تھے کہ میں تو صحرا کے خمار کے کرشمے میں مخمور تھا۔۔۔

تھر کے چاند کا تھال
مستنصر حسین تارڑ
Posted Date : 20/05/2015
جمیل، بار بار ایک غزال شب ہوا جاتا تھا، اپنی نشست سے اٹھتا اور احاطے سے باہر نکل کر صحرا میں گم ہو جاتا، شاید مجنوں کی مانند اپنی لیلیٰ عظمیٰ کو پکارتا اور پھر واپس آ کر زیر لب گنگنانے لگتا۔۔۔ اِک بار کہو تم میری ہو۔۔۔
وہ اپنی آوارہ خرامی صحرا نوروی سے لوٹتا تو میں پوچھتا۔۔۔ جمیل کہاں تھے۔۔۔
"بس یہیں تھا سر۔۔۔"
"یہیں کہاں۔۔۔"
"بس یہیں"
"کہاں یہیں؟"
"بس یہیں یہیں سر۔۔۔"
سر دار خان کھوسہ ایک ایسا شخص تھا جس کی آپ پرکھ نہیں کر سکتے، پہچان نہیں کر سکتے کہ وہ کون ہے، کیا سوچتا ہے اور اس لمحے وہ آپ کے ساتھ ہے تو واقعی آپ کے ساتھ ہے یا کہیں اور ہے۔ وہ تھر کے صحرا کی مانند اپنا بھید کسی پر ظاہر نہ کرتا تھا۔
وہ ہمیں، میری فرمائش پر مقامی آبادی کے مسائل اور حیات کی کٹھنائیوں کے بارے میں تفصیل سے تذکرہ کرتے تھے۔
میرے آباء و اجداد 1971ء کی جنگ کے بعد ننگر پارکر میں منتقل ہو گئے۔۔۔ یہاں کے لوگ جن میں سے بیشتر ہندو ہیں میری بہت تعظیم کرتے ہیں اور میں اُن کی ثقافت اور اُن کی عبادت کا دھیان رکھتا ہوں۔ یہ لوگ پاکستان کے وفادار ہیں لیکن باہر کے لوگ یہاں آ کر فساد پھیلاتے ہیں۔۔۔
"اُن دو ہندو لڑکیوں کا کیا قصہ ہے جنہیں زبردستی دو مسلمان لڑکوں سے بیاہ دیا گیا تھا"
"یہ بھی محض فتنے اور فساد کی بات ہے اور عجیب بات ہے کہ وہ دونوں لڑکیاں پڑھی لکھی اور اچھے گھرانوں کی تھیں اور اُنہوں نے بہ رضا و رغبت نہایت ان پڑھ مسلمان گڈریوں سے بیاہ کر کے اسلام "قبول کر لیا۔۔۔ میں ذاتی طور پر اُن لڑکیوں اور اُن گڈریوں کے گھروں میں گیا ہوں۔۔۔"
"آپ کا تجزیہ کیا ہے۔۔۔ کسی زبردستی کا عمل دخل تو نہیں تھا؟"
"تارڑ صاحب۔۔۔ بس فتنہ فساد کی باتیں ہیں۔۔۔ باہر سے آنے والوں کے کرشمے ہیں۔۔۔ آپ خود سمجھ والے ہیں"۔
کھوسہ صاحب مہمان نوازی کے عادی مجرم تھے۔۔۔ اُن کے ہاں، ہم جیسے بن بلائے مہمان آتے ہی رہتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ آپ اچھے موسموں میں نہیں آئے۔ اُن موسموں میں جب یکدم صحرا کا آسمان بادلوں سے سیاہ ہو جاتا ہے ، ہوائیں سرد ہونے لگتی ہیں اور بارشیں بے بہا برسنے لگتی ہیں تو تھر کی ریت یوں بھیگ کر سیراب ہوتی ہے کہ دو چار روز کے بعد اُس ریت کی کوکھ میں سے ہریاول کی کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں، گھاس کی پتیاں ظاہر ہوتی ہیں اور عجب دل نشیں چھوٹے چھوٹے رنگ رنگ کے پھول کھلنے لگتے ہیں۔۔۔ اس ہریاول اور پھولوں کے انباروں میں سے ہی تتلیاں، بھنورے اور کیڑے مکوڑے جنم لیتے ہیں اور اس خاموش صحرا میں بھنبھناہٹ کی مترنم موسیقی بھنبھنانے لگتی ہے۔۔۔ یعنی وہ جو فیض نے کہا تھا کہ جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے تو یہ محض ایک شاعرانہ خیال نہ تھا، ایک حقیقت ہے۔ (جاری ہے)
ننگر پارکر کی اس صحرائی رات میں کھوسہ صاحب ہمیں بتا رہے تھے کہ تھر میں جب بارشیں اترتی ہیں تو اس کی ریت میں سے پھول پھوٹتے ہیں اور تب ۔۔۔ دور دراز کے شہروں کے لوگ اٹھ اٹھ کر آتے ہیں، تھر کا سفر اختیار کرتے ہیں۔۔۔

وہ اگرچہ بن بلائے مہمان ہوتے ہیں پر میں ان کی میزبانی بخوشی کرتا ہوں۔۔ تو ہم یہاں غلط موسموں میں آگئے تھے، ویسے ایسا کبھی نہ ہوا کہ میں کہیں اگر بلند پہاڑوں میں گیا یا کسی برف پوش جھیل کے کناروں پر اترا تو میں مناسب اور صحیح موسموں میں اترا۔۔
میں یا تو ہمیشہ دیر کردیتا تھا یا کچھ روز پہلے آجاتا تھا۔۔ کبھی کسی بلند پا میری چراگاہ کی سرخ چٹانوں کے دامن میں ایک مارخور کاشکاری جو زندگی میں پہلی مرتبہ گلگت گیا اور وہاں پہلی مرتبہ ٹیلی ویژن دیکھا اور اس نے مجھے دیکھا تو وہ میری پہچان کرکے مجھے خبر کرتا ہے کہ صاحب۔۔ آپ کبھی ادھر خزاں کے موسموں میں آؤ۔۔ ہر جھاڑی میں آگ لگ جاتی ہے، چٹانوں میں سے پگھلتے برفوں کے جھرنے پھوٹنے لگتے ہیں، اور جنگلوں میں لمبی دموں والے رنگین پرندے اڑانیں کرتے، کبھی اس ڈالی پر اور کبھی اس ڈالی پر جا اترتے ہیں، تب میں کہا کرتا تھا کہ ہاں میں ان بلندیوں پر کبھی خزاں کے موسموں میں بھی آؤں گا، لیکن اب میرے پاس بہت سے موسموں کی گنجائش باقی نہ رہی تھی۔۔ بے شک تھر کے صحرا میں بارشیں اترنے کے بعد چپکے سے بہار آجائے۔۔ ریت میں سے پھوٹنے والی گھاس اور بوٹوں اور چھوٹے چھوٹے ان گنت رنگوں کے پھولوں پر ہزاروں بھنورے منڈلاتے پھریں، تتلیاں پھڑپھڑاتی رہیں لیکن میں نے اب دوبارہ نہیں آنا تھا، آنا تو چاہتا تھا پر دن بہ دن سکت اور گنجائش کم ہوتی جاتی تھی۔۔ پر اس کا کیا غم کہ دوبارہ آنانہ ہوگا، کم از کم ایک بار تو آگیا۔۔ کتنے لوگ ہیں جو ایک بار بھی تھر کی رات میں اس کی ریتلی وسعتوں کے درمیان ایک الاؤ کے گرد بیٹھے صحرا کی آوازوں پر کان دھرتے ہوں۔۔ اس لئے کچھ غم نہیں، میں تھر سے اور اپنی زندگی سے خوش تھا۔۔ اور جانتا تھا کہ یہ رات پھر نہ آئے گی۔۔
میرے قدموں میں جو ریت تھی وہ بھی الاؤ کی حدت سے ہلکے بخار سے پھنکنے لگی تھی۔۔
الاؤ میں بھڑکتی، سلگتی، شرارے چھوڑتی آتش پر اگر آپ تا دیر آنکھیں جمائے رکھیں یہاں تک کہ وہ بھڑک، سلگاہٹ اور شرارے ان پر نقش ہو جائیں تب آپ کی آنکھیں اس نتیجے پر پہنچتی تھیں کہ ۔۔ سب الاؤ ایک جیسے ہوتے ہیں۔

تھر کے چاند کا تھال
مستنصر حسین تارڑ
Posted Date : 24/05/2015
کے ٹو کے راستے میں پائیو کی شام میں، دراوڑ کے مٹی کے قلعے کی دیواروں تلے کسی صحرائی ریت میں، دریائے سندھ کے اس ریتلے ٹاپو کی شب میں جس پر تاروں کی مکیش سے ٹانکا ہوا آسمان دمکتا تھا اور جہاں سرخاب پرندوں کے غول اترتے تھے، گلگت پر امڈتی اس پہاڑی پر جہاں خوبانیوں کے زرد سورج ایک گھنے شجر میں روشن تھے اور اس شجر کے نیچے گھاس پر بھی بے شمار سورج غروب نہ ہوتے تھے، طلوع ہوتے تھے۔۔ اور پھر فیئری میڈو کی اس برفیلی رات میں جب ستارے جو گرتے تھے، الاؤ میں آگرتے تھے۔
جتنے بھی الاؤ ہیں انہیں تا دیر تکتے جاؤ تو ان کی آگ میں تمہاری محبتیں راکھ ہوتی ہیں، وہ عشق جو تم سے روٹھ گئے ان کے چہرے فروزاں ہونے لگتے ہیں اور وہ سب دکھ اور درد جو زمانے کے نشتروں سے تمہاری روح کو گھائل کرتے ہیں، یاد آتے ہیں، آگ میں بھسم ہوتے جاتے ہیں،
اگ ساڑھے ککھ کانے، عشق جلائے دل میرا
یار ڈاہڈی عشق آتش لائی ہے۔۔
چنانچہ سب الاؤ ایک جیسے ہوتے ہیں۔۔ اگرچہ ہم قصے کہانیاں لکھتے تھے، اک دوجے سے چہلیں کرتے تھے لیکن جب چپ ہوتے تھے تو دیر تک چپ رہتے تھے کہ اب صحرا بولنے لگا تھا۔۔ اس کے اندر سے سرسراہٹوں اور انجانے پرندوں کے کوکنے کی آوازیں آتی تھیں، اور مجھے آسٹریلیا کے عین درمیان میں واقع مقدس سرخ الورو چٹان کے نواح میں ایک لق و دق سرخ صحرا کی وہ رات یاد آتی تھی جہاں ایک شاندار ارغوانی ڈنر کے بعد مشعلیں بجھا دی گئی تھی، سب سیاح چپ ہو گئے تھے اور ستارے نیچے آگئے تھے اور صحرا بولنے لگا تھا۔
ایک اور لمبی چپ کے دوران ہم ایک بے خبری میں مارے گئے، ہم پر ایک اور ستم ہوگیا، یوں محسوس ہوا جیسے الاؤ کی روشنی میں چاندی کے تار شامل ہو گئے ہیں۔ مہمان خانے کی کچی چار دیواری یکدم تاریکی میں سے ظاہر ہو گئی ہے جیسے ایک بجھا ہوا برتن قلعی کر دیا جائے، ہم سب کے چہروں پر بھی چاندی رنگ کی جھانجھروں کی چھنک اترتی تھی،
ہمیں خیال ہی نہیں رہا۔۔ ہم بے خبر رہے اور چاند کا تھال ابھر آیا، اک اور ستم ہوگیا۔۔

وہ کیا کہتے ہیں کہ مرے کو مارے شاہ مدار۔۔ یہ چاند کا شاہ مدار چپکے سے تھر کے آسمان میں سے ظاہر ہوگیا تھا۔
اس تھال میں سے پھوٹتی کرنوں کی چاندی سارے منظر کو چاندنی سے بھرتی تھی۔۔ اور میں بھی کیا کور ذوق شخص ہوں کہ نہ تو مجھے اس چاند میں کوئی چاند سا چہرہ دکھائی دیا، نہ چرخہ کاٹتی کوئی بڑھیا نظر آتی بلکہ وہاں ننگر پارکر کے راستے میں اس کے اندر جو گدھا گاڑی داخل ہو گئی تھی وہ نظر آئی۔۔ ہم سے خوش بخت تو وہ گدھا تھا جو چاند میں جا مقیم ہوا تھا، یہاں میں ہمیشہ کی طرح مجھے کچھ دیر کے لئے سب سے الگ ہوجانے کی تمنا نے مغلوب کیا، میں تنہائی کا تمنائی ہوا اور الاؤ سے جدا ہوا، میری آنکھوں میں جہاں الاؤ کی چنگاریاں سلگتی تھیں وہاں وحشت کے پرندے بھی پھڑپھڑاتے تھے اور ان کے پر چنگاریوں سے جلتے تھے۔
چار دیواری سے باہر آکر، میں ریت میں دھنستے جوگرز کو کھینچتا، قدرے لڑکھڑاتا، بن پئے ہی ایک حالت خمارمیں ڈگمگاتا صحرا کے اندر چلا گیا۔۔ جان بوجھ کر ایک ایسے آہو کی مانند بھڑکنے لگا جو گھر کا رستہ بھول گیا تھا، ریت کے ٹیلوں پربمشکل چڑھتا، کبھی صحرائی جھاڑیوں میں الجھتا، میں تب تک چلتا رہا جب تک مہمان خانہ کے صحن میں بھڑکتے الاؤ کی روشنی مدھم ہو کر گم نہ ہو گئی۔۔ اب میں تھا اور تھر کا صحرا تھا، اور وہ چاند کے چھاج تلے منور ہو رہا تھا۔۔ ریت کے ہر ذرے میں چاندنی گھونسلے بناتی تھی، اس کی کرنیں پرندوں کی مانند کوکتی تھیں۔۔
چاند میرے سر پر سوار تھا اور اس کا بوجھ بہت تھا، اس میں ایک گدھا گاڑی براجمان تھی۔
میں پہلے تو جان بوجھ کر بھٹکتا پھرا اور پھر مجھے احساس ہوا کہ میں سچ مچ بھٹک گیا ہوں، چاروں اور نظر کی اور وہ مہمان خانہ شاید ایک خواب تھا جو اوجھل ہوگیا تھا۔
اور میں ہراساں نہ ہوا۔۔ اس گم ہو جانے کی، صحرا میں کھو جانے کی کیفیت سے لطف اندوز ہوا کہ یہ کیا ہے کہ انسان ساری عمر طے شدہ راستوں پر ہی سفر کرتا رہے، کبھی تو بھٹکنا اور گم ہو جانا بھی چاہیے۔ میرے موبائل فون کی گھنٹی نے شور کردیا، سارے ویرانے میں غل کرنے لگی۔۔ وہ کون ہے جو تھر کی اس چاندنی شب میں جانتا ہے کہ میں بھٹک گیا ہوں، مجھے یاد آتا ہے۔۔ اس کے لہجے میں تشویش ہے اور گمشدہ محبتوں کی اداسی ہے۔۔ تمہیں اگر میرا خیال نہیں تو کم از کم اپنی عمر کا تو خیال کرو۔۔ اگر تمہارا سانس رکنے لگے جو کبھی کبھار رک جاتا ہے یا تمہاری دھڑکن میں خلل آ جائے تو کون تمہاری مدد کو پہنچے گا۔ واپس چلے جاؤ۔۔ مجھے پس منظر میں کچھ ہاؤ ہو کی آوازیں آتی ہیں، کیا یہ بھیڑئیے ہیں۔۔ شاید گیدڑ ہیں، واپس چلے جاؤ، آئی لَو یُو۔۔
میں نے جیب میں سے اپنا موبائل نکالا۔۔ وہ سائلنٹ موڈ پرتھا۔۔ آخری کال چھ گھنٹے پیشتر آئی تھی۔۔ یہ صحرا کی شب کی دیوانگی تھی جسے فون کی گھنٹی سنائی دی تھی۔۔ کیسے عجب سے کرشمے اس صحرائی راستے میں ظہور پذیر ہو رہے تھے، جس کو دیکھا خمار میں دیکھا، یہ کرشمہ بہار میں دیکھا۔
کہیں سے کوئی صدا سنائی دی۔۔ جمیل میرے لئے پُرتشویش ہو کرمیری تلاش میں نکل آیا تھا،
اور میں تھر کے چاند نگر سے واپس آگیا
الاؤ سرد ہو رہا تھا۔۔

کاسبو کے مور اور ریتلی گلیاں
مستنصر حسین تارڑ
Posted Date : 27/05/2015
ہمیں خبر ملی تھی کہ تھر میں مور ناچتے ہیں، اس کی بستیوں میں اپنی رنگین جھالریں پھیلائے ٹہلتے جاتے ہیں اور ہمیں یہ بھی خبر ہے کہ کبھی وہ زمانے تھے جب ان صحراؤں میں موروں کے غول تھے۔۔ اتنی کثرت میں تھے کہ ریت کے ذرے ان کے وجود سے رنگین ہوتے جاتے تھے، بارش اترتی تھی تو وہ میگھ ملہار میں کوکنے لگتے تھے، اور پھر وہ شکار ہوتے گئے، ہماری گوشت کی دیوانگی کے ہاتھوں ہلاک ہوتے گئے کہ ہم کسی بھی پرند یا چرند کو دیکھتے ہیں تو اسے روسٹ شدہ حالت میں ہی دیکھتے ہیں۔۔ چنانچہ مور اپنی جان بچانے کی خاطر ہجرت کر گئے، سرحد پار کرکے ہندوستان چلے گئے کہ وہاں گوشت خور نہ تھے، مور خور نہ تھے، اب ایک عجیب مزاحیہ صورت حال نے جنم لیا۔۔ ادھر ہندوستان میں سؤر بہت تھے اور ان کے گوشت کے شیدائی بھی بہت تھے۔۔ جو ان کا شکار کرتے تھے اور انہیں ان کی تھوتھنیوں سمیت بھون کر کھا جاتے تھے۔۔ چنانچہ یہسؤر بھی اپنی جان عزیز بچانے کی خاطر نقل مکانی کرکے ادھر پاکستان آگئے کہ یہاں انہیں کوئی نہ کھاتا تھا، چنانچہ اِدھر مور ناچنے لگے اور اُدھر س�ؤروں کا راج ہوگیا۔
ہم نے موروں کو سرحد پار بھگا دیا اور ادھر سے آنے والے س�ؤروں کو قبول کرلیا۔۔ ہم کیسے کمال کے

سوداگر ہیں۔
ایک بے ایمانی، منافقت اورتعصب سے بد رنگ اور بدشکل معاشرہ موروں کی خوش شکلی اور خوش رنگی کیسے قبول کرسکتا ہے۔۔وہ انہیں دیکھ کر ایک احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ آخر یہ کیوں ہمارے درمیان اپنے سو رنگ چمکیلے لشکیلے پروں کے جھاڑ پھیلائے ناچتے پھرتے ہیں جبکہ ہمارے ہاں رقص تو حرام ہے۔۔ ایک رنگیلامور ایسا جو معاشرے کی بدرنگی میں کسی بھی صورت ظاہر ہو، کسی جینئس سیاست دان، کسی نابغۂ روزگار ادیب کی شکل میں، کوئی پارسائی اور درویشی میں مست سچل شخص یا پھر اپنے آپ کو مذہب سے بالاتر ہو کر خدمت خلق کے لئے وقف کر دینے والے شخص کی صورت، ہم اسے مار ڈالتے ہیں وگرنہ موازنہ ہو جاتا ہے ناں چنانچہ نہ رہیں گے مور اور ہوگا موازنہ۔۔ ہرُ سوبماری بدرنگی اور بدشکلی راج کرے گی اور گلیاں سونی ہو جائیں گی اور ان میں مرزا یار نہیں، نہ کوئی مور بلکہ سؤر دندناتے پھریں گے۔۔ اور وہ پھرتے ہیں۔
پچھلی شب صحرا کی چاندی بھری شب میں، الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے کھوسہ صاحب نے ہمیں خبر کی تھی کہ ننگر پارکر سے کچھ فاصلے پر واقع ہندوستانی سرحد سے ذرا ادھر، بلکہ کناروں پر ایک تھری گاؤں سبو نام کا ہے اور وہ اپنی تھری صحرائی دیدہ زیبی میں بے مثال ہے، اس کی گلیاں ہیں جو ریت کی گلیاں ہیں جن میں مور مرغیوں کی مانند ٹہلتے پھرتے ہیں اور یہ گلیاں ون وے سٹریٹ ہوا کرتی ہیں کہ جب مور اپنی شاندار چھتری ،رنگوں کی آبشار چھتری پھیلائے مڑنے کی کوشش کریں تو ان کے پر خار دار باڑوں میں الجھ جاتے ہیں چنانچہ وہ مڑتے نہیں، سیدھے چلے جاتے ہیں۔۔ چاندنی راتوں میں ناچتے پھرتے ہیں، وہاں کے قدیم صحرائی مندروں کے احاطوں میں بے خطر گھومتے ہیں۔۔ صحرا کے جو چھدرے درخت ہوتے ہیں ان پر براجمان دکھائی دیتے ہیں اور ذرا سی آہٹ پرٹھٹھک کر ایک لمبی اڑان کرتے کسی اور شجر پر پھڑپھڑاتے جا بیٹھتے ہیں۔۔ جیسے لکھنؤ وغیرہ میں جب کسی نے قصہ ہیر رانجھے کا سنایاتو اہل درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا، ایسے ہی جب کھوسہ صاحب نے کاسبو کے موروں کا قصہ سنایا تو ہم لٹ گئے، ہمیں لوٹ لیا گیا۔۔
ہم کاسبو نہ جاتے تو اور کیا کرتے نہ جاتے اور وہاں کے موروں کو خبرہو جاتی کہ تارڑ صاحب ننگر پارکر تک چلے آئے اور ہمیں ملنے کے لئے نہ آئے تو وہ کتنے رنجیدہ ہوتے۔۔ ان کا دل توڑنا تو مناسب نہ تھا، آخر کار ایک مور کا دل کتنا ہوتا ہے، ایک مٹھی میں آجاتا ہوگا۔۔ ایسا دل توڑنے سے کتنا گناہ ہوتاہے تو ہم کاسبو جاتے تھے۔۔ ہمیں خبردار کیاگیاتھاکہ اپنی پراڈو کو ذرا دھیرے دھیرے چلائیں، ایسا نہ ہو کہ تیز رفتاری کے دوران آپ کی بریکیں فیل ہو جائیں اور آپ ہندوستان جا پدھاریں۔۔ اور وہاں جاسوسی کے الزام میں دھر لئے جائیں اور جب ”را“ کے اہلکار آپ کو زدوکوب کرتے پوچھیں کہ ادھر ہندوستان میں کیا کرنے آئے تھے اور آپ دہائی دیں کہ ہم تو ادھر مور دیکھنے آئے تھے تو وہ کہیں کہ پہلی بار جاسوس حضرات نے یہ بہانہ تراشا ہے۔۔ اب ہم آپ کو مور بنائیں گے۔۔
اور ہاں پچھلی شب کا ایک قصہ بیان کرنا میں بھول گیا۔۔ ہم ننگر پارکر سے نکل کر کاسبو کی جانب جانے والی ریگزاروں میں بل کھاتی پکی سڑک پر چلے جا رہے تھے اور سڑک کے کناروں پر کبھی کبھار ایک محراب نما چھوٹی سی یادگار نظر آتی، جیسے صحرا میں ایک کھلونا پڑا ہو، ایک گڑیا گھر ہو، اتنی مختصر۔۔ کسی میں کوئی بجھا ہوا چراغ ہوتااور کسی میں کچھ پھول پڑے ہوتے۔۔ دراصل یہ چھوٹے چھوٹے مندر تھے، یہاں سے گزرنے والے مسافر ان کے آگے سجدہ ریز ہو کر سفر بخیر کی پرارتھنا کرتے اور دوچار پھول چڑھا کر چل دیتے۔۔ اور تب مجھے پچھلی شب کا وہ قصہ یاد آگیا۔ (جاری ہے)

مستنصر حسین تارڑ
کاسبو کے مور اور ریتلی گلیاں
Posted Date : 31/05/2015
جیسے چاند راتوں میں سمندر دیوانگی میں مبتلاہو کر تلاطم میں آجاتا ہے، ایسے جمیل پر بھی چاند کا اثر ہو گیا تھا۔ وہ جب کبھی عظمیٰ سے دوری کا سوگ منانے سے فارغ ہوتا تو ایک آہ بھر کر کہتا، کاش یہ سرحدیں حائل نہ ہوتیں تو میں کتنی آسانی سے پیدل چلتا جودھپور پہنچ جاتا اور جودھپوری دوشیزاؤں کا نظارہ کرتا۔
میں نے اسے ایک بار نہیں متعدد بار سمجھایا کہ برخوردار میری معلومات کے مطابق یہاں سے قریب ترین ہندوستان شہر احمد آباد ہے اور وہ بھی کئی سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے، ہم رن آف کچھ کے قریب ہیں، سومنات کی یاترا کرنا چاہتے ہو تو بھی بات سمجھ میں آسکتی ہے لیکن جودھپور سرحد کے پار کہیں نہیں ہے ۔۔ وہ کچھ لمحے اپنی آہ وزاری موقوف کرتا اور پھر یکدم ایک سسکی بھر کر کہتا ”ہائے جودھپور“

میں نے اسے مزید ڈانٹنا مناسب نہ سمجھا، کہ وہ جغرافیے کو بھی خاطر میں نہ لاتا تھا، اس یقین کا اسیر ہو چکا تھا کہ کھوسہ کے اس صحرائی مہمان خانے سے جودھپور بس چندقدم کے فاصلے پر تھا۔۔ تو کیا حرج ہے کہ اسے اس یقین میں مبتلا رہنے دیا جائے۔۔۔ ہر کسی کا اپنا اپنا جودھپور ہوتا ہے، جیسے انشاء کا چاند نگر ہوتا ہے، وہ ہو یانہ ہو، اگر اس کا تصور آپ کے اندر سرشاری اور محبت کے جھرنے پھوٹنے میں ساون ثابت ہوتا ہے تو بے شک۔۔ جودھپور اس شب میں ہمیں جو ہندوستان کی کسی بستی کی روشنیاں نظر آرہی تھیں، ان کے آس پاس تھا، بلکہ وہی تو جودھپور تھا۔

ہماس سویر، کاسبو کے لئے نکلے۔۔ ننگر پارکر کے چڑھتے سورج کے روشن ہوتے جین اور ہندو مندروں کے روشن ہوتے درو بام سے نکلے۔۔ صحرا میں آنکلے۔۔ ویرانے میں آگئے تو بائیں جانب حیرتوں کی ایک چٹانی سلطنت نمودار ہونے لگی، تھر ایک حیرت کدہ تھا۔۔ صحرا کی چٹیل ویران وسعتوں میں چٹانوں کے انبار بلند ہورہے تھے۔

تھر کی ہموار بیابانی میں سرخ چٹانوں کا ایک سلسلہ براجمان تھا۔۔جیسے آسٹریلیا کے عین درمیان جو بے انت سرخ ویرانیاں وہاں تک پھیلی ہیں جہاں یہ دنیا اختتام تک پہنچتی ہے اور وہاں اس سرخ صحرا میں نو کلومیٹر طویل اور تقریباً ایک ہزار میٹر بلند الورو چٹان براجمان ہے، جو آسٹریلیا کے اصل باشندوں کے عقیدے کے مطابق آسمان سے اتری تھی اور جب بارشوں کا نزول ہوتاتھا تو الورو چٹان کی کوکھ میں سے آبشاریں گرنے لگتی تھیں اور مقدس تالاب پانیوں سے بھر جاتے تھے۔

تو ایسے ہی ننگر پارکر کے صحرا میں بلند ہونے والی یہ چٹانیں تھیں، ان کے اندرپانیوں کے ذخیرے تھے، چشمے اورتالاب تھے۔۔ یہ ہماری پاکستانی الورو چٹان تھی، کاش کہ ہم اس کی قدر کرسکتے۔

اس چٹانی سلسلے کے اندردنیا کا بہترین گرے نائٹ پتھر پوشیدہ ہے، جس کے سب ذخیرہ ابھی دریافت نہیں کیے گئے۔

میں کاسبو سے غافل سا ہو گیا اوردیدہ دل سے فریاد کی "چلودلدار چلو۔۔ دیدہ دلدار چلو۔۔ ذرا اس ننگر پہاڑ کے پار چلو"

واپسی پر چلیں گے" دیدہ دل بے دید ہوگیا۔" پہلے کاسبو کے مور دیکھتے ہیں "اور میں ایک مرتبہ پھر ثوریا " کی اس شب میں اتروں گا جہاں بالکونیوں میں ہنستی اندلسی لڑکیاں جن کے دیس میں اب بھی چشم غزال عام تھی مجھ پر ہی نہیں بلکہ ٹونی قصاب پر بھی تاک تاک کر اپنے ڈورے ڈالتی تھیں کہ ثوریا جنون اور آوارگی اور صحرا نوردی کا میرے لئے سب سے بڑا استعارہ ہے، جیسے وہاں ہم دونوں،میں اور ٹونی قشتالیہ کے ویرانوں میں ثوریا میں اترے تھے اور ہم اک عالم تحیرمیں تھے کہ یہ ہم کہاں آگئے۔۔ یہ بستی تو ہمارے نقشوں میں کہیں نہیں تھی۔

تو ایسے ہی کاسبو بھی ہمارے نقشوں میں کہیں نہ تھا۔

ہمیں تو پچھلی شب خبر ہوئی کہ وہاں کاسبو نام کا ایک ثوریا بھی موجود ہے۔۔ جس کی ریت بھری گلیوں میں مور اٹھلاتے پھرتے ہیں۔

تحیر کے سب نقشے کھل گئے۔

حیرت اور ہیجان کی کشتیوں کے سب بادبان کھل گئے۔۔

وہاں قشتالیہ کے ویرانوں میں ثوریا تھا اور یہاں تھر کے صحراؤں میں گم ایک قصبہ کاسبونام کا تھا جس نے مجھ پر حیرت، دیوانگی اور سرخوشی کے سب در وا کرادیئے۔ کاسبو کا گاؤں اپنے آپ کو ظاہر نہ کرتا تھا، خاردار جھاڑیوں کے انباروں کے اندر نظروں سے اوجھل رہنا پسند کرتا تھا۔

جب کبھی کسی کانٹوں بھری دیوار میں کوئی شگاف نظر آتاتو اس کے اندر کاسبو کے کسی خاندان کی حیات کی ایک جھلک نظر آجاتی۔۔ کوئی موہنجوڈارو کی دوشیزہ، کہنیوں تک سفید کنگن سجائے، سر پر ایک گاگر اٹھائے، کچھ بہت سیاہ رنگت کے کیوپڈ بچے کے وہ ننگے ہوتے اور پیچدار سینگوں والے بیل۔۔ اپنے روزمرہ کے کاموں میں جتے ہوئے ناتوانی سے بھرے کسان۔

ہم اپنی پراڈو میں سوار گویا ایک ایسے صحرائی عجائب گھر میں چلے جاتے تھے جس کے دن تھوڑے تھے۔۔ کوئی دن جاتا تھا جب کاسبو کے صحرائی گھاس کے جھونپڑے اور خاردار جھاڑیوں کی دیواروں کو معدوم ہو جانا تھا، اورپھر مجھے اپنا پہلامورنظرآیا، اور وہ مجھے جھاڑیوں کی باڑ کے اندر نظر آیا۔۔ نظر آیا اور اوجھل ہوگیا۔

اگر مجھ سے دریافت کیا جائے کہ کاسبو کا وہ کون سا نظارہ ہے جس نے تم پر جادو کردیاتو۔۔ (یہ کاسبو کی ریتلی گلیاں تھیں۔ (ختم شد

رام دیو مندر میں جو سو فقیر
مستنصر حسین تارڑ
Posted Date : 03/06/2015
جی ہاں یہ کاسبو کی ریتلی گلیاں تھیں جو مجھ پر جادو کر گئیں۔
سیاہ گھاس اور خاردار جھاڑیوں کے درمیان میں وہ گلیاں تھیں۔
وہ جو حفاظتی کانٹوں بھری دیواریں تھیں اُن کے درمیان میں وہ گلیاں تھیں۔
نہ وہ لاہور کی گلیاں تھیں اور نہ دلی کی۔۔۔ یہ تو کاسبو کی گلیاں تھیں۔ ریت راستوں سے اٹی گلیاں۔۔۔ لاہور اور دلی میں کہاں ایسی گلیاں ہوں گی جن میں کوئی کہنیوں تک آتے سفید کنگن پہنے، گھونگھٹ نکالے گوری، سر پر گاگر دھرے کوئی گوری چلتی ہو۔۔۔ اور اُن گلیوں میں مور ناچتے ہوں۔
یہ تو ساجن کی گلیاں تھیں۔
اگرچہ یہ گلیاں ابھی دھوپ میں روشن ہوتی تھیں پر ابھی تو چاند کے سب گمان اور چہرے پر شب ظاہر ہوتے تھے اور وہ ان گلیوں میں بھی ظاہر ہوتے ہوں گے۔
کیا پتہ کہ اس شب جب چاندنیاں کا سبو کی ان ریتلی گلیوں پر اتریں گی تو اپنے آپ کو پوشیدہ کرتی کوئی تھری صاحباں اپنے مرزے سے ملنے انہی گلیوں میں آئے گی۔
وہ پنجاب کی بے دریغ تن بدن میں مرزے کے وصال کے لیے سلگتی صاحباں تو نہ ہو گی، وہ ایک تھری صحرائی صاحباں ہو گی۔۔۔ صحرا کی دھوپوں میں جنگلی بیروں کے مانند پکی ہوئی کھٹی میٹھی، رسیلی اور مدھ بھری۔ جس کی رنگین چولی میں اپنے مرزے کی محبت کے گلاب دھڑکتے اُبھرتے ہوں گے۔۔۔ یہ کاسبو کی صاحباں ہو گی۔۔۔ انہی ریتلی گلیوں میں اپنے محبوب کی متلاشی۔۔۔ اور یہاں غزال تو نہ تھے تو وہ اُن گلیوں میں آوارہ خرام موروں سے پوچھتی ہو گی کہ۔۔۔ مورو تم تو واقف ہو۔۔۔
کاسبو کی ریتلی گلیوں نے مجھے گمراہ کر دیا اور میں نے تصور کے چرخے پر کیسے کیسے تانے بانے چڑھا دیئے۔
کاسبو، سراسر صحرا نہ تھا۔
خار دار باڑوں کے اندر ایک جھلک نظر آتی اور اُن کے اندر تو ایک پنجاب سر سبز اور زرخیز ہوتا تھا۔۔۔ وہاں ہرے بھرے کھیت اور سبزیوں کی بیلیں اور خاص طور پر سرخ ٹماٹر دکھائی دیتے تھے۔ کھوسہ صاحب نے بھی یہ اطلاع کی تھی کہ ’ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی‘۔ تھر کی مٹی بھی بہت زرخیز ہے لیکن وہ ذرا سا نم کہاں سے آئے۔۔۔ پانی کی کمیابی آڑے آتی ہے۔
تھر کی صحرائی زمینوں میں جو پیاز پرورش پاتا ہے وہ پاکستان بھر میں ریاست دیر کے پیاز کے سوا سب سے اعلیٰ کوالٹی کا حامل ہوتا ہے۔ یہ جو تھر کے صحرا کے بندے ہیں وہ ریت تلے پوشیدہ زرخیز زمین کو ظاہر کر کے فصلیں کاشت کرتے ہیں، اُنہیں سیراب کرنے کی خاطر دور دور سے پانی ڈھوتے ہیں اور پھر بارشوں کا انتظار کرتے ہیں۔ بارش ہو گئی تو تھر کے صحراؤں پر ہریاول کے پنچھی اڑانیں کرنے لگتے ہیں، نہ ہوئی تو وہ مر جاتے ہیں۔
کاسبو بھی وقت کی کمی کا شکار ہو گیا۔۔۔ یہ ایک بہت ہی منفرد بودو باش اور گھاس کے مخروطی ”چونرو“ جھونپڑوں کا ایسا خوابناک ساقصبہ تھا، تھر کا ثوریا تھا، جس میں کچھ دیر ٹھہرنا چاہیے تھا، اس کی ریتلی گلیوں میں آوارہ ہو جانا چاہیے تھا۔۔۔ کسی ”چونرو“ میں آج کی شب ٹھہر جانا چاہیے تھا لیکن کیا کرتے آج ہمارے سفر کی سب سے طویل مسافت در پیش تھی، ہمیں پورا صحرائے تھر عبور کر کے ٹھٹھہ شہر کے قریب کینجھر جھیل کے کناروں پر جا شب بسر کرنی تھی۔۔۔ اپنے سندھ ساگر کے سفر کی آخری رات گزارنی تھی۔
ہم کاسبو سے ذرا پار ہوئے کہ ہم نے تھر کے ایک قدیم مندر کی زیارت کرنی تھی جب یہ کامران تھا جس نے ”رکو رکو۔۔۔ مور مور“ کا غل مچا دیا۔
پہلی نظر میں تو کچھ دکھائی نہ دیا۔۔۔ ریت کے انباروں میں سے دو صحرائی درخت، قدرے چھدرے بلند ہوتے تھے اور ان کے دامن میں جنگلی گھاس اور سروٹوں کا جھاڑ جھنکار تھا، پہلی نظر میں کچھ نہ دکھائی دیا اور جب ذرا نظروں کو تلاش کیا تو سروٹوں میں پوشیدہ درجنوں مور نظروں میں آتے گئے۔۔۔ وہ ان گل رنگ ناریوں کی مانند تھے جو اپنی بے لباسی کو چھپانے کی خاطر سروٹوں کے حجاب اوڑھنا چاہتی تھیں، پر ان کے بدنوں سے تو رنگوں کے انار چھوٹتے تھے تو وہ کیسے اپنے آپ کو چھپا سکتی تھیں۔۔۔ نظر آتی گئیں۔۔۔ میں دبے پاؤں اپنی آنکھوں میں ان کی قربت کی ہوس لئے ان کی جانب بڑھا تو وہ چوکنے ہوگئے۔۔۔ پھڑ پھڑا کر پہلے تو ذرا پرے ہوئے اورپھر اپنی باریک ٹانگیں متحرک کرکے دھوپ میں پہلے نمایاں ہوئے اور صحرا میں گم ہو گئے۔

میری تحریروں میں جہاں عطار کے پرندے بہت ہیں، ایسے مور بھی بہت ہوتے ہیں۔۔۔ وہ کبھی ”بہاؤ“ میں دریائے سرسوتی کے پار موت کے ایک استعارے کے طور پر ”می آؤں، می آؤں“ بولتے ہیں اور کبھی ”خس و خاشاک زمانے“ میں بخت جہاں کے صحن میں کُوکتے ہیں۔۔۔ وہ میرے بیشتر ناولوں میں کبھی خوبصورتی اور کبھی موت کی علامت کے طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ سب میرے تصور کے دیومالائی مور تھے۔۔۔
لیکن آج کاسبو گاؤں کے آس پاس میں ایسے مور دیکھتا تھاجو میرے تصوراتی موروں سے کہیں بڑھ کر بانکے اور سجیلے مور تھے، چھیل چھبیلے رنگ رنگیلے کہ یہ زندہ تھے اور ”بہاؤ“ اور”خس و خاشاک زمانے“ کے مور کب کے مر چکے تھے۔۔۔ پاروشنی کے ساتھ، بخت جہان کے ساتھ۔۔۔ یہ حقیقت تھے اور وہ تصور کے کرشمے۔
(جاری ہے

رام دیو مندر میں جو سو فقیر
مستنصر حسین تارڑ
Posted Date : 07/06/2015
ایک بورڈ آویزاں تھا۔
رام دیو مندر کاسبو”
چار سو سال پرانا مندر
تعمیرِ نو: 18 جولائی 1965ء
مرمت: 4 اپریل 2011ء
از طرف: میگھوال پنچایت سندھ“
یہ چار سو برس پرانامندر ایک عمارت نہ تھا، یہ مختلف قدیم مندروں، عبادت گاہوں اور ہندو یادگاروں کا ایک کامپلیکس ، ایک مجموعہ تھا جو ایک چار دیواری کے اندر گویا ایک مندر گاؤں تھا، وہاں درختوں کے سائے بہت گھنے تھے کہ وہ بھی چار سو برس سے گھنے ہوتے چلے آئے تھے۔۔۔ اور ایک سایہ دار مقام پر ایک چھوٹے سے احاطے میں ایک اداس سا شیولنگ چڑھاوے کے تیل سے اپنی گولائی میں سیاہ ہوتا تھا۔۔۔ اور وہ اداس اس لئے تھا کہ وہ ایک مدت سے ناکارہ پڑا تھا۔ جو اس کا فرض منصبی تھا اس کے لئے کبھی باکارنہیں ہوا تھا۔۔۔ اداس نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟
اس مندر احاطے کے اندر شیومہاراج کثرت سے ایستادہ تھے، اور وہ بھی سب کے سب اداس تھے۔۔۔
چند سیڑھیاں چڑھ کر ہم اس احاطے میں واقع سب سے اہم زیارت گاہ تک آگئے اور زیارت ایک ایسے کمرے میں مقید تھی جس کے داخلے کا آہنی جنگلہ مقفل تھا۔۔۔ سلاخوں کے پار دیکھا تو وہاں ایک عجیب سا مجسمہ تھا، کوئی باریش صاحب، سر پر ایک سنہری تاج پہنے، ہاتھ میں کوئی عَلم تھامے، دوسرے ہاتھ کی پانچوں انگلیاں پھیلائے ایک سفید گھوڑے پر سوار ہیں۔
سفید سجے ہوئے گھوڑے کے قدموں میں ایک صراحی اور دیگر ظروف دھرے تھے۔۔۔ وہ بہرطور جو کوئی بھی متبرک دیوتا تھے، مجھے کم از کم ان کا سفید گھوڑا بہت پسند آیا، اور میں محض ایک سفید گھوڑے کے سامنے تو سجدہ ریز نہ ہو سکتا تھا۔۔۔
ہمارے ہمراہ کاسبو کا باسی جو ہندو گائیڈ تھا جو ہمیں راستے دکھاتا تھا اس نے ان سلاخوں سے لپٹ کر انہیں بوسے دیئے اور سنہری تاج والے باریش دیوتا کی دور سے بلائیں لیں۔۔۔
جہاں سے عقیدت شروع ہوتی ہے وہیں سے جہالت شروع ہو جاتی ہے۔۔۔ ویسے ہر مذہب کے پیروکار ، کسی دوسرے مذہب کے ماننے والے خداؤں اور دیوتاؤں کا مذاق اڑاتے ہیں، انہیں وہ خدااور دیوتا عجیب سے لگتے ہیں، ان کی عبادت کے طریقے مزاحیہ لگتے ہیں۔۔۔ ان کے خدا اور دیوتا جھوٹے لگتے ہیں اور انہیں کبھی یہ گمان نہیں ہوتا کہ انہیں بھی آپ کے خدا اور پرستش کے طریقے عجیب سے لگتے ہیں۔۔۔ اپنے سب خدا اور دیوتا سچے لگتے ہیں، باقی سب جھوٹے لگتے ہیں۔
رام دیو مندر کے احاطے میں اپنے بیٹے کا ہاتھ تھامے ایک اور فقیر چلا آتا تھا اور یہ جو سو فقیر تھا۔۔۔ یوسف فقیر تھا جو تھر کے صحراؤں کا ایک نامور لوک گلوکار تھا۔۔۔ جس کی آنکھیں نہیں تھیں، پیدائشی طور پر نابینا، نچڑے ہوئے دھوپوں کے مارے تھر کی چہرے والا، سندھی ٹوپی اوڑھے اپنے بیٹے کے سہارے چند سازندوں کے ہمراہ چلا آتاتھا۔ اس نے تھر کے سب موسم اپنے بدن پر سہے تھے پر اس نے تھر کو کبھی نہ دیکھا تھا، اور اس کے باوجود وہ اس کے حسن کے گیت گاتا تھا، اور نہ ہی اسے کچھ اندازہ تھا کہ جب مور صحرا میں

اپنی رنگین جھالر پھیلا کر اتراتا ہے تو وہ کن رنگوں میں رنگا ہوتا ہے اور پھر بھی اس کی گائیکی کی برتان میں مور رقص کرتے تھے۔۔
وہ ہاتھ پھیلائے میری جانب آیا۔۔ سائیں مہربانی۔۔ مہربانی
رام دیو مندر کے برابر میں ایک قدیم شہر کے سائے اس دوپہر میں بدن کو دھوپ سے بچا کر خوش آرام کرتے تھے۔۔ ایک پلیٹ فارم جو کہ اس شجر کے سائے میں تھا جو سو فقیر نے اس کے کچے فرش پر اپنا آرکسٹرا آراستہ کیا، ہارمونیم کی کیز کو اپنی انگلیوں سے چھیڑنے لگا۔
ننگر پارکر کے صحرائی شہر سے بہت فاصلے پر پتھر کی ریتوں کے اندر، کاسبو کے قصبے سے بھی دور ایک چار سو برس قدیم مسجد کی چار دیواری کے اندر ایک نابینا فقیر ہارمونیم بجا رہا تھا اور اس دھن میں اس کی نابینائی کی فریادیں سوگوار لیکن مترنم بلند ہوتی تھیں۔
سائیں حکم کرو۔۔ کیا سنائیں؟" جو سو فقیر نے اپنی بے نور آنکھیں جھپک کر جیسے خلاء سے سوال کیا۔"
کوئی تھری لوک گیت سنا دیں سائیں۔۔ کرم ہوگا۔۔ جمیل بولا۔۔"
جو سو فقیر نے خلاء میں "دیکھتے" ہوئے کہا "سائیں کرم تو تمہارا ہوگا، میں ایک تھری گیت سناتا ہوں جو میرا باپ گاتا تھا، میرا دادا گاتا تھا، اب میں سناتا ہوں"۔
ہارمونیم کی صدائیں بلند ہونے لگیں، جہاں رام مندر کے اندر شیولنگ کثرت سے ایستادہ تھے اور سروٹوں کے اندر مور براجمان تھے اور احاطے کی صحرائی ویرانی میں دھوپ چھاؤں کے کھیل تھے، جو سو فقیر اپنی (پُرنورصحرائی اداسی میں دل گیرہوتا گانے لگا۔۔ (جاری ہے

من مور ہوا متوالا۔۔
مستنصر حسین تارڑ
17/06/2015
سب لوگ اُسے ایک فاصلے سے دیکھتے رہے، نزدیک نہ گئے کہ وہ ہراساں نہ ہو جائے اور قیافے لگاتے رہے کہ آخر گلبرگ کے اس گھنے انسانی جنگل میں ہمارے بہت مختصر سے صحن میں یہ مور کہاں سے اتر آیا۔۔ گھر کا ایک گیٹ مقفل تھا اُدھر سے تو چہل قدمی کرتا نہیں چلا آیا۔ ہمارے ہمسائے حاجی صاحب اگرچہ جانوروں کے شوقین تھے، کتے، کبوتر، گھوڑے اور شاید گدھے وغیرہ بھی پالتے تھے لیکن یہ طے تھا کہ موروں کے شوقین نہیں ہیں تو پھر یہ مور کہاں سے آ گیا۔
میں نے اپنی تمام مصروفیات موقوف کر دیں اور گارڈن چیئر پر براجمان ہو کر اُسے تکتا رہا۔۔ وہ مجھ سے بیگانہ رہا، ہاں کبھی اُس کے جی میں آتا تو مجھ پر بے اعتنائی کی ایک نگاہ کرتا اور پھر اپنے آپ میں گم ہو جاتا۔۔ دوپہر ہونے لگی اور وہ اپنے مقام سے ٹس سے مس نہ ہوا۔
یہ بھوکا پیاسا ہو گا۔۔ اسے پانی دیتے ہیں، دانہ ڈالتے ہیں"۔۔ مونا نے اپنے لب سکیڑ کر چٹکی بجاتے ہوئے " "آہ۔آہ" کی پر وہ متوجہ نہ ہوا کہ وہ مرغی نہ تھا، مور تھا۔۔ بصد احترام اُسے دانہ پانی پیش کیا گیا پر اُس نے گردن موڑ کر بے اعتنائی اختیار کی، دن بھر کھانے پینے سے انکاری رہا یہاں تک کہ شام ہو گئی۔
میں اُس شب بار بار بستر سے اٹھ کر صحن میں آتا تو وہ اُسی مقام پر ساکت کھڑا ہوتا، رات کی سیاہی میں گم کھڑا ہوتا۔
دوسرے روز بھی اُسے کھلانے پلانے کی سب کوششیں ناکام ہو گئیں اور مجھے محسوس ہوا کہ وہ لاغر ہو رہا ہے، اُس کی باریک ٹانگوں میں لرزش ہے، وہ مستحکم نہیں ہے۔
اس نے مر جانا ہے" مونا نے دُہائی دی۔"
میں کیا کروں" ۔۔میں نے لاچارگی سے کہا۔"
کسی مور ایکسپرٹ سے بات کرو"۔"
اب میں اتنا بارسوخ اور تعلقات عامہ کا ماہر شخص تو نہ تھا۔۔ میری کچھ واقفیت ادب، مصوری یا سیاست اور مذہب وغیرہ کے ایکسپرٹس سے تو تھی پر میں کسی مور ایکسپرٹ کو نہ جانتا تھا۔
شاید میں نے لاہور کے چڑیا گھر کے انچارج یا گھوڑا ہسپتال کے کسی ڈاکٹر سے بات کی اور مجھے بتایا گیا

کہ مور اپنی مورنی سے یا مورنی اپنے مور سے جدا ہو کر زندہ نہیں رہتے۔ مرن بھرت رکھ لیتے ہیں، کھانا پینا ترک کر دیتے ہیں اور چپ چاپ مر جاتے ہیں۔

اس نے مر جانا ہے"۔۔ مونا نے پھر غل مچایا۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم اسے زبردستی کسی ویٹرنری " ڈاکٹر کے پاس لے جائیں اور وہ اسے کوئی طاقت کا ٹیکہ لگا دے۔۔ دیکھو تو سہی کہ اس کے رنگ کیسے پھیکے پڑتے جاتے ہیں۔ یہ مر گیا تو ہم اسے کہاں دفن کریں گے"۔

صد شکر کہ ہم اس آزمائش سے بچ گئے۔۔ تیسرے روز جب کہ مور نڈھال ہو کر گرتا پڑتا اور پھر بمشکل سنبھلتا تھا ایک پریشان حال بوڑھا ہمارے گیٹ پر آ گیا۔

سر، یہاں کوئی مور آیا ہے؟"۔"

ہاں"۔"

وہ ہمارا مور ہے۔۔ ہم آپ سے کچھ فاصلے پر فردوس مارکیٹ کے قریب رہتے ہیں۔ تین روز پیشتر وہ ہمارے " بقیہ موروں سے جدا ہو کر پھڑپھڑاتا ہوا اُڑا اور اڑان کرتا غائب ہو گیا۔۔ وہ آس پاس کے گھروں میں کہیں نہ ملا۔۔ ہم تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ وہ اڑتا ہوا اتنی دور آپ کے گھر میں اتر آیا ہے۔ اُس کی مورنی نے کھانا پینا چھوڑ دیا ہے، ہمارا مور ہے"۔

چونکہ ہم اس مور کی موجودگی کے دوران آس پاس کے گھروں میں دستک دے کر دریافت کرتے رہے تھے کہ ۔۔ کیا آپ کا کوئی مور گم ہو گیا ہے تو یہ عین ممکن تھا کہ یہ بوڑھا جو قدرے مخدوش سا بوڑھا تھا یہ افواہ سن کر ایک مور ہتھیانے کے لئے چلا آیا ہو تو میں نے کہا "آپ مور کی کوئی نشانی بتائیں، مجھے کیا پتا کہ وہ آپ کا مور ہے یا نہیں"۔

لیکن اُسے اپنے مور کی نشانی بتانے کی حاجت نہ رہی کہ جونہی مور نے اُسے دیکھا اُس کی بجھتی ہوئی آنکھوں میں شناسائی کا ایک چراغ روشن ہوا اور وہ ناتواں ٹانگوں سے چلتا اُس کے قریب آ گیا۔

میرے صحن میں اترنے والا وہ آخری مور تھا۔

اب بھی اتنے برسوں بعد جب کبھی میں نیند کے خمار میں گم کسی دھندلی سویر میں اپنے صحن میں آتا ہوں تو مجھے شائبہ ہوتا ہے کہ وہاں ایک مور ہے۔ میں تذکرہ کر چکا ہوں کہ ملکہ پکھراج بھی موروں کی بہت دلدادہ تھیں، اپنے زرعی فارم میں موروں کی نسل پروری کرتی تھیں اور اکثر ہماری بیجوں کی دکان، کسان اینڈ کمپنی پر آ کر ابّاجی سے پہروں زراعت اور باغوں کے بارے میں مشورے کیا کرتی تھیں تو ایک بار انہوں نے ابّا جی سے کہا۔۔ چوہدری صاحب میں آپ کی قدر کرتی ہوں (مجھے شک ہے کہ ابّاجی کی دراز قامتی اور اُن کی نیلی آنکھیں اُن پر اثر کر گئی تھیں) تو میں نایاب سفید موروں کا ایک جوڑا آپ کو تحفے کے طو رپر پیش کرنا چاہتی ہوں تو ابّاجی نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔۔ ملکہ میں بھی آپ کی گائیکی اور پیشکش کی قدر کرتا ہوں لیکن ان دنوں ہم لکشمی مینشن کے ایک فلیٹ میں رہائش پذیر ہیں اور وہ اتنا مختصر ہے کہ یا تو اُس میں میرے چھ بچے رہ سکتے ہیں اور یا پھر مور۔

تو دیکھئے موروں کی بات چل نکلی تو کہاں تک پہنچی۔۔ ابھی تو میں جوان ہوں کی ملکہ پکھراج تک جا پہنچی۔

اگر کاسبو ایک ثوریا تھا تو یہ شِو مندر ایک ایسا اشکولے تھا جس کے پار ویرانیاں اور بے آبادیاں تھیں۔۔ شِو لنگ اتنے تھے کہ ٹھوکریں لگتی تھیں اور مور اتنے تھے کہ صحرا اُن کے وجود سے رنگین ہوتا ایک مور ہوتا تھا۔ کوئی ایک مور کسی ڈال پر رنگوں کا ایک گھونسلا بنائے تادیر ساکت بیٹھا رہتا اور پھر یکدم اپنے پروں کو پھیلا کر اڑتا ہوا کسی اور شجر کی بے برگ شاخ پر جا اترتا۔ اور فضا میں جہاں جہاں سے وہ گزرتا تھا وہاں اُس کے رنگوں کے نشان دوپہر کی دھوپ میں زائل یکدم نہ ہوتے۔۔ ایک کہکشاں رنگ رنگیلی بہت دیر تک دکھائی دیتی رہتی۔۔ جیسے کسی فضائی مظاہرے کے دوران جیٹ طیارے اپنے پیچھے رنگوں کا ایک دھواں چھوڑتے گونجتے گزر جاتے ہیں۔۔ اور وہ رنگ دیر تک جوں کے توں دکھائی دیتے اُن کی گزرگاہ کی نشانی کے طور پر دکھائی دیتے رہتے ہیں۔

موروں سے بچھڑنا آسان نہیں ہوتا۔

کیا پتا اُس شِو مندر کے پچھواڑے میں جھاڑیوں، سروٹوں اور چھدرے درختوں میں جو مور ہی مور تھے اُن میں وہ ایک مور بھی ہو جو کبھی گئے زمانوں میں میرے صحن میں اترا تھا۔
تھر کے

صحرا کا آسمان خالی اور بے آباد تھا، وہاں گھٹا گھنگور گھنگور چھا جانے کا کچھ امکان نہ تھا ورنہ وہ مور شور مچا دیتے۔
ہمیں بہرطور موروں کی یہ دنیا چھوڑ جانا تھی۔
اور ہم اگرچہ اُس جدائی سے بہت دل گرفتہ ہوئے پر ہم رنگے جا چکے تھے۔
گویا یہ موروں کی دیوالی تھی جس میں ہم نے شرکت کی تھی اور اُنہوں نے ہم پر رنگوں کی پچکاریاں پھینکی تھیں تو ہم رنگے جا چکے تھے۔
ہم واپس ہو رہے تھے۔
کاسبو کے ریتلے راستوں پر ہماری پراڈو کے ٹائروں کے نشان نقش ہوتے جا رہے تھے اور میں دکھی ہو رہا تھا کہ ہم رُک نہ سکتے تھے۔۔۔ میں کچھ دیر کاسبو کی ریت کی گلیوں میں بھٹکنا چاہتا تھا، اور مجھے شام ہو جائے۔۔۔وہ مہتاب جو پچھلی شب تھر کے صحرا کے اندر ہمارے بدنوں پر ابھرا تھا اُس نے آج کی شب بھی تو انہی ریتلی گلیوں میں جھلکنا تھا۔۔۔ ان خاردار جھاڑیوں کی ریت کی گلیوں میں مجھے شام ہو جائے اور اگر فیض صاحب میرے ہمراہ ہوتے۔۔۔ اُن دو شبوں کی مانند جب وہ صبح کی اذانوں تک ہمارے رفیق رہے اور ہماری فرمائش پر اپنے شعر سناتے رہے اور جب کبھی میں اُنہیں کوئی ذاتی نوعیت کا سوال پوچھتا تو وہ کہتے ”بھئی تارڑ، رہنے دیں“ ۔ تو اگر فیض اس شب کاسبو کی ریتلی گلیوں میں میرے ہمراہ ہوتے اور مہتاب ابھرتا :تو انہوں نے تو کہنا تھا کہ
آج تنہائی کسی ہمدم دیریں کی طرح
کرنے آئی ہے میری ساقی گری شام ڈھلے
منتظر ہیں ہم دونوں کہ مہتاب اُبھرے
اور جھلکنے لگے تیرا عکس ہر سائے تلے
دن کی تلخ دھوپ میں ہم خوابوں، سرابوں اور خیالوں میں سے نکل آئے، کاسبو میں سے نکل آئے۔
دھوپ میں ہمارے سب موروں کی دیوالی کے رنگ نچڑ گئے۔۔۔ ہم پھیکے پڑ گئے۔۔۔ ہمیں اُن سے بچھڑنا تھا سو بچھڑ گئے کہ ہم نے آج بہت دور جانا تھا۔۔۔ ہم نے جھیل کینجھر کے کنارے آج کی شب گزارنی تھی۔۔۔ آج ہمارے سندھ کے سفر کا اختتام ہونا تھا۔
!سندھ کا صحرائی خواب گمشد۔۔۔ سفر تمام شد

سنسال کا ”براگا“ آوارہ گرد
مستنصر حسین تارڑ

Posted Date : 28/06/2015

تو سوال یہ ہے کہ کیا ہمارا معاشرہ الجیریا اور سعودی عرب سے بھی زیادہ تنگ نظر ہو چکا ہے۔ میں ایک ایسے ادیب کو جانتا ہوں جو روشن خیال تو ہیں لیکن رسول عربیؐ کے عشق میں فنا ہیں، اسلامی تاریخ پر عبور رکھتے ہیں اور اسلام سے وابستگی اُن کے رگ و پے میں گردش کرتی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ پچھلے ایک دو برس سے اسلامی تاریخ اور سیرت نبویؐ کے بارے میں لکھنے سے گریز کرتے ہوئے کچھ غیر جانب دار نوعیت کی تحریریں لکھ رہے ہیں اور جب میں نے اُن سے دریافت کیا کہ حضرت۔۔۔ آپ تو ایک زمانے میں تاریخِ اسلام اور سیرت نبویؐ کے بارے میں سراسر مختلف اور انوکھی تحریریں لکھا کرتے تھے تو اب کیا

ہوا ہے؟۔۔ تو وہ کہنے لگے، میں ڈر گیا ہوں، چونکہ میں نے ایک لبادہ نہیں اوڑھ رکھا اس لئے کوئی بھی ”پرہیز گار“ میری کسی نہ کسی تحریر کی من پسند توجیہہ کر کے مجھے گردن زدنی قرار دے سکتا ہے تو میں ڈر گیا ہوں۔ چنانچہ میری بھی دو پریشانیاں ہیں، اول یہ کہ کسی مسلمان ادیب کو نوبل پرائز کیوں نہیں ملتا اور دوسری یہ کہ الجیریا، مراکو، تیونس یہاں تک کہ سعودی عرب میں بھی حکومت مخالف، مذہبی دہشت گردی کے خلاف آواز اٹھانے والے ناول نگار برداشت کئے جاتے ہیں اور ہم ایسے ہیں کہ اُنہیں پاکیزگی اور بھارت کے تکبّر کے درّے مارتے واجب القتل قرار دیتے ہیں۔

یہ بحث میری یہ پریشانیاں تب وجود میں آئے جب میں نے سنسال کا ناول ”ہراگا“ پڑھا۔۔ اور سنسال کی جادوئی نثر نے مجھے اسیر کر دیا۔۔ میں نے محسوس کیا کہ سنسال کو نہ کسی پلاٹ یا قصہ سنانے کی حاجت ہے اور نہ کوئی منصوبہ بنانے کی ضرورت ہے، اُس کا بیان سحر الکلام ہے۔

الجیئرز کے پُرانے حصے میں عثمانی سلطنت کے کسی پاشا کا شاندار حویلی نما گھر ہے جو کبھی کسی فرانسیسی کی آماجگاہ ہوا اور کبھی کسی متمول یہودی کی اور پھر پہاڑوں سے اترنے والے ایک خاندان نے اُسے خرید لیا۔۔ اور اب وہاں لامیا رہتی ہے جس کی جوانی ڈھل رہی ہے، ایک مشہور ہسپتال میں ڈاکٹر ہے اور جان بوجھ کر تنہائی کی ایک زندگی گزار رہی ہے۔۔ اُس کے خاندان کے افراد میں سے کوئی بھی زندہ نہیں، صرف ایک بھائی سفیان تھا جو یکدم غائب ہو جاتا ہے، وہ الجیریا کے بہت سے نوجوانوں کی مانند اس تنگ نظر اور بے ایمان معاشرے سے فرار ہو کر، غیرقانونی طو رپر سمندر پار یورپ جانا چاہتا ہے یعنی مقامی محاورے کے مطابق وہ ایک ”ہراگا“ ہو چکا ہے۔ نئے راستے تلاش کرنے والا ایک اور آوارہ گرد۔۔ لامیا اُس کی تلاش میں پاگل ہو جاتی ہے کہ اُس کی تنہا زندگی میں تنہا خوشی تھا۔۔ سنسال کا کہنا ہے کہ الجیریا کی عورتیں معاشرے کے جبر کا شکار ہو جاتی ہیں اور بیشتر نوجوان ”ہراگا“ ہو جاتے ہیں۔۔ ایک زمانے میں جب افریقہ اور ایشیا کے محکوم ممالک میں آزادی کی تحریکیں سر اُٹھا رہی تھیں اور کولونیئل طاقتیں اُنہیں نہایت بیدردی سے کچل رہی تھیں تو ان ممالک میں ایسے انقلابی رہنماؤں کا ظہور ہوا جو یورپ کے پورے نظام سے اپنی آزادی کی خاطر بھڑ گئے اور ایسے رہنماؤں کی ایک کہکشاں تھی جنہوں نے نوجوان نسل کو بے حد متاثر کیا۔۔وہ اُن زمانوں کے سپر ہیرو تھے۔۔ ان میں ویت نام کا ہوچی منہ، انڈونیشیا کا سوکارنو۔۔ کانگو کا پیٹرس لوممبا۔۔ کینیا کا جومو کنیاٹا جو ماؤ ماؤ تحریک کا بانی تھا، کیوبا کا فیڈل کاسٹرو اور چے گویرا، فلسطین کا یاسر عرفات، چین کا ماؤزے تنگ اور مصر کا جمال عبدالناصر شامل تھے اور الجیریا کے بن بااللہ کی بہت دھوم تھی، یہ سب انقلابی رہنما سوشلسٹ نظریات سے اس لئے بھی متاثر تھے کہ یہ صرف سوویت یونین تھا جو اُن کی حمایت کرتا تھا، مصر پر جب فرانس، برطانیہ اور اسرائیل نے اس لئے حملہ کر دیا کہ ناصر نے نہر سویز کو قومیانے کا اعلان کر دیا تھا تو یہ نکتیا خروشچوف تھا جس کی دھمکی کی وجہ سے ان سپرپاورز نے مصر سے پسپائی اختیار کی۔ جمال عبدالناصر اُن زمانوں میں پاکستانی نوجوانوں کا بھی ہیرو تھا۔ بن بااللہ کی تصاویر بھی پاکستان میں مقبول تھیں۔

بہرطور ایک طویل خونیں جدوجہد کے بعد فرانس نے مجبوراً الجیریا کو آزاد کر دیا۔۔ یہ وہ زمانے تھے جب فلسفی سارتر نے فرانسیسی حکومت کے خلاف الجیریا کی آزادی کے لئے مظاہروں میں بھرپور شرکت کی۔۔ اور تب فرانسیسی صدر چارلز ڈیگال کے مشیروں نے کہا تھا کہ سارترفرانس کا غدار ہے، آپ اسے گرفتار کیوں نہیں کرتے تو جنرل ڈیگال نے وہ تاریخی فقرہ کہا تھا کہ۔۔ سارتر تو فرانس ہے، میں فرانس کو کیسے گرفتار کر سکتا ہوں۔۔الجیریا بھی دیگر نوآزاد ملکوں کی مانند آہستہ آہستہ آمریت اور مذہبی تنگ نظری کا شکار ہو کر تنزل کا شکار ہو گیا۔

لامیا اُسی زوال پذیر معاشرے میں ایک پُرانے گھر میں تنہائی کی زندگی بسر کر رہی ہے، اپنے ”ہراگا“ ہو چکے بھائی سفیان کی واپسی کا انتظار کرتی ہے جب ایک روز ایک سولہ برس کی حاملہ لڑکی شریفہ، سفیان کے حوالے سے اُس کی زندگی میں داخل ہو جاتی ہے۔۔ وہ ایک معصوم بھی اور ایک بے راہرو لڑکی بھی ہے اور لامیا اُسے ایک بیٹی کی طرح چاہنے لگتی ہے۔۔ وہ یکدم اپنے
سامان کے تھیلے کے ساتھ غائب ہو جاتی ہے، جو مرد بھی اُسے ورغلاتا ہے اُس کے ساتھ چل دیتی ہے اور

پھر یکدم نمودار ہو جاتی ہے۔۔۔ آپ کبھی تو شریفہ کی لولیٹا طرز کی معصومیت کے عشق میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور کبھی اُس کی بے راہروی سے بیزار ہو کر اُسے ناپسند کرنے لگتے ہیں۔ ایسا بے پروا لااُبالی کردار نثر میں کم ہی ملتا ہے۔ میں نے بھی اپنے کچھ ناولوں اور خاص طور "اے غزالِ شب" میں کہیں کہیں نثری نظم کو ذریعہ اظہار بنایا ہے لیکن سنسال نے بھی نہایت مؤثر انداز میں نثر کے درمیان نظم کا سہارا لیا ہے۔ناول کے آغاز میں ایک نظم کا کچھ حصہ ملاحظہ کیجئے۔۔۔

ایک پرندہ، خوبصورتی کا ایک استعارہ ہے
لیکن افسوس کہ ایک پرندے کے پَر بھی ہوتے ہیں
یہ پَر جہاں اُسے زمین پر اترنے میں مدد دیتے ہیں
وہاں اُسے پرواز کر جانے کے لئے بھی معاون ثابت ہوتے ہیں
پرندوں کا یہی المیہ ہے۔۔۔

ناول کے اختتام پر شریفہ ایک کانونٹ میں بچے کی پیدائش کے دوران مر جاتی ہے، لامیا اُس غیرقانونی بچے کو گود میں لے لیتی ہے اور ایک ویران قبرستان میں دفن شریفہ کی قبر تک پہنچتی ہے، کتبے پر صرف "شریفہ" لکھا ہے اور لامیا ایک مارکر کے ساتھ کتبے پر لکھتی ہے "شریفہ کی ماں جو اُس سے محبت کرتی ہے"۔۔ بچی کا نام لوتزا ہے تو لامیا اُس سے مخاطب ہو کر کہتی ہے۔

لوتزا، میری بچی
جب ایک نیا سورج طلوع ہو گا،
تمہاری پہلی مسکراہٹ پر،
ہم دونوں مسافر ہو جائیں گے
ہم "براگا" آوار ہ گرد ہو جائیں گے
لوتزا، میری محبت
ہم اپنی بدقسمتی کو پیچھے چھوڑ جائیں گے
اور یادوں کو بھول جائیں گے۔۔۔
اُنہیں اپنے راستے میں آنے والے پہلے دریا
کے پانیوں سے دھو ڈالیں گے
جیسا کہ آوارہ گرد کیا کرتے ہیں
لوتزا، مائی ڈارلنگ،
ہم اجنبی راستوں پر سفر کریں گے
اور دیکھیں گے جہاں پھول کھلتے ہیں
جہاں پرندے جاتے ہیں
جیسا کہ براگا کرتے ہیں
لوتزا، میری زندگی
جب سورج طلوع ہو گا،
ہمارے پہلے موسم بہار پر
تو ہم بہت دور جا چکے ہوں گے
جیسا کہ براگا چلے جاتے ہیں
میری بیٹی،
میں تمہاری ماں اور تم،
ہم دونوں براگا، آوارہ گرد ہیں۔

کاملہ شمسی کا نیا ناول
مستنصر حسین تارڑ
01/07/2015

بچپن میں، میں نے بھانت بھانت کے شوق پالے ہوئے تھے، ڈاک کے ٹکٹ جمع کرتا تھا، بچوں کے رسالے اور ناول پڑھتا تھا اور کبھی کبھی ان رسالوں میں پوشیدہ کر کے منٹو اور دت بھارتی کی تحریریں پڑھتا تھا، قلمی دوستی کا بھی شوق تھا بلکہ قلمی دوستی کا ایک کلب بھی قائم کر رکھا تھا۔ ایوا گارڈنر، سٹیورٹ گرینجر اور فضل محمود کی تصویریں اخباروں میں سے کاٹ کر البم بناتا تھا۔ دلیپ کمار اور نرگس کو خط لکھا کرتا تھا بلکہ مجھے نرگس نے اپنی آٹو گراف شدہ تصویر بھی بھیجی تھی اور آٹو گراف جمع کرنے کا جنون بھی تھا۔۔ ان میں ایک آٹوگراف شوکت تھانوی کا تھا اور انہوں نے میرے لئے لکھا تھا ”انسان ساری زندگی طالب علم رہ سکتا ہے، مطلب فیل ہونے سے نہیں ہے“۔۔ تو میں فیل تو کبھی نہ ہوا لیکن ساری زندگی ایک طالب علم رہا۔۔ یعنی میں ایک دائمی طالبان تھا۔۔ کتاب سے کبھی رشتہ نہ توڑا۔۔ مجھے اپنی زندگی کا کوئی ایک ایسا دن یاد نہیں، سوائے شادی کے دن کے جب کوئی نہ کوئی کتاب میرے زیرمطالعہ نہ رہی ہو۔۔ میرے والد صاحب تو کتابوں کے ڈھیر میں گھرے رہتے تھے اور والدہ زچ ہو کر کہا کرتی تھیں کہ یہ کتابیں میری سوکنیں ہیں۔ البتہ میری بیگم نے کبھی میری کتاب بینی پر اعتراض نہیں کیا کہ اُسے ہمیشہ یہ خدشہ لاحق رہتا تھا کہ کہیں سچ مچ کی سوکن نازل نہ ہو جائے تو اُس سے بہتر کتاب کی سوکن ہے۔
میرے پسندیدہ ترین موضوعات میں تاریخ، آرکیالوجی، فلسفہ، سیرت نبویؐ اور دنیا بھر میں لکھی جانے والی نثر ہے۔ ناول، کہانی اور ڈرامہ ہے۔۔ کچھ عرصہ پیشتر میں نے اپنے پڑھنے والوں کو اُن چند ناولوں میں شریک کیا تھا جنہوں نے مجھے متاثر کیا تھا اور ان میں سرفہرست البانیہ کے اسماعیل قدارے اور الجیریا کے یاسمین خدرا ہیں۔ پچھلے دنوں اسلام آباد میں منعقد ہونے والے آکسفورڈ لٹریری فیسٹیول میں میرے افسانوں کے حوالے سے جو خصوصی نشست ترتیب دی گئی جس کے میزبان مسعود اشعر تھے، وہاں ادب کے متعدد شائقین نے مجھ سے فرمائش کی کہ مجھے بین الاقوامی ادب کے بارے میں اُنہیں آگاہ کرتے رہنا چاہئے کہ یوں وہ میرے پسندیدہ ناول نگاروں کے بارے میں آگہی حاصل کر کے اُن کی تحریروں کے قریب آ سکتے ہیں۔۔ مسئلہ یہ ہے کہ میں تو ایک ماہ میں کم از کم دس بارہ کتابیں پڑھ ڈالتا ہوں تو چناؤ کیسے کیا جائے۔۔ اور عین ممکن ہے کہ جو ناول میری پسند کے معیار پر پورا اُترے اُسے عام پڑھنے والے بہت معمولی قرار دیں تو اس مسئلے کا حل میں نے یوں نکالا ہے کہ ماضی کی مانند میں زیادہ تر ایسے ناول نگاروں کا تذکرہ کروں گا جو مسلمان ہیں اگرچہ وہ ہماری مسلمانی کے معیار پر پورے نہیں اترتے یا پھر افریقہ سے تعلق رکھنے والے ناول نگاروں کا تذکرہ کروں۔۔ یقین کیجئے ہم میں سے بیشتر کو کچھ علم نہیں کہ البانیہ، مراکو، تیونس، الجیریا، نائیجیریا یا ایتھوپیاکا ایک ناول نگار کیسے اپنی ثقافت اور روایت کو ناول میں ڈھالتا ہے، ان ملکوں کے مسائل کیا ہیں اور ایک عام شخص کس نہج پر سوچتا ہے۔ چلئے ہم آغاز اپنی کاملہ شمسی سے کرتے ہیں۔۔ کاملہ کو بین الاقوامی طور پر ایک اہم ناول نگار کے طور پر پہچانا گیا ہے۔ وہ اگرچہ برطانیہ میں مقیم ہیں لیکن اُن کے تقریباً سب ناولوں کا پس منظر پاکستان اور خاص طور پر کراچی ہے۔۔ میں اُن کے ناول ”سالٹ اینڈ سفران“ سے بہت متاثر ہوا تھا، اُن کے دیگر ناولوں میں ”ان دے سِٹی بائی دے سِی“، ”کارٹوگرافی“، ”بروکن ورسز“ اور ”برنٹ شیڈوز“ شامل ہیں۔ آکسفورڈ کے کراچی فیسٹیول کے دوران کبھی ناول نگار محمد حنیف کے ہاں اور کبھی ایچ ایم نقوی کے گھر اُن سے بہت طویل ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔ وہ ایک خوش شکل اور اپنی گفتگو سے دل کو موہ لینے والی خاتون ہیں، اُنہوں نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا میں نے اُن کا تازہ ترین ناول ”اے گاڈ اِن ایوری سٹون“ پڑھا ہے تو میں نے ہنس کر کہا تھا کہ اب میں صرف وہ ناول پڑھتا ہوں جو مجھے عنایت کئے جاتے ہیں۔۔ اگلے روز وہ اپنا ناول میرے لئے لائیں پر میں وہاں نہ تھا جہاں مجھے ہونا چاہئے تھا۔۔ بہرطور میں نے لاہور واپس آ کر یہ ناول ”اے گاڈ اِن ایوری سٹون“ حاصل کیا اور اسے پڑھ ڈالا۔ یہ نام معنویت سے بھرپور ہے۔ پشاور کے آس پاس گندھارا کی سلطنت تھی اور تب ہر پتھر کو

تراش کر ایک مہاتما بُدھ تخلیق کر لیا جاتا تھا۔ اس ناول کا مرکزی کردار برطانوی لڑکی روز سپنسر ہے جسے آرکیالوجی سے دلچسپی ہے اور وہ تُرکی میں کھنڈروں کی کھدائی کے دوران اپنے باپ کے ایک تُرک دوست تحسین بے کے عشق میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ تحسین بے کا کردار نہایت مؤثر ہے اور ان دونوں کے درمیان محبت کے جو لمحے بیان کئے گئے ہیں وہ دل کو چھو لینے والے ہیں۔ تحسین بے ایک ناگہانی موت کا شکار ہو جاتا ہے اور روز سپنسر اُس کی یاد میں کسی دیومالائی قدیم بار کی کھوج میں پشاور کا سفر اختیار کرتی ہے اور وہاں یک چشم قیوم ہے۔۔ اور یہ وہی زمانے ہیں جب انگریزوں نے قصہ خوانی بازار میں ٹینک چڑھا کر ہندوستان کی آزادی مانگنے والوں کو سینکڑوں کی تعداد میں ہلاک کر ڈالا تھا۔ ناول کا ابتدائی حصہ آپ کو باندھے رکھتا ہے لیکن قصہ خوانی کا قتل عام بے حد طوالت اختیار کرتے بیانیے کو ایک طویل اُکتاہٹ سے دوچار کر دیتا ہے۔ شکر ہے کہ کاملہ شمسی کو اُردو تحریروں سے کچھ سروکار نہیں ورنہ وہ میرے اس تبصرے کو پڑھ کر مجھ سے بے حد خفا ہوتی اور مجھ سے ”کُٹّی“ کر لیتی۔ بہرطور اس ناول کو پڑھنا تو چاہئے۔

جس ناول نے مجھے بے حد متاثر کیا وہ صومالیہ کے نورالدین فرح کا ”ہائڈنگ اِن پلین سائٹ“ ہے۔ نورالدین صومالیہ میں پیدا ہوا، ایک مدت جنوبی افریقہ میں مقیم رہا اور اب نیویارک کی ایک یونیورسٹی میں ادب کا پروفیسر ہے۔۔ کم از کم اس ناول سے پیشتر نہ میں صومالیہ کو جانتا تھا اور نہ ہی جنوبی افریقہ کو۔۔ ہم جو انگریزوں کی کولونیئل ذہنیت کے پیروکار ہیں، ہم نے بھی افریقہ کو ایک ”سیاہ براعظم“ ہی سمجھا۔۔ جب کہ وہ بے حد روشن تھا۔

سومالیا کا نور الدین فرح اور کریم مِسکے
مستنصر حسین تارڑ
05/07/2015

میں سومالیہ کے ناول نگار نورالدین فرح کے ناول ’ہائڈنگ ان پلین سائٹ“ کا تذکرہ کر رہا تھا۔ یوں تو اچیبے کو افریقی ناول کا گرینڈ اولڈ مین قرار دیا جاتا ہے جس کے ناول ”تھنگز فال اپارٹ“ نے دنیا بھر میں تہلکہ مچا دیا تھا کہ یہ ناول جس نظر سے یورپ افریقہ کو دیکھتااور بیان کرتا ہے اسے ایک تاریک براعظم اور ”سفید فام لوگوں کا بوجھ“ قرار دیتا ہے اُس سے یکسر جدا یہ ایک افریقی کا لکھا ہوا پہلا افریقی ناول تھا۔۔ میں نے حال ہی میں ”تھنگز فال اپارٹ“ کے علاوہ اس کے دو اور ناول بھی پڑھے ہیں جن کا تفصیلی بیان پھر کبھی سہی۔۔ ابھی نور الدین فرح کے ناول ”ہائڈنگ ان پلین سائٹ“ کی مختصر بات کرتے ہیں۔یہ بنیادی طورپر ایک بہن بیلا اور بھائی آر کے درمیان محبت کی ایک کہانی ہے۔۔ بیلا، ایک جدید خیالات کی حامل نہایت دل کش لڑکی اور اس کا بھائی آر جو افریقہ میں یو این او کا ایک اعلیٰ افسر ہے، دونوں دوستوں کی مانند ایک دوسرے کے دکھوں اور محبتوں میں شریک رہتے ہیں۔۔ آر ایک مغربی خاتون سے شادی کر لیتا ہے جو بیلا کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ وہ فضول خرچ اور آوارہ مزاج ہے، اُن دونوں کے درمیان علیحدگی ہو جاتی ہے کہ وہ ایک ہم جنس پرست عورت ہے اور ایک افریقی ہندوستانی خاتون کے ساتھ ہندوستان چلی جاتی ہے۔۔ اپنے دونوں بچے بھی ترک کر دیتی ہے۔۔ پھر آر دہشت گردی کا شکار ہو کر مارا جاتا ہے۔ بیلا پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے، اُدھر وہ مغربی خاتون اپنے بچوں پر قابض ہونے کے لیے واپس آجاتی ہے کہ اسے امید ہوتی ہے کہ یوں وہ ایک وسیع جائیداد کی مالک بن جائے گی۔۔ یہ ایک دل کو موہ لینے والا اثر انگیز ناول ہے۔ میں کھلے دل سے اس کی سفارش کروں گا۔

کریم مِسکے کا ناول ”عرب جاز“ میرے لیے ایک غیر متوقع خوشی ثابت ہوا۔۔ ویسے میں آج تک نہ نور الدین فرح سے واقف تھا اور نہ کریم مسکے کے نام سے واقف تھا۔ کریم مسکے موری تانیہ میں پیدا ہوا، اس کا باپ افریقی اور ماں فرانسیسی تھی۔ ان دنوں وہ پیرس میں مقیم ہے۔۔ ”عرب جاز“ اگرچہ ایک ادبی شاہکار ہے لیکن اس کا تانا بانا ایک جاسوسی ناول کی مانند بنا گیا ہے۔۔ لارا نام کی ایک خوش شکل عورت کو اس کے پیرس کے فلیٹ کی کھڑکی میں مردہ حالت میں پایا جاتا ہے۔ اس کا ہمسایہ احمد ایک اپنے آپ میں مست انسان ہے جسے خبر تک نہیں ہوتی کہ لارا، جو ایک ایئر ہوسٹس ہے اس کے عشق میں مبتلا ہے۔۔ وہ جب کبھی پرواز پر جاتی ہے تو احمد اس کے آرکڈ پھولوں کے گملے کو باقاعدگی سے پانی دینے کے لیے اس کی فلیٹ میں آتا ہے تو اسی پر شک کیا جاتا ہے۔۔ پولیس کے دو اہلکار جین اور ریچل اس قتل کی

تفتیش کے دوران پیرس میں آباد ہو چکے مختلف قومیتوں کے مسلمانوں پر بھی شک کرتے ہیں اور یہ سب نہایت مؤثر کردار ہیں۔۔۔ اور ان میں کچھ بنیاد پرست بھی ہیں۔ اس ناول کا اہم ترین وہ حصہ ہے جہاں مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان جو مشترکہ عقیدے ہیں اُن کا تقابل کیا گیا ہے۔۔۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ عیسائی یورپ کسی حد تک مذہب سے باغی ہو چکا ہے جب کہ یہ مسلمان اور یہودی ہیں جو اپنے عقیدے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں یوں امریکہ اور یورپ میں مذہب کے دفاع کے لیے مسلمان اور یہودی شانہ بہ شانہ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے نظر آتے ہیں بلکہ آپ دیکھئے کہ ایران کے ساتھ جوہری معاملات پر امریکہ کے ساتھ جو پیش رفت ہوئی ہے اُس کی مخالفت میں سعودی عرب اور اسرائیل کی پالیسی ایک ہی ہے۔

عرب جاز" کریم مسکے کا پہلا ناول ہے۔"

اور ہاں مسلمان ناول نگاروں کا ذکر کرتے ہوئے میں مختصراً معروف امریکی ناول نگار خاتون جائس کیرل اوٹس کے ناول "دے سیکرے فائس" یعنی "قربانی" کا حوالہ بھی دوں گا۔۔۔ اگرچہ میں متعدد بارنیو یارک جا چکا ہوں لیکن مجھے قطعی طور پر گمان نہ تھا کہ اس شہر کے نواح میں ایسے درد ناک اور ہولنا، غربت زدہ علاقے بھی ہیں جہاں زندگی ایک جہنم ہے۔ یہ ناول ایک نوجوان سیاہ فام لڑکی سیبل کے بارے میں ہے جس کی زبردستی اور نہایت وحشیانہ طریقے سے آبروریزی کی جاتی ہے اور پھر کیسے سیاہ فام لیڈر اسے اپنی ناموری کے لیے استعمال کرتے ہیں اور آخر تک نہیں کھلتا کہ واقعی سیبل اس ظلم کا شکار ہوئی تھی یا پھر یہ ایک منصوبہ بند سازش تھی۔۔۔ لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے۔

چلئے پھر مسلمانوں کی جانب لوٹتے ہیں۔۔۔ اسلام آباد کے آکسفورڈ لٹریری فیسٹیول میں میرے لیے دو پُر مسرت حیرتیں تھیں۔ ایک تو ہندوستانی ادیب، ناشر اور عورتوں کے حقوق کی چیمپئن۔۔۔ اروشا۔۔۔ اور دوسری ثریا خان۔۔۔ حیرتیں اس لیے کہ کچھ برس پیشتر جب جرمنی کی ایک سرکاری ادبی تنظیم لٹریری ورک شاٹ نے ہائیڈل برگ کے پروفیسر کرسٹینا آسٹن ہیلڈ، جنہوں نے جرمنی زبان میں قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری پر پی ایچ ڈی کر رکھی ہے، ان کے مشورے سے میرے ناول "راکھ" کو جنوب مشرقی ایشیا کا سب سے نمائندہ ناول قرار دیا اور مجھے برلن آنے کی دعوت دی جہاں اس ناول کی ڈرامائی تشکیل کی گئی تو وہاں۔۔۔ اُروشا اور ثریا خان بھی تھیں۔ میں نے ثریا خان کی رفاقت میں برلن میں چند نہایت ادبی اور خوشگوار لمحے گزارے تھے۔۔۔ وہ سٹیج پر تشریف فرما تھیں جب میں اُنہیں پہچان کر ان سے ملنے گیا تو وہ مجھے پہچان کر کچھ جوشیلی ہو گئیں تو میں قدرے شرمندہ ہو گیا۔ ثریا خان نے برلن میں مجھے اپنا ایک ناول "نور" دستخط کر کے دیا تھا جو مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ ثریا ہالینڈ میں پیدا ہوئی تھیں، ان دنوں ایک نیو یارکر ہیں لیکن وہ اپنی پاکستانیت سے دستبردار نہیں ہوئیں ، اپنے آپ کو ایک پاکستانی ناول نگار کہتی ہیں۔ چونکہ کاملہ شمسی کی مانند اس سانحے کا کچھ امکان نہیں کہ ثریا خان اُردو میں لکھا کچھ بھی پڑھتی ہوں اس لیے میں بلاخوف و خطر کہہ سکتا ہوں کہ "نُور" ایک بہت ہی معمولی ناول ہے۔ اس کی واحد خوبی یہ ہے کہ یہ انگریزی میں لکھا گیا ہے۔

مجھ سے بہت سے لوگ مزید خفا ہو جائیں گے، ناراض ہو کر میرے بیری ہو جائیں گے جب میں یہ کہوں گا کہ ہم اردو ناول نگار ایک کنویں میں بندہیں "آگ کا دریا" ، "اداس نسلیں" اور ان میں "راکھ" یا بھاؤ بھی جی چاہے تو شامل کر لیجیے، ہم ان دو چار ناولوں کی مسلسل جگالی کر رہے ہیں۔۔۔ مغرب اور امریکہ کو تودفع کیجیے۔ ہم جانتے ہی نہیں کہ مراکو، تیونس، الجیریا، سومالیہ یہاں تک کہ سعودی عرب میں کیسے کیسے ناول لکھے جا رہے ہیں۔ ہم اپنے کنویں میں سے باہر نہیں آنا چاہتے۔ تو پھر پڑے رہتے ہیں، ہم جہاں ہیں خوش ہیں، ہم ملنگوں کو نہ چھیڑا جائے ورنہ ہماری ناول نگاری کی عظمت مجروح ہوجائے گی۔

سعودی عرب اور ایران، اتحاد کرلیں

مستنصر حسین تارڑ

08/07/2015

مذہبی تعصب کی آگ تو اب گھرمیں داخل ہو کر امن اور سلامتی کو خس و خاشاک کرنے لگی ہے۔۔۔ ایسا ممکن نہیں کہ آپ گھر میں اطمینان سے بیٹھ کردیگر ممالک میں تیل چھڑکتے رہیں اورتماشا دیکھتے رہیں۔ وہاں بھڑکتی آگ آپ کی چوکھٹ کے اندر بھی تو کبھی نہ کبھی آئے گی۔۔۔ سعودی عرب میں دہشت گردی کی جو آگ بھڑک اٹھی ہے، وہ ہم سب کو رنجیدہ کرتی ہے کہ مسلمانوں کا صرف ایک ملک ہی ابھی تک خون آشامی سے محفوظ تھا۔۔۔ ہمارے لئے اس دہشت گردی کا دکھ زیادہ ہے کہ وہاں ہمارا حرم ہے۔ قبلہ اور کعبہ ہے اور قصویٰ کے سوار ہمارے پیارے، ماں باپ سے بھی پیارے محمد رسول اللہؐ کا سبز گنبد ہے، ہم

برداشت ہی نہیں کر سکتے کہ ان تک آگ تو کیا گرم ہوا بھی آئے۔ میرے نبی پاکؐ کے روضہ مبارک کے صحن میں ٹہلتا کوئی ایک کبوتر بھی دہشت گردی سے جھلس جائے، ان مقامات مقدسہ کی حفاظت صرف سعودی بادشاہوں کی ہی نہیں دنیا بھر کے مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔ لیکن کچھ ایسے ”روشن خیال“ مسلمان کی سمجھ میں کچھ باتیں نہیں آتیں۔۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی مسلمان ”تاریک خیال“ تو نہیں ہوسکتا۔ اور مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم فوجی آمر السیسی کو فرعون کہتے ہیں، اسلام دشمن کہتے ہیں، امریکہ کا پٹھو کہتے ہیں لیکن اس کے سب سے بڑے سپورٹر سعودی عرب کو کچھ نہیں کہتے جس نے اس کی آمد پر جشن منایا اور اربوں ڈالر اسے مستحکم کرنے کے لئے پیش کردیئے۔ مجھے دیگر دانشوروں کی مانند گھر بیٹھ کر پوری دنیا کے معاملات پر تنقید کرنے کا کچھ شوق نہیں، ہم سے اپنا گھر نہیں سنبھلتا اور ہم دوسروں کو مشورے دیتے ہیں بلکہ انہیں دھمکیاں دیتے ہیں، میری متعدد تحریریں گواہ ہیں کہ مصر کے پہلے جمہوری صدر، لوگوں کے ووٹوں سے برسراقتدار آنے والے مرسی کا جب تختہ الٹا گیا تو مجھے بے حد دکھ ہوا تھا۔۔ سعودی عرب نے جس طور مسرت سے شادیانے بجائے تھے اس پر مزید دکھ ہوا تھا اور اب جب کہ مرسی کو سزائے موت سنائی گئی ہے، تو میں ایک گہرے اضطراب میں مبتلا ہوا، اس شخص کا کیا قصور ہے، وہ تو عوام کا پسندیدہ نمائندہ تھا اور میرے خیال میں پاکستان کے سب سیاستدانوں میں سے یہ صرف عمران خان تھا جس نے واضح طور پر ہر اس فیصلے کی مذمت کی اور کہا کہ اس کے نتائج اچھے نہ ہوں گے۔ پاکستان ابھی تک بھٹو کی پھانسی کے نتائج بھگت رہا ہے کہ بھٹو بھی عوام کا نمائندہ تھا جسے پاکستان کے السیسی ضیاء الحق نے پھانسی پرچڑھا دیا اگرچہ یہاں پسندیدہ فرعون وغیرہ کی بحث ازسر نو چھڑ سکتی ہے۔ یہ درست کہ عرب اور عجم کے جھگڑے پرانے ہیں۔۔ سعودی عرب، امریکہ سے خفا ہے کہ اس نے ایران کے ساتھ نیو کلیئر معاہدہ کیوں کیا اور اسرائیل اس کا ساتھ دے رہا ہے یا سعودی عرب اور اسرائیل شانہ بشانہ کھڑے ہیں بلکہ سعودی عرب نے متعدد بار امریکہ سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ ایرانی جوہری تنصیبات پر حملہ کرے اور ”سانپ کا سر کچل دے“۔

لیکن لمحہ موجود میں صورت حال میں ایک خوفناک تبدیلی آچکی ہے۔۔ داعش کے خونی لشکر امڈتے چلے آرہے ہیں، چنگیز خان اور ہلاکو خان کو ہلاکت اور قتال میں طفل مکتب ثابت کرتے چلے آرہے ہیں۔۔ اگرچہ وہ بھی سعودی عرب کے عقیدے سے مطابقت رکھتے ہیں لیکن وہ اپنے عقیدے میں بہت آگے چلے جا چکے ہیں جہاں وہ سعودیوں کو بھی رجعت پسند قرار دے کر ان کی بادشاہت کے خاتمے کو اپنی ایک منزل قرار دے چکے ہیں۔

سعودی عرب کو فی الحال نہ اسرائیل سے اور نہ ہی ایران سے کچھ خطرہ ہے، صرف داعش کے لشکروں سے خطرہ ہے اگرچہ ابتدائی طور پر وہ ان کے حمایتی اور مددگار تھے، دوسری جنگ عظیم کے دوران کمیونسٹ بلاک اور سرمایہ دار ملک، نازی یلغار کا سامنا کرنے کے لئے اتحادی ہو گئے تھے اگرچہ ان کی دشمنی کا تعصب سمجھوتے کا قائل نہ تھا اور اس کے باوجود وہ ایک مشترک دشمن کے خلاف اتحادی ہو کر ، صف آرا ہوگئے۔ سعودی عرب کے لئے اپنا راج سنگھاسن قائم رکھنے کے لئے بالآخر ایران کے ساتھ اتحاد کرنا ہوگا۔۔ ادھر ایران کو بھی بادل نخواستہ سعودی عرب کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھانا ہوگا اور ایسے احمقانہ اعلانات سے اجتناب کرنا ہوگا کہ اگر سعودی عرب نے ہم پر حملہ کیا تو ہم اسے واپس پتھر کے زمانوں میں پہنچا دیں گے۔۔ ان دونوں بڑی قوتوں نے اگر آپس کے اختلافات ختم نہ کئے تو داعش ان دونوں کو پتھر کے زمانے میں پہنچا دے گی۔

ویسے ان دونوں کی مفاہمت کے درمیان ایک رکاوٹ ہے، امریکہ!

سعودی عرب اس کا سب سے فرمانبردار اتحادی ہے کہ ان کی بادشاہت کو سہارا دینے والا امریکہ ہے جبکہ ایران اگرچہ امریکہ سے مفاہمت کی کوششوں میں ہے لیکن دل سے وہ اب بھی امریکہ کو ”شیطانِ بزرگ“ قرار دیتا ہے۔۔

داعش کے چنگیزی لشکر چلے آتے ہیں، وہ سعودی عرب اورایران کے لئے یکساں خطرہ ہیں تو۔۔ عرب اور عجم تاریخ میں پہلی بار اتحادی ہو جائیں تو اسی میں ان کی عافیت ہے۔

پلیز ہمیں لوٹ لیجیے

مستنصر حسین تارڑ

Posted Date : 12/07/2015

جب کبھی اس وطن عزیز کے عزیز ہم وطن کسی عظیم فراڈ کا شکار ہوتے ہیں، اُن کے ساتھ ہاتھ ہو جاتا ہے، وہ لٹ جاتے ہیں، اُن کے ساتھ فریب وہی کی واردات ہو جاتی ہے تو میں نے کبھی فراڈ کرنے والے، لوٹنے یا

فریب کرنے والے کو مجرم نہیں ٹھہرایا۔ دراصل یہ عزیز ہم وطن ہیں جو مجرم ہوتے ہیں، لالچ، حرص اور راتوں رات امیر ہو جانے کی خواہش کے مارے ہوئے، دولت اور شہرت کے شارٹ کٹ تلاش کرنے والے۔۔۔ وہ فنانس کمپنیوں کے سکینڈل کیا تھے، اتنے لاکھ روپے جمع کروائیے، دوستوں کو لوٹیے اور جمع کروائیے اور آپ ایک لاکھ روپے مہینے پر کسی برانچ کے منیجر مقرر ہو جائیں گے۔ ایک لاکھ روپے ، جبکہ اُن دنوں معمول کی تنخواہ دس ہزار روپے بھی نہ ہوتی تھی۔۔۔ کیا بعد میں واویلا کرنے والے لوگ نہیں جانتے تھے کہ اتنی تنخواہ اور مراعات ممکن ہی نہیں جب تک کہ کہیں نہ کہیں واردات نہ کی جا رہی ہو۔۔۔ کیا کسی میں کچھ کامن سینس نہیں ہے۔۔۔ اور ہاں یہ تو آپ جانتے ہوں گے کہ پاکستان میں آج تک جتنے بھی مالیاتی فراڈ ہوئے اُن کی پشت پر صاحب اقتدار اور صاحب سیاست ہوتے تھے۔۔۔ کیا کوئی ذی ہوش شخص یہ تصور کر سکتا ہے کہ آپ کا پیسہ ہر ماہ ڈبل ہو سکتا ہے۔۔۔ اور لوگ سفارشیں کروا رہے ہیں کہ خدا کے واسطے ڈبل شاہ سے کہیے کہ ہماری دولت قبول کر لے۔۔۔ پڑھے لکھے لوگ، بہت باشعور لوگ کہ اگر انسان نے اپنے آپ کو فریب دینا ہو، احمق بننا ہو تو نہ پڑھائی لکھائی کام آتی ہے اور نہ شعور۔۔۔ میں آنکھوں دیکھا حال بیان کرتا ہوں کہ یکدم گوجرانوالہ اور اس کے نواح میں دھوم مچ جاتی ہے کہ فلاں تاریخ کو وزیر آباد میں ڈبل شاہ ہیلی کاپٹر سے نوٹ برسائے گا اور ہزاروں کی تعداد میں لوگ نکل کھڑے ہوتے ہیں، کڑی دھوپ میں بال بچوں کے ساتھ نوٹ لوٹنے کے لیے کھیتوں میں کھڑے ہیں اور جب ہیلی کاپٹر کا ظہور نہیں ہوتا تو وہ حضرت ڈبل شاہ پر کچھ شک نہیں کرتے کہ شاید اُن کی بین الاقوامی مصروفیت آڑے آ گئی ہو۔۔۔ تو قصور ڈبل شاہ کا تو نہ ہوا۔۔۔ آپ خدا لگتی کہیے کہ اگر لوگ خود ہی لٹنے کو تیار ہوں، تو انہیں کیوں نہ لوٹاجائے۔

البتہ یہ جو دھوکے باز اور فریب کار ہوتے ہیں یہ پہلے اپنی ایمانداری کی دھاک بٹھاتے ہیں۔ ابتدا میں وہ نہایت باقاعدگی سے کسی نالائق شخص کو جس نے دوستوں اور رشتے داروں کی منت سماجت کر کے اُن کی دولت کسی فنانس کمپنی یا مالیاتی ادارے میں جمع کروائی ہوتی ہے اُسے سہولتیں مہیا کرتے ہیں، لاکھوں کی تنخواہ ادا کرتے ہیں۔۔۔ آپ کی دولت ہر ماہ ڈبل کر کے آپ کے گھر پہنچائی جاتی ہے اور یہ مراعات شدہ لوگ اُن کا سب سے بڑا اشتہاری ہتھیار ہوتے ہیں، وہ اُن کے مرید ہوجاتے ہیں اور دن رات اُن کے گیت گاتے ہیں کہ لوگو تم کتنے احمق ہو، یہ ایماندار لوگ ہیں، آؤ اور اپنی قسمت بدل لو۔۔۔ اور پھر۔۔۔ آہستہ آہستہ خلل پڑنے لگتا ہے اور پھر غبارہ پھٹ جاتا ہے۔

ہم ایسے مومن ہیں جو بار بار ایک ہی سوراخ سے ڈسے جاتے ہیں۔ تو قصور کس کا ہوا، ڈسنے والے کا یا مومن کا۔۔۔

جیسے وہ پرانا فلمی نغمہ ہے کہ۔۔۔ دل آنے کے ڈھنگ نرالے ہیں تو فراڈ کرنے والے کے بھی ڈھنگ نرالے ہوتے ہیں۔ میں مذہب کو فروخت کرنے والے بیوپاری حضرات کے تذکرے سے اجتناب کرتا ہوں کہ اس میں فساد خلق کا خدشہ ہے۔ یورپ اور امریکہ میں جن تقدس مآب ہستیوں کی وسیع جائیدادیں ہیں اُن سے گریز کرتا ہوں اور اپنے شعبے ادب کی جانب آتا ہوں۔ یکدم کیا دیکھتے ہیں کہ شعبہ نشرو اشاعت میں ایک صاحب کا ظہور ہوتا ہے جو خود بھی ادیب ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ وہ اپنا اشاعتی ادارہ قائم کر کے بیشتر بڑے ادیبوں کو عام ناشروں سے دوگنی رائلٹی دینے اور تاشقند میں اپنے فلیٹ میں موج میلہ کرنے کی دعوت دے کر راغب کر لیتے ہیں۔ میں ان دنوں صبح کی نشریات کی میزبانی کے سلسلے میں اسلام آباد میں رہائش رکھتا تھا اور لاہور میں انہوں نے اعلان کیا کہ میں اسلام آباد جا رہا ہوں اور واپسی پر میری جیب میں تارڑ کی کتابوں کے حقوق ہوں گے۔ اُن صاحب کی خدمت میں میں نے تین گزارشات پیش کیں۔ مجھے اپنے موجودہ ناشر سے کچھ شکایت نہیں، وہ باقاعدگی سے مجھے رائلٹی ادا کرتے ہیں بلکہ کسی اشد ضرورت کے تحت وہ میرے لیے ایک بینک ہیں جہاں میرے اکاؤنٹ میں کچھ بھی نہ ہو تو بھی ادائیگی ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں میں جانتا ہوں کہ جتنی رائلٹی کی پیشکش آپ کر رہے ہیں وہ ممکن نہیں کہ میں آپ کے ظہور سے بہت پہلے اس کاروبار کے رموز سے آگاہ ہو چکا ہوں۔۔۔ اور آخری بات۔۔۔ میں نے آج تک کسی ناشر کو نہیں چھوڑا جب تک کہ وہ مجھے چھوڑنے پر مجبور نہ ہوا۔۔۔ تین چار ماہ کے بعد شکایتیں آنے لگیں۔۔۔ منیر نیازی نے مجھے فون کر کے کہا، تارڑ، اُس خبیث نے مجھے دو تین ماہ تو رائلٹی کا چیک روانہ کیا اور اب بچارہ چار ماہ سے خاموش ہے۔ فون کا جواب بھی نہیں دیتا، منشا یاد بھی دُہائیاں دیتا پھرتا تھا کہ اُسے تو اسلام آباد میں قائم کردہ اس عظیم اشاعتی ادارے کے عظیم شو روم کا انچارج ہونا تھا اور اُس کے لاکھوں روپے ڈوب گئے تھے۔ یہ ناشر صاحب ایک سوپر چیکے سے غائب ہوئے، کہیں تاشقند میں نمودار ہوئے، وہاں ڈوبے تو شنید ہے کہ کینیڈا میں جا نکلے اور وہاں اب مزے کرتے ہیں۔

تو پھر مجرم کون ہوا۔۔۔ جھانسا دینے والے اور بار بار دینے والے یا اُس جھانسے میں بار بار آجانے والے کہ تعلیمی فراڈ کا بھی یہی معاملہ ہے